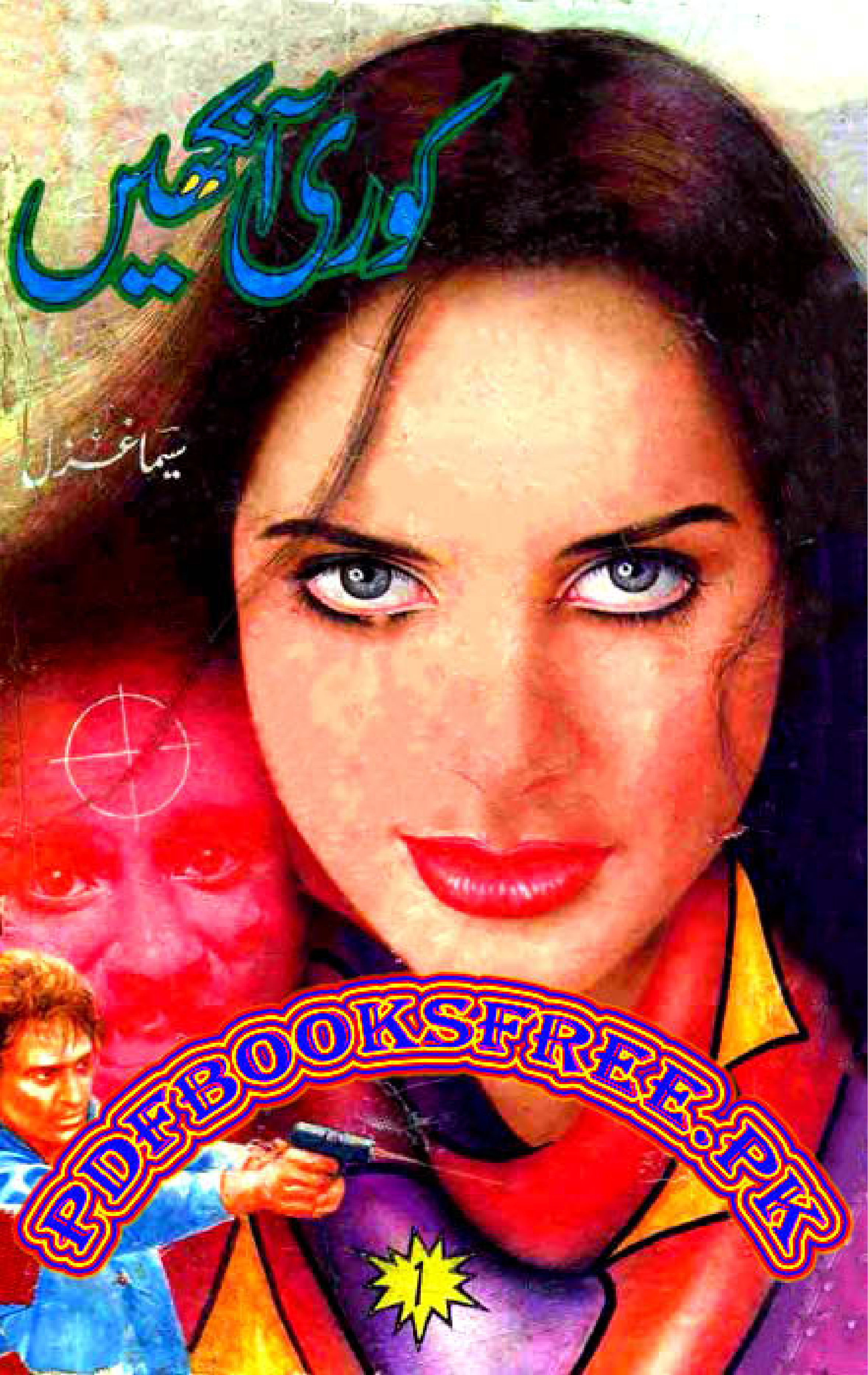
کوری آنکھیں
سیما غزل
PDFBOOKSFREE.PK
1

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ابے تو اٹھے گا یا نہیں؟" قادر داد حسبِ عادت چیخا اور حسب عادت اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

گلو نے کسمسا کر کروٹ بدلی اور پیروں پر پڑی چادر کو سر تک کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی قادر کی بڑبڑاہٹ اونچی ہو گئی۔

"ارے او گینڈے' ابے دن نکل آیا ہے اٹھ جا' سالے نہ دن کی تمیز ہے نہ رات کی' مسٹنڈا سا پڑا رہتا ہے۔" قادر داد نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ شاید اسے ڈر تھا کہ آواز اونچی ہوئی تو کھانسی کا دورہ شدید ہو جائے گا۔ وہ بوڑھے سینے کو دبائے سیمنٹ کے اس چبوترے پر جا بیٹھا جہاں قریب ہی لوہے کی بالٹی میں پانی اور چبوترے کی منڈیر پر لائف بوائے صابن کا ٹکڑا پڑا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھوتے میں بھی بڑبڑاتا رہا مگر گلو کو اس کی کوئی پرواہ نہ تھی۔

یہ تو روز ہی ہوا کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قادر داد جب تک گھرمیں رہے گا یونہی بڑبڑاتا رہے گا۔ اس کے بڑبڑانے سے گلو کی نیند کا کوئی تعلق نہ تھا' اگر وہ اٹھ بھی جاتا تب بھی وہ بڑبڑاتا ہی رہتا۔ اس کی بڑبڑاہٹ تو گلو کو لوری کا سا مزا دیتی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اور قادر داد کی بڑبڑاہٹ اسے کچھ اور گہری نیند میں پہنچا دیتی تھی۔ ہاں اس روز اسے بڑی پریشانی ہوتی جب قادر داد اسے کچھ کہے بنا کام پر چلا جاتا تھا۔ ایسے میں بھی وہ گھر پر تو نہ ٹکتا تھا مگر سارا دن اس کا دھیان قادر داد کی طرف لگا رہتا پھر اس کی بے چینی اسے جلد ہی گھر لے آتی تو پتہ چلتا کہ قادر داد بیمار ہے یا اسے بہت تیز بخار ہے اور وہ چیخ پڑتا۔

"چاچا تو چھوڑے گا نہیں دھوپ میں کھڑا ہونا!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں ہاں۔ تو تو اپنا ہے نا' سائے میں مارنا چاہتا ہے۔ ابے اتنی محبت ہے تو کمائی کیا کر' میری بوڑھی ہڈیوں کو سکون ہو جائے گا۔ سالا زبانی جمع خرچ کر کے چلا جاتا ہے۔"

اور یہیں گلو کی ساری محبت دم توڑ دیتی تھی۔ کمائی کے نام سے ہی اس کی جان جاتی تھی اور خاص طور پر ایسی کمائی سے جو قادر داد چاہتا تھا۔ گلو نے جب سے ہوش سنبھالا تھا چاچا کو بوڑھا اور بیمار ہی دیکھا تھا۔ ایک کمرے کی اس کوٹھڑی میں وہ اور قادر یوں رہ رہے تھے جیسے صدیوں سے یوں ہی رہ رہے ہوں۔ سوائے اس کے کہ گلو لمبا چوڑا ہو گیا تھا' اس مکان میں کوئی دوسری تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شروع شروع میں قادر داد اسے ماضی کی باتیں بتایا کرتا تھا اور وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ بھر کے گھنٹوں سنا کرتا تھا مگر اب نہ قادر داد میں ہمت رہی تھی داستانیں سنانے کی اور نہ ہی گلو کے پاس وقت تھا۔ ویسے بھی اس کا ماضی تو کورے کاغذ کی طرح تھا۔ سادہ' سفید' نہ کوئی بات نہ کوئی منظر' نہ خوشی نہ غم۔ قادر داد جس ماضی کی باتیں کیا کرتا تھا' وہ اس چبوترے سے شروع ہوتا تھا جس چبوترے پر گلو کا ماضی ختم ہوا تھا۔

قادر داد نے اسے محلے کے سکول میں داخل کرایا تو اس نے کچھ ہی روز بعد اسکول جانے سے انکار کر دیا تھا۔ دکان پر بٹھایا تو اس نے چوریاں شروع کر دیں' چھوٹی سی پرچون کی دکان تھی' ایسی بھی آمدنی نہ تھی کہ ٹھیک سے گزارا ہو جاتا پھر یہ چھوٹی موٹی چوریاں پوری ڈکیتیاں محسوس ہوتیں۔ قادر داد کو جب ان چوریوں کا پتہ چلا تو دیر ہو چکی تھی اور گلو پکا چور بن چکا تھا۔ قادر داد کی مار پیٹ اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ پائی' تھک ہار کر قادر داد نے اسے اس کے حالوں پر چھوڑ دیا۔

گلو کی لاتعلقی سے یہ ہوا کہ قادر داد مزید بیمار ہو گیا اور ایک روز تو ایسی حالت ہو گئی کہ اسپتال لے جانا پڑا' دمڑی پاس نہ تھی اور دوائیں بہت مہنگی تھیں۔ محلے والوں کے مشورے پر گلو نے پرچون کی دکان بیچ دی اور سارا پیسہ چاچا کے علاج پر لگا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا بچ گیا تو دکان پھر بن جائے گی' دکان تو نہ بن سکی مگر قادر داد نے ٹھیک ہو کر گلو کا جہنم بھرنے کے لئے ٹھیلا ضرور لگا لیا' اب وہ گلو سے بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ کام میں اس کی مدد کیا کرے یا کہیں مزدوری ہی کر لے۔ مگر گلو کے خواب بہت اونچے تھے۔ وہ استاد فتح کی طرح بڑا آدمی بننا چاہتا تھا ایسا آدمی جس سے سب ڈرتے ہوں۔ جس کے

سب کام چٹکی بجاتے ہی ہو جایا کرتے ہوں اور جسے سب سلام کریں۔ گلو اکثر اکیلے میں استاد فتح کی طرح اکڑا اکڑا پھرتا' اسی کے اسٹائل میں بیڑی کو سب سے چھوٹی انگلی کے درمیان پھنسا کر لمبے کش لیتا اور اس جیسا بن جانے کے خواب دیکھا کرتا۔

☆============☆============☆

"ابے اٹھ جا یا لاش کی طرح اکڑا پڑا رہے گا!"

یہ قادر داد کا آخری جملہ تھا۔ گلو نے انگڑائی لی اور چادر اتار پھینکی۔ قادر داد سامنے بیٹھا چائے کے پیالے میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھور رہا تھا۔

"چائے پی لے۔ ٹھنڈی ہو گئی تو تجھے کون گرم کر کے دے گا؟ گلو! تجھے کب عقل آئے گی' تو تو اپنا بھی دشمن بنا ہوا ہے۔ کچھ کام دھندا شروع کر دے تو میں حمیدہ سے تیرے لئے بات کروں۔ نازاں گھر آ جائے گی تو تیرے ساتھ ساتھ کچھ گھر بار بھی سنبھال لے گی' اچھی سمجھ دار لڑکی ہے' مگر یہ تو سوچ کہ ایک نکھٹو کو حمیدہ اپنا داماد کیسے بنائے گی' کئی بار کہہ چکی ہے کہ گلو کو دھندے سے لگا دے تو گھر بس جائے گا' ویرانی ختم ہو جائے گی۔ تجھے اچھی لگتی ہے یہ ویرانی؟"

"تجھے تو اچھی لگتی ہے نا؟ تجھے تو ساری زندگی ہو گئی اس ویرانے میں رہتے ہوئے۔" گلو نے بے پروائی سے کہا اور اٹھ کر سیدھا سیمنٹ کے چبوترے پر جا بیٹھا۔

"ارے تُو کیا جانے کیسی خوفناک ہوتی ہے یہ ویرانی۔ اب تُو چاہے تو یہ ویرانی ختم بھی تو ہو سکتی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جب میں بڑا آدمی بن جاؤں گا تب سوچوں گا۔ ویسے بھی نازاں جیسی بھنگن نہیں چاہیئے مجھے۔ تو چاہے تو اسے ماسی کے طور پر رکھ سکتا ہوں۔" گلو نے پچکاری مارتے ہوئے کہا اور قادر داد نے حیرت سے اسے دیکھا' گلو نے پہلی بار اس سے اس انداز میں بات کی تھی۔ اس کے لہجے کا غرور' اس کے انداز کا اکھڑپن نہ معلوم کیوں اسے سہا گیا۔ اس نے پھر کچھ نہ کہا اور کندھے پر چادر ڈال کر چپ چاپ نکل گیا۔

☆============☆============☆

گلو آج بہت خوش تھا۔ اسے استاد فتح نے بلایا تھا۔ استاد فتح تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ ہر وقت اس کے آدمیوں کی خدمت میں جتا رہتا' ان کے لئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چائے لاتا' ان کے پاؤں دباتا اور ہر ایک سے اپنی سفارش کے لئے کہتا۔ گلو' استاد فتح کے آدمیوں سے اس کی سخاوت اور بہادری کے قصے سنتا رہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ علاقے کے لوگوں کے علاوہ تھانیدار بھی استاد فتح سے دبتا ہے۔ بڑے بڑے کام اس کے ایک فون پر کر دیتا ہے۔ استاد فتح گلو کا آئیڈیل بن چکا تھا۔ گلو نے جب سے گلی میں پاؤں نکالا تھا اس وقت سے استاد فتح کا نام سن رہا تھا۔ استاد فتح پہلے صرف فتح تھا۔ محلے کا بدمعاش' آئے دن لوگوں سے جھگڑنا اور ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دینا ہی اس کا کام تھا مگر اب تو یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ جانے کتنے تو چیلے تھے اس کے' چھوٹے موٹے کام تو یہی چیلے کر دیا کرتے تھے۔ وہ خود تو عیش ہی کیا کرتا تھا۔ لمبی سی گاڑی میں پیچھے بیٹھ کر سامنے سے گزرتا تھا تو گلو اسے دیکھتا رہ جاتا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے' وہ استاد فتح کی گاڑی صاف کر رہا تھا کہ اچانک وہ باہر آ گیا۔

"سلام صاب!" گلو نے جلدی سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور نہایت چابکدستی سے گاڑی پر کپڑا مارنے لگا۔

"کون ہے یہ چھوکرا؟" استاد فتح نے ڈرائیور سے پوچھا۔

ڈرائیور نے اس کے بارے میں نہ جانے کیا کہا' وہ باوجود کوشش کے پوری بات نہ سن سکا اور مارے خوف کے اس کے بدن پر پسینہ بہہ گیا۔ ڈرائیور کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ اسے بنا بھی سکتا تھا اور تباہ بھی کر سکتا۔ پسینہ تو فتح کو دیکھ کر بھی اس کے بدن پر رینگ آیا کرتا تھا' خوف کی سی کیفیت بھی طاری ہو جاتی تھی مگر اس سے قریب ہونے کی خواہش نے دم نہیں توڑا تھا۔

اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ڈرائیور کی زبان پر جا بیٹھے' اور ایسے میٹھے بول بولے' اپنی اتنی تعریفیں کرے کہ استاد فتح بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لے مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا اور استاد فتح اسے غور سے دیکھتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ گلو نے لپک کر پچھلا دروازہ کھولا۔ فوجیوں کی طرح سیلوٹ مارا اور دو قدم پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی لمحوں میں زن سے آگے بڑھ گئی مگر گلو استاد فتح کی گھنی مونچھوں کے نیچے رینگتی ہوئی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اپنے لئے ستائش کی کیفیت محسوس کر چکا تھا۔

پھر تمام رات وہ حسین خواب دیکھتا رہا' کبھی دیکھتا کہ وہ استاد فتح کے کاندھے پر ہاتھ

رکھے اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا ہے اور کبھی دیکھتا کہ وہ اور استاد فتح لمبی سے چمچماتی ہوئی کار میں بیٹھ رہے ہیں اور ڈرائیور کار کا دروازہ کھولے کھڑا ہے' اور ایسے ہی نہ جانے کتنے خواب اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بھر گئے۔ پھر جب ڈرائیور نے گلو کو بتایا کہ اسے استاد فتح نے بلایا ہے تو وہ حیرت اور خوشی سے اچھل پڑا۔ اسے لگا جیسے رات بھر دیکھے ہوئے تمام خواب تعبیر بن کر سامنے جھلملا رہے ہوں' اور اب اسے سیدھا وہیں جانا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا اور دروازے کی کنڈی چڑھا کر سیدھا جان محمد کے کوارٹر پہنچ گیا۔ جان محمد اسے سویرے سویرے بنا سنورا دیکھ کر ہنس پڑا۔

"ابے وہ تو ابھی سو رہے ہیں۔ اتنے سویرے کس نے کہا تھا آنے کو؟"

"کیا بجا ہے؟" اس نے جھینپ کر پوچھا۔

"صرف سوا گیارہ ہوئے ہیں۔" جان محمد نے گھڑی کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ وہ گلو کی سج دھج کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

گلو نے آج نہا کر کپڑے بدلے تھے۔ ہلکے گلابی رنگ کا شلوار قمیض اس نے پچھلی عید پر بڑے شوق سے سلوایا تھا۔ اس کے رنگ میں وہ پہلی سی چمک دمک تو نہ تھی مگر پھر بھی اس کے تمام جوڑوں میں سب سے بہتر تھا۔ سویرے نہا کر اس نے بالوں میں چنبیلی کا تیل بھی ڈالا تھا اور پرانے بکس سے برسوں پرانی سرمہ دانی نکال کر اسے خوب ہلا کر سلائی کو آنکھوں میں کئی بار پھیرا تھا۔

☆============☆============☆

"ابے کیا قیامت آ گئی۔ یہ تڑکے تڑکے سورج مغرب سے کیسے نکل آیا؟" چاچا نے کھٹر پٹر کی آوازیں سن کر رضائی سے منہ نکالا تھا۔

"کام سے جا رہا ہوں۔" گلو نے بڑے غرور سے جواب دیا تھا۔ "تجھے اس پر بھی اعتراض ہے کیا؟"

اور قادر داد نے دوبارہ رضائی ہٹا کر پرے پھینک دی تھی۔ وہ اسے بے یقینی سے دیکھ رہا تھا مگر اس کی تیاری دیکھ کر اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ پھر اس نے چپ چاپ اٹھ کر چائے بنائی اور پیالہ بھر کر گلو کے پاس آ گیا۔

"لے گلو چائے پی لے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔" گلو نے رعونت سے کہا اور اسے نظر انداز کرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ "دیر ہو گئی تو صاب نکل جائے گا۔"

اور اب........ جان محمد کہہ رہا تھا کہ صاب سو رہے ہیں۔ اسے افسوس ہوا کہ آج پہلی بار چاچا نے بغیر بڑبڑائے اتنے پیار سے چائے بنا کر دی اور وہ پیئے بنا چلا آیا۔

"سوا گیارہ........ یہ تو بہت ٹائم ہوتا ہے جان محمد!........ میرا چاچا تو ساڑھے گیارہ بجے دوپہر کا کھانا کھانے گھر آ جاتا ہے۔"

"ابے وہ تیرا چاچا ہے........ اور یہ تیرے چاچا کا چاچا!" جان محمد نے آنکھ دبائی۔

"ویسے آج تو شہزادہ لگ رہا ہے۔"

"جان محمد! کل استاد میرے بارے میں کیا پوچھ رہا تھا اور تو نے کیا جواب دیا تھا؟"

گلو کو ساری فکر استاد فتح کی تھی۔ اس لئے وہ اپنی تعریف سن کر بھی نظر انداز کر گیا کوئی اور وقت ہوتا تو وہ غبارے کی طرف پھول گیا ہوتا۔

"پوچھ رہا تھا کہ یہ چھوکرا کون ہے اور کیا کرتا ہے' رہا میرے جواب کا تو........ تو خود سوچ لے کہ میں نے کیا جواب دیا ہو گا' ابے راستے کی دھول بن جاتا مگر اس تک رسائی نہ ہوتی اگر میں نے تعریفیں نہ کی ہوتیں' سالے اب مجھے بھول مت جانا' میرا بھی خیال رکھنا۔" اس نے حسب عادت پھر آنکھ دبائی۔

"ہاں جان محمد........ تجھے کیسے بھول سکتا ہوں........ تو تو ویسے بھی میرا یار ہے' اور یاد رکھ جان محمد! گلو بدمعاش ہو سکتا ہے مگر احسان فراموش نہیں۔ تو فکر نہ کر۔" وہ فوراً چاپلوسی پر اتر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب سالے راہ کے کانٹے ہیں' بچ کر نہ نکلا تو دامن تھام لیں گے۔ وہ تو بس استاد فتح سے ملنا چاہتا تھا' کسی بھی طریقے سے' کچھ بھی کر کے۔

"چائے پیئے گا؟" جان محمد نے اسے چونکا دیا۔

"ہاں........ اگر پلائے گا تو ضرور پیوں گا!"

جان محمد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سامنے بیٹھے لالے خان کو آواز دے کر دو چائے لانے کو کہا اور خود کمرے سے ملحق باتھ روم میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر بعد لالے خان نیلے رنگ کی چینک اور دو کپ لے آیا۔ دونوں نے خاموشی سے چائے پی۔ اسی

وقت بنگلے کا نوکر آ گیا اور اس نے جان محمد کو بتایا کہ صاب اٹھ گئے ہیں اور اسے بلا رہے ہیں۔ یہ سنتے ہی چائے کا آخری گھونٹ گولا بن کر اٹک گیا۔ گلو کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔

"چل شہزادے!........ تیرا بلاوا آ گیا۔" جان محمد نے پھر آنکھ دبائی۔

گلو بالوں پر ہاتھ پھیرتا' قمیض کا دامن جھٹکتا اس کے ساتھ ہو لیا۔ اس کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ استاد فتح کے پاس نہیں جا رہا بلکہ پھانسی کے تختے پر لے جایا جا رہا ہے۔

نوکر نے اندر جا کر انہیں برآمدے میں رکنے کا اشارہ کیا اور خود سفید رنگ کے بڑے سے دروازے کا جالی دار پردہ ہٹا کر اندر غائب ہو گیا۔

چند منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو استاد فتح اس کے ساتھ تھا۔ وہ اپنی گن اور لمبی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سانپ کی آنکھوں سے مشابہ تھیں' اس کے پتلے پتلے سیاہ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے' بیچ کی مانگ نکالے' کاندھوں پر کالی شال ڈالے' سفید کلف لگی شلوار کو آڑھا کیے' وہ بڑا بارعب لگ رہا تھا۔ پیروں میں قیمتی کھسے اور انگلیوں میں بڑی بڑی سونے کی انگوٹھیاں گلو پر عجیب سی ہیبت طاری کیے ہوئے تھیں۔ وہ اور جان محمد اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔

"ہوں........" اس نے ہنکارا بھرا اور اپنی نگاہیں گلو پر گاڑ دیں۔ "کیا نام ہے تیرا؟" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا تھا مگر گلو یوں اچھل پڑا جیسے قریب ہی کہیں بم پھٹا ہو۔

"گلو صاب........" وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"گلو صاب!"

"نہیں جی........ صرف گلو........ صاحب جی!" وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

استاد فتح نے مسکراہٹ کو اپنے پتلے ہونٹوں پر بھینچ لیا۔ "یہ کیا نام ہوا........ گلو........؟"

"جی وہ' نام تو گلزار احمد تھا پر........ چاچا گلو کہتا تھا اس لئے........"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ کرتا کیا ہے؟" اب استاد فتح سنجیدہ ہو گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کک.......... کک کچھ نہیں صاب.......... آپ کے پاس کام کرنا چاہتا ہوں صاب.........."

"ہاہاہا.........." اس نے زبردست قہقہہ لگایا۔ "میرے پاس کام کرنے کا دم ہے تجھ میں؟ ابھی تک تو' چاچے کی انگلی پکڑ کر گھوم رہا ہے۔"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں صاب.........." گلو نے فوراً شانوں کو پیچھے کی طرف کر کے سینہ آگے نکال لیا۔

"صاب نہیں.......... استاد۔" اس نے رعونت سے کہا۔

"جی.......... جی استاد۔" اس کا سینہ ایک دم ہی پچک گیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ دیر اور کھڑا رہا تو کمر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ یہ نہیں کہ وہ کمزور تھا بلکہ استاد فتح کے سامنے اکڑ کر کھڑا ہونے کی کوشش نے اسے چٹا کر رکھ دیا تھا۔ یہ شاید قبولیت کا وقت تھا۔ اسی لمحے استاد فتح نے ملازم سے لان میں کرسیاں ڈالنے کو کہا' ملازم فوراً ہی باہر کی طرف چلا گیا۔ کونے میں رکھی بید کی دو کرسیاں اس نے لان میں ڈال دیں۔ استاد فتح انہیں اشارہ کرتا ہوا لان کی طرف بڑھ گیا۔ جان محمد اور گلو اس کے پیچھے تھے۔

"جان محمد!" اچانک استاد فتح نے پلٹ کر جان محمد کو مخاطب کیا۔ "سندھی ہوٹل والے کام پر کون گیا ہے؟"

"ولی محمد گیا تھا استاد! مگر وہ اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے اسے آپ کا لفافہ پہنچا دیا تھا۔"

"ہوں.......... ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

گلو کو یوں لگا جیسے کسی نے باریک نائلون کی ڈور اس کی گردن میں ڈال کر کھینچ لی ہو۔ جان محمد جاتے جاتے کن انکھیوں سے تسلی دے گیا مگر گلو کا حلق خشک ہو چکا تھا۔

وہ سلام کرتا ہوا چلا گیا تو گلو کا دم ہی نکل گیا۔ اب وہ استاد فتح کے ساتھ تنہا رہ گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ملازم ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"غلامو چائے لاؤ۔" استاد فتح نے ملازم کو مخاطب کر کے کہا۔ وہ سر ہلا کر برآمدے کی طرف بڑھ گیا تو استاد فتح پھر گلو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "ہاں گلو.......... یہی نام بتایا نا تم نے؟"

"جج.......... جی استاد!"

"میرے پاس کام کرنا چاہتے ہو؟"

"جی استاد!"

"میرے پاس کام کرنے کی چند شرطیں ہیں' ان سے واقف ہو؟"

"نن.......... نہیں' پر میں تیار ہوں۔"

"شرطیں یاد کرائے بغیر میں کسی سے کوئی کام نہیں لیتا گلو' میری پہلی شرط رازداری ہے۔ جو کچھ میں کہوں وہ کسی دوسرے کو پتہ نہ چلے۔ میرے کام کے بارے میں صرف مجھی سے بات کی جائے۔ دوسری بات یہ کہ میرا کام کرنے والا جان ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے۔ کوئی سوال نہیں کرتا' اور انکار بھی نہیں کرتا۔ معاوضہ میں اتنا دیتا ہوں کہ اس کا جی خوش ہو جائے' اس کی تکلیف میری تکلیف ہوتی ہے' تجھے یہ شرطیں منظور ہیں؟"

"جی استاد!.......... بس آپ مجھے نوکری دے دیں استاد' گلو احسان فراموش نہیں ہے استاد اور اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔" وہ جانے کیسے اتنا کچھ کہہ گیا ورنہ کچھ دیر پہلے تو اس کا حلق بالکل خشک ہو چکا تھا۔

"گڈ.......... کاٹھی تو تیری مضبوط ہے۔ دلیری آزمانا پڑے گی۔ اور سن۔ میرے ہاں ضمیر اور غیرت نام کی کوئی چیز نہیں ہے' میں ان دونوں چیزوں کو کاروبار سے الگ ہی رکھتا ہوں۔"

"جی استاد.........." کچھ نہ سمجھنے کے باوجود گلو نے سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔ اسی وقت ملازم چائے لے آیا۔ چائے کے برتن اتنے نازک اور خوبصورت تھے کہ گلو خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے فوراً چائے پینے سے انکار کر دیا۔ اسے ڈر تھا کہ پیالی اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ جائے گی اور وہ پہلے ہی امتحان میں ہی فیل ہو جائے گا۔

"ڈرائیونگ آتی ہے تجھے؟" استاد فتح نے پوچھا۔

"نن.......... نہیں استاد لیکن میں سیکھ لوں گا۔"

"ٹھیک ہے میں جان محمد سے کہہ دیتا ہوں۔ تیرا پہلا کام یہی ہے کہ گاڑی چلانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں مہارت حاصل کر لے اور سن.......... یہ لے' یہ ایڈوانس تنخواہ ہے۔" اس نے جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر گلو کی طرف بڑھا دیا۔

نوٹ لیتے ہوئے گلو کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ خوشی سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ استاد فتح اتنی جلدی اسے کام پر لگا دے گا۔ اس نے نوٹ لے کر استاد فتح کو کھڑے ہو کر سلیوٹ کیا تو استاد کے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر سی پھیل گئی۔

"میرے کام دیانتداری سے کرے گا تو تنخواہ اور بڑھا دوں گا۔"

"شکریہ استاد.......... مہربانی.......... یہ.......... یہ بہت ہے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بولا۔ "میں.......... میں جاؤں استاد؟"

"ہاں جاؤ.......... اور جان محمد کو بھیج دو۔" اس نے پیالی ہونٹوں کے قریب لے جاتے ہوئے کہا۔

گلو باہر آیا تو اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ دل اب بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا مگر اس بار کیفیت بدلی ہوئی تھی۔ اس نے گیٹ سے باہر سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھے ہوئے جان محمد کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "یار.......... میں تیرا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا' جا تجھے استاد بلا رہا ہے۔"

گلو پانچ سو روپے والی بات بالکل گول کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بات سنتے ہی جان محمد اپنا حصہ باندھ دے گا اور کچھ بعید نہیں کہ ابھی نوٹ تڑوا کر سو دو سو روپے لے لیتا۔ جان محمد کے اندر جاتے ہی اس نے جیب تھپتھپائی اور دوسری جیب سے بیڑی نکال کر سلگا لی۔ وہ بیڑی پینے کا عادی نہیں تھا مگر کبھی کبھی پی لیتا تھا۔ آج بھی اس نے چاچا کے سرہانے سے بیڑی کے پیکٹ سے ایک بیڑی چرا لی تھی۔ اس وقت بیڑی کے نشے نے اتنا مزہ دیا کہ وہ ہواؤں میں اڑنے لگا۔ نشہ ختم ہونے سے پہلے ہی جان محمد آ گیا۔ اس نے آتے ہی گلو کی کمر میں اس زور کا دھپ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔

"کیا ہوا؟" اس نے فوراً بیڑی پاؤں تلے مسل دی۔

"تیرے تو عیش ہو گئے شہزادے.......... استاد کہتا تھا۔ آدمی جان دار لگتا ہے۔ ٹرائی مارنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"سچ بول.......... ایسا کہا..........؟" وہ بے قرار ہو گیا۔

"ہاں.......... اور تیرے پان بیڑی کا خرچا اپن پر ڈال دیا۔ خیر چلے گا.......... چل کوارٹر میں چلتے ہیں' کچھ باتیں ہو جائیں۔"

گلو جانتا تھا کہ جان محمد دوسروں کی نسبت استاد فتح سے زیادہ قریب ہے۔ وہ کہاں سے آیا تھا اور کب سے استاد کے ساتھ تھا یہ تو اسے پتہ نہیں تھا مگر جب سے استاد فتح' استاد بنا تھا تبھی سے جان محمد اس کا سایہ ہو گیا تھا۔ اس کی کوئی بات اور کوئی کام جان محمد سے چھپا ہوا نہیں تھا' بلکہ بعضوں کا تو کہنا تھا کہ استاد فتح بہت سی باتوں میں جان محمد سے مشورہ لیتا ہے اور یہ کہ وہ استاد فتح کا مخبر ہے۔ بہرحال گلو کو ان تمام باتوں سے صرف اتنا سروکار تھا کہ وہ جان محمد کو استاد فتح تک پہنچنے کے لئے پہلی سیڑھی سمجھتا تھا اور یہ اس نے کیا بھی۔ اسی کی خدمت اور یاری سے آج وہ استاد فتح تک پہنچ گیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اسے استاد فتح کے گروپ میں شامل ہونا ہے تو اسے جان محمد کی شاگردی کرنا پڑے گی' اس کے کہنے پر چلنا ہو گا۔ یہی سوچتا ہوا وہ جان محمد کے ساتھ اس کے کوارٹر تک آ گیا۔

"بیٹھ شہزادے!" جان محمد نے اس کے کندھے کو شفقت سے چھوا۔

وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جان محمد بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس وقت جان محمد کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا انداز بالکل پڑھے لکھے لوگوں والا ہو گیا۔ وہ بڑی گہری نگاہوں سے گلو کو تک رہا تھا۔

"تو جانتا ہے کہ استاد فتح کے دھندے کیا ہیں؟"

"نہیں مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کے دھندے کیا ہیں۔ دیکھ جان محمد! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے غریبی سے نفرت ہے' میں امیر ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے غریبی کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو ترس گیا ہوں۔ مجھے کبھی کوئی کھلونا نہیں خرید کر دیا گیا۔ کھانے کی کوئی چیز میری خواہش پر نہیں ملی' اپنی پسند کے کپڑے بھی آج تک پہننے کو نہیں ملے' اس غریبی نے بچپن سے اب تک میری تمام زندگی' عمر کے اتنے بہت سے سال برباد کر دیئے۔ میں ان سب کا ازالہ چاہتا ہوں۔ میں اپنی ساری خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہوں جان محمد.......... میں پڑھا لکھا نہیں ہوں کہ افسر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بن سکوں' اور............ اور میں سڑک پر ٹھیلا بھی نہیں لگا سکتا' پھر میں آخر کیا کام کروں جو مجھے پیسہ ملے' یہی سوچتے سوچتے میرے اتنے برس گزر گئے۔ چاچا سمجھتا ہے کہ مجھے احساس نہیں ہے............ ایسی کوئی بات نہیں ہے جانو............! مجھے احساس ہے کہ میں جوان ہوں' مجھے کمانا اور بوڑھے چچا کو آرام کرنا چاہئے مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ برسوں محنت کر کے صرف ایک گھر بنا سکوں یا ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی خرید سکوں۔ میں یہ سب جلدی چاہتا ہوں۔ فٹافٹ امیر ہونا چاہتا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح استاد فتح امیر ہو گیا' دیکھتے دیکھتے ہی لاکھوں میں کھیلنے لگا۔ بنگلے میں رہتا ہے اور نئی چمچماتی ہوئی کار میں گھومتا ہے۔ اس کے نزدیک پانچ سو روپے کی حیثیت نہیں' پانچ سو روپے اس نے کھڑے کھڑے مجھے دے دیئے بالکل ایسے جیسے جیب سے کوئی بے حقیقت کاغذ کا ٹکڑا نکال کر میری طرف بڑھا دیا ہو۔" وہ بولتے بولتے ٹھٹک گیا۔ اسے فوراً احساس ہو گیا تھا کہ وہ جذباتی ہو کر پانچ سو روپے والی بات بھی بتا چکا ہے۔ اس نے جان محمد کو غور سے دیکھا' وہ اسی طرح سر ایک جانب ڈھلکائے اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

"پانچ سو روپے کی رقم زندگی میں پہلی بار میرے ہاتھ آئی ہے جان محمد' تُو نہیں جانتا کہ اس وقت میری کیا کیفیت ہے' مجھ سے کچھ مت پوچھ............ کچھ مت کہہ' بس کام بتا............ کرنا کیا ہے اور بس۔"

"بول چکا تو؟" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں............"

"تو سن! میں استاد فتح کو تیرے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ یہ بھی کہ تو کتنا غریب ہے اور یہ بھی کہ کچھ بننا چاہتا ہے مگر دوست فتو سے استاد فتح اور گلو سے استاد گلزار بننا اتنا آسان نہیں ہے جتنا شاید تُو سمجھ رہا ہے۔ تُو نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالا ہے' استاد تجھے اپنا آدمی بنا چکا ہے اور تجھ سے کام بھی لینا چاہتا ہے مگر یہ جان لے کہ اب یہ تیری جان............ یہ مضبوط جسم تیرا نہیں رہا............ استاد فتح کا ہو چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تیرا صرف ایک بوڑھا چاچا ہے اور بس' وہ اپنے گروپ میں ایسے ہی آدمی رکھتا ہے جو اکیلے ہوں یا............ اکیلے ہونے والے ہوں۔"

آخری جملہ سن کر گلو لال بھبھوکا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ جان محمد کا مقصد کیا

ہے۔

"نہیں گلو............ گرمی نہیں چلے گی۔ تو' اب تیرا نہیں ہے اور نہ تو تیرے باپ کا ہے۔" جان محمد نے انگلی اٹھا کر کہا تو گلو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا مگر اسے دکھ ہوا تھا کہ اس کے چاچا کے لئے ایسا کہا گیا۔ ساری دنیا میں صرف اس کا بوڑھا چاچا ہی تو تھا جو گلو کی پہچان تھا۔ وہ اس کے بارے میں ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہ تھا مگر تقدیر نے جو چانس اسے دیا تھا وہ بھی اس کے نزدیک کم نہیں تھا۔ حالات دوسرے ہوتے تو وہ اب تک جان محمد کی آنتیں نکال چکا ہوتا۔

جان محمد اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اس کے اندر ہونے والی جنگ کے نتائج دیکھنا چاہتا تھا۔ رفتہ رفتہ گلو نارمل ہو گیا تو جان محمد کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"شاباش............ اسی طرح خود کو سنبھالتا رہا تو جلد ترقی کرے گا۔ میں نے بھی اپنا آپ مارا ہے تو یہاں تک پہنچا ہوں' اور میں کیوں کہ ابھی زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لئے سب کچھ ہنس کھیل کر برداشت کر رہا ہوں۔ گلو! زندگی کا کوئی مقصد ہونا چاہئے' اچھا یا............ برا' بغیر مقصد زندہ رہنا بے غیرتی ہے اور آج میں جو مقصد لئے زندہ ہوں اسے پورا کرنا ہی میرا نصب العین ہے۔ میں نے بھی اپنے اندر بڑی بڑی جنگیں لڑی ہیں گلو' کبھی ہارا بھی ہوں اور کبھی جیتا بھی ہوں۔ دونوں ہی کیفیتوں میں اذیت سہی ہے میں نے مگر............ کبھی کبھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔"

اور گلو منہ پھاڑے اسے تک رہا تھا۔ اس نے تو جان محمد کو ہمیشہ بے وقوف سا' جاہل اور خوشامدی آدمی سمجھا تھا جو پیدا ہی صرف اس لئے ہوا تھا کہ استاد فتح کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا رہے یا اسے لئے لمبی لمبی سڑکوں پر زندگی گزارتا رہے۔ مگر اس وقت جو جان محمد اس کے سامنے بیٹھا بول رہا تھا وہ تو استاد فتح سے بھی زیادہ مہذب' پڑھا لکھا اور بڑا آدمی لگا۔

"جان محمد!............ کیا............ کیا تو بھی بہت غریب آدمی تھا؟"

"نہیں گلو' پیسے کی میرے پاس کوئی کمی نہیں۔ یہ لمبی کہانی ہے' موقع ملا تو تجھے ضرور سناؤں گا۔ فی الحال تو تجھے ڈرائیونگ سکھانا ہے۔ بول کب سے شروع کرے گا؟"

"آج سے............ بلکہ ابھی سے............" گلو نے پُرجوش انداز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں آج تو عیش کر' اور سن تیرے چاچا کی اب جتنی بھی زندگی ہے ناں گلو! اسے سنبھال کر رکھ' اس کا علاج کرا' غذا دے اسے اچھی تا کہ وہ کچھ دن تو سکون سے گزار سکے۔"

اور گلو کا سارا جوش ختم ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ آج چاچا نے بغیر بڑبڑائے اسے بہت پیار سے چائے بنا کر دی تھی اور وہ کس رعونت سے اسے ٹھکرا چلا آیا تھا۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ "جان محمد! آج چاچا مجھے بیمار لگ رہا تھا' جب تک صبح صبح اس کی گالیاں نہیں سن لیتا' اس کی صحت کا یقین نہیں ہوتا اور آج اس نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ میں چلتا ہوں.......... رات کو آؤں گا پھر مجھے پروگرام بتا دینا۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہے' اب تو فکر نہ کرنا گلو۔"

اور گلو وہاں سے سیدھا اس نکڑ پر پہنچ گیا جہاں قادر داد ٹھیلا لگایا کرتا تھا۔ وہ حسب توقع وہاں موجود تھا۔ گلو کو آتا دیکھ کر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے جنہیں دیکھ کر گلو مسکرا اٹھا۔

"ہاں.......... کیوں آیا ہے یہاں؟ پیسے چاہئے ہوں گے؟" اس نے غصے میں پوچھا۔

"تجھے لینے آیا ہوں چاچا.......... تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' چل گھر چلتے ہیں۔"

"چل گھر چلتے ہیں۔" اس نے گلو کے سے انداز میں کہا۔ "ابے باؤلا ہو گیا ہے؟ گھر میں کھانے کو نہیں ہے اور تجھے اٹھکیلیاں سوجھ رہی ہیں۔ جا دفع ہو جا میرا دماغ خراب نہ کر۔" اس نے بھناتے ہوئے جواب دیا۔ وہ گلو کو ڈھٹائی سے مسکراتے دیکھ کر اور آپے سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ "ابے جاتا ہے یہاں سے یا لگاؤں ایک.........." وہ پھر چیخا۔

"چاچا! اب تو فکر کرنا چھوڑ دے۔ گھر میں کھانے کو نہیں ہے تو کیا ہوا' آج ہم ہوٹل پر کھا لیں گے' اور ہاں یہ ٹھیلا ویلا بیچ دے بس' اب تو کوئی کام نہیں کرے گا سمجھا! جب تک میں زندہ ہوں تجھے کچھ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چل.......... نا.........." گلو نے منہ پھاڑے' بت کی طرح ساکت کھڑے قادر داد کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"گلو.......... تو.......... ٹھیک تو ہے نا!" قادر داد اسے یوں ٹٹولنے لگا جیسے اس کے

جسم پر کہیں زخم آ گیا ہو۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"پھر تو بہکی بہکی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ جا تو گھر جا کر آرام کر' میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور ٹھیلے کے نیچے رکھی لکڑی کی پیٹی سے ٹاٹ کا کپڑا نکالنے لگا۔ یہ کپڑا وہ اپنے ٹھیلے پر باندھا کرتا تھا۔

"چل نا' چاچا! کہا تو ہے اسے بیچ دے' بلکہ چھوڑ.......... اسے یونہی چھوڑ دے' کسی کا بھلا ہو جائے گا۔"

"ابے چھوڑ میرا بازو' سالا بالکل پاگل ہو گیا ہے۔" اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا اور بڑبڑاتا ہوا ٹھیلے پر ٹاٹ چڑھانے لگا۔ گلو وہیں کھڑا مسکراتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا اس کی باتوں پر یقین نہیں کرے گا۔ جس نے کبھی ایک دمڑی بھی نہ کمائی ہو وہ اچانک ایک روز ایسی باتیں کرنے لگے تو ظاہر ہے کون یقین کرے گا۔

☆============☆============☆

قادر داد بار بار پلٹ کر گلو کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے گلو کی طرف سے تشویش ہو گئی تھی۔ اسے یہ تو یاد تھا کہ وہ صبح کسی کام سے جانے کا کہہ رہا تھا مگر یوں اچانک دو گھنٹوں میں جو تبدیلی گلو میں آئی تھی وہ ناقابلِ فہم تھی۔ وہ جلدی جلدی کام سے فارغ ہو کر' پان والے سے ٹھیلے کا خیال رکھنے کا کہہ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ گلو اس سے دو قدم پیچھے تھا۔ وہ باوجود کوشش کے اپنی معنی خیز مسکراہٹ پر قابو نہ پا سکا تھا۔

قادر داد نے واسکٹ کی جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور کواڑ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ "اب بول۔ کیا کہہ رہا تھا اور.......... کہاں گیا تھا تو' کیوں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ نشہ تو نہیں کیا تو نے.......... ادھر آ منہ سنگھا۔" وہ اندر داخل ہوتے ہی پھٹ پڑا۔

"چاچا!" گلو نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اسے لئے آنگن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ "میں نے صبح کہا تھا نا کہ میں کام سے جا رہا ہوں۔ میں واقعی کام سے گیا تھا' چاچا.......... اور مجھے کام بھی مل گیا۔ یہ دیکھ پہلی تنخواہ.........." یہ کہہ کر گلو نے جیب سے پانچ سو کا کڑکڑاتا ہوا نوٹ نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ .... یہ ...." اس نے حیرت سے نوٹ کو دیکھا۔ "گلو یہ کہاں سے آیا؟ کام سے پہلی سے دہاڑی کب ملتی ہے بٹوا' دیکھ گلو! تو بہت معصوم ہے اور یہ دنیا بہت خراب .... تو میرا واحد سہارا ہے گلو' میں تیرے ہی لئے زندہ ہوں' تجھے کچھ نہیں ہونا چاہیے ...." وہ ایک دم جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلو کا چہرہ تھام لیا۔

گلو اسے دیکھ کر حیران تھا اور جب اس کی بوڑھی آنکھوں کے کنارے گدلے پانی سے بھر گئے تو وہ بے اختیار اس سے لپٹ گیا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے چاچا کا پیار دیکھا تھا ورنہ اب تک اسے اس کی جھڑکیاں یا گالیاں ہی یاد تھیں' ہزار بار قادر دادنے سے کوسا تھا' بددعائیں دی تھیں۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا چاچا!" اس نے رندھے ہوئے گلے سے جواب دیا۔ "تیرا بیٹا اتنا بے وقوف نہیں ہے' جتنا تو سمجھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ دنیا بہت خراب ہے' مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر دنیا سے دب گیا تو لوگ مجھے ٹھوکروں اور چٹکیوں میں اڑا دیں گے۔ مجھے ان لوگوں سے اپنا حق لینا ہے چاچا۔ اس دنیا میں بکھری دولت میں میرا بھی حصہ ہے' میں اپنا حصہ وصول کرنا جانتا ہوں لیکن میں کوئی برا کام نہیں کروں گا۔ مجھے صرف گاڑی چلانا ہے۔ ڈرائیور بنوں گا میں تو' کیا گاڑی چلانا محنت نہیں ہے؟ وہ بھی کراچی کی زہریلی سڑکوں پر جو روز کسی نہ کسی کو ڈس لیتی ہیں۔ بول کیا یہ برا کام ہے' گناہ ہے' جرم ہے؟"

"نہیں .... نہیں تو' یہ کوئی گناہ نہیں بٹوا' کوئی جرم نہیں مگر ...."

"پھر تو کیوں گھبرا گیا ہے؟"

"پر گلو! تجھے گاڑی چلانا آتا ہی کب ہے؟"

"وہی تو سیکھوں گا' شاید کل سے۔"

"سیکھے گا ....؟ پھر .... یہ پیسے' یہ پگار کس بات کی ہے؟" اس نے پھر اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

"اوہ .... تو بہت وہمی ہے چاچا! میں نے جس سیٹھ کی نوکری کی ہے وہ .... وہ بڑا دل والا ہے' غریبوں سے محبت کرتا ہے' اس کو جب میرے بارے میں پتہ چلا تو اس

نے مجھے فوراً نوکری دے دی اور اپنے ڈرائیور سے کہہ دیا کہ اسے جلد از جلد گاڑی چلانا سکھا دے اور مجھے خرچے کے لئے پیسے بھی دے دیئے۔ میں جو گاڑی چلانا سیکھوں گا' یہ بھی تو اسی کا کام ہوا ناں!"

"بات میری کھوپڑی میں نہیں گھس رہی گلو .... کون ہے تیرا سیٹھ؟"

"وہ .... ہے ایک سیٹھ .... ایک مل کا مالک ہے .... رحمان نام ہے اس کا۔" گلو صاف جھوٹ بول گیا۔ اسے معلوم تھا کہ چاچا استاد فتح سے نہ صرف یہ کہ واقف ہے بلکہ اسے موقع مل جائے تو اسے گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ سخت نفرت تھی اسے استاد فتح سے' اس نفرت کی وجہ تو گلو کو آج تک معلوم نہ ہو سکی البتہ اس کا خیال تھا کہ چاچا اس کے کرتوتوں سے واقف ہے۔ وہ بنگلے میں جانے سے پہلے اسی محلے میں رہتا تھا۔ چاچا کے سامنے ہی جوان ہوا تھا۔ محلے کا دادا بھی اس کے سامنے ہی بنا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اسے چور اچکا اور بدمعاش ہی سمجھتا رہا تھا۔ اس لئے گلو جانتا تھا کہ چاچا کو اگر بھنک بھی مل گئی کہ وہ استاد فتح کے پاس ملازم ہو گیا ہے تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔

"چل مجھے دکھا اپنے سیٹھ کو ...." وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

"دیکھ چاچا اب تو ایسی باتیں کر رہا ہے کہ پھر مجھے غصہ آ جائے۔ تو چاہتا ہے کہ میں زندگی بھر کچھ نہ کماؤں؟"

"یہ بات نہیں ہے گلو مگر یار تو میری ساری زندگی کی کمائی ہے' میں تجھے کھونا نہیں چاہتا۔" وہ زچ ہو کر بولا۔

"سارے وہم ہیں تیرے' انہیں نکال دے .... بس اب تو آرام کیا کر' کھانا وانا سب ہوٹل سے آ جایا کرے گا۔ تجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"میرا دل نہیں مان رہا گلو۔ مجھے خطرے کی بو آ رہی ہے۔"

"اُفوہ .... اب اگر تو نے ایسی باتیں کیں تو .... تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا یا .... یا پھر خودکشی کر لوں گا۔" وہ جھنجلا گیا۔

"ٹھیک ہے مگر .... ٹھیلا تو میں لگاؤں گا۔"

"کیوں .... اب کیا ضرورت ہے ٹھیلا لگانے کی؟ پانچ سو روپے کم ہیں کیا اور پھر جب میں پکا ڈرائیور بن جاؤں گا تو تنخواہ اور بھی بڑھ جائے گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ تو ٹھیک ہے پر............ میں سارا دن اور ساری رات ایک چارپائی پر لاش کی طرح تو نہیں پڑا رہ سکتا' کچھ نہ کچھ تو کرنا ہو گا مجھے۔"

"ٹھیک ہے' ایک کام ہو سکتا ہے۔ تُو کچھ دنوں تک صبر کر لے' مہینے دو مہینے میں تجھے پرچون کی دکان کھلوا دوں گا پھر تیرا جی بھی لگا رہے گا اور............ اور میری بے عزتی بھی نہیں ہو گی۔"

"بے عزتی............! پھرکتے پن پہ اتر آیا تُو! سالے عزت کی روٹی مل رہی تھی تجھے ٹھیلے سے اور اسی سے تیری بے عزتی ہو رہی تھی۔" وہ اچانک بپھر گیا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا چاچا!" گلو ایک دم گھبرا گیا۔ "لوگ مجھے طعنے دیتے تھے نا کہ بوڑھا چاچا کماتا ہے اور تُو بیٹھ کر کھاتا ہے............ یہ مطلب تھا میرا' یہ سب سننا بے عزتی کی بات نہیں تھی کیا؟" اس نے فوراً بات بنائی۔

"ہاں............ میری محنت کو کچھ مت کہنا سالے ساری زندگی گنوادی عزت کی خاطر' تیرے ایسے سیٹھ مجھے بھی بہت ملے تھے' بڑے کڑکڑاتے نوٹ دکھایا کرتے تھے مجھے بھی مگر............ کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا' عزت غیرت اور ضمیر کبھی داؤ پر نہیں لگایا تھا میں نے۔ اور سن لے گلو! یہ تین چیزیں اگر نہ ہوں تو آدمی کتا بن جاتا ہے' چاہے وہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو۔ سمجھا!"

اور جانے گلو کیوں کانپ اٹھا۔ اسے استاد فتح کے الفاظ یاد آ گئے تھے کہ میرے ہاں عزت اور ضمیر نام کی دونوں چیزیں نہیں ہیں' میں ان دونوں کو کاروبار سے الگ رکھتا ہوں۔

"سن گلو! آدمی دو روٹی کمانے جتنی محنت کر کے کھا لے تو اسے بڑی سکون کی نیند آتی ہے' صرف اس لئے کہ اس کا ضمیر جاگ رہا ہوتا ہے اور اگر ضمیر سو جائے تو آدمی کی نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ تُو محنت کر کے چاہے کتنا بھی کما لے مگر کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے تیرے ضمیر پر آنچ آتی ہو۔ اپنی عزت اور غیرت کا سودا بھی نہ کرنا۔ بس مجھے یقین ہو جائے کہ تُو ایسا ہی کرے گا تو یقین جان میں پھر کبھی تجھ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔"

"اچھا ابھی تُو تھکا نہیں! صبح سے ٹھیلے پر کھڑا تھا اور اب گھنٹہ بھر سے بولے جا رہا ہے۔"

قادر داد نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ "پانی پلا مجھے اور............ کچھ کھانے کا بندوبست کر۔ تُو کچھ کھائے پیئے بغیر چلا گیا تھا اس لئے میں بھی بھوکا ہی چلا گیا تھا۔"

گلو نے پانی کا کٹورا بھر کر اسے دیا اور پیالہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

کچھ دیر بعد وہ ہوٹل سے کھانا لے آیا۔ آج برسوں بعد اس نے چاچا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ قادرداد اس کی طرف سے اب بھی مشکوک تھا۔ وہ مسلسل اسے نصیحتیں کر رہا تھا۔ گلو خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ چاچا کو خاموش کرانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ کھانا کھا کر قادر داد بھی جانے کو کھڑا ہو گیا۔ گلو اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"کہاں جا رہا ہے؟"

"اپنے دھندے پر............ تُو مجھ سے بکواس نہ کرنا' سمجھا۔" اس نے ہاتھ دھوتے ہوئے کہا۔

"مگر چاچا!............ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ پورا مہینہ آرام سے گزر جائے گا۔ تُو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔"

"گھر میں بیٹھ کر تیرے بچے کھلاؤں گا کیا؟"

"چاچا دیکھ............"

"بس کر گلو' میں ایک زندہ آدمی ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا اور زندگی سے میرا تعلق ختم ہو گیا ہے۔ تُو مجھے ان دیواروں میں قید کرنا چاہتا ہے جہاں نہ کوئی آواز ہے نہ حرکت۔ کوئی بھی ایسا نہیں جس سے میں باتیں کر سکوں۔ تُو مجھے مردہ سمجھتا ہے کیا؟ ہاں اگر تُو چاہتا ہے کہ میں واقعی گھر میں بیٹھ جاؤں تو............ تو اس چاردیواری کو گھر تو بنا............ جہاں کوئی مجھ سے باتیں کرنے والا ہو' میری خدمت کرنے والا ہو۔ آنگن میں رونق ہو تو گھر میں ٹکنے کو جی بھی کرے گا' ورنہ میں یہاں گونگا بہرہ بن کر نہیں پڑوں گا۔"

قادر داد نے کہا تو اس کے لہجے میں ناراضگی بھی تھی اور نرمی بھی۔ گلو خوب سمجھ رہا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے' اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ قادر داد ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے چند لمحے سوچا پھر قادر داد کو دیکھنے لگا جو کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا چاہتا ہے تو؟"

"اب تو تُو کمانے لگا ہے نا۔ میں چاہتا ہوں حمیدہ سے بات کر لوں۔" اس نے پُرامید نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے مگر ایسے حلئے میں جائے گا تو؟ اب تو تُو کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ.........."

"بس بس۔ مجھے اپنی اوقعات میں رہنے دے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر گلو کی بات کاٹ دی۔

"نہیں چاچا.......... یہ میری شرط ہے' تُو نئے کپڑے پہن کر جائے گا۔ تو سمجھا کر چاچا! یہ تیرا زمانہ نہیں ہے' اب آدمی کا ظاہری روپ دیکھ کر لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور پھر تُو تو لڑکے کا باپ ہے نا! ذرا شان بڑھا کر جانا' میں آج تیرے لئے نئے کپڑے لے آؤں گا۔" گلو نے کہا۔

اس وقت قادر داد کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ پہلی بار اس کے بیٹے نے اسے کچھ لا کر دینے کا کہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں ایک انجانی سی خوشی جھلک رہی تھی۔ بوڑھی اور گدلی آنکھیں یکایک چمک اٹھی تھیں۔

"ٹھیک ہے گلو مگر تو بھی میرے ساتھ چلے گا۔"

"دیکھوں گا۔" گلو نے بڑی بے نیازی سے کہا اور جیب سے روپے نکال کر قادر داد کی طرف بڑھا دیئے۔ "لے یہ اپنے بیٹے کی پہلی کمائی۔"

"دیکھ گلو! یہ میں لے تو رہا ہوں مگر.........." اس نے ہاتھ بڑھا کر نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا؟"

"محنت کر کے اسے حلال کر لینا' حرام کی کمائی کھانے کی عادت نہیں ہے مجھے۔" اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر دکھائی دینے والی خوشی یک لخت کہیں غائب ہو گئی تھی۔

"او چاچا.........." وہ جھنجلا گیا۔

"گلو محنت کی کمائی میں ایک عجیب سا نشہ ہوتا ہے' آدمی اپنے آپ کو بہت طاقتور

سمجھنے لگتا ہے' دیکھ لینا تو' جب تو محنت کرنے لگے گا نا تو تیرے بازوؤں میں بجلی سی بھر جائے گی۔" اس نے پیار سے گلو کے بازوؤں کی مچھلیوں پر ہاتھ پھیرا۔ گلو پھول کر کپا ہو گیا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ اس نے پہلی بار اس کے بھرے بھرے بازوؤں کی تعریف کی تھی' ورنہ ہمیشہ گینڈا کہہ کر طنز ہی کیا تھا۔ "اچھا اب تو جا' میں بھی جا رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر قادر داد نے گلو کی طرف دیکھا جو غصے سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

"ارے چھوڑ دوں گا دھندا بھی.......... مجھے یقین تو آ جانے دے۔" اس نے پھر پیار سے گلو کا کاندھا تھپتھپایا اور پھر وہ گلو کا جواب سنے بغیر جلدی سے باہر نکل گیا۔

☆===========☆===========☆

گلو نے منہ ہاتھ دھویا اور دروازے پر تالا ڈال کر حمیدہ کی طرف چل پڑا۔ دروازے کی چابی ایک ہی تھی۔ قادر داد تو صبح سویرے ہی نکل جاتا تھا اور گلو ہمیشہ اس وقت اٹھتا جب سورج کی جلتی کرنیں کچا آنگن عبور کر کے برآمدے تک آ جاتیں' کرنوں کی تپش اس کے تلوے جلا دیتی تو وہ کسمسا کر اٹھ بیٹھتا۔ ایسے میں اسے تالا ڈال کر چابی خالہ حمیدہ کو ہی دینا پڑتی تھی' قادر داد دوپہر میں کھانا کھانے گھر آتا تو گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کر لیا کرتا تھا' پھر جاتے ہوئے چابی ساتھ ہی لے جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گلو تو گھر سے نکل کر بھول ہی جاتا ہے کہ اس کا کوئی گھر بھی ہے' جب کمر چٹخنے لگتی۔ سنسان گلیاں اسے خوفزدہ کرنے لگتیں یا دوست یار انگڑائیاں لینے لگتے تب وہ گھر لوٹتا تھا۔

خالہ حمیدہ کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ وہ اندر جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔ اسے یاد آ گیا کہ چاچا نے بتایا تھا' نازاں آئی ہوئی ہے' اگر یہ خیال نہ آتا تو وہ ہمیشہ کی طرح بے دھڑک اندر گھس گیا ہوتا۔ اس نے پردے میں ہاتھ ڈال کر کواڑ کی کنڈی بجائی۔

"جا نازاں دیکھ کون ہے!.........." اندر سے خالہ حمیدہ کی کھڑکھڑاتی ہوئی آواز آئی۔ یہ آواز گلو کو بچپن سے ناپسند تھی۔ اس لئے کہ خالہ حمیدہ ہمیشہ اسے طعنے تشنے دیتی رہتی تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ نازاں کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوا تھا۔ نہ معلوم کیوں یہ خیال اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ نازاں خالہ حمیدہ جیسی ہی ہو گی۔ لمبی چوڑی' بڑے بڑے ہاتھ پاؤں اور کرخت' کھڑکھڑاتی ہوئی آواز والی۔ اس نے نازاں کو دیکھا تو تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر اتنی چھوٹی عمر میں کہ اسے ٹھیک سے نہ اس کی صورت شکل یاد تھی اور نہ ہی اس کی آواز۔

"کون ہے جی؟" فاختہ کے پروں جیسی نرم سی آواز اسے ہلکے سے چھو کر گدگدا گئی۔

لمحہ بھر کو گلو بھونچکا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ آواز نازاں کی ہے۔ "میں۔ گلو!" اس نے تھوک نگل کر جواب دیا۔ معاً اس کی نظر ٹاٹ کے پردے پر پھسلنے لگی اور نیچے وہاں جا کر تھم گئی جہاں دو گورے گورے ننگے پاؤں نظر آ رہے تھے۔ پیروں میں پڑی چاندی کی پائل کے گھنگھرو اس کی چکنی کھال پر پھسل کر دھیمی جھنکار پیدا کر رہے تھے۔

"اماں! گلو ہے۔" وہ نرم سی' میٹھی سی آواز دوبارہ گونجی۔

"آ جا گلو۔" خالہ کی کرخت آواز نے گلو کو چونکا دیا۔ اسی لمحے پائل زور سے بولی اور پیر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

وہ دھیرے سے پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا۔ نارنجی رنگ کی چھینٹ کی بڑی سی چادر میں لپٹی نازاں ایک طرف کھڑی تھی۔ گلو کا دل چاہا کہ وہ اسے دیکھے مگر سامنے ہی خالہ حمیدہ بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ وہ سیدھا نگاہیں جھکائے خالہ کے قریب جا بیٹھا۔

"ہاں گلو چاچا تو تیرا ٹھیک ہے نا؟" اس نے ململ کے میلے دوپٹے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ "اور آج دن میں تیری صورت کیسے نظر آ رہی ہے؟"

"نہیں خالہ! چاچا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تجھے چابی دینے آیا تھا۔ پیاس لگی ہے۔" جانے کیوں اس کا حلق خشک ہو گیا۔

"نازاں..........! پانی دے گلو کو!"

اور تبھی پائل ایک بار پھر بول اٹھی۔ گلو نے چپکے سے نگاہ اٹھا کر مٹکے کے قریب کھڑی نازاں کو دیکھا اور دل نے ہزاروں قسمیں کھا ڈالیں کہ یہ وہ نازاں نہیں جسے اس نے کبھی بچپن میں دیکھا تھا۔ اسے میلی کچیلی اور منہ بسورتی ہوئی نازاں یاد تھی جس کا رنگ تانبے جیسا تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی نازاں تھی۔ گلابی گلابی سی' ریشم کی بنی ہوئی گڑیا ایسی۔ آنکھوں کی جگہ جیسے دیئے سے روشن تھے' اس نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ وہ پانی کا کٹورا لئے اس کے قریب آئی تو وہ اندر سے پورا خشک ہو کر جیسے تڑخنے سا لگا تھا۔

"لے.........." نازاں نے جھٹکے سے کٹورا آگے بڑھایا تو پانی چھلک کر گلو کے کپڑوں پر آ گرا۔ ساتھ ہی نازاں کی ہنسی گونج اٹھی۔ گلو کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہنسی کی آواز تھی یا پائل کی۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا اور کٹورا لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی حلق میں انڈیلتے ہوئے اس کی نگاہیں نازاں کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں۔ عجیب کھلکھلاتی سی آنکھیں تھیں۔ گدگداتی ہوئی.......... چھیڑتی ہوئی سی۔

"اری او.......... باؤلی.......... کوئی کام سنبھل کے نہیں ہوتا تجھ سے!" خالہ حمیدہ نے اپنی کرخت آواز میں اسے ڈانٹا تو وہ نارنجی چادر کے کونے میں منہ دبا کر ہنسی روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میں چلتا ہوں خالہ! کام سے جانا ہے مجھے۔" وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے تجھے کون سی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ بیٹھ چائے پی کر جانا۔"

خالہ کا پہلا جملہ گلو کو سلگا گیا۔ وہ اب بھی طنز کرنے سے باز نہیں آئی تھی۔

"نہیں خالہ! مجھے کام پر پہنچنا ہے۔ دیر ہو گئی تو صاب ناراض ہو گا۔" گلو نے جان بوجھ کر کہا۔ وہ خالہ حمیدہ کو جتانا چاہتا تھا کہ وہ اب کمانے لگا ہے۔

"ایں.......... کون صاب ہو گا؟ محلے کے لونڈے لپاڑیئے انتظار کر رہے ہوں گے۔" اس نے روٹی کو توے سے اتارتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں خالہ اب میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ.......... اب میں کام کرتا ہوں' سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تو بھلا لپاڑیوں سے ملنے کا وقت کہاں سے لاؤں گا۔"

اب خالہ حمیدہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ "تو.......... کام کرنے لگا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

اور تبھی گلو نے اسے بتا دیا کہ وہ ڈرائیور بن گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ صاب کی لمبی سے چمکیلی کار کو بالکل ہوائی جہاز کی طرح اڑاتا پھرتا ہے اور نوکری کئے اسے کافی دن گزر چکے ہیں۔ خالہ حیرت سے یہ سب سن رہی تھی۔

"مگر کل ہی تو قادر داد آیا تھا۔ اس نے تو کوئی ذکر نہ کیا۔"

"ہاں خالہ! میں نے ہی چاچا کو نہیں بتایا تھا۔ سوچا تھا پہلی تنخواہ ملے گی تب بتاؤں گا اور آج جب تنخواہ مل گئی تو میں نے اس کو بتا دیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خالہ حمیدہ نے فوراً ہی چائے کی دیگچی چولہے پر چڑھا دی۔ "اب تو تو چائے پی کر ہی جانا۔ جب سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تو بھلا یہاں روز روز آنے کی فرصت کر ملے گی۔" اتنا کہہ کر وہ نازاں سے مخاطب ہوئی۔ "چل نازاں! تو چائے بنا دے۔" نازاں پھر چھن چھناتی ہوئی اٹھی اور چولہے کے پاس جا بیٹھی۔ اور گلو کو یوں لگا جیسے چولہے میں دھیمے دھیمے سلگتی لکڑیاں بھلبھلا کر جل اٹھی ہوں۔ شعلے اسے اندر تک تپا گئے۔

جتنی دیر گلو چائے پیتا رہا اتنی ہی دیر وہ جھوٹے سچے قصے بھی سناتا رہا۔ سارے قصوں کی تان اس کی نوکری پر ٹوٹتی تھی۔ وہ جب خالہ حمیدہ کے پاس سے لوٹا تو خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی پرندہ ہو جو صرف ہواؤں میں اڑتا ہو۔ وہ اپنے پچھلے تمام خیالات اور نظریات پر لعنت بھیج چکا تھا۔ اب تو گھر سے باہر بھی اسے گھر کی ویرانی کھلنے لگی تھی۔ چاچا کی تنہائی کا بھی شدت سے احساس ہو رہا تھا' وہ بے ارادہ قادر داد کے ٹھیلے کے قریب پہنچ گیا۔

"تو...........؟" قادر داد اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔

"وہ........... چاچا!..........." وہ بوکھلا گیا۔ اسی لمحے اس نے ہاتھ جیب میں ڈالا تو انگلیاں چابی سے ٹکرا گئیں۔ "وہ میں........... خالہ کو چابی دینا بھول گیا تھا اس لیے.........
یہ لے چابی۔" اس نے جلدی سے چابیاں قادر داد کی طرف بڑھا دیں۔

قادر داد اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی بات تھی جیسے کچھ چھپا رہا ہو........... جلدی جلدی پلکیں جھپکتا' اِدھر اُدھر دیکھتا گلو اس کے ہاتھ پر چابیاں رکھ کر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

☆===========☆===========☆

گلو نے سوچا تھا آج خوب عیش کرے گا۔ بازار جائے گا' چاچا کے لئے کپڑے خریدے گا۔ اکیلا بیٹھ کر ہوٹل میں اچھی سی چائے پیئے گا مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ تمام دن گلی کے نکڑ کی پلیا پر بیٹھ کر خالہ حمیدہ کے دروازے کو دیکھتا رہا۔ اسے دروازے پر پڑے ٹاٹ کا پردہ بھی نارنجی رنگ کا دکھائی دیتا رہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج ہی چاچا سے بات کرے گا۔ کہے گا کہ گھر بہت ویران لگتا ہے۔ شام ڈھلے اسے جان محمد کے پاس بھی جانا تھا مگر جی ہی نہ چاہا۔ بس وہیں بیٹھا رہا اور دور ہی سے قادر داد کی کھانسی کی آواز نے

سے چونکا دیا۔

"تو...........! ابے کیا ہو گیا ہے آج...........؟ دن میں تیرا چہرہ دو دفعہ دیکھنے کو ملا اور اب اتی جلدی گھر چلا آیا۔" قادر داد نے ٹھٹک کر کہا۔

"کیوں........... اب تجھے اس پر بھی اعتراض ہے کیا؟ چاچا تیرا کوئی دین ایمان بھی ہے کہ نہیں۔ دیر سے آنے پر بھی انگارہ بنا رہتا تھا اور اب جلدی آنے پر بھی ناراض ہے۔" اس نے منہ بنایا۔

"مجھے تو قربِ قیامت کی نشانیاں نظر آ رہی ہیں۔" چاچا بڑبڑایا۔ "کچھ ہونے والا لگتا ہے گلو! ضرور کچھ ہونے والا ہے۔" اس کی بڑبڑاہٹ بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی اس کی آواز گلو کو آ تو رہی تھی مگر یوں جیسے گھنگھرو سے چھنک رہے ہوں۔ وہ چاچا سے دو قدم پیچھے تھا مگر اب یہ فاصلہ اس سے دس قدم کا ہو چکا تھا۔

ٹاٹ کا پردہ پیچھے رہ گیا تھا۔ استاد فتح کی مونچھیں جو ہر وقت اس کی آنکھوں میں لٹکتی رہتی تھیں' اب ان کی جگہ بڑے بڑے نارنجی پھول لہرا رہے تھے۔ چھچھاتی کار کی بلکہ پائل کے گھنگھرو چاروں طرف بکھرے نظر آ رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر میں گھر پہنچے۔ اسے تو رات کے لئے کچھ کھانے کا خیال بھی نہ رہا تھا۔

"جا دہی لے آ۔" وہ چونکا اس وقت جب چاچا نے تام چینی کا جھڑا ہوا کٹورا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "دو روٹیاں دن کی بچی ہوئی ہیں' دو اور لیتے آئیو۔"

"چاچا!" وہ دھیرے سے بولا۔

"ہاں! اب کیا ہے! اور یہ بتا یہ تیرے منہ میں شہد کب سے گھل گیا؟"

"کون سا شہد؟" وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھ کر بولا۔

"ابے یہ انسانوں کی طرح بولنا کب سے سیکھ لیا؟" چاچا نے دھوتی کستے ہوئے کہا۔

"دیکھ چاچا! مجھے کڑوا کرنے میں تیرا ہی ہاتھ ہے۔ میں جانوروں کی طرح بولتا ہوا تو پیدا نہیں ہوا تھا۔" وہ جل گیا۔

"اچھا اچھا جا۔ بھوک سے پیٹ میں گولے اٹھ رہے ہیں۔" اس نے کھڑے کھڑے بالٹی سے پانی نکال کر کلی کی اور پچکاری مارتے ہوئے بولا' ساتھ ہی قمیض اتار کر آنگن میں بندھی رسی پر ڈال دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے ٹھٹک گیا۔ چاچا کی ساری پسلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ چاچا بہت زیادہ کمزور ہو گیا ہے۔ یوں ہی پتلی دال اور پیاز روٹی کھاتا رہا تو بہت جلد مرجائے گا۔ اس نے فوراً ہی تام چینی کا کٹورا گھڑونچی پر رکھ دیا اور لپک کر چاچا کا سوکھا سا بازو تھام لیا۔

"ابے کیا ہے؟" چاچا یوں پلٹا جیسے اسے پھاڑ کھائے گا۔

اس کا انداز ایسا تھا کہ گلو کا جی چاہا گھڑونچی کو لات مار کر گھر سے نکل جائے اور اسی وقت گھر میں قدم رکھے جب چاچا سو چکا ہو مگر نہ معلوم کیوں جان محمد کا جملہ اس کے کانوں میں گونج اٹھا کہ اگر اسی طرح خود کو سنبھالتا رہا تو جلد ترقی کرے گا۔ وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ چاچا کے اندر بھرا زہر ویسے بھی منٹوں میں ختم ہونے سے تو رہا۔ ضروری نہیں کہ جتنی جلد اس میں تبدیلی آئی تھی اتنی ہی جلدی چاچا بھی بدل جاتا۔ ویسے گلو کو لگ رہا تھا جیسے چاچا آج کچھ زیادہ ہی چھالا بنا ہوا ہے۔ اس کے کچھ کہتے یا چھوتے ہی پھٹ پڑتا ہے۔

"ابے میں پوچھ رہا ہوں اب کیا ہے؟" وہ پھر دھاڑا۔

"چاچا............ تو بہت کمزور ہو چکا ہے۔" اس نے اس کی پسلیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

چاچا جو اپنی سوکھی ہوئی پسلیوں کو آگے کی طرف نکالے اور کندھے اچکائے کھڑا تھا ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ "ابے اگر تو اور کچھ دیر روٹی نہ لایا تو کھڑے کھڑے آدھا ہو جاؤں گا۔ میں ہمیشہ سے ایسا تھا' آج تیری آنکھیں دیکھنے کے قابل ہو گئی ہیں شاید۔ اسی لئے تجھے ہر جگہ میں ہی میں نظر آ رہا ہوں۔ دیکھو گلو! مجھے صاف صاف سب کچھ بتا دے ورنہ............"

"چل تو قمیض پہن۔ ہم ہوٹل میں جا کر کھانا کھائیں گے۔" گلو نے سنی ان سنی کر دی۔

"کیوں؟" چاچا نے نتھنے پھلائے۔

"تجھے بھوک لگی ہے ناں؟" گلو نے گلے میں مفلر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ابے یہ تو اتنی گرمی میں مفلر کیوں لپیٹ رہا ہے؟" چاچا نے قمیض کو ہوا میں جھٹکتے ہوئے کہا۔

"یہ مفلر نہیں فیشن ہے۔" گلو کو غصہ آ گیا۔

"اچھا............" چاچا نے اچھا کو کھینچتے ہوئے کہا۔ "اب تو فیشن بھی کرے گا؟"

گلو کا جی چاہا کہ اپنا سر دیوار سے دے مارے مگر جانتا تھا کہ چاچا اس وقت باؤلا ہو رہا ہے۔ اس کے سارے جذبات کو تیل کرنے کے چکر میں ہے اس لئے چپ رہا اور جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے نکڑ پر بنے ہوئے ہوٹل میں جا بیٹھے۔

وہاں کام کرنے والا بابو چودہ پندرہ برس کا چھوکرا۔ چاچا کو بے حد پسند تھا۔ اکثر وہ گلو کو اس چھوکرے کی مثالیں بھی دیا کرتا تھا اور آخر میں یہ ضرور کہتا تھا کہ کاش وہ بھی کسی ایسے ہی چھوکرے کا باپ یا چاچا ہوتا' شاید اسی وجہ سے گلو کے دل میں اس کی نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ اس سے جلتا تھا۔ شاذونادر ہی اس ہوٹل میں آتا تھا مگر آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ آج تو وہ اس چھوکرے سے کہیں آگے تھا۔ اس کی کمائی کے دو سو روپے چاچا کی تہمند میں اڑسے ہوئے تھے اور تین سو اس کی جیب میں تھے۔ آج اسے پوری دُنیا بڑی صاف صاف نظر آ رہی تھی۔ تیز دھوپ اور سخت گرمی کے باوجود موسم بے حد خوش گوار لگ رہا تھا۔ چاچا کی کڑوی کسیلی باتیں شہد ایسی اور تیز چبھتی ہوئی نگاہیں' پیار بھری شفیق نگاہیں محسوس ہو رہی تھیں۔

بابو انہیں دیکھ کر لپک کر آیا۔ "کیسے ہو چاچا؟" اس نے کندھے پر پڑی ہوئے کپڑے سے ٹیبل صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا ہوں۔" چاچا نے جھٹکے سے جواب دیا۔ "اور سن! ایک بگھاری دال اور دو چپاتیاں لے آ۔ تڑکا گہرا لگائیو۔"

"چاچا کیوں؟" گلو جو چاروں طرف دیکھ رہا تھا چونک پڑا۔ "یہ ایک دال اور دو چپاتیاں کیوں منگا رہا ہے۔ مرغی منگا مرغی۔"

"تجھے مرغی کھانی ہے' تو منگا لے۔ میں اتی سی دیر میں اپنی اوقات نہیں بھولتا۔"

"چاچا............ تو کبھی نہیں بدلے گا۔ ساری عمر غریب کا غریب ہی رہے گا۔ پیسہ ہو گا تو بھی سالا غریب ہی رہے گا۔" آخری جملہ اس نے منہ میں کہا تھا ورنہ اتنے جوتے پڑتے کہ ساری امیری نکل جاتی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بابو حیرت سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ "چاچا جلدی بول! تجھے تو پتہ ہے ناں کہ ایک منٹ کی فرصت نہیں ملتی۔" بابو نے گردن اکڑا کر کہا۔ "ابھی سالا سیٹھ آواز دے لے گا۔ دیر ہوگئی تو روٹی بند۔"

"تو کیوں کھڑا ہے؟" چاچا نے پلٹ کر کہا۔ "جا روٹی لے آ۔"

اور گلو نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ بھوک تو دال روٹی کا سنتے ہی غائب ہوگئی تھی اور اس کے سامنے بیٹھ کر اکیلا مرغی کھانا شرم کی بات تھی۔ گلو جانتا تھا کہ ایک دفعہ چاچا نے منع کر دیا ہو تو قیامت تک کوئی اسے مرغی کھانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ بابو بہت ہی پھرتیلا تھا۔ چند ہی منٹوں میں اس نے بگھاری دال کی پلیٹ اور دو چپاتیاں میز پر لا کر رکھ دیں اور تین پلیٹ سبزی اور آٹھ روٹیوں کی آواز لگاتا ہوا چلا گیا۔

چاچا نوالہ لیتے لیتے رک گیا۔ سر اٹھا کر گلو کو دیکھا۔ "کیوں تو روٹی نہیں کھائے گا؟"

"نہیں.......... مجھے بھوک نہیں ہے۔" گلو نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اوقعات میں رہا کر اوقعات میں۔" چاچا نے پھر کہا۔ اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔ "دیکھ گلو! یہ دال ہم غریبوں کے لہو میں شامل ہے۔ ممکن ہے تیرے ماں باپ امیر رہے ہوں مگر میں غریب آدمی ہوں۔"

"بس کر چاچا۔" وہ ایک دم چیخ پڑا تھا۔ یہی تو دنیا کا واحد موضوع تھا جس سے اسے بے پناہ نفرت تھی۔ "میرے ماں باپ کا ذکر نہ کیا کر۔"

اس نے یوں گھٹے گھٹے انداز میں جھک کر کہا جیسے یہ بات چھپانا چاہتا ہو کہ اس کی اس دنیا میں موجودگی کا سبب اس کے ماں باپ ہیں۔ اگر چاچا نے روٹی کھالی ہوتی تو وہ اب یہاں ایک لمحہ بھی نہ رکتا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ اٹھ گیا تو چاچا پھر بھوکا رہ جائے گا۔ وہ چاچا سے جتنی محبت کرتا تھا' اس سے تو خود چاچا بھی واقف نہیں تھا۔ اسے اس بڈھے کڑوے کسیلے اور ہر وقت گالیاں بکتے رہنے والے چاچا کی اس قدر محبت بے وجہ نہیں تھی۔ وہ کبھی بھول ہی نہیں سکتا تھا کہ اس لاوارث کو پناہ دینے والا یہی کڑوا کسیلا بڈھا تھا اور اس وقت وہ اتنا کڑوا بھی نہیں تھا۔ اتنا زہر تو اس میں زمانے نے بھر دیا تھا۔ وہ چاچا کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے اندر ایک بے پناہ شور تھا۔ اسے غصہ آ رہا تھا کہ چاچا نے

اس کے ماں باپ کا ذکر ہی کیوں کیا جبکہ ایک برس پہلے وہ کہہ چکا تھا کہ ان کا ذکر کسی بھی انداز میں نہ کیا جائے اور اس کے ماں باپ تھے بھی کہاں؟

☆============☆============☆

چاچا کو اپنی غلطی کا احساس فوراً ہی ہو گیا تھا۔ وہ جلدی سے سر جھکا کر روٹی کھانے لگا۔ ہر نوالے کے بعد اس کی کھوجتی ہوئی آنکھیں گلو پر جم جاتیں۔ اب اسے رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ یہ غلطی اس سے ہوئی ہی کیوں؟ بھلا ضرورت ہی کیا تھی یہ ذکر نکالنے کی۔ سالے بڑھاپے نے عقل ہی گلا دی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اسے ڈر تھا کہ پچھلے برس کی طرح آج پھر گلو سارا دن اور پھر ساری رات اسی چبوترے پر گزار دے گا۔ پچھلے برس بھی وہ کتنی مشکل اسے واپس لے کر آیا تھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ گلو کو تیز بخار تھا۔ اسے تو ساری زندگی کچھ نہیں ہوا تھا۔ جب سے وہ اسے جنت کے گھر کے سامنے والے چبوترے سے لایا تھا' آج تک سردی' گرمی سی لو' برسات کسی کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ اس روز سارا دن اور پھر ساری رات کے بعد جب وہ ڈھونڈتا ہوا اس چبوترے پر پہنچا تھا تو اسے وہاں نڈھال پڑے دیکھ کر پہلے تو یہی سمجھا تھا کہ شاید اس نے نشہ کیا ہے جو یوں ہاتھ پیر ڈالے پڑا ہے مگر قریب جانے اور اسے چھونے کے بعد اسے کرنٹ لگا تھا۔ گلو کو تیز بخار تھا اور وہ بالکل بے ہوش پڑا تھا۔ کتنی مشکل سے اٹھا کر لایا تھا اسے۔ تبھی قسم کھائی تھی کہ اب اس کے ماں باپ کا ذکر نہیں کرے گا اور سال بھر تک اس نے کوئی ذکر کیا بھی نہیں تھا۔ اب یہ سالی زبان پھسل گئی۔ یادداشت چوپٹ ہو گئی.......... اس نے آخری نوالہ بغیر چبائے نگلتے ہوئے پانی کا پورا گلاس چڑھا لیا۔

"چل اٹھ۔" وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

"تو گھر جا۔ میں آتا ہوں۔" گلو نے بڑی بڑی دیگچیوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے سیٹھ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا پھر چاچا کی طرف دھیان دیئے بغیر ہی آگے بڑھ گیا۔ پیسے دے کر پلٹا تو چاچا ہونقوں کی طرح وہیں کھڑا تھا۔

"کہاں جا رہا ہے تو؟"

"کام سے جا رہا ہوں۔ تو گھر جا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"گلو! تو بھی گھر چل........... دیکھ آج تو تو اتنا خوش ہے' پہلی پگار ملی ہے تجھے۔ چل حمیدہ کے گھر چلتے ہیں۔ میں آج ہی اس سے تیرے لئے بات کرلوں گا۔" چاچا نے اسے منانے کے لئے کہا۔ لہجے میں ہروقت رچا زہر اس نے اپنے اندر ہی کہیں اتار لیا تھا اور بڑے میٹھے انداز میں بات کر رہا تھا۔

"نہیں چاچا........... ابھی کوئی بات نہ کرنا۔ ابھی........... میں سوچوں گا۔" گلو نے لحہ بھر اس کی طرف دیکھ کر نگاہیں دور خلا میں گاڑ دی تھیں پھر چونک اٹھا۔ "جا تو گھر جا کر آرام کر۔"

"تو کب آئے گا؟" چاچا خوفزدہ تھا۔

"جلدی آؤں گا۔" اچانک گلو کو اس پر پیار آگیا۔ وہ اس کی ساری کیفیت سمجھ رہا تھا۔ "تو فکر نہ کرنا' اور سن اب ٹھیلے پر جانے کی ضرورت نہیں۔ گھر جا کر آرام کرلے سمجھا؟"

اور چاچا نے یوں سرہلایا جیسے کوئی ننھا سا بچہ ہو اور پھر بھی اس کی بات سمجھ گیا ہو۔ وہ ایک بار گلو سے جلدی آنے کو کہنا چاہتا تھا مگر اس بار گلو رکا نہیں تھا۔ آڑھی ترچھی پڑی ہوئی چارپائیوں اور میزوں کے درمیان سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

☆============☆============☆

گلو کب اور کیسے وہاں تک پہنچا' اسے یاد نہیں۔ جب ہوش آیا تو وہ اس گھنے درخت کے نیچے بنے اونچے سے چبوترے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس چبوترے پر گزارے ہوئے سات برس اسے یوں یاد تھے جیسے کل ہی کی بات ہو حالانکہ وہ اتنی عمر نہیں ہوتی تھی مگر پھر جانے کیا بات تھی کہ ان گزرے برسوں کا لحہ لحہ اس کے دل پر نقش تھا۔ وہ چبوترے پر یوں لیٹ گیا جیسے ماں کی آغوش میں جالیٹا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور بند آنکھوں میں جیسے فلم چلنے لگی۔

اسے سیمنٹ کے اس چبوترے سے بے انتہا پیار تھا۔ شاید اس لئے کہ اس نے اسی چبوترے پر ہوش سنبھالا تھا۔ معلوم نہیں سخت سردیوں میں بھی چبوترے کا وہ حصہ اتنا گرم کیوں ہوتا تھا جہاں وہ لیٹ کر سوتا تھا۔ اس حصے کی سردی اور گرمی اسے ماں کی آغوش محسوس ہوتی تھی' مگر بھلا وہ کیا جانے کہ ماں کی آغوش کیا ہوتی ہے بس ایک عجیب

سا احساس تھا جو اسے گلیوں گلیوں کی خاک اڑانے کے بعد شام ڈھلتے ہی اسی چبوترے کی جانب کھینچے لے جاتا۔ جب وہ لب سڑک بیٹھی کسی بھکارن کے گندے اور لجلجے بچے کو اس کی میلی چھاتی سے لگا دیکھتا تو بے اختیار اس چبوترے کی طرف بھاگ پڑتا۔ جانے اسے یہ دھڑکا کیوں لگ جاتا کہ چبوترے کے اس حصے پر کسی نے قبضہ نہ کرلیا ہو۔ وہ سرپٹ اس جانب بھاگتا' اس کی پنڈلیاں اینٹھ جاتیں۔ تلوے کھنچنے لگتے پھر جب وہ سب اس کا وہم نکلتا تو وہ مزید نڈھال ہو جاتا۔ بہت تھک کر اس چبوترے پر بیٹھ جاتا اور اسے یوں گھورنے لگتا جیسے وہ اس کی توقعات پر پورا نہ اترا ہو۔ صرف ایک بار اس کا وہم حقیقت بنا تھا جب وہ بھوکا پیٹ اور حیران آنکھیں لئے اس بستی کے واحد بازار میں پھر رہا تھا۔ اسے ہمیشہ اس بازار میں کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ کھانے کو ضرور مل جاتا تھا مگر اس روز اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی اور وہ بیچ بازار میں تنہا کھڑا رہ گیا تھا۔ تمام لوگ یوں اچانک غائب ہو گئے تھے جیسے بارش کی تیز بوندوں میں گھل کر بہہ گئے ہوں۔

تب یہ احساس اس کے سارے وجود میں جھنجھنا اٹھا تھا کہ کسی نے اس کے چبوترے پر قبضہ کرلیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ بھوک پیاس سب کچھ بھول کر اس جانب بھاگ پڑا تھا۔ اس کی پنڈلیوں میں اینٹھن ہونے لگی تھی اور تلوے کھنچ کر تکلیف دینے لگے تھے پھر جب اس نے دور ہی سے چبوترے پر ایک گٹھڑی سی پڑی دیکھی تو سناٹے میں رہ گیا تھا۔ اس کی رفتار دھیمی ہو گئی تھی۔ اس کے قدم نپے تلے انداز میں اٹھنے لگے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا اور اس نے اپنی آواز کو بھاری بنانے کے لئے اپنے حلق کو پوری طرح پھیلا لیا تھا۔ زبان کو نیچے کو دبا کر بھنویں اچکالی تھیں۔ یہ سب کرنے کے بعد اسے خود اپنا وجود بڑا پُروقار سا اور بھاری بھرکم لگا تھا۔ اسے شدت سے احساس تھا کہ وہ اپنے کسی دشمن کے سامنے جا رہا ہے۔

"اے کون ہے تو........... اور یہاں کیا...........؟"

ابھی اس کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ اس میلی سی چادر میں حرکت ہوئی اور چھ سات برس کی بچی نے اپنا منہ نکالا۔ اس کی بھیگی ہوئی پلکوں کے درمیان چکرانے والی بھوری پتلیوں کے گرد خوف کا جالا سا بنا ہوا تھا۔ اس کی ساری اکڑ بارش کی بوندوں میں گھل کر چبوترے سے نیچے بہہ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اٹھ یہاں سے۔" اس نے اپنے لہجے میں تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں سے مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ جیسی آواز نکلی ہو۔

تب اس بچی نے چپ چاپ اپنے پاؤں سکیڑے اور میلی چادر کو سر پر ڈالتی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی اور اتنی آہستگی سے چبوترے پر سے اتری تھی جیسے بارش کی بوند چبوترے سے پھسل کر مٹی میں جذب ہو گئی ہو۔ اس نے چاہا کہ اسے آواز دے کر روک لے مگر اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی اور وہ نڈھال ہو کر چبوترے پر بیٹھ گیا تھا۔

بس اسی روز سے ایک نامعلوم سی بے چینی نے اسے گھیر لیا تھا۔ تب سے اب تک' اس کے گرد آنسوؤں کی لکیریں سی تیرتی رہتی تھیں جن کے کناروں پر خوف جما ہوا تھا۔ وہ جانے کہاں چلی گئی تھی؟ جانے کون تھی؟ اس کے جانے کے بعد خالی چبوترا اس کے دل سے اتر گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ سارا دن اور ساری رات بھی اسی پرُہجوم سڑک پر گھومتا رہے جہاں گونجنے والے اونچے اور بے ہنگم قہقہے اسے تنہا کر دیتے تھے۔ اس بچی کے چلے جانے کے بعد پہلی بار اس کے اندر اپنے آپ کو جان لینے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ یہ خیال اسے اچانک ہی آیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس رات چبوترے کی ماں کی آغوش جیسے نرم و ملائم حصے میں کانٹے اگ آئے تھے۔ وہ تمام رات سو نہ سکا تھا۔

اگلی صبح وہ پاس کی بستی میں چلا آیا۔ اس نے ہر گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ہر ایک سے سوال کیا مگر وہ سب کچھ بھی نہ بتا سکے۔ اسے سر سے پاؤں تک حیرت سے دیکھتے رہتے اور ٹھک سے دروازہ بند کر دیتے۔

"تجھے ایک عورت نے جنا تھا۔" اس بڑھیا نے ٹھنڈی سانس بھر کر بتایا' جیسے کسی اہم راز سے پردہ اٹھا رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں سلگتے تجسس نے اچانک بڑھ کر شعلوں کی شکل اختیار کر لی۔

"وہ.......... وہ کہاں ہے اور میں اس چبوترے تک کیسے پہنچا؟" چھوٹی سی عمر کی بے پناہ معصومیت کے باوجود اس کے سوال کرنے کے انداز میں بڑی مردانگی تھی۔

بڑھیا نے چونک کر اسے دیکھا پھر اسے یوں گھورنے لگی جیسے اس نے کوئی بہت ہی بے وقوفی کی بات کہہ دی ہو۔

"تو اسی چبوترے پر پیدا ہوا تھا۔" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے جواب دیا۔

"اور.......... اور وہ عورت جو شاید تیرے لئے رزق لینے گئی تھی' خود ہی کسی کا نوالہ بن گئی۔ تو اس وقت گھٹنوں چلتا تھا۔ تجھے محلے کے لوگ اٹھا کر لے جاتے تھے۔ سبھی جانتے تھے کہ.......... کہ تجھے پیدا کرنے والی گئی تو واپس ہی نہ لوٹی لیکن.......... وہ ایسی نہیں تھی۔ اسے تو تیرے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی تجھ سے بہت پیار تھا۔" وہ بڑھیا جو اپنی گدلی آنکھوں سے خلاؤں کو تک رہی تھی' اچانک چپ ہو گئی تھی۔

"پھر..........؟" اس نے اپنے دونوں گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا کر پوچھا۔

"پھر..........!" وہ چونک اٹھی۔ "پھر پتا نہیں تو کیسے بڑا ہو گیا۔ پر تیرا چبوترے پر سونا ختم نہ ہوا۔ اگر تجھے کوئی اٹھا کر اپنے گھر لے جاتا تو تو آدھی رات کو اٹھ کر اسی چبوترے پر جا سوتا۔ پھر تو اور چبوترا ایک ہی چیز بن گئے۔ ہم سب تجھے یہاں دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ کبھی خیال ہی نہ آیا کہ تجھے اس چبوترے سے الگ کر کے دیکھتے۔" اس نے چادر کے پلو کو کھولتے ہوئے کہا تھا اور پھر ایک چونی اس کے ہاتھ پر رکھ دی اور پھر بولی۔ "سمجھا تو؟ وہ تیری ماں تھی۔"

اور وہ یوں مطمئن ہو گیا جیسے اس بڑھیا نے اسے اس کا حسب نسب سمجھا دیا ہو مگر اس کے سپاٹ ذہن میں ایک پریشان حال عورت کا ہیولا سا بن گیا جو ہر وقت دھوئیں کی صورت اس کے وجود میں چکرایا کرتا۔ کبھی کبھی وہ لمبا سا ہیولا سمٹ کر چھوٹا ہو جاتا اور پھر میلی سی چادر سے منہ نکال کر اسے تکا کرتا اور اس کے چہرے پر پڑی آنسوؤں کی لکیریں گہری ہو کر سلاخوں کی شکل اختیار کر لیتیں تو وہ بے چین ہو کر پورے شہر کے سارے فٹ پاتھ چھاننے نکل جاتا مگر رات کو اپنا ننھا سا تھکا ہوا وجود اور بے چین آنکھیں لئے لوٹ آتا۔

☆==========☆==========☆

اس روز کی شدید گرمی نے اسے بلبلا کر رکھ دیا تھا۔ سورج عین چبوترے کے اوپر چمک رہا تھا۔ وہ بستی میں ایک گلی کے نکڑ پر لگے گھنے درخت کی چھاؤں میں جا لیٹتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی اور کہاں جا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"سنو! تم ذاکر حسین کو جانتے ہو؟" اس نے جھجک کر پوچھا۔

اس کا جی چاہا تھا کہ وہ کوئی جواب دیئے بغیر کروٹ لے کر سو جائے۔ رات بھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چبوترے سے آگ نکلتی رہی تھی' وہ سو نہیں سکا تھا یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ لڑکی جاتے جاتے کوئی منتر پھونک گئی ہو تاکہ وہ بھی چبوترے پر نہ لیٹ سکے۔ وہ چھوٹی سی میلی چادر میں لپٹی لڑکی ضرور کوئی جادوگرنی تھی۔ اس نے اس عورت کو جواب دینے کی بجائے سوچا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" اس عورت نے اس کی بیزاری کو نظرانداز کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔

"یہی ہے میرا گھر۔" اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔

اور وہ حیران ہو گئی تھی۔ "یہ.......... یہ چبوترا تمہارا گھر ہے اور تمہارے ماں باپ؟"

تب اس نے اسے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ اس کی ماں ایک عورت تھی جو اس کے لئے رزق لینے گئی تھی اور خود کسی کا نوالہ بن گئی۔ جو کچھ بھی اس بڑھیا نے بتایا تھا وہ اس نے اسے بتا دیا اور یوں چمکتی ہوئی آنکھوں سے سر اٹھائے اسے دیکھتا رہا جیسے وہ اسے شاباشی دے گی۔

"تمہیں کیسے پتہ؟" وہ خواب کے سے عالم میں بولی تھی۔

"وہ سامنے والے گھر میں جو بڑھیا رہتی ہے' اسے سب کچھ پتہ ہے۔ اسی نے بتایا تھا۔" اب وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

اس عورت نے پلٹ کر سامنے گھر کے دروازے پر پڑے ٹاٹ کے پردے کی طرف دیکھا پھر تیز قدموں سے اس طرف بڑھ گئی۔ اس عورت کے پاؤں میں لنگ تھا۔ وہ لنگڑا کر چل رہی تھی' بس اسے یہی یاد رہ گیا کہ وہ لنگڑی تھی پھر پتہ نہیں کیا ہوا' اسی رات چاچا قادر داد جانے کہاں سے چبوترے تک پہنچ گیا۔ ہزاروں جتن کر کے' ہزار منتیں کر کے اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ نہ جاتا مگر چاچا قادر داد نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس کا چاچا ہے۔ اسے اس کے ماں باپ نے بھیجا ہے۔ وہ لوگ بہت دور رہتے ہیں۔ اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ اس لئے اب اسے ماں باپ کے واپس آنے تک اسی کے پاس رہنا چاہئے۔ اگر چاچا نے ماں باپ کے واپس آنے کی بات نہ کی ہوتی تو وہ کبھی بھی یہ چبوترا چھوڑ کر کہیں نہ جاتا۔ تبھی سے وہ چاچا کے گھر رہ

رہا تھا۔ برسوں اس آس میں گزر گئے کہ ماں باپ واپس آ جائیں گے' چاچا بھی ہر برس ایک نیا بہانہ پہلے ہی سے بنا کر تیار کر لیتا تھا مگر جوں جوں گلو کی سمجھ میں بات آتی گئی ماں باپ سے متعلق سوالات اتنے ہی کم ہوتے چلے گئے۔

پہلے تو چاچا اکیلے میں اکثر اس سے نگاہیں چرائے رکھتا تھا مگر جب اسے پکا یقین ہو گیا کہ گلو ماں باپ کو قطعی بھول چکا ہے' تب سے وہ چوڑا ہو کر باتیں کرنے لگا تھا۔ گلو جان گیا تھا کہ اب دنیا میں اگر کوئی رشتہ رہ گیا ہے تو وہ صرف چاچا ہی کا رشتہ ہے۔ چاچا کو اس نے ہمیشہ تنہا ہی دیکھا تھا۔ نہ اس نے شادی کی تھی' نہ دنیا میں اس کے سوا اس کا کوئی رشتہ دار تھا۔ گلو نے کئی بار اس سے پوچھا بھی کہ وہ اکیلا کیوں ہے مگر یہ سوال چاچا کے اندر طوفان کھڑے کر دیا کرتا تھا۔ وہ اس کی جان کے پیچھے پڑ جاتا اور جھنجلا کر کہتا۔ "ابے تجھے کیا اعتراض ہے سالے.......... میں اکیلا ہوں یا دوکیلا.......... تجھے کیا فکر ہے۔"

بات اسی جواب پر ختم نہیں ہو جاتی تھی بلکہ یہ طوفان جاتے جاتے پورے گھر میں اپنے نشان چھوڑ جاتا تھا مثلاً پانی کا مٹکا ٹوٹ جاتا' تام چینی کی پلیٹیں دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹیڑھی ہو جاتیں' چائے کی پتیلی بیچ آنگن میں پڑی ہوتی' الگنی پر لٹکے کپڑے زمین پر پڑے ہوتے۔ گلو ایک کونے میں بیٹھا رہتا ورنہ وہ بھی شاید کہیں مسلا ہوا پڑا ہوتا۔ گلو کی سمجھ میں دنیا بھر کی باتیں آ گئی تھیں مگر یہ بات آج تک سمجھ میں نہ آئی کہ چاچا اس سوال پر اتنا کیوں بدک جاتا ہے۔ دوسری حیرانی اسے اس بات سے بھی ہوتی تھی کہ وہ اس کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اسے ہر حال میں سینے سے لگائے رہا۔ اس نے کیسے کیسے نہ اسے تنگ کیا۔ چوریاں کیں' آوارہ گردی کی' جھگڑے کرائے' سر پھٹول ہوا' چاچا نے بھی جی بھر کر اسے دھویا' گالیاں دیں مگر اس بات سے ڈرتا رہا کہ گلو اسے کہیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اسے چھوڑ کر جانے کی ہمت خود گلو میں بھی نہ تھی۔ ساری بھری پُری دنیا میں ایک چاچا کی ہستی تو تھی جس سے وہ مانوس تھا بلکہ جس کی قربت کا وہ اس قدر عادی ہو چکا تھا کہ اب اس کے بغیر ایک پل رہنا بھی عذاب لگتا تھا۔ پچھلے برس چاچا نے کسی بات پر اس کے ماں باپ کا ذکر کر دیا تھا۔ گلو کو یوں لگا تھا جیسے چاچا نے اسے اتنی بڑی گالی دے دی ہے کہ اب اس کا زندہ رہنا بیکار ہے۔ اس روز وہ پہلی بار گھر چھوڑ کر رات بھر اس چبوترے پر پڑا رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ اس گالی کے پس منظر کی چبھن نے اور کچھ پہلی بار چاچا سے الگ ہونے کی تکلیف نے بخار کی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ اگلی صبح' سویرے ہی چاچا آ کر اس سے لپٹ گیا تھا۔

"معاف کر دے مجھے........... گلو!........... میں بھی تو انسان ہوں ناں! کیوں تنگ کرتا ہے مجھے اتنا کہ میں پھٹ پڑوں۔"

"جا چلا جا چاچا۔ یہی چبوترا میرا رشتے دار ہے ناں! ٹھیک ہے' میں اسی کے ساتھ رہ لوں گا۔ جب آسرے کی ضرورت تھی تب بھی تو اسی چبوترے نے سہارا دیا تھا۔ اب تو ہاتھ پاؤں والا ہوں' اپنا رزق خود کما سکتا ہوں۔ جا میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔" اس نے حتمی فیصلہ دے دیا تھا۔

"ابے عقل کے کورے! جب تو کچھ کمانے کے قابل نہ تھا تب بھی تجھے خدا ہی رزق دیتا تھا سالے........... آج بھی وہی دے گا اور آئندہ بھی........... اپنے ہاتھ پیروں پر نہ اترایا کر........... چل اب کے وعدہ' کبھی یہ بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔ ویسے بھی اب تو خود ہی سمجھ دار ہو گیا ہے۔ بہت سی باتیں پوچھے بغیر بھی تو سمجھ آ جاتی ہیں ناں۔ چل..........."

اور گھنٹا بھر تک نخرے دکھانے کے بعد وہ لوٹ آیا تھا۔ کچھ روز تک تو چاچا نرم نرم رہا پھر جیسے ہی اسے یقین ہوا کہ گلو وہ واقعہ بھول گیا ہے وہ پھر چوڑا ہو گیا مگر اس بار اس نے بھولے سے بھی اس کے ماں باپ کا ذکر نہیں کیا تھا مگر اب........... سال بھر گزرنے کے بعد پھر وہ یہی ذکر لے بیٹھا تھا لیکن گلو اس بار اس سے ناراض ہو کر نہیں آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی تو آ گیا تھا کہ جن باتوں میں چاچا کا دوش نہ ہو' ان باتوں پر اسے سزا دینا ناانصافی ہے۔ یہ چبوترا تو اس کا ماضی تھا۔ یہاں تو وہ خود کو کھوجنے آیا تھا۔ یہاں آ کر دو عورتیں اسے یاد آتی تھیں۔ ایک وہ لنگڑی عورت جس کے نقوش اس کے ذہن میں قطعی نہ تھے اور دوسری وہ بچی جو ایک بار یہاں آ کر لیٹ گئی تھی اور جس کی آنکھوں کی بھوری پتلیوں پر خوف تک اسے خوب یاد تھا۔ گالوں پر بہتی آنسوؤں کی میلی میلی لکیریں' نچلے ہونٹ کے پاس نکلا ہوا بڑا سا دانہ' اس دانے کے گرد پھیلی سرخی سبھی کچھ یاد تھا اسے جانے ان دونوں کی یاد سکون کیوں دیتی تھی۔ ایک عجیب و غریب سا سکون

اسے محسوس ہوتا اور وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا تھا۔

☆============☆============☆

آج بھی اس چبوترے پر پہنچ کر اسے وہی سکون نصیب ہوا تھا۔ وہ اس پر چت لیٹا اپنا مختصر سا ماضی یاد کرتا رہا۔ اس کے ماضی کی کوئی لمبی چوڑی داستان تو تھی نہیں۔ ایک یہ چبوترا تھا۔ ایک لنگڑی عورت' ایک خوفزدہ بچی۔ ایک بڑھیا اور بس........... کل چار منظر تھے وہی گھنٹوں رنگ بدل بدل کر نظر آتے رہتے۔ وہ اس سے پہلے کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا تو کوئی منظر ابھرنے کی بجائے اس کی سماعت میں چند بے ہنگم سی آوازوں کا شور سا بھر جاتا ان آوازوں میں کسی عورت کی سسکیوں کی آواز زیادہ واضح ہوتی۔ اس کا دم گھٹنے لگتا جیسے وہ اندھا ہو گیا ہے۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا مگر سنائی سب کچھ دے رہا ہے۔ کوئی رو رہا ہے کوئی چیخ رہا ہے۔ کہیں جھگڑا ہو رہا ہے۔ یہ کیفیت اسے نڈھال کر دیتی اور وہ بے حال ہو جاتا۔ اس وقت بھی وہی شور اس کے اعصاب پر چھایا ہوا تھا۔ پورا آسمان گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ چت لیٹا ہوا آسمان کو گول گول گھومتے دیکھ رہا تھا کہ اچانک چاچا کا چہرہ بھی سامنے آ کر گول گول گھومنے لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"گلو!"

اس نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ واقعی چاچا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"مجھے پتہ تھا کہ تو........... تو یہیں آیا ہو گا۔"

"میں........... میں گھر آ رہا تھا چاچا...........!" وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب ایسی حالت اور اس عمر میں وہ چاچا کو کوئی تکلیف پہنچائے۔

"مجھے........... مجھے معاف کر دے گلو!" چاچا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

گلو نے لپک کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ چاچا کا سفید چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ "نہیں چاچا........... تو........... تو معافی کیوں مانگتا ہے۔ اس میں تیرا تو کوئی بھی قصور نہیں ہے چاچا........... قصور تو........... اس عورت کا ہے جس نے مجھے جنم دیا اور یہاں........... کھلے آسمان تلے چھوڑ کر خود رنگینیوں میں گم ہو گئی یا........... اس مرد کا قصور ہے جو میرے وجود کا سبب بنا۔ تو تو........... تو تو بہت اچھا ہے چاچا۔ ایک ایسے بچے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو سینے سے لگائے جوانی کی دہلیز تک لے آیا جو گناہوں کی پیداوار تھا۔ جو رات کے اندھیرے میں پھیل جانے والی اس سسکی کی لذت کا نتیجہ تھا جو صبح ہونے سے پہلے ہی اذیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔"

اور چاچا سر اٹھائے اسے حیرت سے تک رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ گلو آج کیسی باتیں کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں اور باتوں میں اتنی گہرائی تو اسے آج محسوس ہوئی تھی۔ آج اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ گلو جوان ہو گیا ہے۔ اب وہ سوچنے لگا ہے۔ سمجھنے اور سمجھانے کے قابل ہو گیا ہے۔

"مجھے خود سے نفرت محسوس ہوتی ہے چاچا! مگر.......... مگر تیری محبت اس سے زیادہ شدید ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تو ایک طوائف کی اولاد کو اتنی محبت دیتا ہے۔"

"وہ.......... وہ طوائف نہیں تھی۔" چاچا چیخ اٹھا۔ "حرامزادے' سور کے بچے' اپنی ماں کو گالی دیتا ہے۔ گالی دیتا ہے اسے.........." چاچا ایک دم باؤلا سا ہو گیا۔ اس پر جھپٹ پڑا۔ گلو نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں کس لیا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے جملوں پر غور کر رہا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ چاچا اس کے ماں باپ کو نہیں جانتا۔ اکیلا تھا اس لئے اسے سینے سے لگا کر زندگی کی ویرانی کو شکست دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ جھوٹ بولتا رہا کہ وہ اس کا چاچا ہے مگر.......... مگر آج جو کچھ اس نے کہا تھا اس نے گلو کے اندر وہی طوفان سے کھڑے کر دیئے جو اکیلے پن کی بات سن کر چاچا کے اندر اور باہر توڑ پھوڑ مچاتے تھے۔

"پھر.......... پھر وہ کون تھی چاچا.......... تو اسے جانتا ہے؟ جانتا ہے تو اسے؟"

اس نے چاچا کے ہاتھ چھوڑ کر اسے کاندھوں سے پکڑ لیا۔

چاچا ایک دم جیسے ہوش میں آ گیا۔ "ایں.......... ہاں.......... کیا.......... کیا.......... ہوا؟"

"چاچا! میری ماں.......... کون تھی وہ.......... کہاں ہے؟ بتا چاچا.......... بتا دے.......... تجھے نہیں پتہ چاچا کہ میں.......... میں.........."

"بک.......... گھاس کھا گیا ہے کیا؟" چاچا نے خود کو چھڑاتے ہوئے اکڑنے کی کوشش کی۔ "مجھے کیا پتہ.........."

"چاچا! بیٹھ جا' بیٹھ یہاں۔" گلو نے اس کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر اسے چبوترے پر بٹھا دیا۔ چاچا اسے یوں دیکھے گیا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے والا مجرم دیکھتا ہے۔ "چاچا اب تک میں نے نہ کچھ پوچھا تھا' نہ تو نے ہی بتانے کی ضرورت محسوس کی مگر.......... اب' اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتا۔"

"ابے ہٹ یہاں سے۔" چاچا نے اتنی دیر میں خود کو سنبھال لیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ "یہ فلمی ڈائیلاگ مت بولنا مجھ سے۔ دیکھ گلو!" وہ اچانک نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "بس اتنا سمجھ لے کہ تجھے خدا نے میرے لئے پیدا کیا ہے اور مجھے تیرے لیے' باقی پہلے کیا تھا' کیوں تھا' کب تھا سب بھول جا۔"

"بھول ہی تو جانا چاہتا ہوں چاچا مگر.......... مگر تو پھر یاد دلا دیتا ہے۔ میں کب انہیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں جنہوں نے مجھے یوں بے آسرا چھوڑ دیا تھا۔ جنہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ گھٹنوں چلنے والا بچہ کھلے آسمان تلے کیسے جئے گا۔ میں تو ان لوگوں کے لئے جانے کب کا مر چکا ہوں۔ انہیں تو ایک پل کو بھی خیال نہ آیا ہو گا کہ.......... کہ چبوترے نے اس لاوارث بچے کو ماں جیسی آغوش دی ہو گی۔ قدرت نے اس بچے کو زندہ رکھا ہو گا پھر اسے تجھ جیسا باپ بھی دے دیا ہو گا مگر.......... مجھے تو معلوم ہونا چاہئے ناں کہ وہ.......... وہ کون تھی۔ تو کہتا ہے کہ طوائف نہیں تھی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو اسے جانتا ہے۔ بول۔ جانتا ہے ناں تو اسے؟"

"نہیں.......... نہیں.......... جانتا ہوں.......... بس اتنا پتا ہے گلو کہ.......... کہ تجھ جیسے بیٹے کی ماں طوائف نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ طوائف ہوتی تو تو کسی کوٹھے پر پیدا ہوا ہوتا گلو' یا طبلہ بجا رہا ہوتا یا پھر گجرے بیچ رہا ہوتا۔ وہ طوائف نہیں ہو سکتی گلو! بہت نادان اور معصوم ہو سکتی ہے۔ اچھا اب چل مجھے چکر آ رہے ہیں۔" چاچا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے کہا۔

☆===========☆===========☆

یہ بات تو وہ جان چکا تھا کہ چاچا قادر داد بڑا گھنا ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہا ہے۔ مگر اس نے بھی زندگی میں پہلی بار یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ حقیقت جان کر رہے گا یہ کوئی فلم تو تھی نہیں کہ وہ ماں باپ کو ڈھونڈ کر ان کے گلے لگ جاتا اور فلم ختم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو جاتی۔ وہ تو صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس عورت کو ایسی کیا مجبوری تھی جو اسے پیدا کر کے یہاں چبوترے پر چھوڑ گئی۔ اس کا باپ کون تھا؟ کیا اس کا کوئی گھر نہیں تھا۔ کوئی جھونپڑی' کوئی چھپر' جہاں اس کے ماں باپ یا بہن بھائی رہتے ہوں۔ اس کی ماں نے اسے چبوترے پر نہیں جنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی سائبان تو ایسا ہوگا جس کے سائے میں وہ پیدا ہوا ہوگا پھر............ وہ عورت کہاں گئی۔ اس بڑھیا نے بتایا تھا کہ وہ کسی کا نوالہ بن گئی۔ تب تو مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر آج............ آج وہ جان گیا تھا کہ نوالہ بننا کسے کہتے ہیں۔ اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ مر گئی............ یہ کہہ دیا ہوتا تو آج وہ کتنے سکھ سے ہوتا۔ اب بھی بے چینی اسے کبھی کبھی ہی ہوتی تھی مگر آج چاچا کے جملے نے اس کے اندر آگ لگا دی تھی۔ اس نے تو کئی بار اپنے اندر کے شور سے پریشان ہو کر یہی سوچا تھا کہ وہ کسی طوائف کی اولاد ہے جو اسے پیدا کر کے ایک بوجھ سے جان چھڑا کے کسی عاشق کے ساتھ رنگ رلیاں منانے گئی تو لوٹ کر ہی نہ آئی۔

"چل گلو! کیوں میری جان لینے پر تلا ہے؟" چاچا اسے گم دیکھ کر منتیں کرنے لگا۔

"چل!" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر پلٹ گیا۔

☆============☆============☆

چاچا قادر داد بڑے دنوں تک چپ چپ رہا۔ اس کی کھوجتی نگاہیں گلو کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں گھس جاتی تھیں۔ گلو خوب سمجھتا تھا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہا ہے مگر ابھی بات کرنا بیکار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب تک چاچا یہ واقعہ بھولے گا نہیں چوکنا ہی رہے گا اور اسے پھر سوچ سمجھے بہانے بنا کر' داستانیں سنا کر مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔

☆============☆============☆

اس دوران میں جان محمد نے اسے بلا بھیجا۔ گلو دوڑا دوڑا اس کے کوارٹر جا پہنچا۔

"تو کہاں غائب ہو گیا تھا؟ دو بار استاد تجھے پوچھ چکا ہے۔" جان محمد نے اسے چائے کا پیالہ تھماتے ہوئے کہا۔

"چاچا کی طبیعت خراب تھی۔" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"دیکھ گلو! میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ استاد ان لوگوں کو نوکری نہیں دیتا جن کے پیچھے سائے لگے ہوں۔ اب یہ ذکر اس کے سامنے مت کر دینا کہہ دینا کہ' تیری اپنی

طبیعت خراب تھی ورنہ............"

"جان محمد! تو تو جانتا ہے ناں کہ چاچا بیمار رہتا ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اسے کام پر نہ جانے دوں مگر وہ مانتا ہی نہیں۔ تو اس سمجھا دینا۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ میں کوئی غلط کام کر رہا ہوں۔ تو اسے بتانا کہ ڈرائیوری کرنا غلط نہیں ہے نہ یہ حرام کی کمائی ہے کہ............"

"گلو............ گلو............ تو اسے بڈھے کو بھول نہیں سکتا............؟" جان محمد نے تیز لہجے میں جھنجلا کر کہا۔

"یہ............ یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟" وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ وہ کون سا تیرا رشتہ دار ہے۔ ٹھیک ہے کہ اس نے تجھے پالا پوسا ہے۔ تجھ پہ خرچہ بھی کیا ہوگا۔ اب تو اتنا کما لے گا کہ اپنے اوپر کئے ہوئے احسان کو چکا دے۔ ہر ماہ پانچ سو روپے دے دیا کر اسے اور بس............ اب اگر تجھے کچھ کرنا ہے تو سنجیدہ ہو جا۔ استاد فتح تیرا چاچا نہیں ہے کہ روز کام کے لئے گالیاں دے گا یا پھر تجھے تیرے حال پر چھوڑ دے گا۔"

"مگر جانو!"

"کوئی اگر مگر نہیں۔ تو سوچ لے۔ اب تو شام ہو گئی۔ پوری رات پڑی ہے تیرے سوچنے کو۔ صبح سویرے یہاں آنا تو کشتیاں جلا کر آنا۔"

"ایں کون سی کشتیاں؟" گلو نے ہونقوں کی طرح اسے دیکھا۔

"ابے میں چاچا کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھ گلو! استاد فتح کی آنکھوں میں بہت کم چہرے ٹھہرتے ہیں۔ بہت کم لوگ یاد رہتے ہیں اور............ اور وہ تجھے دو بار پوچھ چکا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ اب تو گیا تیرے ہاتھ سے۔"

"وہ تو اچھا ہے جانو! میں بھی اس کے سارے کام چٹکی بجاتے کر دیا کروں گا مگر اس میں چاچا کہاں آڑے آ رہا ہے۔ وہ تو بس کبھی کبھی ہی بیمار ہوتا ہے اور بیمار ہوتا ہے تو کون سا بستر سے جڑ جاتا ہے' سالا جلتی گلیوں میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ بس کبھی کبھی............"

"یعنی............ بات تیری سمجھ میں نہیں آئی ہے؟" جان محمد نے نتھنے پھلا کر اسے گھورا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آ گئی یار! ٹھیک ہے بس یہ بتا کہ استاد کے پاس کب چلنا ہے اور تو گاڑی چلانا کب سکھا رہا ہے؟"

"تجھے فرصت ملے گی تو گاڑی بھی سکھا دوں گا۔" اس نے منہ بنایا۔ "چل' استاد کی طرف چلتے ہیں۔ اسے کہیں جانا ہے۔" جان محمد سر پر ٹوپی جماتے ہوئے بولا۔

یہی سفید ٹوپی تو گلو کو حسین خواب دکھاتی تھی۔ سفید پتلون' سفید بے داغ قمیض اور سفید چھجے دار ٹوپی۔ وہ خود کو تصور میں اس لباس میں دیکھتا تو یوں لگتا جیسے بہت سے فوجی اسے سلیوٹ مار رہے ہوں۔ وہ ایک دم سیدھا ہو جاتا۔ اس کی کمر اکڑ جاتی۔ گردن اکڑ جاتی۔ جبڑے بھنچ جاتے اور وہ خود کو کسی فوج کا بڑا افسر سمجھنے لگتا۔

وہ جان محمد کے پیچھے چلتا ہوا استاد فتح کے بنگلے تک آ گیا۔ گیٹ کے اندر لال پتھروں کی روش پر اس کی چمچماتی ہوئی کار کھڑی تھی۔ جان محمد نے جاتے ہی چوکیدار سے استاد فتح کے بارے میں پوچھا۔

"بس آنے والے ہیں۔ بڑی میڈم کو ایئرپورٹ چھوڑنا ہے۔" چوکیدار نے بتایا اور جان محمد نے جلدی سے گاڑی نکال کر ایک صاف ستھرا کپڑا نکال لیا اور ونڈ سکرین صاف کرنے لگا۔ گلو نے آگے بڑھ کر اس سے کپڑا لے لیا۔

"لا میں صاف کرتا ہوں۔" پھر اس نے پوری جان لگا کر اس پر سے ہر دھبا صاف کر دیا۔ جان محمد اسے دیکھتا رہا۔ عین اسی وقت استاد فتح باہر نکل آیا۔ اسے دیکھتے ہی گلو کے بدن میں عجیب سی سرسراہٹ ہونے لگی جیسے اس کے بدن پر چیونٹیاں چڑھ گئی ہوں۔

وہ بے چینی محسوس کرنے لگا اور لپک کر دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"اے........" استاد فتح نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

"جج........ جی استاد؟" وہ دوڑ کر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

"عمر کیا ہے تیری؟" استاد فتح نے عجیب و غریب سوال کیا تھا۔

"جج........ جی استاد' وہ شاید' سترہ برس........ نہیں اٹھارہ........ وہ جی میرا چاچا........"

"تجھے تیری عمر بھی نہیں معلوم پھر تو کام کیسے کرے گا؟" اس نے اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو اوپر کی طرف تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔ لہجہ نرم ہی تھا جو گلو کو حوصلہ دے رہا تھا

موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی پھیلی ہوئی تھی۔

"میں کر لوں گا استاد! آہستہ آہستہ کام کرنا آ جائے گا اور کل سے میں ڈرائیوری بھی........"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر سے پاؤں تک اسے غور سے دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ "شام کو بنگلے پر آ جانا۔ کچھ چھوٹے موٹے کام ہیں وہ تجھے ہی کرنا ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ پلٹ پڑا۔ اس کا رخ اندر کے دروازے کی طرف تھا۔ اسے شاید کسی کا انتظار تھا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور جو عورت باہر آئی اسے دیکھ کر گلو نے پہلے تو نگاہ جھکا لی پھر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں اسے دیکھ کر اس کے اندر بے چینی سی کیوں پیدا ہوئی تھی۔ اسے تو یہ بھی یاد نہ آیا کہ اسے پہلے کبھی دیکھا ہے کہ نہیں۔ اتنی خوب صورت' اتنی مالدار اور گوری چٹی عورت سے بھلا اس کا ناتا ہی کیا ہو سکتا ہے۔

اس کا ذہن کورے کاغذ کی طرح صاف ضرور تھا مگر دل بوجھل ہو چکا تھا۔ وہ عورت اس کی طرف دیکھے بنا گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ کچھ عجیب سے انداز میں' عین اسی لمحے جانو گاڑی کو سیڑھیوں تک لے آیا۔ وہ ایک شان بے نیازی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی جانو نے پھرتی سے دروازہ بند کیا۔ استاد فتح وہیں کھڑا تھا۔ اسے اس عورت کے ساتھ کہیں نہیں جانا تھا۔ ملازم دو خوبصورت اور قیمتی اٹیچی کیس ڈگی میں رکھ چکا تھا۔ گلو اب بھی کن انکھیوں سے اس پُروقار سی عورت کو دیکھ رہا تھا' جس نے اب تک نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔

"اے........ کیا نام ہے تیرا؟" استاد فتح نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"جی گلو استاد!" وہ جلدی سے ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

"ہاں........ جانو' اسے تم اپنے ساتھ لے جاؤ۔ واپسی پر ولی محمد کے پاس اسپتال چلے جانا۔"

گلو اس وقت چونک پڑا جب اس نے استاد فتح کو آنکھ دباتے دیکھا۔ جانو بھی استاد فتح کو معنی خیز انداز میں دیکھ رہا تھا تبھی گلو چونک اٹھا۔ جانو اسے آگے بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔ گلو نے تیزی سے آگے بڑھ کر جانو کے برابر والا دروازہ کھولا اور دھم سے بیٹھ گیا۔ جانو نے اسے گھور کر دیکھا پھر استاد فتح سے اجازت لے کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاڑی جیسے پانی پر تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ گلو ایسے بیٹھا تھا جیسے ذرا سا بھی ہلا تو بے کراں سمندر میں غوطے کھانے لگے گا۔

"جانو! یہ لڑکا پہلے نظر نہیں آیا۔" یہ آواز گلو کے کانوں میں آئی تو وہ پیچھے دیکھنے کو بے چین ہو گیا مگر ضبط کئے رہا۔

"جی میڈم! یہ استاد فتح کو پسند آ گیا ہے۔ اسے کام پر لگانا چاہتے ہیں۔" جانو نے مستعدی سے جواب دیا۔

"نہیں............ یہ............ یہ تو بہت چھوٹا ہے۔" وہ بے اختیار بول اٹھی۔

"نہیں جی! میں............ میں چھوٹا نہیں ہوں۔ چاچا کہتا ہے کہ اب میں بہت بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھے کمانا چاہئے۔" وہ ایک دم پلٹ پڑا۔ عجیب سی مقناطیسیت تھی اس کی شخصیت میں کہ وہ نگاہ اس کے چہرے سے ہٹا ہی نہیں سکا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

"گلو جی............ نہیں گلزار احمد............" وہ جان محمد کے کہنی مارنے پر گھبرا گیا تھا۔

"یہ نام تمہاری ماں نے رکھا تھا یا باپ نے؟"

"بس جی بس............" وہ ایک دم بدک گیا۔ "مجھے یہیں اتار دیں۔" اس کی پُروقار شخصیت کا سارا رعب داب پانی بن کر بہہ گیا۔

"کک............ کیا بات ہے گلو! تو ہوش میں تو ہے؟" جانو نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک دم چنگاریاں بھر گئی تھیں۔

"معاف کرنا جانو۔" وہ ایک دم ہوا نکلے غبارے کی مانند پھسپھسا گیا پھر جلدی سے پیچھے کی طرف پلٹ گیا۔ "میرا نام میرے چاچا نے رکھا تھا جی گلزار احمد' لیکن آج تک اس نے مجھے گلو ہی کہا ہے۔ میں گلزار احمد بننا چاہتا ہوں اسی لئے استاد فتح کے پاس آ گیا۔"

"تمہارا چاچا کیا کرتا ہے؟" وہ اب اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"ٹھیلا لگاتا ہے۔" گلو نے سر جھکا کر کہا یوں جیسے اپنے کسی بڑے جرم کا اقرار کر رہا ہو۔ "مگر اب میں نے اسے منع کر دیا ہے۔ اب میں جو کمانے لگا ہوں۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"اس کچی بستی میں............ اسی بستی میں جہاں استاد فتح رہتا تھا۔"

"تمہارے ماں باپ............؟"

اور گلو کو لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر کوئی بھاری چیز مار دی ہے۔ جانو نے فوراً بات سنبھال لی ورنہ وہ پھر بدک جاتا۔

"کون سے ٹرمینل پر جانا ہے میڈم؟"

"تین پر۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

ایئرپورٹ قریب آ چکا تھا۔ جانو گاڑی تیز رفتاری سے آگے لیتا چلا گیا اور پھر جھٹکے سے بریک لگا دیئے۔ "گلو اتر کر سامان نکال۔" یہ کہتا ہوا جانو گاڑی سے اتر گیا اور اس نے آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ میڈم گاڑی سے نکل کر رکے بغیر آگے بڑھ گئی اور ڈکی میں سے سامان نکالتا ہوا گلو حیرت سے منہ پھاڑے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ لنگڑی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا۔ گلو کو یوں لگا جیسے اس کے دماغ میں کہیں دور' بہت دور شور ہو رہا ہے۔ کوئی چیخ رہا ہے۔ کوئی رو رہا ہے اور کہیں جھگڑا ہو رہا ہے۔ سسکیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"اے............ گلو! سامان............" جانو کی آواز آئی۔

اور گلو ہوش میں آ گیا۔ وہ سامنے بنے شیشے کے دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی پھر گلو جانو کے ساتھ اسپتال نہیں گیا بلکہ سیدھا گھر آ گیا۔

☆===========☆===========☆

وہ گھر میں داخل ہوا تو چاچا اکیلا پڑا کھلے آسمان کو تک رہا تھا۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا پھر اٹھ بیٹھا۔ "تو............ آ گیا گلو!" اس کے انداز میں بڑی چاشنی تھی۔

"ہاں آ گیا۔ کیوں............ تجھے اعتراض ہے کیا؟" اس کا دماغ ٹھیک نہیں تھا۔ اس میڈم نے بار بار اس کے ماں باپ کا ذکر کر کے اس کی کھوپڑی گھما دی تھی۔ وہاں تو سب کچھ ضبط کرنا پڑا تھا مگر گھر پہنچتے پہنچتے اس کا مغز پلپلا ہو چکا تھا۔

"گلو! حمیدہ آئی تھی۔ نازاں کے لیے۔" چاچا نے اس کے انداز کو گھاس ڈالے بغیر کہا۔

آج نازاں کے ذکر پر گلو کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ "تو کیا ہوا نازاں کو؟" اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قمیض اتار کر کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے پوچھا۔

چاچا نے اسے غور سے دیکھا۔ "ابے کیا نشہ کر کے آیا ہے؟ میں ناراں کی بات کر رہا ہوں۔"

"چاچا! میری ماں کون تھی؟"

قادرداد کو یوں لگا جیسے قریب ہی کہیں بم پھٹا ہو حالانکہ گلو نے یہ بات بہت آہستگی سے پوچھی تھی۔ "ک ک............کیوں............اب کیا ہے؟"

"صرف میری بات کا جواب دے۔ تو مجھے چبوترے سے کیوں لایا تھا اور میری ماں کو کیسے جانتا ہے؟ اب یہ مت کہنا کہ تو اسے نہیں جانتا۔"

"گلو! بڑا' اب تو اتنے برس گزر گئے۔ تو اب یہ سب کچھ کیوں جاننا چاہتا ہے۔ ویسے اتنا بتا دوں کہ اگر تو جان بھی لے تو اسے ڈھونڈ نہیں سکے گا۔ میری ساری زندگی اسے ڈھونڈتے گزر گئی۔ تو کہتا ہے ناں کہ میں اکیلا کیوں ہوں؟............میں............میں اکیلا اس لئے ہوں کہ وہ مجھے ملی ہی نہیں۔ میں نے برسوں اسے ڈھونڈا' جگہ جگہ' شہر شہر اور پھر تھک کر اس بستی میں چلا آیا۔ تب ایک روز اچانک............ بالکل اچانک مجھے تیرے بارے میں پتہ چل گیا۔ تیرے بارے میں مجھے جنت نے بتایا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ مجھے تو یاد بھی نہ تھا کہ جنت اس کی پرانی سہیلی تھی۔ اسی بڑھیا کی بیٹی جو چبوترے کے عین سامنے والے گھر میں رہتی تھی اسی نے بتایا کہ تُو جہاں آرا کا بیٹا ہے۔ جہاں آرا نے خود کہلوایا تھا کہ میں تجھے لے آؤں۔ وہ جانتی تھی کہ میں یہاں رہتا ہوں مگر وہ میرے پاس نہیں آئی۔ کیوں نہیں آئی' یہ تو میں نہیں جانتا۔ میں نے پہلا کام تو یہی کیا کہ جا کر تیری منتیں کر کے یہاں لے آیا پھر میں اسے ڈھونڈنے نکلا مگر وہ تو جیسے دھواں بن کر غائب ہو چکی تھی تبھی سے تو میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن گیا۔ تو اس کا بیٹا ہے اور' اور وہ طوائف نہیں تھی گلو! وہ تو بہت معصوم اور بھولی تھی۔ میں خود حیران رہ گیا جب میں نے سوچا کہ وہ تجھے یہاں برسوں پہلے چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی۔ اس چبوترے پر تجھے تو میں نے بھی اکثر دیکھا تھا مگر اس وقت مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ تو اس کا بیٹا ہے۔ بستی میں مشہور تھا کہ وہ کوئی بھکارن تھی۔ چبوترے کے سامنے درخت کے نیچے چھپر ڈالے بیٹھی تھی۔ بستی کے لوگوں کے گھروں میں کام کر کے دو وقت کی روٹی حاصل کر لیتی تھی پھر ایک دن

اس نے تجھے جنا۔ کئی ماہ بلکہ شاید سال ڈیڑھ سال تک یہیں چھپر تلے رہتی رہی۔ پھر ایک روز تجھے چبوترے پر سوتا چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ جنت تجھے اٹھا کر لے گئی تھی۔ اس نے تجھے پالا۔ جب تو چلنے کے قابل ہو گیا تو اچانک ہی تو پھر چبوترے پر پہنچ گیا۔ سارا دن بھری دوپہر میں وہیں ٹھیکروں سے کھیلتا رہتا تھا پھر رات کو بھی وہیں پڑ کر سونے لگا۔

جنت کا کام صرف اتنا ہی رہ گیا کہ وہ دونوں تینوں وقت تجھے آواز دے کر روٹی دے دیا کرے۔ یا کبھی زبردستی پکڑ کر نہلا دھلا دے اور کپڑے بدل دے۔ تو تو چبوترے سے لپٹ کر رہ گیا تھا۔ لوگ اکثر شام ڈھلے تجھے گھر لے جاتے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر سلا دیتے مگر تو آدھی رات کو اٹھ کر چبوترے پر جا سوتا۔ رفتہ رفتہ لوگ تیری اس حرکت کے عادی ہو گئے۔ پوری بستی کے لوگ تجھے اپنا بچہ سمجھتے تھے۔ نہ تجھے کھانے پینے کی فکر تھی' نہ پہننے اوڑھنے کی۔ ہر گھر تیرا گھر تھا پر رات کو تجھے بیڑیاں بھی ڈالو تو' تو توڑ ڈال دیتا تھا۔ جس روز مجھے پتہ چلا کہ تو جہاں آرا کا بیٹا ہے اس روز میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ مہینوں تجھے لے لے کر چبوترے پر سویا ہوں تاکہ تو رات کو اکیلا نہ نکل جائے پھر تجھے ماں باپ کے لوٹ آنے کا لالچ دیا پر گلو! اب تو تو بڑا ہو گیا ہے ناں۔ اب ان باتوں کی کھوج چھوڑ دے۔ جانے اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہو گا کہ وہ تجھے یوں............"

چاچا بول رہا تھا اور گلو بت بنا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ آج پہلی بار کانوں نے اس کی ماں کا نام سنا تھا' جہاں آرا۔ گلو یہ نام دل ہی دل میں ہزاروں مرتبہ دہرا چکا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے اندر شور تھا اور اس شور میں بھی وہ جہاں آرا کے نام کی گونج صاف محسوس کر رہا تھا۔

"گلو!" چاچا نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

"آں۔ ہاں............" وہ چونک اٹھا۔ "پھر............پھر چاچا! وہ نہیں ملی؟"

"نہیں............میں تو تھک گیا گلو!" اس نے نڈھال ہو کر کہا۔

"میں............میں اسے تلاش کروں گا۔" اس نے ایک عزم سے کہا۔ "وہ کیسی تھی چاچا۔ مجھے کچھ بتا' کچھ سمجھا۔" وہ سرک کر چاچا کے بالکل قریب آ گیا۔

"بہت خوبصورت تھی۔ بہت گوری' بالکل گڑیا سی۔ بے داغ چہرہ' کالی خوبصورت آنکھیں............بس ذرا سی............ہلکی سی............ہلکی سی لنگڑی تھی............"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کک............ کیا............؟" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

نہ جانے کیوں ایئرپورٹ کا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر جاتی میڈم اس کی آنکھوں میں گھوم گئی۔ وہ جھٹکے سے اٹھا اور کھونٹی سے قمیض اتارتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔

"گلو............ گلو............" چاچا چیختا رہ گیا مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ استاد فتح کے بنگلے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ کئی فرلانگ کا فاصلہ اس نے منٹوں میں طے کر لیا۔ وہ سیدھا جان محمد کے کوارٹر کی طرف بڑھ گیا۔ جوں ہی اس نے دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا اندر سے آنے والی آواز نے اسے منجمد کر دیا۔

اندر سے آنے والی آواز استاد فتح کی تھی۔ گلو تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ استاد فتح جان محمد کی کوٹھڑی میں قدم بھی رکھ سکتا ہے۔ اصولاً تو اسے جان محمد کو اپنے بنگلے پر بلانا چاہئے تھا۔ اسے استاد فتح کو یہاں دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ اس نے اندر ہونے والی گفتگو کو سننا چاہا تو کوئی بات اس کے پلے نہ پڑی مگر جب استاد فتح نے اس کا نام لیا تو اس کے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ استاد فتح شاید دروازے کے قریب آ گیا تھا۔ اسے آخری جملہ صاف سنائی دیا وہ کہہ رہا تھا۔ "گلو کو جلد از جلد کام پر لگا اور ولی محمد کو اب آزاد کر دے۔"

یہ محسوس کرتے ہی کہ استاد فتح دروازے تک آ گیا ہے اور کسی بھی وقت وہ باہر آ سکتا ہے' گلو دوڑ کر دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ اس کا اندیشہ درست تھا۔ اس کے دیوار کے پیچھے دبکتے ہی استاد فتح باہر نکل آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی گلو کا دم نکل گیا' یہ سوچ کر ہی وہ لرز اٹھا کہ اگر استاد اسے یوں دروازے سے لگا دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

وہ دیوار سے ٹیک لگائے' سانس روکے کھڑا رہا۔ استاد فتح کے چمچماتے ہوئے بوٹوں کی آواز اس کی کنپٹیوں میں گونج رہی تھی۔ شاید پندرہ منٹ تک وہ وہیں ساکت کھڑا رہا پھر اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ جھانکا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ وہ تیزی سے نکلا اور جان محمد کے گھر کھلے دروازے میں داخل ہو گیا۔ جان محمد اپنے سامنے کچھ فائلیں رکھے بیٹھا تھا۔ اسے یوں غڑاپ سے اندر گھستے دیکھ کر چونک اٹھا۔

"گلو............ تو............؟"

"ہاں............ آں جانو............ وہ میں نے کہا کہ میں آج ہی سے گاڑی چلانا سیکھ

لوں۔" نہ جانے کیوں وہ بوکھلا گیا۔ وہ تو اس سے میڈم کی بات کرنے کے لئے آیا تھا۔ پوچھنے آیا تھا کہ وہ کون ہے' کہاں گئی اور کب آئے گی' اس کا نام کیا ہے اور استاد فتح کی کون لگتی ہے۔ مگر استاد فتح کو یہاں دیکھتے ہی اس کے دماغ سے ساری باتیں ہوا کے تیز جھکڑ کی طرح اڑ گئی تھیں۔

"اچھا کیا' تو آ گیا۔ ابھی ابھی استاد فتح نے تجھے یاد کیا تھا۔ کہتا ہے کہ گلو کو کام پر لگا دے۔ دیکھ گلو! میں تجھے دس دن میں گاڑی چلانا سکھا دوں گا مگر اس کے لئے تجھے سویرے سویرے میرے پاس آنا ہو گا۔"

"میں تیار ہوں۔" یہ سنتے ہی کہ وہ جلد از جلد گاڑی چلانا سیکھ لے گا۔ گلو خوش ہو گیا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ میڈم کے بارے میں کسی سے پوچھے بنا معلومات حاصل کرے گا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ اگر وہ جان محمد سے میڈم کے بارے میں پوچھے گا تو وہ یہ ضرور جاننا چاہے گا کہ اسے میڈم کی فکر کیوں ہے' اب اسے وہ کیا بتاتا کہ وہ لنگڑی ہے اس لئے اسے شک ہو گیا ہے کہ وہ اس کی ماں ہو سکتی ہے اور پھر وہ اسے اپنی ماں کے بارے میں کیا بتائے گا؟ یہ کہ وہ اسے چھوڑ کر غائب ہو گئی! جان محمد نے اسے دوپہر کے بعد آنے کا کہا۔ وہ اس وقت شاید کسی کام میں مصروف تھا۔ گلو چپ چاپ لوٹ آیا۔ سارے راستے اس کے دماغ پر گرد سی جمی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ ڈولتے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہوا تو چاچا گلی میں' گھر کے تھڑے پر بے چین بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی لپک کر آیا۔

"کہاں گیا تھا تو؟"

"کہیں نہیں۔" گلو نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور سیدھا چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔

"گلو مجھے بتا تو بیٹا............ تو کہاں گیا تھا۔ یہ سن کر کے کہ............"

"چاچا! تو نے کہا تھا ناں کہ وہ............ لنگڑی تھی؟"

"ہاں............ مگر............"

"وہ بھی لنگڑی تھی۔ خوبصورت تھی۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولا۔

"گلو............ گلو تو پاگل ہو گیا ہے............ دنیا میں ہزاروں عورتیں لنگڑی ہوں گی۔ خوبصورت بھی ہوں گی۔ ہر لنگڑی عورت تیری ماں نہیں ہو سکتی۔" چاچا جھنجھلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیکھ گلو! اب تو میری زندگی اجیرن نہ کر............ میں نے تجھے یہ بات اس لئے نہیں بتائی کہ اب تو ہر لنگڑی اور خوبصورت عورت کے پیچھے باؤلے کتے کی طرح پھرتا پھرے۔ گلو بیٹا اگر تیری ماں کو ملنا ہوگا تو وہ مل جائے گی۔ خدا پر بھروسہ رکھ۔ ایسی حرکت نہ کر جس سے لوگ تجھ پر شک کریں۔"

بات تو چاچا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ دنیا میں ہزاروں عورتیں لنگڑی اور خوبصورت ہو سکتی ہیں۔ یہ بات گلو کی سمجھ میں آ گئی۔ پھر بھی ایک کانٹا سا تھا جو گلو کے دل کے اندر کہیں اٹکا رہ گیا تھا۔ پھر اچانک وہ چونک اٹھا۔ "چاچا!............ ماسی جنت کہاں ہے؟"

"کب کی مر کھپ گئی۔" چاچا نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔ "اب تو اسے ڈھونڈنے نہ نکل جائیو۔ دیکھ بیٹا! میں نے جتنا اسے تلاش کیا ہے ناں' تو نہیں جانتا۔ چل اب روٹی کھالے۔ میں نے تیرے لئے بکرے کا گوشت پکایا ہے۔" چاچا نے پیار سے کہا۔

"اور ہاں' تو کام پر نہیں گیا کیا؟"

"دوپہر کے بعد جانا ہے مجھے۔ ابھی گیا تھا۔ جسے گاڑی چلانا سکھانی ہے وہ ابھی مصروف تھا۔" گلو نے دل کو سنبھال کر کہا اور کلی کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند ہی منٹ بعد وہ دونوں روٹی کھا رہے تھے۔

☆===========☆===========☆

اس روز گلو نے پہلی بار گاڑی چلائی۔ جان محمد گاڑی چلا کر ایک بڑے میدان میں لے گیا تھا۔ وہاں سٹیئرنگ تھامتے ہوئے گلو کے ہاتھ کانپ اٹھے مگر بڑی جلدی اس نے سب کچھ سیکھ لیا۔ اب وہ جان گیا تھا کہ ایکسی لیٹر کسے کہتے ہیں' گیئر کیسے بدلا جاتا ہے اور کلچ کس کام آتا ہے۔ تین گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد اس نے میدان کا ایک چکر لگا ہی لیا تھا۔ جان محمد نے پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر وہ اسی طرح محنت اور لگن سے سیکھتا رہا تو گاڑی چلانے میں اسے ہفتہ بھر بھی نہ لگے گا۔ یہ سنتے ہی گلو کا سینہ پھول گیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنے کام میں لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بسے خوابوں کی تعبیر اس کے سامنے تھی۔ ایک ہفتہ............ صرف ایک ہفتے کے بعد وہ یہ لمبی سڑکوں پر چمچماتی ہوئی کار چلا رہا ہوگا' یہ سوچ کر ہی خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

شام میں وہ گھر پہنچا تو تالا دیکھ کر بجھ گیا۔ اس نے تو سوچا کہ آج وہ گھر جا کر چاچا سے لپٹ جائے گا۔ اسے بتائے گا کہ آج اس نے گاڑی چلائی ہے مگر چاچا تو گھر پر تھا ہی نہیں۔ اسے یقین تھا کہ وہ حسب معمول دھوپ میں ٹھیلا لئے کھڑا ہوگا۔ وہ باز آنے والوں میں سے نہیں تھا۔ گلو نے سوچا کہ اسے جلد از جلد پرچون کی دکان لے کر دے دے گا تاکہ وہ دھوپ میں جلنا تو چھوڑ دے۔ یہی سوچتا ہوا وہ اس نکڑ کی طرف چل پڑا جہاں چاچا پھلوں کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ دور ہی سے اسے چاچا قادر داد نظر آ گیا جو پان والے مرزا جی سے گپیں لڑا رہا تھا۔

"چاچا! پھر تو چلا آیا یہاں پر۔" پان والے مرزا کو متوجہ پا کر گلو نے ذرا رعونت سے کہا۔

"دیکھا............ دیکھا تو نے............ میں نے نہیں کہا تھا کہ وہ آتے ہی غصہ ہونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگے گا۔" چاچا نے پلٹ کر پان والے مرزا جی سے کہا۔

"ہاں.......... ہاں قادر داد! یہ تو تیری خوش بختی ہے۔ گلو کی تو ایک دم کایا پلٹ گئی۔" مرزا جی نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا تو اس کا سینہ ایک دم پھول گیا۔

"مرزا جی! آپ ہی اسے سمجھائیے۔ اب اس کی عمر دھوپ میں جلنے کی نہیں ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ میں پرچون کی دکان لے دوں گا۔ اسے کہئے کہ اتنے دن صبر کر کے گھر میں پڑا رہے گا۔ کچھ آرام ہی مل جائے گا۔"

"ویسے قادر داد' بیٹا کہتا تو ٹھیک ہے۔ کچھ آرام کر لے گا تو ہڈیوں کا گودا جم جائے گا۔" مرزا جی نے مسکرا کر کہا۔

قادر داد کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے خوشی اس سے سنبھالی نہیں جا رہی ہو۔ وہ یوں گلو کو بار بار دیکھتا تھا جیسے اسے دو جہاں کی بادشاہت مل گئی ہو۔ گلو نے پہلی بار محسوس کیا کہ دنیا کمانے والے کی کتنی عزت کرتی ہے۔ یہ وہی چاچا تھا جو ہر وقت اسے گالیاں دیتا رہتا تھا۔ یہ مرزا جی بھی وہی تھے جو اسے دیکھتے ہی زور سے ہنکارا بھر کر منہ پھیر کر لیا کرتے تھے بلکہ کئی بار تو اسے دیکھ کر لاحول بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ آج وہ بھی اسے اتنی لگاوٹ سے دیکھ رہے تھے جیسے گلو کی شکل میں ان کی بھی لاٹری نکل آئی ہو۔

"اچھا تو چل۔ میں یہ سمیٹ کر آ رہا ہوں۔" چاچا نے اسے چابی دیتے ہوئے کہا۔

چاچا نے پہلی بار فوراً ہی اس کی بات مان لی۔ گلو بڑے انداز سے پلٹ کر مسکراتا ہوا گھر کی طرف بڑھ گیا۔ آج وہ بہت خوش تھا۔ آج اسے سب کچھ بھول گیا تھا۔ کل والی یاسیت ختم ہو گئی تھی۔ طبیعت میں ایک جولانی سی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آج چارپائی پر پاؤں پسار کر خوب سوئے' سب کچھ بھول جائے اور صرف یہ یاد رکھے کہ اب اس کے دن پھرنے والے ہیں۔ دروازہ کھول کر اس نے جونہی قدم اندر رکھا' گھر کی ویرانی منہ پھاڑے اس کی طرف لپکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گلو نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور جوتے اتار کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ گھر کا سناٹا کانوں میں گونجتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ چاچا ٹھیک کہتا ہے کہ اتنے ویران گھر میں تو وہ آرام بھی نہیں کر سکتا۔ یہاں پڑا پڑا تو اور بیمار ہو جائے گا۔ مہینہ گزرنے میں تو ابھی ڈھیر سارے

دن پڑے تھے۔ مہینہ گزرتا تو اسے تنخواہ ملتی' تنخواہ ملتی تو دال روٹی میں ختم ہو جاتی۔ پرچون کی دکان پانچ سو روپے میں تو آتی نہیں پھر.......... پھر وہ کیا کرے؟ استاد فتح سے ایک دم' کام کئے بغیر کیسے اتنے پیسے مانگ لیتا کہ چاچا کو دکان کر دیتا۔ اس نے سوچا کہ اس موضوع پر جان محمد سے بات کر کے دیکھے گا۔ شاید وہ کوئی سبیل نکال لے۔ ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہا تھا کہ چاچا آ گیا۔

☆============☆============☆

"کیا کرے گا تو اتنے پیسوں کا؟" جان محمد نے گلو کو مسکین سی شکل بنائے دیکھ کر پوچھا۔

"چاچا کو دکان کر کے دوں گا۔ جانو تو میری تنخواہ سے کٹوا دینا۔ تو چاہے تو استاد فتح تیری بات مان کر مجھے پیسے دے سکتا ہے۔" اس نے خوشامدی انداز میں کہا۔

"گلو! تو چاچا کے چکر سے نکل نہیں سکتا؟"

"جان محمد.......... ایسی باتیں نہ کیا کر مجھ سے۔"

"اچھا یہ بتا کہ کیا تو نہیں چاہتا کہ تیرے پاس پیسہ ہو' مکان ہو' تو بھی چمچماتی کار میں استاد فتح کی طرح اکڑ کر بیٹھا کرے۔"

"کیوں نہیں چاہتا۔ پر پھر تو وہی باتیں کر رہا ہے' بھلا اس سے چاچا کا کیا تعلق؟"

"ہے اس کا تعلق۔ سالا پتہ نہیں دنیا کو کس انداز میں دیکھتا ہے۔ ہر وقت نصیحتیں کرتا رہتا ہے۔ اگر تو اس کی نصیحتوں پر یوں ہی عمل کرتا رہا تو زندگی بھر دال روٹی کھاتا رہے گا۔ دھیلا بھی نہ جوڑ سکے گا۔"

"وہ کب روکتا ہے مجھے کمانے سے۔ وہ تو بہت خوش ہے۔ سب کو بتاتا پھر رہا ہے کہ گلو اب کمانے لگا ہے۔ وہ منع نہیں کرتا جان محمد' ہاں نصیحتیں کرتا رہتا ہے اور یہ ٹھیک بھی تو ہے نا۔ مجھے دیکھ' میں چوری کرتا رہا۔ جھگڑے کرتا رہا۔ اگر وہ نصیحت نہ کرتا اور میں ڈاکو بن جاتا تو..........؟"

"ٹھیک ہے' تو ڈاکو تو نہیں بنا ناں؟" جان محمد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اب ایک کام کر' اسے پرچون کی دکان کے لئے پیسے میں دے دوں گا مگر میری ایک شرط ہے۔"

"ہاں بول.......... میں تیری ہر شرط مانوں گا۔" گلو فوراً ہی تیار ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جتنے دن میں تو گاڑی چلانا سیکھے گا۔ اتنے دن میں اسے دکان مل جائے گی مگر پھر تو اپنی مرضی نہیں کرے گا' نہ میں روز روز یہ سنوں گا کہ چاچا بیمار ہے اور تجھے اس کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھنا ہے۔ اسے دکان کرا دے اور سمجھ لے کہ تیرا کام ختم ہو گیا۔ پھر تیرا کام استاد فتح کے لئے شروع ہو گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" گلو نے فوراً شرط مان لی۔

جان محمد نے گلو سے وعدہ کر لیا کہ وہ ہفتہ بھر میں اسے اتنی رقم دے دے گا کہ وہ چاچا کو پرچون کی دکان کرا دے۔ گلو کے لئے اب سارا مسئلہ یہ تھا کہ چاچا کو اتنی بہت سی رقم کے لئے کیا کہے گا۔ اگر یہ کہتا ہے کہ سیٹھ نے دیے ہیں تو وہ پھر جان کھا جائے گا کہ کام کیے بغیر کسی نے اتنی رقم کیسے دی۔ بہرحال یہ باتیں سوچنے کے لئے ابھی بڑا وقت پڑا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ ساری رقم ایک بار نہیں دے گا بلکہ تھوڑی تھوڑی کر کے دے گا تاکہ اسے شک نہ ہو اور کام بھی بن جائے۔ اس روز بھی اس نے تین گھنٹے گاڑی چلانے پر صرف کیے اور رات کو چاچا سے کہہ دیا کہ وہ کہیں کرائے کی دکان ڈھونڈ لے۔

چاچا یہ بات سن کر پھول کر کپا ہو گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ سوالات کر کے اس کا مغز کھائے' گلو نے کہہ دیا کہ وہ اپنے سیٹھ سے بات کر رہا ہے کہ وہ اس کی چھ ماہ کی تنخواہ ایڈوانس دے دے۔ وہ راضی ہو جائے گا تو وہ دکان کا ایڈوانس دے کر دکان لے لے گا پھر رفتہ رفتہ سامان ڈالتا رہے گا۔ چاچا پتہ نہیں کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔ گلو نے اسے بتایا کہ دو چار ہی روز میں گاڑی سیکھ لے گا تو اسے اتنا وقت نہیں ہو گا کہ وہ دکان ڈھونڈتا پھرے اس لئے چاچا ٹھیلا لگانے کی بجائے دکان ڈھونڈ لے۔ یہ بتانے سے مقصد اس کا صرف اتنا تھا کہ چاچا اس کی مصروفیت سے ایک دم ہی نہ بدک جائے۔

☆===========☆===========☆

ہفتہ چٹکی بجاتے گزر گیا۔ اس دوران میں گلو اتنا مصروف رہا کہ خالہ حمیدہ کے گھر بھی نہ جا سکا۔ چاچا کی صورت صرف رات ہی کو دیکھنے کو ملتی تھی۔ دن میں اگر گلو کسی وقت گھر آیا بھی تو چاچا نہ تھا۔ اب اس نے تالے کی دو چابیاں بنوا لی تھیں۔ ایک اس کے پاس رہتی تھی اور دوسری قادر داد کے پاس۔ پان والے مرزا جی نے چاچا کی مدد کی اور اپنے قریب ہی ایک دکان کا آدھا حصہ قادر داد کو کرائے پر دلوا دیا۔

قادر داد بہت خوش تھا۔ ایک تو اس لئے کہ گلو دھندے سے لگ گیا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ آج لوگوں میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ وہی لوگ جو اسے اس کے لمبے چوڑے گلو کے لئے طعنے دیتے تھے' آج حیرت سے قادر داد کے چہرے پر پھوٹتے ہوئے رنگ دیکھا کرتے تھے۔ سبھی حیران تھے کہ گلو کے پاس ایسی کون سی جادو کی چھڑی آ گئی جس کے گھماتے ہی اس کی کٹیا پر ہن برسنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے قادر داد ٹھیلا بیچ باچ کر پرچون کی دکان کا مالک بن گیا۔

خالہ حمیدہ یہ سن کر دو بار آئی مگر گلو سے ملاقات ہی نہ ہوئی۔ وہ قادر داد کو کہہ گئی کہ چھٹی کے روز وہ اور گلو دن کا کھانا اس کے گھر کھائیں۔ قادر داد نے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کی دعوت گلو تک پہنچا دے گا مگر یہ وعدہ نہیں کرتا کہ وہ دعوت پر آئیں گے کہ نہیں۔ یہ سب گلو پر منحصر تھا۔ اس کے پاس وقت ہو گا تو آئیں گے ورنہ نہیں' پھر بھی خالہ حمیدہ کہہ گئی تھی کہ وہ گلو کو مجبور کرے۔ قادر داد جانتا تھا کہ حمیدہ اس قدر اصرار کیوں کر رہی ہے۔ نازاں جیسے ہیرے کو ٹاٹ کے پیچھے چھپائے رکھنا اس کے لئے عذاب ہو گیا تھا اور وہ بھی ایک بیوہ عورت کے لئے۔ اس نے سوچا کہ گلو اب ٹھیک ٹھاک کما رہا تھا۔ پرچون کی دکان بھی چل پڑی تھی۔ گھر کا دال دلیا تو قادر داد بھی چلا سکتا تھا۔ گلو کی تنخواہ تو صاف بچ جاتی۔ پہلے چھ ماہ کی تنخواہ تو ایڈوانس لے چکا تھا مگر اس کے بعد اس کی تنخواہ تو بچنا ہی تھی۔ ان چھ ماہ بعد قادر داد بہو لا سکتا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے پلاننگ کر لی اور گلو سے بات کرنے کا تہیہ بھی کر لیا۔ اس شام جب گلو کام سے لوٹا تو قادر داد نے بات چھیڑ دی اور خالہ حمیدہ کی دعوت بھی دے دی کہ جمعے کے روز ان دونوں کا کھانا وہاں ہے۔

"کیوں؟" گلو نے کلی کرتے ہوئے پوچھا۔ "ویسے تو کبھی خالہ حمیدہ نے چائے کو بھی نہ پوچھا تھا۔ یہ کام پر لگتے ہی کیا میرے اندر سرخاب کے پر نکل آئے ہیں؟" یہ سب کچھ گلو نے خالہ حمیدہ کے خلاف نہیں کہا تھا بلکہ وہ قادر داد کے منہ سے سننا چاہتا تھا کہ پہلے والے گلو اور اب کے گلو میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

قادر داد بے اختیار بول اٹھا۔ "لے........... پہلے کی بات الگ تھی۔ اب تو کماؤ پوت ہے گلو۔ زندگی اسی کا نام ہے' انسان کی عزت جبھی ہوتی ہے جب وہ اپنے پیروں پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑا ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے............ دیکھوں گا۔ اگر کوئی کام نہ ہوا تو جائیں گے۔" گلو نے ٹال دیا۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ اب نازاں کے بارے میں سوچتا نہیں تھا۔ نارنجی پھول اب بھی اس کے خوابوں میں کھلے ہوئے تھے۔ راتوں کے سناٹے میں اکثر پائل کی چھنکار گونج اٹھتی تھی اور پھر یہی چھنکار مسکراہٹ بن کر اس کے موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پر پھیل جایا کرتی تھی۔ بات تو صرف اتنی تھی کہ استاد فتح نے اس کے ذمے ہزاروں چھوٹے موٹے کام لگا دیئے تھے۔ ابھی وہ گاڑی چلانے میں پکا نہیں ہوا تھا' وہ اب بھی گاڑی لے کر نکلتا تھا تو جانو اس کے ساتھ ہوتا تھا اور جانو کی موجودگی میں گلو ایک مشین بن کر رہ جاتا تھا۔

گلو نے تو سوچا تھا کہ جب وہ گاڑی چلانے لگے گا تو استاد فتح کو لے کر نکلا کرے گا۔ سفید براق قمیض' سفید پتلون اور سفید چھجے دار ٹوپی لگا کر وہ کوئی فوجی افسر لگے گا مگر ابھی تک اسے وہ لباس نہیں ملا تھا۔ نہ ہی وہ اب تک استاد فتح کو لے کر نکلا تھا۔ استاد کہیں جاتا تو جانو اکثر اسے گلی کے نکڑ پر اتار دیا کرتا تھا اور کہتا۔

"گلو! تو کچھ دیر آرام کر لے۔ میں استاد فتح کو لے کر ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ جلدی لوٹ آؤں گا۔"

اور گلو جل کر کباب ہو جاتا۔ وہ خوب سمجھ رہا تھا کہ جانو اس کے اور استاد فتح کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ابھی وہ اتنا پرفیکٹ نہیں ہوا ہے کہ اکیلا گاڑی لے کر جا سکے۔ گلو بڑی دیر میں پرفیکٹ کا مطلب سمجھا تھا اور جب اسے پتہ چلا کہ یہ لفظ انگریزی کا ہے تو وہ حیران رہ گیا کہ جانو انگریزی بھی جانتا ہے۔ بہرحال وہ اکیلا گاڑی لے کر نکلنا چاہتا تھا مگر اب تک اسے ایسا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ جانو کچھ دیر کو گاڑی اسے دے دے تاکہ وہ چاچا کو گاڑی میں اپنے برابر بٹھا کہ خالہ حمیدہ کے گھر جا سکے مگر جانو ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ ابھی وہ ایسا پکا ڈرائیور نہیں بنا کہ گاڑی اکیلے لے کر نکل سکے۔

☆===========☆===========☆

استاد فتح اس پر بہت خوش تھا۔ کئی بار اس کا سامنا ہوا تھا۔ جانو اسے بتا چکا تھا کہ وہ

گاڑی سیکھ گیا ہے۔ اس روز بھی وہ جانو کو برابر بٹھائے گاڑی چلاتا ہوا استاد فتح کے بنگلے میں داخل ہوا تو سامنے ہی استاد فتح کھڑا ایک شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ گلو نے جان بوجھ کر گاڑی استاد فتح کے قریب کھڑی کی' تیزی سے گاڑی سے نکلا اور اسے یوں سلیوٹ مارا کہ اس کے برابر کھڑا شخص بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیسے ہو گلو؟" استاد فتح نے مسکرا کر پوچھا۔

"اچھا ہوں استاد۔" اس نے دانت نکال کر جواب دیا۔

"جانو! تم تین روز کے لئے اسلام آباد جا رہے ہو۔ شام تک تیاری کر لو۔ تمہیں امانت کے ساتھ جانا ہے۔"

"جی استاد۔" جانو نے جواب دیا۔

گلو کو لگا جیسے جانو بجھ کر رہ گیا ہو۔ گلو نے اسی وقت سوچ لیا کہ جانو کے جاتے ہی وہ استاد فتح کے قریب ہونے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس روز دن میں گھر جانے کا ارادہ بھی ترک کر چکا تھا۔ ویسے بھی اگر جانو جا رہا تھا تو گلو کو وہیں رہنا تھا۔ یہ گلو نے صرف سوچا ہی نہیں بلکہ استاد نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ آج اسی بنگلے پر رہ جائے۔ استاد سے یہ بات سن کر تو جیسے گلو کی مراد بر آئی تھی۔ اس نے خوامخواہ ایسے جھک کر تعظیم دی تھی جیسے اس کے سامنے استاد فتح نہیں بلکہ کوئی بادشاہ کھڑا ہو۔

جانو اپنا سامان تیار کرنے کمرے میں چلا گیا۔ استاد فتح نے گلو سے کرسیاں لانے کو کہا۔ گلو نے ایک کونے میں الٹی رکھی بید کی کرسیاں لان میں گھنے درخت کے سائے میں ڈال دیں۔ استاد فتح اور امانت نامی وہ شخص دونوں وہاں بیٹھ گئے۔ گلو بے وجہ ہی گاڑی صاف کرنے لگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ استاد فتح کی نگاہوں کے سامنے رہنا چاہتا تھا۔

اسے سامنے دیکھ کر استاد نے اسے اندر سے ٹھنڈی بوتلیں لانے کو کہا تو گلو لپک کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو حیران کھڑا رہ گیا۔ اس برآمدے تک وہ پہلے بھی آیا تھا۔ سامنے سفید جالی دار دروازہ بھی تھا مگر اس دروازے کے علاوہ بھی وہاں تین دروازے اور تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ اندر کوئی بھی نہ تھا جس سے وہ بوتلیں مانگتا۔

دیر ہو رہی تھی۔ وہ گھبرا رہا تھا۔ استاد فتح کا حکم جلد از جلد پورا کرنا چاہتا تھا' واپس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا کر اس سے پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ کہاں جائے۔ اس کی بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کر کے سامنے کا جالی دار دروازہ کھول لیا۔ دروازہ کھولتے ہی اسے یوں لگا جیسے اس نے کوئی طلسمی دروازہ کھول لیا ہو۔ ایک بہت بڑے ہال میں سرخ دبیز قالین بچھا تھا۔ ایک طرف انتہائی خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ چھت پر لٹکتے فانوس ہیروں کی طرح چمک رہے تھے۔ دیوار پر بنی الماری میں انتہائی خوبصورت اور نازک نازک سی چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ وہ مبہوت سا کھڑا پورے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک اسے ایک آواز نے چونکا دیا۔

"کیا ہے؟"

وہ یہ آواز سن کر اچھل پڑا تھا۔ اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں پر ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"جی وہ........... وہ جی استاد نے بوتلیں مانگی ہیں۔ ٹھنڈی بوتلیں۔"

اس لڑکی کے پوچھنے پر اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ وہ لڑکی آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئی۔

"تم کون ہو؟" اس نے ایک دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں.......... گلو ہوں۔"

"تم کیا کرتے ہو؟"

وہ اندر چلی گئی تھی مگر گلو نے جواب دیا۔ "میں جی گاڑی چلاتا ہوں۔"

وہ فوراً ہی واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تین بوتلیں تھیں۔ بوتلیں ہاتھ میں دیتے ہوئے اس کی نگاہیں گلو کے چہرے پر جمی رہیں۔ گلو نے دوسرے ہی لمحے نگاہیں جھکا لیں۔ نہ معلوم کیوں اسے لگا جیسے یہ نگاہیں' بالکل یہی تاثر' وہ پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔

وہ بوتلیں لے کر پلٹ گیا مگر وہ نگاہیں اس کے دماغ میں چپکی رہ گئیں۔ وہ دھیما دھیما لہجہ اور سلگتی نگاہیں اسے بے چین کر گئی تھیں۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" اسے باہر آتا دیکھ کر استاد نے سخت لہجے میں پوچھا تو گلو کے پسینے چھوٹ گئے۔

"وہ جی........... اندر........... کوئی تھا نہیں........... پھر..........."

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ "جاؤ جانو کو بلا لاؤ اور آج تم گھر نہیں جانا۔ مجھے بہت سے کام ہیں۔"

استاد کی بات سن کر گلو رکا نہیں۔ آج اس کا سخت لہجہ سن کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہاں سے جانو کے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے گلو نے پروردگار سے دعا کی کہ وہ اسے بھی بالکل استاد فتح جیسا بنا دے' ایک دن ایسا بھی آئے کہ اس کے لہجے پر بھی بڑے بڑے کڑیل جوانوں کے دل دہل جائیں۔

☆===========☆===========☆

جانو اسی شام امانت کے ساتھ اسلام آباد چلا گیا۔ گلو نے چاہا کہ ذرا دیر کو گھر یا دکان جا کر چاچا کو بتا دے کہ وہ اس کا انتظار نہ کرے مگر استاد فتح سے اجازت لینے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ رات آٹھ بجے تک وہ اسی چکر میں الجھا رہا۔ اس دوران میں استاد فتح کہیں گیا تو نہیں البتہ ان کے پاس لوگ آتے رہے۔ گلو مسلسل الرٹ کھڑا رہا۔ یوں اکڑے ہوئے کھڑے رہنے سے اس کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ وہ تو خوش تھا کہ آج اسے اکیلے گاڑی چلانے کا موقع ملے گا۔ آج اس کا ایک دیرینہ خواب پورا ہو گا۔ وہ استاد فتح کے لئے گاڑی کا دروازہ کھولے گا اور پھر اسے لے کر لمبی سیاہ سڑکوں پر نکل جائے گا مگر شام کا ملگجا پن رات کی تاریکی میں اتر گیا اور لوگوں کی آمدورفت جاری رہی۔ گلو بھاگ بھاگ کر کبھی چائے بسکٹ اور کبھی بوتلیں لاتا رہا۔

رات تقریباً آٹھ نو بجے استاد فتح فارغ ہوا تب گلو نے ہمت کر کے اس سے اجازت چاہی مگر اس نے کہا۔ "میرے ساتھ کام کرنے شرائط میں یہ بات شامل تھی کہ تم کسی کام کو انکار نہیں کرو گے۔"

"میں انکار تو نہیں کر رہا استاد' میں نے تو کہا کہ اب شاید کام نہیں رہا اس لیے۔"

استاد فتح کے اونچے قہقہے نے گلو کی بات مکمل نہ ہونے دی۔ وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔

"ہمارا کام کبھی ختم نہیں ہوتا گلو۔" استاد فتح نے قہقہہ دبا کر کہا۔ "ادھر بیٹھ۔"

استاد فتح نے اپنے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا تو گلو ہواؤں میں اڑنے لگا۔

"گلو' پیسے میں کتنی طاقت ہے تجھے معلوم ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

استاد فتح نے سوال کیا تھا مگر جواب دینے کی بجائے گلو بے معنی سے انداز میں سرہلا کر رہ گیا۔ کرسی پر وہ یوں بیٹھا تھا جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ پڑے گا۔

"یہ جو لوگ میرے پاس آ رہے تھے ناں' یہ سب لکھ پتی' کروڑ پتی لوگ تھے۔ میرے آگے پالتو کتے کی طرح سر جھکائے رکھتے ہیں۔ میں چاہوں تو منٹوں میں انہیں خاک میں ملا دوں۔ دھیلے دھیلے کو محتاج بنا دوں' کیوں............؟ جانتا ہے کیوں؟"

گلو نے انکار میں سرہلا دیا۔

"اس لئے کہ یہ لوگ' یہ پیسہ میرے ہی دم سے کما رہے ہیں۔ میرے آگے سر اٹھا کر بولنے کی جرات نہیں ہے ان میں۔ کیا تو نہیں چاہتا کہ تو بھی ایسا بن جائے کہ لوگ تیرے سامنے سر اٹھاتے ہوئے گھبرائیں۔ تیرے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتے رہیں۔"

"استاد............ اسی لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔" بڑی ہمت کی گلو نے اور دل کی بات زبان پر لے آیا۔

"ہاں............ یہ بات! تو پھر سن! اتنی پوزیشن ایسے ہی نہیں بنا لی میں نے' دن رات کام کیا ہے۔ گدھوں کی طرح کام کرتا رہا ہوں میں۔ لوگوں کی جھڑکیاں سنی ہیں' بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں تب یہاں تک پہنچا ہوں! اگر تجھے بھی مجھ جیسا بننا ہے تو کام کرنا پڑے گا۔ دن رات کام کرنا پڑے گا۔ سمجھا تو اور سب سے بڑی بات سن لے' ہمارا کام رات کے اندھیروں میں شروع ہوتا اور روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہمارا کام اب شروع ہوگا اور تو چھٹی مانگ رہا ہے۔ جانتا ہے جانو نے دن رات کام کر کے کتنا روپیہ جمع کر لیا ہے؟ گلستان جوہر میں پورا مکان کھڑا کر لیا ہے اس نے۔"

"استاد............ میں............ میں یہی چاہتا ہوں جی۔ کام میں سارے کروں گا مگر چاچا کو............ وہ رات کو بہت پریشان ہو جائے گا ناں............ اس لئے............"

"چھوڑ دے اس بڈھے کو۔ جانو بتا رہا تھا کہ وہ............ خیر چھوڑ' میں جانتا ہوں اسے۔ بہت زمانے سے جانتا ہوں۔ بڑی خراب زبان کا بڈھا ہے۔"

ایک تیز دھار چھری سی تھی جو گلو کا کلیجہ کاٹ گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ استاد فتح کی موٹی موٹی اوپر کو مڑی ہوئی مونچھیں اکھاڑ دے۔ وہ خود گالیاں بھی سن سکتا تھا مگر چاچا کے خلاف ایک حرف بھی اسے برداشت نہ تھا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ

اسی وقت استاد فتح مڑ گیا ورنہ وہ شاید گلو کا چہرہ دیکھ کر ہی بھانپ جاتا۔

"چل بھوک لگی ہے۔ تجھے اچھا کھانا کھلاؤں گا۔"

استاد فتح گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ گلو نے آگے بڑھ کر' لپک کر دروازہ کھولا اور استاد فتح کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے خود ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ پہلی بار جانو کے بغیر' وہ بھی استاد فتح کے ساتھ۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ کافی کنفیوز تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس نے بڑی احتیاط سے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی اور لمبی سیاہ سڑک پر آ گیا۔ راستے بھر فتح اسے شیشے میں اتارتا رہا۔ گلو ہواؤں میں اڑتا رہا۔ انہوں نے ایک بڑے ریستوران کے باہر گاڑی ہی میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ نوالے گلو کے حلق میں اٹک رہے تھے مگر اسے اتنا احساس تھا کہ کھانا بڑے مزے کا ہے' جیسے تیسے اس نے پیٹ بھر لیا۔ واپسی پر وہ بہت خوش تھا اور اس وقت تو خوشی سے بے حال ہو گیا جب استاد فتح نے اسے خوش خبری سنائی کہ اب وہ اسے اپنے سارے کام سمجھا دے گا اور کل سے اسے جو کام بتائے گا اس کے بعد اس کے گھر پر ہن برسنے لگے گا۔

"استاد' میں محنت سے نہیں گھبراتا۔ ساری رات کدال چلا سکتا ہوں۔ اتنی طاقت ہے میرے بازوؤں میں۔" گلو بے اختیار کہہ اٹھا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ استاد فتح اس پر مکمل اعتماد کر کے کام بتائے۔ گلو کا خیال تھا کہ اس کی بہت بڑی بڑی بلڈنگیں بن رہی ہیں۔ ایک بار جانو نے اسے بتایا تھا کہ استاد فتح بڑی بڑی بلڈنگوں کا مالک ہے۔

"میرے ساتھ پیسہ کمانے میں کدال نہیں چلانا پڑتا۔" استاد فتح یوں ہنس پڑا جیسے کسی بچے کی انتہائی معصوم بات سن کر ہنس پڑا۔ "معمولی سا کام ہوتا ہے اور تھیلا بھر کر روپے ملتے ہیں۔"

گلو ہونقوں کی طرح منہ کھولے دیکھتا رہ گیا۔

"اب آج رات کو تین بجے تجھے ٹیکسی لے کر ڈیفنس جانا ہے۔ ٹیکسی تو باہر چھوڑ دینا' بڑی سڑک پہ............ نہیں ایسا کرنا' میں تجھے یہاں تک لے آؤں گا۔ سڑک پر چھوڑ دوں گا۔ ابھی میں تجھے وہ گھر دکھا دیتا ہوں جہاں تجھے رات کو آنا ہے۔ تیرے پاس چھوٹا سا بلیک تھیلا ہوگا وہ تھیلا تجھے اس کوٹھی کے اندر پچھلی طرف دائیں دیوار کے پاس رکھ کر آ جانا ہے۔ دوسرے روز میں تجھے پانچ ہزار روپے دوں گا۔ اتنے پیسے کبھی تو نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خواب میں بھی دیکھے نہ ہوں گے۔ بول دیکھے ہیں اتنے پیسے؟ بول!"

اور گلو نے خواب کے سے عالم میں سر انکار میں ہلا دیا۔ اب تو اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقت نہیں ہے' وہ شاید اپنی چارپائی پر پڑا ہوا کوئی سہانا سا خواب ہی دیکھ رہا ہے۔ ابھی چاچا کی بڑبڑاہٹ سے اس کی آنکھ کھل جائے گی اور استاد فتح' اس کی اتنی خوب صورت باتیں' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا گلو' سب ہی غائب ہو جائیں گے اور پھر کچھ ہی دیر بعد جانو آ کر ہارن دے گا اور وہ اٹھ کر پھر پالتو کتوں کی طرح جانو کے پیچھے پیچھے پھرنے لگے گا۔

"اس گلی میں موڑ لے۔"

استاد فتح کی آواز نے اسے چونکا دیا' وہ ہوش میں آنے کے باوجود مدہوش تھا۔ اس نے آنکھ بچا کر انگلی دانتوں تلے داب لی' ایک سسکاری کے ساتھ ہی انگلی منہ سے باہر آ گئی اور وہ ہاتھ جھٹک کر رہ گیا۔

"کیا ہوا؟"

استاد فتح نے سسکاری کی آواز سن کر پوچھا۔

"کک............ کچھ نہیں استاد۔"

"وہ دیکھ' بس یہاں روک لے۔" استاد فتح نے جیسے ہی کہا گلو نے بریک لگا دیا۔

"وہ جو لال پتھر سے بنی کوٹھی ہے ناں' بس اسی کوٹھی میں جانا ہے تجھے۔ رات کو یہاں کوئی نہیں ہوتا۔ نہ کتا ہے نہ چوکیدار۔ باہر کی دیوار بھی اونچی نہیں ہے۔ تجھے دیوار پھاند کر اندر جانا ہے' یاد رکھ اس طرف کی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر جانا ہے۔" استاد فتح نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ "بس جہاں یہ دیوار ختم ہوگی' وہیں تھیلا رکھ دینا ہے۔ بڑی سڑک سے یہاں تک تجھے پیدل آنا ہوگا۔ میں آگے والے نکڑ پر تیرا انتظار کروں گا۔ تیرے پاس صرف سات منٹ ہوں گے' ان سات منٹ میں اگر تو مجھ تک نہ پہنچا تو پھر میری ذمے داری نہ ہوگی۔ میں چلا جاؤں گا۔ اب یہاں سے گاڑی سیدھی نکال لے۔" وہ کسی مشین کی طرح بولے چلے جا رہا تھا۔

گلو نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا لی۔ گلی کے ختم ہوتے ہی ایک خالی پلاٹ تھا جس میں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

"میں یہاں........... ان جھاڑیوں کے پیچھے گاڑی میں موجود رہوں گا۔ تجھے سات منٹ میں یہاں پہنچنا ہے گلو۔ پیسے تجھے اگلی صبح ہی مل جائیں گے۔ یاد رکھنا کہ استاد فتح وعدے کا پکا ہے۔ پانچ ہزار پہلی کرن نکلنے سے پہلے ہی تیار ہوں گے۔"

آخری جملے نے گلو کو پھر آسمان پر پہنچا دیا۔ پانچ ہزار کی رقم بہت بڑی تھی۔ چاچا نے شاید اپنی پوری زندگی میں اتنا کمایا نہ ہوگا جتنا گلو ایک رات میں وہ بھی معمولی سا کام کر کے کمانے والا تھا۔

"اس تھیلے میں کیا ہوگا استاد؟" نہ معلوم اس کوڑھ مغز کے دماغ میں کیا آیا کہ وہ سوال کر بیٹھا۔

اسے ایک پھنکار سی سنائی دی اور وہ لرز اٹھا۔ "یہ پیسے محنت کے نہیں ہیں گلو' محنت تو ہے ہی نہیں اس کام میں' یہ پیسے خاموش رہنے کے ہیں۔ زبان بند رکھنے کے' سمجھا تو............؟"

اور وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا کر رہ گیا۔ پھر راستے بھر اس کے دماغ میں بگولے سے اٹھتے رہے۔ اس نے اپنے تئیں سوچ کے ہزاروں گھوڑے دوڑا لئے کہ تھیلے میں کیا ہوگا' آخر تھک ہار کر سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ پانچ ہزار روپے کی رقم جب بھی دماغ میں آتی' دماغ ٹھس ہو جاتا اور گلو اپنے چھوٹے سے مکان کی جگہ سفید چونا کیا ہوا ایک بڑا مکان دیکھنے لگتا۔ پرچون کے کھوکے کی بجائے یہ بڑا جنرل سٹور اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتا۔ سوکھا سڑا چاچا بھرے بھرے بدن کے ساتھ' چمکتی آنکھیں لئے تصور میں آ جاتا اور خود گلو کے بدن پر ریشمی کپڑے گدگدی کرنے لگتے۔ استاد فتح جیسی مونچھیں' اس کی جیسی انگوٹھیاں اور سنہری چین والی گھڑی اسے چندھیانے لگتی۔

"کہاں جا رہا ہے؟" استاد فتح کی آواز سے وہ پھر ہوش میں آ گیا۔

"جی استاد؟"

"اپنی گلی پیچھے رہ گئی۔"

گلو نے چاروں طرف دیکھا' وہ واقعی استاد فتح کے بنگلے والی گلی پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس نے گاڑی ریورس کی اور اس کے بنگلے کے دروازے پر کھڑی کر دی۔ ہارن دیتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ رات کے سوا گیارہ بجے تھے۔ استاد فتح کے بنگلے کے برآمدے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بڑی سی گھڑی پر نظر پڑتے ہی گلو بے چین ہو گیا۔ چاچا اب تک گلی کے کئی چکر کاٹ چکا ہو گا۔ یہ خیال اسے مضطرب کیئے دے رہا تھا۔ "سالا دن میں نہیں بتا سکتا تھا کہ رات کو کام ہے؟ کم از کم چاچا کو بتا دیتا کہ آج رات اس کا انتظار نہ کرے۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

استاد فتح اسے گاڑی میں بیٹھا چھوڑ کر اندر جا چکا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ واپس بھی آ گیا۔ اس بار اس کے ہاتھ میں کپڑے کا خاکی رنگ کا تھیلا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس چھوٹے سے تھیلے میں کافی وزن ہے۔ تھیلے کو پچھلی سیٹ کے نیچے رکھ کر استاد فتح گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آ گیا۔ اسے برابر والی سیٹ پر جانے کا اشارہ کر کے وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نہ معلوم کیوں گلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے استاد فتح بہت گھبرایا ہوا ہے۔ گھبرایا ہوا تو گلو بھی تھا' چاچا کا خونخوار چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے جم کر رہ گیا تھا۔ عام طور پر گلو دس بجے تک گھر چلا جاتا تھا پھر بھی چاچا اسے یہ بات سمجھانے سے باز نہیں آتا کہ دیر سے گھر لوٹنے والے بدمعاش اور اچکے ہوتے ہیں۔ اس بات پر گلو کا کئی بار جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے کئی بار لوگوں کی مثالیں دیں کہ لوگ رات تک محنت کرتے ہیں مگر ہر بار چاچا نے ثابت کر دیا تھا کہ رات گئے آنے والے ہلڑ بازی کرنے والے ہوتے ہیں یا جواری اور شرابی' بدمعاش اور اچکے۔ وہ کسی طرح یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سویرے شروع ہونے والا کام اتنی رات گئے تک بھی ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ مغرب تک گھر واپس آ جانے بضد رہا تھا۔

اور آج تو بہت رات ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں اور کتنا وقت لگنا تھا۔ استاد فتح بڑی تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ گلو دم سادھے اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ استاد فتح کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ جبڑوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کی تیز نگاہیں سکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ آج پہلی بار گلو نے اسے گاڑی چلاتے دیکھا تھا۔ وہ ایک مشاق ڈرائیور کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔ جتنے وقت میں گلو ڈیفنس سے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس سے آدھے وقت میں استاد فتح اسے پھر ڈیفنس لے آیا تھا۔

ایک گلی کے موڑ پر رک کر استاد نے دروازہ کھولا اور پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ اس سے پہلے کہ گلو دروازہ کھولتا اور پھرتی سے نیچے اترتا استاد فتح پچھلی سیٹ کے نیچے سے

کپڑے کا وہ تھیلا نکال چکا تھا اور اندر کی طرف منہ ڈالے پتہ نہیں کیا کر رہا تھا۔ گلو کو کچھ نظر نہ آیا۔ ویسے بھی جس جگہ وہ لوگ کھڑے تھے کافی اندھیرا تھا۔ چند ہی لمحوں بعد استاد فتح نے تھیلا گلو کی طرف بڑھا دیا اور جیب سے رومال نکال کر پسینہ صاف کرتے ہوئے وہ تیزی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "گلو! جتنی تیزی دکھا سکتا ہے دکھا۔ یہ تیرا امتحان ہے' جلدی کر۔ دائیں دیوار کے ساتھ ساتھ اندر چلے جانا اور آخری کونے میں رکھ کر جس قدر پھرتی سے ہو لوٹ آنا۔ جلدی کر۔" اس نے دوبارہ پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا اور اسی دوران میں اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے گھمالی اور زن کی آواز کے ساتھ ہی گلو کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

گلو حیران و پریشان کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس نے حیرت سے تھیلے کو دیکھا جس میں لوہے کی کوئی بھاری سی چیز تھی۔ اس نے چھو کر دیکھنا چاہا مگر دوسرے ہی لمحے سرپٹ دوڑ پڑا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسے سات منٹ کے اندر اندر یہ تھیلا اندر رکھ کر خالی پلاٹ تک پہنچنا ہے جہاں استاد فتح گاڑی لئے کھڑا ہو گا۔ تیز چلنے کے باوجود اس کے قدموں کی آواز نہیں ہو رہی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دم چھوٹا سا ہو گیا ہے۔ اسے چاچا کی پرچون کی دکان میں داخل ہونا ہے اور اس کے گولک سے پیسے نکالنا ہے۔ ایسے موقع پر وہ بلی کی سی چال سے بھاگا کرتا تھا کیونکہ اس پرچون کی دکان کے سامنے ہی غلام سرور چارپائی ڈال کر سویا کرتا تھا۔ غلام سرور ایک کرخت بوڑھا تھا جو بستی بھر کی پہرے داری کیا کرتا تھا بلکہ پہرے داری کا تو بس نام ہی تھا ورنہ رات کا زیادہ تر حصہ اس دکان کے سامنے چارپائی پر سویا کرتا تھا۔

اس کی نیند اتنی کچی تھی کہ اگر دور سے بھی کوئی گزرتا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا تھا اور اپنی گرج دار آواز میں پکارتا تھا۔ "کون ہے؟" اس کی آواز کی گونج گزرنے والے کے دل کو دہلا کر رکھ دیا کرتی تھی۔ کم از کم گلو کے ساتھ تو یہی ہوتا تھا۔ دو بار اس نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ پرچون کی دکان کا ایک پھٹا نکلا ہوا تھا جسے چاچا نے کسی نہ کسی طرح ٹھونک دیا تھا۔ اسے نکالنا مشکل نہ تھا اس لئے گلو کو کبھی پریشانی نہ ہوتی تھی مگر ایک روز نہ جانے غلام سرور کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جونہی اپنی کرخت آواز میں پکارا کون ہے؟ گلو کی چیخ نکل گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی آواز خالہ حمیدہ کی آواز سے بھی زیادہ کریہہ تھی۔ پہلی بار تو گلو نے اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لی تھی مگر دوسری بار اس نے معاف نہیں کیا اور اسے گدی سے پکڑ کر چاچا کے آگے لا پٹخا تھا۔ اس کے بعد گلو نے کئی بار چوری کی مگر پھر کبھی غلام سرور کے ہاتھ نہیں لگا۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے بلی کی چال چلنا سیکھ لیا تھا۔ آج وہی اس کے کام آ رہا تھا۔ وہ جس تیزی اور پھرتی سے دیوار کودا تھا کوئی دیکھ لیتا تو حیران رہ جاتا۔ لگتا تھا بجلی سی کوندی ہے اور گلو غائب ہو گیا ہے۔ وہ شاید چوتھا یا پانچواں منٹ تھا کہ وہ تھیلا رکھ کر بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کنارے پر پہنچ گیا جہاں سے اسے باہر سڑک پر اترنا تھا۔ اس نے جونہی دیوار سے دوسری طرف کودنا چاہا ایک نسوانی آواز نے اسے منجمد کر دیا۔ "کون ہے؟"

آواز بہت سہمی ہوئی تھی۔ اسے تو استاد فتح نے بتایا تھا کہ کوٹھی خالی ہو گی مگر یہاں گونجنے والی آواز نے اسے بوکھلا دیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بے اختیار باہر سڑک پر جا پڑا۔ اس کے گھٹنے اور کہنیاں زخمی ہو گئیں مگر اس نے زخموں اور تکلیف کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دوڑ لگا دی۔ اس کا رخ گلی کی دوسری جانب تھا جہاں پروگرام کے مطابق استاد فتح گاڑی میں اس کا منتظر تھا۔ اسے خوف تھا کہ اندر جو بھی تھا وہ شور مچا دے گا یا اس کے پیچھے کسی کو دوڑا دے گا مگر ایسا ہونے سے پہلے ہی وہ گلی کے کونے تک پہنچ گیا۔ استاد فتح شاید بلی کی سی آنکھیں رکھتا تھا۔ اتنے اندھیرے میں بھی اس نے گلو کو دیکھ لیا۔ گلو قریب پہنچا تو گاڑی اسٹارٹ تھی اور آگے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"جلدی کر۔" استاد فتح نے دبی دبی سرگوشی کی اور اس کے پوری طرح بیٹھنے سے قبل ہی گاڑی چلا دی۔

گلو پسینے میں شرابور تھا۔ گھٹنوں اور کہنیوں میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، اچانک یوں گر جانے کی وجہ سے دماغ بھی ٹھکانے پر نہیں تھا۔ سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ استاد فتح کئی سنسان گلیوں سے ہوتا ہوا اب مین روڈ پر نکل آیا ہے۔ یہاں آ کر گاڑی کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی جانے کیا ہوا کہیں بہت زور کا دھماکا ہوا تھا۔ تمام گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر رک گئی تھیں، عجیب بھگدڑ مچ گئی تھی۔ گو سڑک پر اتنا ٹریفک نہیں تھا پھر بھی ہر طرف افراتفری سی مچ گئی۔

خود گلو بھی اچھل پڑا۔ "کک......... کیا، یہ کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں۔ شاید گیس کا سلنڈر پھٹا ہے۔" استاد فتح نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے آنے والی گاڑی بڑی زور سے اس کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس لئے اتنا کہہ کر استاد فتح اتر کر گاڑی کے پچھلے حصے کو دیکھنے لگا۔ پچھلی گاڑی والے بھی اتر آئے تھے۔ دونوں ہی گاڑیوں کا نقصان ہوا تھا۔

مگر سب اس دھماکے کی وجہ سے پریشان تھے۔ کسی کو اپنے نقصان کی پرواہ نہ تھی۔ گلو بھی ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا مگر استاد فتح کے چہرے پر بلا کا اطمینان تھا۔ ٹریفک جام ہو چکا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں پولیس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیاں ہارن بجاتی ہوئی گزرنے لگیں۔ عجیب سی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ٹریفک کانسٹیبل جام ہو جانے والی ٹریفک کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گلو جاننے کے لئے بے چین تھا کہ یہ کیا ہوا مگر استاد فتح سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ اب تک ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ اس کی نگاہیں ونڈ سکرین پر جمی ہوئی تھیں، سامنے سے آنے والی روشنی اس کی آنکھوں کی پتلیوں سے ٹکراتی تو لگتا جیسے ان آنکھوں میں شعلے دہک رہے ہوں۔ یہ دیکھ کر گلو کے اندر کوندے سے لپک جاتے اور وہ گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگتا۔

اس شاہراہ سے نکلتے نکلتے دو تین گھنٹے لگ گئے۔ رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ گلو اب چاچا کے لئے بے قرار ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا کو اس کے بنا نیند نہیں آئے گی۔ وہ گلی میں پاگلوں کی طرح پھر رہا ہو گا۔ اب تو اسے یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ آج بڑے عرصے بعد اسے گالیاں بھی پڑیں گی۔ ورنہ جب سے گلو نے نوکری کی تھی اور چاچا کو پرچون کی دکان کر کے دی تھی وہ ہر وقت خوش ہی رہتا تھا۔ دن رات اس کی شادی کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب اس کا نصب العین صرف اور صرف نازاں کو بہو بنا کر گھر میں لانا ہی رہ گیا ہو۔ گو ابھی تک گلو اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہوا تھا مگر نارنجی پھول، فاختہ کے پروں ایسے پاؤں اور چھنکتی ہوئی پائل اب بھی اس کے اردگرد چکراتی رہتی تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ بہت سارا روپیہ کما کر گھر میں چونا کرا کے اور کچھ اچھے اچھے کپڑے بنانے کے بعد وہ اس رشتے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچے گا مگر چاچا کا تو دل اسی چکر میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا تو بس ہی نہیں چلتا تھا کہ راتوں رات نازاں کو بیاہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر لے آئے۔

گاڑی سیاہ لمبی اور چکنی سڑکوں پر تیرتی ہوئی' درمیانی رفتار سے استاد فتح کے بنگلے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گلو کی بستی راستے میں آتی تھی۔ گلو کی بستی اور استاد فتح کے بنگلے کے درمیان گندے پانی کا نالہ ایک ایسی دیوار بنا رہا تھا جو دو طبقوں کے درمیان زمین سے لے کر آسمان تک کھنچی ہوئی تھی۔ اس ان دیکھی' اونچی اور مضبوط دیوار کو پار کرنے میں استاد فتح کو عرصہ تو زیادہ نہیں لگا تھا مگر اس نے اس بستی سے اس بستی تک آنے کے لئے کئی آگ اور خون کے دریا عبور کئے تھے۔ اس آگ کی تپش نے جہاں اس کے ضمیر کو جھلسا کر رکھ دیا تھا وہاں اسے ایک عالیشان بنگلے کا مالک بھی بنا دیا تھا' آگ اور خون کے اس دریا کی چھینٹیں اس کی روح پر گہرے گھاؤ ڈال گئی تھیں جنہیں مندمل ہوتے ہوتے زمانے لگے تھے اور انہیں مندمل کرنے میں کرارے نوٹوں کی خوشبو نے مرہم جیسا کام کیا تھا۔ اس کی گھٹی ہوئی تمنائیں کسی طوفان کی طرح اس سے آ کر ٹکرائی تھیں تب وہ سنبھل نہیں سکا تھا۔ پیروں تلے زمین ہوتی تو شاید پاؤں جما کر کھڑا رہتا مگر جب زمین ہی پیروں سے سرکتی جا رہی ہو تو اس کا وجود تو ڈھیر ہونا ہی تھا' یا تو وہ سامنے آجانے والے سہارے کو تھام لیتا یا گر جاتا اور اضطراری کیفیت نے اس کے ہواؤں میں بڑھتے ہاتھوں میں سہارا تھما دیا۔ ایک ایسے دروازے کی چوکھٹ جہاں سے گزر کر وہ ان ایوانوں تک پہنچ سکتا تھا جہاں عیش و آرام اس کے منتظر تھے مگر اس راہ کے کانٹے میں اسے جہاں بہت سے لوگوں کی جان و مال سے کھیلنا پڑا تھا وہاں اس کا اپنا ضمیر بھی جھلس کر خاک ہو چکا تھا۔ اب اس کا دین ایمان صرف اور صرف پیسہ تھا۔ وہ فتو جیسے زمانے نے نفرتوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ جس کی ہر تمنا اور ہر خواہش یوں روندی گئی تھی جیسے راہ میں پڑے ہوئے سنگ ریزے' وہی کچلا ہوا فتو آج بہت سے لوگوں کے ارمانوں کو روندتا ہوا خون کی ہولی کھیلتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت گلو کے چہرے پر پریشانی مگر استاد فتح کے چہرے پر بلا کا اطمینان پھیلا ہوا تھا۔

"استاد.......... اگر اب میرے گھر.......... وہ استاد.......... میرا چاچا.........." وہ پریشانی میں بے ربط سے جملے بول کر رہ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ تیری مرضی' ورنہ استاد فتح اپنا وعدہ پورا کئے بغیر ساتھ نہیں چھوڑتا۔

میں تو وعدے کے مطابق صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی پیسہ دیتا اور تب تجھے جانے کی اجازت بھی دے دیتا۔ کل کا تمام دن تیرے آرام کا دن ہے مگر گلو' سورج کی آخری کرن ڈوبتے ہی تجھے میرے پاس آنا ہے۔ سمجھا تو؟"

"جی استاد.......... سمجھ گیا۔ پیسے تو سویرے لے لوں گا۔ چاچا ابھی تک سویا نہیں ہو گا اس لیے۔"

"چل تجھے گھر اتار دوں۔" اتنا کہہ کر استاد فتح نے گاڑی موڑ لی۔

گلو کی جان میں جان آئی مگر جب گاڑی گلو کے گھر والی گلی میں داخل ہوئی' وہ دہل کر رہ گیا۔ چاچا کا چہرہ اسے دور ہی سے صاف نظر آ گیا تھا جو گاڑی کی روشنیاں پڑتے ہی اس کی طرف لپکا ہوا آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ استاد فتح کو گاڑی روک دینے کو کہتا چاچا اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے کھڑکی میں جھانک کر پہلے گلو کو پھر ذرا سا سر ٹیڑھا کر کے استاد فتح کو دیکھا۔ گلو تو جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ اس کی تو دروازہ کھول کر اترنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ ایک بار پھر کسی دھماکے کی آواز کا منتظر تھا۔ دھماکا ہوا اور ایسا ہوا کہ گلو کے تو جیسے پرخچے اڑ گئے۔ وہ تو سمجھا تھا کہ چاچا اب گالیاں دے گا۔ استاد فتح کو بھی اور اسے بھی مگر.......... مگر چاچا کے منہ سے تو چیخوں کی آواز نکلی تھی۔ وہ پھوٹ کر' بلک کر رو دیا تھا۔ گلو نے حیرت سے اس بڈھے کو دیکھا جس کے ساتھ وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی رہ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں میں کبھی نمی بھی نہ دیکھی تھی۔ وہی بڈھا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ گلو گھبرا کر گاڑی سے اتر آیا۔

"چاچا.......... کیا ہو گیا؟" گلو اس کے سامنے بیٹھتا ہوا بولا۔

"لٹ گیا میں.......... ارے میرے پاس دولت کہاں تھی' کیا تھا میرے لئے مجھے بھی لوٹ لیا اس کتے نے۔" چاچا حلق پھاڑ کر بولا اور استاد فتح کی طرف "بول.......... لچے لفنگے میں نے کیا کیا تھا تیرا.......... کیا بگاڑا تھا میں نے؟" وہ روتا تھا اور چیختا جا رہا تھا۔ بات گلو کی سمجھ میں تو آ گئی تھی مگر استاد فتح لمحہ بھر کو بھونچکا رہ گیا۔

"چاچا.......... چپ کر جا۔" گلو نے سرگوشی کی۔

"اب بھی چپ کر جاؤں.......... ابے اب بھی خاموش رہوں۔ بول گلو' تو نے مجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے جھوٹ کیوں بولا؟ تو اس لفنگے کے لئے مجھ سے جھوٹ بولتا رہا۔ ارے اس بدمعاش کی حرام کی کمائی سے میرے پیٹ میں انگارے بھرتا رہا تو............"

"او بڈھے............ زبان کو لگام دے۔ تو اس فتو سے بات نہیں کر رہا جو تیری بستی میں کتوں کی طرح پھرتا رہتا تھا سالے۔ تیرے سامنے استاد فتح کھڑا ہے۔" استاد فتح نے آگے بڑھ کر چاچا کو گدی سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

گلو کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے بدن پر تیل چھڑک کر آگ لگا دی ہو۔ شعلے اس کے وجود کو یوں چاٹنے لگے تھے کہ گلو کرب سے چیخ اٹھا۔

"استاد............ چھوڑ اسے............ اور خبردار جو تو نے چاچا کو ایک لفظ بھی کہا تو۔"

استاد فتح کو بجلی کا سا جھٹکا لگا تھا۔ وہ پورا کا پورا گھوم گیا تھا۔ "گلو............!" ایک گرج دار آواز گونجی ضرور تھی مگر گلو پر اس آواز نے کوئی اثر نہ ڈالا۔ اس نے آگے بڑھ کر استاد فتح کی مضبوط کلائیوں کو سختی کے ساتھ پکڑا تو استاد فتح کی آنکھوں میں تارے ناچ اٹھے مگر وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ گلو اور اس کے بڈھے چاچا نے استاد فتح جیسے آدمی کو للکارا تھا۔

اس چیخ پکار سے گلی کے لوگ جاگ اٹھے تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں کھلیں تو اندر سے رینگ کر آنے والی روشنی نے گلی منور کر دی۔ اس سے پہلے کہ گلو کوئی اور قدم اٹھاتا' استاد فتح نے ایک جھٹکے سے اس بڈھے کو چھوڑ دیا اور گالیاں دیتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔

"گلو............ تو ہوش میں نہیں ہے۔ تو اس بڈھے کے لئے میرے ساتھ پنگا کر رہا ہے جس نے تیری ماں کو............" اس کے بعد استاد فتح نے کیا کہا یہ گلو نہیں سن سکا۔ سٹارٹ ہونے والے انجن کی آواز میں استاد فتح کی آواز دب کر رہ گئی۔ جانے اس نے کیا کہا سنائی نہیں دیا مگر لفظ "ماں" سن کر گلو پاگل ہو گیا وہ گاڑی کے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔

گلو کو ہوش ان بے پناہ آوازوں کے درمیان آیا جو اس کے چاروں طرف گونج رہی تھیں۔ اس نے سر کو جھٹکا۔ کئی بار آنکھیں بھینچ کر کھولیں اور پھر اپنے سامنے خون پھیلا دیکھ کر متوحش ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ جانو کے علاوہ استاد فتح کے بنگلے پر موجود تینوں ملازم اس کے گرد کھڑے تھے۔ استاد فتح کی گاڑی کا اگلا دروازہ کھلا تھا۔

اور ڈرائیونگ سیٹ پر استاد فتح کا بے جان جسم خون میں نہایا ہوا تھا۔ دو ملازموں نے گلو کو دونوں جانب سے پکڑا ہوا تھا۔ گلو کو یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہونے والا ہے مگر اس سے پہلے کہ گلو بے ہوش ہوتا' چاچا کی آواز نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ دونوں بازو پھیلائے روتا ہوا اس کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ "گلو............ گلو کیا ہو گیا............ کیا کیا تو نے؟" وہ گاڑی کے قریب پڑی استاد فتح کی لاش دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

"یہ............ یہ کیا کیا تو نے؟" وہ چیخا تو اس کی آواز پھٹ گئی۔

تب گلو نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ تھی۔ وہ سلاخ جسے گیٹ کے لگے کنڈے میں اٹکا کر گیٹ بند کیا جاتا تھا۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ گلو اس پر لگا خون دیکھ سکے۔ خون کی ایک باریک لکیر سلاخ سے اس کی انگلیوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی اس کی کلائی تک پہنچ چکی تھی۔

"پولیس............ پولیس کو فون کرو۔" کوئی زور سے چیخا تھا اور جیسے گلو کو کرنٹ لگا۔ وہ اچھل پڑا۔ سلاخ پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر سلاخ شور مچاتی ہوئی پکے فرش پر گری اور دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ اس آواز نے تمام لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ یہ لمحہ گلو کے دماغ میں روشنیاں سی پھیلا گیا اور صرف ایک سرگوشی تھی جو اس کے پورے وجود میں دائرے بن کر پھیلتی چلی گئی۔

"بھاگ گلو............ بھاگ۔" گلو نے دیر نہیں لگائی اور ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا کر گیٹ کی طرف بھاگ پڑا۔

گہرے سناٹے میں ڈوبی گلیاں اس کے قدموں کی دھمک سے چونک اٹھیں۔ پیچھے آنے والے استاد فتح کے ملازمین کی چیخ وپکار اور چاچا کے بین دور تک اس کا تعاقب کرتے رہے مگر وہ تو یوں بھاگ رہا تھا جیسے اس کے پیروں میں پہیئے فٹ کر دیئے گئے تھے۔ تعاقب کرتی آوازیں دھیرے دھیرے کہیں دور رہ گئیں۔ بے پناہ اندھیری گلیوں کے سناٹے میں اس کے پشاوری' بھاری جوتوں کی آواز اسے ہولا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک لمحہ کو بھی رکا تو بیڑیاں اس کے پیروں کی ساری طاقت چھین لیں گی۔ اب تک پولیس کو اطلاع کر دی گئی ہو گی۔ انہیں یہ بھی بتا دیا ہو گا کہ گلو فرار ہو چکا ہے' کس طرف بھاگا ہے' یہ بھی وہ لوگ جان گئے ہوں گے' یہی سوچ کر گلو نے سب سے پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھاگتے بھاگتے ہی رفتار کم کرتے ہوئے اپنے جوتے اتار دیئے۔ یہ جوتے اس نے
سڑک نہیں چھوڑے بلکہ انہیں ایک ایک کرکے اپنے دائیں اور بائیں طرف اچھال
ورنہ یہ جوتے اس کے لئے پریشانی کھڑی کر دیتے۔

معلوم نہیں اسے کب تک اور کہاں تک بھاگنا تھا۔ کوئی منزل نہ تھی' کوئی
جگہ نہ تھی جہاں وہ خود کو پوشیدہ رکھ سکتا' اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بچپن سے بھاگ
ہے۔ اپنی منزل کی تلاش میں' سنسان اور اندھیری گلیوں میں بھاگتا ہی چلا جا رہا ہے۔
کی سانس بری طرح پھول چکی تھی۔ وہ کئی بستیاں گزار آیا تھا۔ رات بہت زیادہ گہری
چکی تھی ۔ کافی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اب اس کے تعاقب میں کوئی نہیں ہے
اس کی چاپ اور اس کی پھولی ہوئی سانسیں تھیں جو کسی کے تعاقب کا احساس دلا
تھیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ ٹھہر گیا۔ یہ کسی انجانی بستی کی چوڑی سڑک تھی۔ ہر دو ج
اونچے' بڑے اور شاندار بنگلے تھے۔ موتیا اور گلابوں کی خوشبو سے معطر فضا تھی۔ کھڑ
میں کھنچے پردوں نے روشنی کو گھونٹ رکھا تھا مگر شاہراہ کے کنارے لگے پولز پر بلب ر
تھے۔

گلو ایک دیوار کے سائے کے گہرے اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنی
ہوئی سانس پر قابو پانا چاہتا تھا۔ کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ یوں سڑکوں پر بھاگتے رہنا اس کے
خطرناک تھا۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ اس دوران اسے کوئی پولیس موبائل نہیں ٹکر
تھی ورنہ سندھ کے بگڑے ہوئے حالات کی وجہ سے پولیس' رینجرز اور فوج کا گشت
گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی سڑک پر پولیس مقابلے میں مارا جائے یا اچانک چھ
لیا جائے۔ اسے بہر حال اپنی منزل کا تعین کرنا تھا۔ آئندہ کے لئے لائحہ عمل طے کر
اونچے بنگلے کی کھردری دیوار سے پشت لگا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆==========☆==========☆

امام دین کا نام اچانک ہی اس کے دماغ میں کسی دیے کی طرح ٹمٹما گیا۔ اس
جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ امام دین بھی اسی کی طرح اس دنیا میں اکیلا تھا۔ اس کا تو
چاچا بھی نہ تھا جو اسے سہارا دیتا۔ امام دین سے اس کی پہلی ملاقات ایک بازار کی
بڑی سڑک پر اس وقت ہوئی تھی جب وہ بھوک سے نڈھال تین ہٹی کے پل کے

ل والے کی دکان کے سائے میں بیٹھا تھا۔ اس کی عمر بہ مشکل آٹھ نو برس ہو گی۔ وہ
پاتھ پر بیٹھے' گاڑیوں کے پیچھے بھاگتے' نیفوں میں پیسے اڑستے فقیروں کو حسرت سے
رہا تھا۔ اس میں تو اتنی جرات بھی نہیں تھی کہ کسی گاڑی والے کے آگے ہاتھ پھیلا
بھیک مانگ لیتا اور پیٹ میں اٹھتے ہوئے ہوا کے گولوں سے نجات حاصل کر لیتا۔ تیز
پ' شدید گرمی اور سخت بھوک نے اس کے ہاتھ پاؤں شل کر ڈالے تھے تبھی ایک
از نے اسے چونکا دیا۔

"ابے........... یہاں یوں کیوں پڑا ہے؟"

اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے آواز کی سمت دیکھا تھا۔ وہ دبلا پتلا' لمبا اور گنجا
اتھا جو کسی بدمعاش کی طرح سینہ نکالے کھڑا تھا۔

"کیوں........... یہ فٹ پاتھ تیرے باپ کا ہے؟" اس نے نحیف آواز میں جواب
۔

وہ بے وجہ ہی ہنس پڑا۔ "ابے یہ ساری کرانچی اپنے باپ کی ہے۔ تو کیا یہاں نیا آیا
؟" وہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"تجھے کیا........... نیا ہوں یا پرانا۔"

"دیکھ بھیئے! بھوکا چہرہ' وہ بھی کسی شریف بندے کا' اپن کو بہت برا لگتا ہے۔" یہ
ہ کر اس نے جیب میں اڑسا ہوا ایک کاغذ کا پلندہ نکال لیا تھا۔ کاغذ پر چپڑے تیل کی
شبو نے اس قدر نقاہت کے باوجود گلو کو اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑکے نے لفافہ
ڑا اور اس میں لپٹا ہوا بن کباب اس کی طرف بڑھا دیا۔ "لے یہ کھا لے۔"

اسی دن گلو کی ساری خودداری' ساری شرافت اور ساری اکڑ اس کے بدن میں
ے پسینے کی بدبودار لکیروں میں گھل کر بہہ گئی۔ اس نے بن کباب جھپٹ لیا اور پھر تین
نوالوں میں بغیر چبائے نگل بھی لیا۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ سامنے کھڑی گاڑیوں کی قطار
ے ہوا میں ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اور پھر اسے ہوش نہ رہا تھا۔

☆==========☆==========☆

ہوش آیا تو وہ اچھل اٹھ بیٹھا۔ اس کے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وہ کسی چارپائی
پڑا تھا۔ یہ چارپائی ایک جھگی میں پڑی تھی۔ جھگی کے باہر روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ وہ جلدی سے چارپائی سے اتر آیا۔ جھگی سے باہر بھی کرا[...] تھا۔ روشنی ریلوے لائن کے اوپر پل سے آ رہی تھی جہاں پیلے رنگ کی لائٹیں لگی[...] تھیں۔ یہ بہت سی جھگیوں اور کچے مکانوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ہر جھگی[...] لالٹین یا موم بتی روشن تھی۔ کئی جگہ لوگ چارپائیاں جھگی سے باہر ڈالے بیٹھے تھے۔ ا[...] باہر آتا دیکھ کر دور بیٹھے ایک شخص نے آواز لگائی۔

"ابے او مامے۔ جا تیرا گیسٹ اٹھ گیا۔"

دوسرے ہی لمحے گلو نے اندھیرے میں اپنی طرف بڑھتے ہوئے اس دبلے پتلے لمبے لڑکے کو پہچان لیا۔ وہ امام دین تھا۔

اس رات امام دین نے بتایا کہ گلو بن کباب کھاتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ ا[...] دن امام دین نے اپنے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ندی کے کنارے پر رہتا تھا۔ باپ کباڑیہ تھا۔ ماں بچہ پیدا کرنے والی وہ مشین تھی جو[...] سال ایک مردہ بچے کو جنم دیتی تھی۔ پتہ نہیں امام دین کیسے اور کس نیکی کے سبب زند[...] گیا تھا۔ ایک برس برسات میں ندی چڑھ گئی تو باپ اپنے کاروبار سمیت ڈوب گیا۔ اس برس پھر ایک مردہ بچے کو جنم دے کر خود بھی ختم ہو گئی۔

امام دین اکیلا رہ گیا۔ پہلے کچھ دن تو حکومتی امداد پر پلتا رہا۔ پھر حکومت برسا[...] موسم ختم ہوتے ہی ٹھنڈی پڑ گئی تو وہ پھر بھوکوں مرنے لگا۔ ملیر ندی میں زمین کا وہ ٹکڑ[...] رہ گیا تھا جہاں وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتا سکتا تھا کہ یہاں اس کی جھگی تھی۔ کچھ د[...] یہی کرتا رہا پھر وہ جگہ چھوڑ کر تین ہٹی کے پل کے نیچے والی آبادی میں چلا گیا اس لئے[...] اس جگہ سے اجڑے ہوئے کچھ لوگ اس طرف بھی آ گئے تھے۔ اپنے اپنے سے تنگ[...] چلا آیا۔ یہاں آ کر باپ کے کاروبار کو بڑھانا چاہا تو دشواریوں نے جکڑ لیا۔ پھر ایک گ[...] میں گاڑیاں دھونے کا کام کرنے لگا۔ بدمعاشی مزاج میں رچی بسی تھی۔ بدمعاش بننا چاہ[...] لیکن اس کا دبلا پتلا بدن آڑے آ جاتا تھا۔ جب اکڑ کر کسی کو دھمکی دینے کی کوشش[...] اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر دھکا مارا تو وہ دور تک لڑکھڑا جاتا تھا۔ اب دونوں چیزیں[...] ساتھ چل رہی تھیں۔ بدمعاشی بھی اور گیراج کا کام بھی۔ پیٹ بھر لیتا تھا۔ گلو کو بھی[...] چاہا مگر گلو تو چبوترے کی یاد میں تڑپ کر تیسرے ہی روز واپس چلا گیا پھر چاچا اسے

گیا۔ کبھی کبھی اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اب امام دین نے ٹین کی چھت ڈال کر زمین کا ایک بڑا حصہ بھی گھیر لیا تھا دو چار اکیلے' بھوکے اور ٹھکرائے ہوئے لڑکوں کو بھی جمع کر لیا تھا جنہیں وہ منہ ٹیڑھا کر کے اپنا "ملازم" کہتا تھا۔ وہ گاڑیاں دھونے کا کام اب اپنے انہی ملازمین سے کرانے لگا تھا۔

گلو چبوترے سے چھوٹا تو چاچا کے لاغر بدن سے چمٹ گیا مگر امام دین کا دیا ہوا وہ بن کباب نہیں بھولا جس نے پیٹ میں اٹھتے ہوئے گولے بھسما دیئے تھے۔ اس وقت امام دین کا خیال آیا تو گلو کو سکون مل گیا۔ اسے یقین تھا کہ امام دین اس کی بہت مدد کرے گا۔ اسے چاچا کی طرف سے بہت فکر تھی' جانے کا اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ کسی کو قتل کر دینے کا تو گلو نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اور ویسے بھی وہ کون سا بدمعاش تھا مگر استاد فتح پر ہاتھ اٹھانا خود اسے بھی حیرت زدہ کیا ہوئے تھا۔ اسے تو بالکل گمان نہ تھا کہ وہ چاچا کی محبت میں اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔ فتح نے چاچا کو گالی نہ دی ہوتی اور اس کی ماں کا نام نہ لیا ہوتا تو شاید وہ اس وقت مزے سے چارپائی پر لیٹا ہوا چاچا سے باتیں کر رہا ہوتا۔ جو کچھ ہوا وہ چشم زدن میں ہو گیا۔ گلو جانتا تھا کہ پولیس ایک نہ ایک روز اس تک ضرور پہنچ جائے گی مگر ایک آس یہ بھی تھی کہ شاید وہ اسے کبھی نہ پا سکے۔ گلو نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کراچی میں نہیں رہے گا۔ امام دین کے ذریعے چاچا کو بھی بلا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔

اسے یہاں بیٹھے ہوئے بڑی دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ خود کو کافی پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ سانس قابو میں آ چکا تھا۔ راستے کے بارے میں اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ فیڈرل بی ایریا کے علاقے میں تھا۔ یہاں سے تین ہٹی کا پل بہت دور تھا' پیدل جانا تو ویسے بھی خود کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ بس میں جاتا اگر بسیں اس وقت تک چل رہی ہوتیں تب' مگر اب پیروں میں جوتے نہ تھے۔ اس حلئے میں اس کا جانا ویسے بھی اسے مشکوک بنا دیتا کیوں کہ اب تو اس کے بدن پر اچھے کپڑے تھے۔ ایک نکل کی موٹی سی' بڑے سے عقیق والی انگوٹھی اس نے بولٹن مارکیٹ سے خرید کر انگلی میں پہن لی تھی۔ فٹ پاتھ والے سے ایک سنہری گھڑی بھی خرید چکا تھا جو اس وقت کلائی پر بندھی تھی۔ ایسے حلئے میں جوتے نہ ہونے سے وہ مشکوک بن سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے گھڑی کو روشنی کی جانب کر کے دیکھا۔ رات کے ڈھائی بجے تھے۔ اس نے دماغ لڑانا شروع کر دیا۔ ایک ہی بات دماغ میں آئی کہ وہ فجر تک کا وقت کسی مسجد میں گزار دے۔ سویرے وہاں سے کسی نمازی کے جوتے پہن کر نکل لے اور سیدھا امام دین کے پاس پہنچ جائے۔ اس خیال نے اسے کافی مطمئن کر دیا۔ پھر وہ گلیوں گلیوں تلاش کرتا ہوا بالآخر ایک مسجد تک پہنچ گیا۔ مسجد روشن تھی مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ گلو نے سب سے پہلے وضو کر کے نماز پڑھی' چاچا کی خیریت کے لئے دعا کی اور وہیں ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔

تمام رات یہی سوچتے گزر گئی کہ اب کیا ہوگا۔ اگر فتح قتل ہو چکا ہے تو اسے پھانسی بھی ہو سکتی ہے' اگر صرف زخمی ہوا ہے تو بھی اسے جیل تو جانا ہی پڑے گا۔ تھانیداروں کو دیکھ کر ویسے ہی اس کا دم نکلتا تھا' اسی لئے تو وہ استاد فتح جیسا بننا چاہتا تھا کہ کراچی کے سارے تھانیدار اس سے خوف کھائیں۔ پتہ نہیں فتح نے ایسا کون سا جادو سیکھا ہوا تھا کہ کراچی کے بہت سے پولیس والے اسے سلام کرتے تھے اور اکثر تھانیدار اس سے دبتے تھے۔ ایک مرتبہ جانو سے اس نے سنا تھا کہ استاد فتح علاقے کے تھانیدار کو بھتہ دیتا ہے۔ اس کے پاس تو دینے کو دمڑی تک نہ تھی۔ جو پیسہ فتح نے اسے دیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ چاچا کی دکان چھوٹی سی تھی۔ گھر کا خرچہ تو اس سے چل سکتا تھا پر کسی کو بھتہ یا رشوت دینے کے لئے اس کے پاس پیسہ نہ تھا' اگر فتح نے چاچا کو گالیاں نہ دی ہوتیں تو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ پانچ ہزار روپے کا مالک بن چکا ہوتا............ اس وقت وہ بالکل کنگال تھا۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے مسجد میں چہل پہل شروع ہو گئی' پہلے آدمی کی آہٹ ہی سے گلو اٹھ بیٹھا اور فوراً ایسی پوزیشن میں بیٹھ گیا جیسے عبادت کر رہا ہو۔ وہ مولوی صاحب تھے۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ٹھٹکے پھر ماشاء اللہ' ماشاء اللہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ ایسا نماز کا پابند کہاں تھا' نہ کبھی عبادت کا خیال آیا تھا اسے' آج اگر حالات اسے یہاں نہ لے آتے تو یہ بے وقت کی نماز بھی نہ پڑھتا۔ وہ تو چاچا کی فکر ایسی لگی تھی کہ جی ہار بیٹھا تھا' مگر مسلمان تو تھا' اللہ پر پورا یقین اور بھروسہ بھی تھا۔ نماز پڑھ کر دعا مانگ لی تھی مگر اب وہ فجر کی نماز پڑھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تو اسی وقت مسجد سے نکل سکتا تھا۔ اسے یقین تھا

کہ صحن کے نیچے سیڑھیوں پر مولوی صاحب کے جوتے ضرور ہوں گے۔ قد کاٹھ بھی اسی جتنا تھا سو اس کے پیروں میں پورے بھی آ جاتے مگر وہ اللہ میاں کے آگے اپنی پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چوریوں سے توبہ کیے اسے بڑا زمانہ گزر چکا تھا۔ اس وقت جوتوں کی چوری ناگزیر ہو چکی تھی ورنہ وہ کم از کم مسجد میں ایسا کام کبھی نہ کرتا۔

رفتہ رفتہ نمازی آنے لگے۔ پیش امام صاحب نے اپنی خوبصورت آواز میں اذان دی تو گلو کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ گڑگڑا کر خدا کے حضور معافیاں مانگیں۔ محنت کر کے کھانے کا وعدہ کیا۔ چاچا کے لئے دعا مانگی اور آخر میں اس آخری چوری' یعنی جوتے چرانے کی مجبوری بتا کر ایڈوانس میں معافی بھی طلب کر لی' اللہ سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ جیسے اور جب بھی ممکن ہوا وہ یہ جوتے واپس اسی مسجد میں چھوڑ جائے گا۔

فجر کی نماز شروع ہوئی تو گلو مسجد میں اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے پہلی بار اتنے بہت سے نمازیوں کو دیکھا تھا۔ عید بقر عید کی بات الگ تھی' اس روز تو بہت سے ایسے لوگ بھی مسجد جاتے ہیں جنھوں نے کبھی نماز ہی نہ پڑھی ہو مگر آج اسے حیرت ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کراچی میں نیک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ اس نے بھی عہد کیا کہ وہ اب باقاعدگی سے نماز پڑھے گا بلکہ امام دین اور چاچا کو بھی تلقین کرے گا کہ نماز پڑھنا چاہیے۔

نماز سے فارغ ہو کر سب سے پہلے باہر نکلنے والا گلو ہی تھا۔ اس کا ذہن نماز میں کم اور نمازیوں پر زیادہ لگا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے نکل جائے تاکہ جوتے چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں نہ پکڑا جائے۔ اس نے بالکل اپنے ناپ کے جوتے پہنے اور سیدھا مین روڈ کی طرف چل پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بس میں بیٹھا سفر کر رہا تھا۔ تین ہٹی کے پل کے پاس اتر کر اس نے اپنا رخ امام دین کے گیرج کی طرف کر لیا۔ اس کا گیرج اسی بستی کے قریب تھا۔ امام دین اب کچھ فربہ ہو گیا تھا۔ اکثر صاف اور چکنے رہنے والے سر پر خوب گھنے بال بھی موجود تھے۔ وہ کافی بدل گیا تھا۔ گلو اسے سال بھر بعد دیکھ رہا تھا۔ اسے اچانک اپنے سامنے پا کر امام دین حیران رہ گیا۔

"ابے۔ ابے یہ چاند کس طرف سے نکل آیا؟" وہ ایک بڑی گاڑی کی سیٹیں نکال رہا تھا۔ اسے دیکھ کر سیدھا ہو گیا اور آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ "ابے اتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سویرے سویرے کہاں سے آگیا یار؟" وہ اسے دونوں بازوؤں میں جکڑتے ہوئے بولا۔

"حالات وقت دیکھ کر خراب نہیں ہوتے امام دین۔"

"ہیں..........! کیا کہہ رہا ہے۔ حالات تو ماشاء اللہ بڑے اچھے لگ رہے ہیں۔"

اس نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس لمحے گلو کی نگاہ بھی اپنے جوتوں پر پڑی' بڑے قیمتی جوتے تھے۔ کسی مالدار آدمی کے لگ رہے تھے۔ اب وہ امام دین کو کیا بتاتا کہ یہ جوتے وہ چوری کر کے آیا ہے۔

"چائے پلا یار! سانس لے لوں گا تو پوری کہانی سناؤں گا۔" وہ تھکا ہوا تھا اس لئے اس کے پاس پڑی بینچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"چل اٹھ وہاں چارپائی پر بیٹھتے ہیں۔" امام دین نے پانا بینچ پر رکھتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں چارپائی پر جا بیٹھے۔ امام دین نے آواز دے کر سامنے ہوٹل والے کو چائے کے لئے کہا اور بولا۔ "اب بتا.......... یہ حالات کیسے تجھے سویرے سویرے لے آئے۔ چاچا کیسا ہے اور تیرے اس لنگوٹئے یار' چبوترے کی کیا خیر خبر ہے؟"

تب گلو نے دھیمے لہجے میں اسے ساری کہانی سنا ڈالی۔ اب وہ فتح پر حملہ کرنے اور پھر اس کے خون میں ڈوبے دکھائی دینے کی کہانی سنا رہا تھا۔ امام دین کی آنکھوں میں کئی بلب سے جلنے بجھنے لگے تھے۔ وہ اپنی چمکدار آنکھوں سے' حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تردد یا تاسف کا کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ یوں ساری کہانی سن رہا تھا جیسے اس کے پسندیدہ موضوع پر بنی فلم کی اسٹوری سن رہا ہو۔

"اب بتا.......... میں تو تیرے پاس آگیا ہوں' تو چاہے تو مجھے پولیس کے حوالے کر دے یا.......... یا پھر میری مدد کر' مجھے یہاں سے فرار ہونے میں مدد دے۔"

"ابے پولیس کے حوالے کروں گا میں اپنے دشمنوں کو۔ تو تو میری جان وجگر ہے یار۔ تو اتا جی دار ہو گا' یہ مجھے پہلے پتہ ہوتا تو تجھے اکیلا نہ چھوڑتا۔ اب تو فکر مت کر' تو نے اچھا کیا کہ یہاں چلا آیا۔ بس اب تو لمبی تان کر سویا کر' دیکھنا تیرا یہ یار کیا کرتا ہے تیرے لیے' اور چاچا کی فکر مت کر' آج ہی جاتا ہوں اور اسے لے کر آتا ہوں.......... ویسے میرا خیال ہے کہ اسے تو پولیس لے گئی ہو گی۔"

امام دین کے آخری جملے نے گلو کو ڈنک مار دیا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا.......... ابے کیا بات ہے' کھڑا کیوں ہو گیا؟" امام دین چونک اٹھا۔

"وہ.......... وہ چاچا کو لے گئے ہوں گے؟" وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

"ابے تو کون سی قیامت آجائے گی۔ چھوڑ دیں گے اسے۔"

"نہیں امام دین.......... وہ.......... وہ بہت ظالم ہوتے ہیں' اسے مار دیں گے۔" وہ گھبرا رہا تھا۔

"ابے ان کے ہاتھ توڑ کر انہی کی بغلوں میں داب دوں گا' سالے ہاتھ تو لگا کر دیکھیں۔" امام دین کھڑا ہو گیا۔ "کون سا تھانہ لگتا ہے؟"

"پتا نہیں.......... قتل تو فتح کے گھر پر ہوا ہے' ہماری بستی کے قریب ہی اس کا بنگلہ.........."

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے' میں ذرا فون کر کے آتا ہوں۔ تو بے فکرا بیٹھا رہ۔ وہ چائے لا رہا ہو گا۔" اتنا کہہ کر امام دین بڑی عجلت میں چلا گیا مگر پانچ منٹ بعد ہی لوٹ آیا۔ اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا؟" گلو نے اسے آتے ہی پکڑ لیا۔

"کچھ نہیں ہوا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔ "چاچا خیریت سے گھر پہنچ جائے گا۔ وہ اسے لے گئے تھے' پوچھ گچھ کر رہے تھے مگر.......... اب چھوڑ دیں گے۔"

"اور اگر نہیں چھوڑا تو؟" اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"یہ سر پھر منڈوا دوں گا۔ ابے اکثر یہ سر شرطوں کی وجہ سے ہی منڈا رہتا تھا' مگر اب مسلسل تین برس ہو گئے ہیں میرے پندرہ دوست گنجے پھر رہے ہیں۔ سالے سب شرطیں ہار جاتے ہیں۔ اگر تو ہار گیا تو.......... چل چھوڑ' تجھے پہلی بار سمجھ کر معاف کر دوں گا پھر آئندہ مجھ سے شرط لگاتے ہوئے خوب سوچ سمجھ لینا۔ مجھے ہر آدمی کا گنجا سر دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔ گنجے سر کی وجہ سے میں آدمی کی نفسیات تک جان جاتا ہوں۔ ابے چہرہ آئینہ نہیں ہوتا' گنجا سر آئینہ ہوتا ہے۔ اب تو میرا مغز مت کھا۔ لے وہ چائے آگئی۔"

آخری جملہ اس نے ہوٹل سے آنے والے ایک آٹھ نو برس کے بچے کے ہاتھ میں لٹکی ہوئی پیالیوں اور چینک دیکھ کر کہا۔ وہ لڑکا گاتا گاتا ہوا' جھومتا ہوا چلا آرہا تھا۔

گلو چپ ہو گیا۔ وہ لڑکا بینچ کو گھسیٹ کر قریب لے آیا اور اس پر چینک اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیالیاں رکھتے ہوئے لہکا۔ "رکھ دیا قدموں میں دل نذرانہ قبول کرلو۔"

"ابے چپ۔ سالا تان سین کی اولاد.......... ایسا کھولتا ہوا دل ہے تیرا۔" امام دین نے بھاپ اڑاتی چینک کی طرف اشارہ کیا۔

"ماے استاد' جوانی میں دل ایسا ہی کھولتا ہوا ہونا چاہئے۔"

"ابے.......... ابے یہ جوانی تو دیکھو سالے کی۔" امام دین نے اس کا کھلا گریبان پکڑ کر کھینچا۔ "ابے ابھی تک تو پسلیاں بھی پوری نہیں بنی ہیں تیری' دانت پورے نہیں نکلے اور جوانی آگئی' وہ بھی ایسی کھولتی ہوئی۔" اس نے جھٹکے سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔

"آدمی کا دل جوان ہونا چاہئے ماے استاد.......... اور جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔"

اس نے وحید مراد کے سے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلا کر کہا اور اس سے پہلے کہ پھر اسے امام دین پکڑ لیتا' وہ ایک پاؤں پر اچھلتا ہوا ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

"اسکول میں پڑھتا ہے۔ سالا کاغذ کے ٹکڑے مل جائیں تو پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ ہر ہفتے پیسے بچا کر فلم دیکھنے جاتا ہے۔ ہوٹل میں سارے پوسٹر یہ فلم والوں سے مانگ کر لا کے لگاتا ہے۔ جس دن اس کے گانے کی آواز نہ آئے' لگتا ہے گلی کے سارے لوگ ایک ساتھ ہی مرگئے ہیں۔" وہ گلو کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا مگر گلو کا دل تو چاچا میں پڑا ہوا تھا۔

"امام دین چاچا یہاں کیسے آئے گا' اسے تو یہ جگہ پتہ بھی نہیں ہے اور میں وہاں جا نہیں سکتا۔"

"تو سکون سے نہیں بیٹھ سکتا؟ چاچا کو میں بلوا لوں گا۔ وہ اب گھر پہنچ گیا ہوگا۔ تو فکر نہ کر' اور تجھے اب کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے گلو۔ ماے استاد کو تو جانتا نہیں ہے۔"

جس اطمینان سے امام دین اسے کہہ رہا تھا اس نے گلو کو کچھ پُرسکون تو کر دیا تھا مگر اس کی مکمل پریشانی ختم ہونے کا تو اس وقت تک کوئی سوال نہ تھا جب تک وہ چاچا سے مل نہ لیتا۔ وہ پیالی اٹھا کر ہلکے ہلکے چسکیاں لینے لگا۔ امام دین کو بولنے کا خبط تھا۔ یہ بات گلو جانتا تھا۔ وہ بولے جا رہا تھا۔ اسے خواب میں بولنے کے علاوہ اکیلے میں بولنے کی بھی

عادت تھی۔ اس وقت بھی وہ بول رہا تھا۔

"گلو سمجھ لے کہ اب تیرے دن پھرنے والے ہیں۔"

"ہاں لگتا ہے اب جیل جا کر ہی رہوں گا۔ پتا نہیں یار کیا ہو گیا تھا مجھے۔ اب ایسی بات بھی نہ تھی کہ میں فتح کو قتل ہی کر دیتا۔"

"ابے وہ نہیں کہہ رہا۔" وہ جھنجھلا گیا۔ "وہ تو تو نے بہت اچھا کیا اور جیل ویل جانے کی بات دماغ سے نکال دے۔ تجھے فتح کی طرح کا آدمی بننا تھا ناں! اب سمجھ لے کہ تجھے تیرے خوابوں کی تعبیر ملنے والی ہے۔"

ابھی اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک تیز ہارن کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔ "اوہ.......... ابھی آیا.......... اچھا آ.......... تو بھی آ.......... جلدی۔" امام دین بوکھلا کر کھڑا ہو گیا تھا اور اسے کہہ کر گلی کی طرف بڑھ گیا جہاں گہرے براؤن شیشوں والی ایک بڑی سی کالی گاڑی کھڑی تھی۔

گلو پیالی بنچ پر رکھ کر اس کے پیچھے بڑھ گیا۔ وہ گاڑی کے قریب پہنچا تو امام دین ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی پر جھکا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھے شخص کا چہرہ گلو کو دکھائی نہیں دیا۔ وہ امام دین کے پیچھے تھا۔ اچانک گاڑی کا پچھلا شیشہ ایک ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ نیچے سرکنے لگا۔ سرسراہٹ کی آواز نے گلو کو چونکا دیا اور پھر جونہی اس کی نگاہ کھڑکی سے اندر گئی' اسے لگا جیسے کسی نے اس کی آنکھوں میں انگارے بھر دیئے ہوں۔

☆==========☆==========☆

اسے لگا تھا جیسے وہ چمکتی ہوئی آنکھیں نہ ہوں۔ دو دھاری تلواریں ہوں جو اس کی آنکھوں میں کھب کر اس کا کلیجہ چیرتی ہوئی اس کے پیٹ کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے ایک روز استاد فتح کے گھر میں دیکھا تھا۔ اس وقت جب وہ ٹھنڈی بوتلیں لینے کے لئے اندر گیا تھا۔ سنہرے چہرے پر چمکتی ہوئی دو سیاہ آنکھیں اس وقت بھی اس کے دل میں اتر گئی تھیں۔ مگر اسے یوں کلیجہ کٹتا ہوا محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک دم پلٹ پڑا۔ اس نے واپس چارپائی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ تو کہیں چھپ جانا چاہتا تھا مگر یہاں چھپنے کی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ دھلنے کے لئے آنے والی کاریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس سے کافی فاصلے پر کھڑی تھیں۔

"او............ گلو............" اچانک امام دین پلٹ پڑا۔ اپنے پیچھے نہ پا کر اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے گلو کہیں دکھائی نہیں دیا مگر گلو کو وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اسے یقین تھا کہ استاد فتح کے آدمی اس کا سراغ لگا کر یہاں تک پہنچ چکے ہیں۔ وہ وہاں سے فرار کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک ہی امام دین کی نگاہ اس پر ٹھہر گئی۔

"او گلو............ ادھر آ............" اس نے آواز دی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"ادھر آ ناں!" اس نے اسے یونہی کھڑے دیکھ کر پھر پکارا۔ اس بار اس نے سر کے اشارے سے امام دین کو بلایا۔ وہ گاڑی کی کھڑکی کے پاس سے ہٹا تو اس کی نگاہ اندر بیٹھے گنجے اور موٹے شخص پر پڑی جو سر نکالے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گلو کو یوں لگا جیسے وہ ابھی دروازہ کھول کر اس کی طرف دوڑ پڑے گا مگر وہ گاڑی سے نہیں اترا اور امام دین اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"ابے کیوں چلا آیا؟"

"ماے............ وہ لڑکی............ یہ............ یہ لوگ استاد فتح کے آدمی ہیں۔"

"استاد فتح کے............؟" اس نے حیرت سے سر گھما کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ پھر زور سے ہنس پڑا۔ "ابے گھاس کھا گیا ہے کیا؟ یہ اپنے آدمی ہیں۔ استاد فتح کا بھی باپ ہے یہ۔ چل............ بڑے کام کا آدمی ہے۔" آخری جملہ اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ماے میں............ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ لڑکی............ اسے میں نے فتح کے بنگلے پر دیکھا تھا۔" گلو نے زچ ہو کر کہا۔

"دیکھو یار گلو! اپن کا ٹیم بہت قیمتی ہے۔ تو اپنی آنکھوں کا علاج کرا۔ وہ لڑکی اس آدمی کی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے پاس کام کرتی ہے۔ استاد فتح کا ان کے سامنے نام لینا بارود کو تیلی دکھانا ہے۔ اب تو ٹھیک ہو جا۔ یہ فلمی قسم کا سین نہیں چلے گا یہاں پر۔" وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ "تجھے دھوکا ہوا ہو گا۔"

گلو نے اس کے شانے کے اوپر سے پھر گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ لڑکی ان لوگوں کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا موٹا اور گنجا شخص بڑی بے قراری

سے اسٹیرنگ پر انگلیوں سے تال دے رہا تھا۔ ان دونوں کے چہروں سے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی تھی جو گلو کے شک کو تقویت پہنچاتی ہو۔ وہ کچھ سہما سہما سا امام دین کے ساتھ ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"کیا مسئلہ ہے؟" اس آدمی نے ان کے قریب جاتے ہی امام دین سے سوال کیا مگر اس کی نگاہیں گلو کے چہرے پر گڑی تھیں۔ گلو پر گھبراہٹ طاری ہوتی جا رہی تھی۔ وہ خوفزدہ نہیں تھا مگر یہ سوچ کر اسے گھبراہٹ ضرور ہو رہی تھی کہ یہ استاد فتح کا آدمی ہوا تو معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سوچ لیا کہ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو اسے بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ وہ قاتل ہے تو پھر قاتل ہی سہی۔ مرنے والے ایک ہوں یا چار' کیا فرق پڑتا ہے۔ امام دین سوال کرنے والے کو پتہ نہیں کیا جواب دے رہا تھا گلو کو تو جیسے کچھ ہوش ہی نہ تھا۔ اس کا ذہن قتل کے منصوبے بنانے میں لگا ہوا تھا۔

"اے............" اچانک پیچھے بیٹھی لڑکی نے اپنی مخروطی انگلی کھڑکی سے باہر نکال کر گلو کی طرف اشارہ کیا۔

گلو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"وہ............ پانی مل جائے گا یہاں............؟ ایک دم ٹھنڈا۔"

"ہاں ہاں میڈم............ کیوں نہیں۔" اس سے پہلے ہی امام دین بول اٹھا۔ پھر گلو کی طرف پلٹا۔ "یار گلو اس تان سین کی اولاد کو کہہ' فٹافٹ دو ٹھنڈی بوتلیں پکڑا دے۔"

گلو فوراً ہی پلٹ پڑا۔ اسے وہاں کھڑے کھڑے گھبراہٹ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس بار اس نے لڑکی کو بہت غور سے دیکھا تھا کہ شاید امام دین سچ کہتا ہو۔ اسے واقعی دھوکا ہوا ہو مگر............ اسے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ یہ سو فیصد وہی لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امام دین جھوٹ بول رہا ہے یا ان دونوں نے امام دین کو بے وقوف بنایا ہے۔ بہرحال اس وقت تو یہ اطمینان ہی اس کے لئے کافی تھا کہ گڑبڑ نہیں ہو گی۔ ممکن ہے یہاں سے جانے کے بعد وہ پولیس کو یہاں بھیجتا مگر اس وقت تک تو گلو کے نکل بھاگنے کو کافی ٹائم پڑا تھا۔ وہ ہوٹل کے باہر ہی سے ٹھنڈی بوتلوں کا آرڈر دے کر لوٹ آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس بار وہ گاڑی کی طرف نہیں گیا۔ ٹین کے اس چھجے کے نیچے چلا آیا جہاں دو کاریں کھڑی تھیں اور ایک گاڑی کی دھلائی ہو رہی تھی۔ چودہ پندرہ برس کے تین لڑکے اس گاڑی کو جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔ وہیں ایک کونے میں بیٹھ کر گلو نے اس گاڑی پر نگاہیں گاڑ دیں۔ امام دین اب بھی اس گنجے سے باتیں کر رہا تھا۔ اس گنجے کی نگاہیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں اور ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ اس دوران میں ہوٹل والا لڑکا گانا گاتا ہوا' بوتلیں جھلاتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھا۔ "چلے ٹھنڈی ہوا تھم تھم.......... ہو جی' چلے ٹھنڈی ہوا تھم تھم' ایسے تجھے چاہوں' پھول کو جیسے شبنم.........."

اس کی آواز دور دور تک گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گلو کو لگا جیسے اگر وہ گانا گانا چھوڑ دے تو ساری دنیا میں سناٹا چھا جائے۔ اس گلی میں زیادہ تر گیراج ہی تھے۔ ان گیراج پر اچھے خاصے لوگ کام کرتے تھے مگر یوں جیسے انسان نہ ہوں۔ مشین ہوں۔ روبوٹ ہوں۔

"ابے او.......... چپ!" امام دین اس لڑکے پر دھاڑا اور اس کے ہاتھ سے بوتلیں لے لیں۔ وہ لڑکا بوتلیں دے کر یوں اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے امام دین نے اس پر کراٹے کا کوئی داؤ آزمایا ہو۔ گلو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اب وہی لڑکا ماتھے پر بالوں کی لٹ کو گرائے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

"کس نام سے پکاروں.......... کیا نام ہے تمہارا..........؟" اس نے گلو کے قریب آتے ہی دایاں ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیا۔ وہ اب بھی لہک لہک کر گانا گا رہا تھا۔

گلو کی مسکراہٹ زور کی ہنسی بن کر ہونٹوں سے پھوٹ نکلی۔ "گلو۔" اس نے جواب دیا۔

"ابے او ہیرو.........." گاڑی کے نیچے گھسا ہوا لڑکا چلایا۔

"یہ کس نے پکارا ہے.........." وہ محمد علی کے سے انداز میں پلٹا۔

"چل' ہوائی جہاز ہو جا۔"

اسے ہیرو کہہ کر پکارنے والے لڑکے نے ہاتھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا اور وہ ہیرو واقعی بازو ہوا میں پھیلا کر زن سے اس کے قریب سے گزر گیا۔ اس کی طرف سے

توجہ ہٹتے ہی گلو کو امام دین کا خیال آیا۔ وہ گاڑی اب بھی وہیں کھڑی تھی اور یہ دیکھ کر تو گلو کا دل دھک سے رہ گیا کہ امام دین اسی کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے اس گنجے سے کچھ کہہ رہا تھا۔ گنجے نے سر ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ پاس سے گزرتی ہوئی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی لڑکی کے ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی جس نے گلو کو ایک دم ہی بے چین کر دیا۔ نہ معلوم کیوں اسے یوں لگنے لگا جیسے خطرہ قریب آ رہا ہو۔

امام دین اسی کی جانب آ رہا تھا۔ "ابے گلو.......... تو آدمی ہے یا گیدڑ؟" وہ آتے ہی اس پر پھٹ پڑا۔ "میں بات کر رہا ہوں' اسے چاچا کے بارے میں بتا رہا ہوں' جانتا ہے تو یہ کون تھا؟"

"کون تھا؟"

"تیرے علاقے کا ڈی ایس پی تھا۔"

گلو سر سے پاؤں تک کانپ اٹھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ چند ہی لمحوں میں پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی ہوئی یہاں پہنچنے ہی والی ہے۔ "کیا کہا ہے تُو نے اس سے.......... کیا بتایا ہے تو نے اسے چاچا کے بارے میں؟" وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ وہ غم وغصے سے لرز رہا تھا۔

"گلو.......... گلو تجھے کیا ہو گیا ہے یار..........؟" وہ اسے یوں کانپتے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"دیکھ ماے.......... اگر تو مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو.......... تو جواب دے دے۔ میں تیرے لئے کوئی مصیبت کھڑی کرنے سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

"گلو.......... ہوش میں تو ہے تو؟ اپن کتنا بڑا بدمعاش سہی مگر دوستوں کا دوست ہے۔ یاروں کا یار اور ڈرپوک بھی نہیں۔ یہ.......... یہ دیکھ۔" اتنا کہہ کر اس نے بڑی بیدردی سے گریبان گھسیٹ کر ایک کاندھا ننگا کر دیا۔ اس پر بہت گہرے زخم کا نشان تھا۔

"یہ یاروں کی خاطر کھایا تھا۔" اس نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "ساری بتیسی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا اگر ایسی ویسی کوئی بات کی تو۔" ابھی اس نے کندھے پر آئی ہوئی قمیض کو ٹھیک کیا ہی تھا کہ وہی ہوٹل والا لڑکا بوتلیں لینے آ گیا۔ اس کی نگاہ ان دونوں پر جمی ہوئی تھی۔ وہ امام دین کا زخم دیکھ چکا تھا۔ قریب آتے ہی اس نے تان لگائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ دنیا ہے پیارے یہاں غم کے مارے تڑپتے رہیں.......... شکوہ نہ کر گلہ نہ کر.........."

اور غصے سے پھنکارتا ہوا امام دین زور سے ہنس پڑا۔ اس نے ایک زوردار دھپ اس کی کمر پر جڑ دیا اور جیب سے پیسے نکال کر اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

"مجھے مانگنے کی عادت نہیں ہے بابو۔ حالات نے مجبور کر دیا ہے ورنہ.........."

تان سین نے زنانہ آواز میں کہا اور پھدک کر ایک طرف ہو گیا۔

"چل بھاگ یہاں سے۔" امام دین نے اسے جھڑکا اور گلو کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "چاچا خیریت سے ہے' رات میں چلیں گے اس سے ملنے.........."

"آئیں.........." گلو چونک اٹھا۔ "کہاں.......... کہاں چلیں گے؟"

"چاچا سے ملنے.........." امام دین نے آستین کو موڑتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر وہ.......... ڈی ایس پی.........." گلو گڑبڑا گیا۔

"ابے وہ پولیس والا ڈی ایس پی نہیں ہے۔ بدمعاشوں کا ڈی ایس پی ہے۔ بدمعاشوں میں آئی جی' ڈی آئی جی' بھی ہوتے ہیں۔" وہ بتا رہا تھا اور گلو منہ کھولے سن رہا تھا۔

"مگر ماے! وہ لڑکی.......... وہی تھی یار.......... یار تو میرا یقین کیوں نہیں کرتا؟"

گلو کو ایک دم وہ لڑکی یاد آ گئی۔

"تیری بات میری کھوپڑی میں گھسے گی تو یقین کروں گا ناں؟"

"ماے قسم اللہ پاک کی یہ وہی تھی۔"

"اچھا بات سن۔ اپنی کھوپڑی کو کچھ دیر آرام دے لے بلکہ ایسا کر' کچھ دیر کو سو جا۔ اٹھے گا ناں تو ٹھیک ہو چکا ہو گا۔" اس نے بیزاری سے کہا۔

امام دین اس قدر یقین کے ساتھ اس کی بات کی نفی کر رہا تھا کہ اسے یوں لگنے لگا جیسے وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا ہو۔ اس نے کوئی خواب دیکھا ہو یا.......... یا واقعی اسے دھوکہ ہوا ہو۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ واقعی وہ ٹھیک نہیں ہے۔ رات بھر جاگتے رہنا' مسلسل بھاگنے اور فتح کو قتل کر دینے والے واقعات نے اس کے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ وہ چپ چاپ جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ امام دین اس کے پاس

نہیں بیٹھا تھا بلکہ کچھ پانے وغیرہ لے کر واپس گیراج میں چلا گیا تھا۔

گلو کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ بدن درد سے چیخ رہا تھا۔ پنڈلیاں اینٹھی ہوئی تھیں۔ سخت تکلیف کے باوجود نیند غلبہ پا رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ وہ سب کچھ بھول کر سو جائے مگر چاچا کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور ایک دم' پل پل میں بدلتے حالات پر غور کرتا رہا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے قتل ایسا بھیانک جرم کیسے کر لیا۔ اور جو ہوا سو ہوا مگر اب وہ چاچا کو منہ کیسے دکھائے گا؟ اس نے تو چاچا سے بڑے جھوٹ بولے تھے۔ فتح کا تو نام بھی نہیں لیا تھا بلکہ کسی سیٹھ سلطان کا نام لے دیا تھا۔ چاچا کیا سوچتا ہو گا اس کے بارے میں..........

دن ڈھلنے لگا تھا۔ اس کی بڑھتی ہوئی بے چینی نیند کو شکست دے رہی تھی۔ پتہ نہیں کتنی دیر وہ یونہی بے سدھ پڑا رہا۔ پھر جانے کب نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ شاید وہ زیادہ دیر نہیں سویا تھا کہ امام دین نے اسے اٹھا دیا۔

"روٹی کھا لے۔" امام دین اس کے سر کی طرف کھڑا تھا۔

گلو نے آنکھیں کھولیں تو لگا جیسے پوری دنیا گھوم رہی ہو' امام دین بھی گھوم رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر چارپائی کی پٹیوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"کیا بات ہے۔ گلو.......... گلو!!" امام دین اس پر جھک آیا۔

"کچھ نہیں چکر آ رہے ہیں۔" اس نے سر جھٹک کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"کب سے بھوکا ہے؟" امام دین ہاتھ میں روٹی کی ڈلیا اور دو تام چینی کی پلیٹوں میں سالن لئے کھڑا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی اس نے چارپائی پر روٹی اور سالن رکھ دیا اور خود بھی پائنتی کو بیٹھ گیا۔

امام دین کے پوچھنے پر گلو کو یاد آیا کہ واقعی وہ تو بہت دیر سے بھوکا ہے۔ رات بھی اس نے روٹی نہیں کھائی تھی۔ صبح بھی صرف چائے پی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس کے پیٹ میں گولے سے بننے لگے۔ اس نے اٹھ کر کلی کی اور ہاتھ دھو کر پھر چارپائی پر آ بیٹھا۔ بھوک بہت بری چیز ہے۔ اس کا خیال اسے کھانا کھا لینے کے بعد آیا۔ جب پیٹ بھر گیا تب چاچا کی بھوک کا خیال آیا۔ اسے یقین تھا کہ چاچا نے اب تک روٹی نہیں کھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گی۔ وہ تو گلو کے ناراض ہو کر چلے جانے پر ہی سارا سارا دن بھوکا رہتا تھا پھر بھلا ان حالات میں کیسے روٹی کھاتا۔ "امام دین............ تو............ تو چاچا سے ملوا نہیں سکتا؟" وہ آستین سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"ملوا سکتا ہوں۔"

"تو............ تو چل ناں!" وہ جلدی سے بولا۔

"ابے پیٹ بھرتے ہی ہری ہری سوجھنے لگی۔" امام دین نے گلاس سے منہ میں پانی بھر کر پچکاری مارتے ہوئے کہا۔ "دن میں تیرا یوں گھومنا ٹھیک نہیں ہے۔ رات کو چلیں گے۔ اور............ میں نے کہا ہے ناں کہ چاچا بالکل ٹھیک ہے' تو فکر نہ کر۔"

"چاچا ٹھیک نہیں ہو گا امام دین۔ وہ............ وہ اب تک بھوکا ہو گا۔"

"باؤلا ہو گیا ہے تو۔ ابے کوئی کسی کے لئے بھوکا نہیں رہتا۔ اس نے روٹی کھالی ہے۔" آخری جملہ اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر کہا تھا مگر گلو نے سن لیا۔

"کک............ کیسے پتہ تجھے؟"

"وہ............ تیری ایک خالہ بھی ہے کیا............ اسی محلے میں رہتی ہے۔"

"ہاں ہاں............ تو............؟"

"اسی نے کھلا دیا تھا۔"

"تجھے کیسے پتہ؟" گلو حیران ہو کر بولا۔

"ابے ہمیں سب کچھ پتہ رہتا ہے۔" امام دین نے ذرا اکڑ کر جواب دیا۔

"بتا دے ماے............ تو نہیں جانتا کہ میری کیا حالت ہے............ بتا وہ کیسا ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے یار............ تو یقین کیوں نہیں کرتا؟" امام دین جھنجلا گیا پھر فوراً ہی گردن ٹیڑھی کر کے بولا۔ "یہ بتا یہ چاچا کب پیدا ہو گیا تیرا؟"

تب گلو نے اسے ساری بات بتا دی۔ امام دین خاموشی سے سنتا رہا پھر گردن ہلا کر بولا۔ "یار اپن نے تو اس دنیا میں کوئی ایسا بندہ نہیں دیکھا جو یوں کسی کو چبوترے سے اٹھا کر پالے اور ساری زندگی اس کی پرورش پر لگا دے۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟" آخری جملہ اس نے ذرا جھجک کر کہا۔

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"مطلب یہ کہ............ اچھا چھوڑ۔ تو ایسا کر یہ گولی کھا کر سو جا۔ تو بڑا سوجا ہوا ہے تیرا۔ نیند پوری نہ کی تو حالت نہیں سنبھلے گی۔ ہم رات سے پہلے اس کے پاس نہیں جا سکتے اور تیرے لئے رات کا انتظار عذاب بنے نہ بنے میرے لئے ضرور بن جائے گا۔ مجھے ہر ایک منٹ کے بعد تجھے یقین دلانا پڑے گا کہ تیرا چاچا خیریت سے ہے۔ چل پانی سے گولی نگل اور چادر تان کر سو جا۔" امام دین برتن اٹھاتے ہوئے بولا۔ اس نے ایک چھوٹی سی کاغذ کی پڑیا اس کے سامنے رکھ دی تھی۔

گلو کچھ دیر تک گہری نظروں سے امام دین کو دیکھتا رہا پھر سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ چاچا جہاں بھی تھا اور جیسا بھی تھا اس کے پریشان ہونے سے کچھ فرق تو پڑنے والا تھا نہیں۔ دن میں اس کی تلاش کے لیے نکلنا بھی غلط تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ پولیس کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتی پھر رہی ہو گی۔ استاد فتح کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ بہت سے حوالدار اس کے دوست تھے پھر اس کے ملازم گرگے بھی کم نہ تھے۔ سبھی کو گلو کی تلاش ہو گی۔ ایسے میں چاچا کے پاس جانا خود کو سلاخوں کے پیچھے قید کر لینے سے کم کب تھا۔

اسی دوران میں گلو نے وہ چھوٹی سی گولی پانی کے ساتھ حلق میں اتار لی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی سوچیں گڈ مڈ ہونے لگیں۔ کبھی وہ ہواؤں میں اڑنے لگا اور کبھی کسی گہرے کنویں میں گرنے لگا۔ کبھی اسے لگتا کہ سمندر کی موجیں اسے ایک طرف دھکیل دیتی ہیں اور کبھی دوسری طرف پھر اس کی آنکھوں میں' کانوں میں اور ناک میں جیسے پانی بھرنے لگا اور رفتہ رفتہ یہ پانی گہرے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔

☆============☆============☆

اسے امام دین نہ اٹھاتا تو وہ شاید قیامت ہی کے دن اٹھ پاتا۔ امام دین دھیرے دھیرے اس کا کندھا تھپتھپا رہا تھا مگر گلو کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے سر پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ اس نے اس ہتھوڑے کو خود سے دور رکھنے کے لئے ہاتھ نچائے۔

"گلو............ اٹھ جا یار............ سالا ایک گولی میں ہی آسمان سے جا لگا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین کی آواز اسے ہوش کی دنیا میں لے آئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ حلق میں یوں خراشیں پڑ رہی تھیں جیسے سوتے میں اس نے کانٹے نگل لئے ہوں۔

"لے پانی پی۔" امام دین نے اس کے کہے بغیر ہی پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔

پانی پی کر اسے کچھ ہوش آیا۔ اپنے گرد اندھیرا پھیلا دیکھ کر گلو اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اسے ایک دم ہی چاچا کا خیال آگیا تھا۔ "کک.......... کیا بجا ہے؟"

"زیادہ ٹیم نہیں ہوا۔ تو اٹھ۔ چائے پی کر ٹھیک ہو جا۔ چاچا کے پاس جانا ہے' بھوک تو نہیں لگی تجھے؟"

گلو نے جواب دینے کی بجائے نفی میں سر ہلا دیا اور چارپائی سے اتر کر ایک کونے میں بنے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ غسل خانہ پکا بنا ہوا تھا مگر اس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ تھا۔ ذرا دیر بعد وہ نکلا تو کافی بہتر تھا۔ اس نے بدن پر خوب پانی ڈالا تھا' سر پہ پانی ڈالتے ہی اسے لگا تھا جیسے کھوپڑی کے اندر دہکتی ہوئی بھٹی ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی ہو۔ اسے بھوک تھی مگر چاچا کے پاس جانے کی تڑپ نے بھوک نگل لی تھی۔ وہ باہر نکلا تو امام دین چارپائی پر اوندھا لیٹا بیڑی پی رہا تھا۔

"چل ماے۔" اس نے قریب پہنچتے ہی کہا۔

"بڑا بے صبرا ہے تو یار۔" امام دین زور سے ہنس پڑا۔ اس کے انداز میں بلا کا اطمینان تھا۔ "رات گہری ہو لے تو جائیں گے۔ ابھی پولیس ٹھنڈی نہیں پڑی ہے۔ پھر مجھے ایک آدمی کا انتظار ہے۔ اس کے آئے بغیر نہیں جا سکتا۔" امام دین نے اسی اطمینان کے ساتھ جواب دیا اور دھوئیں کے لچھے بنانے لگا۔ دھوئیں کے ہر لچھے میں چاچا کا آنسوؤں سے تر چہرہ مٹ مٹ کر بن رہا تھا۔ گلو کا جی چاہا کہ پاس رکھا پانا امام دین کی کھوپڑی پر دے مارے۔ "روٹی کھالے۔" امام دین نے بیڑی کا آخری کش لے کر کہا۔

"بھوک نہیں ہے۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا اور گیلے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں جمانے لگا۔

امام دین ٹھیک کہہ رہا تھا کہ پولیس ابھی ٹھنڈی نہیں پڑی۔ ابھی استاد فتح کو ختم

ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی تھی؟ گلو کو خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ ایک قتل کر چکا تھا مگر اس کے اندر ڈر یا خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اسے اگر فکر تھی تو صرف چاچا کی۔ وہ جلد از جلد چاچا سے ملنا چاہتا تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ چاچا سے مل کر بھی کون سا اس کے حالات بدل جائیں گے۔ استاد فتح کون سا زندہ ہو جائے گا۔ حالات کب معمول پر آجائیں گے۔ صرف اتنا ہی تو ہو گا کہ وہ چاچا کے سینے سے لگ کر رو لے گا۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کرے گا کہ اسے قتل کرنا اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ تو بس اچانک ہی ہتھے سے اکھڑ گیا تھا۔ وہ چاچا کے لئے کسی کے منہ سے کوئی گالی سن ہی نہیں سکتا۔ پھر............ پھر کیا ہو گا؟ ایک سوال اس کے دماغ میں یوں رینگ آیا جیسے گہرے اندھیرے میں بھٹکی ہوئی کوئی کرن رینگ آئے۔ اسی سوال نے اسے پریشان کر دیا۔ اگر چاچا نے پوچھ لیا کہ تو نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟ استاد فتح کی بجائے سیٹھ سلطان کا نام کیوں لیا تھا؟ پھر وہ کیا جواب دے گا؟

اچانک ہی اس کا جی گھبرا گیا۔ اس نے چاہا کہ بھاگ جائے۔ ایسی جگہ جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ نہ چاچا ہو' نہ اس کا خیال۔ نہ استاد فتح کو کوئی جانتا ہو نہ اسے یا پھر............ یا پھر وہ مرجائے پھر پیدا ہو اور اس بار کسی ایسے گھر میں پیدا ہو جہاں ماں باپ اور بہن بھائی سب ہوں۔ بالکل بدلی ہوئی زندگی ہو۔ سب کچھ مختلف ہو مگر وہ ایسا کچھ کرنے پر قادر ہی کب تھا۔

"دیکھ گلو!" اچانک امام دین بیڑی پھینک کر اٹھ بیٹھا۔ "آدمی اکیلا ہی پیدا ہوتا ہے۔ اکیلا جیتا ہے اور اکیلا ہی مرتا ہے۔ یہ جو آدمی کے چاروں طرف بھیڑ ہوتی ہے ناں' یہ صرف دیکھنے کی ہوتی ہے جب تک تو بھیڑ میں چلتا رہے گا اکیلے پن کا احساس نہیں ہو گا' مگر احساس نہ ہونے سے آدمی کا اکیلا پن ختم نہیں ہوتا۔ وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔"

"اس بکواس کا مطلب کیا ہے؟" گلو نے گردن ٹیڑھی کر کے اس کی جانب دیکھا۔

امام دین کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ پتہ نہیں گلو کو کیوں ایسا لگ رہا تھا جیسے جب سے اس نے اپنے گنجے سر پر بال اگائے ہیں' وہ کچھ سنجیدہ سنجیدہ ہو گیا ہے۔ وہ اکھڑ پن بھی نہیں رہا جو اس نے ہمیشہ سے اس میں دیکھا تھا۔ اس کی باتیں بھی جان محمد ایسی لگنے لگی تھیں اور............ جانو تو پڑھا لکھا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کبھی اکیلے نہیں رہتے انہیں اپنے اکیلے پن کا احساس بہت دیر میں ہوتا ہے اور جب وہ اس تنہائی کی اذیت سے اچانک دو چار ہوتے ہیں تو بہت جلدی بکھر جاتے ہیں بلکہ جلدی مرجاتے ہیں مگر جو لوگ اکیلے پن کا احساس رکھتے ہیں وہ کبھی بکھرنے نہیں پاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ اکیلے ہیں' خواہ ان کے گرد کتنے ہی لوگ کیوں نہ ہوں۔"

"پتا نہیں تو کیا کہہ رہا ہے؟" گلو نے بیزاری سے کہا اور منہ پھیر لیا پھر اس نے آسمان پر نگاہ دوڑائی۔ آسمان پر گہری سیاہی بچھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب امام دین کس بات کا منتظر ہے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ امام دین کسی آدمی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ایک عجیب سی سنسناہٹ پھیل گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں۔ اس نے کن انکھیوں سے امام دین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ گلو اس سے یونہی ملنے کے لئے آ گیا ہو۔ "سالا خود کو دوست کہتا ہے۔" گلو نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اور دوست کی پریشانی پر ذرا بھی پریشان نہیں۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ میں کتنا بے چین ہوں۔ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کیا کچھ ہو چکا ہے؟"

اس کا جی چاہا کہ امام دین کے سر پر اگ آنے والے گھنے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر اتنے جھٹکے دے کہ اس کا مغز ناک سے باہر آ جائے۔ گلو کی مٹھیاں بھنچ گئیں نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ اچانک وہ کھڑا ہوا اور اس نے قریب پڑے گاڑی کے جیک کو اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ کھڑبڑ کی تیز آواز پیدا کرتا ہوا دور رکھے ٹب سے ٹکرا کر رک گیا۔

"کیا.......... کیا بات ہے؟" امام دین چونک اٹھا۔

"یہ تو بتائے گا مامے۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" امام دین بیڑی پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ کیا تو اس بات کا انتظار کر رہا ہے کہ پولیس آئے اور مجھے پکڑ کر لے جائے؟"

وہ زور سے ہنس پڑا۔ "دیکھ گلو! تو پاگل ہو گیا ہے۔ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھا ہے۔ ابے میں کرار کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ گاڑی لے کر آئے گا اور ہم اس کے ساتھ

جائیں گے۔"

"کہاں جائیں گے؟" گلو کے چبھتے ہوئے لہجے میں شک بھی شامل ہو گیا۔

"تیرے چاچے سے ملنے۔ عجیب آدمی ہے تو۔" وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ "ایک آدمی کا دھڑن تختہ کرنے کے باوجود تجھے اپنی فکر نہیں ہے' چاچا کی فکر ہے۔ وہ جو گاڑی میں ڈی ایس پی آیا تھا ناں.......... وہ تیری سیٹنگ کرا رہا ہو گا تھانے میں۔ وہی کرار کو بھیجے گا۔ اب میں تجھے یوں کیسے لے کر نکل جاؤں۔ وہاں بات نہ بنی تو؟ کبھی کبھی کھوپڑی بھی استعمال کر لیا کر۔"

اور گلو نے واقعی کچھ دیر کھوپڑی استعمال کی تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ ہوا نکل جانے والے غبارے کی طرح پچک کر رہ گیا۔

"دیکھ' ذرا تسلی رکھ۔ میرے پاس آیا ہے ناں تو اعتماد بھی کر مجھ پر۔ میں تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔" وہ اس کے پاس بیٹھ کر' اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔ "دیکھ گلو' تو نہیں جانتا کہ تو نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ مارکیٹ میں تیری مانگ بڑھ گئی ہے۔ ابے کچھ سینہ وینہ نکال کر بیٹھ۔ ویلیو بڑھا اپنی اور ہاں یہ بھی سوچ لے کہ اب تیرے دن پھر گئے۔ وہ فتح کیا بیچتا تھا سالا۔ بڑا طرم خان بنا پھرتا تھا ناں وہ اور تو.......... تو نے اس طرم خان کو لٹا دیا۔ تو سمجھ نہیں رہا یار میرے۔ کیسے سمجھاؤں تجھے؟"

گلو واقعی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسے تو شک ہونے لگا تھا کہ اس کے دن نہیں پھرے' امام دین کی کھوپڑی پھر گئی ہے۔ ایسے حالات میں وہ دن پھرنے کی بات کر رہا تھا۔ مارکیٹ میں مانگ بڑھنے کی بات کر رہا تھا۔ "کون سی مارکیٹ؟ ابے کسی ویلیو؟" وہ جھنجلا گیا۔

"نہیں سمجھے گا تو.......... اچھا چھوڑ بس تجھے چاچا سے ملنا ہے ناں اور.......... اور تو پولیس سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ ہے ناں؟"

گلو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو سمجھ لے کہ تیرے یہ دونوں کام ہو گئے۔ اب تو روٹی کھا لے۔ تیری وجہ سے میں بھی بھوکا ہوں۔" آخری جملہ اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ گلو کو اس پر ترس آ گیا۔

"ٹھیک ہے پھر جلدی سے منگا لے۔ اگر گاڑی آ گئی تو.........."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کبھی اکیلے نہیں رہتے انہیں اپنے اکیلے پن کا احساس بہت دیر میں ہوتا ہے اور جب وہ اس تنہائی کی اذیت سے اچانک دو چار ہوتے ہیں تو بہت جلدی بکھر جاتے ہیں بلکہ جلدی مرجاتے ہیں مگر جو لوگ اکیلے پن کا احساس رکھتے ہیں وہ کبھی بکھرنے نہیں پاتے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ اکیلے ہیں' خواہ ان کے گرد کتنے ہی لوگ کیوں نہ ہوں۔"

"پتا نہیں تو کیا کہہ رہا ہے؟" گلو نے بیزاری سے کہا اور منہ پھیر لیا پھر اس نے آسمان پر نگاہ دوڑائی۔ آسمان پر گہری سیاہی بچھی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اب امام دین کس بات کا منتظر ہے۔ اچانک اسے یاد آیا کہ امام دین کسی آدمی کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں ایک عجیب سی سنسناہٹ پھیل گئی۔ اسے لگا جیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ہوں۔ اس نے کن انکھیوں سے امام دین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ گلو اس سے یونہی ملنے کے لئے آ گیا ہو۔ "سالا خود کو دوست کہتا ہے۔" گلو نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اور دوست کی پریشانی پر ذرا بھی پریشان نہیں۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ میں کتنا بے چین ہوں۔ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کیا کچھ ہو چکا ہے؟"

اس کا جی چاہا کہ امام دین کے سر پر اگ آنے والے گھنے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ کر اتنے جھٹکے دے کہ اس کا مغز ناک سے باہر آ جائے۔ گلو کی مٹھیاں بھنچ گئیں نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ اچانک وہ کھڑا ہوا اور اس نے قریب پڑے گاڑی کے جیک کو اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ کھڑبڑ کی تیز آواز پیدا کرتا ہوا دور رکھے ٹب سے ٹکرا کر رک گیا۔

"کیا......... کیا بات ہے؟" امام دین چونک اٹھا۔

"یہ تو تو بتائے گا ماے۔" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" امام دین بیڑی پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ کیا تو اس بات کا انتظار کر رہا ہے کہ پولیس آئے اور مجھے پکڑ کر لے جائے؟"

وہ زور سے ہنس پڑا۔ "دیکھ گلو! تو پاگل ہو گیا ہے۔ اچھے برے کی تمیز کھو بیٹھا ہے۔ ابے میں کرار کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ گاڑی لے کر آئے گا اور ہم اس کے ساتھ

جائیں گے۔"

"کہاں جائیں گے؟" گلو کے چبھتے ہوئے لہجے میں شک بھی شامل ہو گیا۔

"تیرے چاچے سے ملنے۔ عجیب آدمی ہے تو۔" وہ بری طرح جھنجلا گیا۔ "ایک آدمی کا دھڑن تختہ کرنے کے باوجود تجھے اپنی فکر نہیں ہے' چاچا کی فکر ہے۔ وہ جو گاڑی میں ڈی ایس پی آیا تھا ناں......... وہ تیری سیٹنگ کرا رہا ہو گا تھانے میں۔ وہی کرار کو بھیجے گا۔ اب میں تجھے یوں کیسے لے کر نکل جاؤں۔ وہاں بات نہ بنی تو؟ کبھی کبھی کھوپڑی بھی استعمال کر لیا کر۔"

اور گلو نے واقعی کچھ دیر کھوپڑی استعمال کی تو ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ ہوا نکل جانے والے غبارے کی طرح پچک کر رہ گیا۔

"دیکھ' ذرا تسلی رکھ۔ میرے پاس آیا ہے ناں تو اعتماد بھی کر مجھ پر۔ میں تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔" وہ اس کے پاس بیٹھ کر' اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔ "دیکھ گلو' تو نہیں جانتا کہ تو نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ مارکیٹ میں تیری مانگ بڑھ گئی ہے۔ ابے کچھ سینہ وینہ نکال کر بیٹھ۔ ویلیو بڑھا اپنی اور ہاں یہ بھی سوچ لے کہ اب تیرے دن پھر گئے۔ وہ فتح کیا بیچتا تھا سالا۔ بڑا طرم خان بنا پھرتا تھا ناں وہ اور تو......... تو نے اس طرم خان کو لٹا دیا۔ تو سمجھ نہیں رہا یار میرے۔ کیسے سمجھاؤں تجھے؟"

گلو واقعی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسے تو شک ہونے لگا تھا کہ اس کے دن نہیں پھرے' امام دین کی کھوپڑی پھر گئی ہے۔ ایسے حالات میں وہ دن پھرنے کی بات کر رہا تھا۔ مارکیٹ میں مانگ بڑھنے کی بات کر رہا تھا۔ "کون سی مارکیٹ؟ ابے کسی ویلیو؟" وہ جھنجلا گیا۔

"نہیں سمجھے گا تو......... اچھا چھوڑ بس تجھے چاچا سے ملنا ہے ناں اور......... اور تو پولیس سے بھی بچنا چاہتا ہے۔ ہے نا؟"

گلو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو سمجھ لے کہ تیرے یہ دونوں کام ہو گئے۔ اب تو روٹی کھا لے۔ تیری وجہ سے میں بھی بھوکا ہوں۔" آخری جملہ اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ گلو کو اس پر ترس آ گیا۔

"ٹھیک ہے پھر جلدی سے منگا لے۔ اگر گاڑی آ گئی تو........."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین جیسے انتظار ہی میں بیٹھا تھا۔ اس نے گلو کا پورا جملہ بھی نہیں سنا اور ہوٹل کے چھوٹے کو آواز دے دی۔ گلو کے اردگرد کی بوجھل فضا ذرا ہی دیر میں سبک ہو گئی۔ یہ صرف گلو کا احساس تھا۔ اس کی حس سماعت کا قصور تھا۔ اب تک تو جیسے اس کے کان بند پڑے تھے۔ باہر کی کوئی آواز اندر جا ہی نہیں رہی تھی بس امام دین کی بات پر کان لگے تھے۔ ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو ہوٹل میں بجتا نورجہاں کا گانا بھی سنائی دینے لگا اور چھوٹے کی تانیں بھی۔

ذرا دیر میں ہی چھوٹا' گاتا ٹھمکے لگاتا' ہاتھ میں ٹرے پکڑے کھانا لے آیا۔ امام دین بہت بھوکا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر گلو کو جلدی سے آنے کو کہا اور ہتھیلی تک لٹکی ہوئی آستین اوپر کر کے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا دیکھ کر گلو کی بھوک بھی چمک اٹھی تھی۔ ان دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر اور پانی پی کر امام دین نے زور کی ڈکار لی اور بولا۔ "یار بچپن میں بڑے فاقے کیے ہیں اس وقت ایسی حالت نہیں ہوئی تھی جیسی اب ہو جاتی ہے۔ آدمی بڑا ہوتا ہے تو اس میں صبر بھی بڑھنا چاہئے پر یہاں تو سالا سب کچھ الٹا ہے۔"

گلو ہاتھ دھو کر کلی کر رہا تھا جب کسی گاڑی کی قریب آتی ہیڈ لائٹس نے اسے چونکا کر دیا۔ اس نے قمیض کے دامن سے منہ پونچھتے ہوئے آتی ہوئی گاڑی پر نظر جما دی۔ گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ امام دین اب تک گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"گلو..........."

امام دین نے اتنا ہی کہا تھا کہ گلو وہاں تک پہنچ گیا۔ وہ غالباً کرار تھا جس کا انتظار تھا۔ گلو نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں امام دین اگلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی فوراً ہی آگے بڑھ گئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی گلو کو چاچا کی فکر ستانے لگی۔ شرمندگی کا احساس اسے یوں بھی ادھ موا کر رہا تھا۔ وہ تمام راستے یہی سوچتا رہا کہ وہ چاچا کو کیا جواب دے گا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ گاڑی کن راستوں کو عبور کر کے اس اندھیری گلی میں داخل ہوئی۔ کرار نے بریک لگائی تو گاڑی جھٹکے سے رک گئی اور گلو جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے دونوں طرف دیکھا' سامنے دیکھا یہ اس کے گھر والی گلی نہیں تھی۔ یہاں جھگیاں پڑی تھیں۔ کسی کسی کے کچے پکے گھر بھی بنے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں بہت سے ننگے اور میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بچے جمع ہو گئے۔ امام دین کے

گاڑی سے اترتے ہی بچے اس سے لپٹ گئے۔

"چاچا آگیا........... چاچا آگیا۔" کی بہت سی آوازوں نے گلو کو گھیر لیا۔ امام دین ایک دو بچوں کو گود میں بھر چکا تھا۔ کئی اس کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے تھے۔

"ابے ٹانگیں چھوڑ یار۔" امام دین نے ایک بچے کو جھٹکا دیا۔ گلو اس کے پیچھے حیران حیران سا کھڑا تھا۔

"میں جاؤں؟" کرار نے کھڑکی سے منہ نکال کر امام دین سے پوچھا۔

"آں........... ہاں ہاں........... تم جاؤ اور سنو! طاہر صاحب سے کہنا کہ میں کل سویرے آؤں گا۔" اتنا کہہ کر امام دین نے گلو کو آنے کا اشارہ کیا اور بچوں کے ہجوم میں گھرا ایک کچے مکان کی طرف بڑھ گیا۔ اس پوری بستی میں یہی مکان ذرا بڑا' اور پکا بنا ہوا تھا۔ اس کی دیواروں پر چونا بھی کیا ہوا تھا اور دروازوں پر گہرے ہرے رنگ کا پینٹ کیا گیا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی امام دین نے بچوں کو گود سے اتار دیا۔ جیب سے ایک روپے کے نوٹوں کی گڈی نکالی اور بچوں میں بانٹنے لگا۔ گلو کو الجھن ہو رہی تھی۔ وہ یہ تو سمجھ گیا تھا کہ اس کا چاچا اسی گھر میں ہے' وہ چاہتا تھا کہ امام دین کو چھوڑ کر گھر میں گھس جائے مگر ایسا کرنے کی اسے ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ امام دین کو گدی سے پکڑ کر کھینچ لے۔ بچوں میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ وہ اچک رہے تھے' اچھل رہے تھے اور امام دین انہیں جھڑکیاں دے رہا تھا۔

"اے!" آخر اس سے برداشت نہیں ہو پایا تو وہ دبے دبے انداز میں چیخ پڑا۔

"چلو بھاگو۔" مامے نے اسے دیکھا پھر پلٹ کر بچوں پر چیخا۔ بچے ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے پلٹ گئے۔ امام دین نے آگے بڑھ کر ہرے رنگ کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازے کے قریب آہٹ ہوئی۔ دروازے میں بنے ایک چھوٹے سے سوراخ میں ایک سیاہ پتلی چمکی اور دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ گلو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ آنسو آنکھوں کے اندر ہی کہیں چکرا رہے تھے۔

"آجا..........." امام دین نے گلو سے کہا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے پھیلا آنگن بالکل سنسان تھا۔ دروازے پر ایک موٹی سی لڑکی کھڑی تھی جس نے اپنے بھدے جسم پر سیاہ چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس کی بتیسی نکلی ہوئی تھی اور وہ امام دین کو ایسے دیکھ رہی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے کچھ دیر پہلے بچے امام دین کے ہاتھوں میں پکڑے ایک ایک کے نوٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے کھی کھی کی آوازیں نکال رہی تھی۔

"کیوں ہنس رہی ہے؟" امام دین نے اسے گھورا۔

"کھی کھی کھی۔" وہ اس بار زور سے ہنس پڑی۔

"کہاں ہے؟" امام دین نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ہاتھ سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ امام دین گلو کو لئے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جس طرف اس لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ اندر روشنی تھی مگر آہٹ کوئی بھی نہ تھی۔ گلو جونہی اندر داخل ہوا' اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سامنے کھاٹ پر چاچا یوں بے سدھ پڑا تھا جیسے اس کی روح پرواز کر چکی ہو۔ "چاچا.........." گلو چیخ کر آگے بڑھا چاچا کا بے جان جسم ایک دم اچھل پڑا۔ وہ اتنی تیزی سے اٹھ بیٹھا کہ گلو کے ساتھ ہی امام دین کو بھی حیرت ہوئی۔

"گلو.......... گلو.......... گلو میرے بچے.......... میرے لال.......... تو.......... تو ٹھیک ہے نا؟" چاچا اس سے لپٹ گیا پھر اس کے چہرے اور بدن کو یوں ٹٹولنے لگا جیسے کہیں زخم تلاش کر رہا ہو۔ گلو بوڑھے چاچا کے جھرخ سے چہرے کے چٹاچٹ بوسے لے رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں چاچا.......... تجھے.......... تجھے وہاں کسی نے کچھ کہا تو نہیں؟"

اچانک ہی گلو کو خیال آگیا کہ پولیس چاچا کو پکڑ کر تھانے لے گئی ہو گی۔

"نہیں.........." چاچا نے نگاہیں چرا لیں۔ پھر ایک دم سر اٹھا کر بولا۔ "گلو' تو نے یہ کیا کیا بیٹا؟"

"بس چاچا.......... کچھ بھی مت پوچھو۔ میں.......... میں تو تجھ سے معافی مانگنے آیا ہوں چاچا! میں نے تجھ سے جھوٹ بولے۔ تجھے دھوکا دیا تھا ناں میں نے.......... یہ سب اسی کی سزا ہے۔ مجھے سزا مل گئی ہے چاچا.......... اب.......... اب تو بس مجھے معاف کر دے۔" وہ روتا ہوا اس کے گھٹنے پر جھک گیا۔ وہ رو رہا تھا۔ چاچا بھی رو رہا تھا۔ امام دین دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے کھڑا تھا جیسے کوئی دلچسپ تماشہ دیکھ رہا ہو۔ چاچا گلو کے سر پر ہاتھ رکھے گم صم بیٹھا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس میں بات کرنے کی سکت ہی نہ ہو۔

"گلو.......... تو نے.......... جھوٹ کیوں بولا؟ کس چیز کی کمی کی تھی میں نے.......... جو تو اس لچے لفنگے کے پاس جا پہنچا۔" کچھ دیر بعد چاچا نے اپنی میلی آستین سے آنکھیں رگڑ کر پوچھا۔

"چاچا۔" گلو کوئی جواب دینے کی بجائے دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔

"اچھی زندگی کی تلاش میں لوگ راستہ بھٹک جاتے ہیں گلو اور نہیں جانتے کہ.......... اچھی زندگی کسے کہتے ہیں۔" وہ یوں بولا جیسے خود سے کہہ رہا ہو۔ اس کی نگاہیں خلا میں بھٹک رہی تھیں۔ "وہ بھی.......... تو تیری ہی طرح گھر سے نکل گئی تھی۔ پھر پلٹ کر نہیں آئی۔ کسی کی محبت بھی اسے واپس نہیں لا سکی تھی گلو.......... راستے اسے نگل گئے۔ استاد فتح جیسے بدمعاش' شکورے جیسے لچے اسے ہم سے چھین کر لے گئے اور.......... اور اب.......... تو.......... تو بھی انہی کے چکر میں آگیا گلو۔ یہی تو ڈر تھا مجھے.......... یہی تو.........."

"کسے چاچا..........؟" گلو اپنا رونا بھول گیا۔ "کسے' کون چھین کر لے گیا چاچا۔ کون گھر سے نکل گئی؟"

"آں..........؟" چاچا چونک اٹھا۔ "کچھ نہیں.......... تو کہاں تھا؟ پولیس تیری تلاش میں ہے گلو۔ تو چلا جا یہاں سے۔" وہ ایک دم ہی گھبرا گیا تھا۔ "وہ قتل ہو گیا ہے گلو۔ تو نے اسے مار دیا ہے۔ وہ تجھے پھانسی دے دیں گے۔ بھاگ جا یہاں سے گلو۔" وہ گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ گلو بھی گھبرا گیا۔

"اسے کچھ نہیں ہو گا چاچا۔" امام دین بڑے اطمینان سے بولا۔ "یہ میرے پاس ہے۔ تو اطمینان رکھ۔"

امام دین کے بولنے پر چاچا چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ پھر گلو سے مخاطب ہوا۔

"یہ.......... یہ کون ہے؟"

گلو نے اسے مختصراً امام دین کے بارے میں بتایا۔ چاچا مسلسل اسے شکی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ گلو امام دین کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ چاچا اس کی باتوں سے مطمئن نہیں ہو رہا۔

"گلو.......... چل یہاں سے چل۔ ہم یہ شہر چھوڑ دیں گے۔ میں تجھے ان لوگوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ تو پھر لفنگوں کے چنگل میں پھنس جائے گا۔" چاچا نے امام دین کی موجودگی کی پرواہ کئے بغیر کہا۔

"چاچا' میرا یقین کر چاچا۔ امام دین اچھا آدمی ہے۔ اس نے مجھے بچایا ہے۔ اسی نے تجھے یہاں پہنچایا ہے۔ اسی نے.......... اسی نے تو.........."

"ٹھیک ہے گلو۔ میں کبھی نہ کبھی اس کا یہ احسان چکا دوں گا مگر.......... اس کے احسان کے بدلے میں' میں تجھے نہیں چھوڑ سکتا۔ بیٹا میں نے تجھے بڑی مشکل سے پالا پوسا ہے گلو۔ تو.......... تو کسی کی امانت ہے۔ تجھے حقدار کو لوٹائے بغیر تو میں مر بھی نہیں سکوں گا بتوا۔" چاچا کی آنکھیں پھر بھیگ گئی تھیں۔

"تیری مرضی ہے چاچا۔ تو اسے لے جانا چاہتا ہے تو شوق سے لے جا' مگر اتنا بتا دوں کہ پولیس سارے شہر کی ناکہ بندی کر چکی ہے۔ ہر اسٹیشن پر پولیس لگی ہوئی ہے۔ استاد فتح کے آدمی بھی اسے تلاش کر رہے ہیں اگر کچھ ہو گیا تو.......... تو ذمے دار ہو گا۔" امام دین نے رکھائی سے کہا اور گلو سے بولا۔ "جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کر لے اور مجھے بتا دے۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔" اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

چاچا کی آنکھیں بجھنے لگیں۔ خوف اس کے چہرے کی جھریوں میں رینگنے لگا۔ گلو بھی گھبرا گیا۔ اس نے چاچا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "چاچا.......... ہم کہاں جائیں گے چاچا؟ کون ہے ہمارا؟ کون پناہ دے گا ہمیں؟ ضد نہیں کر چاچا۔ امام دین اچھا آدمی ہے۔"

"پتہ نہیں.......... پتہ نہیں' گلو کون اچھا ہے اور.......... کون برا۔" وہ بڑبڑایا۔ خوف اب بھی اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں بھرا تھا۔ "مگر.......... مگر.......... تو نے قتل کیا ہے گلو۔" اس کی آواز پھٹنے لگی۔

"آہستہ بول۔" گلو نے اس کا منہ بند کر دیا۔ "چاچا.......... تجھے یہیں رہنا ہے اسی گھر میں اور مجھے بھی.......... یہیں رہنا ہے۔ امام دین کے ساتھ۔ خدا پر بھروسہ رکھ چاچا۔ میری موت اگر پھانسی سے لکھی ہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"کیا فیصلہ کیا تو نے؟" امام دین ایک دم کسی دیو کی طرح آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر رکھائی تھی اور آنکھوں میں سرد مہری۔

چاچا اس بار کچھ نہیں بولا۔ بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ گلو آنکھوں

کے گیلے کونے صاف کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "ٹھیک ہے ماے.......... چاچا یہیں رہے گا۔ یہ.......... امام دین' بس اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے۔"

"ابے اسے کچھ نہیں ہو گا۔ بس تو اس سے کہہ دے کہ یہ عورتوں کی طرح بین نہ کرے۔ ہاں اسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ عصمت جہاں اس کا خیال رکھے گی۔"

"کون عصمت جہاں؟" گلو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہی موٹی یار۔" امام دین نے باہر کی طرف اشارہ کیا اور پھر دروازے ہی میں اس موٹی لڑکی کو دیکھ کر جھینپ گیا۔ "تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔ وہ کھی کھی کر کے پھر ہنس پڑی۔ امام دین گلو کی طرف پلٹا۔ "چل.......... میں یہاں دیر تک نہیں رک سکتا۔"

یہ سنتے ہی چاچا تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ "اسے کہاں لے جا رہا ہے؟" اس نے گلو کا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا۔

"ابے یہ کیسا چاچا ہے یار؟" امام دین پھر جھلا کر گلو پر برس پڑا۔ "کوئی بات اس کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔"

"تو چپ رہ۔" گلو نے ملتجیانہ لہجے میں کہا اور پلٹ کر چاچا کا وہ ہاتھ پکڑ لیا جس سے اس نے گلو کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ "چاچا.......... یہاں میرا رکنا خطرناک ہے۔ میں امام دین کے ساتھ رہوں گا۔ وہاں پولیس نہیں پہنچ سکتی۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ میں آتا رہوں گا۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا مگر چاچا کی آنکھوں سے بے صبری ٹپک رہی تھی۔

امام دین اس جذباتی ڈرامے سے اکتا کر باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے گلو سے جلدی باہر آنے کو کہہ دیا۔ امام دین کی غیر موجودگی میں گلو نے چاچا کو بڑی جلدی سنبھال لیا ورنہ امام دین اس کے سر پر ننگی تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ چاچا نے اس دوران میں کئی بار آنکھوں میں آ جانے والے گدلے پانی کو رگڑا۔ اس سے جلدی آنے کا وعدہ لیا۔ اپنا خیال رکھنے کو کہا اور دروازے تک اس کا ہاتھ پکڑے رہا۔ بڑی مشکل سے ہاتھ چھوڑا۔

دروازے پر امام دین اس کالی موٹی لڑکی کو ہدایت دے رہا تھا کہ اس بڈھے کا خیال رکھنا۔ اسے رونے مت دینا ورنہ بات کہیں سے کہیں پہنچ جائے گی۔ گلو نے یہ سب سنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ امام دین کی نگاہ گلو پر پڑی۔ "آگیا تو! میری بات سن گلو۔ یار اسے اچھی طرح سمجھا دے۔ اس کی وجہ سے بات بگڑ گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔ ساری عمر کے لئے جیل چلا جائے گا تو۔ استاد فتح کا قتل کوئی معمولی بات نہیں ہے۔"

"نہیں نہیں........... یہ........... یہ جیل نہیں جائے گا۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔"

دروازے کی طرف سے چاچا کی آواز آئی۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ "امام دین........... اس کا خیال رکھنا۔ میں........... میں تیرے ہاتھ جوڑتا ہوں بیٹا........... یہ........... یہی ہے میرا سب کچھ ہے۔" چاچا نے آگے بڑھ کر امام دین کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"ٹھیک ہے۔" امام دین رعونت سے بولا۔ "دیکھ چاچا........... یہ سب ہم تیرے بھلے کو کر رہے ہیں۔" اس بار اس کی آواز دھیمی اور لہجہ نرم تھا۔ "معاملے کو سنبھال رہے ہیں۔ اب اگر تیری بے صبری سے معاملہ بگڑ گیا ناں تو..........."

"نہیں نہیں........... میں' میں کچھ نہیں کروں گا۔ بڑا بس تو میرے گلو کا خیال رکھنا۔ یہ بہت معصوم ہے کچھ نہیں جانتا کہ..........."

"چھوڑ چاچا' یہ کتنا معصوم ہے اس کا ریکارڈ تو اب تھانے تک پہنچ گیا ہے۔" امام دین نے قہقہہ لگایا۔ چاچا کے چہرے پر دھواں سا پھیل گیا۔ "چل کاکے۔" امام دین نے پلٹ کر گلو سے کہا۔ گلو چاچا کے ہاتھ پر پیار کر کے آگے بڑھ گیا۔ وہ موٹی اب بھی کھڑی ہنس رہی تھی۔ چاچا کے ہاتھ جوڑنے اور آنکھیں بھیگ جانے پر بھی چپ نہیں ہوئی تھی' ہنسے جا رہی تھی۔ پتہ نہیں یہ کیسی لڑکی تھی۔ گلو کا جی چاہا کہ اسے دھکا دے کر گھر کے اندر پھینک دے۔ اس سے پوچھے کہ کیا یہاں بندر تماشا ہو رہا ہے جو اس کے دانت نکلے ہوئے ہیں؟ اس کا بھاری بدن اس کی ہنسی کے ساتھ تھلتھلا رہا تھا۔ وہ امام دین کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی کمر پر پانی کی دو لکیریں بہہ رہی ہوں۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا اسے جاتا دیکھ کر رو رہا ہے۔ اسے زندگی میں پہلی بار پوری طرح احساس ہوا تھا کہ رشتہ صرف پیدا کرنے والوں سے نہیں ہوتا' پالنے والے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔

اس کے کان پیچھے کی آوازوں پر لگے تھے۔ وہ دروازہ بند ہونے کی آواز سننا چاہتا

تھا مگر پوری گلی عبور کرنے کے بعد بھی وہ دروازہ بند ہونے کی آواز نہیں سن سکا۔ گلی سے باہر آتے ہی امام دین ٹھہر گیا۔

"ک........... کیا ہے؟"

"گاڑی آئے گی۔" اس نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

"کس کی گاڑی؟" اس کے اندر اتھل پتھل ہونے لگی۔

"میرے باپ کی گاڑی۔" اس نے غصے میں جواب دیا۔ "تو اتنے سوال کیوں کرتا ہے؟"

گلو کا جی چاہا کہ وہ امام دین کو صاف صاف بتا دے کہ اس کے اندر کہیں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔ اعتماد بحال نہیں ہو رہا ہے اور اعتماد بحال نہ ہونے میں خود امام دین کا قصور ہے۔ وہ اس تمام معاملے میں سسپنس پیدا کئے ہوئے ہے۔ کوئی بات واضح نہیں ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے وہ کوئی چکر چلا رہا ہے۔ جیسے اس سارے معاملے سے اس کا کوئی بڑا مفاد وابستہ ہے۔ یہ سب سوچتا رہا مگر اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ جس انتشار کی کیفیت سے دوچار تھا اس سے نجات چاہتا تھا۔ امام دین سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا مگر یہاں........... سڑک پر یہ ممکن نہ تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج وہ امام دین سے بات ضرور کرے گا۔ وہ انہی سوچوں میں تھا کہ دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آتے ہی چوکنا ہو گیا۔ امام دین نے بھی آدھی پی ہوئی بیڑی پھینک کر جوتے سے رگڑ دی۔

گاڑی کچھ فاصلے پر رک گئی۔ گلو سمجھا کہ وہ کوئی اور گاڑی ہے۔ امام دین کسی چیتے کی طرح ہوشیار تھا۔ اچانک گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔ گلی میں گہرا اندھیرا چھا گیا پھر گلی دوبارہ روشن ہو گئی۔ ان دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ دوسرے لمحے پھر آنکھوں میں گہرا اندھیرا در آیا۔ گلو کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔ اندر بیٹھا ہوا شخص بار بار لائٹس جلا رہا تھا۔ گلو کو اس روشنی کے ساتھ شاید خطرہ گلی میں پھیلتا اور سمٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"امام دین........... بھاگ..........." وہ اتنا کہہ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ امام دین نے بروقت اس کا بازو پکڑ لیا۔

"آجا........... یہی ہے۔" بازو پکڑتے ہی امام دین کو احساس ہو گیا کہ اگر اس پل اس نے گلو کو نہ پکڑ لیا ہوتا تو واقعی بھاگ چکا ہوتا۔ "کیا ہے؟" اس نے گلو کے بازو کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"امام دین یہ پولیس بھی ہو سکتی ہے۔" گلو کا بھاگے بغیر ہی سانس پھول گیا۔

"گلو.......... گلو خدا کے واسطے تو ہوش میں آجا یار!" وہ بری طرح جھنجلا گیا۔

"میری بات پر یقین کرلے کہ اب نہ پولیس تجھے پکڑ سکتی ہے اور نہ استاد فتح کے آدمی۔ تو بالکل محفوظ ہے۔ تیری زندگی کے اچھے دن شروع ہونے والے ہیں۔ تیری کایا پلٹ چکی ہے یار.........." اس نے یہ کہہ کر اس کا بازو جھٹکے سے چھوڑ دیا۔

گلو ہونقوں کی طرح اندھیرے میں اس کی شکل دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "یہ گاڑی ہمیں لینے آئی ہے۔ چل جلدی۔" اس نے گلو کو دھکا دیا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے گاڑی تک پہنچ گئے۔ پہلے گلو آگے تھا مگر گاڑی کے قریب پہنچتے پہنچتے گلو امام دین کی آڑ میں ہو گیا۔ انہیں دیکھتے ہی گاڑی کے ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ گلو کو اندر دھکیل کر امام دین پھرتی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "چلو.........." اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"اسماعیل صاحب نے اسی وقت تم لوگوں کو بلایا ہے۔" ڈرائیور کی آواز عجیب سی تھی۔ یوں جیسے اس کا گلا خراب ہو۔ پھنسی پھنسی سی' بھرائی ہوئی آواز۔

"ابے یار.........." امام دین کو اس اطلاع سے خوشی نہیں ہوئی۔ "میں نے اسے کہا تھا کہ میں سویرے آؤں گا۔"

"ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ کل رات کسی نے ہارون راؤ اور دانیال گردیزی کو بم سے اڑا دیا۔ آج سارا دن وہ پریشان رہے ہیں۔ اوپر سے سخت دباؤ ہے۔ میٹنگز چل رہی ہیں۔ کل انہیں اسلام آباد جانا ہے۔ اسی لئے ابھی بلایا ہے۔" ڈرائیور پھنسی پھنسی آواز میں بتا رہا تھا۔

گلو نے سرسری انداز میں باتیں سنیں اس کا دماغ تو اپنے ہی چکر میں لگا تھا۔ وہ اس وقت ان دونوں سے بے نیاز تھا۔

"یہ کب ہوا؟" امام دین کے لہجے میں تشویش محسوس کر کے گلو ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اور تم لوگوں نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

"اجازت نہیں تھی۔" ڈرائیور نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔ "کنفرم بھی نہیں ہوا تھا

کہ وہ لوگ کوٹھی میں تھے یا نہیں۔ شام میں کنفرم ہوا ہے۔"

"اسماعیل صاحب کہاں تھے؟" اس نے بے چینی سے پوچھا۔

"گھر پر نہیں تھے کل وہ ایک پارٹی میں گئے ہوئے تھے' اس لئے جان ہی نہیں سکے۔ واپسی رات تین بجے ہوئی۔ گلی میں پولیس اور فائر بریگیڈ دیکھ کر پتہ چلا۔"

"پھر تو غضب ہو گیا ہو گا؟" امام دین کا انداز گھبرایا ہوا تھا۔

"کون.......... کیا ہوا؟" گلو اب پوری طرح امام دین اور ڈرائیور کی طرف متوجہ تھا۔

"بڑا غلط ہو گیا یار.......... ہارون راؤ اور دانیال گردیزی کو کسی نے رات بم سے اڑا دیا۔" امام دین نے ایسے جواب دیا جیسے وہ جواب نہ دے رہا ہو' سوچ رہا ہو۔

"کون تھے یہ.......... کیوں' کس نے.......... کہاں؟" گلو کے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے۔

"ابے جاننے والے تھے۔ بڑے کام کے لوگ تھے یار.......... اپنے پھنسے ہوئے سارے کام یوں ہو جاتے تھے۔" امام دین نے چٹکی بجائی۔

"اوہ تو.......... پھر تو یہ لوگ استاد فتح کے جاننے والے ہوں گے۔" وہ ایک دم چونک کر بولا۔ "اس کے پھنسے ہوئے کام بھی یوں چٹکی بجاتے ہو جاتے تھے۔"

امام دین نے یوں جھٹکے سے اپنا رخ گلو کی طرف کیا کہ وہ ایک دم پیچھے کو ہو گیا۔

"استاد فتح..........!" وہ بڑبڑایا۔ "ہاں.......... ممکن ہے۔" وہ خود کلامی کر رہا تھا۔ اس کی تیز چھوٹی چھوٹی آنکھیں گلو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں پھر اچانک وہ آگے کی طرف سرک کر بولا۔ "کرار.......... گاڑی کوٹھی کی طرف لے لو۔"

"وہیں جا رہا ہوں۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "اسماعیل صاحب نے وہیں آنے کو کہا تھا۔"

اب گلو ان دونوں کی مبہم باتوں سے بیزار ہو چکا تھا پھر اسے اتنا احساس تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کوئی مر گیا ہے جس کی موت نے امام دین کو پریشان کر دیا ہے۔ اس نے ان دونوں کی طرف سے لاتعلقی اختیار کرلی اور خود کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اب گاڑی شہر کی مصروف ترین سڑک سے گزر رہی تھی۔ رش تھا' دھواں تھا۔ اس نے اپنی طرف کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑکی کھول لی۔ ٹھنڈی ہوا کی جھونکے آئے تو ساتھ چاچا کی سرگوشیاں بھی لیتے آئے۔

"وہ بھی تو تیری ہی طرح گھر سے نکل گئی تھی گلو.......... کسی کی محبت بھی اسے واپس نہیں لا سکی تھی۔ راستے اسے نگل گئے۔ استاد فتح جیسے بدمعاش، شکورے جیسے لچے اسے ہم سے چھین کر لے گئے۔"

"کون.......... کون تھی وہ؟" گلو کے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اس نے چاچا سے پوچھا کیوں نہیں۔ پہلے بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے کچھ کہا تھا پھر.......... پھر ٹال گیا تھا۔ گلو کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے سوچ لیا کہ اس بار چاچا سے ملا تو ڈھنگ سے ٹک کر اس سے بات کرے گا کہ وہ کون تھی.......... چاچا کس کے بارے میں کہتا ہے۔ کس کے لئے روتا ہے اور.......... اور یہ شکورا کون تھا.......... کون ہے؟ گلو کے دماغ میں سوچوں کے لچھے سے بننے لگے۔ ساری گاڑیاں، زن سے گزرتی بسیں اور موٹر سائیکلیں کھلونا بن گئیں۔ دھواں گاڑھا ہو کر چاچا کے نحیف بدن کے خاکے میں ڈھلنے لگا۔ پھر اچانک.......... بالکل اچانک اسے وہ لنگڑی عورت یاد آ گئی۔ وہی جو چبوترے پر آ کر اس سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ گلو نے سر کو جھٹکا دیا۔ وہ ان بے ربط سوچوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ "بیڑی ہے تیرے پاس؟" اس نے امام دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ وہ اب بھی ڈرائیور سے انہی دونوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو شاید کسی بم کے دھماکے میں مر گئے تھے۔ امام دین نے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بیڑی نکال کر اسے تھما دی پھر دوسری جیب سے ماچس نکال کر دی۔ گلو نے بیڑی سلگا کر ماچس واپس کر دی اور خود کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پھر.......... وہ چونک اٹھا۔ یہ سڑک.......... یہ راستے اسے جانے پہچانے لگے۔ اسے یاد آ گیا کہ پرسوں ہی تو استاد فتح کو لئے ان راستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

"کہاں.......... کہاں جا رہے ہو؟" اس نے امام دین کا کاندھا ہلایا۔

"اسماعیل صاحب کے گھر.........." اس نے سرسری انداز میں جواب دیا اور پھر ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ "مگر یہ ہارون راؤ دانیال کے گھر گیا کیوں تھا؟ دانیال کے بیوی بچے کہاں تھے؟"

"وہ بھی.......... وہ بھی وہیں تھے۔ سب ختم ہو گئے۔ ایک لڑکی بچی ہے، پاگل ہو

گئی ہے۔ اسے اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ زخمی ہے مگر زخم گہرے نہیں ہیں۔" ڈرائیور بتا رہا تھا۔

"اوہ.......... یہ تو بہت برا ہوا۔" امام دین نے بھی بیڑی سلگائی۔ "تم دوسری طرف سے لو۔ دانیال کی کوٹھی کی طرف سے۔"

گلو نے پھر اکتا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا اور اسی لمحے ڈرائیور نے ایک چوڑی سڑک پر گاڑی موڑ دی۔ گلو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ وہی گلی تھی جہاں رات وہ استاد فتح کو لے کر آیا تھا۔ پسینہ گلو کی گردن پر رینگنے لگا۔ اس نے بیڑی کا لمبا کش لے کر باقی کا ٹکڑا کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور سیٹ کی پشت سے یوں ٹیک لگا کر سمٹ کر بیٹھ گیا جیسے کسی کی نگاہوں سے بچنا چاہتا ہو۔ گاڑی چند ہی لمحوں بعد ٹھیک اسی کوٹھی کے آگے سے گزری جہاں وہ ایک بھاری تھیلا لے کر اندر گھسا تھا اور وہ کوٹھی دیکھ کر گلو کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا جیسے کوئی سینے میں بیٹھا اس کے سانس کی ڈوری کو اندر کی طرف کھینچ رہا ہے۔ وہ کوٹھی ملبے کا ڈھیر بنی ہوئی تھی۔ صرف گیٹ سلامت تھا ورنہ عمارت کا اندرونی حصہ اینٹوں کا ڈھیر بن چکا تھا۔ گاڑی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ وہاں اب بھی پولیس کے لوگ موجود تھے۔ ان پر نگاہ پڑتے ہی گلو کھسیانے لگا۔ "امام دین.......... پولیس۔"

"او.......... چپکا بیٹھا رہ.......... خواہ مخواہ شک ڈالے گا انہیں۔" اس نے دبی دبی سرگوشی کی اور خود یوں اکڑ کر بیٹھ گیا جیسے اس گاڑی کا مالک ہو۔

گاڑی عمارت کے سامنے سے گزری تو لکڑی اور برادہ جلنے کی بو گلو کے نتھنوں میں گھس گئی۔ گاڑی کے آگے بڑھتے ہی گلو نے پلٹ کر دیکھا۔ "ہاں.......... یہ وہی ہے۔ وہی۔" وہ بے خیالی میں بڑبڑایا۔

"کیا وہی ہے؟" امام دین بھی چونک اٹھا۔ وہ بھی پلٹ کر عمارت کے ملبے کو دیکھ رہا تھا۔

"کک.......... کچھ نہیں۔" گلو گھبرا گیا۔ "یہاں کیا ہوا ہے؟"

"ابے ساری کہانی سن لی اور پوچھتا ہے کہ زلیخا عورت تھی کہ مرد۔" امام دین جھنجلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آں............ہاں............کہاں؟" وہ سٹپٹا گیا۔

"ابے سنا نہیں کہ کسی نے یہاں بم رکھ دیا تھا' پرسوں رات............ دانیال صاحب جن کی یہ کوٹھی ہے وہ اور ان کے بیوی' بچے' ایک اور دوست سب ختم ہو گئے۔"

یہ جملہ گلو کے پیٹ میں گولے سے بنانے لگا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اچھی طرح............ ایک ایک بات' ایک ایک لمحہ اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا۔ اسے راستہ نہیں آتا تھا۔ فتح اس کے برابر میں بیٹھا تھا۔ وہی راستہ بتاتا رہا اور پھر اس نے اس گیٹ سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی تھی۔ وہ بھاری تھیلا دے کر اسے سمجھایا تھا کہ وہ تھیلا پچھلی دیوار کی جڑ میں رکھ آئے۔ وہ اتر گیا تھا اور جب وہ اندر داخل ہوا تھا تو رات کی رانی کی مہک نے اسے بے خود کر دیا تھا۔ وہ تھیلا رکھ کر واپس آ گیا۔ آگے کونے پر' جھاڑیوں کے قریب فتح انتظار کر رہا تھا۔ وہ بھاگا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔ گاڑی اسٹارٹ تھی۔ استاد فتح ایکسی لیٹر پر پاؤں رکھے تیار تھا۔ اور پھر............ جب وہ واپس جاتے ہوئے مین روڈ پر پہنچے تھے تو دھماکا ہوا تھا۔ بڑی زور کا دھماکا' اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟" تو فتح نے کہا تھا۔

"شاید گیس کا سلنڈر پھٹا ہے۔"

اور............ اور اس کے چہرے پر کیسی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ عجیب سی۔ اس کی آنکھوں میں استاد فتح کا چہرہ گھوم گیا۔ ٹریفک جام ہونے کے باوجود وہ کتنا پُرسکون تھا۔ کتنا خوش............ اور تبھی گلو کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا۔ یہ آگہی اسے اندر تک دہلا گئی۔ رات کی رانی کی مہک کی جگہ اس کا دماغ' لکڑی' کپڑے اور چربی کی بو سے پھٹنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی جلی ہوئی لاشیں اچانک اٹھ کر جیسے ناچنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر چھلانگ لگا دے۔ بھاگے............ اتنا بھاگے کہ اس کا دل پھٹ جائے۔ اس کا ہاتھ غیر محسوس انداز میں دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا اور عین اسی لمحے گاڑی کا بریک چرچرایا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

یہ سفید رنگ کا بڑا سا گیٹ تھا۔ دروازے پر استاد فتح جیسی مونچھوں والا اسی کی طرح گینڈے کے بدن جیسا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس نے گاڑی کو دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ گلو جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ امام دین نے اترتے ہوئے اسے بھی اترنے کو کہا۔ وہ چپ

چاپ اتر گیا اور امام دین کے پیچھے کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا اس عالیشان کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ وہ چل رہا تھا' دیکھ رہا تھا' محسوس کر رہا تھا' مگر یہ کہ اس کے اندر بم پھٹ رہے ہیں۔ بچے ٹوٹ کر ٹکڑوں کی شکل میں فضا میں اڑ رہے ہیں۔ لوگ چیخ رہے ہیں' رو رہے ہیں۔ وہ گھبرا رک گیا۔

"امام دین............ یہاں سے............ چل............ چل امام دین............" اس نے لپک کر امام دین کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کیا ہے یار............ کام سے آیا ہوں یہاں۔" وہ جھنجھلا گیا۔

"میں............ میں پکڑا جاؤں گا امام دین تو سمجھتا کیوں نہیں............ اگر کسی نے مجھے دیکھا ہو گا تو............ تو............ میں............" اس کی آواز پھٹنے لگی۔

امام دین کی آنکھوں میں شدید حیرت در آئی۔ اس کا منہ لمحہ بھر کو کھلا کا کھلا رہ گیا پھر سفیدی اس کے چہرے پر ایک دم ہی چھا کر چھٹ گئی۔ وہ اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور گاڑی لاک کر رہا تھا۔ ان سے کافی فاصلے پر تھا۔

"گلو............ تو چپ رہ............ منہ مت کھولنا اپنا۔ بالکل چپ۔" اس نے سرگوشی کی' ایک ہاتھ کی انگلیاں اس کے بازو میں گڑ گئیں اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ہونٹوں سے جا لگی۔

"مم............ مگر............ مامے............ یہاں میرے لئے خطرہ ہے۔ تو............"

"میں کہتا ہوں چپ کر۔" اس نے اپنی ہتھیلی اس کے ہونٹوں پر دبا دی۔ "ابھی تک تو تیرے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے مگر............ تیرے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو............ تو تیری لاش بھی اسی عمارت کے ملبے میں دبا دی جائے گی۔ سمجھا تو؟" اس کے چہرے کی کھال یوں لرز رہی تھی جیسے اندر کہیں کرنٹ دوڑنے لگا ہو۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو امام دین نے اپنی ہتھیلی اس کے ہونٹوں سے ہٹا لی۔ گلو گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

"گھر جا کر بات کریں گے۔" اس بار امام دین کا لہجہ نرم تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کی بجائے عمارت کے اندرونی حصے کو دیکھ رہا تھا۔ "یہاں تو بالکل چپ رہنا۔ گزری ہوئی کوئی بات نہ کرنا۔ وہ اسماعیل' بہت حرامی ہے وہ۔" یہ کہتے ہوئے امام دین اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ پکڑ کر عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ ڈرائیور ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ امام دین نے ہونٹوں کو ایسے کھینچ لیا جیسے مسکرا رہا ہو۔

گلو کی حالت بہت پتلی تھی۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ جانو کے پاؤں دبا کر اس سے استاد فتح سے اپنی سفارش کو کہتا تھا۔ نہ وہ استاد فتح کے چکر میں پھنستا' نہ آج یوں اشتہاری ملزموں کی طرح بھاگ رہا ہوتا اور نہ............ نہ وہ عمارت............ اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ وہ لوگ اندرونی بڑے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ اندر تین آدمی بیٹھے تھے۔ گلو کو وہ تینوں استاد فتح لگے' بالکل اسی جیسے' اسی کی طرح تومند' اسی کی طرح پُرغرور اور............ اور اسی کی طرح پُراسرار۔ ان تینوں نے ہی اسے چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"یہ کون ہے؟" ایک نے اپنے منہ میں پھنسے سگار کو انگلیوں میں دابتے ہوئے پوچھا۔

"اسماعیل صاحب کا آدمی ہے جی۔ جی دار بندہ ہے۔" امام دین نے دھیرے سے کہا۔ گلو نے حیران ہو کر امام دین کی طرف دیکھا جو صاف جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ تو کسی اسماعیل کو نہیں جانتا تھا۔ اسی لمحے امام دین نے کن انکھیوں سے' پھر سر کھجانے کے بہانے اس کی طرف گردن موڑتے ہوئے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں تنبیہہ تھی' جیسے کہہ رہا ہو۔ "بالکل چپ رہ۔ گھر جا کر بات کریں گے۔"

وہ چپ ہو گیا۔ جیسے گونگا ہو پھر وہ بہرہ بھی ہو گیا۔ اب اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا بات کر رہے ہیں' اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاں' بس اسے نظر آ رہا تھا' کبھی استاد فتح کا خون میں تر چہرہ' کبھی جلی ہوئی' چاروں طرف بکھری ہوئی لاشیں' کبھی ملبے کا ڈھیر بنی خوبصورت کوٹھی اور اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا گاڑھا دھواں' دھواں جو اس کے اندر بھرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ نتھنوں میں گھس کر جلن پیدا کر رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "امام دین!!" اس کے حلق سے پھٹی پھٹی سی آواز نکلی۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

امام دین خجل سا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا کان کھجاتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں............

بس یہاں سے سیدھے اسپتال جائیں گے۔ جناح اسپتال قریب ہے۔"

پتہ نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا۔ گلو کا جی چاہا کہ وہ اس سے پوچھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے مگر ماے نے اسے بولنے کا موقع دیئے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اسے کچھ کہنے سے روک دیا اور بولا۔ "سر! اسے دمہ ہے۔ بچپن سے بیمار ہے۔"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ آدمی جی دار ہے۔ ویسے کاٹھی سے بھی جاندار لگتا ہے اور ابھی تم کہہ رہے ہو کہ اسے دمہ ہے۔" ان تینوں میں سے ایک بولا۔

امام دین شرمندگی سے مسکرایا۔ "سر! اسے دمہ تو میں کہتا ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ الرجی ہے۔ اسے دھول سے' مٹی سے' اور............ اور دھوئیں سے الرجی ہے۔ ابھی یہاں آتے ہوئے ہم دانیال صاحب کی کوٹھی کی طرف سے آئے ہیں ناں! وہاں فضا میں مٹی دھول بہت تھی' اسی لیے۔"

"ٹھیک ہے تو تم جاؤ۔ اسماعیل کا تو فون آ گیا وہ رات بہت دیر سے آئے گا بلکہ میرا خیال ہے کہ اب اسے صبح ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے سر............ ویسے خطرے والی کوئی بات............"

"نہیں............ خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے سمجھا دو' کچھ عرصے تک اسے اسکرین پر مت آنے دو۔ حالات جلد ہی قابو میں آ جائیں گے۔"

بولنے والا چبھتی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں سے گلو کو دیکھ رہا تھا۔ گلو کو لگا تھا جیسے عمارت میں دبی ہوئی دو سلاخیں بم سے لگنے والی آگ میں تپ کر اس کے اندر اتر گئی ہوں۔ وہ ایک دم پلٹ گیا۔ امام دین نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے اس عمارت سے باہر آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ اس عمارت سے باہر آئے۔ پوری گلی کو پولیس نے گھیر رکھا تھا۔ گلو کا تو دم ہی نکل گیا۔ وہ بے اختیار جھک گیا' اگر امام دین نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو شاید وہ سیٹوں کے درمیان گھس چکا ہوتا۔

"گلو!! پاگل ہو گیا ہے تو' اٹھ۔ سیدھا بیٹھ۔"

"مگر ماے............ اگر ان لوگوں نے دیکھ لیا تو............" وہ کسمسا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر امام دین نے چیل کی طرح جھپٹا مار کر اس کا کالر پکڑا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوری قوت سے اسے سیٹ پر بٹھا دیا۔

"بیٹھا رہ۔" اس نے دانت کچکچا کر جواب دیا اور اپنے ہاتھ کا دباؤ اس کے سینے پر ڈالا۔ گلو کا رنگ سفید ہو گیا۔ گاڑی دونوں طرف پولیس والوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ ان لوگوں نے گاڑی کی طرف دیکھا تک نہیں' اگر کسی کی نظر بھی گلو پر پڑ جاتی تو شاید وہ گاڑی روک کر اسے اتار لیتا۔ اندر کے خوف نے اس کے چہرے پر جیسے پوری کہانی لکھ ڈالی تھی۔ امام دین منہ ہی منہ میں اسے گالیاں دے رہا تھا۔ گاڑی جوں ہی مین روڈ پر آئی' امام دین پھٹ پڑا۔ وہ ڈرائیور کے سامنے اسے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی لئے وہ فضول سی باتوں پر چڑچڑا رہا تھا۔ سامنے آ جانے والے رکشہ والے کو اس نے بلاوجہ ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔ گلو جان رہا تھا کہ وہ یہ سب کسے کہہ رہا ہے۔ مگر کچھ کہنے اور اسے روکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے ان لوگوں کو گیراج کے آگے اتار دیا اور خود چلا گیا۔ پھر تو گلو کو لگا جیسے قیامت ہی آ گئی ہو۔ امام دین باؤلے کتے کی طرح گیراج میں گالیاں دیتا' ٹائروں' پانوں کو ٹھوکریں مارتا پھرا۔ گلو چپ چاپ پلنگ پر جا بیٹھا تھا۔ امام دین کچھ ٹھنڈا ہوا تو سارے گیراج میں سناٹا سا چھا گیا۔ کام کرنے والے لڑکے سہمے ہوئے کونوں کھدروں میں دبکے امام دین کو دیکھتے رہے۔

"کام کرو حرامزادو........... میری شکل کیا دیکھ رہے ہو۔" وہ ایک دم دھاڑا۔ اور تمام لڑکے کسی مشین ہی کی طرح گاڑیوں پر جھک گئے یا اس کے نیچے لیٹ گئے۔ امام دین وہاں پڑے گاڑی کے سائلنسر کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر چلا گیا۔ گلو جس طرح دم سادھے بیٹھا تھا' ویسے ہی بیٹھا رہ گیا۔ امام دین پتہ نہیں کہاں گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر کو تھام کر بیٹھ گیا۔ جانے کتنے لمحے' کتنے گھنٹے یونہی گزر گئے۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ استاد فتح نے جب اتنے سے کام کے پورے پانچ ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا تو اس وقت اس نے کیوں نہ سوچا کہ وہ کیسا کام ہے جس کے وہ اتنے بہت سے روپے دے رہا ہے۔ ان پانچ ہزار کے عوض اس نے ایک پورے خاندان کو تباہ کر دیا جو اسے ملے بھی نہیں۔ کانٹا یا تیر نہیں بھالا تھا جو اس کے کلیجے کے آرپار ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے آج پتہ چلا کہ چاچا استاد فتح کو لچا لفنگا کیوں کہتا تھا۔ "جانے وہ اس کے کرتوتوں سے واقف ہی ہو۔"

اس کے کان میں بھنک بھی پڑی ہوتی کہ وہ استاد فتح کے پاس کام کر رہا ہے تو وہ تو

قیامت تک یہ نہ کرنے دیتا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رات دھیرے دھیرے گزر رہی تھی جیسے اس کے پیروں میں کوئی بھاری زنجیر پڑی ہو۔ آج گلو کو وقت کے دھیرے دھیرے گزرنے کا کوئی گلہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اندر ہی اندر چپکے چپکے یہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ یہ رات کبھی نہ گزرے۔ گیراج میں ہونے والی تیز روشنی اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ اسی لمحے اسے یوں لگا جیسے بھونچال پھر آ گیا ہو۔ امام دین واپس آ گیا تھا۔

"او........... اٹھ کے بیٹھ۔" اس نے آتے ہی اسے ٹھوکا دیا۔

گلو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اسے چاچا کا جملہ یاد آ گیا۔ اس نے کہا تھا۔ "گلو بیٹا! یاد رکھ' تو اگر اپنا راز راز نہیں رکھ سکتا تو اسے راز رکھنے کی کسی اور کو تاکید کیسے کر سکتا ہے۔ اپنی کمزوری اگر تو خود نہیں چھپا سکتا تو دوسرا کیسے چھپائے گا؟" یہ بات چاچا نے اس وقت کہی تھی جب گلو نے پہلی بار چوری کر کے محلے کے ایک لڑکے دینو کو اپنا رازدار بنا لیا تھا۔ اس رازدار نے اس کا جرم چاچا کے سامنے اگل دیا تھا۔ اس کی' کی گئی پہلی چوری کا علم چاچا کو اس بات سے ہوا تھا۔ اس روز پہلی بار چاچا نے اسے بری طرح مارا تھا۔ اس کا گال سجا دیا تھا۔ دائیں کی دو انگلیاں مہینوں سیدھی نہیں ہو سکی تھیں۔ گلو بھی اس روز بہت رویا تھا۔ اسی روز اس کے دل میں پہلی بار چاچا کے خلاف نفرت بھڑکی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس کا دشمن ہے۔ واقعی چاچا ہوتا تو بھلا اس بری طرح مارتا لیکن جب اسی رات سوتے ہوئے گلو کو چاچا نے سینے سے لگا کر پیار کیا تھا تو وہ سوتا بنا رہ گیا تھا کہ اسے چاچا کا پیار کرنا بہت اچھا لگا تھا۔ چاچا نے چپکے چپکے یہ بات کہی تھی۔ اسے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ گلو اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کے تپتے ہوئے' تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کا لمس محسوس کر رہا ہے اور بدن کو یوں ڈھیلا چھوڑے لیٹا ہے جیسے سویا نہ ہو مر گیا ہو۔

"کیا حرکت کی تھی تو نے؟" امام دین نے اسے چونکا دیا۔ "اٹھ کے بیٹھ۔" وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ "ابے پولیس والوں کو دیکھ کر یوں پتہ پانی ہوتا ہے تو اتنا بڑا طرم خان بنا ہی کیوں تھا سالے؟"

گلو کو لگا جیسے اس کے بتائے بنا ہی امام دین سب کچھ جان گیا ہے۔ "مامے! مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ پتہ ہی نہیں تھا.......... وہ تو استاد فتح..........“

”اچھا.......... تو تجھے پتہ ہی نہیں تھا؟“ امام دین نے ”اچھا“ کو خوب کھینچتے ہوئے کہا۔ ”یعنی تو نے اپنے سامنے کھڑے چھ فٹ کے آدمی کا بھیجا پھاڑ دیا اور تجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ تو کیا کر رہا ہے؟“

”ہیں!!“ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے امام دین کو دیکھ رہا تھا۔ جلدی ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ استاد فتح کے قتل کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ بم والا قصہ تو اسے پتہ ہی نہیں۔ نہ ہی وہ کچھ جان سکا ہے۔ اس بات نے گلو کے اندر بہت سا اطمینان اتار دیا۔ یہ بڑا غنیمت تھا کہ اب سے پہلے گلو کو موقع نہیں ملا ورنہ شاید وہ اپنا یہ خوفناک راز اگل دیتا۔ ”نہیں یار یہ بات نہیں ہے۔“ گلو نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔ ”وہ سب اچانک ہو گیا ماے.......... میرا ارادہ تو نہیں تھا۔“

”دیکھ گلو!“ اس بار امام دین خود پر پوری طرح قابو پا کر بولا تو اس کا لہجہ نرم تھا۔ ”یہ دنیا ہے۔ یہاں اچھا برا سب کچھ ہوتا ہے۔ ایک بات سمجھ لے گلو کہ یہاں کوئی کسی سے ہمدردی نہیں رکھتا نہ کسی کے کام آنے کا شوق ہوتا ہے کسی کو۔ یہاں سب غرض کے بندے ہیں۔ میں نے اگر تجھے سہارا دیا ہے ناں.......... تو یہ بھی اپنی غرض کی وجہ سے۔ دیکھ یار‘ میں کھلا کھلا بول رہا ہوں۔ تو برا مت ماننا‘ تجھے رکھنا میرے لئے خطرے والی بات ہے اور پھر چاچا کے رکھنے کا بندوبست بھی آسان نہ تھا پھر تجھے پولیس سے بچانے کے چکر میں بھی بہت کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔ تیرا خیال ہے کہ یہ سب میں ہمدردی کر رہا ہوں؟ ہمدردی اپنی جگہ مگر صاف ستھری بات یہ ہے کہ میں.......... میں بدمعاش بننا چاہتا تھا مگر.......... خیر اپنے کرنے کے کام تو میں اب بھی کر لیتا ہوں مگر اسماعیل صاحب بعض کام میرے حوالے کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ بس وہ کام ہاتھ میں لینے کے لئے میں تجھے استعمال کر رہا ہوں۔ تیرا قد کاٹھ دیکھ کر وہ ضرور مرعوب ہو جائیں گے۔“

”میری سمجھ میں تیری بات نہیں آ رہی ماے۔“ گلو جھنجھلا گیا۔ ”کیا کام.......... کیسی غرض اور.......... یہ استعمال کرنے والی بات کیا کی تو نے؟“

”اچھا چھوڑ۔ پھر کبھی بتاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ تو بہت ڈرا ہوا ہے۔ ابھی تیری سمجھ میں کچھ آنے والا بھی نہیں ہے۔“ اب وہ مکمل طور پر نارمل ہو چکا تھا۔ اتنا تو گلو کی

سمجھ میں آ گیا تھا کہ امام دین اس دھماکے والی بات کو سمجھ نہیں سکا۔ گلو کا سینہ چوڑا کرنے کو بھی اتنا ہی کافی تھا۔

”یہ کون لوگ تھے اور تو مجھے وہاں کیوں لے گیا تھا؟“ گلو نے منہ ذرا ٹیڑھا کر کے پوچھا۔

”یہ بڑے کام کے بندے ہیں گلو! بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں ان کے۔ قتل وتل تو چھوٹی سی چیز ہے ان کے لئے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہ لوگ ایسے بندے کی قدر کرتے ہیں جو مارنے مرنے پر ہر وقت تیار رہے۔ اب تو میری بات غور سے سن!!“

اتنا کہہ کر وہ پلنگ پر پاؤں سمیٹ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ گلو نے اسے غور سے دیکھا۔ اس وقت امام دین اسے بڑا اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔

”دیکھ گلو! پیسہ دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم اور طاقتور ہے۔ پیسہ سب کو چاہئے‘ تجھے بھی اور مجھے بھی۔ تو بتا چاہئے کہ نہیں؟“

اس نے گلو کے منہ کے سامنے ہاتھ نچایا۔ گلو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس خوف نے اسے اتنا ضرور سمجھا دیا تھا کہ بغیر سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہئے۔ امام دین کچھ دیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ شاید اسے جواب کا انتظار تھا۔ گلو نگاہیں پھیر کر سامنے والے ہوٹل کی طرف دیکھنے لگا۔

”اب دیکھ اگر آج تیرے پاس پیسہ ہوتا ناں تو‘ تو چاچے کو لے کر اس شہر سے دوسرے شہر بلکہ کسی دوسرے ملک چلا جاتا۔ ایسی جگہ جہاں کوئی تجھ تک نہیں پہنچ پاتا۔ اچھا فرض کر کہ تو یہاں سے نہیں جاتا تب بھی‘ لاکھ دو لاکھ علاقے کے ایس ایچ او کے منہ پر مارتا اور وہ.......... وہ فتح کے قتل میں کسی اور کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیتا۔ فائل بند ہو جاتی۔ کیس برسوں نہ چلتا نہ راز کھلتا۔ پیسے سے تو ایسے گواہ خرید سکتا تھا جو عدالت میں سینہ ٹھونک کر کہتے کہ تو ان دنوں میں کراچی میں تھا ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ مری میں گھوم رہا تھا۔“

امام دین بتا رہا تھا۔ گلو حیرت سے آنکھیں پھاڑے‘ منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔

”مگر.......... مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے یار‘ جو کرتا ہے وہی تو بھگتتا ہے۔“

گلو کی بات سن کر امام دین نے اتنی زور کا قہقہہ لگایا کہ گلو کا دل ایک دم اچھل کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حلق میں آ گیا۔ "ابے کون سی دنیا سے آیا ہے تو............؟" وہ ہنسنے کے دوران ہی بولا۔

"تو تو بالکل کورا ہے یار! لیکن اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔ اچھا اپنے یار پر تو اعتماد کرتا ہے ناں تو............؟"

گلو نے بے سوچے سمجھے ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"بس تو اب تو سب کچھ میرے پر چھوڑ دے۔ تجھے ایسی دنیا کی سیر کراؤں گا کہ تو یاد رکھے گا۔ میری ساری باتیں بے چوں چرا کے مان لے گا۔ جب سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ لے گا تب تو میرے کہے پر عمل کرے گا ناں؟"

گلو نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بے وجہ ہی ایسا کر رہا تھا ورنہ دماغ تو مسلسل تنبیہہ کر رہا تھا۔

"بس تو پھر پیٹ بھر' لمبی تان کے سو جا۔ اب بھول جا گلو کہ کوئی پولیس والا یا فتح کا کوئی آدمی تجھے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ میں سارا انتظام کر کے آیا ہوں۔ وہ موٹے سے صاحب نہیں تھے۔ ابے وہ جو سفید فریم کا چشمہ لگائے تھے!! ان داتا ہیں وہ۔ شکل دکھا دی ہے میں نے تیری۔ بہت بڑے سرکاری افسر ہیں۔ ان کی مرضی بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ چل اب منہ دھو لے۔ میں کھانا منگاتا ہوں۔"

امام دین پتہ نہیں کیوں ایک دم خوش ہو گیا تھا۔ گلو نے اس کی باتیں حیرت سے سنیں۔ اسے یاد آ گیا کہ چاچا قرآن کی ایک آیت اسے سنایا کرتا تھا کہ اللہ قادر مطلق ہے' اس کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ پھر............ یہ امام دین کیا کہہ رہا تھا؟ کیا امام دین پاگل ہو گیا ہے یا اسے پاگل سمجھ رہا ہے؟ وہ دور جاتے ماے کو دیکھتا رہا۔ ہاں امام دین کی یہ بات اس کے دل میں اتری تھی کہ پیسہ بہت بڑی طاقت ہے۔ یہ قاتل کو بے گناہ اور بے گناہ کو قاتل بنا سکتا ہے۔ پیسہ اس کے پاس ہوتا تو وہ ٹھکانے کے لئے یوں مارا مارا نہ پھر رہا ہوتا۔ اپنے بوڑھے چاچا کو ان اجنبی لوگوں کے رحم وکرم پر نہ چھوڑتا۔ وہ چاچا کو لے کر یہ شہر چھوڑ جاتا۔ پیسہ ہو تو کہیں بھی پاؤں جمانا مشکل نہیں ہوتا۔ یہاں امام دین سولہ آنے درست تھا۔ امام دین کی یہ بات بھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی کہ اب نہ پولیس اسے آنکھ اٹھا کر دیکھے گی اور نہ فتح کے آدمی۔ وہ جانتا تھا کہ جب جانو کو پتہ چلے گا کہ اس نے فتح کا خون کر دیا ہے تو وہ باؤلے کتے کی طرح اس کی بو سونگھتا پھرے

گا۔ وہ تو فتح کا بہت وفادار تھا۔ کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا تھا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے ہر حرف کو پتھر کی لکیر سمجھتا تھا۔ اس کے لئے جان دینے کو تیار رہتا تھا وہ............ وہ بھلا اسے کیسے چھوڑے گا؟

"ابے ارسطو!!" وہ چونک اٹھا۔ امام دین اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلا رہا تھا۔

"چل اٹھ۔ کھانا آ رہا ہے۔" اور وہ اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے چلا گیا۔ پیٹ بھر کر وہ لیٹا تو دماغ میں جالے سے بن رہے تھے یوں جیسے کوئی اندر بیٹھا سگریٹ کے مرغولے بنا رہا ہو۔ دھوئیں کے لچھے سے گھوم رہے تھے۔ ہزاروں منظر پانی کی سطح پر بنتے حباب کی طرح بار بار سامنے آ کر ٹوٹ رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ اس کی زندگی میں گھوں گھوں کر کے چل پڑنے والا یہ پہیہ کیسے رکے گا؟ چاچا کب تک وہاں پڑا رہے گا؟ وہ خود کب تک امام دین کا محتاج بنا رہے گا؟ کب تک یوں اس کی روٹیاں توڑے گا؟ پولیس کا ڈر نہ ہوتا تو وہ اسی گیراج پر کام سیکھ لیتا۔ اب عزت کی روٹی کی قدر تو اسے ہو ہی گئی تھی مگر یہاں مسئلہ پھر پولیس اور فتح کے آدمی کا تھا۔ امام دین کتنا بھی کہتا۔ خوف تو اس کی پاتال میں اتر چکا تھا۔ جیسے پانی بھربھری ریت میں جذب ہو جائے۔ بھلا وہ کیسے نکلتا؟ پتہ نہیں کیسی سوچیں تھیں جو اسے بے چین کر رہی تھیں۔ اسے لگا جیسے چاروں طرف سناٹا چھاتا جا رہا ہو۔ وہ چونک اٹھا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کاریگر لڑکے جو یہیں رہتے تھے' سونے کے لئے دور دیوار کے ساتھ بنی کھولی میں جا چکے تھے اور جو گھروں سے آتے تھے وہ بھی نہیں تھے۔ گیراج میں اندھیرا تھا البتہ لڑکوں کی کھولی کے باہر لگا بلب جل رہا تھا۔ وہ جس چارپائی پر لیٹا تھا اس کے برابر پڑی بنچ پر امام دین لیٹا ہوا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اچانک اسے سر اٹھائے چاروں دیکھتے ہوئے محسوس کر کے وہ اٹھ بیٹھا۔

"گلو!!" پتہ نہیں کیا تھا اس کی آواز میں............ گلو سہم کر رہ گیا۔

"آں............ہاں............؟"

"وہاں............ گاڑی میں تو کیا کہہ رہا تھا؟"

"کیا؟" گلو کا دل اچھلا۔

"دیکھ گلو! اپن سے اڑنے کی کوشش نہیں کرنا۔" اب اس نے گلو کی طرف کروٹ لے لی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پتہ نہیں تو کیا کہہ رہا ہے؟" اس نے جھنجلانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے جملے کے ساتھ لپٹا خوف اس کی آواز کو تھرتھرا گیا۔

"دانیال کی کوٹھی کس نے اڑائی تھی؟" اس بار امام دین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں اتنی کم روشنی میں بھی یوں چمک رہی تھیں جیسے خنجر کی تیز دھار پر روشنی منعکس ہو رہی ہو۔

"مم.......... مجھے کیا پتہ.......... تو مجھے.......... مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟" وہ بے قراری سے اٹھ بیٹھا۔

"دیکھ گلو.......... یہ بال اپن نے یونہی نہیں اگا لئے اور یوں بھی اڑتی چڑیا کے پر گنتا ہوں اپن۔ صاف صاف تیری بات سننا چاہتا ہوں۔ منہ سے کچھ اور نکالے بغیر شروع ہو جا۔"

اس کا لہجہ اتنا گھمبیر' ایسا کاٹ دار تھا کہ گلو واقعی کچھ اور بولے بغیر شروع ہو گیا۔ درمیان میں ایک بار امام دین نے اسے ٹوکا کہ آہستہ بولے ورنہ سارا وقت وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کی جانب جھکا رہا۔ "میں کچھ بھی نہیں جانتا امام دین.......... مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ تھیلے میں کیا ہے اور وہ.......... کوٹھی کس کی ہے؟"

"ہاں مجھے یقین ہے۔" وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تجھے کچھ پتہ نہیں ہو گا۔ وہ ایسا ہی حرامزادہ تھا ان لوگوں سے یہ کام کرواتا تھا جو تیرے جیسے بے عقل اور کورے ہوتے ہیں۔" اس نے رک کر جیب سے بیڑی نکالی۔ ایک بیڑی سلگا کر گلو کی طرف بڑھا دی جسے اس نے یوں جھپٹ لیا جیسے پل بھر کی دیر کی تو دولت ہاتھ سے نکل جائے گی۔ دوسری بیڑی کا لمبا کش لیتے ہوئے امام دین اس کے قریب آ بیٹھا۔ "گلو! ٹھیک ہے کہ تجھے پتہ نہیں تھا کہ تھیلے میں کیا ہے اور وہ کوٹھی کس کی ہے مگر.......... اب تجھے اتنا تو پتہ چل گیا ہے ناں کہ اس تھیلے نے چار جیتے جاگتے جسموں کو چیتھڑوں میں بدل دیا۔ وہ بم تھا۔ تو نے فتح کو مار کر پانچ آدمی قتل کر دیئے۔ اب پولیس صرف فتح کے قاتل کو ہی نہیں' اس بم دھماکے کے مجرم کو بھی تلاش کر رہی ہے۔ تجھے شاید پتہ نہیں کہ دانیال گردیزی کون تھا۔ بہرحال تیرے کو اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ ایسا آدمی تھا جس کے قتل سے

حکومت ہل کر رہ گئی ہے۔ ساری انتظامیہ کھوج لگانے میں جتی ہوئی ہے۔ اب تیرے کو بچانا بہت مشکل ہو گیا ہے.........." اس نے خاموش ہو کر بیڑی کا لمبا کش لیا اور دھویں کا مرغولا ہوا میں چھوڑ دیا۔

گلو کو ایسا لگا جیسے وہ مرغولا بھی آنکھوں کے راستے اس کے دماغ میں اتر کر چکرانے لگا ہو۔

"ہاے.......... میں.......... میں کیا کروں گا؟" وہ گھگھیانے لگا تھا۔ "ٹھیک ہے.......... پکڑنے دے.......... اچھا ہے پولیس مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دے۔ میں اسی قابل ہوں.......... میں نے چاچا کی بات جو نہیں مانی تھی۔ ہوس کی تھی پیسے کی' پر.......... میں نہیں جانتا تھا کہ یہ پیسا.......... یہ تو میری نیند اور چین تک چھین لے گا۔ امام دین.......... چل.......... میں تیار ہوں.......... چل پولیس اسٹیشن چلتے ہیں۔ بس تو.......... تو اتنا کرنا کہ چاچا کا خیال رکھنا۔" گلو ایسا کہتے ہوئے باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے..........؟" امام دین ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس نے اسے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کا کپکپاتا جسم اور زور زور سے کپکپانے لگا۔

"ابے میں ہوں ناں یار.......... یہ سب بتانے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب میں تجھے یوں بے آسرا چھوڑ دوں گا۔ میں تو تیرے کو یہ صرف اس لئے بتا رہا تھا کہ اب تو عقل پکڑ لے۔ معاملے کی سنگینی کا احساس ہو جائے تیرے کو۔ اور ایک بات سن!" اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کاندھے پکڑ کر خود سے الگ کیا اور اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر بولا۔ "جب تک تیرا یار امام دین تیرے ساتھ ہے' کوئی تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اب تو سوجا۔ سب کچھ بھول کر سوجا۔ سویرے بات کریں گے۔ اور ہاں سن۔ اب ہمارے کام کا ایک ہی بندہ ہے' وہی ہمارے کام آ سکتا ہے۔ سویرے تجھے اس سے ملا دوں گا۔ وہ سب سنبھال لے گا۔"

"مم.......... مم مگر.......... امام دین.........."

"بس اب سوجا۔" امام دین اتنا کہہ کر دوسری چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔

اس رات گلو کو پہلی بار پتہ چلا کہ چاچا بار بار جو ایک جملہ کہا کرتا تھا کہ میں نے زندگی انگاروں پر لوٹ کر گزاری ہے تو اس کا اصل مطلب کیا تھا۔ رات وہ بھی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انگاروں پر لوٹتا رہا۔ مگر پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ یہ حقیقت تسلیم کرتے ہی کہ وہ چاہے کچھ بھی کہے' وہ پانچ آدمیوں کا قاتل ہے۔ اس حقیقت کو نہ وہ تبدیل کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اور۔ اس کے اندر گہرا سناٹا سا چھا گیا۔ یوں جیسے اس کے اندر باہر کی تمام آبادیاں مر گئی ہوں۔ یہ سناٹا صبح تک چھایا رہا۔ اسے رات بھر نیند بھی نہیں آئی تھی۔ سویرے امام دین اٹھا تو اسے یوں چوکس دیکھ کر چونک اٹھا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

پھر جو کچھ گلو نے کہا اسے سن کر امام دین اچھل پڑا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "ماے.......... میں تو قاتل ہوں.......... میں نے پانچ آدمی مار دیئے۔ میری سزا پھانسی سے تو کم نہیں ہوگی نا! پھر.......... پھر میں یوں مر مر کر' ڈر ڈر کر زندگی کیوں گزاروں۔ مجھے پیسہ چاہئے ماے.......... بہت سا پیسہ جو مجھے اور چاچا کو عیش سے جینے دے۔ ہم جہاں چاہیں جا سکیں۔ جو چاہیں کر سکیں ماے۔ اب کیا فرق پڑتا ہے.......... ہاں.......... بھلا کیا فرق پڑتا ہے؟"

وہ یوں بول رہا تھا جیسے اس کا دماغی توازن پوری طرح بگڑ چکا ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھنور سے پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے پر بلا کی سفاکی تھی۔ "بات سن گلو.......... کیا تو خوفزدہ ہے؟" امام دین اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"نہیں۔" وہ ایک دم اس کی طرف مڑا۔ "اب.......... اب میں خوفزدہ نہیں ہوں۔" پھر اچانک اس کے چہرے پر ہنسی پھوٹ پڑی۔ "اب بھلا خوفزدہ ہونے سے کیا ہونے والا ہے۔ دیکھ نا.......... جس بدمعاشی کی تو ساری زندگی کوشش کرتا رہا اور ناکام ہو گیا' میں بغیر کوشش کے کامیاب رہا۔ اب اصولاً تو میں بدمعاش بن گیا؟ بلکہ میں تو.......... میں تو قاتل بن گیا' قاتل.......... اور جب بن ہی گیا تو.......... تو میں.........." وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ آنکھیں انگارہ بن گئیں۔

امام دین کو یوں لگا جیسے اس کے سامنے کوئی پاگل بیٹھا ہو۔ جو کبھی ہنس رہا تھا اور کبھی آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے گلو کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اس وقت بھونچکا رہ گیا جب اس نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا۔ "گلو.......... کیا ہو گیا ہے تجھے؟" امام دین کا دل بھر آیا اس سے گلو کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا مجھے.......... مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کسی نئے آدمی کی طرح اپنے سامنے آ گیا ہوں۔" وہ پھر ہنس پڑا۔ "تو کس سے ملانے کو کہہ رہا تھا۔ چل۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"ایسی کیا جلدی ہے یار.......... ناشتہ تو کر لیں۔ ویسے بھی وہ سو رہا ہوگا۔ یہ لوگ چمگادڑوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ رات بھر جاگتے ہیں اور دن بھر سوتے ہیں' چل اٹھ' زیادہ نہ سوچا کر' یوں بھی تیرے بھیجے کو سوچنے کی عادت ہی نہیں تھی.......... اب ایک دم بوجھ ڈالے گا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔" امام دین نے اسے سنبھلنے کو کہا اور اٹھ کر ٹنکی کی طرف بڑھ گیا۔

گلو وہیں بیٹھا اسے گھورتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ کبھی کبھی.......... درمیان میں کہیں چاچا کا خوفزدہ بجھا بجھا چہرہ اس کی آنکھوں میں چمک کر پھر گہرے اندھیرے میں گم ہو جاتا تھا۔ تب اس کے اندر بے چینی سی پھیلتی' وہ لمحہ بھر کو بدن اکڑا لیتا۔ دونوں ہتھیلیوں سے چارپائی کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑ لیتا۔ پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے کا تناؤ ختم ہو جاتا۔ وہ کندھے جھکا کر ڈھیلا ہو جاتا۔ امام دین یوں تو ٹنکی کے پاس بیٹھا کلی کر رہا تھا مگر اس کی آنکھیں گلو پر جمی ہوئی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ گلو کی ایسی حالت اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس میں بلا کا اضطراب تھا۔ عجیب سی بے کلی' آنکھوں میں بے چینی پتلیوں کو ایک نقطے پر ٹکنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ "کہیں یہ پاگل تو نہیں ہو گیا.......... واقعی پاگل.......... پتھر مارنے والا.......... یا لحاف اوڑھ کر سڑکوں سے کوڑا اٹھا کر جیبوں میں بھرنے والا۔" اس خیال کے آتے ہی اس کے منہ میں بھرا پانی پچکاری کی صورت میں باہر آ گیا۔ اس نے جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مارے' بالوں پر گیلا ہاتھ پھیرا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اٹھتے ہی چھوٹے کو آواز دے ڈالی۔ اس کا ناشتہ روز ہی چھوٹا لاتا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ آج کل وہ ایک ناشتے کی بجائے دو منگا رہا ہے۔ اس نے ہوٹل ہی سے "آیا جی" کا نعرہ لگایا اور بڑی پھرتی سے ٹرے لے کر گلو کے پاس پہنچ گیا۔

گلو اب بھی گم صم بیٹھا تھا۔ اس نے ٹرے پاس ہی رکھ دی۔ امام دین بھی آستین چڑھاتا ہوا قریب آ گیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی گلو چونک گیا۔ اس نے سر گھما کر امام دین کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا۔ امام دین کو لگا جیسے اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے ہیں۔ "گلو! تو اب ٹھیک ہو جا۔ ایسے کام نہیں چلے گا' میں تجھے اس حالت میں کہیں لے کر نہیں جاؤں گا' سمجھا تو!" اس کا خوف زبان پر آ گیا۔

دوسرے ہی پل گلو مسکرانے لگا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں ماے۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ کلی کر کے ناشتا کر رہا تھا۔ ناشتے کے دوران میں خاموشی رہی۔ چھوٹا شاید ان دونوں کا موڈ سمجھ چکا تھا۔ اس بار وہ کوئی بھی تان چھیڑے بغیر چپکے سے لوٹ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد امام دین کے گیراج میں پھر چہل پہل شروع ہو گئی۔ کاریگر آ چکے تھے۔ امام دین نے انہیں کام پر لگا دیا اور خود ایک گاڑی نکال کر لے آیا۔

"چل گلو!" اس نے ونڈ اسکرین پر کپڑا مارتے ہوئے کہا۔

گلو گاڑی میں آ بیٹھا۔ امام دین نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ اسے یوں لگا جیسے گلو نے کچھ دیر پہلے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ اس کے اندر سے ایک نیا آدمی نکل آیا تھا جو گلو سے بہت مختلف تھا۔

اس کے چہرے کی وہ معصومیت جس نے پہلی بار امام دین کو متاثر کیا تھا کہیں کھو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک سفاک سی کرختگی چھائی ہوئی تھی۔ امام دین نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا مگر لگتا تھا کہ کوئی خوفناک طوفان ہے جو اندر کہیں کروٹیں لے رہا ہے۔ اس کے چہرے پر گو اس طوفان کا کہیں عکس نہ تھا مگر امام دین ایک بات اچھی طرح جانتا تھا کہ شریف آدمی جب بدمعاش بنتا ہے تو وہ بہت خطرناک ہوتا ہے اور اسی احساس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ اسماعیل وغیرہ کو صرف فتح کے قتل ہی کی داستان پتہ تھی۔ انہوں نے شاید گلو کی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا جو گردیزی کی کوٹھی میں بم دھماکے سے متعلق تھی۔ وہ سبھی لوگ پریشان تھے ورنہ تو ان کی نگاہوں سے کچھ بچ جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو آدمی کے بولے بنا ہی اس کے اندر کا کچا چٹھا جان لیا کرتے تھے۔ یہ بھی شکر ہوا کہ گلو نے جو باتیں بھی کیں وہ گاڑی میں کیں۔ ڈرائیور نے شاید دھیان نہ دیا اور اگر.......... یہ خیال امام دین کو اچانک ہی آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسماعیل کے ڈرائیور سے لے کر اس کا

خانساماں تک تربیت یافتہ جاسوس ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اگر اسے شک یا یقین ہو گیا ہوتا تو گلو یوں رات اس کے گیراج پر گزار نہیں پاتا بلکہ اب تک تو وہ اسماعیل کے خفیہ اڈے پر پہنچایا جا چکا ہوتا۔

وہ جس قدر سوچ رہا تھا' اتنا ہی اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس ساری صورت حال پر خود کو ملامت کر رہا تھا۔ اگر گلو سے اتفاقاً فتح کا قتل ہو بھی گیا تھا تو کیا ضروری تھا کہ وہ اسے بھی ان کانٹوں میں گھسیٹنے کی کوشش کرتا جن میں بارہ برس سے وہ خود گھسٹ رہا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کس طرح ان لوگوں کے چنگل میں پھنسا اور پھر کیسے خود کو کسی بھیانک جرم میں مبتلا کیے بنا صاف بچ نکلا مگر اب بھی وہ ان کا مخبر تو بن ہی چکا تھا۔ جب سے سلو کا بھائی ان لوگوں کی درندگی کا شکار ہوا تھا اسے ان سب سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا کام کرنے پر مجبور تھا۔ گلو کے بارے میں بھی وہ لوگ پہلے ہی روز جان گئے تھے کہ وہ فتح کے پاس ملازمت کے لئے بے چین تھا' پھر ملازم ہو گیا اور ایک روز اس نے جذباتی ہو کر فتح کو قتل کر دیا۔ یہ اطلاع ملتے ہی کہ گلو امام دین کا دوست ہے اور پناہ کے لئے اس کے پاس آیا ہے' اسماعیل نے اسے بلا بھیجا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ وہ اسماعیل سے کہہ کر گلو کو پولیس سے بچا سکتا ہے' گلو کے بارے میں اسے تفصیل سے بتا دیا تھا۔ غلطی اس سے وہاں ہو گئی جب اسماعیل نے اس کے عوض اسے اپنے کام کے لئے تیار کرنے کو کہا اور امام دین نے حامی بھر لی۔

"کہاں جا رہا ہے تو؟" اچانک گلو نے اسے چونکا دیا۔ "یہاں کون رہتا ہے؟"

"کچھ دیر صبر گلو.......... یہاں کوئی نہیں رہتا۔ میں تجھ سے کچھ اہم باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یہ باتیں کسی ایسی ہی جگہ ہو سکتی ہیں جہاں کسی کے سن لینے کا ڈر نہ ہو۔" امام دین کی بات سن کر گلو نے اسے غور سے دیکھا مگر بولا نہیں۔

ان کی گاڑی کلفٹن جانے والی شاہراہ پر مڑی تو گلو نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے اندر پھر سے دھماکے ہونے لگے۔ یہی سڑک آگے جا کر گردیزی کی کوٹھی کی طرف مڑتی تھی۔ امام دین نے اس کی بے چینی کو محسوس کر لیا۔ "ہم ساحل سمندر پر جا رہے ہیں۔" اس نے گلو کی بے چینی ختم کرنے کو کہا اور وہ واقعی پُرسکون ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ سمندر کے کنارے بنی منڈیر پر بیٹھے تھے۔ امام دین نے بیڑی کا پیکٹ نکال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراس کی طرف بڑھا دیا۔ "اب اچھی طرح سوچ کر مجھے بتا کہ تو کیا چاہتا ہے؟" امام دین نے بیڑی کا کش لے کر گلو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے دھوپ کی تپش کو نگل لیا تھا۔ گلو طبیعت میں بڑی فرحت محسوس کر رہا تھا۔

"میں تجھے بتا چکا ہوں۔ میں جو کچھ کر چکا ہوں اس سے بڑا جرم کیا ہو گا۔ اب تو مجھے اس آدمی سے ملا دے جس کے بارے میں تو نے کہا تھا کہ وہ............"

"نہیں گلو! پہلے میرا یہی ارادہ تھا مگر اب............"

"اب کیا ہو گیا؟"

"تجھ میں ان سب باتوں کا دم نہیں ہے یار' مجرم بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

"کیا کہہ رہا ہے تو!............ میں مجرم بن چکا ہوں اور تو کہتا ہے کہ............"

"یوں اتفاقاً مجرم بن جانا صلاحیت نہیں' بے وقوفی کہلاتا ہے۔ دیکھ' میری بات تو اس طرح سمجھ کہ یہ سب تیرے بس کا کام نہیں ہے۔ تو ابھی تک چاچے کو یاد کر کے روتا ہے۔ اسے پریشانی میں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ کوئی اسے گالی دے دے تو غصے میں اندھا ہو جاتا ہے۔ قتل کر دیتا ہے۔ یہ سب نہیں ہوتا یار۔ اس طرح کا آدمی پلاننگ سے باقاعدہ مجرم نہیں بن سکتا بلکہ وہ تو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ تو سب کو پکڑوا سکتا ہے۔ ذرا سی مار پڑنے پر سب کچھ اگل سکتا ہے۔ دیکھ گلو تو ایسا کر' کوئی اور کام کر لے' تو............ تو چاچا کو لے کر کہیں بھاگ جا۔ ان لوگوں سے دور۔ تو نہیں جانتا گلو کہ یہ لوگ کس طرح کے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ تجھے وہاں لے گیا۔ میں نے ہمیشہ جلد بازی میں مار کھائی ہے۔ یہاں بھی کھا گیا۔ میں تجھے پیسہ دے دیتا ہوں تو چاچا کو لے کر پنجاب چلا جا۔"

"اس سے کیا ہو گا؟ اور تو............ تو مجھے کتنا پیسہ دے دے گا۔ میں کب تک بھاگوں گا اس طرح۔ نہیں ماے' میں نے رات بھر سوچا ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا ہے' اسے ہر حال میں کرنا ہے' چاہے کچھ بھی ہو جائے اور پھر مجھے............ مجھے کسی کو تلاش کرنا ہے ماے............ ان لوگوں میں رہ کر ہی میں اسے تلاش کر سکتا ہوں۔" گلو کو وہ لنگڑی مگر خوبصورت عورت یاد آ گئی تھی۔

"کسے............ کسے تلاش کرنا ہے؟"

"کرنا ہے کسی کو۔" گلو نے دوسری طرف منہ پھیر کر سمندر کی مچلتی ہوئی لہروں کو دیکھا۔

"یہ سب تیرے لئے ٹھیک نہیں ہے گلو۔ میں ابھی سے کہے دیتا ہوں' آگے تیری مرضی۔ ان کے کام بہت خطرناک ہیں۔ تجھے اندازہ نہیں ہے تو سن............ وہ لوگ بھرے بازاروں میں بم دھماکے کرواتے ہیں۔ لوگوں کو قتل کرواتے ہیں۔ بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔ بڑی اونچی بساط ہے ان کی' اور بڑی خطرناک چالیں ہیں۔ یہ سب کچھ وہ تجھ جیسے اور مجھ جیسے مجبوریوں کے ماروں سے ہی کرواتے ہیں۔ انہیں پیسہ دے کر ان کا سکون چھین لیتے ہیں۔ میں بدمعاش بننے کے چکر میں ان کے چنگل میں پھنس گیا تھا مگر مجھے وقت سے پہلے عقل آ گئی۔ کچھ پیسہ ہاتھ میں آتے ہی میں نے گیراج کھول لیا اور خود کو ان کے سامنے اتنا بودا ظاہر کیا کہ انہوں نے مجھ سے کام لینے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ اب میں صرف ان کا مخبر ہوں۔ جان کو ہتھیلی پر لئے پھرتا ہوں لیکن فکر اس لئے نہیں ہے کہ میرے پیچھے کوئی رونے والا نہیں ہے۔ کبھی مارا بھی گیا تو کسی کو دکھ نہ ہو گا مگر تو............ تیرا چاچا............"

"ماے تو............ تو یہ سب سچ کہہ رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو' تو انہیں پکڑوا کیوں نہیں دیتا۔ پولیس کو بتا کیوں نہیں دیتا۔" گلو جی جان سے لرز گیا۔

"ابھی کچھ دن زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لئے ایسا نہیں کرتا۔ بڑے بڑے لوگ ان کے ساتھی ہیں۔ میرے اطلاع دینے پر ضروری نہیں کہ ایکشن بھی لے لیا جائے بلکہ ہو سکتا ہے کہ الٹا مجھے ہی مروا دیا جائے۔ تو یہ سارے چکر دل سے نکال دے۔ جو غلطی مجھ سے ہو چکی ہے میں اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسے درست کرنا چاہتا ہوں' تو کیوں اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے گلو اگر تجھے بتا دوں تو تیرا کلیجہ پھٹ جائے۔ میں نے جب ان لوگوں کے چکر سے نکلنے کی کوشش کی تو انہوں نے میرے ساتھ کیا کیا' یہ میں تجھے بتا نہیں سکتا۔ دیکھ گلو! وقت نہیں ہے۔ تو چلا جا۔ میں پھر کبھی تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔" ماے نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ملتجیانہ انداز میں کہا۔

گلو حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے امام دین کو کبھی بھی گھگھیاتے نہیں دیکھا تھا بلکہ ہمیشہ اکڑتے ہی دیکھا تھا۔ آج وہ جس انداز میں باتیں کر رہا تھا وہ گلو کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لئے بالکل نیا اور انوکھا تھا۔

"چل گلو! اب اور کوئی بات نہ کرنا۔" امام دین کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں خاموشی سے گاڑی میں آ بیٹھے۔ سورج کی تپش میں کچھ ہلکی سی نرمی آ چکی تھی۔ یہ گاڑی بننے کے لئے آئی ہوئی گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ اس کا مالک کسی بھی وقت گیراج میں آ سکتا تھا اس لئے امام دین نے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے چلاتا ہوا گیراج پہنچ گیا۔

راستے بھر گلو صرف یہی سوچتا رہا کہ امام دین اچانک بدل کیسے گیا۔ خود اسی نے تو اسے تیار کیا تھا کہ وہ پیسہ کمائے، عیش کرے۔ پیسے کے بنا چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترستے رہنا بھی تو زندگی نہیں ہے۔ اب جب کہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا تو وہ عجب الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا۔

"چل اتر۔" گیراج پر پہنچتے ہی امام دین نے کہا۔ گلو نیچے اتر آیا۔ وہ اس حصے کی طرف آ گیا جہاں چھپر کے نیچے پڑی چارپائی اس کی منتظر تھی، وہ چارپائی جیسے اس کی زندگی کا محور بن کر رہ گئی تھی۔ چار دن سے وہ دن رات اس چارپائی پر بیٹھے اور لیٹے گزار رہا تھا۔ آج اتنے دنوں میں پہلی بار امام دین اسے سورج کی روشنی میں کہیں لے گیا تھا۔ پتہ نہیں اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ یوں نکلنے سے پولیس یا فتح کا کوئی آدمی اسے دیکھ سکتا ہے۔ شاید امام دین کو خیال نہیں رہا تھا ورنہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے اسے لے کر کہیں نہ جاتا۔

امام دین گیراج کے ملازم سے بات کر رہا تھا۔ گلو کچھ دیر تو گزری باتوں پر غور کرتا رہا۔ اپنے حوصلے کو آزماتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا وہ بھرے بازار میں بم رکھ سکتا ہے؟ کسی ماں کے کلیجے کو چھین کر لا سکتا ہے۔ کسی کو سوچی سمجھی اسکیم کے تحت قتل کر سکتا ہے؟ کیا امام دین سچ کہہ رہا ہے کہ اس میں حوصلہ نہیں ہے۔ یہ بات تو اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں سے ایک راستہ دلدل کو جاتا ہے اور دوسرا راستہ خوف کی طرف.......... یہ راستہ وہ ہے جہاں سے وہ بھاگ سکتا ہے پھر اسے بھاگتے ہی رہنا ہوگا، موت سے پہلے موت کا خوف اسے کہیں بھی ٹھہرنے نہیں دے گا۔ یہاں نہ اس کی حیثیت بدلے گی، نہ اس کی شخصیت۔ اسے اسی حالت میں بھاگنا ہوگا۔ ایک بوڑھے کا لاغر جسم کاندھوں پر اٹھائے بھاگتے رہنا ہوگا اور دوسری طرف۔ دوسری

طرف، وہ خوف سے تو نجات پا لے گا، پیسہ بھی حاصل ہو جائے گا مگر جرائم کی ایک دلدل ہو گی جو اسے دھیرے دھیرے اپنے اندر کھینچے چلی جائے گی۔ جس وقت اس نے فتح کی شخصیت سے متاثر ہو کر اس جیسا بننا چاہا تھا تو اسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ ایسا آدمی ہے۔ وہ قتل کرواتا ہے، بم دھماکے کرواتا ہے مگر آج ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اب اسے فیصلہ کرنا تھا کہ اسے گلو ہی رہنا ہے یا مسٹر گلزار بننا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ آج اور ابھی فیصلہ کرنا تھا۔ امام دین کے قریب آنے سے پہلے۔ اس کے پوچھنے سے پیشتر اسے طے کر لینا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اچانک اسے وہ لڑکی یاد آ گئی جسے اس نے پہلی بار فتح کی کوٹھی میں اور دوسری بار یہاں گیراج پر آنے والے اس آدمی کے ساتھ گاڑی میں دیکھا تھا۔ اس کی پہچان کا عکس اب بھی اس کے دل میں لرز رہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور پھر وہ لنگڑی خوبصورت عورت............ جس کا تصور ہی اس کے دل میں کانٹا سا توڑ دیتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون تھی؟ اسے یاد کرنے کے باوجود بچپن میں دیکھی ہوئی لنگڑی عورت کے خدوخال یاد نہیں آ سکے تھے اور پھر چاچا کی پُراسرار باتیں۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی ماں خوبصورت اور لنگڑی تھی۔ تو کیا وہ میری ماں تھی؟ اس خیال نے گلو کے اندر بھٹی سی سلگا دی۔

"اگر وہ میری ماں ہی تھی تو........... تو............ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جھونپڑی میں فٹ پاتھ پر بچے کو جنم دینے والی عورت اپنے بچے کو چبوترے پر چھوڑ کر کسی محل نما حویلی میں جا بسے۔" گلو نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ اسے اپنی ماں کو کراچی کی کچی بستیوں میں تلاش کرنا ہوگا۔ فٹ پاتھوں پر سڑکوں پر یا........... یا پھر ہیرا منڈی میں، نیپیئر روڈ کے بازار حسن میں۔ "بھلا کسی محل میں بسنے والی، ہوائی جہاز میں سفر کرنے والی کوئی خوبصورت اور لنگڑی عورت میری ماں کیسے ہو سکتی ہے۔" اس نے خود ہی تردید کر دی۔ اب اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ اب اسے ان لوگوں میں کسی کی تلاش نہیں تھی۔

"ہاں، بھوکا ہے؟" امام دین کے قریب آنے کا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔

"نہیں یار، چائے منگا لے اور بیڑی پلا..........." گلو نے بیزاری سے کہا پھر اس سے بیڑی لے کر سلگائی اور دھواں خارج کرتے ہوئے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"امام دین تو مجھے مشورہ دے........... مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ تیرا بھاگ جانا اچھا ہے۔ گلو کیا تو سوچ سکتا ہے کہ میں تجھے غلط مشورہ دوں گا؟"

"نہیں مگر..........."

"کچھ اگر مگر نہیں۔ تجھے نہیں پتہ یار کہ یہ کون لوگ ہیں اور یہ سب کچھ کیوں کرتے ہیں۔ یہ سالے' دشمن ملک کے ایجنٹ ہیں۔ اس ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ یار میں کتنا ہی کمینہ سہی' مگر اپنی اس مٹی سے پیار کرتا ہوں۔ کیا تجھے تیرا الگ وطن ہونے پر فخر نہیں ہے؟" وہ گلو کے بار بار پوچھنے اور بے وجہ معاملے کو طول دینے پر جھنجلا ہی گیا تھا۔

"مگر........... یہ لوگ تو ہمارے ہی بندے ہیں۔" گلو کو ماے کی بات پر یقین نہیں آیا۔ "یہ ملک ان کا بھی تو ہے۔ پھر یہ لوگ ایسا کیوں کریں گے؟"

"ان کا کوئی ملک نہیں' کوئی دین ایمان نہیں ہے یار' میں تو چھوٹا موٹا بدمعاش بننا چاہتا تھا۔ سلو کا بھائی بہت حرامی آدمی تھا۔ وہ ان لوگوں کا ساتھی تھا۔ اسی نے مجھے ان لوگوں سے ملایا تھا اور پیسے ہی کا لالچ دے کر ملایا تھا۔ میری عقل پر بھی اس وقت پتھر پڑے تھے۔ میں سمجھا تھا کہ بس پیسہ ہی سب کچھ ہے' ملک کسی کا بھی ہو۔ اس میں کچھ بھی ہو رہا ہو بس میرا جہنم بھرنا چاہیے۔ میں بے دھڑک ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے تربیت کے لئے ایسی جگہ بھیج دیا جہاں چاروں طرف جنگل تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں گھری اس جگہ پر تقریباً تین سو آدمی تھے۔ سب کو جدید قسم کی فوجی تربیت کے علاوہ مختلف قسم کی تربیت دی جا رہی تھی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ فوجی تربیت ہے' اچھی چیز ہے۔ یہ سب سیکھ کر میں بہترین فوجی بن جاؤں گا اور کہیں اگر ہمارے دشمن ملک نے ہم پر حملہ کیا تو میں بھی سرحد پر ان سے لڑ سکوں گا۔ مگر پھر مجھے پتہ چل گیا کہ یہ تربیت دراصل ایک دہشت گرد تنظیم کے سرکردہ لوگوں کے دماغ کی کارستانی ہے۔ اس کا مقصد ملک کے دفاع میں لڑنا نہیں بلکہ ملک کے خلاف لڑنا ہے' اپنے ہی ملک کے خلاف' اسی تربیت میں مجھے ایک لڑکا سلطان مل گیا جسے ان لوگوں نے زبردستی اس تنظیم میں شامل کیا تھا' اسی کے ذریعے مجھے سب کچھ پتہ چلا۔ اسی نے مشورہ دیا کہ ان

لوگوں سے بچنے اور بھیانک جرائم سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ تربیت میں فیل ہو جاؤ۔ جب تم سے کوئی راز اگلوانے والی ریہرسل کریں گے تو تھوڑی سی مار کھا کر تم سب کچھ بتا دینا۔ وہ تمہیں فیل کر دیں گے اور کسی ایسے کام لگا دیں جو زیادہ سنگین نوعیت کا نہیں ہوگا۔ سلطان نے بتایا تھا کہ پہلے وہ کچھ اہم باتیں تمہیں بتائیں گے' پھر کچھ دوسرے لوگ تمہیں لے جا کر تشدد کریں گے' اس تشدد کو برداشت کر لینے والا سخت جان آدمی ان کے لئے بہت اہم ہوتا ہے۔ سنگین قسم کے جرائم میں وہ اس سے کام لیتے ہیں۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پہلے مجھے ایک سنسان علاقے میں بم کا دھماکہ کرنے اور بم رکھ کر آنے کو دیا گیا پھر کچھ لوگ مجھے رات کے اندھیرے میں آ کر اپنے تربیتی کیمپ سے کہیں اور لے گئے۔ وہاں مجھ پر تشدد کرنے کے لئے ایسی ایسی چیزیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں دیکھتے ہی میرے بدن سے پسینہ بہہ نکلا۔ دو چار ہاتھ کھا کر ہی میں نے سب کچھ اگل دیا۔ اگلے ہی روز صبح ہمیں وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ میں وہ تشدد برداشت کر سکتا تھا مگر میں اور سلطان تو پروگرام بنا چکے تھے۔ ہماری جان بچ گئی۔ سلطان تو موقع دیکھ کر ملک سے باہر نکل گیا۔ میں نے یہاں گیراج تو کھول ہی لیا تھا۔ باہر بھی اپنا کون ہے جہاں جائیں۔ میں نے سوچ لیا کہ اب جینا مرنا یہیں ہوگا۔ اب وہ لوگ مجھ سے ہلکے پھلکے کام لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے انہوں نے سلو کے بھائی کو گولی مار دی۔ وہ حرامی بہت لالچی اور کمینہ تھا۔" امام دین سانس لینے کو رکا تو گلو بول اٹھا۔

"یہ سلو کون ہے؟"

لمحے کے ہزارویں حصے میں ماے کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی یوں جیسے پتلیوں کے پیچھے سے کوئی خواب جھانکا ہو۔ کوئی حسین سا خواب۔

"ملواؤں گا تجھے۔ بہت اچھی ہے۔ اگر اس کا بھائی حرامی پن نہ کرتا تو میں کب کا اس سے شادی کر لیتا مگر صرف اس کی وجہ سے میں نے شادی نہیں کی۔ اب وہ مر گیا ہے نا تو معاملہ آسان ہو گیا ہے۔"

"کیوں........... اس نے کیا حرامی پن کیا تھا؟"

"لالچی تھا سالا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ سلو اور میں ایک دوسرے کو چاہتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ اس کی شادی تو اسے کہیں نہ کہیں کرنی ہی تھی۔ میری دلچسپی دیکھی تو اس نے نیا طریقہ اختیار کر لیا۔ اسے جو کام ملا کرتے تھے' وہ مجھے سونپ دیا کرتا تھا اور پیسہ خود لے لیا کرتا تھا' وہاں بھی اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی کہ کام جلدی اور پکا کرتا ہے حالانکہ وہ سب میں کیا کرتا تھا اور صرف سلو کی وجہ سے کرتا تھا کہ وہ جلدی سے کام کی رپورٹ لے کر چلا جائے اس طرح ہمیں باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ پہلے تو میں نہیں سمجھا کہ یہ وہ میرے ساتھ چالاکی کر رہا ہے مگر رفتہ رفتہ اس بھینسے نے بیٹھ کر پیسہ کھانے کی عادت ڈال لی۔ وہ مجھے اپنے ملازم کی طرح جھڑک دیتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے دوڑاتا تھا۔ بات میری سمجھ میں آئی تو میں نے اسماعیل صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔ ان کے کام میں رازداری پہلی شرط ہوتی ہے جبکہ سلو کا بھائی مجھے کام بتا کر اور میرے ہاتھوں انجام دلا کر شرائط کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ بس میں نے یہ اطلاع دے دی' اس دن میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لوگ اسے مار دیں گے' اتنا خیال تھا کہ اس پر سختی کریں گے۔ اسے اپنا کام خود کرنے پر مجبور کریں گے یا پھر ان کاموں کا معاوضہ مجھے دیا کریں گے۔ مگر دوسرے ہی دن جب سلو انہیں رپورٹ دینے جانے کے لئے گھر سے نکلا' چلتی گاڑی سے چلائی جانے والی گولیوں نے اسے بھون کر رکھ دیا۔ اس کی ادھڑی ہوئی لاش دیکھ کر میں مزید خوف زدہ ہو گیا۔" وہ پھر چپ ہو گیا۔

"پھر.........؟" گلو ایسے سن رہا تھا جیسے الف لیلیٰ کی داستان سن رہا ہو۔

"پھر کیا۔ میرا پتا صاف ہو گیا۔ اب سلو کے باپ کو شیشے میں اتارنے کی دیر ہے۔ یہ سب بتانے کا مقصد صرف یہ ہے گلو کہ تو ان کے چکر میں نہ پڑے۔"

"پھر تو مجھے ان کے پاس کیوں لے گیا تھا؟" گلو نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"بس یار غلطی ہو گئی۔ معاف کر دے۔ میری کمینگی تھی۔ کتا پن تھا' میں نے سوچا تھا کہ اس طرح انہیں اگر میری وجہ سے ایک کام کا آدمی مل گیا تو وہ مجھ سے خوش ہو کر میرا بھی بھلا کر دیں گے۔ انہوں نے تیرے لئے اخراجات کے مجھے بیس ہزار روپے بھی دیئے تھے۔ مزید بھی دیتے۔ چچا کے لئے بھی انہوں نے پیسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ سب کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں تجھے ان کے کام کرنے پر تیار کروں۔"

گلو کو امام دین کی صاف گوئی پر پیار آ گیا۔ "لیکن تو نے تو انہیں بتا دیا کہ فتح کو میں

نے قتل کیا ہے۔ میں بھاگا تو یہ لوگ بھی میرا پیچھا کریں گے' اب مجھے تین طرف سے بھاگنا ہو گا۔ ادھر پولیس سے' ادھر فتح کے آدمی اور اب یہ نئی مصیبت۔"

"نہیں۔ اس کی ترکیب ہے میرے پاس۔ میں تجھے پیسہ دیتا ہوں تو چاچا کو لے کر آج ہی رات نکل جا۔ تجھے حیدر آباد جانا ہو گا۔ وہاں سلطان کا بڑا بھائی رہتا ہے۔ وہ میرا احسان مند ہے کیونکہ میں نے سلطان کو یہاں سے بھگانے میں بڑی مدد دی تھی۔ تجھے اس کے اس جانا ہو گا۔ وہ تیرا اور چاچا کے رہنے کا بندوبست کر دے گا۔ کچھ دن وہاں گزار لے پھر حالات جو رخ اختیار کریں گے' وہی ہمیں بھی کرنا ہو گا۔ بول تو تیار ہے؟"

"اور وہ پولیس.........؟"

"وہ تو کام ہی پکا ہو گیا یار' اول تو اس کی ایف آئی آر ہی نہیں کٹی۔"

"کیوں؟" وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ "جانو تو......... مجھے کبھی بھی نہیں چھوڑے گا۔"

"ابے اس علاقے میں ایک ہفتے کے اندر کسی بھی قتل کی واردات کا ذکر نہیں ہے۔ میں خود اسماعیل کے ساتھ گیا تھا۔ اسماعیل نے کہا تھا کہ تم اس پر یہی ظاہر کرو کہ فتح کے قتل کی ایف آئی آر کٹ چکی ہے۔ پولیس اسے تلاش کر رہی ہے۔ پولیس کا خوف ہی تجھے ان کے چنگل میں پھانسنے کو کافی تھا۔"

"لیکن فتح کے آدمیوں نے اس وقت پولیس بلالی تھی یار........."

"لیکن میں جو کہہ رہا ہوں کہ تھانے میں نہ اس کے قتل کا پرچہ کٹا ہے اور نہ ہی انہیں لاش ملی ہے۔ ممکن ہے جانو نے چپ چاپ اسے دفنا دیا ہو' فتح اگر پکڑا جاتا یا مردہ حالت میں بھی مل جاتا تو اب تک ہنگامہ مچ چکا ہوتا۔ تو یہ ساری باتیں نہیں سمجھے گا۔ یہی تو بات ہوتی ہے نا ان حرامزادوں میں۔ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کیا کر رہے ہیں۔ بہر حال' اب تک سارے حالات تیرے حق میں ہیں۔ تو چاہے تو ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے گلو' اب آگے تیری مرضی' بس تجھے جو فیصلہ کرنا ہے جلدی کر لے۔ اسماعیل وغیرہ کو اگر بھنک بھی پڑ گئی کہ بم کا دھماکا تو نے کیا تھا تو......... تو وہ تجھے چھوڑے گا نہیں۔ تیری اسی حرکت نے مجھے اس انداز سے سوچنے پر مجبور کیا ہے ورنہ اپن بھی غرض کا بندہ ہے۔ دوستی یاری ایک حد تک نبھاتا ہوں۔"

"پھر......... کیا کروں؟" گلو کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے یہ بھی یقین نہیں آیا تھا کہ جانو اسے چھوڑ دے گا۔ پولیس میں رپورٹ نہ کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے خود اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا۔ وہ بڑا پُراسرار سا آدمی تھا۔ عجیب سا۔ اب پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا کہ وہ کرے گا کیا۔

"یہ پانا اٹھا اور میرے سر پر مار دے۔ میں کہتا ہوں کہ آج رات فیصلہ کر لے............"

"ٹھیک ہے ماے۔ لیکن تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔" بہت سوچ بچار کے بعد گلو نے امام دین کو اپنی ماں کے بارے میں بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"بول!"

تب گلو نے اسے شروع سے ساری داستان سنا دی۔ امام دین حیرت سے منہ پھاڑے سب کچھ سنتا رہا۔ گلو سب کچھ بتا کر چپ ہوا تو اس نے سر جھٹکا۔ پلکیں جھپکاتا رہا' پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "تو............ تیرا خیال ہے کہ فتح کے ساتھ نظر آنے والی وہ لنگڑی عورت تیری ماں ہے؟" انداز تمسخرانہ تھا۔

"میں یہ تو نہیں کہہ سکتا پر............ امام دین اسے دیکھ کر اور وہاں رہنے والی اس لڑکی کو دیکھ کر جو یہاں بھی آئی تھی' میرے دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں............ پتہ نہیں میں نے ایسا کیوں محسوس کیا تھا............ بس میں تجھے بتا نہیں سکتا۔ تو اس سے پوچھ تو سکتا ہے ناں؟"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ اب تو اپنا پروگرام بتا۔" اس نے اسے ٹالنے والے انداز میں ہاتھ ہلا کر کہا۔

"میرے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ماے............ ہاں البتہ نازاں کی ماں کا گاؤں میں گھربار ہے۔ اگر تو خالہ کو لے آئے............ وہ خالہ یار جس نے چاچا کو سنبھالا تھا اور تو کہہ رہا تھا کہ اسے روٹی بھی اسی نے کھلائی تھی۔ میرے محلے ہی میں رہتی ہے۔"

"سمجھ گیا۔ میں آج ہی جاتا ہوں۔ تو روٹی کھا کر آرام کر لے۔ میں شام تک ان لوگوں کو تیار کر لوں گا۔"

گویا فیصلہ ہو گیا تھا۔ گلو دلدل میں دھنسنے کو تیار نہ تھا۔ امام دین نے دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس کے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے کھانا کھایا۔ گلو آرام کرنے

کے لئے لیٹ گیا حالانکہ اسے آرام نہیں آ رہا تھا۔ اس کے اندر عجیب سی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ کوئی اندر بیٹھا چٹکیاں لے رہا تھا۔ بار بار اکسا رہا تھا۔ بار بار جتا رہا تھا کہ وہ ہار چکا ہے۔ فتح بننے کا خواب بکھر چکا ہے اور اس خواب کا بکھر جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ خواب اس نے کچی عمر سے ہی دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نڈھال ہو گیا۔ اگر چاچا کا دم اس کا دم چھلا نہ بنا ہوتا تو وہ کسی بات کی پرواہ نہ کرتا مگر اس بوڑھے ہڈیوں کے پنجر نے اسے جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں اس نے گلو کو اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا تھا۔ پتہ نہیں یہ قرض اس نے اس پر کیوں سوار کر دیا تھا۔

گلو نے ایک بات کا تو فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ چین سے کسی بھی جگہ ٹکتے ہی وہ چاچا سے صاف صاف بات کرے گا بلکہ اسے اپنے ٹھکانے پر بٹھا کر نکل جائے گا۔ اس کی طرف سے کچھ اطمینان ہو تو وہ کسی کام کے قابل بھی ہو ورنہ یوں ساری زندگی منہ چھپا کر جینے سے کیا فائدہ۔ امام دین اسے کہہ کر جا چکا تھا کہ وہ اندر کی کوٹھڑی میں رہے بلکہ اس نے چھوٹے کو کہہ کر چائے بھی بھجوا دی تھی اور تالا چھوٹے کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ ماے کا خیال تھا کہ چھوٹا قابل اعتماد ہے۔ اس کی سمجھ میں بات بھی جلدی آ جاتی تھی۔ امام دین کے جاسوس کا کام بھی وہی انجام دیا کرتا تھا۔ ماے کے پیچھے گیراج میں کیا ہو رہا تھا۔ کس نے کام جی لگا کر کیا' کتنی گاڑیاں آئیں اور ٹھیک ہو کر لوٹائی گئیں' کس گاڑی پر کس نے کام کیا' گاہک سے کتنے پیسے لیے' ان ساری باتوں پر وہی نظر رکھا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے چھوٹے کو بلا کر سمجھا دیا تھا کہ گلو یہاں نہیں ہے' کوئی بھی اسے پوچھے' خواہ وہ گیراج کا ملازم کیوں نہ ہو' اسے یہی بتانا ہے کہ گلو استاد کے ساتھ ہی گیا ہے۔ اس نے ساری بات سن کر سر ہلا دیا تھا۔ پھر گلو کو چائے دے کر باہر سے تالا ڈال دیا تھا۔ چابی بھی اسی کے پاس تھی۔ خدا نہ کرے امام دین کو کچھ ہو جائے یا وہ واپس نہ آئے تو اسے دروازہ کھولنے میں دشواری نہ ہو۔ گلو کو تو یقین نہیں تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آئے گا مگر وہ کچھ بولا نہیں تھا کہ شاید امام دین کو کوئی خطرہ ہے۔ یوں بھی اسے کرنا ہی کیا تھا۔ بند کمرے میں پڑا رہتا تو سکون سے کچھ سوچ سکتا تھا یا پھر سو سکتا تھا۔

امام دین چلا گیا۔ گلو کمرے میں بند ہو گیا۔ کچھ دیر الٹی سیدھی باتیں سوچنے کے بعد وہ سو گیا۔ چھوٹے سے کمرے میں اونچائی پر ایک روشن دان کے سوا کوئی کھڑکی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ پتہ نہیں کوٹھڑی کس مقصد کے لئے بنائی گئی تھی ورنہ امام دین کا کمرا تو اچھا خاصا کشادہ اور ہوا دار تھا۔ اس وقت شام ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ امام دین خالہ کو دیکھنے گیا تھا۔ دیر ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اسے جلدی آجانا چاہیے تھا۔ یہی سوچ کر گلو سویا نہیں۔ انتظار کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا احساس گلو کو ان حالات میں پڑ کر ہی ہوا تھا۔ کئی بار خیال آچکا تھا کہ چاچا چارپائی پر چت پڑا اس کا انتظار کرتے کرتے کتنا تھک جاتا ہوگا جبھی تو اسے دیکھتے ہی پھٹ پڑتا تھا۔ اکیلے گھر میں کسی کا انتظار کتنی شدت اختیار کر جاتا ہے' اسے اس وقت محسوس ہو رہا تھا۔ روشن دان سے نظر آنے والی روشنی اب سرمئی ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے کے فرش پر اندھیرا رینگنے لگا' بس چھت پر کچھ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس دوران میں چھوٹا بھی نہیں آیا تھا۔ گلو کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے آوازیں سننے کی کوشش میں کان بھی کھڑے کر لئے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے سوا کوئی زندہ ہی نہ بچا ہو۔ کوئی آواز' کوئی آہٹ' کسی کی چاپ' کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ یک بیک گلو کو جیل کی اندھیری کوٹھڑی کا خیال آگیا اور وہ سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔ یہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ پکا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بار بار دروازے پر جاتا' کسی سوراخ' کسی روزن کی تلاش میں سارا دروازہ انچ انچ دیکھ ڈالا مگر ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں سے جھانک کر وہ باہر زندگی کی موجودگی کا احساس پا سکتا۔

اب اس کا دل حلق میں آ گیا تھا۔ بڑا سا گولہ سینے میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ کانوں میں سے آنچ سی آتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس وقت پھر اس نے قسم اٹھالی کہ موقع مل گیا تو آج ہی یہاں سے بھاگ کھڑا ہوگا۔ ڈھیر سا پیسہ بنالینا کتنا مشکل ہے.......... پتہ نہیں یہ فتح جیسے اور اسماعیل جیسے لوگ کیسے اتنا پیسہ بنا لیتے ہیں۔ چاچا کہتا تھا کہ کما' پھر تو بھی عیش کرے گا مگر نازاں کا باپ جو ساری عمر کماتا رہا' ایک کھٹیا بھی نہ بنا سکا۔ گھر میں چار برتن نہ جوڑ سکا' اچھا کپڑا نہ پہنا سکا۔ زندگی بھر مزدوری کرتا رہا اور چہرے پر فاقہ برستا رہا۔ اگر وہ یہ مان لیتا کہ وہ پڑھا لکھا نہیں تھا' پڑھا لکھا ہوتا تو کما کر عیش کرتا تب طارق بابو کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ اس کے محلے میں سب سے بہتر اور صاف ستھرا گھر اسی کا تھا۔ اس کے والد سکول ٹیچر تھے۔ برسوں کی نوکری کے بعد دو کمروں والا گھر بنا سکے تھے اور مرتے وقت تک قرض میں جکڑے رہے۔ جنازے پر کچھ لوگوں نے قرض معاف کیا

اور کچھ کا ذمہ طارق بابو نے لے لیا۔ کمانے کے باوجود وہ سال بھر میں ایک ہی جوڑا بنا پاتا اور پھر استاد فتح کون سا پڑھا لکھا تھا۔ اس نے کیسے بنگلا' گاڑی اور اتنا پیسہ بنا لیا تھا۔ یقیناً اتنے خطرناک کام کر کے ہی پیسہ بنایا ہوگا۔ کاش یہ بات پہلے ہی اس کی سمجھ میں آجاتی۔ اس وقت آجاتی جب چاچا اسے منع کر رہا تھا۔ وہ پرچون کی دکان ہی کافی تھی۔ وہ بھی نہ ہوتی تو چاچا کا ٹھیلا کون سا برا تھا۔ دو وقت کی روٹی تو بندھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اگر چاچا کا ہاتھ بٹاتا تو اور بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ فتح کے پاس کام کرنے کا صرف اتنا فائدہ ہوا تھا کہ وہ گاڑی چلانا سیکھ گیا تھا اور چاچا کی دکان میں ساٹھ ستر ہزار کا راشن پڑا تھا مگر اب نہ وہ گھر کسی کام کا تھا جسے چاچا نے پتہ نہیں کیسے اور کتنا خون پسینہ بہا کر بنایا تھا' نہ پرچون کی دکان' البتہ گاڑی چلانا اس کے کام آ سکتا تھا۔

اور اس بات پر گلو کو خیال آگیا تھا کہ چاچا ٹھیک ہی کہتا تھا کہ کوئی ہنر سیکھ لے' کبھی کہیں بھوکا نہیں مرے گا۔ یہ خیال آتے ہی گلو نے فیصلہ کر لیا کہ یہاں سے بھاگ نکلا تو کہیں ڈرائیوری کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد پھر اسے دیر ہو جانے کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اب تو روشن دان سیاہ ہو چکا تھا۔ گویا رات بھی ہو چکی تھی۔ کمرے میں گہرا اندھیرا تھا تبھی گلو نے آگے بڑھ کر سوئچ آن کر دیا۔ تیز روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ پتا نہیں اسے کمرے میں روشنی کرنے کا خیال پہلے کیوں نہیں آیا تھا' شاید اس لئے کہ اس کے دماغ میں اس سے زیادہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

اب گلو میں مزید برداشت نہیں تھی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اس سے پہلے کہ کاریگر لڑکے بھی چلے جائیں' اسے دروازے کو دھڑ دھڑا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لینا چاہیے۔ وہ ان لوگوں سے کہہ سکتا تھا کہ میں سو گیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں امام دین باہر سے دروازہ بند کر گیا۔ یہی سوچ کر اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اسے باہر سے باتیں کرنے آواز کے ساتھ ہی کسی کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ساکت رہ گیا۔ کان لگائے تو آواز امام دین کی تھی۔ اس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ امام دین آ چکا تھا اور غالباً کاریگر لڑکوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ انتظار ختم ہونے والا تھا مگر یہ آخری لمحے بھی گلو پر بہت بھاری بن کر گزر رہے تھے۔ وہ بے چین ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ حلق پھاڑ کر امام دین کو آواز دے لے۔ مگر اس سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے کہ وہ اسے آواز دیتا۔ دروازے کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔

دروازہ کھلا تو امام دین کے ساتھ نازاں کو چادر میں لپٹا کھڑا دیکھ کر گلو دنگ رہ گیا۔

"تو............ تو............ کیوں آئی ہے؟"

اس نے سر سے چادر سرکائی۔ منہ پر پڑا پلو ہٹایا تو اس کی روئی روئی سوجی ہوئی سرخ آنکھیں دیکھ کر گلو پریشان ہو گیا۔

"گلو............ وہ............" اس سے بولا نہیں گیا۔ تبھی امام دین بول اٹھا۔

"بیٹھ............ بیٹھ جاؤ............ میں پانی لاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ جلدی سے باہر چلا گیا۔

"بولتی کیوں نہیں؟ کیا ہو گیا ہے تجھے اور تو یہاں آئی ہی کیوں ہے؟" اس وقت گلو کو نہ اس کے پاؤں کبوتر ایسے نرم اور ریشمی لگ رہے تھے نہ نارنجی پھولوں والی چادر یاد آ رہی تھی اور نہ سوجی ہوئی آنکھوں میں بھرے سرخ ڈورے اسے خوابوں کی طرف کھینچ رہے تھے۔ وہ وحشت بھرے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

"گلو خالہ کو............ خالہ مر گئی؟"

"کیا؟" وہ سناٹے میں رہ گیا۔ "کیا کہہ رہی ہے تو؟ وہ کیوں مرنے لگی؟"

"کیوں............ دنیا میں کون ایسا ہے جسے مرنا نہیں ہے۔" یہ امام دین تھا جو پانی کا گلاس بھر کر پانی لایا تھا۔ "نازاں تو سکون سے بیٹھ جا۔" اس نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

گلو حیرت اور دکھ میں ڈوبا حیران کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرخت سی آواز والی، مردوں ایسے ہاتھ پیروں والی لمبی چوڑی خالہ اچانک اچھی بھلی ہوتے ہوئے بھی کیسے مر سکتی ہے۔ نازاں پانی پی کر چادر کے کونے سے منہ اور ناک رگڑ رہی تھی۔ امام دین اس سے پانی کا گلاس لے چکا تھا۔

"بول نا!" گلو چیخ پڑا۔

"تیرے جانے کے بعد اس رات کچھ لوگ آئے تھے گلو............ کچھ غنڈے............ بری بری شکلوں والے اور موٹی موٹی مونچھوں والے۔ ان کا خیال تھا کہ تو نے جہاں بھی پناہ لی ہے، خالہ وہ جگہ جانتی ہے۔ انہوں نے اسے دھمکیاں دیں۔ میں تو

اپنے کمرے میں تھی، یہ دیکھ کر کہ کچھ لوگ گھس آئے ہیں میں چارپائی کے نیچے گھس گئی تھی، ان لوگوں کے جانے کے بعد ہی باہر آئی تھی۔ خالہ اس وقت تک ٹھیک تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ لوگ تجھے پوچھ رہے تھے۔ اگلی صبح وہ اٹھی تو ٹھیک نہیں تھی۔ اسے بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں بھاگ بھاگ کر پانی پلاتی رہی پھر اس نے برف مانگنا شروع کر دیا۔ اسے برف بھی کھلاتی رہی مگر اس کی حالت بگڑتی چلی گئی پھر............ پھر محلے کے لوگ اسے اسپتال لے گئے۔ ایک رات اسپتال میں رہ کر صبح............ آج صبح وہ............" نازاں پھر رونے لگی۔

"اوہ............ یہ تو............ یہ تو بہت برا ہوا۔ اب تیرا کیا ہو گا؟" چھوٹتے ہی اسے نازاں کی فکر ستانے لگی۔

نازاں نے شاکی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تیری خاطر مری ہے وہ............ وہ حرامزادے تیرے ہی پیچھے آئے تھے۔"

یہ سنتے اور سمجھتے ہی اس کا دماغ گھوم گیا۔ "وہ استاد فتح کے آدمی ہوں گے۔ وہ جانو............ میں نے کہا تھا ناں کہ جانو میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔" آخری جملہ اس نے ماے سے کہا تھا۔

"اب جو کچھ ہو چکا اسے رونا بیکار ہے گلو۔ اب یہ بیچاری بھلا کہاں جائے گی۔ اکیلی رہے گی کیا؟ تو اسے اور چاچا کو لے کر آج رات ہی یہاں سے نکل جا۔" امام دین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اور............ اور ان کتوں کو چھوڑ دوں۔" اس نے یہ نازاں کو یہ بات جتانے کے لئے کہا تھا کہ اسے خالہ کی اس طرح موت کا دکھ ہے، دکھ اسے اس کے مرنے کا ضرور ہوا تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ وہ فتح کے آدمیوں کے ڈرانے دھمکانے سے خوفزدہ ہو کر مری ہے مگر سچی بات یہ تھی کہ اسے فوراً ہی اپنی فکر ستانے لگی تھی اور چاچا کی طرف سے تو وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اگر خدانخواستہ امام دین نے وہاں سے چاچا کو نہ نکالا ہوتا............ تو وہ حرامزادے............ وہ اس سے آگے کچھ نہیں سوچ سکا اور بولا۔ "میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا ماے۔"

"ٹھیک............ تجھے جو کچھ بھی کرنا ہو وہ بعد میں کرنا۔ تیرا سب سے پہلے مسئلہ نازاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور چاچا کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچانے کا ہے گلو۔ تو بات کو سمجھا کر۔ بعد میں، میں بھی تیرا ساتھ دوں گا۔ ہم دونوں مل کر ان سارے حرامزادوں کا کام کر دیں گے فی الحال تو اٹھ۔ میں گاڑی کا بندوبست کر کے آیا ہوں۔ تجھے سہراب گوٹھ کے بس اڈے پر چھوڑ دوں گا۔ راستے ہی سے ہم چاچا کو بھی لے لیں گے۔ یہ پتہ لکھا ہے اس پر۔" اس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر گلو کی طرف بڑھا دیا۔ "سلطان کے بھائی کا نام احسان اللہ ہے۔ وہاں ایک شوگر مل میں منشی ہے۔ تو سیدھا اس کے ہاں چلے جانا۔ وہ تیرا ٹھکانہ کر دے گا۔ تجھے یہاں اس وقت تک واپس نہیں آنا ہے جب تک میں تجھے لینے نہ آؤں۔ سمجھ رہا ہے ناں تو؟" امام دین پاس بیٹھ کر کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، سمجھ گیا۔" گلو نے جلدی سے سر ہلا دیا۔ "چل۔" اس کے کھڑے ہوتے ہی امام دین بھی کھڑا ہو گیا۔ نازاں نے پھر چادر سے منہ کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔ یہ لوگ باہر آ گئے۔ گیراج ابھی بند نہیں ہوا تھا۔ آدھے سے زیادہ کاریگر جا چکے تھے۔ وہی لڑکے کام کر رہے تھے جو وہاں رہتے تھے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ گاڑی کے پاس ہی چھوٹا اداس کھڑا تھا۔

"گلو!" وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔ "میں نے دروازہ اس لئے نہیں کھولا تھا کہ یہاں کچھ عجیب سے لوگ گھوم رہے تھے۔ ان کے سامنے دروازہ کھولنا ٹھیک نہیں تھا۔" اس وقت وہ بچہ نہیں کوئی سمجھ دار آدمی لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور آنکھوں میں اداسی۔

"کون لوگ تھے؟" گلو نے گھبرا کر پوچھا۔

"چھوڑ تو........... مجھے بتا چکا ہے یہ۔ ضروری نہیں کہ وہ لوگ تیرے ہی چکر میں ہوں۔ بیٹھ تو گاڑی میں۔" امام دین کو بہت جلدی تھی۔ گلو نے پچھلا دروازہ کھول کر نازاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر گھوم کر خود ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ امام دین نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ عین اسی لمحے چھوٹے کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز دور تک پھیل گئی۔ "لے جا میری دعائیں لیا، پردیس جانے والے، لے جا میری دعائیں۔"

گلو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ چھوٹے کو گلے لگا لے مگر گاڑی چل پڑی تھی۔ اس نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر ہلایا اور آستین سے آنکھیں پونچھ

ڈالیں۔

"یہ سالا بھی جان کو آ گیا ہے۔" امام دین نے عجیب سے انداز میں کہا۔ اس کا بھی لہجہ بھیگا ہوا تھا جسے غصیلا بنانے کی کوشش کرنے میں اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "نہ ہو تو جی نہیں لگتا اور اگر ہو تو........... کان کھا لیتا ہے۔" اس نے بے وجہ ہونٹ پھیلا کر ہنسنے کی کوشش بھی کی۔

گلو کچھ نہیں بولا۔ اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ وہ تین دن اس کے گیراج پر رہا تھا۔ چھوٹے سے کبھی بات نہیں ہوئی تھی سوائے اس کی تانیں سننے کے مگر پھر بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بہت اپنے کو چھوڑ کر جا رہا ہو۔ کسی بہت محبت کرنے والے کو۔

امام دین نے گاڑی کی رفتار ایک دم بڑھا دی تھی۔ نازاں پیچھے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وہ لوگ مین روڈ پر آئے تو گلو کو چاچا کی فکر ستانے لگی۔ وہ اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ لوگ اس کچی بستی میں داخل ہو رہے تھے جہاں کچھ گھر پکے بنے ہوئے تھے۔ جلد ہی گاڑی اس دروازے پر جا رکی جہاں گلو چاچا سے ملنے آیا تھا۔

"تو بیٹھ........... میں چاچا کو لاتا ہوں۔" امام دین نے اس کا بازو پکڑ کر اترنے سے روک دیا۔

"جلدی آنا ماہے۔" وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ امام دین ایک ہی چھلانگ میں دروازے سے اندر چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے اندر جاتے ہی گلو کو دروازے میں وہی موٹی بھدی لڑکی نظر آ گئی۔ صرف ایک لمحے کو اس کا چہرہ نظر آیا پھر غائب ہو گیا۔

"چاچا یہاں ہے؟" پیچھے سے نازاں کی آواز آئی تو اتنی دیر میں پہلی بار گلو کو نازاں کا خیال آیا۔

"ہاں..........." اس نے مختصر جواب دیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ کس کا گھر ہے؟" نازاں نے پھر پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ امام دین کے کسی جاننے والے کا ہے۔" گلو نے جواب دیا۔ اسی وقت چاچا کو پکڑے ہوئے امام دین باہر چلا آیا۔ گلو برداشت نہیں کر سکا اور لپک کر گاڑی سے باہر آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ارے گلو.......... میرے بچے.......... میرے لال۔" چاچا اس سے لپٹ گیا۔

"تیری راہ دیکھتے دیکھتے اب تو میں موت کی راہ تکنے لگا تھا۔ کل آیا کیوں نہیں تھا تو؟"

"وقت نہیں ہے چاچا۔" امام دین اس کے ڈائیلاگ سن کر جھنجھلا گیا۔

"دیکھ گلو.......... اب میں صاف کہے دیتا ہوں کہ تیرے ساتھ جاؤں گا۔ یہاں نہیں رہنے کا میں۔" چاچا ایک دم بپھر گیا۔

"ہاں ہاں.......... تجھے لینے ہی آیا ہوں چاچا۔" وہ اسے سنبھالے گاڑی کی دوسری طرف لے آیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ نازاں کو دیکھ کر چاچا حیران ہو گا۔ اس کی موجودگی کا سبب پوچھے گا اور اگر نازاں نے بتا دیا کہ خالہ.......... اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں سکا اور چاچا کو چھوڑ کر جلدی سے گاڑی کی طرف لپکا۔ اس نے ایک سیکنڈ میں نازاں کو بتا دیا کہ خالہ کے بارے میں اسے چاچا کو کچھ نہیں بتانا ہے۔ وہ ایسے جھکا ہوا تھا جیسے گاڑی کے اندر رکھی کسی چیز کو اٹھا رہا ہوں۔ نازاں کو پوری بات سمجھا کر وہ سیدھا ہو گیا۔ اتنی دیر میں چاچا گاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ حسبِ توقع نازاں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

"تو.......... تو.......... کیا کر رہی ہے بیٹا؟"

"چاچا ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھو۔" امام دین نے اس کا بازو پکڑ کر اندر بٹھاتے ہوئے کہا۔ گلو پہلے ہی اگلی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ ان لوگوں کے بیٹھتے ہی امام دین نے گاڑی چلا دی۔ مختلف سڑکوں پر تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا امام دین کافی چوکنا تھا۔ وہ ہر سگنل پر بڑے غور سے چاروں طرف دیکھتا۔ وہ لمبا راستہ کاٹ کر ایک سڑکوں سے ہو کر گزر رہا تھا جہاں زیادہ تر رش نہیں تھا۔ اس کے محتاط رویے نے گلو کو پریشان کر دیا تھا۔ پتہ نہیں وہ لوگ ایسے کیسے جن تھے کہ لمحوں میں اس کے پیچھے لگ جاتے۔ گلو کو تو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہوں گے۔ نازاں چپکے چپکے چاچا سے باتیں کر رہی تھی۔ گلو کے کان اس طرف بھی لگے ہوئے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ نازاں کہیں خالہ کی موت کا ذکر نہ کر دے۔ چاچا اب بھی اس سے یہی پوچھ رہا تھا کہ وہ گلو کے ساتھ کیسے ہے۔ وہ اپنے گھر میں کیوں نہیں ہے۔ اسے تو خالہ کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ خالہ کو وہ کیا بتا کر آئی ہے۔ پتہ نہیں نازاں نے اسے کیا جواب دیا کہ وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو کر بولا۔ "گلو! میں پوچھتا ہوں کہ تو نازاں کو کیوں لے کر آیا ہے۔ خالہ کیا سوچے گی تیری!"

"چاچا! خالہ نے خود ہی نازاں کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ استاد فتح کے آدمی میری تلاش میں خالہ کے گھر تک پہنچ گئے تھے۔ خالہ نے اس وقت تو اسے چھپا دیا تھا۔ وہ.......... دراصل میں جانو کو بتا چکا تھا کہ میں نازاں سے شادی کرنے والا ہوں۔ شاید ان لوگوں نے سوچا ہو گا کہ نازاں میرے بارے میں جانتی ہو گی۔ بس اسی ڈر کی وجہ سے کہ وہ پھر لوٹ کر نہ آئیں اور نازاں کو پریشان نہ کریں۔ اس نے اسے میرے ساتھ کر دیا۔" گلو نے لمبا چوڑا جھوٹ بولتے ہوئے ذرا بھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا کی طرف دیکھ کر وہ اب بھی زندگی بھر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ ناگزیر نہ ہوتا تو وہ کبھی جھوٹ نہ بولتا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب کبھی چاچا سے جھوٹ نہیں بولے گا۔ اس سے جھوٹ بولنے کا خمیازہ وہ بھگت ہی چکا تھا۔

پتہ نہیں چاچا مطمئن ہوا یا نہیں۔ گلو کو یقین تھا کہ یہ سن کر اس نے پہلو ضرور بدلا ہو گا۔ ان حالات میں ایک جوان لڑکی کا ساتھ یوں بھی خطرناک ہو سکتا تھا۔ پھر وہ دونوں تو فٹ پاتھ پر بھی گزارا کر لیتے مگر اس کے لئے تو چھپر بھی چاہئے تھا اور پردہ بھی۔ اس وقت تو وہ کچھ نہیں بولا۔ صرف اتنا پوچھا کہ وہ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ گلو نے اسے بلا کم و کاست سب کچھ بتا دیا کہ یہاں اسے کئی طرح خطرہ ہے۔ مخبری ہو سکتی ہے اس لئے امام دین نے انہیں حیدر آباد بھیجنے کا انتظام کر دیا ہے۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر وہ لوگ سوچیں گے کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ فی الوقت کراچی چھوڑنے کے بارے میں سوچنا تھا۔

امام دین گاڑی بھگاتا ہوا سپرہائی وے پر پہنچ کر رک گیا تھا۔ سامنے ہی بسوں کا اڈا تھا۔ امام دین نے جیب سے ایک موٹا لفافہ نکال کر گلو کے حوالے کر دیا۔ "اس میں پینتیس ہزار روپے ہیں۔"

"پینتیس ہزار!!" گلو نے ہونٹوں کو سکیڑ کر حیرت سے کہا۔

"ہاں.......... جیسے ہی اور کا انتظام ہوا' بھیج دوں گا۔ فی الحال تو تجھے کچھ نہیں کرنا ہے۔ بس احسان اللہ سے کہنا میں جلد ہی اس سے بات کروں گا۔"

"نہیں.......... ماے.......... یہ' یہ بہت پیسے ہیں۔ ان کا کیا کرنا ہے مجھے؟" گلو کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل امام دین کے لئے پیار سے بھر گیا۔ اتنی بڑی رقم بھلا کون کسی کو یوں دیتا ہے۔

"گلو! پتہ نہیں حالات کیا ہوں۔ کیا خبر تجھے کہاں کہاں جانا پڑے۔ رکھ لے۔ احتیاط سے رکھنا۔ جیب کٹ گئی تو چکر میں آجائے گا۔" امام دین نے پیسے اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ چاچا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنے بہت سے نوٹ دیکھ کر اس کے دماغ میں جیسے گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔

"نہیں گلو! خبردار.......... یہ پیسے مت لینا۔ کیوں دے رہا ہے یہ پیسے.......... بلا وجہ کوئی نہیں دیتا۔ دیکھ گلو تو پہلے بھی بھگت چکا ہے۔ فتح نے تجھے پیسوں کا ہی لالچ دیا تھا نا! واپس دے.......... لوٹا دے یہ پیسے۔" وہ ایک دم ہی گلو کی طرف جھپٹ پڑا تھا۔

"یار.......... یہ کیسا چاچا ہے تیرا؟" امام دین حیرت کے مارے اتنا ہی کہہ سکا۔

"چاچا.......... تو ہر ایک پر شک نہ کیا کر۔ امام دین ایسا نہیں ہے۔ میں قسم کھا چکا ہوں کہ اب تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو.......... دیکھ چاچا.......... میں بہت پریشان ہوں۔ اللہ کے واسطے بے تکی باتیں نہ کر۔"

گلو گھبرا گیا جیسے چکی کے دو پاٹوں کے بیچ آ گیا ہو۔ "دیکھ ماے.......... چاچا جب پریشان ہوتا ہے نہ تو.......... دراصل میں نے جو فتح کے بارے میں جھوٹ بولا تھا تو یہ.........." اس سے صفائی بھی پیش نہیں کی جا رہی تھی۔

"چل اتر۔" امام دین دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اب چاچا بالکل چپ تھا مگر اس کی آنکھوں میں بے اعتباری اب بھی موجود تھی۔ نازاں نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ گلو تیزی سے اترا اور گھوم کر امام دین کی طرف آ گیا۔ پھر اس کے کاندھے پر بازو رکھ کر گاڑی سے کچھ دور لے گیا۔

"دیکھ ماے.......... تو برا مت ماننا۔ وہ بوڑھا ہے ناں' پھر پریشانیوں نے یوں بھی باؤلا کر دیا ہے۔" گلو کھسیانے لگا۔ وہ بڑی گہری نگاہوں سے امام دین کے کرخت چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دکھ پیسوں کا نہیں تھا۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ امام دین کیا سوچ رہا ہو گا۔ اس بے چارے نے تو اسے عذابوں سے بچایا تھا۔ وہ چاہتا تو اسے پھر جہنم میں جھونک دیتا۔ اتنی صفائی سے اس نے سب کچھ بتا کر اس کے بھاگنے کا انتظام کیا تھا اور چاچا نے ایسی بات کر کے اسے کیسا دکھ پہنچایا تھا' بس اسی بات نے اسے امام دین کے سامنے

شرمندہ کر دیا تھا۔

اچانک امام دین نے پلٹ کر اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ لیا۔ گلو ڈر گیا۔ اس کے چہرے پر برف سی جمی محسوس ہو رہی تھی۔ گلو کا دل حلق میں دھڑکنے لگا۔

"گلو.......... تو' تو بڑا خوش نصیب ہے گلو۔" اچانک وہ پورے کا پورا جیسے پگھل گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "کوئی تو ہے.......... کوئی تو ہے گلو جو تجھے ہر قدم پر روکتا ٹوکتا ہے۔ ارے ایسا چاچا.......... اتنا غصہ کرنے والا۔ تجھ پر نگاہ رکھنے والا تو بڑے نصیب والوں کو ملتا ہے.......... میں نے برا نہیں مانا۔ تو فکر نہ کر.......... یہ لے اب اسے نیفے میں رکھ اور جلدی سے وہ جو گاڑی کھڑی ہے نا.......... سڑک کے اس طرف.......... اس میں بیٹھ جا۔"

گلو ایک دم امام دین سے لپٹ گیا۔ برداشت کرنے کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ "ماے.......... ماے تیرا جیسا یار بھی تو نصیب والوں کو ملتا ہے ناں! اپنا خیال رکھنا ہے.......... اور.......... اس کا.......... چھوٹا کا بھی.......... اسے کچھ مت کہنا.......... تو جلدی آنا.......... میں اکیلا گھبرا جاؤں گا.......... تو بھی یہ سب کچھ چھوڑ دے ماے۔ اپن دونوں کسی اور شہر میں جا کر نئے سرے سے بسیں گے۔ وہاں کام کریں گے ماما۔" وہ اسے سینے سے بھینچے بولے جا رہا تھا۔

"اچھا بس کر.......... میں جلدی آؤں گا۔ یہ رکھ۔" اتنا کہہ کر امام دین نے پیسوں کا لفافہ اس کے نیفے میں اڑس دیا۔ ذرا دیر بعد ہی گلو' چاچا اور نازاں کو لیے ایک بس میں چڑھ رہا تھا۔ وہ پلٹا.......... اس نے امام دین کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پلٹ کر اپنی سیٹ پر آ گیا۔ چاچا اور نازاں بیٹھ چکے تھے۔ سبھی مسافر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کنڈیکٹر آواز لگانے لگا۔ اسی لمحے کسی نے دروازے میں کھڑے کنڈیکٹر کو ہٹایا اور بس میں سوار ہو گیا۔ گلو کی نگاہ جونہی بس میں سوار ہونے والے پر پڑی اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بس میں سوار ہونے والا فتح کا ذاتی ملازم عبدل تھا۔ وہ اس کے گھر میں خانساماں تھا۔ اسے پہلی بار گلو نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ جانو کے لیے فتح کا پیغام لے کر آیا تھا۔ گلو اس وقت جانو کے ہاتھ پاؤں جوڑنے اور فتح کے پاس ملازمت دلانے کی منتیں کر رہا تھا۔ عبدل نے جانو کو بتایا تھا کہ فتح نے اسے بلایا ہے۔ جانو گلو کو وہیں بیٹھا رہنے کا کہہ کر فتح کے بنگلے میں چلا گیا تھا۔ دوسری بار عبدل کو اس نے فتح کے بنگلے میں دیکھا تھا۔ جب پہلی بار وہ فتح کے بلانے پر جانو کے ساتھ اندر گیا تھا پھر اس سے اکثر ملاقات ہوتی بلکہ ڈبھیڑ ہوتی تھی مگر عبدل اپنے میں مگن رہنے والا آدمی تھا۔ وہ بولتا بہت کم تھا۔ سر اٹھا کر چلنے کی عادت بھی نہ تھی اس لئے بھی اردگرد سے بے خبر رہتا تھا۔ کسی کے اچھے برے میں نہ تھا۔ چپ چاپ اپنا کام کرتا رہتا اور فرصت کے وقت بنگلے میں لان کے کونے میں لگے گھنے پیڑ کے نیچے گھاس پر لیٹا رہتا تھا۔

اس کی اس عادت کی وجہ سے کسی کو اس کی موجودگی یا اہمیت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ سب کو چائے دیتا' پودوں کو پانی دیتا۔ فتح کے پیغامات پہنچاتا اور بازار سے سبزی گوشت لاتا مگر کسی کو اس کی موجودگی کا احساس نہ ہوتا۔ گلو نے اسے ہزار بار دیکھا تھا مگر کبھی بھی اس سے بات کرنے یا اسے جان لینے کی خواہش نہیں ہوئی تھی۔ آج پہلی بار اسے اس کی موجودگی بلکہ اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ وہ اگر دیکھ سکتا تو یقیناً اپنے چہرے پر پھیلی ہوئی زردی اسے نظر آ جاتی۔ چاچا نازاں سے باتیں کر رہا تھا شاید اس لیے گلو کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ نہیں پایا تھا۔ گلو نے جلدی سے منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ مگر دیکھ لئے جانے کا خوف چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں آج وہی بے ضرر سا عبدل اسے بڑا پُراسرار اور اپنی جان کا دشمن دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یقین آتا جا رہا تھا کہ وہ فتح

کا جاسوس ہوگا۔ اب فتح کے بعد جانو نے اسے اس کی تلاش کا کام سونپا ہوگا۔ شاید مخبری ہو گئی ہو۔ کسی نے جانو کو بتا دیا ہوگا کہ آج رات گلو چاچا کو لے کر کراچی چھوڑ رہا ہے۔ شاید چھوٹے کے بتائے ہوئے عجیب عجیب شکلوں والے لوگوں نے جانو تک یہ اطلاع پہنچائی ہو۔ جانو نے اسے ان لوگوں کے پیچھے لگا دیا ہو۔ یہی سوچ کر گلو کی گدی پر پسینہ بہہ نکلا تھا۔ وہ منہ کھڑکی کی طرف ہی کیے رہنے کی خواہش پر عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ گردن اپنے آپ ہی عبدل کی طرف مڑ رہی تھی۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

اب تک عبدل نے سر گھما کر کسی کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پوٹلی کی گرہ کس رہا تھا۔ اسے دروازے کے قریب ہی سیٹ مل گئی تھی۔ پوٹلی کا سرا ٹھیک سے باندھ دینے کے بعد وہ کندھے پر پڑی چادر سے اپنا پسینہ پونچھنے لگا۔ گلو نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔ چند ہی ثانئے بعد اسے اپنی کمر پر کچھ رینگتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ بے چینی بڑھ گئی۔ یوں لگا جیسے اب عبدل کی نگاہیں اس کی کمر پر رینگ رہی ہیں۔

کیسا عجیب خوف تھا۔ جیسے بدن کی ساری رگیں کھنچ کر حلق میں جمع ہونے لگی ہوں۔ اس اذیت ناک کیفیت نے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی سلب کر لی تھیں۔

"گلو!" اچانک اسے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا۔ آواز چاچا کی تھی۔ چاچا اور نازاں پیچھے والی سیٹ پر تھے۔ اس کے دائیں طرف کوئی چودہ پندرہ برس کا لڑکا سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اب اسے چاچا کی طرف مڑنا ہی تھا پھر بھی وہ کھڑکی کی طرف سے تھوڑا سا ترچھا ہو کر بولا۔

"ہوں.......... آہستہ بول چاچا۔"

"یہ تو بتا کہ ہم جائیں گے کہاں؟" چاچا نے شاید گلو کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ اسی آواز میں بولا۔

"چاچا.......... چپ کر جا۔" وہ ذرا سا اور ترچھا ہو کر بولا۔ اس بار اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے مگر آواز پہلے سے کچھ زیادہ بلند تھی۔

"باؤلا ہو گیا ہے کیا؟" وہ بالکل پہلے کے سے انداز میں غرایا۔ "میری بات کا جواب دے مجھے۔"

اور گلو جو نہیں چاہتا تھا وہ ہو گیا۔ عبدل نے ذرا سا سر گھما کر چاچا کی طرف دیکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھراس کی نگاہ گلو پر پڑی۔ اس کی باچھیں کانوں سے جا لگیں۔ وہ جلدی سے اٹھ کر گلو کے کاندھے پر جھک آیا۔ "ارے گلو.......... تو؟"

گلو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا سر کھڑکی سے دے مارے یا اس کے کلوں میں انگلیاں ڈال کر چیر ڈالے۔ اس کی بتیسی دیکھ کر ہنسے یا آنے والے لمحوں کی سنگینی پر روئے۔

"تو کہاں جا رہا ہے؟" وہ ویسے ہی جھکا جھکا بولا۔ اس کی سرمہ بھری آنکھوں میں خوشی تھی۔

"وہ.......... میں..........!!" گلو ذرا سا گڑبڑایا۔ پھر اسے یاد آگیا کہ یہی بس نواب شاہ بھی جاتی ہے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "میں نواب شاہ.......... وہ میری خالہ مرگئی ہے ناں! وہاں پرسا دینے جا رہا ہوں۔ تم کہاں؟"

"میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہی اس نے گلو کے برابر بیٹھے ہوئے لڑکے کا کاندھا ہلا کر اسے اپنی سیٹ پر جانے کو کہا۔ اس سے پہلے کہ گلو کچھ سمجھ اور سوچ پاتا' وہ لڑکا فوراً ہی اٹھ کر اس سیٹ پر جا بیٹھا۔ عبدل گلو کے برابر ہی بیٹھ گیا۔ گلو گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اب سارے راستے ہی اسے محتاط رہ کر بات کرنی تھی۔ چاچا پر اسے بے پناہ غصہ آ رہا تھا نہ وہ اتنی زور سے اسے مخاطب کرتا نہ عبدل کی نگاہ اس پر پڑتی مگر اب جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ مزید کڑھ کر اپنا خون جلانے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔

"پرسا دے کر میرے ساتھ گاؤں چلو۔ میں اکیلا ہو جاؤں گا۔" وہ جانو کی چالاکی' فتح کی موت اور گلو کے جرم سے بے پرواہ باتیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کسے بے وقوف بنا رہا تھا۔ گلو کو یا خود اپنے آپ کو۔ اسے یقیناً فتح کے قتل کی اطلاع ہو گی۔ وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ فتح کو گلو نے ہی قتل کیا ہے مگر اس وقت نہ تو اس کے چہرے پر حیرانی تھی' نہ خوف' نہ آنکھوں میں اسے پا لینے کی چمک تھی کہ اسے یوں پکڑ لینا اسے مالدار بھی بنا سکتا تھا۔ پولیس نے گلو پر انعام رکھا ہو یا نہ رکھا ہو' جانو ضرور اسے انعام سے نوازتا مگر وہ بڑی بے نیازی اسے اپنے گاؤں چلنے کی دعوت دے رہا تھا۔ اچانک گلو کو خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے کچھ علم ہی نہ ہو۔ ممکن تو یہ بھی تھا کہ جانو نے فتح کی موت کو چھپا لیا ہو۔ مگر دوسرے ہی لمحے جانو نے یہ خیال جھٹک دیا۔ جس وقت اس نے فتح پر حملہ کیا تھا اس وقت اس کا چوکیدار' مالی اور باہر کے کام کرنے والا ملازم بالا وہیں تھے جنھوں نے اسے پکڑ

تھا۔ پھر فوراً ہی پولیس کو بلا لیا تھا گویا اس کی موت کو چھپانے والی بات نری بکواس ہی ی۔ جہاں اتنے لوگ موجود ہوں وہاں یہ خبر بھلا کیسے چھپ سکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ فتح کے پاس سے ملازمت ہی چھوڑ چکا ہو۔ گلو نے اسے دیکھا بھی تو بہت روز پہلے تھا جب وہ پہلی بار فتح کو ملنے گیا تھا۔ بعد میں بھی وہ صرف ایک دو بار ہی دکھائی دیا تھا۔ وہ زیادہ تر کوٹھی کے اندر ہی رہتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی گلو پوچھ بیٹھا۔ "تم.......... فتح کے پاس کام کر رہے ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو حیرت سے گلو کا منہ پھٹ گیا۔ "ہیں.......... کیا..........؟"

"ملازم تو اسی کا ہوں.......... مگر چھوٹی بی بی اور بڑی بی بی کے مکان پر کام کر رہا ہوں۔" اس نے اپنی پوٹلی میں ہاتھ ڈال کر بھنے ہوئے چنے نکالتے ہوئے کہا۔

"چھوٹی بی بی اور بڑی بی بی؟ یعنی.......... کیا فتح کی بیوی ہے..........؟ میں نے تو سنا تھا کہ اس نے شادی ہی نہیں کی۔" گلو ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

"نہیں نہیں.........." اس نے بھنے ہوئے چنوں کی پڑیا کو اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ "شادی تو صاب نے کی ہی نہیں تھی۔ یہ بڑی بی بی اس کی جاننے والی ہے۔ باہر ملک سے آئی ہے.......... اور وہ چھوٹی بی بی.......... وہ بھی.......... پتا نہیں وہ اس کی کون ہے؟ اس کے انداز میں الجھن تھی۔ "سچی بات تو یہ ہے گلو کہ مجھے وہاں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے جیسے استاد فتح نے ان دونوں کو زبردستی.......... قید کر رکھا ہے۔ وہ لوگ آپس میں بات نہیں کر سکتیں۔ استاد سے بہت ڈرتی ہیں۔ پتہ نہیں.......... کیا چکر ہے؟ میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ کام کو منع کرتا تو استاد کا تمہیں پتہ ہی ہے۔ جانے چھوڑتا یا نہیں۔ بہن کی شادی کی بات پکی ہونے والی تھی۔ بہن کا خط پہنچا۔ بس.......... مجھے بہانہ مل گیا۔ لمبی چھٹی لے کر نکل گیا۔ اب میں واپس نہیں آؤں گا۔ وہیں کہیں کام کروں گا۔ میں تالا چابی کا کام اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہی کروں گا۔" بولتے بولتے اچانک ٹھٹک کر چپ ہو گیا۔ پھر اس نے گلو کی طرف غور سے دیکھا اور دھیرے سے بولا۔

"گلو.......... تم.......... تم اسے بتانا نہیں' کہ میں نے کام چھوڑ دیا ہے یا یہ کہ میں اب واپس نہیں آؤں گا۔ وہ سنے گا ناں تو پھر زبردستی بلا لے گا۔ اسے میرے ہاتھ کا کھانا بہت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسند ہے۔"

عبدل جس معصومیت سے بات کر رہا تھا اس سے گلو کو اب الجھن ہونے لگی تھی۔ پتہ ہی نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ سب ڈراما بازی کر رہا ہے یا واقعی حقیقت سے ناواقف ہے۔

"گلو! میرا دل شہر میں نہیں لگتا۔ یہاں بہت جھوٹ اور فریب ہے۔ میں بس اس لیے یہاں واپس نہیں آنا چاہتا۔" وہ گلو کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"استاد فتح کیسا ہے؟" گلو نے اچانک سوال کر لیا۔ "میں نے بھی اسے کافی دنوں سے نہیں دیکھا۔ سنا تھا کہ.........." گلو جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

"دیکھا تو میں نے بھی کافی دنوں سے نہیں۔"

اور گویا بات صاف ہو گئی۔ گلو نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ وہ واقعی حقیقت سے ناواقف تھا اس کا دوسرا مطلب یہ بھی تھا کہ جانو نے استاد فتح کی موت کو چھپا دیا تھا۔ ان دو چار آدمیوں کے علاوہ شاید کسی کو بھی اس کی موت کی خبر نہ تھی۔ ورنہ عبدل اسے استاد فتح کے قاتل کی حیثیت سے شناخت کر کے اب تک تو شور بھی مچا چکا ہوتا۔

"بس کبھی کبھی فون پر بات ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ ان دونوں کا خیال کرنے کو کہتا تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ مجھے تو دونوں ہی عورتیں پاگل لگتی ہیں۔ خاص طور پر وہ لنگڑی۔" گلو کا دل اچھل کر دوسری بار حلق میں آیا تھا۔ پہلی بار استاد فتح کا فون پر بات کرنے کا سن کر اور دوسری بار اس لنگڑی کے ذکر پر۔

"کون.......... کون لنگڑی؟ وہ تو گئی ہوئی تھی ناں؟"

"نہیں وہ تو برسوں سے یہیں رہ رہی ہے۔ اسی نے بتایا کہ تھا پہلے والا خانساماں ان دونوں سے ڈر کر بھاگ گیا۔ میں اکثر اس مکان پر سبزی گوشت پہنچانے جاتا تھا مگر کبھی رہا نہیں تھا پر بڑی بی بی کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہونے لگا۔ وہ کبھی کبھی رونے لگتی تھی اور کبھی ہنسنے لگتی تو ہنستی ہی چلی جاتی۔"

"پاگل نہیں تھی؟" اب گلو سوائے عبدل اور اس لنگڑی عورت کے باقی سب کچھ بھول چکا تھا۔

"نہیں.......... پاگل تو نہیں تھی۔ بس کبھی کبھی ان پر دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ انہوں

نے جان بوجھ کر اس خانساماں کو بھگایا تھا۔ وہ ان کی چغلی استاد فتح سے لگاتا تھا' پھر استاد فتح نے مجھے وہاں بھیج دیا تھا۔"

"مگر میں نے خود.......... جانو کے ساتھ انہیں ایئرپورٹ پر چھوڑا تھا۔" گلو مضطرب ہو کر بولا۔

"پتہ نہیں.......... شاید گئی ہوں.......... مگر میں جب سے اس مکان پر ملازم ہوا ہوں وہ کبھی نہیں گئیں۔"

پھر عبدل سے جو باتیں پتہ چلیں اس سے گلو کو خوب اندازہ ہو گیا کہ استاد فتح نے ان دونوں عورتوں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بہت سے کام نکالے ہوں گے۔ وہ دونوں یعنی عورت اور وہ لڑکی اس کی کون تھی' یہ تو پتہ نہیں چل سکا مگر اتنا اندازہ مزید ہو گیا کہ وہ اس کی کوئی بھی نہیں تھی۔ امید کی کرن سی چمکی تھی مگر جانو کے علاوہ اسماعیل وغیرہ کے خوف نے اس کرن کو جلد ہی بجھا دیا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی واپس لوٹ نہیں سکتا تھا۔ امام دین کو پتہ چل جاتا تو الگ ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ اس کو گلو نے جس قدر جذباتی اور خوفزدہ دیکھا تھا اور پھر جس طرح اس نے گلو کا ساتھ دیا تھا گلو وہ دیکھ کر اسے بتائے بنا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"اے گلو.......... یہ کون ہے؟" اچانک چاچا نے کسی تھانیدار کی طرح گلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر غراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ.......... یہ.........." گلو گڑبڑا گیا۔ وہ اس دوران میں چاچا کو بالکل بھلا بیٹھا تھا۔

"دوست ہے میرا۔"

"ابے ہر دوسرا آدمی تیرا دوست نکل آتا ہے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا۔ "دیکھ گلو تجھے تیری یہی دوستیاں لے ڈوبیں گی۔ اب تو کچھ نصیحت پکڑ لے ورنہ تیرے تو.........."

"بس کر چاچا۔" گلو کے کچھ بولنے سے پہلے ہی نازاں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"چپ کرا لے اسے۔" گلو بھی پلٹ کر غرایا۔ "یہ بھی نہیں دیکھتا کہ کون سی جگہ ہے۔ اور.......... پھر یوں سب کے سامنے ذلیل بھی کر دیتا ہے۔ کیا ساری دنیا سے دشمنی کر لوں!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاچا کو اس کی بات نے نہیں.......... اس کے اکھڑے ہوئے انداز نے سہما کر چپ کرا دیا۔ عبدل حیران پریشان سا بیٹھا تھا پھر وہ پلٹا اور بولا۔ "چاچا میں........ میں واقعی اس کا دوست ہوں۔"

چاچا نے گھور کر اسے دیکھا اور پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ گلو کا خون کھول رہا تھا.......... اسے پتہ تھا کہ ایک غلطی اسے برسوں ذلیل کرواتی رہی ہے اور یہ غلطی اب تو جرم بن چکی تھی۔ یہ تو شاید مرنے تک اس کے وجود سے لپٹی رہتی۔

عبدل نے اب سرگوشیوں میں اسے اپنے گھر چل کر رہنے کی پیش کش کی۔ اس کا اصرار تھا کہ گلو اس کی بہن کی شادی میں شرکت کر کے ہی لوٹے۔ گلو نے دبے دبے لہجے میں اس سے وعدہ بھی کر لیا۔ چاچا اور گلو والی ان دو سیٹوں کے درمیان گہری خاموشی تن گئی تھی۔ جو عبدل کے وجود پر گراں گزر رہی تھی۔ گلو کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے کہ وہ چپ بیٹھا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بوڑھے چاچا کی نگاہیں اس کے سر کے پہلے حصے پر جمی ہوئی ہوں گی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور بیٹھا رہا تو اس کا سر پچھلے حصے سے دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ عبدل اچانک اٹھا اور گلو کی سیٹ سے اٹھ کر واپس اپنی سیٹ پر چلا گیا۔ اس کی سیٹ پر جانے والا لڑکا اسے گھورتا ہوا واپس آ گیا۔

سفر شاید دو ڈھائی یا تین گھنٹے کا ہو گا مگر گلو کو یوں لگا جیسے ڈھائی تین منٹوں میں ختم ہو گیا ہو۔ وہ جو کچھ سوچنا چاہتا تھا کبھی کچھ سوچ بھی نہ پایا۔ دماغ الگ پھٹا جا رہا تھا۔ چاچا نے امام دین کے بعد اب عبدل کے سامنے بھی اس کی بے عزتی کر دی تھی۔ عبدل بے چارہ تو بالکل دوسرے ٹائپ کا آدمی تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ اب بھی استاد فتح کا ملازم تھا' وہ شریف آدمی تھا۔ اس کی شرافت پر شک کا کوئی جواز ہی نہ تھا مگر چاچا کے نزدیک ہر آدمی لفنگا ہی تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر کے بعد گلو کا دماغ ٹھکانے پر بیٹھا تو وہ اس لڑکی اور لنگڑی عورت کی گتھی سلجھانے میں لگ گیا۔ ابھی اس الجھی ڈور کا سرا ہاتھ بھی نہ آیا تھا کہ سفر ختم ہو گیا۔ حیدر آباد آ چکا تھا۔ عبدل اسے یہاں اترتے دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اسے خود بھی یہیں اتر کر اپنے گاؤں کی لاری لینا تھی۔ وہ چاچا کے چہرے کی کرختگی کو خاطر میں لائے بغیر ان لوگوں کے سر ہو گیا کہ وہ اس کے گاؤں اور گھر کا پتہ لکھ لیں پھر وہاں ضرور

آئیں۔ گلو جانتا تھا کہ وہ وعدہ خلافی کا مرتکب ضرور ہو گا مگر اسے ٹالنے کے لئے اس کا پتہ لینا اور وعدہ کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا سو اس نے اچھی طرح اس کا پتہ ذہن نشین کر لیا۔ اس کے جاتے ہی گلو نے تانگے والے کو امام دین کا لکھا ہوا کاغذ پڑھوایا اور وہ لوگ اس تانگے میں سوار ہو گئے۔

یہ بڑا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ چوڑی پکی سڑک پر تانگا اپنی مخصوص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ دو جانب لگے گھنے درخت ٹھنڈک کا احساس دلا رہے تھے۔ دائیں بائیں پکے گھر بنے تھے جن میں بعض گھر تو بہت ہی خوبصورت تھے۔ گلو دونوں جانب سر گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک تانگا ایک گھر کے سامنے رک گیا۔ تانگے والے نے بتایا کہ سامنے والا ہلکے نیلے رنگ کا مکان اس کا مطلوبہ مکان ہے۔ وہ لوگ اتر گئے۔ گلو نے تانگے والے کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ تانگے کے لوٹتے ہی سڑک پر گہری خاموشی چھا گئی۔ رات کا شاید ایک یا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اچانک گلو کے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹک گئے۔ بلا کی اجنبیت کا گہرا احساس اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر گیا۔ اتنی گہری اور سنسان رات میں ان لوگوں کے قدموں کی آوازیں دل و دماغ میں ہتھوڑے کی ضرب کی سی اذیت پیدا کر رہی تھیں۔ اس کا دل ایک دم ہی گھبرانے لگا تھا۔ وہ احسان اللہ کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چھوٹے سے کالے رنگ کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ گیٹ پر لگی احسان اللہ کے نام کی تختی اسے منہ چڑاتی اور لوٹ جانے کو کہتی محسوس ہوئی۔

احسان اللہ کے بھائی کو اس گروہ سے بچانے والا امام دین تھا۔ اگر وہ احسان مند تھا تو امام دین کا' گلو سے تو اس کا کچھ بھی لینا دینا نہیں تھا پھر وہ اتنی رات گئے ان دو اجنبی مردوں اور ایک اجنبی لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ کیسے دے سکتا تھا۔ "چاچا!" وہ بے اختیار پکار اٹھا۔

"کیا بات ہے گلو؟" چاچا کی آواز دھیمی اور لہجہ نرم تھا بلکہ اس کے لہجے میں تشویش تھی یوں جیسے وہ گلو کے اندر ہونے والی ساری کشمکش سے اچھی طرح واقف ہو۔

گلو ایک دم ہی پلٹ گیا۔ "چاچا میں ان لوگوں کو نہیں جانتا۔"

"نہیں جانتا..........؟"

"نہیں چاچا.......... میں نے تو احسان اللہ کی شکل تک نہیں دیکھی۔" وہ روہانسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گیا۔

"پھر.......... پھر تو یہاں اتنی رات کو کیوں آ گیا؟" چاچا کا لہجہ بدل گیا تب اس نے چاچا کو ساری بات بتا دی۔ نازاں حیران پریشان ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ساری بات سمجھ کر ایک دم ہی پھٹ پڑی۔

"گلو.......... میں سمجھتی تھی کہ تیرے اندر ذرا سی عقل ضرور ہو گی مگر تو.......... تو تو نرا بے عقل ہے۔"

"بکواس مت کر.........." گلو دانت پیس کر دبے انداز میں غرایا۔

"چھوڑ گلو.......... اب ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ اگر یہاں کسی نے اس وقت.......... اس انداز میں ہمیں کھڑے دیکھ لیا تو.......... پہلے ہی حالات بہت خراب ہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتا دور کہیں چوکیدار کی سیٹی کی آواز گونج اٹھی۔

"گلو.......... جلدی کر.........." نازاں نے گھبرا کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ وہ شاید چوکیدار کو تلاش کر رہی تھی۔

"اب تو تانگا بھی چلا گیا۔" چاچا نے گلو کا بازو پکڑ کر لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "گلو ایسا نہ ہو کہ ہم پر کوئی اور الزام آ جائے۔ چوکیدار کے قریب آنے سے پہلے ہی تو دروازہ بجا دے۔ وہ تجھے نہیں جانتا مگر امام دین کو تو جانتا ہے ناں! تیری اتنی مدد تو کرے گا ایک رات گزارنے کا انتظام کر دے۔ سویرے ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں گے۔"

چاچا کی بات گہری رات میں کرن کی طرح چمک کر اس کا دماغ روشن کر گئی۔ اب چوکیدار کے ڈنڈے کی ٹھک ٹھک قریب آ رہی تھی۔ اس کے بازو پر دھرا چاچا کا ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ اس کے سوا اس کے پاس کوئی اور چارہ بھی نہ تھا۔ وہ تیزی سے گیٹ پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کال بیل پر ہاتھ رکھتا مکان کی چھت سے ایک مردانہ آواز گونجی۔

"کون ہے؟"

گلو، چاچا اور نازاں نے ایک ساتھ سر اٹھا کر آواز دینے والے کو دیکھا۔ "جی یہ

احسان اللہ گھر ہے؟" گلو جلدی سے بول اٹھا۔

"کیا کام ہے احسان سے.......... اور آپ لوگ کون ہیں؟" چھت پر اندھیرا تھا مگر دور سے آنے والی روشنی اس کے ہیولے کو بہت واضح کر رہی تھی۔

"ہم.......... ہم کراچی سے آئے ہیں۔ مہمان ہیں ان کے۔" اس بار بھی گلو ہی نے جواب دیا۔

"آدھی رات کو مہمان آتے ہیں؟" بولنے والا اکھڑ لہجے میں جواب دے رہا تھا۔

"شرمندہ ہیں جی.......... کراچی سے رات میں چلے تھے جی.......... اتنی رات کو لاری نے پہنچایا اور پھر ہمیں گھر کا بھی پتہ نہیں تھا۔"

"کون ہے بھائی؟" مکان کے اندر سے کسی کی آواز آئی۔ "کون آیا ہے.......... کس سے بات کر رہے ہیں آپ..........؟"

"پتہ نہیں.......... کہتے ہیں کراچی سے آئے ہیں۔" چھت پر کھڑے آدمی نے نیچے کی طرف جھانک کر کہا۔ "دروازہ مت کھولنا۔ پتہ نہیں کون ہیں.......... حالات ویسے ہی اس قدر خراب ہیں۔ جاؤ بھئی جاؤ۔ کراچی میں ہمارا ایسا کوئی نہیں جو اتنی رات کو مہمان بن کر یہاں آئے۔" آخری جملہ اس نے گلو وغیرہ سے کہا تھا۔

"ارے ٹھہریئے تو۔" نیچے والا جو گلو اور چاچا کو نظر نہیں آ رہا تھا' بولا۔ "کہاں سے آئے ہو بھائی؟" آخری جملہ اس نے پکار کر ادا کیا۔

"ہمیں امام دین نے احسان اللہ کے پاس بھیجا ہے۔" گلو نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔

امام دین کا نام سنتے ہی اچانک گہری خاموشی چھا گئی پھر دوسرے ہی لمحے گیٹ کی کنڈی کھلنے کی آواز آئی اور سفید کرتے پاجامے میں ملبوس تیس پینتیس برس کا آدمی گیٹ سے باہر آ گیا۔ گیٹ کھولتے ہی اس نے اندر کہیں بٹن دبا کر گیٹ کے ماتھے پر لگا بلب روشن کر دیا تھا۔ روشنی دور دور تک پھیل گئی جس میں نازاں کا ہونق چہرہ اور چاچا کا نڈھال وجود دکھائی دینے لگا۔

"امام دین نے.........." باہر نکلنے والے نے تصدیق چاہی۔ "وہ خود کہاں ہے؟"

اب اس کا انداز دوستانہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بیٹا بڑا لمبا سفر تھا۔ میری ہڈیوں میں بھی درد ہو گیا۔" چاچا یہ کہتا ہوا وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ گلو نے اس کے یوں زمین پر بیٹھنے کو اپنی بے عزتی سمجھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے کھڑا کرتا آنے والا بول اٹھا۔

"چلیں آپ لوگ اندر چلیں۔"

اندر پہنچ کر اس نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ خود احسان اللہ تھا اور چھت سے اتر کر آنے والا شخص اس کا چچا فرقان اللہ۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک چھوٹا سا ڈرائنگ روم بنا ہوا تھا۔ احسان اللہ انہیں اندر لے گیا۔ چاچا تو اندر جاتے ہی قالین پر بیٹھ گیا۔ نازاں سہمی ہوئی ایک طرف کھڑی تھی کہ احسان اللہ نے اسے بیٹھنے کو کہا پھر وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں شربت کے گلاس تھے۔ چاچا نے بلا کسی تکلف کے گلاس ہاتھ سے لے کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا اور دعاؤں کے ساتھ احسان اللہ کی طرف بڑھا دیا۔ گلو کو پہلی مرتبہ احساس ہو رہا تھا کہ چاچا انتہائی بے باک ہے' احسان اللہ نے کھانے کا بھی کہہ دیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں کھانا بھی آ گیا۔

احسان اللہ میزبانی کا حق ادا کر رہا تھا۔ اس کے اچانک بدل جانے والے رویے نے گلو کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ وہ لوگ احسان فراموش نہیں ہیں۔ امام دین کی عزت کرتے ہیں اور اس کے احسانوں کا بدلہ چکانے کی کوشش بھی کر رہے ہیں۔ کھانا کھاتے ہی چچا وہیں قالین پر ایک کونے میں سر کے نیچے بازو کا تکیہ بنا کر لیٹ چکا تھا۔ اس نے تو سکڑی ہوئی نازاں کو بھی ایک کونے میں لیٹ جانے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ یونہی چادر میں لپٹی ہوئی کھڑی تھی۔

"میرے گھر میں خواتین نہیں ہیں گلو ورنہ میں ان کو اندر بھیج دیتا۔" احسان اللہ نے آہستہ سے کہا۔

"کوئی بات نہیں احسان بابو۔ یہ یہیں سو جائے گی۔" گلو نے جواب دیا۔

"آؤ ہم باہر بیٹھتے ہیں۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر نازاں سے مخاطب ہوا۔ "آپ لیٹ جائیے۔ اندر سے دروازہ بند کر لیں۔ گلو باہر ہمارے ساتھ ہی سو جائے گا۔"

وہ لوگ باہر نکلے تو نازاں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔ گلو احسان اللہ کے ساتھ

باہر آ گیا۔ وہ لوگ ٹی وی لاؤنج میں آ بیٹھے۔ فرقان اللہ وہیں بیٹھے کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انہیں اندر آتے دیکھ کر انہوں نے کتاب صوفے پر اوندھا دی اور بڑی گہری نگاہوں سے گلو کو دیکھنے لگے۔ گلو اپنے آپ کو بڑا بندھا بندھا محسوس کر رہا تھا۔ جس اجنبیت کے احساس نے دروازے پر جکڑا تھا وہ پھر شدید ہو گیا۔ ورنہ احسان اللہ کے رویے نے اجنبیت کو قدرے کم کر دیا تھا۔ اسے فرقان اللہ کی نگاہیں اپنے اندر کھبتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ احسان اللہ کا اس سے تعارف کرانے کے بعد ہی وہ اس کمرے میں آ گئے تھے۔ انہوں نے اس سے مل کر کسی اپنائیت کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس وقت وہ اسے جس انداز میں دیکھ رہے تھے اس نے گلو کے اس ارادے کو مزید پختہ کر دیا تھا کہ سویرا ہوتے ہی اسے کہیں اور ٹھکانہ ڈھونڈ لینا چاہیے۔ احسان اللہ نے جلد ہی اس کے سونے کا انتظام کر دیا۔ وہیں لاؤنج میں فوم کا گدا اور تکیہ دے کر کہا کہ اگر وہ پسند کرے تو اپنے چاچا کے پاس ہی سو جائے۔ گلو نے یہی مناسب سمجھا۔ رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ اس وقت تھکن اور پریشانی کے احساس نے بھی گلو کو نڈھال کیا ہوا تھا وہ گدا اور تکیہ لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ نازاں ابھی جاگ رہی تھی اسی نے دروازہ کھولا کچھ ہی دیر بعد نازاں اور چاچا بے خبر سو چکے تھے۔ وہ وہیں گدا ڈال کر لیٹ گیا۔ بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی۔ سویرے ہی چاچا نے اسے اٹھا دیا۔ پہلے تو اس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی مگر دوسرے ہی لمحے اسے یاد آ گیا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے کہ چاچا بڑبڑاتا رہے گا اور وہ منہ لپیٹے پڑا رہے گا۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا احسان اللہ اٹھ چکا تھا۔ ناشتہ بڑا پُر تکلف تھا۔ احسان اللہ نے ان لوگوں کو اس حلئے میں دیکھ کر کسی تکبر کا اظہار نہیں کیا تھا جبکہ وہ خود اونچی سوسائٹی کا آدمی تھا۔ ڈرائنگ روم میں قیمتی فرنیچر' اس کی آرائش وزیبائش' پُر تکلف کھانا اور ناشتہ۔ یہ سب گلو سے میل نہیں کھاتے تھے۔ اس کا جی مسلسل گھبرا رہا تھا۔

ناشتے کے بعد ہی اس نے احسان اللہ سے صاف کہہ دیا کہ امام دین نے کہا تھا کہ وہ ان کے رہنے کا بندوبست کر دے گا۔ وہ یہ سن کر کچھ دیر تو سوچتا رہا پھر دھیرے سے بولا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

گلو نے ساری بات اسے بتا دی مگر استاد فتح والی بات صاف چھپا گیا۔ یہ بھی بتا دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اسماعیل وغیرہ اسے اپنے دھندے میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان لوگوں سے چھپ کر یہاں آ گیا ہے۔ وہ ساری کہانی چپ چاپ سنتا رہا پھر بولا۔ "امام دین بڑا اچھا آدمی ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ وہ چھوٹے موٹے جرم کرنے کے باوجود اچھا آدمی ہے۔ اس نے میرے بھائی کو اس خطرناک گروہ کے چکر سے نکال کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اسے اتارنا میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ تم لوگ اس کے دوست ہو۔ میں تمہیں یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

"بڑی مہربانی جی! پر ہم لوگ یہاں نہیں رہ پائیں گے۔ آپ اگر ہمارا بندوبست کہیں اور کر دیں.......... میرا مطلب ہے ہمیں چھوٹا موٹا گھر دلا دیں کرائے پہ تو ہم وہاں رہ لیں گے۔ میں مزدوری کرنا جانتا ہوں جی۔ ٹیکسی چلا سکتا ہوں۔ مجھے نوکری مل گئی تو عزت سے زندگی گزار لوں گا۔"

وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ اچانک وہ بول اٹھا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں یہاں قریب ہی دو کمروں والا مکان دلا دیتا ہوں۔ تم گاڑی چلانا چاہتے ہو ناں! سمجھو تمہاری نوکری بھی پکی ہو گئی۔ میں جس کمپنی میں ملازم ہوں' وہاں ہمیں ایک ایسے ڈرائیور کی ضرورت ہے جو دن رات ہمارے پاس کام کر سکے۔ درمیان میں ہم اسے ریسٹ کے لئے ٹائم بھی دیں گے۔"

گلو یہ سب جان کر خوش ہو گیا۔ امام دین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ احسان اللہ اس کا سارا مسئلہ حل کر دے گا۔ اس روز شام کو احسان اللہ نے خوشخبری سنائی کہ اسے گھر مل گیا ہے۔ چابی وہ لے کر آیا تھا۔ یہاں چاچا اور نازاں دونوں ہی پریشان تھے۔ کسی اور کے گھر وقت گزارنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور اپنا گھر آدمی کے اندر اعتماد کی بنیاد کو مضبوط کرتا ہے۔ گلو کو گھر بہت برا لگتا تھا۔ وہ دن چڑھے تک سوتا تھا پھر باہر نکل جاتا تھا اور رات گئے ہی لوٹتا تھا۔ آج اسے اپنے گھر کی وہ کچی دیواریں' بغیر رنگ کیا' ایک قبضہ نکلا' لٹکا ہوا دروازہ' کچا آنگن اور چولہے کے قریب کی دھوئیں سے کالی دیوار بے طرح یاد آ رہی تھی۔ کتنی خوبصورتی تھی اس لفظ گھر میں' گویا خوبصورت رنگ کی ہوئی اونچی دیواریں یا مضبوط خوشبو والی لکڑی کے دروازے ہی گھر کی خوبصورتی نہیں ہوتے بلکہ گھر.......... اپنے پن کے اس احساس کی شدت کا نام ہوتا ہے جہاں قدم رکھتے ہی اسے اپنے معتبر' خودمختار اور

بااعتماد ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے وہ جب جی چاہے وہاں جا سکے' جب جی چاہے وہاں سے نکل سکے' جہاں جس حالت میں چاہے سو سکے' اپنی مرضی سے اٹھ سکے' گویا اپنے لئے زندہ رہنے کا اتنا ہی احساس ہو جتنا کہ زندہ رہنے کے لئے ہونا چاہیے۔ احسان اللہ نے تو اس پر نوکری دے کر بھی احسان کیا تھا۔ اب وہ واقعی نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

"چلو' ایک نظر دیکھ لو۔ ضرورت کی ہر چیز تمہیں دے دی جائے گی۔ یہاں کافی سامان ایسا ہے جو ضرورت سے زیادہ ہے۔ میں نے گھر کی صفائی کروا لی ہے۔"

احسان اللہ کے ہونٹوں سے نکلنے والا ہر جملہ اسے حیرت زدہ کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امام دین نے اس کے بھائی کو ان لوگوں سے بچا کر اتنا ہی بڑا احسان کیا ہے کہ احسان اللہ یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے' اگر ایسا ہی تھا تو گلو کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہی کام تو امام دین نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ اسے بھی تو اس گروہ سے بچایا ہے۔ اس خطرناک دلدل میں گرنے سے پہلے ہی ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا ہے۔ کاش میں بھی اس کے احسان کا بدلہ اسی طرح اتارنے کے قابل ہو سکوں جیسے احسان اللہ اتار رہا تھا۔ گلو نے حسرت سے سوچا۔

"کیا سوچنے لگے؟" احسان اللہ نے اسے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں جی!" وہ جلدی سے سنبھل گیا۔ "میں چاچا کو بتا دوں پھر چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں انکل فرقان سے مل لوں۔ وہ کل واپس لندن جا رہے ہیں۔"

احسان اللہ یہ کہہ کر ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

گلو نے جب چاچا کو بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ گلو سے زیادہ الجھن تو خود اسے ہو رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اب بھی اسی گھر میں قید ہو جہاں چھوڑتے وقت امام دین نے اسے تاکید کر دی تھی کہ اسے گھر سے تو کیا کمرے سے بھی نہیں نکلنا ہے۔ اس نے خود بھی چل کر گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی مگر گلو نے اسے بٹھا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد احسان اللہ واپس آ گیا۔ گلو اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گیا۔ یہ الگ ہی بستی تھی۔ احسان اللہ کافی شرمندہ تھا مگر گلو کے لئے وہ جگہ بھی جنت سے کم نہ تھی۔ وہ تمام راستے کو ذہن نشین کرتا رہا جیسے یہی راستے اسے منزل تک لے کر جائیں گے۔

"گلو تم چاہتے تو میرے گھر پر کچھ عرصہ رہ سکتے تھے۔ میرا خیال بھی یہی تھا مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہارے جلدی کرنے کی وجہ سے فی الحال یہی گھر ملا۔ یہ میرے جاننے والے کا گھر ہے۔ وہ میرے پاس ملازم تھا۔ اب وہ پشاور جا چکا ہے۔ گھر خالی ہے اور چابی میں اس کے ایک دوست سے لے کر آیا ہوں۔ جگہ اتنی اچھی نہیں مگر........."

اس کے جملہ ختم کرنے سے پہلے ہی گاڑی اس کچی گلی میں داخل ہو چکی تھی اور گلو نے بھی کون سے وہ جملے سنے تھے۔ ہاں اسے اتنا پتہ تھا کہ احسان اللہ شرمندہ ہے' اس کے خیال میں وہ کافی بے وقوف آدمی تھا جو اسے کسی محل میں بسانے کے خواب دیکھ رہا تھا' یا ممکن ہے وہ سوچ رہا ہو کہ گلو ایسی بستی میں ایک کچے گھر میں رہنا پسند نہیں کرے گا۔ اسے کیا پتہ کہ گلیوں کی یہی مخصوص بو' گھروں کا یہی کچا پن' دیواروں کی یہی بے ترتیبی تو گلو کی بنیاد ہے۔ وہ تو بہت خوش تھا اور اس نے کسی بخل سے کام لئے بغیر اس خوشی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

"احسان بابو! یہ آپ کی مہربانی ہے۔ ہمیں تو سر چھپانے کو چھپر چاہیے تھا' یہی ہماری اوقعات ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ چاچا تو یہاں بہت خوش رہے گا۔ یہ جگہ اچھی ہے۔ بہت اچھی۔" وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

دوسرے ہی لمحے ایک مکان کے آگے گاڑی رک گئی۔ دو پٹ کے کواڑوں پر بڑا سا تالا پڑا تھا۔ یہ بستی ڈھلوان میں تھی۔ شہر کا وہ حصہ جہاں سے یہ لوگ آئے تھے پیچھے بہت اونچا دکھائی دے رہا تھا۔ چھوٹے بڑے گھروں کی بے ترتیبی اور بہت سے چھوٹے چھوٹے بچوں کی ننگ دھڑنگ قطار نے گلو کے اندر زندگی سی پیدا کر دی تھی۔ ہر دروازے' ہر کھڑکی سے دو آنکھیں جھانکتی محسوس ہو رہی تھیں مگر گلو کو ذرا اجنبیت محسوس نہ ہوئی۔ وہ بالکل ایسے خوش تھا جیسے اپنے پرانے گھر پہنچ گیا ہو۔ گھر اندر سے کشادہ اور ہوادار تھا۔ بس دائیں جانب کی دیوار بہت کچی' ٹیڑھی اور نیچی تھی مگر گلو کو کچھ بھی احساس نہ ہوا۔ بس ایک سرسری نگاہ نے اسے دوسری دیواروں سے نیچا دکھایا تھا۔ گھر میں کل تین کمرے تھے۔ مستطیل صحن تھا۔ برآمدہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ گھر تھا' گلو کے لئے یہی بہت تھا۔ اس کی خوشی نے احسان اللہ کو کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔

گلو اسی روز رات اس مکان میں شفٹ ہو گیا۔ سہمی سکڑی رہنے والی نازاں تو

جیسے گھر میں داخل ہوتے ہی کہر کی طرح چھا گئی۔ پائنچے چڑھا کر اس نے سارا گھر صاف کر ڈالا۔ احسان اللہ نے ضرورت کی کچھ چیزیں ان کے ساتھ ہی بھیج دی تھیں۔ وہ تو فرنیچر تک دے رہا تھا مگر پہلے چاچا نے سختی سے منع کر دیا پھر گلو نے التجا کی کہ وہ اب اور کچھ نہ کرے بلکہ یہ ضد بھی کی کہ یہاں کا کرایہ باندھ لے' جس کا گھر ہے اسے دے دیا کرے۔ بات غیرت کی تھی' احسان اللہ نے معمولی کرایہ باندھ دیا۔ چاچا کو تو گمان بھی نہ تھا کہ یوں ایک ہی دن میں وہ لوگ کسی اجنبی شہر میں الگ گھر بھی بسا سکتے ہیں۔

ہر چیز جگہ پر رکھنے کے بعد گلو سیدھا بازار پہنچ گیا تھا۔ کچھ چیزوں کی ضرورت تھی جو اس نے احسان اللہ سے لینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ انہی میں تین کھری چارپائیاں تھیں۔ آج پہلی مرتبہ تیسری چارپائی لیتے ہوئے گلو کے اندر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔ پل میں ہوا کے تیز جھکڑ کی طرح خیال آیا تھا کہ کیوں.........؟ یہ ذمے داری کیوں اور کس رشتے سے؟ آج پتہ نہیں کیوں وہ نازاں کے گلابی کبوتر جیسے پاؤں اور پھول دار چادر کے سارے رنگ بھول چکا تھا۔ چارپائی لیتے ہوئے اسے شدت سے خود سے جدا ہو جانے' بچھڑ جانے کا خیال آیا۔ حالات نے اس کے اندر ایسی گہری خاموشی پھیلا دی تھی کہ کچھ یاد ہی نہ تھا بلکہ اتنی دیر سے نازاں کے ساتھ ہونے کے باوجود اسے اس کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔

وہ چارپائیاں گدھا گاڑی پر لاد کر گھر پہنچا تو اس کے ساتھ لالٹین بھی تھی۔ نازاں گھر میں موم بتیاں جلا چکی تھی۔

"یہ اچھا کیا تو نے۔" اسے دیکھتے ہی اس نے گلو کے ہاتھ سے لالٹین لے لی۔

"چاچا اب گلو اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا تم بتا رہے تھے۔" اس نے پلٹ کر چاچا کی طرف دیکھا۔

گلو کو وہ ایک دم زہر لگنے لگی۔ دوسری مرتبہ اس نے اسے بے وقوف اور بے عقل کہا تھا۔

"ہیں.........کیا.........؟" چاچا کے ان الفاظ کو سن کر نازاں زور سے ہنس دی اور گلو پیر پٹخ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ چارپائیاں اتار کر گھر میں لایا۔ چاچا بیمار ہونے کے باوجود اس کی مدد کو لپکا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اتنے روز بعد وہ پہلی رات تھی جب گلو نے کھلے آنگن میں' کسی ہوئی چارپائی پر چت لیٹ کر تاروں بھرا آسمان دیکھا۔ اس کونے سے اس کونے تک سیاہ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ روٹی کی گرم گرم بھاپ' ہوا کو خوشبو دار بنا کر اسے بے چین کر رہی تھی۔ چاچا اپنی چارپائی پر دری اور چادر بچھا کر لیٹ چکا تھا۔ گلو نے دھیرے سے گردن موڑ کر باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ جہاں صرف تین دیواریں تھیں۔ سامنے کی طرف نہ دیوار تھی نہ دروازہ۔ اندر مٹی کے چولہے میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں۔ تیل کا چولہا بند پڑا تھا جو احسان اللہ نے سب سے پہلے پہنچا دیا تھا۔ نازاں کا نخرہ تھا کہ روٹی سالن میں مٹی کے تیل کی بو آجاتی ہے۔ گیس یہاں تک پہنچی نہ تھی۔ کچی آبادی تھی۔ حکومت کے حساب سے تو یہاں میدان تھا تو بھلا گیس بجلی کی لائنیں کہاں ڈلتیں۔ اس وقت نازاں لالٹین کی روشنی میں روٹی پکا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ آنکھوں پر روشنی کی طرف ہاتھ رکھ کر اسے اور چاچا کو دیکھنے کی کوشش کرتی اور پھر روٹی پلٹنے کو مڑ جاتی۔

گلو مکمل اندھیرے میں تھا۔ اسے غور سے دیکھنے کا بڑا انمول موقع تھا' اس نے اس موقع سے فائدہ بھی اٹھایا۔ نہ چاچا کو پتہ تھا کہ وہ کسے اور کیوں دیکھ رہا ہے اور نہ نازاں کو۔ وہ گردن کو ہلکا ترچھا کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ چولہے سے اٹھنے والی آگ کی تپش اسے تمتمائے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں بتی جل رہی تھی۔ لالٹین تو جیسے اندھیری پڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر عجب مذاق اڑاتی ہوئی سی مسکان تھی۔ بال دونوں طرف لٹوں کی صورت میں پڑے تھے۔ وہ چادر اتار کر ململ کا دوپٹہ اوڑھ چکی تھی۔ دونوں گھٹنوں کو موڑے' سامنے چکلا بیلن رکھے وہ روٹی پکانے میں مصروف تھی۔ دفعتاً گلو چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر سب کچھ تھا' سوائے دکھ یا غم کے۔ اصولاً تو اسے دکھی ہونا چاہیے تھا۔ کل ہی تو اس کی خالہ مری تھی۔ پتہ نہیں اس کی اپنی ماں کہاں تھی۔ نہ اسے خالہ کے مرنے کا دکھ تھا نہ اپنی ماں کی فکر۔ وہ تو ایسے ان لوگوں کے گلے پڑ گئی تھی جیسے جنم جنم کا ساتھ ہو۔ گلو کو پہلی بار خیال آیا کہ یہ یہاں کیوں ہے؟ ٹھیک ہے کہ چاچا اسے بہو بنانا چاہتا تھا۔ خالہ سے ذکر بھی کیا ہوگا مگر اس نے ہاں تو کی ہی نہیں تھی پھر یہ کیسا اعتماد ہے جو اسے یوں بے نیاز کیے ہوئے تھا۔

اور عین اسی لمحے ایک معصوم سا' آنسو بھری آنکھوں والا چہرہ اس کے سامنے گھوم

گیا۔ جس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں یوں جم گئی تھیں جیسے لوہے کی سلاخیں ہوں۔ ہونٹوں کے انتہائی جانب ایک دانہ تھا اور اس کے گرد کا حصہ لال ہو کر سوجا ہوا تھا۔ میلی سی چادر میں لپٹا ہوا چہرہ اس کے اتنے قریب آگیا کہ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ جانے وہ کون تھی اور کہاں سے آئی تھی اور کہاں تھی مگر اپنا چہرہ گلو کے دماغ میں ہی چھوڑ گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" چاچا چونک اٹھا۔

"یہ............" گلو نے باورچی خانہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ کب تک رہے گی؟"

"کیوں............؟" چاچا نے تیوری پر بل ڈال لیے۔ "تجھے کیا فکر ہے اس کی؟"

چاچا کا مخصوص انداز عود کر آیا تھا۔

"ہم ان حالات میں اسے کہاں لادے پھریں گے؟" گلو نے چاچا کی طرف کروٹ بدل کر لہجہ دھیما کر لیا۔

"کون سے حالات............؟ اب تو نوکری کرے گا۔ یہیں رہے گا اور............ اور اس سے نکاح کرے گا۔" چاچا نے یوں جواب دیا جیسے گزشتہ دنوں میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"بیکار باتیں نہ کر چاچا۔ میں نکاح کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" وہ آخری بات سن کر بے وجہ ہی جھلا گیا حالانکہ پہلے یہی بات سن کر اسے پھلجھڑیاں سی چھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔

"نکاح کرنے کی کوئی خاص پوزیشن نہیں ہوتی۔" چاچا نے اسی کے سے انداز میں جواب دیا پھر دھیمے انداز میں بولا۔ "گلو تیری بچت اس میں ہے۔ یہاں نازاں سے شادی کر کے نئی زندگی شروع کر دے فوراً............"

"اور جو استاد فتح کے قتل میں پکڑا گیا تو؟"

"اللہ نہ کرے............ ویسے مجھے یقین ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے گلو کہ اب برے دن چھٹ گئے ہیں۔"

"پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ نکاح بھی کر لیا جائے اور............ اور میں اس سے نکاح نہیں کروں گا۔" یہ وہ نہیں' کوئی اور اس کے اندر سے بولا تھا جس نے خود گلو کو بھی چونکا دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ابے دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ اب بھی انہی ہواؤں میں ہے۔ کوئی راجکماری بیاہے گا تو؟"

"دیکھ چاچا۔ میں جب تک اس مصیبت سے نکل نہیں جاتا شادی نہیں کر سکتا۔"

"اچھا چپ کر.......... وہ آ رہی ہے مگر ایک بات کان کھول کر سن لے۔ اس کا کوئی نہیں ہے۔ خالہ ہے پر وہ اب وہاں صرف تیری وجہ سے نہیں رہ سکتی۔" اس بات پر گلو کو یاد آگیا کہ چاچا کو خالہ کے مرنے کی خبر ہی نہیں۔

"میں تو اسے بھی یہاں بلوا لوں گا۔ دھوم دھڑکے کی ضرورت ہے نہ حالات۔ فرض ادا ہونا ہے۔ چپ چپاتے ہو جائے بس۔ اپنے سارے ارمان اس وقت نکالنا جب سکون ہو جائے۔" اس نے جملہ ختم کیا ہی تھا کہ نازاں تھال لئے سر پر آ پہنچی۔

"کون سے ارمان چاچا.......... کیسے ارمان.. کس کے ارمان؟"

"تیرے ارمان اور کس کے؟" گلو نے جل کر جواب دیا۔ چاچا کی بات اسے اتنی بری نہیں لگی تھی جتنی نازاں کی باتیں بری لگ رہی تھیں۔ صرف اس لئے کہ چاچا تو خالہ کی موت سے ناواقف تھا پر اسے تو سب پتہ تھا' وہ افسردہ کیوں نہیں تھی۔ اسے کون سے خزانے مل گئے تھے جو شوخی اس کی پور پور سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔ چہرے پر دکھ کا سایہ تک نہ تھا۔

"ایسی بے حس لڑکی کو بیوی بنا لوں گا میں؟ یہ تو میری موت پر بھی افسردہ نہ ہوگی۔ میرے حالات پر بھی ذرا تو تشویش نہیں ہے اسے۔" گلو نے تھال میں سے پلیٹیں اٹھاتے ہوئے سوچا۔

"کچھ نہیں بٹوا۔ چل چھوڑ۔ تو بھی تو تھک گئی ہو گی ناں! آ جا روٹی کھالے۔" چاچا نے بڑی لگاوٹ سے اسے دیکھا۔

"ہاتھوں پر آٹا لگا ہے' دھو لوں۔ تم شروع کرو۔" اتنا کہہ کر نازاں نلکے کی طرف بڑھ گئی۔

"کتنے برسوں کے بعد گھر کی روٹی ملی ہے۔" چاچا نے حسرت سے روٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسی روٹی.......... ایسی روٹی کھائی تھی پر.......... اس کی خوشبو.......... تیری ماں بھی تو ایسی ہی روٹی.........." چاچا کچھ کہتے کہتے گھبرا کر ایک دم چپ ہو گیا۔ اس نے

پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلو کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"گلو.......... بیٹا معاف کر دینا مجھے' اب اس چبوترے کے چکر میں کراچی نہ پہنچ جانا۔"

گلو بے ساختہ ہنس پڑا۔ "اب وہ احساس نہیں ہوتا چاچا۔" اس نے ہنسی کو گھونٹ کر جواب دیا۔ "اس چبوترے کی محبت ماں کی محبت سے بڑھ کر ہے پر اب وہاں جانا.......... اور ماں.......... ماں تو.........." وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

"ہاں.......... کیا کہہ رہا تھا تو؟" وہ گھبرا گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں.......... چھوڑ اس بات کو.......... پھر تو کہے گا کہ ہر لنگڑی تیری ماں نہیں ہے۔"

"تو کون سا غلط کہوں گا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ دنیا کی ہر لنگڑی اور خوبصورت عورت تیری ماں ہے؟" اب وہ جھنجھلانے لگا تھا۔ چبوترے پر جا کر رونے کا خوف جو زائل ہو گیا تھا اور یوں بھی گلو کا آج کا رویہ اس کے لیے قطعاً اجنبی تھا۔ اس سے پہلے تو وہ ماں باپ کے ذکر پر مرنے مارنے پر تل جایا کرتا تھا۔

"ٹھیک ہے چاچا۔"

"اچھا اب چپ ہو کر روٹی کھالو۔ سارا کھانا ٹھنڈا ہو گیا۔" نازاں اتنی بے باکی سے اس کے پہلو میں آ کر بیٹھی کہ گلو کے پیر سے پیر ٹکرانے پر گلو کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ بے اختیار دوسری طرف سرک گیا۔

کھانا واقعی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ گلو کو بھوک تھی مگر جانے کیوں بہت سی ایسی باتیں ہو چکی تھیں کہ اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اس نے پیٹ بھرنے کو چار نوالے کھا لئے جبکہ چاچا یوں جھوم جھوم کر کھا رہا تھا جیسے ساتھ ہی ساتھ قوالی بھی سنتا جا رہا ہو۔ اس پریشانی میں بھی بلا کا سکون اس کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ آنکھوں میں خوشی بھی تھی۔ وہی آنکھیں نازاں کی طرف اٹھتیں تو شفقت لٹانے لگتیں۔ پل بھر کو گلو پسیج گیا۔ اسے چاچا پر ترس آنے لگا۔ بے چارہ گھر کی روٹی اور گھر میں عورت کی موجودگی کو ترس گیا تھا۔ کب سے پیچھا پکڑے ہوئے تھا کہ شادی کر لے۔ محض گھر کے سونے پن کو ختم کرنے کے لیے۔ خود تو جانے کیوں شادی نہ کی ورنہ یہی گھر بھرا ہوتا مگر شاید.......... تب گلو یہاں نہ ہوتا۔

گلو نے سر جھٹک کر بات ختم کرنا چاہی مگر ایک سفید پردہ سا کھنچا جا رہا تھا جس پر سوم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرہ' آنسوؤں کی لکیریں' لنگڑی عورت اور وہ چبوترا باری باری نظر آتا رہا۔

کھانا کب ختم ہوا' کب نازاں برتن سمیٹ کر لے گئی اور کب وہ بستر پر لیٹا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ احساس اس وقت ہوا جب برابر کی چارپائی کسمسائی اور اس کے بان چیخ اٹھے۔ گھر میں گہرا سناٹا اور اندھیرا تھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی یا بجھا دی گئی تھی' اسے یاد نہیں تھا۔ عجیب خواب کا سا عالم تھا۔ چاچا کے خراٹے ہلکی سی تھرتھراہٹ بن کر سماعت میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ سو کر جاگا تھا یا ابھی تک مسلسل جاگ رہا تھا یا شاید غنودگی میں رہا ہو۔ اس کے برابر کی چارپائی پر چاچا سو رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر چارپائی ترچھی ڈالے نازاں بے خبر تھی۔

اس دبلی پتلی' کبوتر کے پیروں ایسے پیر والی نازک سی لڑکی سے پوری چارپائی بھری ہوئی تھی۔ پائینچے پنڈلیوں تک چڑھے ہوئے تھے۔ بھرا بھرا بے پرواہ سا بدن ریت بن کر گلو کی آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا۔ گلو نے گھبرا کر کروٹ بدل لی۔ اسے اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا اگر ستاروں کی روشنی میں بھی اس کی آنکھیں اتنا تیز نہ دیکھ پاتیں ورنہ تو گہرا اندھیرا تھا۔ گوری پنڈلیاں نظر بھی آتیں تو پنڈلیاں کب لگتیں اگر گلو نے سارے بدن کی نگاہوں سے پیائش کر کے یہ اندازہ نہ لگایا ہوتا کہ پیروں پر پڑی چادر میں سے جھانکتی ہوئی چاندی ایسی گول مٹول' گدرائی ہوئی چیز پنڈلی ہی ہو سکتی ہے۔

وہ کروٹ لے کر احسان اللہ کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرنے لگا' پھر جب دماغ سے احسان اللہ کا وجود پھسل پڑا تو وہ امام دین کے بارے میں سوچنے لگا۔ "وہ کب آئے گا۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ احسان اللہ نے اسے گھر بھی دلا دیا اور وہ پہلی بار تیسری چارپائی خرید کر لایا اور ساری چارپائی نازاں کے دبلے پتلے وجود سے بھر گئی اور ستاروں کی روشنی اتنی تیز کب ہوتی ہے کہ پنڈلیاں بھی صاف دکھائی دے جاتیں پھر اتنی دبلی پتلی لڑکی سے چارپائی کیسے بھر گئی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ لگتی ہے اور ایسی گدرائی ہوئی پنڈلیاں! پتہ نہیں اسماعیل کا کیا ہوا۔ مخبری نہ ہو گئی ہو۔ وہ نوکری کر لے گا پھر چاچا.......... شادی کو کہے گا.......... مگر خالہ مر گئی اور یہ لڑکی.......... اس کے ہونٹوں پر پھوار سی کیوں محسوس ہو رہی تھی جب روٹی پکا رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں.......... تیل تو لالٹین میں ڈالا تھا' بتی آنکھوں میں بھڑک اٹھی تھی.......... کیسے دھم سے پاس آ بیٹھی تھی۔ پیر میں

کرنٹ.......... اوہ.........." وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حلق ایک دم یوں خشک ہو گیا جیسے وہ میلوں دور سے بھاگتا ہوا آیا ہو۔ وہ گھڑے کی طرف بڑھ گیا۔ کٹورا بھر کے پانی نکالا اور سب سے پہلے ہونٹ پانی میں ڈال کر گھونٹ بھرے بغیر ٹھنڈک اور نمی کو محسوس کرنے لگا۔

"اے.........." اسے سرگوشی سنائی دی۔

اس کا کٹورے والا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سر اٹھائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"مجھے بھی دینا پانی۔"

گلو نے قطعی اخلاق برتے بغیر کٹورا ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔ جی تو چاہا کہہ دے "خود پی لے۔" مگر بک بک کرنے سے چاچا اٹھ جاتا۔ پتہ نہیں کتنے دن بعد تو وہ پیر پسار کر سویا تھا۔ بڑھاپے کی کچی نیند ہوتے ہوئے بھی وہ بے خبر تھا۔ اس کے جاگ جانے کے خوف سے گلو چپ چاپ کٹورا بھر کے اس کی چارپائی تک چلا گیا۔ وہ سر اٹھائے اسی پوزیشن میں لیٹی تھی۔ نہ تو اس نے پنڈلیوں پر چڑھے ہوئے پائینچے نیچے کیے تھے نہ چادر سے ڈھکے تھے۔ پانی کا کٹورا دیتے دیتے اسے کئی بار بجلی کے جھٹکے لگے۔ نگاہیں جب بھی گدرائی ہوئی چاندی سے ٹکراتیں' جھٹکا سا لگتا۔ پتہ نہیں اس نے کٹورا کب اس کے ہاتھ سے لیا پھر گلو کو لگا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ پانی گھونٹ گھونٹ اس کے حلق سے اتر رہا تھا اور چاندی گدرائی جا رہی تھی۔

"جلدی کر۔" اس کے گھونٹ گھونٹ پانی پینے سے وہ چڑ گیا۔ اس کا کھڑا رہنا محال ہو رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پانی پی رہی تھی۔

"لے.........." اس نے جھٹکے ہی سے کٹورا تھما دیا۔ "جلدی کرنے سے پھندا لگ جاتا ہے۔ پانی پینے کا مزہ بھی نہیں آتا۔ تری نہ آئے تو خشک حلق تر کیسے ہو؟ تیری طرح پیتی کیا کہ کٹورا منہ سے لگایا اور دھار اندر انڈیل لی۔ اونہہ.........." وہ بڑبڑا کر لیٹ گئی اور کسی ہوئی چارپائی جیسی جھلنگا ہو گئی۔

رات ساری گزر گئی۔ بار بار استاد فتح کے چہرے کے ساتھ نازاں کی [illegible]ڈلیاں اور امام دین کے دیئے ہوئے پیسے یاد آتے رہے۔ کبھی کبھی چاچا کے کاندھوں [illegible] نکلی ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہڈیاں' لنگڑی عورت اور آنسوؤں کی لکیریں بھی نظر آتی رہیں۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ یہ سب کچھ خواب میں دیکھتا رہا یا جاگتے میں۔ صبح پتہ نہیں کب تک سوتا رہا۔ برتن کھنکنے کی آواز کے ساتھ ہی کہیں دور سے کسی کی ہنسی کی آواز بھی اسے بار بار غنودگی سے کھینچ کر لاتی رہی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے پھر اسے نیند میں دھکیل دیتے تو ایسا لگتا جیسے ساری آوازیں گہرے کنویں گرتی جا رہی ہیں۔

"گلو.......... ابے او گینڈے.........." چاچا کے چیخنے کی آواز آج اسے پہلی بار اچھی لگی۔ "اٹھے گا یا نہیں۔" اس بار چاچا کی آواز میں محبت تھی۔ آواز کی چاشنی ٹھنڈی ہوا میں گھل کر اسے تھپکیاں دینے لگی مگر اسی لمحے نازاں کی ہنسی کی آواز اسے اپنے تکیے میں بجتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"اٹھ بٹوا۔ دن چڑھ گیا۔ احسان بابو نے آدمی بھیجا تھا۔ میں تو تجھے اٹھا رہا تھا پر اس نے کہا بابو نے کہا تھا اگر جاگ رہا ہو تو بلانا' سو رہا ہو تو سونے دینا۔ جا کر دیکھ شاید کام کی بات کرنا ہو۔"

چاچا بولتا رہا اور وہ اٹھ کر منہ دھونے چلا گیا۔ یہاں مسئلہ پانی کا تھا۔ دو وقت پانی آتا تھا۔ صبح اور شام۔ گھر میں پانی بھرنے کو برتن پورے نہ تھے۔ بالٹی میں بہت کم پانی تھا۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا کہ نہا لے' تولیہ کاندھے پر ڈال کر وہ نہانے ہی کے پروگرام سے اٹھا تھا مگر نازاں نے بھنویں چڑھا کر اسے اطلاع دی تھی کہ یہاں نہانے کے لئے صرف چلو بھر پانی ہی ہے۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر پھر چارپائی پر آ بیٹھا۔

"اتنے دنوں میں بس ایک کام تو نے کیا تھا۔" چاچا نے نازاں کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ پکڑتے ہوئے کہا۔

گلو نے سوالیہ نگاہوں سے چاچا کی طرف دیکھا پھر کن انکھیوں سے نازاں کو دیکھنے لگا جو اس قدر بے باکی سے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ خالہ کے گھر پہلے دن وہ جس لڑکی سے ملا تھا وہ نازاں نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں تو بلا کی حیا تھی۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں مگر یہ نازاں.......... یہ تو کوئی اور ہی تھی۔ کسی اور ہی طرح کی۔

"ٹیکسی چلانے کا کام.......... میرا مطلب ہے کہ ڈرائیوری.......... اب اس کام کو کر لے۔ زندگی بھر کہتا رہا کہ ٹھیلا لگا لے۔ محنت کے پیسے میں برکت ہوتی ہے بیٹا۔ محنت

میں عیب نہیں ہوتا۔ اب یہ بتا کہ یہاں تو تجھے میرے ٹھیلا لگانے پر اعتراض نہیں ہوگا ناں۔" چاچا اس کے اندر کی کیفیت سے بے نیاز بولے جا رہا تھا۔

"بیکار باتیں مت کرنا چاچا۔ یہاں عزت سے رہنے دے۔ نئی جگہ ہے' نئے لوگ ہیں۔ تو چپکا بیٹھا رہ' میں ڈرائیوری کروں گا تو دو وقت کی روٹی مل جائے گی۔" گلو کے نتھنے پھول پھول کر پچکنے لگے۔ چاچا ایک دم ہی چپ ہو گیا۔ "اس کا کیا ہوگا؟" گلو کچھ دیر چپ رہ کر پھر بولا۔

"کس کا؟" چاچا نے چائے کا گھونٹ بھر کر حیرت سے پوچھا۔

"اس کا۔" گلو نے اس بار تکلف کیے بغیر نازاں کی طرف اشارہ کیا۔ نازاں پراٹھا پکاتے ہوئے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے آٹے سے سنے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی ماتھے پر رگڑ کر پسینے کے قطرے پونچھے۔ بالوں کی لٹ جھٹکے سے پیچھے کی اور جلتی ہوئی لکڑی کو چولہے میں توڑ دیا۔

"اس کا.......... اچھا اس کا۔" چاچا نے ہنس کر جواب دیا۔ "میرا ارادہ ہے کہ اس کا اب اور کچھ نہ کروں بس نکاح کر دوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ خالہ کو اس گھر کا پتہ نہیں اور تو یا میں وہاں جا نہیں سکتے۔" اتنا کہہ کر اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا اور دھوتی کا پلو الٹ کر اس سے منہ پونچھ لیا۔

"کیا.......... نکاح.......... اس کا.......... کس سے اور یہ خالہ.......... کون ہے؟"

گلو گڑبڑا گیا۔

"باؤلا تو نہیں ہو گیا تو۔ اب خالہ کون ہے' یہ بھی میں بتاؤں گا تجھے۔ ابے نازاں کی خالہ.......... وہ آ جاتی تو اچھا تھا۔ میں تو رسموں کا قائل نہیں ہوں پھر بھی.......... ویسے تو یہ ابھی تک اسی کی امانت ہے۔"

"تو نے بتایا نہیں چاچا کو۔" گلو چاچا کا مطلب سمجھ کر اکھڑ گیا۔ وہ نازاں پر برس پڑا۔ روٹی پلٹتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک دم جلتے توے کو چھو گیا تھا یا گلو کی بات نے اسے اچھل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سسکاری بھر کر اس نے دونوں ہاتھ اپنی گود میں چھپا لئے تھے۔

"کیا.......... کیا نہیں بتایا؟" چاچا نے پہلے اسے اور پھر نازاں کو دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نازاں نے آنکھیں پٹ پٹا کر جھکا لی تھیں مگر اس سے پہلے اس نے دانت کچکچا کر گلو کو گھورا تھا اور چاچا نے اسے ایسا کرتے دیکھ لیا تھا۔ "کیا بات ہے گلو.......... تو بتا.......... بات کیا ہے؟" چاچا ایک دم پریشان ہونے لگا تھا۔

لمحہ بھر کو گلو کو خیال آیا کہ وہ بات کو گول کر جائے مگر اسی لمحے میں اس نے ہزاروں دوسری باتیں سوچ ڈالیں' وہ جانتا تھا کہ خالہ کی موت کا پتہ نہ چلا تو وہ اسے امانت سمجھ کر زندگی بھر گلے سے لگائے رکھے گا۔ جس طرح اس نے خود گلو کو سینے سے لگا رکھا تھا اور خالہ کے مرنے کا پتہ چل گیا تو اس کے ماں باپ کی فکر کرے گا۔ بغیر کسی رشتے ناتے کے' اس کا گھر میں رہنا یوں بھی عذاب بن جاتا۔ آج تو یہاں پہلا دن تھا کل سے محلے کے لوگ تاک جھانک شروع کر دیں گے۔ نازاں کون ہے؟ یہ فکر محلے کے ہر لونڈے کو سب سے پہلے پریشان کرے گا۔ خود وہ بھی تو یہی فکریں کرتا رہا تھا اور زمانہ کون سا اس سے جدا تھا۔

"میں نے بات پوچھی ہے۔ کیا کہہ رہا تھا تو کہ اس نے مجھے کیا نہیں بتایا؟" اب چاچا کھڑا ہو گیا تھا۔

گلو نے پل بھر کو نازاں کی طرف دیکھا' وہ سیدھے ہاتھ کی انگلی منہ میں دبائے اسے شکوے بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ گلو کا دل پسیجا' وہ بات بدلنے ہی والا تھا کہ نازاں بول اٹھی۔

"ایسی خبریں دینا تجھے ہی اچھا لگتا ہے۔ شرم تو نہیں آئے گی ناں تجھے۔ تیری ہی خاطر تو وہ.........."

پتہ نہیں کتنا زہر تھا اس کی آواز میں یا پتہ نہیں' گلو کو ہی وہ کڑوی لگنے لگی تھی۔ ایک دم جی اکھڑ گیا تھا یا اس کے اندر بیٹھا کوئی اسے بے وجہ نازاں سے ڈرا دھمکا رہا تھا۔ اکسا رہا تھا کہ اسے فوراً خود سے دور کر دے۔

"ابے سر پھاڑ لوں گا میں اپنا۔ مجھے بات بتا۔" چاچا نے پاس رکھا تالا اٹھا کر سر سے بلند کر لیا۔ اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ شاید اس نے ان دونوں کے چہروں سے دکھ کی وہ کرچیاں چن لی تھیں جنہیں دونوں ہی چھپائے ہوئے تھے۔

"بتا دے.......... تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ میں تو.......... میں تو بھلائے ہوئے تھی۔ یاد کروں گی تو بہت روؤں گی اور روؤں گی تو.......... یہ' یہ چاچا.........." وہ رو پڑی۔

گہرا سناٹا گلو کے اندر اترتا چلا گیا۔ "چاچا.......... بیٹھ جا۔" اس نے چاچا کے دونوں کاندھوں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔

"گلو.......... بیٹا.......... سب ٹھیک ہے ناں؟" چاچا نے یوں پوچھا جیسے اسے سب کچھ پتہ چل چکا ہے۔

"خالہ مر گئی تھی' چاچا۔" گلو نے جلدی سے کہہ کر سر جھکا لیا۔

"کیا کون.......... مر گئی تھی۔ یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ خالہ...؟ وہ بھلی چنگی تو تھی۔ نہ گلو ایسے مذاق نہیں کرتے۔ دیکھ اگر تو نازاں کو زبردستی لایا ہے' میرا مطلب ہے کہ بھگا کر لایا ہے تو بھی.......... تو بھی میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ ارے میں تو اسے پہلے ہی تیرے واسطے مانگ چکا تھا۔ یہ تو تھی ہی تیری.......... بس ایسی باتیں نہ کر۔ وہ اچھی عورت ہے بیٹا' تجھے برا بھلا بھی تو تیرے بھلے کو کہتی تھی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔"

نازاں اٹھ کر چاچا کے قریب آ گئی تو گلو تیزی سے اندر کمرے میں چلا گیا۔ اس میں حوصلہ ہی نہیں تھا چاچا کے آنسو دیکھنے کا ورنہ خالہ سے تو اسے بچپن سے ہی چڑ تھی۔ وہ مردانہ ہاتھ پیروں اور کرخت آواز والی عورت اسے کبھی اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کی موت کا بھی اسے کوئی دکھ نہیں تھا' صرف یہ بات کانٹے کی طرح دل میں چبھی رہ گئی تھی کہ اسے مارنے یا موت کے منہ میں دھکیلنے والے استاد فتح کے بدمعاش تھے اور ایسا انہوں نے گلو کی وجہ سے کیا تھا۔

پتہ نہیں نازاں نے چاچا کو کیا بتایا؟ کیسے بتایا؟ کیسے اس کے آنسو پونچھے' وہ تو دم سادھے کمرے میں دبکا رہا۔ کافی دیر گزرنے کے بعد نازاں نے دروازہ بجایا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ نازاں کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی ہوں گی۔ وہ نہ جانے کب سے یہ غم دل میں سنبھالے بیٹھی تھی۔ چاچا کی وجہ سے رو بھی نہ سکی تھی اور خود اس کے پاس آ کر کتنا روئی تھی۔ اب جی بھر کر روئی ہو گی۔ پتہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں اس کے ماں باپ کیسے تھے کہ بیٹی اٹھا کر خالہ کے حوالے کر دی تھی۔ اکیلی عورت کے لئے لڑکی کا سنبھالنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا۔ کچھ بھی تھا۔ اسے خالہ نے پالا تھا اور یہ غم نازاں کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہوگا مگر دروازے میں کھڑی نازاں کی آنکھوں میں ستارے ٹوٹ کر بکھرے ہوئے تھے۔ نچلے ہونٹ کا کونہ دبا ہوا تھا اور وہاں سے ہلکی سی مسکراہٹ جھانک رہی تھی۔ "کہیں اس نے جھوٹ تو نہیں بولا؟" ایک خیال بجلی کی طرح گلو کے دماغ میں کوندا مگر پھر اس نے خود ہی اس کی تردید کر دی کیونکہ خالہ کی موت کی اطلاع دینے والا خود امام دین تھا جو نازاں کو لے کر آیا تھا۔ وہ بھلا جھوٹ کیوں بولتا۔

"چل ناشتا کر لے............ تجھے شاید بھوک نہ ہو مگر مجھے بہت بھوک لگی ہے۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

"ایں............" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی حیرت کا اظہار کر بیٹھا۔ "تجھے خالہ کی موت کا ذرا سا بھی دکھ نہیں ہے؟"

"کسی کی بھی موت کا دکھ نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات مجھے خالہ ہی نے سمجھائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اللہ کے بندے دنیا میں لوگوں کے پاس اس کی امانت ہوتے ہیں۔ امانت رکھنے والا اگر امانت واپس لے لے تو دکھ نہیں کرنا چاہیے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں اس نے جو اصل میں تو تجھے سمجھانے والی تھیں' اس وقت تو بھوک بہت ہے۔ جلدی چل۔"

گلو کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ خالہ مرگئی ہے۔ صرف دو روز پہلے............ وہ چپ چاپ اٹھا اور کمرے سے باہر آگیا۔ چاچا اداس ضرور تھا مگر جو کچھ گلو سمجھ رہا تھا ویسا نہیں تھا۔ نہ تو اس نے اس بات پر ہنگامہ کیا کہ وہ گلو کی وجہ سے مری ہے اور نہ اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پتہ نہیں نازاں نے ایسا کیا کہہ دیا تھا۔ "بھاڑ میں گئی خالہ اور اس کی بھانجی۔" گلو کا دماغ ہلکورے کھانے لگا تو اس نے جھلا کر سوچا۔

چارپائی پر پراٹھے اور چائے کے پیالے رکھے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکا کر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔ چاچا نے بھی چند نوالے لئے پھر کلی کرنے چلا گیا۔ گلو تو ناشتا کرتے ہی کمرے میں جا گھسا۔ امام دین کے دیئے ہوئے روپے اب تک اس کی انٹی میں تھے۔

انہیں چھپا کر رکھنا ضروری تھا۔ اتنی بڑی رقم وہ ساتھ لئے نہیں پھر سکتا تھا۔ چمڑے کا ایک بیگ احسان بابو نے اپنے کچھ جوڑے رکھ کر اسے بھجوایا تھا' گلو نے پانچ سو روپے نکال کر باقی تمام روپے اس میں رکھ دیئے۔ بالوں کو اچھی طرح جمایا۔ کپڑوں پر نگاہ ڈالی۔ کپڑے صاف تھے۔ اسے اچھا نہیں لگا کہ وہ احسان بابو کے گھر اسی کے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ آج شام کو وہ اپنے اور چاچا کے دو جوڑے ضرور خریدے گا۔

وہ کمرے سے تیار ہو کر نکلا تو چاچا دیوار کے سائے میں چارپائی ڈالے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نازاں برتن دھو رہی تھی۔ آنگن میں گہری خاموشی تھی۔ گلو چاچا کو بتا کر احسان بابو کی طرف چل پڑا۔

☆============☆============☆

اس نے گیٹ کے دائیں جانب لگی کال بیل دبائی۔ تھوڑی ہی دیر میں احسان بابو نے گیٹ کھول دیا۔ "آؤ گلو! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"معاف کیجئے گا احسان بابو۔ بہت تھک گیا تھا۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم جس چکر سے نکل کر آرہے ہو' مجھے اندازہ ہے کہ رات تمہیں کتنی اچھی اور گہری نیند آئی ہو گی۔ میرا بھائی............ میرا بھائی تو دو تین دن تک بے سدھ پڑا سوتا رہا تھا۔"

وہ پتہ نہیں کیا سمجھ رہا تھا۔ گلو نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چپ چاپ اندر جا کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں اپنی کمپنی لے چلتا ہوں۔ وہاں تمہارے لئے بات کروں گا۔ ڈرائیونگ لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں جی............ گاڑی چلانا تو آتی ہے پر............ لائسنس............ اور احسان بابو میں نے اکیلے زیادہ گاڑی نہیں چلائی۔ بس یونہی آتی ہے۔ ابھی تو سیکھ رہا تھا۔" گلو نے صاف گوئی سے ساری بات بتا دی۔

"ہوں تو گویا تم ڈرائیونگ نہیں کر سکتے۔"

"کچھ دن اگر سکھا دی تو............" گلو جھجک کر خاموش ہو گیا۔ "ویسے جانتا تو ہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر..........."

"ایسے کام نہیں چلے گا۔ کمپنی پرفیکٹ ڈرائیور چاہتی ہے۔ بہر حال کچھ سوچتے ہیں۔ امام دین نے آنے کو کہا تھا یا نہیں۔"

"کہا تو تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ کب آئے گا۔" گلو کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔ اسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ پکا ڈرائیور نہیں تھا۔ جانو نے کبھی اسے تنہا گاڑی دی ہی نہیں تھی۔ بس ایک ہی بار وہ استاد فتح کو لے کر گیا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ تم ساتھ چلے چلو۔ دیکھیں گے کہ کمپنی میں ہی کسی کام سے لگا دیں۔ ویسے ڈرائیونگ سیکھ لینا۔"

احسان اللہ یہ کہہ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ایک سترہ اٹھارہ برس کا لڑکا شربت لے آیا۔ احسان اللہ جلدی واپس آنے کا کہہ کر اندر گئے تھے کچھ دیر بعد لوٹے تو بالکل تیار تھے۔ گلو نے دو تین گھونٹ میں ہی شربت کا گلاس خالی کر دیا تھا۔ احسان اللہ نے اپنی گاڑی نکالی اور وہ لوگ روانہ ہو گئے۔

وہ کوئی پرائیویٹ کمپنی تھی۔ اچھا خوبصورت آفس تھا۔ احسان اللہ اونچے عہدے پر تھے۔ ان کے پہنچتے ہی کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ گلو یہ سب دیکھ رہا تھا اور اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ کچھ بھی ہو' احسان اللہ اسے یہاں نوکری ضرور دلا دیں گے۔ وہ ان کے کمرے کے باہر پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔ احسان اللہ اسے وہاں بٹھا کر ایک دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ لوٹے اور اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ چپراسی سے کہہ گئے کہ انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ یہ کمرا بھی بے حد خوبصورت تھا۔ دبیز قالین چھت پر لٹکے فانوس' دیواروں پر آویزاں تصاویر۔ گلو ایک ایک چیز کو بغور دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بھئی' آفس پسند آیا؟" احسان اللہ کی آواز سے گلو چونک اٹھا۔

"جی........... بہت اچھا ہے۔"

"میں نے باس سے تمہارے لئے بات کی ہے۔ امید تو ہے کہ کام مل جائے گا۔ ویسے امام دین کا آنا ضروری ہے۔" ان کا لہجہ فکر مند تھا۔

"وہ تو جی پتہ نہیں کب آئے گا۔"

"خیر........... میں اسے بلوانے کی کوشش کروں گا۔ یہ بتاؤ کہ یہ اسماعیل کس قسم کا آدمی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" گلو ایک دم کہہ بیٹھا۔

احسان اللہ چونک اٹھا۔ "کیا مطلب؟ تم بتا رہے تھے ناں کہ ان لوگوں نے تمہیں اپنے دھندے میں پھنسانا چاہا تھا۔"

"ہاں جی........... مگر میں اسماعیل صاحب کے بارے میں اتنا نہیں جانتا۔ وہ........... دراصل..........." گلو کچھ کہتے کہتے جھجک گیا۔

"دیکھو گلو۔ حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔ کراچی کے بعد حیدر آباد میں بھی تخریب کاریاں ہو رہی ہیں۔ ان تخریب کاریوں میں یہی دہشت گرد ملوث ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ امن میں رہیں۔ حالات بگاڑنے سے ان لوگوں کے کیا مقاصد ہیں یہ ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔ امام دین نے میرے بھائی کو ان کے چنگل سے بچایا تھا۔ میں آج تک اس کا احسان مند ہوں مگر میں یہ بھی نہیں بھولا ہوں کہ میرے بھائی ایسے پتہ نہیں کتنے معصوم نوجوان ہوں گے جو مجبوراً ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہوں گے۔ میں ان سب کو بچا کر امام دین کا احسان اتارنا چاہتا ہوں۔ تم میری مدد کرو۔ ملک اور قوم کا بھی تو ہمارے اوپر کچھ فرض ہے۔ ہمیں اس فرض کو ادا کرنا چاہیے۔"

"جی سر! مگر میں ان لوگوں کو نہیں جانتا۔ ہاں میں استاد فتح کو جانتا تھا۔ میں جانو کو جانتا ہوں۔ اسماعیل صاحب سے تو ابھی کچھ روز پہلے امام دین نے ملوایا تھا۔ وہ مجھ سے کام لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے امام دین سے کہا تھا کہ اسے تیار کر لو۔ دوسری طرف استاد فتح کے آدمی اور پولیس میرے پیچھے پڑی تھی۔ پولیس سے بچا کر اسماعیل نامی آدمی مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔"

"پولیس تمہارے پیچھے کیوں پڑی تھی؟" احسان اللہ نے اتنے پیار سے پوچھا جیسے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھ رہا ہو۔ پتہ نہیں اس کے انداز میں ایسی کیا بات تھی کہ گلو کو ذرا جھجک نہ ہوئی۔ وہ بولتا چلا گیا۔ شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا کر اس نے چپ سادھ لی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ احسان اللہ بھی پتھر کا بت بنا بیٹھا سن رہا تھا۔ اس خاموشی نے گلو کو پریشان کر دیا۔ وہ ایک دم ہی خوفزدہ ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ احسان اللہ ابھی پولیس کو بلا کر اسے ان کے حوالے کر دے گا یا ایک دم کھڑا ہو کر چیخے گا اور کہے گا۔ "نکل جاؤ یہاں سے۔ تم قاتل' مجرم......... تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی۔" مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ بس وہ چپ چاپ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے بیٹھا رہا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ دانیال گردیزی کون تھا اور فتح نے جو تھیلا تمہیں دیا تھا اس میں کیا تھا؟" وہ بولا تو گلو کے اندر جیسے دھماکے سے ہونے لگے۔

"نہیں......... خدا کی قسم میں نہیں جانتا تھا۔ اس نے اچانک ہی بلا کر کہا تھا کہ مجھے اس کا ایک کام کرنا ہے جس کے وہ پورے پانچ ہزار روپے دے گا۔ اس کے بعد اس نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ بس رات ہوتے ہی مجھے گاڑی میں بٹھا لیا تھا۔ اس نے اس روز گاڑی خود ہی چلائی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کس پروگرام سے جا رہا ہے۔ خدا کی قسم احسان بابو' اگر میں یہ سب کچھ جانتا تو......... میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے پیسے پر' میں پیسہ کمانا چاہتا ہوں۔ امیر بننا چاہتا ہوں مگر کسی کی جان اور عزت لے کر نہیں' اپنی محنت کے بل پر امیر بننا چاہتا ہوں۔"

"تو پھر تمہیں پہلا کام یہی کرنا چاہیے تھا کہ تم جا کر پولیس کو اطلاع کرتے۔"

احسان اللہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیسے کرتا......... جس رات اس نے میرے ہاتھ سے بم کا تھیلا رکھوایا تھا اسی رات میں نے اسے قتل کر دیا۔ بم والی بات تو مجھے پتہ ہی بعد میں چلی۔ جب امام دین مجھے لے کر اسماعیل صاحب کی کوٹھی پر گیا۔"

"ہوں......... اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"جی.........!" گلو اس کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ پتہ نہیں یہ پوچھنے سے احسان اللہ کا مقصد کیا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب تم کیا کرو گے؟ پولیس کو اطلاع دو گے یا یونہی چھپے پھرتے رہو گے؟"

"پولیس کو اطلاع دینا بیکار ہے احسان بابو۔ وہ مر چکا ہے۔ زندہ ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا۔" گلو نے تاسف سے جواب دیا۔

"گویا اب تم یونہی چھپ چھپ کر زندگی گزارو گے۔ جانتے ہو کہ قاتل کو کہیں پناہ نہیں ملتی۔ ضروری نہیں کہ تم کراچی سے یہاں آکر محفوظ ہو جاؤ۔ کراچی یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟ تم کام کرنا چاہتے ہو۔ یہاں رہ کر تم کام تو کر لو گے مگر کب تک......... ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور وہ......... کیا نام بتایا تھا تم نے استاد فتح کے آدمی کا؟"

"جانو.........!!"

"ہاں جانو۔ وہ بھی تو تمہاری تلاش میں ہو گا نا!"

"ہاں......... مگر......... میں کیا کروں؟" وہ اچانک گھبرا گیا۔

"فی الحال تم کچھ مت کرو۔ آرام کرو۔ میرا خیال ہے کہ جب تک تمہارے ذہن کو سکون نہ ہو لے' تم نوکری کی فکر بھی مت کرو۔ پیسے کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک مجھ سے مانگ سکتے ہو۔ فارغ اوقات میں تم میری گاڑی لے کر پریکٹس کر سکتے ہو۔ اب گھر جاؤ۔ کچھ مت سوچو۔ میں رات کو گھر آؤں گا پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

احسان اللہ کی باتیں سکون آور دوا کا سا اثر دکھا رہی تھیں۔ وہ جو کچھ کہتے گلو کے اندر ڈھیروں اطمینان اتر جاتا۔ وہ کسی کٹھ پتلی کی طرح سر ہلا کر کھڑا ہو گیا۔ احسان اللہ نے اپنے ڈرائیور کے ساتھ اسے گھر پہنچوا دیا۔ آنگن میں دھوپ بھری تھی۔ چاچا اور نازاں سامنے والے کمرے میں تھے۔ چاچا چارپائی پر لیٹا تھا اور نازاں چوکھٹ پر کواڑ سے ٹیک لگائے چاچا کی قمیض رفو کر رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر چاچا ایک دم اٹھ بیٹھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"کیا ہوتا؟" نازاں کی ترچھی نگاہوں نے گلو کو ایک دم سلگا دیا تھا۔ اس نے برابر کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں' کہ کام کا کیا ہوا؟ احسان بابو نے کیا کہا؟" چاچا اب چارپائی سے پاؤں لٹکا کر بیٹھ چکا تھا۔

"انہوں نے کہا ہے کہ کچھ دن آرام کرو۔ ویسے رات کو وہ آئیں گے۔ امام دین کو کیسے پتہ ہو۔" وہ خود کلامی کرنے لگا۔

"کس کا کیسے پتا ہو......... کون امام دین؟" چاچا بالکل سٹھیا گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہی امام دین جس نے ہمیں یہاں بھیجا ہے۔" وہ جھنجلا گیا۔ "کیا ہو گیا ہے تجھے چاچا؟"

"اچھا اچھا............ وہ............ لیکن ایک بات بتا دوں گلو۔ مجھے آدمی وہ بھی کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا۔" چاچا نے اتنا کہہ کر گلو کو دیکھا۔

اور گلو چپ کا چپ رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ ان پڑھ بڈھا کتنا تیز ہے۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی جیسے سب کچھ جان جاتا تھا۔ یہی باتیں اس نے استاد فتح کے لئے کہی تھیں جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں اور امام دین بھی کون سا مولانا تھا۔ وہ جیسا تھا گلو کو پتا تھا اور پھر یہ بات تو وہ خود ہی مان چکا تھا کہ اسماعیل کے لئے کیا کام کرتا ہے۔ وہ کام زیادہ سنگین نہ سہی تھا تو غیر قانونی۔ وہ کیا کیا کر چکا تھا یہ گلو کو نہیں پتہ تھا مگر اتنا اندازہ اسے ضرور تھا کہ کام ٹھیک نہیں ہوگا۔ پتہ نہیں اسماعیل وغیرہ کون تھے اور کیا کرتے تھے' اور وہ دانیال گردیزی............ "پتہ نہیں کیا چکر ہے؟" وہ چاچا اور نازاں کو بھول کر بڑبڑایا۔

"کیسا چکر؟" چاچا کے کان اس کی طرف لگے ہوئے تھے۔

"کچھ نہیں............ ایک تو بندہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتا۔" وہ تلملا گیا۔

"تو بندہ زبان سے سوچے گا تو زمانہ سنے گا۔" نازاں نے دھاگا منہ میں لے کر توڑتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا تو چپ رہا کر۔ اسے سمجھالے چاچا' میرے منہ نہ لگا کرے۔"

"اس نے کیا کہہ دیا؟ بالکل باؤلا ہو گیا ہے کیا؟" چاچا نے الٹا اسے جھڑک دیا پھر نازاں سے چائے بنانے کو کہا۔ وہ دھاگا سوئی سمیٹتی ہوئی' کن انکھیوں سے گلو کو دیکھتی ہوئی باہر چلی گئی۔

"گلو............ بیٹا! میں............ مجھے بے کلی ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں لگتا ہے جیسے کچھ گڑبڑ ہے۔ کوئی چکر و کر ہے۔" چاچا کی آواز خوف میں بھیگی ہوئی تھی۔

"کیا مطلب؟"

"یہ احسان اللہ اتنا مہربان کیوں ہو گیا۔ امام دین سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس کی خاطر اس نے اتنا کچھ یہ جانے بغیر کر دیا کہ ہم ہیں کون............ اور امام دین سے ہمارا کیا

ناتہ ہے۔ دیکھ لے گلو............ مجھے دنیا پر اعتبار نہیں ہے۔ میں کئی بار ڈسا گیا ہوں۔ بہت اپنے لوگوں نے ڈسا ہے مجھے۔ میں نے دنیا کو کبھی ایسا دیکھا نہیں ہے جیسی یہ اب نظر آ رہی ہے۔ میری مان' تو کوئی اور کام کر لے۔ احسان اللہ کے چکر میں نہ پڑ۔ یہی احسان بہت ہے کہ اس نے سر چھپانے کا ٹھکانہ کر دیا۔ اس کا بھی کرایہ دے دیا کریں گے تو بوجھ نہیں رہے گا سینے پر۔"

پتہ نہیں فرصت ملتے ہی چاچا نے کیا کیا کچھ سوچ لیا تھا۔ ہر ایک پر شک کرنے کی عادت نے اسے اتنا زہریلا بنا دیا تھا۔ گلو اس سے یہ نئی بات سن کر جھلا گیا۔ سویرے تک وہ احسان اللہ کے گن گا رہا تھا اور اب اس پر شک کر رہا تھا۔ "چاچا' ہر ایک پر شک کرنا چھوڑ دے۔" اس نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ "احسان اللہ اچھے آدمی ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ یہ مہربانی کیوں کر رہے ہیں۔ تیری تسلی بھی کرا دوں گا مگر اس وقت مجھے سونے دے۔"

"اتنی دیر میں تو سو کر اٹھا ہے' پھر سوئے گا؟"

"ہاں............ سر میں درد ہے۔" گلو نے زیادہ بحث سے بچنے کے لئے کہہ دیا اور چاچا چپ ہو گیا۔ گلو کو چاچا کی محبت کا یقین تو ہو ہی گیا تھا' وہ جانتا تھا کہ یہ سن کر وہ اسے تنگ نہیں کرے گا۔

گلو سوچنا چاہتا تھا۔ اسے ساری پریشانی یہ تھی کہ اس نے احسان اللہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ یہاں تو امام دین بھی نہیں تھا جس سے مشورہ لے لیتا۔ چاچا تو جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔ نازاں سے اس موضوع پر بات کرنا ہی بیکار تھا بلکہ نازاں تو گلو کو بہت ہی کھٹک رہی تھی۔ اب پتہ نہیں کیوں چاچا اسے یہاں رکھے ہوئے تھا۔ گلو نے چاہا کہ پوچھ لے مگر اسی وقت باہر والے دروازے کی کنڈی بجی اور چاچا اٹھ کر باہر چلا گیا۔ گلو نے آنکھیں موند لیں۔

"ارے آپ............ آیئے بابو............ آیئے۔"

چاچا کی آواز سن کر گلو نے حیرانی سے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے ذرا سا سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ احسان اللہ سامنے ہی نظر آ گئے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ اسے دفتر میں چھوڑ کر آیا تھا۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے اسے چھوڑ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واپس بھی نہ پہنچا ہو گا پھر یہ کیسے آ گئے۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

"گلو آ گیا تھا؟" احسان اللہ کی آواز آئی۔ وہ فوراً ہی کمرے سے باہر چلا آیا۔

"سر آپ؟"

"ہاں بھئی۔ میں نے کہا کہ تم اور چاچا بہت پریشان رہے ہو۔ اب خوشخبری سنا کر تم لوگوں کی پریشانی دور کردوں۔ ارادہ نہیں تھا یہاں آنے کا مگر.........." وہ اب بھی دروازے میں کھڑے تھے۔

"آیئے' اندر آجایئے۔" گلو نے ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"میرے ساتھ مہمان ہیں۔" احسان اللہ نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

"تو بلایئے نا!" چاچا فوراً بولا۔

گلو بھی آگے بڑھا۔ اس وقت احسان اللہ نے پلٹ کر کہا۔ "آؤ بھئی.......... اندر آجاؤ۔"

آنے والے نے دھیرے سے دروازے کا پٹ کھولا اور اندر داخل ہو گیا..........

اسے دیکھ کر گلو اس بری طرح اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ "تم.......... تم؟"

آنے والے کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھیں' گلو کے چہرے کے آرپار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں اور گلو کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ نگاہیں اس کے کلیجے کو کاٹتی ہوئی اندر ہی اندر اسے پورے کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی ہوں۔ لمحہ بھر کی گہری خاموشی نے جیسے پورے گھر کو بگولوں کے حوالے کر دیا تھا' سوائے عجیب سی تیز سنسناہٹ کے کوئی دوسری آواز نہ تھی مگر اسی لمحے میں چاچا کی کاٹ دار آواز نے خاموشی کے ٹکڑے کر دیئے۔ "یہ کون ہیں احسان بابو؟"

"یہ..........!" احسان بابو بے وجہ سسپنس پیدا کرنے کو تھے۔ گلو کو یوں لگا جیسے وہ اس کی اس خوفناک کیفیت سے لطف لے رہے تھے جس نے اسے بری طرح دہلا دیا تھا۔

"جانو.......... تم؟" بے اختیار گلو کے منہ سے نکلا۔ اس بار اچھلنے کی باری چاچا کی تھی۔

"تو.......... تو کیوں آیا ہے؟" چاچا اپنا سکڑا ہوا سینہ چوڑا کرتے ہوئے عجیب مضحکہ خیز سی چیز بن گیا تھا۔

"ایک منٹ چاچا۔" احسان اللہ فوراً ریفری کی طرح درمیان میں آ گیا پھر وہ گلو کی طرف مڑا جو پھٹی پھٹی ہوئی خوفزدہ آنکھوں سے اب بھی استاد فتح کے ڈرائیور' جانو کو دیکھ رہا تھا۔ دکھ سے وہ کالا پڑ چکا تھا اور یہ دکھ اسے احسان اللہ پر بے پناہ اعتماد نے پہنچایا تھا۔ وہ بتا چکا تھا کہ وہ احسان اللہ کو ساری بات بتا کر اتنی بڑی غلطی کا مرتکب ہو چکا ہے جس کا ازالہ اب ممکن نہیں ہے۔ حیرت تو اسے اس بات پر تھی کہ اتنی جلدی احسان اللہ نے جانو کو کراچی سے حیدر آباد کیسے بلا لیا۔ کیا یہ دھوکا اسے امام دین نے دیا ہے؟ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ سوچ سکا تو اپنے گرتے ہوئے بدن کو سنبھالتے ہوئے چارپائی پر ٹک گیا۔

"گلو! ہمیں بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گے؟" احسان اللہ اس کے قریب آ گیا۔

گلو نے اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھا' کچھ بولنا چاہا مگر حلق میں جیسے گولا سا اٹک کر رہ گیا تھا۔

"بیٹھیں جی.........." نازاں نے دوسری چارپائی گھسیٹ کر قریب کر دی۔ چاچا ابھی تک کسی مرغی کی طرح گردن کو جھٹکے دے دے کر کبھی گلو کی طرف اور کبھی جانو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے نتھنے پھول پھول کر پچک رہے تھے۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا اور کنپٹیوں سے پسینہ بہہ کر داڑھی تک لکیری بنا گیا تھا۔

"گلو! میرا خیال ہے کہ تم بہت گھبرائے ہوئے ہو۔" اتنا کہہ کر احسان اللہ جانو کی طرف پلٹا جو اب بھی گلو کی کیفیت سے لطف اندوز ہونے والے اسٹائل میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ "بیٹھیے سر آپ۔" یہ بات اس نے جانو سے کہی تھی۔

اور گلو کے دماغ میں ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ "سر.......... سر.......... سر.........." اس لفظ کی گردان جاری تھی۔ "یہ کون ہے؟" یہ سوال پھنکار مار کر اس کے دماغ میں سنسناہٹ سی پھیلا گیا۔ جانو سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ جانو دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے اس کی جانب جھکا ہوا تھا۔

"گلو! پلیز اب تم ٹھیک ہو جاؤ۔ ہم تمہیں ایک بڑی خوشخبری سنانے آئے ہیں۔" احسان اللہ نے جانو کے بیٹھنے کے بعد اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جج.......... جی..........!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"مگر یہ یہاں کیوں آیا ہے؟" چاچا بھی شاید اسی طوفان سے گزر رہا تھا جس کی زد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں گلو تھا۔ "میرے بچے نے کچھ نہیں کیا' وہ حرامزادہ تھا ہی اسی قابل۔ میرے بچے کو بہکا کر اس کے پاس ملازمت اسی نے دلوائی تھی۔ اب یہ یہاں کیا لینے آیا ہے' میں کہے دیتا ہوں احسان اللہ اگر میرے بچے کو کچھ ہوا تو............"

"چاچا آپ بیٹھ جائیے۔" احسان اللہ نے بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا احسان بابو۔" چاچا کے ضبط کے بندھن ٹوٹے تو وہ ایک دم رو پڑا۔

"ارے ارے چاچا۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" احسان اللہ نے جلدی سے اٹھ کر چاچا کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "آپ دونوں ایک بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ میں تو............ میں تو آپ کو خوشخبری سنانے آیا تھا............ اور یہ............"

"خوب احسان اللہ' یہ خوش خبری لے کر آئے ہو تم............" چاچا نے ہتھیلی سے آنسو صاف کرتے ہوئے جانو کی طرف اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے اب سسپنس ختم کر دو۔" یہ جانو تھا جو اتنی دیر سے عجیب سی خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ "ہمارا مقصد آپ کو دکھ پہنچانا نہیں ہے۔" یہ جملہ اس نے چاچا اور پھر گلو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"گلو! یہ میجر احمد جان ہیں۔ تم انہیں جانو کی حیثیت سے جانتے ہو اس لئے خوفزدہ ہو گئے ہو۔" احسان اللہ نے پھر گلو کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں نازاں چاچا کو چارپائی پر بٹھا کر پانی کا کٹورا دے چکی تھی۔

"جی............ کیا جی؟" گلو نے چونک کر جانو کی طرف دیکھا۔ اب اس کے سپاٹ سے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر گلو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیسے ہو یار گلو؟"

"جانو............ تم............ میں............ وہ میں نے............" گلو کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا صفائی پیش کرے۔ جانو' جانو ہو یا میجر احمد خان............ اس بات سے تو واقف ہی تھا کہ استاد فتح کو گلو نے ہی قتل کیا ہے۔

"ہاں............ کیا میں نے............؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس کے ہونٹوں پر پھیلی

مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

"وہ جانو' اس نے چاچا کو گالی دی تھی۔ میں............ میں برداشت نہیں کر سکا۔ سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں جانو میں مگر............ مگر گالی............ چاچا کو............ مجھے پتہ نہیں کہ پھر میں نے کیا کیا............ میں اندھا ہو گیا تھا جانو۔ اب اگر تم چاہو تو مجھے پولیس کے حوالے کر دو' میں اپنے کیے کی سزا بھگت لوں گا مگر میں کہے دیتا ہوں جانو کہ اب بھی اگر کسی نے میرے چاچا کو گالی دی تو............ تو میں پھر قتل کر دوں گا............ بار بار کروں گا۔"

وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اور جانو اس کے سامنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے سر کو تھوڑا سا جھکائے' نگاہیں اوپر اٹھائے' چہرے پر عجیب' مذاق اڑاتی ہوئی مسکراہٹ بکھیرے اسے دیکھ رہا تھا یوں جیسے باپ اپنے کسی معصوم سے بچے کو دھمکیاں دیتے ہوئے سنتا ہے' دیکھتا ہے۔ گلو سب کچھ کہہ کر خاموش ہو گیا مگر جانو کچھ نہ بولا۔ احسان اللہ نے بھی کوئی جواب نہ دیا۔ چاچا کسی انہونی کے انتظار میں چارپائی پر ایسے بیٹھا تھا جیسے کچھ ہوا تو لپک کر گلو کو کاندھوں پر اٹھا کر بھاگ کھڑا ہو گا۔ نازاں دم سادھے کھڑی تھی۔

"بولتا کیوں نہیں تو............ چل............ اٹھ میں خود تیرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوں گا اور سب کو چیخ چیخ کر بتاؤں گا کہ ہاں............ ہاں میں نے قتل کیا ہے استاد فتح کو............ میں نے قتل کیا ہے اس حرامی کے بچے کو جو لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے ایسے خوفناک کام لیتا تھا کہ وہ چاہیں بھی تو............"

"بس کر گلو۔" چاچا نے وحشت زدہ آواز میں چیخ کر کہا۔ "چپ ہو جا۔"

اور تبھی گلو ساکت ہو گیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ چاچا کے سامنے کیا کہنے جا رہا تھا۔ جو کچھ اس کے علم میں تھا وہی اس کی جان گھلانے کو کافی تھا۔ دانیال کی کوٹھی میں بم رکھنے والا قصہ بھی اسے پتہ چل جاتا تو جانے کیا ہوتا۔

"تم بول چکے؟" جانو نے اسی اطمینان سے پوچھا۔

"اٹھتا کیوں نہیں تو؟"

گلو بالکل بھول چکا تھا کہ احسان اللہ اس کا تعارف میجر احمد جان کے طور پر کرا چکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے یا یہ کہ وہ اسے سر کہہ رہا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی مطلب نہیں تھا کہ وہ میجر احمد جان تھا۔ گلو کے سامنے تو وہی جانو تھا جو کبھی کبھی ایسی باتیں کرنے لگتا تھا جیسے پڑھا لکھا ہو اور گلو حیرت سے سوچتا تھا کہ ایسی کون سی مجبوری تھی جس نے جانو جیسے ذہین اور پڑھے لکھے آدمی کو استاد فتح کا ڈرائیور بنا دیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ گلو۔ اب میں ایک دھماکا کرنے والا ہوں۔" اس نے پُراسرار انداز میں اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

"چھوڑیں سر............ بتا دیں۔ اب گلو کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہو چکا ہے۔" احسان اللہ نے ہنس کر کہا۔ گلو، چاچا اور نازاں تینوں ان دونوں کو حیرت سے تک رہے تھے۔

"ہاں تو گلو!" جانو نے کھڑے ہو کر اس کے کاندھوں پر اپنی ہتھیلیوں کا دباؤ ڈال کر اسے سامنے کی چارپائی پر بٹھا دیا۔ "جس آدمی کو تم نے قتل کیا تھا وہ............ وہ جیل میں ہے۔"

"کک............ کیا............ کون............ کون جیل میں ہے۔ میں نے تو............ استاد فتح کو............"

"ہاں وہی۔" جانو نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "وہی استاد فتح جس کو قتل کر کے تم بھاگ گئے تھے۔ جس کے قتل کی سزا سے بچنے کے لئے تم یہاں تک پہنچ گئے۔ وہی استاد فتح اس وقت جیل میں ہے۔"

گلو ہی نہیں چاچا بھی حیرت سے منہ پھاڑے کھڑا ہو گیا۔ "پر ہؤا............ اسے تو............ گلو نے............ وہ تو............"

"چاچا، گلو نے اسے زخمی کر دیا تھا۔ سر پہ چوٹ ایسی لگی تھی جس نے اسے بے ہوش کر دیا تھا مگر وہ مرا نہیں تھا۔ اس کے آدمی اسے فوراً ہی اسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹروں نے اسے مرنے سے تو بچا لیا مگر............ میں............ میں بہت روز سے موقع کی تلاش میں تھا۔" جانو نے دھیرے سے جواب دیا۔

بس چاچا نے اس سے آگے کچھ نہیں سنا۔ وہ بے اختیار گلو سے لپٹ گیا اور اسے ایسے چومنے لگا جیسے یہ کارنامہ اسی نے انجام دیا ہو۔

"ہٹ چاچا۔" گلو نے جھینپ کر اسے خود سے الگ کر دیا۔ وہ جانو سے کچھ اور

قریب ہو گیا۔ "جانو............ سچ کہہ............ وہ زندہ ہے؟"

"ہاں گلو۔ وہ زندہ ہے۔"

"اسے جیل میں بند رکھنا ہؤا۔ باہر آ گیا تو اسے تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔"

چاچا نے پھر گلو کا سر اپنے پیٹ سے لگا لیا۔ گلو چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور چاچا اس کے قریب کھڑا تھا۔

"اس کا باہر آنا فی الحال تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں۔ اب کچھ نہیں ہے۔ نہ گلو قاتل ہے نہ اسے یوں دربدر ہونے کی ضرورت ہے اور نہ خوفزدہ ہونے کی۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر بابو۔ میں تو کل ہی کراچی جاؤں گا۔ کیا کہوں، کیسے اینٹ اینٹ جوڑ کر وہ چاردیواری اٹھائی تھی۔ اسے چھوڑنے کا تو سوچ کر ہی کلیجہ منہ کو آتا تھا پر گلو مجھے اس چاردیواری سے زیادہ پیارا تھا اس لیے............"

"بس کر چاچا۔" گلو نے ایک دم اسے ٹوک دیا۔ "پتہ نہیں کیا کیا بولتا چلا جاتا ہے۔ اس سے کہہ چائے بنا دے۔" گلو نے چاچا سے کہا مگر اشارہ نازاں کی طرف تھا۔

نازاں نے آگے پڑی چوٹی کو جھٹکے سے پیچھے کیا اور بل کھا کر پلٹ گئی۔ گلو نے جھٹ احسان اللہ اور جانو کی طرف دیکھا کہ کہیں انہوں نے اس چھچھوری ادا کو تو نہیں دیکھا مگر وہ دونوں آپس میں کچھ بات کر رہے تھے اور وہ اتنے آہستہ کہ گلو سمجھ نہیں سکا۔

"میں بسکٹ لاتا ہوں۔" گلو کو اچانک ان لوگوں کی مدارات کا خیال آ گیا تھا۔

"تو بیٹھ............ میں جاتا ہوں۔" چاچا نے ایک دم اسے بٹھا دیا۔

احسان اللہ یا جانو نے تکلفاً بھی چاچا کو بسکٹ لانے یا نازاں کو چائے بنانے سے نہیں روکا۔ ان دونوں کے ہٹتے ہی جانو نے گلو سے کہا کہ وہ چائے پی کر ان کے ساتھ احسان اللہ کے گھر چلے۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔ گلو نے تصدیق کے لئے احسان اللہ کی طرف دیکھا جس نے ہولے سے سر ہلا کر تصدیق کی۔

"جانو............ تو قسم کھا کہ تو سچ کہہ رہا ہے۔ دیکھ میں خود پولیس کے پاس چلنے کو تیار ہوں۔ تو مجھے دھوکا مت دینا۔" گلو کی آنکھوں میں اتنی بے یقینی نہیں تھی جتنی اس کے لہجے میں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب کیا قرآن اٹھا کر کہوں۔" جانو ہنس پڑا۔ "یہ لمبی باتیں ہیں گلو اسی لیے تو تمہیں لے کر احسان اللہ کے ہاں جانا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ چاچا اور اس لڑکی کے سامنے کوئی بات ہو۔ ہر بات ہر ایک کو بتانے والی نہیں ہوتی اور ہاں.......... تم دانیال والے معاملے کا ذکر چاچا سے نہیں کرنا۔ احسان بتا رہے تھے کہ تم نے ابھی تک انہیں اس بارے میں نہیں بتایا ہے۔"

"ہاں اسے تو نہیں بتایا پر.........." اچانک گلو خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف رینگ آیا۔ "وہ.......... ان لوگوں کو میں نے نہیں.......... وہ بھی.......... جانو' وہ بھی استاد فتح نے۔"

"بس چپ رہو۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ وہ بھی جو تم نہیں جانتے۔ بعد میں بات کریں گے۔" جانو نے نازاں کو قریب آتے دیکھ لیا تھا۔

گلو چپ ہو گیا۔ نازاں قریب آ کر دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گلو کا جی چاہا کہ وہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔ کیسی بے حیائی سے آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور جب وہ پہلی بار خالہ کے پاس گیا تھا تو کیسے چادر میں چھپی جا رہی تھی۔ کیسے نظر کترا کر چولہے کے آگے سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور اب.......... ایسے سر اٹھا کر کھڑی تھی جیسے وہی اس گھر کی مالکن ہو اور ان کے قریب آ کر تو ایسے کھڑی ہو گئی تھی جیسے اس کی غیر موجودگی میں گلو گھر کے بھید کھول دے گا۔ گلو کے سر میں چک پھیریاں سی پڑنے لگیں۔

"اے.......... جا کر چائے بنا' یہاں کیوں کھڑی ہے؟" وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

"میرے وہاں بیٹھنے سے کوئی پانی میں ابال نہیں آ جائے گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ وہ گلو کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ گلو کا جی چاہا کہ کہہ دے تیرے یہاں کھڑے رہنے سے جو مجھ میں ابال آ رہا ہے' وہ تجھ پر الٹ گیا تو بری طرح جل جائے گی۔ مگر جانو اور احسان اللہ کی وجہ سے چپ ہو گیا بس اسے ایسی انگارہ آنکھوں سے گھورنے لگا کہ نازاں پیر پٹختی ہوئی واپس چلی گئی۔ ویسے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کراچی واپس لوٹنے سے پہلے ہی اسے گھر بھجوا دے گا' ماں باپ نہ ہوئے تو بھی دور پرے کا کوئی تو ہو گا۔ اس وقت گلو شکر بھیج رہا تھا کہ اس نے جذباتی ہو کر چاچا سے حامی نہیں بھری ورنہ یہ تو اس کے گلے پڑ چکی ہوتی۔ وہ اپنے غصے کو بہلنے کے لئے احسان اللہ کی

طرف متوجہ ہو گیا' جو انگریزی میں جانو سے کچھ کہہ رہا تھا۔ گلو حیرت سے گنگ رہ گیا جب اس نے جانو کو بھی انگریزی بولتے سنا۔ پھر اسے یاد آ گیا کہ احسان اللہ نے اسے میجر کہا تھا۔

"جانو.......... تو.......... تو میجر ہے؟" اس نے ان دونوں کے چپ ہوتے ہی پوچھ لیا۔

"ہاں گلو.......... میں میجر ہوں۔ بڑے عرصے سے کچھ لوگوں کی تلاش میں تھا' اسی چکر میں فتح کا ملازم بن گیا تھا۔ ہمیں جس کی تلاش تھی' مجھے پتہ چلا تھا کہ اس تک پہنچنے کے لئے فتح اہم آدمی ہے۔ میں سال بھر سے اس کی ملازمت کر رہا تھا۔ اس روز اس نے جو مجھے اسلام آباد بھیجا تھا تو میں گیا نہیں تھا۔ تم لوگوں کے تعاقب میں تھا۔ جب وہ تمہیں لے کر کلفٹن گیا تو بھی میں تم لوگوں کے پیچھے تھا۔ میں اسماعیل وغیرہ سے بھی واقف ہوں.......... بہرحال یہ بھی لمبی داستان ہے' اس وقت سنانے کا موقع نہیں ہے۔ یہ بات میں تم سے اکیلے میں کرنا چاہتا ہوں' اس امید پر کہ تم اس راز کو راز ہی رکھو گے۔ میں تمہارے لئے جانو ہی ہوں اور جانو ہی رہوں گا۔ سمجھے؟"

"ہاں.......... سمجھ گیا۔" گلو نے جلدی سے سر ہلا دیا۔ اتنی دیر میں چاچا بھی بسکٹ لے آ گیا۔ نازاں چائے کے مگ اور پلیٹ میں بسکٹ لے آئی۔ ان لوگوں نے خاموشی سے چائے پی۔ چاچا مسلسل پہلو بدل رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ گلو کو گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ وہ جانے کیا شروع کر دے۔ اسی لئے چائے ختم ہوتے ہی گلو کھڑا ہو گیا۔ "چلئے احسان بابو۔"

"ایں.......... کک.......... کہاں.......... کہاں جا رہا ہے تو؟" چاچا کے انداز میں خوف تھا۔

"یہ ہمارے ساتھ جا رہا ہے چاچا۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔" احسان اللہ نے چاچا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"پر.......... اب یہ.......... دیکھو بابو.......... اب میرے اندر بالکل دم نہیں ہے۔ یہی میرا سب کچھ ہے۔ اسی کے اندر میری جان ہے۔" چاچا پتہ نہیں کیوں رو پڑا۔

"میں آتا ہوں ناں!" گلو اس کے اس طرح رونے پر جھینپ گیا۔ بڑی بے اعتباری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی چاچا کے اندر۔

"میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں چاچا کہ اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کروں گا۔" جانو نے اس بار اسے تسلی دلانا چاہی مگر اس کے بوڑھے بدن میں جیسے اضطراب بھر گیا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

"گلو!" چاچا نے ایسے کہا کہ تیز دھار آلے کی طرح کوئی چیز گلو کا کلیجہ کاٹتی ہوئی اندر تک اتر گئی۔ اس کے باوجود وہ جھلا گیا۔

"چاچا.......... پنجرہ بنوالے میرے لیے' ہر وقت قید کیے رکھنا۔ کیا ہو گیا ہے تجھے؟ اب کیا میں زندہ رہنا بھی چھوڑ دوں۔ گھر سے باہر بھی نہ نکلوں۔ مرنے نہیں جا رہا میں۔"

"ایسے نہیں کہتے گلو۔" جانو نے اسے جھڑک دیا۔

"اور کیا کروں' میری جان کو آ گیا ہے۔ اب تو پولیس میرے پیچھے نہیں ہے ناں اور پھر تو........... سارا خطرہ تو مجھے تیری طرف سے تھا' اب کیا ہے؟ اب اس کا دم کیوں نکل رہا ہے۔ اب مجھے کون کھا جائے گا؟"

وہ بولے جا رہا تھا اور چاچا آنکھوں میں بھرے گدلے پانی کے اس طرف سے اسے بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ گلو کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس بوڑھے لاغر اور ٹوٹے ہوئے شخص کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اگر گلو کے چہرے پر ستاروں کی طرح جڑی آنکھوں میں جہاں آرا پوری کی پوری نہ سما گئی ہوتی تو شاید اس کے جذبے اتنے شدید نہ ہوتے یا اس میں شکورا کی ذرا سی بھی شباہت ہوتی شاید سیدھی سمت بہتی ندی الٹ کر بہنے لگتی' وہ اسے محبت کی بجائے نفرت سے دیکھتا مگر یہاں........... یہاں وہ کتنا مجبور تھا' وہ گلو کو بتا بھی تو نہیں سکتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسے بڑا ہی نہ ہونے دیتا۔ کسی چھیچھڑے کی طرح اپنے سینے کی نکلی ہوئی ہڈیوں سے چمٹائے رکھتا یا واقعی اس کے لئے ایک پنجرہ بنا کر اسے قید کر دیتا۔ وہ تو اسے ہر لمحہ اپنی نگاہ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے اس قابل بنانا چاہتا تھا کہ کل جہاں آرا اپنا بیٹا مانگنے آ جائے تو اسے لوٹاتے ہوئے وہ فخر سے تنا کھڑا ہو۔

گلو کو کیا پتہ کہ جب تک وہ گھر سے باہر رہتا تھا دنیا بھر کا اضطراب اس کے وجود میں سمٹ آتا تھا' آنکھیں سڑکوں پر اسے تلاش کرتی تھیں' سماعت اس کے پیروں سے لپٹی

چلی جاتی تھی اور وہ ہواؤں میں اس کی خوشبو سونگھتا پھرتا تھا۔ پتہ نہیں پہلا رویہ کیسے اور کسے لڑاکا بنا گیا تھا۔ وہ کیا بات ہوئی تھی کہ چاچا کے منہ سے جھڑتے پھول گالیوں میں تبدیل ہو گئے۔ جانے کیوں وہ اسے سینے سے بھینچ کر اپنے پیار کا یقین دلاتے ہوئے کترانے لگا تھا شاید اس کی ہر لمحہ نگران رہنے والی آنکھیں اسے کھٹکنے لگی تھیں۔ ہر وقت اسے بھینچے رہنے والے ہاتھ اس میں گھسنے لگے تھے۔ جانے کیا تھا اور کیوں تھا۔ چاچا آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

نازاں نے آ کر اسے چھوا تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں خون جلاتا ہے چاچا تو اپنا؟" نازاں نے دوپٹے کے پلو کو اس کی آنکھوں پر رگڑا اور اس بوڑھے کے اندر جیسے لو سی چلنے لگی یا ہمیشہ چلتی ہوئی لو کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ دور تک بجھے ہوئے صحرا میں جیسے اچانک ہی بادل کا ٹکڑا تیر گیا ہو اور تبھی لو کی شدت کا احساس ہونے لگا ہو۔

وہ بے معنی انداز میں سر ہلاتا رہ گیا۔

☆============☆============☆

گلو احسان بابو کی گاڑی میں بیٹھا تو بھنایا ہوا تھا۔

"تم چاچا سے نفرت کرتے ہو کیا؟" جانو نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

"آں..........؟" وہ ہونقوں کی طرح منہ پھاڑ کر رہ گیا۔

"تمہارا رویہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔" جانو بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ "وہ تم سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ سچ پوچھو تو میں نے اب تک اپنی زندگی میں ایسا کوئی چاچا نہیں دیکھا جس نے اپنے بھتیجے کے لئے اپنی زندگی تج دی ہو اور اس کے لئے یوں تڑپتا ہو۔ تمہیں اس کی قدر کرنا چاہیے۔"

اور گلو سوچ رہا تھا۔ "کون سا چاچا.......... کس کا چاچا...........؟ وہ اس کا چاچا تھا ہی کب' چاچا ہوتا تو اس کے باپ کے بارے میں تو جانتا ہوتا۔ اس کے دادا کا نام تو پتا ہوتا اسے' اس کے خاندان کو تو جانتا ہوتا۔ اس کی ماں آسمان سے تو نہ ٹپکی ہوگی۔ دنیا میں اکیلی تو نہ ہوگی' یہ میری ماں کو کیسے جانتا ہے.......... اور باپ کو کیوں نہیں جانتا۔ یہ خیال اسے پہلی بار آیا تھا اور وہ حیران رہ گیا تھا کہ اسے یہ خیال پہلی بار کیوں آیا۔ وہ چاچا سے تو پوچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکتا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے' اس کا باپ کون تھا؟ وہ ماں کو کیسے جانتا ہے' اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ چبوترے پر سونے والا' لاوارث بچہ جہاں آرا کا ہے۔

"تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے۔" یہ احسان اللہ تھے۔

گلو چونک اٹھا۔ "آں.......... ہاں.......... وہ بس.......... پیچھے پڑ جاتا ہے۔ کسی پر اعتبار ہی نہیں کرتا۔" وہ جھینپ رہا تھا۔

"کوئی اعتبار کے قابل ہے ہی کب؟" جانو نے جواب دیا تو گلو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں.......... کوئی اعتبار کے قابل ہے ہی کب؟" جانو نے جواب دیا تو گلو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"ہاں.......... کوئی اعتبار کے قابل ہے ہی کب؟ یہ تو تو نے ٹھیک کہا جانو.......... میں تجھے کیا سمجھا تھا اور تو.......... اچھا یہ بتا فتح واقعی زندہ ہے؟"

"ہاں.......... اس کا صرف سر پھٹا تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر گرا تو تم یہ سمجھ کر بھاگ کھڑے ہوئے کہ وہ مر گیا ہے۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی گلو کہ ہم کن چکروں میں ہیں' مختصراً اتنا بتا دوں کہ ہمارے ملک میں کئی ایسے گروہ کام کر رہے ہیں جن کے مفادات ملکی مفادات سے ٹکراتے ہیں۔ وہ دہشت گردی پھیلا کر لوگوں کو ایسے معاملات میں الجھا دیتے ہیں کہ اصل مسئلوں کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی۔ وہ حکومت کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ حکومت اپنے تمام وسائل ان دہشت گردوں کی سرکوبی کے لئے صرف کرتی ہے تو اس کی توجہ بٹ جاتی ہے۔ جب وہ عوام کی بھلائی کا کوئی کام کرنے لگتی ہے تو وہ پھر ایسی کوئی حرکت کرتے ہیں جس کی وجہ سے انتشار پھیلتا ہے۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟" جانو پوری سنجیدگی اور توجہ سے انتہائی آسان زبان میں اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا جانو' میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس زمین پر کچھ بستیاں ایسی ہیں جہاں کے رہنے والے خواب دیکھتے ہیں اور تعبیر بھی پا لیتے ہیں مگر یہیں پر کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جنہیں خواب دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو کوری آنکھیں لئے پیدا ہوتے ہیں اور کوری آنکھیں لئے مرجاتے ہیں۔ انہیں تو دو وقت کی روٹی بھی

نصیب نہیں ہے اور ایک طرف استاد فتح جیسے لوگ ہیں جو دنوں میں امیر بن جاتے ہیں۔ سب کچھ پا لیتے ہیں۔ اسماعیل جیسے لوگ ہیں جن کی کوٹھیاں دیکھ کر ہم جیسوں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ان کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے..........؟ انہیں کون دیتا ہے اتنا پیسہ..........؟ کوئی ان سے پوچھتا کیوں نہیں کہ تمہارے پاس اچانک قارون کا خزانہ کہاں سے آ گیا۔ جھونپڑیوں پر کوٹھیاں کیسے کھڑی کر لیں تم نے.......... اور ہم.......... ہم جب پیسہ کمانے کا سوچتے ہیں تو ہمارے دماغ تھک جاتے ہیں وہ بوڑھا چاچا دیکھا ہے تم نے..........؟ ساری عمر محنت کر کے بھی کبھی اپنے لئے چار جوڑے کپڑے کے نہیں بنا پایا۔ سالوں میں کبھی چپل خرید سکا تو خرید لی۔ میں نے کبھی اچھا کپڑا نہیں پہنا۔ کسی مہنگے ہوٹل میں قدم رکھنے کا سوچ بھی نہیں سکا۔ اپنے گھر کی کچی دیواروں پر پلاسٹر نہیں کروا سکا۔ میرے پاس اتنا نہیں کہ میں اپنے چاچا کو سکھ دینے کا کوئی راستہ سوچ سکوں؟ میں کیا کروں کہاں سے لاؤں پیسہ؟" گلو کے اندر کا طوفان سارے بند توڑ چکا تھا۔

گاڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ جانو اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ احسان اللہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا مگر اس کی تمام تر توجہ گلو کی طرف تھی۔

"گلو! کیا تم سمجھتے ہو کہ زندگی صرف پیسے سے عبارت ہے! خوشیاں صرف پیسے ہی میں مل پاتی ہیں؟ نہیں گلو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم فتح پر ہاتھ نہ اٹھاتے۔ اسے قتل کرنے کا بالکل نہیں سوچتے.......... پتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ چند ہی لمحوں میں تمہیں دس ہزار روپے دینے والا تھا۔ پورے دس ہزار جو تم برسوں کما کر بھی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود تم نے چند لمحے بھی انتظار نہیں کیا۔ اس کا سر پھاڑ کر گویا اسے جان سے مار کر بھاگ گئے۔ کیوں.......... اس لئے کہ تم چاچا کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ چاچا کے اور تمہارے درمیان رشتہ ہے' جذبہ ہے اور یہی جذبے سب کچھ ہوتے ہیں گلو.......... زندگی میں سب سے اہم چیز یہی جذبے ہوتے ہیں۔ جذبوں سے ہٹ کر انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ محبت اور نفرت کے جذبے' رشک اور حسد کے جذبے' یہ جذبے زندگی کے رویے کو ترتیب دیتے ہیں۔ تمہیں اچھا اور برا بناتے ہیں۔ تمہیں صحیح اور غلط سمجھاتے ہیں۔ تم جانتے ہو ناں کہ وہ دس ہزار تمہیں فتح نے کیوں دینے کا وعدہ کیا تھا؟" لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو کر گلو کی طرف دیکھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو نے نگاہ چرالی۔ "میں.......... میں پہلے نہیں جانتا تھا۔"

"بعد میں تو پتہ چل گیا تھا ناں! اگر وہ پہلے بتا دیتا کہ یہ دس ہزار روپے دو معصوم بچوں اور ان کے ماں باپ کی زندگیوں کے عوض ہیں تو تم ان روپوں سے خریدا ہوا ایک نوالہ بھی کھا پاتے؟ ان پیسوں سے خریدا ہوا کپڑا پہن کر چین پا لیتے؟ ان پیسوں سے اپنے گھر کی دیواریں رنگوا کر سکون سے سو پاتے؟ گلو تم ایسا نہیں کر سکتے تھے' کبھی نہیں۔ امیر بننے کی جس خواہش نے تمہیں فتح تک پہنچایا تھا' وہ بہت معصوم تھی۔ میں تمہاری نس نس سے واقف ہوں گلو! تم میں احساس زندہ ہے' جذبوں کی سچائی موجود ہے' یہ پیسہ وہ لوگ ہضم کر پاتے ہیں گلو جن کے ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں' احساس ان کے اندر کی سڑاند سے گھبرا کر مر جاتا ہے۔ جذبے راکھ ہو جاتے ہیں۔ جو لاشوں کی تجارت کرتے ہیں' لہو پیتے ہیں گلو! اور اپنے ضمیر ہی کی طرح گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں۔ کیا تم اسماعیل کی طرح اپنے کچے مگر پرسکون مکان پر کوٹھی کھڑی کرنا چاہتے ہو؟ کیا تم فتح کی چم چماتی ہوئی کار میں گھومنا چاہتے ہو؟ اس کی طرح راتوں رات امیر بننا چاہتے ہو؟ اگر تم ایسا چاہتے ہو گلو تو خدا کی قسم میں تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔ ان لوگوں تک تمہاری راہنمائی بھی کر دوں گا جو تمہیں لمحوں میں انسان سے درندہ بنا کر لکھ پتی بنا سکتے ہیں۔ میں کبھی تم سے وہ سب کچھ چھیننے کی یا تمہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مگر.......... میری ایک شرط ہے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گیا۔

گلو کو لگا جیسے وہ اور کچھ دیر نہ بولا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔ گاڑی میں چلتے ہوئے اے سی کی ہلکی سی آواز ڈرل مشین کی طرح اسے چھیدے دے رہی تھی۔

"وہ شرط یہ ہے کہ تم پھر چاچا سے کبھی نہیں ملو گے۔ اس لڑکی نازاں سے بھی تمہارا ہر رشتہ ختم ہو جائے گا۔ امام دین کو بھول جاؤ گے' اپنے گھر کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دو گے' اس گھر کے بارے میں جہاں تم نے اپنی زندگی کے بہت سے دن گزارے ہیں اور نہ کبھی تمہیں وہ چبوترا یاد آئے اور نہ اس سے متعلق کوئی خیال تمہارے ذہن میں آئے۔ بولو.......... میری شرطیں منظور ہیں تمہیں؟"

ایک گہرا سناٹا تھا جو گلو کے اندر جانو کی آواز کی بازگشت کے ساتھ گونجنے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کی قوت گویائی اچانک سلب ہو گئی ہو۔

"بولو گلو' میں نے جو کچھ کہا ہے اسے کر کے دکھانا میرے لئے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ میں نے قسم کھائی ہے' تم مجھے میرے قول کا پکا پاؤ گے۔"

گلو سے اب بھی نہ بولا گیا تو وہ گھبرا کر کھڑکی کے شفاف شیشے سے باہر دیکھنے لگا جہاں پھیلی ہوئی نرم دھوپ میں لوگ کاروبار زندگی میں مصروف تھے۔ اسے لگا جیسے اکیلا وہی نہیں پوری دنیا گونگی ہو گئی ہے سوائے جانو کے۔ ساری دنیا کے بولنے کی طاقت صرف جانو کو مل گئی ہے۔ بس وہی بول سکتا ہے' چیخ سکتا ہے' سوال کر سکتا ہے۔ وہی اس کے کانوں میں گونج رہا تھا' اس کے دماغ میں چیخ رہا تھا اور اس کے وجود میں سنسنا رہا تھا۔

"نہیں.........." وہ ایک دم چیخ اٹھا۔ بڑی زور سے' جیسے گرمیوں کی سنسان اور حبس زدہ دوپہر میں اچانک کوئی پرندہ چیخ مارتا ہوا سر سے گزر جائے۔ جانو اور احسان اللہ دونوں ہی اچھل پڑے۔ گاڑی لمبی سڑک پر ڈول سی گئی۔ شاید احسان اللہ کے ہاتھوں سے سٹیرنگ پھسل گیا تھا۔ ہاتھ بہک گئے تھے۔

"نہیں جانو.......... میں نے کب کہا کہ مجھے ایسے پیسے کی ضرورت ہے؟" وہ رو پڑا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دانیال گردیزی کی خوبصورت کوٹھی راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئی۔ "وہ تو خواب تھا۔ ایک ترسے ہوئے بچے کا خواب' جانو! جس نے بستی کے ہر در سے روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے مانگ مانگ کر کھائے تھے۔ جو ہر رشتے اور ہر جذبے سے کھرچ کر باہر پھینک دیا گیا تھا جیسے کسی نے گھر کا کچرا' بستی سے باہر الٹ دیا ہو۔ "روٹی کے ٹکڑے نے تو مجھے بعد میں ترسایا ہو گا جانو' میں تو ماں کی آغوش اور باپ کے سائے کو بھی ترسا ہوا ہوں۔ تو کون سے جذبوں کی بات کر رہا ہے جانو! جن سے کسی نے مجھے آشنا ہی نہیں کیا' کون سے رشتوں کی بات کر رہا ہے ان رشتوں کی جن کی مجھے پہچان ہی نہیں۔ یہ چاچا.......... یہ تو.......... یہ تو کوئی اجنبی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے میرے اندر اپنے لئے جس رشتے کی پہچان ڈالی ہے تو ایسا کرنے میں بھی اس کا کوئی مقصد ہو گا۔ کوئی غرض ہو گی ورنہ یہ اپنے رشتے چھوڑ کر مجھے کیوں پال لیتا؟ بول جانو.......... کیا تو ایسا کر سکتا ہے بول.......... اب تو بول.........."

وہ ایسے چیخ چیخ کر بول رہا تھا جیسے جانو اس کے پہلو میں نہیں بلکہ اس سے کوسوں دور بیٹھا ہو۔ گاڑی اگر ایئر کنڈیشنڈ نہ ہوتی اور اس کے شیشے نہ چڑھے ہوتے تو شاید

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سڑک پر چلتے لوگ ٹھٹک جاتے۔

"گلو! میرے یار............ ہوش میں آؤ۔" جانو نے ایک دم اسے بازوؤں میں لے کر سینے سے بھینچ لیا۔

اور گلو ایک دم ہوش میں آگیا۔ اس نے حیرت سے اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو محسوس کیا اور جانو کی گرفت سے آزاد ہو کر دوسری طرف سرک کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے اور قمیض کے دامن سے ناک صاف کرنے ہی والا تھا کہ جانو نے جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ گلو نے لمحہ بھر کو اس سفید رومال کو دیکھا اور اسے تھام کر آنکھوں سے رگڑ کر واپس کر دیا۔

"رکھ لو۔ اس رومال میں وہ آنسو جذب کیے ہیں تم نے جو تمہارے انسان ہونے کا ثبوت ہیں۔ شاید یہ رومال تمہیں زندگی بھر احساس دلاتا رہے گا کہ تم ایک بہت معصوم اور نیک انسان تھے۔"

جانو بڑی گہری باتیں کرتا تھا' پڑھے لکھوں کی طرح۔ یہ خیال اسے پہلی بار اس وقت آیا تھا جب وہ اس کے پاؤں داب کر استاد فتح کے پاس ملازم رکھوانے کی منتیں کر رہا تھا۔ آج تو وہ جان گیا تھا کہ جانو وہ تھا ہی کب جو وہ نظر آتا تھا۔ "میجر ہونا کوئی معمولی بات نہیں' پتہ نہیں کتنی جماعتیں پاس کی ہوں گی اس نے۔" گلو نے سوچا اور پھر باہر دیکھنے لگا۔ گاڑی پتہ نہیں کب سے چل رہی تھی' مسلسل. بغیر رکے۔ پتہ نہیں کون سی سڑک تھی جو کہیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"چلو کھانا کھاتے ہیں۔" جانو اب بھی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔

اچانک گلو کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اسے اتنی دیر میں پہلی بار احسان بابو کا خیال آیا تھا جو کسی پتھر کے مجسمے کی طرح بیٹھا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ بول کیوں نہیں رہا تھا۔ بات کیوں نہیں کرتا ہے۔ اسے یہ سوچ کر ہی گھبراہٹ شروع ہوئی تھی۔ "احسان اللہ کا جانو سے کیا تعلق ہے؟" کسی نے جیسے اس کے دماغ میں سرگوشی کی اور وہ چونک کر جانو کو دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے گلو؟" جانو کی آواز میں بے پناہ اپنائیت تھی۔ وہ پوری طرح گلو کی

طرف متوجہ تھا۔ جیسے اس کے اندر اٹھنے والے ہر سوال سے واقف' اس کے اندر پڑنے والے ہر بل سے آگاہ۔

"یہ............ احسان بابو تجھے کیسے جانتے ہیں جانو؟" وہ بھول جاتا تھا کہ وہ اب جانو نہیں' میجر احمد جان ہے' جسے احسان اللہ جیسے آدمی نے بھی سر کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"یہ لمبی کہانی ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے بتاؤں گا۔" وہ لمحہ بھر کو چپ ہوا پھر بولا۔

"میں ہر بات بتاؤں گا گلو۔ مجھے تم پر بڑا اعتماد ہے' یہ اعتماد کیوں ہے' میں نہیں جانتا' بس اعتماد ہے کہ تم ہر بات کو جان لینے کے باوجود اسے کبھی کسی کے سامنے نہیں دہراؤ گے۔ شاید یہ میری اور تمہاری دوستی کے درمیان کا وہ معاہدہ' وہ عہد' وہ وعدہ ہے جسے ہم نے زبان سے نہیں کیا مگر ہماری روحیں' ایک دوسرے سے یہ وعدہ کر چکی ہیں۔ میں تم سے کبھی غافل نہیں رہا گلو............ اور نہ کبھی غافل رہوں گا۔ تم جو کچھ چاہتے ہو وہ میں تمہیں دوں گا مگر تمہارے ہاتھ میں ترازو دینے کے بعد جو نیکی اور بدی کو تول سکے' پوری ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ۔"

وہ اس کے کاندھے کو تھپکتے ہوئے دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار گلو کو محسوس ہو رہا تھا کہ رشتے ہوتے ہیں۔ خون ہی کے نہیں............ ایک دوسرے سے گفتگو کے بھی' ایک دوسرے کی نگاہوں سے تصادم کے بھی۔ ان جانے' ان کہے اور غیر محسوس سے رشتے جو جذبوں کو جنم دیتے ہیں اور انہیں پروان بھی چڑھاتے ہیں۔ اس نے کچھ بھی نہیں کہا بس گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے احسان اللہ کی پتھریلی پشت کو تکنے لگا۔

ایک اچھے صاف ستھرے مگر درمیانے ہوٹل میں کھانا کھانے کے دوران میں جانو نے جو انکشافات کیے اس نے گلو کو کچھ بھی کھانے نہ دیا۔ اس نے بتایا کہ احسان اللہ کا بھائی اپنی مرضی سے اس گروہ میں داخل ہوا تھا' مقصد صرف اس گروہ یا اس کے سرکردہ لوگوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنا تھا مگر وہ اپنا کام مکمل نہ کر سکا' اسے کینسر ہو گیا۔ اس کی بیماری کا انکشاف ہوتے ہی احسان اللہ نے اس سے کہہ دیا کہ وہ کسی بھی بہانے سے وہاں سے نکل آئے مگر کسی ایسے شخص سے دوستی کر لے جس میں کچھ نہ کچھ انسانیت ہو۔ وہاں اس کی ملاقات امام دین سے ہو چکی تھی۔ امام دین کے اندر ایک اچھا انسان چھپا ہوا تھا' وہ بھی ان لوگوں کے کرتوتوں سے واقف ہونے کے بعد وہاں سے نکلنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش میں تھا۔ چالاک آدمی تھا' اس نے جو کچھ خود کیا ویسا ہی احسان اللہ کے بھائی کو کرنے کے لئے کہا یعنی یہ کہ ٹریننگ میں ناکام ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور اس طرح سے کیا کہ امام دین سمجھا کہ وہ مشکل میں پھنس گیا تھا اور وہ اس کی مدد کر رہا ہے۔ اس نے بڑی ہمدردی اور خلوص سے اس کی مدد کی تھی' اس میں شک نہیں تھا۔ احسان اللہ اس سلسلے میں اس کا واقعی احسان مند تھا کہ اس نے بروقت وہاں سے نجات دلا کر اسے احسان اللہ تک پہنچایا ورنہ اس کی تکلیف اس سٹیج پر پہنچ چکی تھی کہ وہ خود اپنے پیروں پر چل کر آنے سے قاصر تھا۔ احسان اللہ نے اپنے بھائی کو علاج کے لئے امریکہ بھیجا' اسے بچانے کی سرتوڑ کوشش کی مگر.......... وہ بچ نہیں سکا۔ امام دین کو نہیں معلوم کہ وہ مر چکا ہے' وہ صرف اتنا جانتا ہے کہ وہ دبئی میں ہے اور کبھی کبھی اسے خط بھی لکھتا ہے۔ یہ خط احسان اللہ کے ہاتھ سے ہی اس تک پہنچتے تھے بلکہ انہیں پڑھ کر بھی احسان اللہ ہی سناتا تھا۔ (یہی بات اس نے گلو کو بھی بتائی تھی۔) بہرحال اس کے بعد امام دین نے اس گروہ کے بارے میں بڑی اہم معلومات بہم پہنچائیں حالانکہ وہ خود اس بات سے بے خبر رہا تھا کہ وہ نادانستگی میں جانو وغیرہ کے کام آ رہا ہے یا یہ کہ احسان اللہ اس کی بتائی ہوئی ہربات جانو تک پہنچا رہا ہے۔ جانو کا تعلق حکومت کے اس شعبے سے تھا جو دہشت گردوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اوپر تک پہنچاتا تھا۔

جانو نے یہ بھی بتایا کہ احسان اللہ اس کے بچپن کا دوست ہے' وہ بھی اس شعبے میں یعنی آرمی انٹیلی جنس میں آنا چاہتا تھا مگر ٹریننگ میں رہ جانے سے وہ اپنی خواہش پوری نہیں کر سکا مگر وہ جانو کا بھرپور ساتھ دیتا ہے۔ یہ تمام باتیں سن کر گلو حیران تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ جانو فتح کا ملازم تھا۔ "تو' تو فتح کے پاس ملازمت کیوں کر رہا تھا؟" وہ پوچھ بیٹھا۔

"جب اس کے بارے میں مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ بھی غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہے۔ پہلے وہ چھوٹے چھوٹے جرم کرتا تھا مگر پھر اچانک اس کے حالات نے حیرت انگیز پلٹا کھایا۔ وہ تمہاری بستی کے کچے مکان سے بنگلے میں پہنچ گیا۔ اس کی دوستیاں ان لوگوں سے ہونے لگیں جو ہماری لسٹ پر تھے۔ جب تک وہ چھوٹے موٹے جرم کرتا تھا محض پولیس کی نظر میں تھا مگر جیسے ہی اس نے اونچے ہاتھ مارنا شروع کیے' میں ایک ذہین

بدمعاش کی شکل میں اس سے جا ٹکرایا۔ میں نے بھی تمہاری طرح اس کے ایک دادا کی بڑی منتیں کی تھیں کہ مجھے اس کے پاس ملازمت دلا دے۔ وہ بوڑھا اس کا سگا دادا نہیں تھا بلکہ اس کے باپ کا دوست تھا۔ مرنے والا تھا اور فتح اس کی بات بہت مانتا تھا۔ مرتے مرتے وہ میرا کام کر گیا۔ میں نے فتح کو اپنی ذہانت سے بڑی جلدی ہاتھ میں لے لیا۔ یہ کام میرے لئے بہت مشکل ثابت ہوا تھا۔ مجھے کافی جرم کرنا پڑے تھے بعض میں اس کی اعانت کرنا پڑی تھی مگر کیوں کہ ہمارا ٹارگٹ بڑا تھا جس کے لئے ہم ایسا کرنے پر مجبور تھے۔" جانو چپ ہوا تو گلو نے منہ میں کب سے رکھا ہوا نوالہ جلدی جلدی چبا کر نگل لیا۔

"اور ایک مزے کی بات بتاؤں؟" جانو نے نیپکن سے منہ پونچھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ احسان اللہ تب سے اب تک بت بنا ان کے ساتھ تھا۔ اس وقت بھی وہ چپ چاپ کھانا کھانے میں مصروف تھا جیسے وہ ان لوگوں کے ساتھ نہ ہو بلکہ اکیلا ہو۔ نوالہ منہ میں رکھنے کے بعد وہ چاروں طرف دیکھنے لگتا تھا جیسے ماحول کا لطف لے رہا ہو۔ گلو نے لمحہ بھر کو اسے دیکھا پھر جانو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"کیسی بات؟"

"جس روز اس نے تمہیں دس ہزار کا وعدہ کر کے دانیال کی کوٹھی میں تھیلا رکھ کر آنے پر تیار کیا تھا اس روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا' اس کے کمرے میں ہونے والی تم لوگوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ میں ڈر گیا تھا کیونکہ وہ تم سے بہت خوفناک کام لے رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ یہ بے وقوفی کیوں کر رہا ہے۔ اس نے کبھی اتنے انجان آدمی سے اتنا بڑا کام نہیں لیا تھا۔ اس کے لئے وہ آزمائے ہوئے آدمی پر ہی بھروسہ کرتا تھا۔ میں تمہیں روکنا چاہتا تھا مگر اس نے غیر متوقع طور پر عجلت دکھائی۔ میں تو بہ ظاہر اسلام آباد گیا ہوا تھا اس لئے اس کے سامنے نہیں آ سکتا تھا ورنہ تمہیں منع کر دیتا۔ بہرحال میں نے بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ میں تمہارا پیچھا کروں گا اور کسی بھی طرح تمہیں ایسا کرنے سے باز رکھوں گا۔ میں نے تم لوگوں کا پیچھا کیا۔ جب اس نے تمہیں اس کوٹھی کے قریب اتارا' تمہیں گاڑی میں سے تھیلا نکال کر دیا' اس وقت میں تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میری بے آواز گاڑی تمہاری گاڑی سے کچھ فاصلے پر رک چکی تھی۔ میں بڑی پھرتی سے وہاں ایک دیوار کی آڑ لینے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے تمہیں تھیلا دیتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تم تھیلا لے کر کوٹھی کی جانب چل پڑے تھے۔ میں نے تمہارے پیچھے جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک میری نگاہ فتح پر پڑی جو ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے بالکل ویسا ہی دوسرا تھیلا نکال رہا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے۔ یہ میں جانتا تھا کہ جو تھیلا اس نے تمہارے ہاتھ بھیجا ہے اس میں بم کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا وہ دانیال گردیزی سے نالاں تھے۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ بم اتنی جلدی نہیں پھٹے گا۔ میں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنے آدمی کو جو میری گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا' دانیال کی کوٹھی کی طرف دوڑا دیا کہ وہ دانیال وغیرہ کو فوری خبر دے کر وہاں سے ہٹا دے پھر میں فتح کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اب وہ بڑے محتاط انداز میں مگر بڑی تیز رفتاری سے دانیال کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ چند ہی لمحے بعد وہ دانیال گردیزی کی کوٹھی تک پہنچ گیا۔ اس نے وہ تھیلا گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اندرونی برآمدے کی دیوار کے نیچے رکھ دیا۔ اس دیوار کے دوسری طرف دانیال کا بیڈ روم اور دائیں جانب ڈرائنگ روم تھا۔ وہ تھیلا رکھ کر اسی پھرتی سے واپس آ گیا۔ تم بھی اندر جا چکے تھے اور ابھی باہر بھی نہ آئے تھے کہ وہ دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ گاڑی اسٹارٹ ہی تھی جس سے وہ پل بھر میں تیز رفتاری سے گلی کے نکڑ پر پہنچ کر تمہارا انتظار کرنے لگا۔ میں گفتگو سن چکا تھا کہ اس نے تم سے تھیلے کو اندر کی طرف آخری دیوار کے ساتھ رکھنے کو کہا تھا۔ میں اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ اب تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے پریشانی تھی کہ میرا آدمی دانیال وغیرہ کو وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوا یا نہیں' جس وقت تم دوڑتے ہوئے گاڑی کی طرف آ رہے تھے اسی وقت مجھے اطلاع مل گئی کہ دانیال وغیرہ وہاں سے ہٹا دیئے گئے ہیں۔"

جانو پھر چند لمحوں کے لئے رکا۔ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر گلو کی طرف بڑھایا۔ گلو جو فق بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اور جس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا تھا اس نے جلدی سے سگریٹ لے لیا۔ دوسرا سگریٹ جانو نے ہونٹوں میں دبا کر گلو کا سگریٹ سلگایا پھر اپنا سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا۔ دھوئیں کا لچھا منہ سے نکال کر وہ چند لمحے اس گول دائرے کو آہستہ آہستہ فضا میں اٹھتے ہوئے دیکھتا رہا پھر گلو کو پہلو بدلتے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم بہت بے چین ہو۔ ہاں' تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں......... یہ سن کر کہ دانیال گردیزی اور اس کی فیملی کو وہاں سے نکال لیا گیا ہے' میں مطمئن ہو گیا تھا مگر ایک بات مجھے الجھن میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ فتح نے دوسرا تھیلا وہاں کیوں رکھا ہے۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ اس میں بھی بم ہو گا۔ شاید وہ اس معاملے میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ شاید اسے بعد میں خیال آیا ہو کہ جو بم اس نے تم سے رکھوایا ہے وہ اندرونی عمارت سے فاصلے پر ہے اور دانیال بچ بھی سکتا ہے اسی لئے اس نے دوسرا بم رکھ کر اس امکان کو ختم کر دیا ہو۔ بہرحال میں پھر تم لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے واپس آ گیا۔ اس نے میرے سامنے تمہارے چاچا کو گالیاں دی تھیں۔ میرے سامنے ہی تم آپے سے باہر ہو کر اس کے پیچھے بھاگے تھے اور پھر سب کچھ میرے سامنے ہوا۔ راستے ہی میں' میں نے بم کا دھماکا بھی سن لیا تھا مگر میں مطمئن تھا کہ جانی نقصان ہونے سے بچ گیا۔ تم اسے زخمی کر کے فرار ہو گئے۔ وہ بے ہوش تھا۔ اسے اس کے ملازم ہسپتال لے گئے۔ پولیس تمہاری تلاش میں تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اب سامنے آ جاؤں پھر میں نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے میں اسلام آباد سے واپس آ گیا ہوں۔ اس کے آدمیوں نے مجھے اس کے زخمی ہونے اور تمہارے فرار ہونے کی کہانی سنائی۔ میں اسپتال پہنچ گیا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش تھا۔ چوٹ گہری تھی۔ میں رات بھر اسپتال میں رہا مگر میرا رابطہ میرے آدمیوں سے بھی تھا۔ میں جانتا تھا کہ کوٹھی میں بم کے دھماکے نے ویسے ہی سب کو متوجہ کر لیا ہو گا۔ کچھ ہی دیر بعد جو اطلاع مجھے ملی وہ بڑی روح فرسا تھی۔ دانیال گردیزی کی ملازمہ' اس کے دو بیٹے اور اس کا شوہر اپنے کمرے میں تھے۔ جنہیں گردیزی وغیرہ افراتفری کے عالم میں اطلاع نہیں دے سکے اس لئے کہ میرے آدمی نے فوراً انہیں باہر نکل جانے کو کہا تھا۔ میرے آدمی نے ان سے کہا کہ وہ ملازمین کو بھی بچانے کی کوشش کرتا ہے' اتنا کہہ کر وہ سرونٹ کوارٹر کی طرف بھاگا۔ دانیال وغیرہ کوٹھی سے نکل گئے تھے۔ ابھی میرا آدمی ان لوگوں کو لے کر عمارت سے باہر آیا بھی نہ تھا کہ بم پھٹ گیا۔ میرا آدمی اور وہ سب اس بم دھماکے کا شکار ہو گئے۔ یہ خبر ایسی تھی جس نے مجھے ہی نہیں پوری مشینری کو ہلا دیا تھا۔ اگلے روز تمہارا رکھا ہوا تھیلا جوں کا توں آخری دیوار کے ساتھ رکھا مل گیا اس لئے کہ بم اس میں نہیں تھا۔ بم تو اس تھیلے میں تھا جو فتح نے سامنے کی دیوار کے پاس رکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔"

"ہیں............ کیا............ کیوں............؟ مگر اس نے تو............" گلو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میرا خیال درست نکلا تھا کہ وہ ایسے کام کسی انجان اور نئے آدمی سے نہیں لیتا تھا۔ شاید اس وقت اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ کسی جانے بوجھے آدمی سے رابطہ کر سکتا۔ یہ کام اسے خود ہی کرنا تھا مگر وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ لوہے کے بیکار مگر بھاری ٹکڑے اس تھیلے میں رکھ کر اس نے تمہیں وہاں رکھنے کو اس لئے دیئے تھے کہ جب اگلے روز اس کوٹھی میں بم پھٹنے کی اطلاع تمہیں سنائے گا تو یہ بھی بتائے گا کہ یہ بم تم نے رکھا تھا۔ گویا ان سب کی موت کے ذمے دار تم ہو' اس جرم میں تم شریک ہو اس طرح وہ تم پر وقت ضائع کیے بغیر تمہیں اپنے جال میں پھنسا کر بلیک میل کرے گا اور آئندہ تم سے پورے اعتماد کے ساتھ کام لے گا۔ نہ تم اس بارے میں کسی کو کچھ بتا سکو گے نہ اس سے بھاگ سکو گے۔" جانو چپ ہوا تو اس کا سگریٹ بے پیئے ہی راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اچانک گلو کو جھٹکا سا لگا' انگلیوں کی پوریں سلگنے لگی تھیں۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ جھٹکا تو احساس ہوا کہ اس کا سگریٹ بھی اس کی انگلیوں میں دبے دبے ختم ہو چکا تھا اور اس کے گھبرا کر ہاتھ جھٹکنے پر سگریٹ فرش پر بچھے دبیز قالین پر جا گرا تھا گلو نے جلدی سے سگریٹ کا ٹکڑا وہاں سے اٹھا کر ایش ٹرے میں ڈال دیا اور انگلیوں کو منہ میں لے لیا۔

"اوہ............ تو پھر............ وہ جیل میں............"

"ہاں۔" جانو نے دوسرا سگریٹ جلاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ پھر گہرا کش لے کر بولا۔ "یہ اطلاع ملتے ہی کہ وہاں چار پانچ جانیں تلف ہو چکی ہیں' میری اطلاع پر اسے اسپتال میں ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا۔ تین چار روز علاج ہوتا رہا پھر اسے جیل بھیج دیا گیا۔ میں اب بھی اس سے جانو کی حیثیت سے ملتا ہوں۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس پر تشدد کیا جاتا اس لئے میں نے دوسرے طریقے سے ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش شروع کر دی ہے۔ اب وہ مجھ پر پہلے جتنا اعتماد نہیں کرتا پھر بھی میں ڈوبتے ہوئے استاد فتح کے لئے تنکے کا سہارا ہوں۔ اب تک ہم یہ نہیں جان پائے

کہ وہ کس کے کہنے پر' کس کے اشارے پر یہ سب کر رہا ہے' مگر ہم جلد ہی یہ سب معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اسے یہ پتہ ہے کہ اسے دانیال گردیزی اور اس کی فیملی کو ختم کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا ہے۔ اسے وہاں رہنے والے ایک شخص نے پہچان لیا ہے اسی لئے اسے گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کئی بار پتہ کر چکا ہے۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا حالانکہ میں جانتا تھا کہ تم کہاں تھے اور چاچا کہاں رہ رہا تھا لیکن تم نے کیونکہ کوئی بھی جرم نہیں کیا تھا اس لیے............"

"اور وہ............ اس کوٹھی میں جو لوگ مرے ہیں۔ میں ان لوگوں کا قاتل تو ہوں ناں!" گلو نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

"وہ............" جانو ہنس پڑا۔ "بے وقوف' ابھی ابھی میں نے تمہیں بتایا نہیں ہے کہ اس نے تمہیں پھنسانے کے لئے چال چلی تھی' ہاں اگر اس روز میں نے خود اسے تھیلا رکھتے نہ دیکھا ہوتا اور تم لوگوں کی گفتگو نہ سنی ہوتی تو............ تو شاید اس وقت تم بھی اسی کے ساتھ جیل میں ہوتے۔ انہیں تم نے نہیں گلو............ خود فتح نے قتل کیا ہے۔"

"اور گردیزی وغیرہ؟"

"وہ لوگ محفوظ ہیں مگر ہم نے فی الحال ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہی ظاہر کیا ہے کہ کوٹھی میں وہی لوگ تھے اور وہ سب مر گئے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اسے قتل کرنے کی سازش کی وجہ سمجھ میں آ سکے۔ شاید یہ لوگ کھل کر سامنے آ جائیں۔"

"یہ دانیال گردیزی ہے کون؟" گلو اب کچھ کچھ ہوش میں آ رہا تھا ورنہ اس داستان نے تو اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔

"یہ تمہیں بعد میں پتہ چل جائے گا۔ فی الحال اٹھو۔ اب تک تمہارے چاچا کا آدھا خون خشک ہو چکا ہوگا۔" جانو نے اتنا کہہ کر ویٹر سے بل لانے کو کہا پھر اس سے بولا۔ "تم فی الحال یہیں حیدر آباد میں رہو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے کسی آدمی کی نگاہ تم پر پڑے اور ہاں' میں پھر کہوں گا کہ مجھے جو باتیں تم سے نہیں کرنا چاہیے تھیں وہ کر بیٹھا ہوں اور اس کی وجہ تم پر بے پناہ اعتماد ہے۔ امید ہے تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔ یہ سب کچھ میں نے اس لئے بھی کہہ دیا ہے کہ تم اپنے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ محسوس نہ کرو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور نہ ہی خود کو اس کا قاتل سمجھو۔ اس طرح تم سکون سے زندگی گزار سکو گے۔ ایک آخری بات اور۔" اس نے بل کی ادائیگی کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "چاچا تم سے محبت کرتا ہے' اس کا خیال رکھو۔"

گلو سرہلا کر رہ گیا۔ وہ لوگ ہوٹل سے باہر آئے تو شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ گلو واقعی پریشان ہو گیا کہ چاچا تو اب تک آدھا ہو چکا ہو گا۔ احسان اللہ اتنی دیر بعد پہلی بار مسکرایا۔ "اب تم ہمارے دوست ہو۔ ٹھیک ہے ناں! اور جلد ہی میں تمہارے لئے نوکری کا بندوبست کردوں گا۔ فی الحال سکون سے رہو۔ پھر کہہ رہا ہوں کہ کسی بھی وقت بلا جھجک میرے پاس آسکتے ہو' مجھ سے کسی معاملے میں تکلف نہیں کرنا اور............ ان باتوں کا ذکر امام دین' چاچا یا نازاں کسی سے بھی نہیں کرنا۔"

"آپ فکر نہ کریں احسان بابو۔ آپ نے اعتماد کیا ہے تو میں بھی ثابت کردوں کہ آپ نے غلط نہیں کیا۔"

"شاباش' ملاؤ ہاتھ۔" جانو نے ہنس کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

وہ لوگ گلو کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ احسان اللہ نے گلو سے کہا کہ وہ کل صبح اس کے آفس آجائے۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا کہ وہ سویرے آفس پہنچ جائے گا جانو کسی گہری سوچ میں غرق تھا اور گلو اسے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ وہ کیا ہے' بہرحال ایک بات کا اسے یقین آچکا تھا کہ جانو اچھا آدمی ہے۔ بااعتماد دوست ہے اور دیانت دار افسر بھی ہے۔ اس نے واقعی گلو کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر دیا تھا ورنہ اس کی تو دن رات کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ بوجھ ذہن سے اترا تو احساس ہوا تھا کہ وہ کس قدر بے چین تھا۔ اب وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد احسان اللہ کی گاڑی اس کی گلی میں داخل ہوئی تو دروازے پر ہی اکڑوں' سر پکڑے بیٹھا چاچا صاف دکھائی دے گیا۔ اسے دیکھ کر گلو کے اندر اس کا پیار امنڈ آیا۔ قریب پہنچنے پر اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں بھی صاف دکھائی دے گئیں۔ وہ گاڑی پہچان کر کھڑا ہو چکا تھا' پل بھر میں ہی اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

"گلو!!" وہ لپک کر گاڑی کے پاس آگیا۔

"جی چاچا............ دیکھ لیجئے آپ کا گلو بالکل ٹھیک ٹھاک اور سلامت ہے۔" جانو نے ہنس کر کہا۔

"اللہ اسے سلامت رکھے۔" چاچا کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

گلو جانتا تھا کہ اب تک وہ بڑے بڑے طوفانوں سے گزر چکا ہو گا۔ جانے کیا کیا سوچ لیا ہو گا اس نے۔ وہ جانو اور احسان اللہ سے ہاتھ ملا کر گاڑی سے اتر گیا۔

"اندر آجاؤ بیٹا۔" چاچا نے مروتاً ان دونوں سے کہا ورنہ ایک عجیب سی تھکن اس پر طاری تھی جو ان سب کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔

"نہیں چاچا' اب آپ آرام کریں۔ پریشان ہونا چھوڑ دیں اور یہ مرد ہے' اسے مردوں کی طرح زندگی گزارنے دیں۔ خدانخواستہ برا وقت آنا ہوا تو کسی کی پریشانی سے ٹل تو نہیں جاتا ناں!" احسان اللہ نے نیچے اتر کر چاچا کے دونوں ہاتھ تھام کر کہا۔ جانو بھی دروازہ کھول کر نیچے آگیا تھا۔

"ہاں بیٹا............ بس کیا کروں............ یہ تو میں بھی جانتا ہوں پر............ عادت سے مجبور ہوں۔" چاچا نے جھینپ کر جواب دیا پھر بولا۔ "چائے پیتے جاؤ۔"

"نہیں بس اب اجازت دیں' پھر کبھی حاضر ہوں گے۔" جانو نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ چاچا نے اسے دعا دی اور گاڑی روانہ ہونے تک گلو اور چاچا انہیں جاتا ہوا دیکھتے رہے۔

پلٹ کر گھر میں قدم رکھتے ہی نازاں گاڑھے دھوئیں کی طرح اس کے دماغ پر چھا گئی۔ وہ چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"چل نازاں کھانا نکال۔" چاچا نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

وہ اٹھتے ہوئے بڑبڑائی۔ پتہ نہیں کیا بولی تھی' گلو بالکل نہیں سن سکا۔ بس دانت کچکچا کر رہ گیا۔ عجیب سا انداز تھا اس کا' حق جتانے والا۔ گھور کر بھی ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس سے پوچھے بغیر گیا ہے اور اسے اتنی دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیے تھا۔ اس سے پوچھ کر جانا چاہیے تھا۔ پاؤں جھٹک جھٹک کر چلتی ہوئی وہ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ پلیٹیں زور زور سے تھال میں رکھتے ہوئے بھی وہ بار بار اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ گلو چاچا کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھا تھا۔ چاچا شاید اس سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اسے غور سے دیکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا تھا۔ گلو کا ذہن منتشر ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر نازاں کی حرکات و سکنات' اس کی بیہودگی' اس کا انداز بار بار اسے مضطرب کر دیتا تھا۔ آخر گلو نے اس کی طرف سے نگاہ چرالی۔

"کیا ہوا..........؟" چاچا بے اختیار بول اٹھا۔

"کچھ نہیں۔" گلو نے بیزاری سے جواب دیا۔ اتنی دیر میں وہ کھانے کا تھال اٹھائے قریب آ گئی۔

"یہ دوسری چارپائی بچھا دے۔" اس نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی کی طرف اشارہ کر کے گلو سے کہا۔ جھلایا ہوا سا انداز تھا۔

چاچا نے جلدی سے کھڑے ہو کر چارپائی بچھا دی۔ "رکھ دے بیٹا۔"

"کچھ کام اسے بھی کرنے دیا کر چاچا۔ اسے دیمک لگ جائے گی۔" اس نے تھال رکھتے ہوئے کہا تو گلو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"مجھے دیمک لگی تو تیرا کچھ نہیں بگڑے گا۔" اس نے بھنا کر جواب دیا۔

"گلو!" چاچا نے اسے گھورا۔ "چل اٹھ کھانا کھا۔"

"پہلے ہاتھ دھو لے۔" نازاں نے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور مٹکے کی طرف چل دی۔

"چاچا اسے.........." گلو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ "میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔" شاید اس نے اپنے غصے کو برداشت کر لیا تھا۔

وہ جاتے جاتے جھٹکے سے مڑی۔ اس نے گلو کو غور سے دیکھا بلکہ گھورا۔ "یہاں بھی کوئی خالہ بن گئی ہے کیا؟" اس نے طنز کیا اور ایک ہاتھ کمر پر ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں.......... خالہ بن گئی.......... نانی بن گئی' دادی بن گئی۔ تجھے کیا پریشانی ہے آخر؟" گلو نے اس بار لہجے کو دھیما رکھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے اس کے طنز نے سرور دیا تھا دل کو گدگدا دیا تھا۔ ایک دم ہی اس کا موڈ تبدیل ہو گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ گلو کو اسے چڑانے کا بہانہ مل گیا تھا۔

"کہاں کھا لیا؟" چاچا نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

"یا اللہ.......... یہ تم لوگ تھانیداروں کی طرح سوال کیوں کرتے ہو؟ کھا لیا بس'

جہاں بھی کھایا ہو' اب ضروری ہے کہ ہر بات کی تفصیل مجھے ہر ایک کو بتانی ہو۔"

"مجرموں سے ایسے ہی سوال کیے جاتے ہیں۔" وہ بڑبڑائی۔ اس بار آواز اتنی اونچی تھی کہ گلو پھر سن کر بھنا گیا۔

"تیری بکریاں چرائی ہیں میں نے۔" وہ بپھر گیا۔ "اور تو سن چکی ہے کہ فتح مرا نہیں ہے اور ایک بات اور سن لے' مجھ سے آئندہ اس انداز میں بات مت کرنا۔ نہ میں مجرم ہوں اور نہ تو تھانیدار اور اب تو سالا کوئی تھانیدار بھی مجھ سے ایسے سوال نہیں کر سکتا۔" آخری جملہ اس نے سینہ چوڑا کر کے کہا۔

نازاں کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسے واقعی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی حالانکہ یہ کہنے کا مقصد وہ نہیں تھا جو گلو سمجھ رہا تھا۔ چاچا کو بھی شاید اس کا اس طرح کہنا برا لگا تھا۔ اس بار اس نے گلو کو جھڑکا بھی نہیں اور نہ ہی سر اٹھا کر ان دونوں میں سے کسی کو دیکھا۔ نازاں پر سناٹا سا چھا گیا۔ وہ سر جھکائے چارپائی پر آ بیٹھی۔ پانی سے بھرے ہوئے گلاس اس نے نیچے رکھ دیئے۔ چاچا ہاتھ دھونے گیا تو اس نے کن انکھیوں سے گلو کی طرف دیکھا جو دوسری چارپائی پر چت لیٹا آسمان کو تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ نازاں نے جلدی سے پلٹ کر چاچا کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی ہاتھ دھو رہا تھا۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"گلو! میں نے یونہی مذاق میں کہا تھا۔"

اس کے انداز میں ایسی لجاجت تھی کہ گلو چونک گیا۔ "ہیں.......... کیا؟" وہ تو بھول ہی گیا تھا کہ نازاں نے کیا کہا تھا۔ وہ تو آسمان کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس نے کتنے دن کے بعد آسمان دیکھا ہے' ورنہ اسے اپنے اردگرد دیکھنے کا ہوش ہی کب رہا تھا۔ اسے تو صرف پر پیچ راستے نظر آتے تھے یا جیل کی کال کوٹھڑی۔

کچھ دیکھنا بھی چاہتا تو فتح کے چہرے پر جما ہوا خون اسے کچھ بھی نہ دیکھنے دیتا تھا۔ دانیال کی کوٹھی کے ملبے میں دبے ہوئے یا فضا میں اڑتے ہوئے انسانی اعضا کے ٹکڑوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ سننا چاہتا تو دانیال گردیزی کی کوٹھی میں ہونے والے دھماکے کی آواز کے سوا کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا۔ امام دین کے بتائے ہوئے راستوں کے علاوہ کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔ آج ہی تو اسے آسمان دکھائی دیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس ہوئے تھے۔ پل بھر کو جو اس کا موڈ خراب ہوا تھا وہ ایک دم خوشگوار ہو گیا تھا۔

"تو نے سنا نہیں کیا؟" نازاں نے پھر سرگوشی کی وہ جلدی سے جواب چاہتی تھی کیونکہ چاچا الگنی پر لٹکے ہوئے تولیے سے ہاتھ پونچھ کر ادھر آنے ہی والا تھا۔

"کیا؟" گلو پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مجھے معاف کر دے۔ میں نے مذاق کیا تھا۔" اس نے چاچا کی طرف دیکھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

"جا میں نے معاف کیا۔" گلو نے ذرا شوخی سے بلند آواز میں کہا۔ نازاں غصے سے تپ کر لال ہو گئی۔

چاچا اتنی دیر میں چارپائی کے نزدیک آ چکا تھا۔ اس نے گلو کا جملہ بھی سن لیا تھا۔ حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا.......... کیا ہوا؟ کسے معاف کیا؟"

"اسے۔" گلو نے بے جھجک نازاں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"کیوں........... میں نے کیا تیری بکریاں چرا لی ہیں؟" نازاں جل کر بولی۔ یہ وہی جملہ تھا جو چند لمحے پہلے گلو نے کہا تھا۔ گلو زور سے ہنس پڑا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا گلو کہ تیری اس سے پرخاش کیا ہے؟ کیوں ہر وقت اس سے جھگڑتا ہے۔" چاچا نے آستینیں الٹتے ہوئے کہا۔

"تو اس کی باتیں نہیں سنتا؟ یہ خالہ کی طرح ہر وقت جلی کٹی باتیں کرتی رہتی ہے۔ آخر ہے نا اس کی بھانجی۔"

"اچھا چھوڑ۔" چاچا نے جلدی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ جھگڑا شروع ہوا تو وہ گلو سے کام کی کوئی بات بھی نہیں کر سکے گا۔ "یہ بتا یہ جانو کا کیا چکر ہے؟"

گلو یوں اٹھ بیٹھا جیسے اس کا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا گیا ہو۔ اس نے مختصراً کچھ ردوبدل کے ساتھ ساری داستان سنا کر چاچا کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس نے خیال رکھا تھا کہ اس دوران میں اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو احسان اللہ یا جانو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کی حد میں آتی ہو۔

"تو پھر ہم واپس کراچی چلتے ہیں گلو' بیس برسوں جس جگہ کے عادی ہوں' وہاں سے ہٹ کر نہ نیند آتی ہے نہ چین۔"

"ابھی ہمارا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے چاچا۔ اب پولیس تو میری تلاش میں نہیں ہے مگر فتح کی آدمی تو میری تلاش میں ہیں ناں!.. وہ مرا نہیں مگر میرے ہاتھوں زخمی تو ہوا ہے ناں!"

"تو جانو سے کہہ ناں کہ اس حرامزادے کے سارے آدمیوں کو جیل میں ڈال دے۔" چاچا نے نوالہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں چاچا' یہ بات کسی کو پتہ نہ چلے کہ جانو دراصل جانو نہیں' میجر احمد جان ہے۔" گلو نے جلدی سے کہا اور پلٹ کر نازاں سے بولا۔ "تو بھی سن لے۔ یہاں کی کوئی بات باہر گئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

"ہاں یہ تو مجھے بھی یقین ہے۔" اس نے جلے بھنے انداز میں جواب دیا۔

"یہ دیکھ........... دیکھ لیا تو نے؟" گلو نے چاچا کی طرف دیکھ کر نازاں کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ "سیدھی سادی بات کا کیسا ٹیڑھا جواب دیتی ہے۔"

"تو دھمکی کو سیدھی سادی بات کہتا ہے؟" نازاں بھی چپ ہونے والی نہیں تھی۔

"ارے گلو........... نازاں...........!" چاچا اتنا کہہ کر رہ گیا مگر اس کے چہرے سے اس وقت بے پناہ خوشی جھلک رہی تھی۔ گھر کی قبرستان ایسی خاموشی میں وہ ایسی آوازوں کو تو ترس گیا تھا۔ بڑے دھندلے دھندلے سے منظر اس کی گدلائی ہوئی آنکھوں میں بجلی کی طرح چمک چمک کر بجھنے لگے۔

"جا جا دیکھی ہیں تیری دھمکیاں! بڑا آیا مجھے اٹھا کر لے جانے والا۔ اتنی ہمت ہے تجھ میں؟" اس کے کانوں میں نقرئی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

"بہت ہمت ہے' بس وقت کا انتظار ہے۔" اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

اس اب بھی اچھی طرح یاد تھا کہ ایسا کہتے ہوئے اس کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگی تھیں۔

"وقت کسی کے لئے تھمتا نہیں ہے۔ تو نیم کے نیچے پڑا سوتا رہ جائے گا اور وقت اس درخت کے سارے پتے تک اڑا لے جائے گا' تجھے خبر بھی نہ ہو گی۔"

اس نے گویا پیشین گوئی کر دی تھی اور یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہ سوتا رہ گیا تھا اور وقت اس کی زندگی کے گھنے اور ہرے بھرے درخت کے سارے پتے تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اڑا کر لے گیا تھا۔ ایسی آندھی بن کر جس کے بعد بستیاں اجڑ جایا کرتی ہیں۔ اس کی بستی بھی ایسی اجڑی تھی کہ آج تک وہ سنبھل نہیں سکا تھا۔ وہ زمین پر سے واپس آیا تو پوری بستی میں گہرا سناٹا تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔ جیسے ساری بستی کے سارے ہی لوگ مر گئے ہوں۔ اس گہرے سناٹے میں اس کے بھاری قدموں کی دھمک سن کر سب دم بخود رہ گئے تھے۔

اندھیرا سہمے سہمے قدم رکھتا دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ مشرق سے نکلنے والا اندھیرا مغرب سے پھیلنے والی شفق اور ہلکی سی روشنی کو شکست دے دینا چاہتا تھا۔ پرندے بھی جیسے اس کے قدموں کی دھمک سے سہم کر گھونسلوں میں جا چھپے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی' اس کے ہروقت کھلے رہنے والے کواڑ سختی سے بند تھے۔ گلی میں بیٹھے رہنے والے بوڑھے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ بچے بستروں میں جا چھپے تھے۔ مائیں آہٹ پر کان دھرے دم بخود تھیں۔

اس نے چاروں طرف حیرت سے دیکھا تھا اور بھاری قدم اٹھاتا ہوا گھر کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنی چوڑی ہتھیلی کا زور ڈال کر دروازہ کھولا اور اسے یوں لگا جیسے جنازہ اسی آنگن سے اٹھا ہے۔ اس کی بہن لالی گھر کے اندر والی کوٹھری میں سہمی سکڑی بیٹھی تھی۔ اماں آنگن میں پڑی چارپائی پر چت لیٹی تھی۔ اس کے آنے پر بھی نہ اماں نے جنبش کی نہ لالی باہر نکلی تھی۔

آنگن میں وہ رونق بھی نہ تھی جو بلاناغہ اس وقت اس کی منتظر ہوتی تھی۔

"لالی!" اس نے بہن کو زور سے آواز دی اور چارپائی کے پاس پہنچ کر اماں کے قریب جا بیٹھا۔

یوں لگا تھا جیسے لالی نے کچھ سنا ہی نہ ہو' جیسے وہ بہری ہو گئی ہو۔

پر اماں یونہی مردے کی طرح سیدھی لیٹے لیٹے بولی تھی۔ "ڈاکے.......... جھاراں.......... جھاراں کو راجہ اٹھا کر لے گیا۔"

اور اسے یوں لگا تھا جیسے وقت تیز آندھی میں تبدیل ہو گیا ہو۔ پھر سارے ماہ وسال اڑ گئے۔ اماں فوت ہو گئی۔ لالی اکیلی رہ گئی' وہ دیوانہ ہو گیا۔ ساری دنیا میں جھاراں کو ڈھونڈنے کا عزم دل میں ہوتے ہوئے بھی وہ کسی کھونٹے کی طرح اس آنگن میں گڑا

رہ گیا۔ لالی کو کیسے چھوڑ جاتا؟ کس کے سہارے چھوڑ دیتا۔ زندہ رہنے کے لئے دو نوالے بھی ضروری تھے' اور غیرت اس بستی میں رہنے بھی نہیں دے رہی تھی۔ وہ لالی کو لے کر شہر آ گیا۔ جھونپڑا ڈال کر اسے وہاں چھوڑ کر وہ روزی کم اور جھاراں کو زیادہ ڈھونڈتا رہا۔ جب لالی کی حالت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ ہسپتال پہنچی تو وقت اسے بھی اڑا لے جانے کو تیار تھا' ذرا مہلت نہ دی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ لالی کو ٹی بی ہے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ اک ذرا ہوش میں آیا تو اسے بچا لینے کو تڑپ اٹھا مگر وہی تیز آندھی تھی' لالی حسرت سے دیکھتی ہوئی کہیں سے کہیں جا پہنچی اور وہ اکیلا' بالکل اکیلا رہ گیا۔ دل کا عزم بڑی دیر تک مردہ رہا۔ پھر دھیرے دھیرے جاگا تو وہ پھر سرگرداں ہو گیا تب سے اب تک سرگرداں ہی تھا۔ گلو نہ مل جاتا تو شاید پہلے کی طرح اب بھی گلی کوچوں میں مارا مارا پھر رہا ہوتا۔ برسوں سے آوازوں کو' آہٹوں کو ترسی ہوئی دیواریں اسے کھانے کو دوڑتی تھیں۔ پھر گلو کی معصوم باتوں نے آ کر ہی گھر کا سکوت توڑا تھا۔ اب دیواروں نے پہلے گلو اور اس کی پیار بھری سرگوشیاں سنیں' پھر اس کی ڈانٹ ڈپٹ سنی اور گلو کے بڑے ہوتے ہوتے وہ گالیوں پر اتر آیا۔ وہ گلو کو جو کچھ بنانا چاہتا تھا اس میں کامیاب نہ ہوا۔ وہ تو جان چکا تھا کہ خواب آنکھوں میں بھر لئے جائیں تو کانچ کے ٹکڑوں کی طرح کھٹکنے لگتے ہیں۔ پھر آنسو بہتے ہیں تو کبھی ریت بھر جاتی ہے۔ یہی آنسو اور یہی ریت سارے خواب بہا کر لے جاتی ہے اور آنکھیں ویسی ہی کوری رہ جاتی ہیں۔ گلو تو کچھ بھی نہیں جانتا تھا سو جانے کیسے کیسے خواب سجا بیٹھا۔ دولت مند بننے کے' ساری دنیا کو فتح کر لینے کے' اب اس کی آنکھیں بھی کوری تھیں۔ وہ سوچ بیٹھا تھا کہ اگر محبت کا کوئی خواب بھی گلو نے آنکھوں میں سجا لیا تو وہ ایک بھی لمحے کی دیر کیے بغیر اسے اس کے خواب کی تعبیر دے دے گا مگر اسے کوری آنکھیں لیے' زندگی بھر کے لئے اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

"چاچا چل اٹھ۔ کب تک بیٹھا رہے گا۔ تجھے کہیں جانا تھا ناں؟" نازاں اسے برسوں کے فاصلوں سے لمحوں میں کھینچ لائی۔

"آں.......... ہاں.......... کیا؟" وہ ایسے چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے یہاں پہلی بار آیا ہو۔

گلو نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بہت خالی خالی سی لگیں۔ وہ سمجھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاچا ان کے جھگڑے پر افسردہ ہو گیا ہے۔ بولا۔

"چاچا! میں بے وجہ جھک جھک نہیں کرنا چاہتا۔ اسے سمجھا دے۔ میرے منہ نہ لگا کرے۔"

"دیکھ چاچا۔ یہ منہ ہے لگنے والا؟" نازاں نے شوخی سے کہا۔

"دیکھا تو نے............ اب میں کچھ کہوں گا تو............ تو؟"

"اچھا اچھا بس کر۔" چاچا نے ہنس کر اسے اور چڑا دیا۔

"چاچا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تو اسے سر پر کیوں چڑھائے ہوئے ہے؟" وہ پھٹ پڑا۔ "پتہ نہیں کیوں تو اسے یہاں............"

"گلو!" چاچا نے گھبرا کر اسے آگے کچھ کہنے سے روک دیا۔ "جا بیٹا! تو جا کر آرام کر۔" چاچا نے آخری جملہ نازاں سے کہا تھا۔ نازاں اسے گھورتی ہوئی اٹھ گئی۔ کھانے کے برتن نلکے کے نیچے رکھ کر وہ الگنی سے کپڑے اتارنے لگی۔ چاچا ہاتھ پاؤں دھو کر پھر چارپائی پر آ بیٹھا۔ شام دیواروں پر اتر آئی تھی۔ گلو کو آج موسم بہت اچھا لگ رہا تھا حالانکہ نازاں سوا نیزے پر جلتے سورج کی طرح اسے تپا جاتی تھی مگر لمحوں میں ہی اس کے اندر کی ساری تپش پگھل کر بہہ جاتی تھی۔

چاچا چارپائی پر تکیہ رکھ کر لیٹ گیا۔ بہت سا وقت گہری خاموشی میں گزر گیا۔ پھر اچانک چاچا کی سرگوشی سنائی دی۔ "گلو! تو نازاں سے ایسی باتیں نہ کیا کر بیٹا۔"

"کیوں؟" اس کے اندر کی ساری ٹھنڈک ہوا ہو گئی۔ "تو آخر کب تک اسے برداشت کرے گا؟ چھوڑ کر آ اس کے ماں باپ کے پاس اسے............"

"پہلی بات تو یہ گلو کہ اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ ایک خالہ تھی سو جان ہار گئی۔ دوسری بات یہ کہ میں اسے تیری خالہ سے مانگ چکا تھا تیرے لیے۔"

"مگر میں نے تو ہاں نہیں کی تھی۔ تو اتنے بڑے بڑے فیصلے اکیلے کیسے کر سکتا ہے؟"

"یہ فیصلہ میں نے تیری مرضی سے کیا تھا۔ زیادہ بک بک نہ کر تو۔ بھول گیا' مجھے کہتا تھا نئے کپڑے پہن کر جانا' تو کوئی کسی سے کم ہے کیا؟ اب میں کہنے لگا ہوں۔" چاچا نے اس کی نقل اتاری۔

"مگر گیا تو نہیں تھا ناں!" وہ برابر بحث کر رہا تھا۔

"دیکھ گلو یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ جوان لڑکی کا معاملہ ہے۔ آخر تجھے شادی تو کرنا ہے نا! اور اب تو قتل والا چکر بھی نہیں رہا۔ پھر بیٹا یہ تو سوچ کہ میں گھر کو گھر دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔ سچ کہتا ہوں کہ جب تم دونوں لڑتے ہو تو بھی مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میرے گھر میں آوازیں گونجتی ہیں تو لگتا ہے زندگی اب شروع ہوئی ہے۔ جب تک تو چھوٹا تھا تب تک تو ٹھیک تھا مگر جب سے بڑا ہوا تھا' میں تیرے انتظار میں خاموش دیواروں کو تکتا رہتا تھا۔ مجھے پہلی بار خوشی ملی ہے گلو' مجھ سے یہ خوشی تو نہ چھین۔"

چاچا نے ایسی حسرت سے کہا کہ گلو دم سادھے لیٹا رہ گیا۔ مگر اتنا بڑا فیصلہ کرنا' وہ بھی اپنی مرضی کے خلاف اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ پتہ نہیں ایسا سوچتے وقت کیوں وہ ننھا سا چہرہ' آنکھوں سے بہتی آنسوؤں کی لکیریں بنائے اس کے سامنے گھومنے لگتا تھا اور ہونٹوں کے قریب کا سوجا ہوا حصہ اور اس کے سوجن پر نکلا ہوا دانہ گھنٹوں اس کے دماغ میں اٹکا رہتا۔ فیصلہ کرنے کی ساری قوت سلب ہو جاتی تھی۔

"بول............" چاچا نے اسے چونکا دیا۔

"تو تو ایسا صرف اس لئے کرنا چاہتا ہے کہ تیرے گھر میں آوازیں گونجتی رہیں اور یہی آوازیں جو میرا خون پئے جا رہی ہیں اس کا کیا ہو گا۔ چاچا عقل سے کام لے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ میں فی الحال شادی نہیں کر سکتا۔ دوسری بڑی اہم بات یہ ہے کہ لوگ کیا کہیں گے کہ یہ نہ تیری بیٹی ہے اور نہ میری بیوی' پھر یہاں کیوں رہ رہی ہے۔ کیا جواب دے گا انہیں؟"

"دیکھ گلو! اگر تو اس سے شادی نہیں کرے گا تو نہ کر۔ یہ کس نے کہہ دیا کہ یہ میری بیٹی نہیں ہے۔ کان کھول کر سن لے۔ آج سے یہ میری بیٹی ہے۔ بالکل سگی بیٹی۔" اس نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا اور گلو ہنس پڑا۔

"چل ٹھیک ہے تو دنیا سے کہہ دینا کہ تو نے بھی کبھی محبت کی تھی' محبوبہ بیٹی پیدا کر کے مر گئی اور اب تو اپنی اس بیٹی کا دیوانہ اس لئے ہے کہ یہ تیری محبوبہ کی نشانی............"

اور پھر گلو کو لگا جیسے اچانک بھونچال آ گیا ہو۔ اس کے رخسار پر پڑنے والا تھپڑ کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طاقت ور آدمی کا نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے پورے وجود کو ہلا گیا۔ وہ بے اختیار مڑ گیا۔ یہ تھپڑ کا زور نہیں تھا' حیرت اور اچانک آ کر گھیر لینے والے دکھ کی طاقت تھی۔ ایک بے ساختہ چیخ نے پورے گھر کی خاموشی کو چکنا چُور کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا تھا۔ نازاں آواز سن کر بھاگتی ہوئی آ گئی اور اب کھڑی حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

"حرامزادے........... سور کے بچے.......... تیرے منہ سے یہ بات نکلی کیسے؟ کیسے کہہ دیا تو نے کہ وہ مر گئی ہے۔ وہ مر گئی........... ہیں!!........... ایسی بددعا دینا گوارا کیسے کر لیا تو نے اسے؟ ارے تیرا دل نہیں پھٹا۔ تیری نسوں میں دوڑتے لہو نے کیسے برداشت کر لیا۔ ارے کوئی اولاد بھی ایسی بددعا دے سکتی ہے؟؟"

چاچا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ گلو نے اب تک اس کی یہ حالت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے منہ سے کف بہنے لگا تھا۔ پورا جسم یوں کانپ رہا تھا جیسے اسے کپکپی چڑھ گئی ہو۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں اور ماتھے کی ساری رگیں ابھر کر نیلی پڑ گئی تھیں۔ اٹھا تو وہ چاچا پر چڑھ دوڑنے کو تھا مگر پھر اس کی پھیلی ہوئی بانہوں نے گرتے ہوئے چاچا کو یوں تھام لیا جیسے وہ کانچ کا پتلا ہو۔ نازاں بھی چیختی ہوئی چاچا کی طرف لپکی تھی۔

"پانی لا۔" گلو چیخا۔ وہ دوڑ کر پانی کا کٹورا بھر لائی۔ گلو چاچا کو چارپائی پر لٹا چکا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا کہ چاچا کسی مردے کی طرح بے حس و حرکت ہو چکا ہے۔

"چاچا........... چاچا...........!" وہ اس کے گال تھپتھپا کر اسے آوازیں دینے لگا۔ نازاں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔ گلو نے چاچا کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس کے حلق میں پانی ٹپکانے کی کوشش کی' سختی سے ایک دوسرے پر جمے دانتوں کے درمیان ٹوٹے دانتوں کی بنی ہوئی جگہ سے کچھ پانی حلق میں اترا' کچھ اس کی ٹھوڑی سے بہہ کر گریبان تک چلا گیا۔ پانی ٹپکانے کے بعد اسے توقع تھی کہ وہ ہوش میں آ جائے گا۔ ہلکے ہلکے پھولتے پچکتے سینے پر نگاہیں جمائے وہ یوں بیٹھا تھا جیسے اگر اس نے سینے سے نگاہ ہٹائی تو اس کا سانس بند ہو جائے گا۔

"کہیں سے ڈاکٹر کو لا۔ اسے کچھ ہو گیا تو..........." نازاں ابھی تک رو رہی تھی۔

"آں..........." اس نے سر اٹھا کر نازاں کو دیکھا۔ پل بھر میں ندامت اسے مرجھا

ئی کہ جس لڑکی کو گھر میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ وہ تو چاچا سے اتنی محبت رنے لگی اور وہ........... احسان فراموش جسے اس نے ننگا بھوکا' چھچھوڑے کی طرح اٹھا کر پوسا' وہ پتھر دل بنا اس کے ساتھ جی رہا تھا۔ نازاں کا چہرے خوف اور دکھ سے سفید لٹھے طرح ہو گیا تھا۔ وہ چاچا کے پاس بیٹھ کر رو رو کر اسے آوازیں دینے لگی تھی۔

"ڈاکٹر..........." گلو سوچ رہا تھا کہ یہاں ڈاکٹر کہاں ملے گا' یہ تو اسے پتہ ہی نہیں ا۔ دو روز ہی تو انہیں آئے ہوئے گزرے تھے' گلو نے ٹھیک سے چاروں طرف دیکھا ی نہ تھا۔ جانے یہاں کوئی ڈسپنسری ہو گی بھی یا نہیں؟ پھر بھی وہ باہر نکل کر کسی سے پوچھ لتا تھا۔ وہ اٹھنے لگا پھر اسے خیال آیا کہ گھر کی چیخ پکار محلے والوں نے سنی ہو گی' نئے لوگ تھے' جانے کیا سوچتے ہوں گے۔ اس کا بدن وہیں جم گیا۔

"ڈاکٹر کو لا گلو........... خدا کے واسطے۔ تو اس کے بنا جی سکتا ہے مگر........... ں........... میں کیا کروں گی؟ اس کے بعد کہاں جاؤں گی' کیسے جیوں گی؟ ڈاکٹر کو لا۔" وہ ں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بلک اٹھی۔

"میں........... میں بھی کب جی پاؤں گا اس کے بنا۔" گلو یہ بات کہہ نہیں سکا بس آنکھیں صاف کرتا ہوا باہر کی طرف لپکا۔ گھر سے باہر قدم رکھتے ہی برابر والے گھر کے روازے پر کھڑا بیس بائیس برس کا لڑکا نظر آ گیا جو گلو کو باہر آتا دیکھ کر انجان بننے کی وشش میں ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ ورنہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی توجہ اس گھر ی جانب تھی۔ برابر والے گھر کی کھڑکی بھی اچانک کھٹکے سے بند ہو گئی تھی۔

"بھیا........... اے بھیا........... یہاں کوئی ڈاکٹر ہے؟" گلو لپک کر اسی کے قریب پہنچ گیا۔

"جی........... ڈاکٹر!" وہ فوراً نہ صرف متوجہ ہو گیا بلکہ خیریت بھی پوچھنے لگا۔ "ہوا کیا........... خیریت تو ہے ناں؟"

"بس جی........... وہ چاچا۔ اسے غصہ جلدی آتا ہے اور بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ اس کی حالت خراب ہے۔ میں منع کرتا ہوں کہ زیادہ غصہ نہ کیا کرے مگر سنتا ہی نہیں ہے۔ اپنے رشتے داروں پر غصہ کر رہا تھا جنہیں چھوڑ کر ہم یہاں کل ہی آئے ہیں۔" گلو صفائیاں پیش کرنے لگا پھر اسے چاچا کا خیال آ گیا۔ "وہ ڈاکٹر..........."!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں انہیں دیکھ سکتا ہوں پھر اگر ضرورت پڑی تو.........."

"اوہ.......... اچھا اچھا.......... جلدی کریں بھیا۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔

"ایک منٹ' میں فرسٹ ایڈ باکس لے لوں۔" وہ تیزی سے گھر میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا کالے رنگ کا بکس تھا۔ گلو اسے لئے ہوئے گھر میں داخل ہوا تو چاچا ہوش میں آ چکا تھا۔ نازاں اس پر جھکی ہوئی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"تو غصہ کیوں کرتا ہے چاچا۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دے۔ مجھے کسی یتیم خانے میں چھوڑ آ.......... میں چلی جاؤں گی چاچا مگر تو اپنی جان پر عذاب نہ جھیل۔"

اور چاچا ہاتھ سے منع کر رہا تھا۔ شاید اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ دکھ کی کئی لہریں ایک ساتھ گلو کے دل میں اٹھ کر ٹیس چھوڑ گئیں۔ وہ لڑکا آگے بڑھا۔ نازاں ان لوگوں کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑنے لگی۔ گلو نے آگے بڑھ کر چاچا کا ہاتھ تھامنا چاہا تو اس نے منہ پھیر کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اس وقت اس سے بات کرنا بیکار تھا۔ لڑکے نے بکس میں سے اسٹیتھو سکوپ نکال لیا اور چاچا کے سینے پر رکھ کر چیک کرنے لگا۔

"کیا محسوس کر رہے ہیں آپ؟"

"اچھا.......... اچھا ہوں۔" چاچا بمشکل بولا۔

وہ لڑکا کچھ دیر تک چیک کرتا رہا پھر بولا۔ "غصہ کرنا جبھی تو حرام قرار دیا گیا ہے کہ یہ غصہ کرنے والے کو بھی تکلیف پہنچاتا ہے اور دوسروں کو بھی۔"

آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے نازاں کی طرف کچھ ایسے انداز میں دیکھا کہ گلو کے جبڑے بھنچ گئے۔ اس کا جی چاہا کہ نازاں کو ڈانٹ کر اندر بھیج دے۔ "اس کو یہاں کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ کمینی کہیں کی' اندر نہیں جا سکتی تھی۔" وہ دل میں سوچ کر رہ گیا۔

"اب چاچا کیسا ہے؟" گلو نے جلدی سے پوچھا تو اس کی نگاہیں نازاں سے پھسل کر اس پر آ ٹکیں۔

"اب تو ٹھیک ہیں۔ کچھ دیر تو آرام کرنے دیں اگر پھر بھی بہتر محسوس نہ کریں تو اسپتال لے جائیں۔ اسپتال یہاں سے دور نہیں ہے۔ میں دوا دے دیتا مگر.......... ابھی میں پڑھ رہا ہوں۔ خود بھی کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا۔ ویسے ان کا بلڈ پریشر ہائی نہیں' لو ہو گیا ہے۔ آپ انہیں نمک اور چینی کا پانی پلا دیں بلکہ اگر گلوکوز پلا دیں تو اچھا ہے۔ ان کی غذا کا بھی خاص خیال رکھیں۔ انہیں اچھی غذا کی بہت ضرورت ہے۔"

"ہاں جی.......... میں ابھی لے آؤں گا گلوکوز۔" اس نے جلدی سے سر ہلایا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ لڑکا جلد از جلد وہاں سے چلا جائے۔

"اگر پھر کبھی ضرورت پڑے تو آپ بلا تکلف مجھے بلا لیجئے گا۔"

وہ نازاں سے مخاطب ہوا تھا۔ گلو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا اس منحوس لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر زمین سے اٹھا لے اور باہر اس کے دروازے پر پھینک آئے۔

"میں آپ کے برابر والے گھر میں رہتا ہوں۔ میرا نام عاطف ہے۔" اب وہ مسکرا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے جی۔ آپ کا بہت شکریہ۔" گلو کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ نازاں کے علاوہ' وہ بھی چونک اٹھا۔ پھر خدا حافظ کہتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

گلو وہیں جما کھڑا رہا اور اس کے باہر جاتے ہی اس نے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ "اپنے اور غیر کا خیال نہیں ہے تجھے؟ اندر نہیں جا سکتی تھی؟" وہ نازاں کی طرف دیکھ کر غرایا اور چاچا کے پاس پہنچ گیا۔ "میرے باپ مجھے معاف کر دے۔ مگر خدا کے واسطے یہ سب مت کیا کر۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کر چاچا۔"

"تو کون سا میرا اپنا ہے؟" اس کی پشت سے آواز آئی۔ "جیسا تو غیر' ویسا وہ غیر۔"

گلو کرنٹ کھا کر مڑا تھا مگر سامنے پڑے چاچا کے خیال سے ضبط کر کے پھر سیدھا ہو گیا۔ "چاچا میرے حال پر رحم کر۔ اب جیسا تو کہے گا ویسا ہی کروں گا مگر.......... اپنی حالت کو سنبھال۔"

چاچا کچھ بھی نہ بولا۔ چپ چاپ کروٹ لئے لیٹا رہا۔ آنگن میں اتری شام کالی ہوتی جا رہی تھی۔ نازاں لالٹین جلانے لگی اور گلو چاچا کا خیال رکھنے کو کہتا ہوا باہر چلا گیا مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتے جاتے کہہ گیا۔ "دروازے پر کنڈی لگا لے اور جب تک میں آواز نہ دوں نہیں کھولنا۔"

"ڈاکو آنے والے ہیں ناں اس گھر میں۔" نازاں دھیرے سے بڑبڑائی' گلو نے سن بھی لیا مگر اس وقت وہ چاچا کی وجہ سے چپ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد واپس آیا تو گلوکوز کے بڑے ڈبے کے علاوہ اس کے ہاتھ میں پھلوں کے تھیلے بھی تھے۔ اس نے خود ہی چاچا کو بڑے گلاس میں گلوکوز بنا کر دیا جسے اس نے پینے سے صاف انکار کر دیا۔ "تو کیوں میرے لئے اتنی تکلیف کر رہا ہے؟ میں مر نہیں رہا ابھی زندہ ہوں۔ اپنے کام اپنے ہاتھ سے کر سکتا ہوں۔"

"چاچا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ.......... مجھے معاف کر دے۔"

"یہ تیرا حکم ہے؟" چاچا غرایا۔

"چاچا خدا کے واسطے!" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ "میں واقعی شرمندہ ہوں۔ اب اگر تو نہیں مانا تو.......... تو میں یہاں سے ہی چلا جاؤں گا۔"

"تو کیوں جائے گا' تیرا تو یہ گھر ہے' میں ہی چلی جاؤں گی۔ نہ میں ہوں گی نہ تو چاچا سے جھگڑا کرے گا۔" نازاں نے لالٹین دیوار پر لگے لوہے کے کنڈے میں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"میں تجھ سے بات نہیں کر رہا۔" گلو نے حیرت انگیز طور پر نرم لہجے میں جواب دیا۔ "اب بلاوجہ چاچا کو پریشان کرنے والی باتیں نہ کر۔"

اس بار نازاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چاچا نے آنکھیں موند لیں۔ گلو' گلوکوز لیے اب بھی کھڑا تھا اور چاچا آنکھیں موندے لیٹا تھا۔

"اچھا لے.......... یہاں رکھا ہے۔ اپنے ہاتھ سے پی لے۔" گلو نے گلاس زمین پر رکھ دیا۔ چاچا نے آنکھیں اب بھی نہ کھولیں۔ نازاں نے آگے بڑھ کر گلاس اٹھا لیا اور چاچا کے سر کو تھام کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔ نازاں کے کہنے پر چاچا فوراً اٹھ بیٹھا۔ اس نے غٹاغٹ گلاس بھر پانی پی لیا۔

گلو سامنے والی چارپائی پر بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ نازاں نے چاچا کو سو جانے کے لئے کہا۔ وہ چپ چاپ سو گیا۔ گلو لیٹا سوچتا رہ گیا کہ اس نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی

جو اس بوڑھے کو باؤلا کر گئی۔ کیا وہ کسی سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔ کیا وہ زندہ ہے؟ اگر زندہ نہ ہوتی تو چاچا اس کے مرنے کی بات سن کر باؤلا کیوں ہوتا اور اگر وہ زندہ ہے تو.......... کہاں ہے؟ چاچا نے اس سے شادی کیوں نہیں کی۔ کیوں بلاوجہ میری پرورش میں لگ گیا۔ میری ماں کو تلاش کرنے کی بجائے اس نے اپنی محبوبہ کو تلاش کیوں نہیں کیا۔ وہ زندہ ہے تو اسے یہ بھی تو پتہ ہوگا کہ وہ کہاں ہے؟ شکورا کون تھا؟ ایک بار چاچا نے کہا تھا کہ شکورے جیسے بدمعاش.......... مگر یہ تو اس نے میری ماں کے بارے میں کہا تھا۔ پتہ نہیں.......... پتہ نہیں میری ماں کے بارے میں کہا تھا یا کسی اور کے بارے میں۔ کسی اور ہی کے بارے میں کہا ہوگا ورنہ میری ماں کے بارے میں تو وہ بتا رہا تھا کہ وہ وہیں بستی میں' چبوترے کے پاس جھونپڑی میں رہتی تھی۔ وہ میری ماں کو میرے لئے تلاش کرتا ہوگا مگر اپنے لئے بھی تو اسے کچھ کرنا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں کون شکورا' اس کا سب کچھ چھین کر لے گیا۔ کاش مجھے پتہ چل جائے تو میں.......... میں.......... مگر میں تو اپنی ماں کو ہی تلاش نہیں کر پایا۔ اتنی بڑی دنیا میں کوئی کھو جائے تو بھلا کیسے ملے..........؟ اور پھر وہ جسے کسی کی تلاش بھی نہ ہو' وہ اپنے تلاش کرنے والے سے کیسے مل سکتا ہے۔ پھر اچانک اسے چاچا پر ترس آنے لگا۔ نازاں پر بھی ترس آنے لگا۔ دونوں ہی تو اکیلے تھے' اور خود بھلا اس کا کوئی کہاں تھا۔ بلاوجہ نازاں کہہ رہی تھی کہ اسے یتیم خانے چھوڑ آئے۔ یہ یتیم خانہ ہی تو تھا اور ایسا یتیم خانہ جس میں رہنے والے ہر آدمی کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ تھا۔ ٹھیک ہے مجھے کیا' میں تو نوکری پر جاؤں گا۔ یہ رہے گی تو اچھا ہے چاچا کا خیال رکھے گی۔ چاچا کا دل بھی بہلا رہے گا۔ چاچا کی بیٹی بن کر تو رہ سکتی تھی۔ یوں بھی محلے والوں کو کیا پتہ کہ یہ تینوں آپس میں کون ہیں؟ اور کون سا ہمیں یہاں رہنا ہے۔ تھوڑے دن کی بات ہے پھر وہیں اپنے گھر جا کر رہیں گے۔ وہاں تو سب کو پتہ ہے کہ خالہ مر گئی اور نازاں کون ہے۔ گلو یہ سب سوچ کر مطمئن ہو گیا۔ اس نے کروٹ لے کر چاچا کی طرف دیکھا۔ وہ بے دم سا پڑا سو رہا تھا۔

"اسے غذا اور دیکھ بھال کی سخت ضرورت ہے۔" کسی نے اسے سہا دیا۔ "اگر اسے کچھ ہو گیا تو.........." اندر سے کوئی پھر بولا۔ گلو گھبرا کر اٹھ گیا۔

"نازاں.........!" اس نے پہلی بار اس کا نام لے کر اسے پکارا تھا۔ وہ اٹھا تو آنگن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سناٹے نے اسے چونکا دیا۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دل گھبرانے لگا۔ نازاں نے اس کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ "نازاں............ او نازاں۔" وہ پھر زور سے پکار اٹھا۔ اس بار اس کی پکار سے چاچا کی آنکھ بھی کھل گئی۔

"کیا............ کیا ہوا؟" وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"کچھ نہیں چاچا............ تو سو جا۔" اس کا گھبرایا ہوا انداز چاچا کو بھی گھبرا گیا۔

"کہاں ہے نازاں............ بول کہاں ہے؟" وہ ایک دم چیخ اٹھا تھا پھر وہ اٹھ کر اندر کمرے کی طرف بھاگا۔ گلو کو بھی خیال آیا کہ وہ وہیں ہوگی۔ گلو اس کے پیچھے لپکا ہی تھا کہ چاچا کی چیخ نے اسے دہلا دیا۔ گلو ایک ہی چھلانگ میں کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں چاچا بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ چکا تھا۔ جوں ہی گلو کی نگاہ اندر گئی اس کے بدن میں جیسے زوردار کرنٹ لگا اور چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔

کمرے کے فرش پر نازاں بکھری سی پڑی تھی۔

"نازاں............ بیٹے کیا ہوا؟" چاچا اسے جھنجوڑ رہا تھا۔

گلو بھی بھاگ کر اس کے قریب جا پہنچا۔ وہ شاید بے ہوش تھی۔ بے سدھ' بے حس و حرکت۔ گلو نے اس کی کلائی تھام کر سب سے پہلے نبض دیکھی جو مدہم رفتار سے چل رہی تھی۔ "شاید اس کا بلڈ پریشر لو ہو گیا ہے۔" اسے فوراً ہی یاد آ گیا کہ کچھ دیر پہلے اس لڑکے نے چاچا کے لئے بھی یہی کہا تھا۔ شاید صدمے سے بلڈ پریشر لو ہو جاتا ہے۔ اسے بھی تو صدمہ ہوا ہو گا۔ یہ سب باتیں گلو چند ثانیوں میں سوچ بیٹھا۔

"تو جا............ گلوکوز لا۔ مگر............ یہ تو............ یہ تو بے ہوش ہے گلو۔ تو ڈاکٹر کو لے آ۔ وہ دیکھ لے گا تو............" چاچا گھبراہٹ کے مارے پیلا پڑ چکا تھا۔

"گلو تیزی سے باہر نکل گیا مگر باہر نکلتے ہی ٹھٹک کر رہ گیا۔ "کون ڈاکٹر............؟ یہ لونڈا............؟ نہیں اس حرامزادے کے تو مزے آ جائیں گے۔ اس کے سینے پر آلہ رکھ کر بیٹھا رہے گا گھنٹوں۔" بڑی سفاکی سے گلو نے سوچا تھا اور بڑے ہی کھور پن سے واپس لوٹ آیا تھا۔

"کیا ہوا؟" چاچا نے اس کے قدموں کی چاپ سن کر سر اٹھایا۔ وہ کٹورا ہاتھ میں لئے پانی سے گیلا ہاتھ نازاں کے چہرے پر پھیر رہا تھا۔

"وہ............ وہ نہیں ہے۔ کہیں گیا ہوا ہے۔" گلو نے نظریں چرا کر جواب دیا۔ "میں گلوکوز دیتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ گلوکوز بناتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے۔ بھلے سے یہ مرجائے مگر اس حرامزادے کو تو نہیں بلاؤں گا۔ کیسے مسکرا کر کہہ رہا تھا کہ جب ضرورت ہو بلا لیجئے گا۔ اندھے کو میں کھڑا نظر نہیں آ رہا تھا جو نازاں سے کہہ رہا تھا۔ ٹانگیں نہ توڑ دیتا اگر وہ بلانے جاتی تو۔ سالی کی چٹیا کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دیتا۔" وہ غصے سے کھول رہا تھا۔

"لے آ گلو............ کیا کر رہا ہے۔ دیکھ تو ٹھنڈی پڑی ہے بٹیا۔" چاچا کی کانپتی لرزتی آواز میں خوف کی سنسناہٹ سی گونج رہی تھی۔ وہ جلدی سے گلاس لئے اس کے کمرے کی طرف دوڑا۔ "گلو! دیکھو تو اسے............ ارے یہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی؟" چاچا کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیل کر جیسے پورے چہرے پر چھاتی جا رہی تھیں۔ "اسپتال لے چل گلو اسے۔" اس نے التجا کی۔

نازاں کو اب تک ہوش نہیں آیا تھا' یہ بات گلو کے لئے بھی پریشانی کی باعث تھی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے اپنا فیصلہ بدل ڈالا اور گلوکوز کا گلاس چاچا کے ہاتھ میں تھما کر باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ برابر والے گھر کا دروازہ بجا رہا تھا۔ اس بار دروازہ کھلتے ہی اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔ وہ اتنا ہی روشن چہرہ تھا۔ معصوم بڑی بڑی آنکھوں میں جیسے بجلی کے کوندے لپک رہے تھے۔

"جی۔" اس نے پوچھا۔

"جی وہ............ وہ جی ڈاکٹر صاحب سے کام ہے۔"

"وہ تو نہا رہے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں؟"

"نہیں جی............ وہ نازاں بے ہوش ہے۔ پتہ نہیں کیا ہو گیا۔"

"نازاں............؟"

"جی وہ نازاں............ میری............ میرے چاچا کی بیٹی۔"

"اچھا ایک منٹ۔" اتنا کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ اس نے وہیں سے عاطف کو آواز دے کر بتایا کہ برابر والے نئے پڑوسی آئے ہیں۔ وہ جلدی سے باہر آ جائے پھر دروازے سے جھانک کر بولی۔ "اگر آپ کہیں تو میں چلوں۔ عاطف بھی آ رہے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں جی........... جلدی کریں۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔"

وہ گلو کے ساتھ ہی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔ گلو اسے لئے ہوئے سیدھا کمرے میں چلا آیا۔ چاچا حیران پریشان ابھی تک فرش پر نازاں کے قریب اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور گلو کے ساتھ کھڑی لڑکی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"یہ........... یہ کسے لے آیا تو........... ڈاکٹر کہاں ہے؟"

"وہ آ رہے ہیں۔" لڑکی یہ کہہ کر نازاں کے قریب بیٹھ گئی۔ "کیا ہوا تھا؟" اس نے پہلے چاچا کی طرف پھر گلو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"بس جی کیا بتائیں..........." پتہ نہیں چاچا کیا کہنے والا تھا کہ گلو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پتہ نہیں جی۔ میں نے آواز دی۔ جواب نہیں ملا تو میں ادھر آیا۔ یہاں یہ گری ہوئی بے ہوش پڑی تھی۔"

چاچا نے پھر کٹورے میں ہاتھ بھگو کر اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس بار نازاں کی پلکیں لرز اٹھیں۔

"ہوش آ رہا ہے۔" اس لڑکی نے کہا تو گلو نے چونک کر نازاں کی طرف دیکھا۔ اسے اس بار نازاں پر ترس آ گیا۔ بے چاری نے اس کی باتوں کو دل پر لے لیا تھا ورنہ بلاوجہ کون بے ہوش ہوتا ہے۔

"مگر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی تھی؟" گلو نے سوچا۔

"نازاں........... بٹیا! اٹھ بٹیا۔" چاچا کے چہرے کا زرد رنگ دھیما پڑ گیا تھا۔

"میں........... میں........... چاچا........... وہ۔" نازاں پہلے تو یونہی فرش پر پڑی آنکھیں پٹ پٹا کر بے ربط سا بولتی رہی پھر جونہی اس کی نگاہ اپنے دائیں جانب بیٹھی لڑکی پر پڑی وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ "کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں........... آپ شاید بے ہوش ہو گئی تھیں۔" اس لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ گلو نازاں کو بھول کر اس لڑکی کے رخساروں میں پڑنے والوں گڑھوں میں ڈوب گیا۔

"اٹھ بٹیا! چارپائی پر لیٹ جا۔" چاچا نے اسے سہارا دیا۔ نازاں گلو کو گھور رہی تھی۔ گلو نازاں کی نگاہوں کی تپش سے بے خبر اس لڑکی کے چہرے کو تکتا رہا۔

"ایسا کیا ہو گیا تھا مجھے؟" نازاں بولی تو اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ "اور یہ کون ہیں؟" اس نے کچھ اس انداز میں جھٹک کر بات کی گلو چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں ڈاکٹر عاطف کی بہن ہوں۔" وہ کسی کے جواب دینے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ چاچا کے کمزور بازوؤں کا سہارا لے کر نازاں کھڑی ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ لڑکی بھی کھڑی ہو گئی۔ چاچا نے اسے چارپائی پر لٹایا ہی تھا کہ دروازے پر دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ گلو دروازے تک پہنچا بھی نہ تھا کہ عاطف بوکھلایا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ گلو بھنا گیا۔ "تمیز نہیں ہے حرامزادے کو۔" وہ دل ہی دل میں غرایا مگر اتنی دیر میں وہ نازاں کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

"کیا ہوا........... کیا ہو گیا تھا؟" وہ چاچا اور اپنی بہن سے پوچھ رہا تھا۔ چہرے پر یوں ہوائیاں اڑ رہی تھیں جیسے خود اسے کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ چاچا اسے بتانے لگا مگر اس سے پہلے ہی اس نے نازاں کی گول کلائی تھام لی۔ نازاں کے چہرے پر چند لمحے پہلے چھا جانے والی ناگواری دور ہو چکی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ گلو کے جبڑے بھنچ گئے۔ وہ نازاں پر اتنا جھک چکا تھا کہ سامنے کھڑے گلو کو نازاں کا چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ گلو اس بار گھوم کر دوسری طرف آ گیا۔ نازاں کا چہرہ اس جانب تھا۔ عاطف کی آنکھوں میں سمندر سا ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہو رہا تھا۔ نبض تھامے کافی دیر گزر گئی۔ کم از کم گلو کو تو ایسا ہی لگا جیسے وہ گھنٹوں سے یہاں کھڑا ہے۔ وقت تھم گیا ہے۔ چاچا اور وہ لڑکی پتھر بن چکے ہیں۔ خود عاطف اور نازاں کے بدن میں بھی کوئی جنبش نہیں تھی بس عاطف کی آنکھیں متحرک تھیں۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی پتلیاں زندہ تھیں۔ باقی سب کچھ جیسے ختم ہو چکا تھا' مر چکا تھا۔

پھر جانے کیا ہوا۔ شاید وہ ایک دم چیخ اٹھا تھا۔ سبھی اچھل پڑے۔

"میں........... میں ٹھیک ہوں۔" نازاں کی خوف زدہ آواز گونجی' اور ساتھ ہی اس نے اپنی کلائی اس کی گرفت سے چھڑائی' اور کروٹ لے کر بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔

سب کچھ زندہ ہو گیا۔ متحرک ہو گیا۔ گلو کا جی چاہا کہ عاطف کو دھکے دے کر باہر نکال دے۔ اس کے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ قمیض گیلی ہو کر بدن سے چپک چکی تھی۔ وہ شاید باتھ روم سے نکل کر سیدھا ادھر ہی آ گیا تھا۔ "ہوا کیا تھا؟" اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کانپتی ہوئی سی آواز فضا میں چکر کھاتی ہوئی گلو تک پہنچی۔

"بنتی ہے اور کیا ہونا تھا!" وہ بولا نہیں تھا' اس نے جیسے چنگاریاں اڑائی تھیں۔

چاچا ایسے بلبلا کر اس کی جانب گھوما تھا جیسے وہ ساری کی ساری چنگاریاں اسی کے بدن پر گری ہوں۔

"باؤلا ہو گیا ہے تو؟" وہ دھاڑا۔

"ایک منٹ............ پلیز!" جیسے برف پوش پہاڑوں سے جھونکا آیا ہو۔ اس لڑکی نے گھبرا کر ہاتھ اٹھایا تھا اور اس کی کلائی کی ساری چوڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بج اٹھی تھیں۔

نازاں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گلو کو دیکھا۔ وہ لڑکا چور چور سا کھڑا تھا۔ گلو ایک دم پگھل گیا تھا۔ اسے پگھلانے میں نازاں کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دہکتی بے بسی کا ہاتھ قطعی نہ تھا۔ چوڑیوں کی چھنک تھی یا اس مدھر آواز کی حدت۔

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔"

"جی.......... مگر دیکھیے نا' اب ذرا ذرا سی بات پر یہ یوں بے ہوش ہونے لگی تو۔" گلو ایک دم ہی بے حد مہذب ہو گیا تھا۔

"وہ ذرا سی بات تھی؟" چاچا غرایا۔ "سن لے گلو! اب اگر تو نے اپنا رویہ درست نہ کیا تو.........."

"اچھا بابا.......... مجھے معاف کر دو۔ اب اگر میں کسی سے بات کروں تو.........."

گلو پلٹ کر برآمدے میں چلا آیا مگر اس کا دل اس کمرے میں پڑا تھا۔ اسے عاطف کی آواز آ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"دل تو بہت نازک ہوتے ہیں چاچا۔ ذرا سی بات پر ٹوٹ جاتے ہیں اور آپ.......... آپ ہر بات دل کو نہ لگایا کریں۔ چھوٹی موٹی باتیں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ میرا بھی سیمی سے ہر وقت جھگڑا رہتا ہے۔" یہ بات شاید اس نے نازاں سے کہی تھی۔

نازاں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ چاچا بھی چپ تھا۔ گلو کا ہر پل بھاری ہو کر چٹان میں تبدیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ بہت دیر ضبط کرنے کے بعد بھی اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ اندر جانے کو پلٹ پڑا۔ اس نے سوچ لیا

کہ اس بار اس لڑکے سے صاف کہہ دے گا کہ اب نازاں ٹھیک ہے' وہ جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گلو نے ایک اور فیصلہ بھی کیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ان لوگوں کے جاتے ہی وہ باہر جا کر اسپتال تلاش کرے گا یا کسی ایسے ڈاکٹر کا پتہ پوچھے گا جو بوڑھا ہو۔

"مگر کیوں؟" اس کے اندر سوال گونج اٹھا۔ اس نے اس سوال کا جواب دینے یا سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ وہ لڑکی باہر آ گئی۔

پھر کتنی ہی دیر گزر گئی' نہ اسے عاطف کا خیال آیا نہ ہی نازاں کا۔ اس دوران اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سیمی کالج میں پڑھتی ہے۔ عاطف اس سے دو برس بڑا ہے۔ اس کا باپ ایک سرکاری محکمے میں آفیسر ہے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں اور ایک سب سے چھوٹا بھائی بھی ہے اور سب اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اسے نازاں بہت اچھی لگی تھی۔ وہ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش تھی اور ان لوگوں سے یعنی نازاں سے دوستی کی خواہش مند تھی۔ گلو اس وقت اتنا مہذب' اس قدر ملنسار اور خوش اخلاق لگ رہا تھا کہ اگر نازاں اسے دیکھ لیتی تو شاید دوبارہ پٹ سے گر کر بے ہوش ہو چکی ہوتی۔

"آپ آیئے نا کبھی ہمارے ہاں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ہاں ضرور۔" شاید ابھی گلو کچھ اور بھی کہتا کہ اسی لمحے چاچا عاطف کو لئے کمرے سے باہر آ گیا۔ گلو کو جیسے ہوش آ گیا۔ عاطف کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی۔ آنکھوں میں بالکل اسی طرح کوندے لپک رہے تھے جیسے سیمی کی آنکھوں میں اس نے دیکھے تھے۔ وہ پھر غبارے کی طرح پھولنے لگا۔ اسے چاچا پر غصہ آنے لگا جو اس کے آگے یوں بچھا جا رہا تھا جیسے مری ہوئی نازاں کو اس نے دوبارہ زندہ کر دیا ہو۔ اسے دیکھتے ہی گلو کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں' نتھنے پھولنے اور پچکنے لگے تھے۔ عاطف کی نگاہ جونہی اس پر پڑی' اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ ایک دم سکڑ گئے۔ اس نے نگاہ چرا کر چاچا سے کہا۔

"اچھا ہم چلتے ہیں۔" پھر وہ سیمی کی طرف مڑا جو گلو کی بدلتی ہوئی کیفیت کو نہ صرف محسوس کر رہی تھی بلکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت بھی ناچ رہی تھی۔ "چلو سیمی!" اس نے گلو سے کچھ بھی نہ کہا بلکہ بلند آواز میں خدا حافظ کہتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

"خدا حافظ بیٹا! تم لوگوں سے بڑا آسرا ہو گیا۔" چاچا نے شفقت سے کہا اور ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے جاتے ہی کمرے کی طرف پلٹ گیا۔ لمحہ بھر کو گلو پتھرایا ہوا کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ اندر سے چاچا کی آواز آ رہی تھی۔ ”بٹیا! کیا کروں.......... بتا میں کیا کروں! کسی کی بھی تو نہیں سنتا۔ پتہ نہیں کیسا زہر بھرا ہے اس لونڈے میں۔ میں نے ہی تربیت کی ہے' زندگی بھر سب سے پیار کرنا سکھاتا رہا مگر جانے.......... جانے وہ کیا چیز ہے جو اسے پیار کرنے سے روکتی ہے' پتہ نہیں یہ نفرت کا جذبہ کب اس کے اندر پیدا ہو کر جوان ہو گیا' ہر وقت بپھرا ہوا طوفان بنا رہتا ہے۔“

”نہیں چاچا.......... یہ نفرت نہیں.......... محبت ہے' بس اسے محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا۔ پتہ نہیں کیوں جھجکتا ہے۔ تو پریشان نہ ہوا کر۔“

”پریشان نہ ہوا کروں..........؟ وہ ایسی زہر میں بجھی باتیں کر جاتا ہے' ایسے ایسے بھالے دل میں اتارتا رہتا ہے اور میں کچھ نہ کہوں' پریشان بھی نہ ہوں۔ اور.......... اور اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو.......... تو میں کیا جواب دیتا؟“ چاچا روہانسا ہو رہا تھا۔

”کسے جواب دینا تھا تجھے؟ کون سا میں کسی کی امانت ہوں تیرے پاس؟ خود ہی تو گلے پڑ گئی ہوں۔“

”نہ بٹوا.......... ایسی باتیں نہ کر.......... کسی کو نہیں پر خدا کو تو جواب دینا ہے ناں!“ چاچا شاید رو پڑا تھا اور گلو سوچ رہا تھا۔ میں نے نازاں کو آخر کیا کہہ دیا۔ یہ تو عجیب مصیبت تھی کہ وہ اگر چاچا کو کچھ کہے گا تو وہ بے ہوش ہو جائے گا اور کچھ بات نازاں کو بری لگی تو وہ.......... اندر جانے کی بجائے واپس جا کر صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گیا۔

وہ رات گلو پر بہت بھاری گزری۔ اسے اپنے بہت زیادہ تنہا ہونے کا احساس ہو رہا تھا اور ایسی ہی کیفیت میں اسے وہ چبوترا یاد آ جایا کرتا تھا۔ چبوترے کے ایک طرف لگے پیپل کے گھنے پیڑ کی سرسراہٹ اسے لوری کی طرح تھپکیاں دیتی تھیں اور جب نیند اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ کسی جھولے میں لیٹا ہے اور دو نرم وشفیق ہاتھ اسے جھولا دے رہے ہیں' وہ بے چین ہو گیا۔ یہ کراچی کی وہ بستی تو نہیں تھی جہاں سے وہ بھاگتا ہوا چند منٹوں میں اس چبوترے تک پہنچ جاتا۔ وہ بڑی دیر ٹہلتا رہا۔ اندر سے چاچا اور نازاں کے باتیں کرنے کی آواز آتی رہی۔ اس نے کان لگانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی نازاں کا ایک جملہ نہ جانے کہاں

ے رینگتا ہوا اس کی سماعت میں چکر کھانے لگا۔ ”بس اسے محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا.......... محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا۔“

”سچ.......... سچ ہی تو ہے۔“ گلو کے اندر ایک آواز گونج اٹھی۔ ”تو چاچا سے اس ندر محبت کرنے کے باوجود آج تک اس سے یہ نہیں کہہ سکا کہ چاچا میں تجھ سے بے پناہ بت کرتا ہوں۔ میں تجھے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک پل کو بھی تجھ سے دور نیں رہ سکتا۔ تیرے اس ہڈیوں کے پنجر' اس لاغر بدن میں ایک ایسا گداز ہے جس کی رماہٹ مجھے زندگی کی حرارت بخشتی ہے۔ کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔“ کوئی اس سے جرح کر ہا تھا۔ گلو بے بس تھا۔ بالکل بے بس۔

رات جانے کب اور کیسے گزر گئی۔ اسے اتنا یاد تھا کہ سوتے وقت اس کی آنکھوں ں کوندے سے لپکے تھے اور سیمی کی بڑی بڑی آنکھوں میں سمندر موجیں مارنے لگا تھا ر پھر وہ شاید کسی سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ صبح اٹھا تو دل پر بڑا بوجھ تھا۔ دن چڑھ آیا ا۔ نہ چاچا نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی نازاں نے۔ اس نے آنکھیں ھول کر چاروں طرف دیکھا۔ نازاں نظر نہ آئی البتہ چاچا تولیہ کندھے پر ڈالے پانی کی ٹنکی کے آگے بیٹھا کلیاں کر رہا تھا۔ چولہا جل رہا تھا۔ چائے کی پتیلی چڑھی ہوئی تھی۔ اسے ذرا ا دیر کو تشویش ہوئی کہ نازاں کہاں ہے مگر وہ یہ بات چاچا سے نہیں پوچھنا چاہتا تھا۔ کن ہے ابھی تک بیمار ہو۔ کمرے میں ہو یا سو رہی ہو۔ چاچا ٹنکی کے آگے سے اٹھا اور تھ منہ پونچھتا ہوا چولہے کے قریب جا بیٹھا۔ اس دوران وہ گلو کو دیکھ چکا تھا۔ گلو منہ ہاتھ ہو کر فارغ ہوا تو چاچا چائے کے دو پیالے بنا چکا تھا۔

”لے چائے پی لے۔“ اس نے گلو سے کہا مگر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ راض ہے۔

گلو چپ چاپ پیالہ لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ چاچا سے زاں کے بارے میں پوچھے مگر ہمت ہی نہ ہوئی۔ تبھی اسے یاد آگیا کہ آج احسان اللہ نے ے اپنے دفتر بلوایا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو گیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ جائے کیسے۔ لی ہی بار وہ اس کے دفتر گیا تھا اور وہ بھی احسان اللہ کے ڈرائیور کے ساتھ۔ رستوں ے بھی واقف نہ تھا۔ آج کے بارے میں پتہ نہ تھا۔ کہ وہ کیسے دفتر جائے گا۔ ڈرائیور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے آنے کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ ایسی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ کافی دیر الجھن میں رہنے کے بعد اس نے احسان اللہ کے گھر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ چاچا چپ چاپ اس کی تیاریاں دیکھ رہا تھا۔

"میں احسان اللہ کے گھر جا رہا ہوں۔ وہاں سے ان کے ساتھ دفتر جاؤں گا۔ تو پاگل مت ہو جانا۔" اچھا خاصا اطلاع دیتے دیتے وہ اچانک ہی اکھڑ گیا اور یہ اکھڑپن جانے کہاں سے اس کے اندر در آتا تھا۔ اب تو وہ خود بھی اپنے اس اکھڑپن سے بیزار ہو گیا تھا۔ وہ گھر سے نکل آیا اور پھر تمام راستے افسوس کرتا رہا کہ کیا ضروری تھا کہ وہ چاچا سے آخری جملہ بھی کہتا؟ اور پھر چاچا نے جواب نہ دے کر گویا اس کے دل میں گرہ سی ڈال دی تھی۔ وہ بڑبڑا لیا ہوتا تو شاید اس کے سینے میں اتنا بوجھ نہ پڑ گیا ہوتا۔

کچھ دیر بعد وہ احسان اللہ کے دروازے پر کھڑا بیل بجا رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے احسان اللہ کے ملازم لڑکے نے اسے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ احسان اللہ ابھی تک گھر پر ہی تھے۔ اسے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ "میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں یاد بھی رہا کہ نہیں۔" انہوں نے ٹائی کی گرہ لگاتے ہوئے گلو سے کہا۔ "پھر سوچ رہا تھا کہ آؤ گے کیسے؟ ڈرائیور بھیج کر بلوا لوں، بس بھیجنے ہی والا تھا۔"

"رات تو میں بھول گیا تھا۔ صبح چائے پیتے ہوئے یاد آیا تو یہاں چلا آیا۔ دفتر کا تو پتہ ہی نہیں معلوم۔"

"ہاں۔ ظاہر ہے اتنی دور تم پہنچ بھی نہیں سکتے تھے۔ فی الحال تم یہی کیا کرو کہ یہاں آ گئے پھر یہاں سے ساتھ ہی نکل گئے تم چائے پیو میں ابھی آتا ہوں۔" اتنا کہہ کر احسان اللہ اندر چلے گئے۔ ملازم چائے دے گیا اور گلو کو بار بار نازاں کا خیال تنگ کرنے لگا۔ وہ کہاں تھی.........؟ ایسی بھی بیمار نہ تھی کہ سویرے اٹھا نہ جاتا......... کہیں وہ چلی تو نہیں گئی؟ اس خیال نے اسے بے چین کر دیا......... مگر جائے گی کہاں؟ پر چاچا بتا رہا تھا کہ اس کے ماں باپ بھی نہیں ہیں۔ شاید......... شاید اپنے گاؤں چلی گئی ہو۔ شاید کوئی دور پرے کا رشتہ دار ہو......... مگر......... مگر پھر چاچا......... چاچا کا خیال کون رکھے گا؟

بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ احسان اللہ سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر واپس چلا جائے۔ چارپائی پر لٹا لٹا سا بیٹھا چاچا اس کی آنکھوں میں جم کر رہ گیا تھا۔ اس

ی اجڑی ہوئی صورت اور خالی خالی آنکھیں اب اسے یاد آئیں تو لگا جیسے واقعی نازاں چلی ئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں بھی ویسا ہی خالی پن تھا جیسا کسی اسٹیشن پر گاڑی کے روانہ و جانے کے بعد نظر آتا ہے۔ ہر لوٹتے ہوئے قدموں کی چاپ میں ہر لوٹ جانے والی نگاہ ں اور ہر منہ پھیر کر جانے والے چہرے میں نظر آتا ہے۔

اس کا دل گھبرانے لگا۔ عین اسی لمحے احسان اللہ کمرے میں داخل ہوئے۔

"چلیں!" انہوں نے گلو سے پوچھا اور گلو سر ہلا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ لوگ گاڑی میں سوار ہو گئے۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہ لوگ احسان اللہ کی کمپنی پہنچ گئے۔ راستے میں احسان اللہ نے بتا دیا تھا کہ وہاں ان کی ملاقات میجر احمد جان سے ہو گی۔ ان کے کہنے کے عین مطابق جب وہ اپنے آفس میں داخل ہوئے تو جانو ان کا منتظر تھا۔ وہ گلو کو دیکھ کر کسی پرانے اور پُرخلوص دوست کی طرح اٹھا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

"کیسے ہو؟" اس نے گلو کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"نہیں......... تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں......... وہ......... چاچا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" گلو چھپا نہیں سکا۔

"کیا جھگڑا کر کے آئے ہو؟" اس نے صوفے پر اسے بٹھا کر اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"نہیں........." وہ نگاہ چرا گیا۔

"چلو تھوڑی دیر بعد گھر چلیں گے۔ آج ویسے بھی تم سے ضروری کام ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے اسے وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا پھر احسان اللہ کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔ ان کے جانے کے بعد گلو خود کو پھر کسی بھاری بوجھ تلے دبا محسوس کرنے لگا۔ ایک ان جانا سا خوف اس کے دل کو مٹھی میں لئے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وہ سب کچھ بھول گیا ہے۔ کچھ کھو بیٹھا ہے۔ اکیلا دیکھ کر بے چینی نے اسے گھیر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ چونکا اس وقت جب احسان اللہ اور جانو باتیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں بہت سنجیدہ تھے۔ چہرے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا وہ باتوں میں اس قدر مگن تھے کے انہوں نے گلو کی طرف دیکھا تک نہیں۔ گلو بار بار یہی سوچتا رہا کہ ان کی گفتگو ختم ہو تو وہ انہیں اپنی موجودگی کا احساس دلائے مگر گفتگو کچھ اس تسلسل سے جاری تھی کہ تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ جانو ہی کو خیال آیا۔ وہ چونکا اور پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔

"ارے.......... سوری گلو.......... ہم بالکل بھول گئے۔" پھر وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا اور پلٹ کر احسان اللہ سے بولا۔ "چائے منگواؤ' دماغ کی چولیں ہل گئیں۔" اس نے گلو کو سگریٹ پیش کیا پھر گلو کو بھی ٹیبل کے قریب' اپنے برابر پڑی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر سگریٹ سلگانے لگا۔

"گلو! تمہاری نوکری کا بندوبست تو ہو گیا۔" اس نے لمبا کش لے کر کہا۔

"اچھا.......... کہاں؟" گلو نے دھواں اگلتے ہوئے پوچھا۔

"کراچی میں۔" اس نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کراچی میں..........؟ مگر وہاں تو.........."

"کچھ نہیں ہوگا۔ وہ سب ہم نے طے کر لیا ہے۔ البتہ چاچا اور نازاں کو یہیں رہنا ہو گا۔" جانو نے کرسی کا رخ کچھ ترچھا کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں..........؟ چاچا اکیلا کیسے رہے گا؟"

"اکیلا کب ہے وہ؟ نازاں اس کے ساتھ ہے۔ ویسے میں ملازم کا بندوبست کر دوں گا۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" اس بار احسان اللہ نے جواب دیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے احسان بابو مگر آپ کو پتہ ہے۔" پھر وہ جانو کی طرف پلٹا اور بولا۔ "تجھے تو پتہ ہے ناں جانو کہ وہ میرے بغیر ایک رات بھی سو نہیں سکتا اور نازاں.......... پتہ نہیں ہے کہ نہیں۔" آخری جملہ کہتے ہوئے وہ کہیں سو سا گیا۔

"کیا مطلب؟" جانو چونک اٹھا۔ "نازاں کہاں گئی اور یہ نازاں ہے کون؟"

تب گلو نے اسے بتایا کہ نازاں کون ہے اور ان کے پاس کیسے پہنچی۔ جانو نے ساری کہانی سن کر گہری سانس لی۔ "فی الحال شادی کا مشورہ تو میں تمہیں نہیں دوں گا مگر

ہ تمہارے اور چاچا کے لئے بڑا سہارا ہے' خاص طور پر ان حالات میں وہ چاچا کا خیال ھ سکتی ہے اور جب اس کا کوئی نہیں ہے تو جائے گی بھی کہاں۔ تم ان لوگوں کو یہیں ہنے دو میں انہیں سمجھالوں گا۔"

"مگر جانو اگر تو میری ملازمت کا بندوبست یہیں کر دے تو.........."

"گلو! کیا تم نہیں چاہتے کہ دانیال گردیزی کے ملازموں اور ان کے بچوں کی موت ا سبب بننے والوں کو سزا دلواؤ؟ ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤ جو بھرے گھر اجاڑ کر اپنی جوریاں بھر رہے ہیں۔ لوگوں کو قتل کر رہے ہیں۔ تم تو ابھی صرف ایک بم دھماکے سے اقف ہو' تمہیں کیا پتہ کہ ان لوگوں نے کتنے ہنستے کھیلتے لوگوں کو چیتھڑوں میں تبدیل کیا ہے۔ کیا تمہیں انیس سو ستاسی میں صدر کے بوہری بازار کا وہ دھماکا یاد ہے جس میں زاروں گھروں کے چراغ گل ہو گئے تھے۔ کتنے والدین سے معصوم بچے بچھڑ کر خاک اور ون میں تبدیل ہو گئے تھے۔ کتنے بچوں کے باپ جو کام پر نکلے تھے' کبھی واپس نہ پہنچ سکے ر وہ.......... حیدر آباد کے بس اڈے پر ہونے والا دھماکا۔ جس نے بہت سے لوگوں کو وت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور کئی لوگوں کے جسم کے اعضاء کٹ گئے تھے' وہ لوگ زندگی ھر کے لئے معذور ہو گئے تھے۔"

"بس کرو جانو.......... بس کرو.......... مجھے یاد ہے۔" گلو کو جھرجھری آ گئی تھی۔

"تو کیا تم نہیں چاہتے کہ ایسے لوگوں کو سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا جائے۔ ان سے ان بے حساب لوگوں کے زخموں کا بدلہ لیا جائے۔ یہاں پتہ نہیں کتنے ہی استاد فتح دندناتے پھر رہے ہیں گلو جن کی مٹھیوں میں ہزاروں لوگوں کی موت کے پروانے دبے ہیں۔ یہ ملک و قوم کے دشمن ہیں' کیا یہ تمہارا ملک نہیں ہے' کیا اسے بچانا' یہاں کے لوگوں کو بچانا تمہارا فرض نہیں ہے؟"

"مگر میں کیا کر سکتا ہوں جانو! میں فوجی ہوتا تو سرحد پر اپنی جان لڑا دیتا۔ مگر اب.......... میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگا۔

جانو بے اختیار ہنس پڑا۔ "صرف سرحد پر لڑ مرنا ہی تو وطن کی حفاظت نہیں ہے۔ گلو تم یہاں ان چھوٹی چھوٹی گلیوں میں چلتے پھرتے سوتے جاگتے بھی تو وطن کی حفاظت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکتے ہو۔ لوگوں کے دلوں میں وطن سے محبت کا جذبہ بیدار کر کے' پولیس کی' فوج ک حکومت کی مدد کر کے۔ اپنے ہم وطنوں کی مدد کر کے۔ یہ سب بھی تو وطن کا سپاہی کر ہے۔ گلو اور تم........... تم وطن کے سپاہی ہو۔ یہ ملک تمہارا اپنا ہے جسے تم لوگوں نے ہم لوگوں نے بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔" گلو حیرت سے جانو کی شکل دیکھ ر تھا۔

"کاش میں نے پڑھ لکھ لیا ہوتا تو........... آج میں بھی افسر بن کر یا فوجی بن کر ملک کے لئے کچھ کرنے کے قابل تو ہوتا جانو!"

"تم اب بھی بہت کچھ کر سکتے ہو۔ ہر وہ شخص جو حساس ہے' وطن کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے گلو۔ بس تم وعدہ کرو کہ جیسا میں کہوں گا تم کرو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں جانو........... مگر میں جانتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے گرم جوشی سے گلو کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

اسی لمحے چپراسی چائے لے کر آ گیا۔ جس کا آرڈر احسان اللہ کافی پہلے ہی دے چکا تھا۔

"چلو' چائے پی لو پھر ہم گھر جا کر چاچا سے بات کریں گے۔"

چپراسی چائے بنانے لگا اور گلو سوچنے لگا کہ چاچا کبھی بھی تیار نہیں ہو گا۔ جو مجھے پنجرے میں قید کر کے رکھنا چاہتا ہو وہ بھلا مجھے کراچی بھیجنے پر کیسے راضی ہو گا اور وہ بھی اس صورت میں کہ خود اسے یہاں رہنے کو کہا جائے مگر جانو پُرامید تھا۔ اس کے انداز سے تو لگتا تھا جیسے وہ چاچا کو چٹکی بجاتے میں راضی کر لے گا۔ چپراسی نے بھاپ اڑاتی ہوئی پیالیاں ان کے سامنے رکھیں اور خالی ٹرے لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

"قدیر صاحب سے بات ہو گئی تھی تمہاری!" احسان اللہ نے چائے کا گھونٹ لینے کے بعد پوچھا۔ وہ جانو کو دیکھ رہا تھا۔ گلو بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں! وہ کہہ رہے تھے ملا دو۔ میرا خیال ہے کہ میں کل ہی چلا جاؤں۔ یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔" جانو نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز سوچ میں ڈوبا ہوا سا تھا۔

"پھر ہماری ملاقات کب ہو گی؟" احسان اللہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ حالات پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ممکن ہے میرا کام جلدی ختم ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مصروفیات بڑھ جائیں۔ بہرحال فون پر رابطہ رہے گا۔ تم اس کے چاچا اور نازاں کا خیال رکھنا۔ وہ اب تمہاری ذمے داری ہیں۔"

یہ سن کر گلو چوکنا ہو گیا۔ اچانک ہی اسے وہ ڈاکٹر لڑکا یاد آیا۔ بے چینی اس کے اندر عجیب سا انتشار پھیلا گئی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جانو کو منع کر دے مگر پھر یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ چاچا کبھی بھی اس بات پر راضی نہیں ہو گا کہ گلو کراچی چلا جائے اور وہ لوگ یہاں رہ جائیں۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ اشارے سے یا چپکے سے چاچا کو منع کر دے گا کہ اسے جانے کی اجازت نہ دیں۔

وہ لوگ چائے پیتے رہے۔ جانو اور احسان اللہ بہت سنجیدگی سے باتیں کرتے رہے۔ گلو کا ذہن یہاں وہاں بھٹکتا رہا۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب جانو نے کھڑے ہو کر سگریٹ کا پیکٹ جیب میں رکھا اور احسان اللہ سے ہاتھ ملانے لگا۔

"اچھا یار! دعا کرنا ہر کام خیریت سے ہو جائے۔" جانو نے احسان اللہ سے کہا۔

"انشاء اللہ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" اس نے جانو کے بعد گلو سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "گلو تم کسی قسم کی فکر نہ کرنا۔ چاچا اور نازاں کا خیال میں خود سے بڑھ کر رکھوں گا۔ تم بلا کسی پریشانی میں پڑے احمد جان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اب وہ دونوں میری ذمے داری ہیں۔"

"جی........... ہاں جی..........." گلو نے بے وقوفوں کی طرح گردن ہلا کر کہا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے چل پڑے۔

گلو تمام راستے الجھتا رہا۔ بار بار پہلو بدلتا' جانو سے کہہ دینے کی ہمت باندھتا اور پھر توڑتا رہا۔ اسے صرف اتنی پریشانی تھی کہ اگر اس نے کراچی جانے سے انکار کیا تو جانو اسے بزدل سمجھے گا۔ اسے کیا پتہ کہ وہ چلا گیا تو یہاں کیا ہو گا۔ یکایک اس پر انکشاف ہوا کہ اسے ساری پریشانی نازاں کی ہے ورنہ چاچا کے پہلو سے وہ اب سے پہلے کب جڑا رہا تھا؟ نازاں...........؟ نازاں کا گدرایا ہوا بدن۔ پورا کا پورا بدن مڑ کر سوالیہ نشان بن گیا تھا اور اب اس کی آنکھوں کے سامنے جھول رہا تھا۔ "پتہ نہیں چاچا اسے کیوں اٹھا لایا تھا؟" اس نے دانت کچکچا کر سوچا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چاچا کب اٹھا کر لایا تھا؟" اس کے اندر کسی نے چٹکی بھری تھی۔ وہ کسمسا کر رہ گیا پھر اس نے شرمندگی سے گردن ایک طرف کو موڑ لی' یوں جیسے کہنے والا اس کے پہلو میں بیٹھا ہو۔ وہ شیشے کے پار سڑک پر دیکھنے لگا۔

جانو چپ تھا۔ احسان اللہ کا ڈرائیور روبوٹ کی طرح گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ جانو سامنے ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر نگاہیں جمائے کسی گہری سوچ میں تھا۔ ڈرائیور کو شاید معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس نے گاڑی گلو کے مکان کے سامنے روک دی۔ گلو تو گلی میں داخل ہوتے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے اپنے گھر کے برابر والے دروازے پر پڑی تھی جو کھلا ہوا تھا اور اس پر لٹکا پردہ ہل رہا تھا۔ گاڑی کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس کی پنڈلیوں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ جیسے وہ خود بھاگ کر دروازے تک آیا ہو۔ اس نے دروازہ کھولا پھر پلٹ کر جانو سے بولا۔

"آؤ جانو۔" پھر جانو کا جواب سنے بغیر ہی وہ گھر میں داخل ہو گیا' اندر داخل ہوتے ہی اس نے پل بھر میں سارے گھر کا جائزہ لے لیا۔ نازاں کہیں نظر نہ آئی۔ چاچا کمرے کے اندر تھا اور یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی چاچا نے جنبش بھی نہ کی مگر اس کے پیچھے جانو کو داخل ہوتا دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔

گلو تیزی سے اندر داخل ہوا۔ "نازاں کہاں ہے؟" اس نے جاتے ہی چاچا سے پوچھا' آواز دھیمی مگر لہجہ تیز تھا مگر اس سے پہلے کہ چاچا اسے کوئی جواب دیتا۔ گلو کو اپنی پشت پر سے ہنسی کی آواز آئی۔

"مر گئی۔" ہنسی کے دوران نازاں کی سرگوشی ابھری اور گلو کو یوں لگا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ جس تیزی سے اندر داخل ہوا تھا اسی تیزی سے باہر نکل گیا۔ جانو ابھی دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"آؤ جانو!" گلو نے دیوار سے ٹکا پلنگ صحن میں بچھا دیا۔ دھوپ دیوار کی جڑوں تک پہنچ چکی تھی۔ چاچا اس کے پیچھے ہی باہر کو چلا آیا۔ گلو کو لگا جیسے اس کی مونچھوں تلے' ہونٹوں کے کناروں میں مسکراہٹ دبی ہوئی ہو۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسے خود پر غصہ آنے لگا کہ آتے ہی نازاں کے متعلق پوچھنے کی آخر تک ہی کیا تھی۔ وہ چلی بھی گئی ہوتی تو کیا تھا' بلکہ اچھا ہی تھا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس کی نگاہیں بھٹکتی

ہوئی کمرے کے اندر رینگنے لگیں۔

"کیسے ہیں چاچا آپ؟" جانو چاچا سے ہاتھ ملا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! احسان اللہ نہیں آئے؟"

"نہیں............ ویسے آئیں گے............ چاچا میں آپ سے بہت ضروری بات کرنے آیا ہوں۔" جانو فوراً ہی اپنے مقصد پر آ گیا۔ گلو نے نگاہیں چاچا کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اب وہ منتظر تھا کہ چاچا اس کی جانب دیکھے تو وہ اشارے سے منع کر دے۔ مگر چاچا نے تو جیسے اس کی طرف نہ دیکھنے کی قسم کھالی تھی۔ جانو بولے جا رہا تھا اور چاچا اس پر نگاہ جمائے چپ چاپ سن رہا تھا۔ گلو کے اندر ابال سے اٹھنے لگے۔ وہ بار بار پہلو بدلنے لگا۔ پھر دل ہی دل میں خدا سے دعا کرنے لگا کہ چاچا خود ہی منع کر دے۔ جانو کہہ رہا تھا۔

"چاچا............! آپ لوگ فکر مند نہیں ہونا۔ احسان اللہ ہر روز یہاں آئیں گے؟ اور پھر میں بھی خیر خبر لیتا رہوں گا۔ گلو کی طرف سے قطعی پریشان نہیں ہونا"۔

چاچا اس بار بھی کچھ نہ بولا۔ گلو کو اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر بڑی شدید مایوسی ہوئی تھی. دل میں جیسے کانچ سا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تو توقع کر رہا تھا کہ اس کے کراچی جانے کی بات سن کر چاچا کا چہرہ دھواں دھواں ہو جائے گا۔ آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگے گی۔ وہ حواس باختہ ہو کر کہے گا۔ "نہیں گلو کہیں نہیں جائے گا. میں اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔" مگر کچھ بھی نہ ہوا تھا۔

اس سے پہلے کہ چاچا کچھ جواب دیتا گلو جلدی سے بول اٹھا۔ "وہ چاچا! پہلے نازاں سے کہہ کہ وہ چائے بنائے۔"

"چاچا نے اس بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

نہیں گلو............ چائے کا تکلف مت کرو۔ ابھی تو پی ہے۔" جانو نے ہاتھ سے چاچا کو بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور چاچا پھر بیٹھ گیا۔

گلو کے پیٹ میں گولے سے اٹھنے لگے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور نازاں والے کمرے میں چلا گیا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ نازاں سے مدد لے۔

نازاں کمرے کے ہلکے اندھیرے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ گلو سے پہلے اس کا لمبا سایہ کمرے میں داخل ہو کر اس پر چھا گیا تھا۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چونک کر سر اٹھایا۔

"نازاں! تو چاچا کو بلا کر کہہ کہ گلو کراچی نہیں جانا چاہتا۔ اگر گیا تو تم دونوں کے بغیر نہیں جاؤں گا۔ جلدی سے اسے آواز دے اور کہہ کہ وہ جانو کو منع کر دے یا پھر خود بھی ساتھ چلنے کو کہے۔" اتنا کہہ کر گلو اس کا جواب سننے کو رکا نہیں۔ یہ سب اس نے نازاں کے چہرے پر جھک کر کہا تھا اور اس کے نتھنوں میں نازاں کی خوشبو بھر گئی تھی اور اس کی بڑی بڑی حیران حیران سی آنکھوں کی چمک اسے اپنی آنکھوں میں بھرتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا قرب عجیب سا تھا. لڑکھڑا دینے والا. وہ اسی طرح لڑکھڑاتا ہوا پلٹ کر کمرے سے باہر آگیا تھا اور چاچا اور جانو کے قریب جانے تک اسے صرف تین چیزیں یاد رہ گئی تھیں. نازاں کی خوشبو. اس کی آنکھوں چمک. اور اس کی قربت..........اس کے بیٹھنے سے پہلے ہی نازاں کی آواز گونج اٹھی تھی۔ وہ چاچا کو آواز دے رہی تھی۔ چاچا جانو سے اجازت لے کر اندر چلا گیا تو گلو کو اپنے اندر کا طوفان تھم کر گہری خاموشی اور سکون میں بدلتا محسوس ہوا۔ بڑی دیر بعد اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور چہرے کے کھنچے ہوئے عضلات ڈھیلے ہو گئے۔

"تم کن چکروں میں پڑ گئے! ابھی تو چائے پی ہے ہم نے۔" جانو شاید یہ سمجھا تھا کہ وہ خود نازاں کو چائے کے لئے کہنے گیا تھا۔

کوئی بات نہیں جانو! تم تو چائے ویسے بھی زیادہ پیتے تھے۔ ہم کراچی والے ہیں اور کراچی والے چائے اور سگریٹ کے لئے کافی مشہور ہیں۔" گلو نے بھونڈا سا مذاق کیا اور زور سے ہنس پڑا۔

جانو نے چونک کر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ گلو ایک دم سیدھا ہو گیا۔ جانو سے یوں بھی اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں دل میں یہ بات جڑ پکڑ گئی تھی کہ وہ سب کچھ جان لیتا ہے۔ اسی دم چاچا کمرے سے باہر آیا۔ نازاں بھی بل کھاتی ہوئی باہر آگئی۔ اس کے چہرے پر غرور تھا۔ کھلی کھلی آنکھیں. اکڑی ہوئی گردن اور نپے تلے قدم۔ اس نے باہر آکر جانو کو سلام کیا. چولھے پر چائے کی پتیلی چڑھا کر وہ بھی ان کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گلو کو اس کا یہ انداز کھٹکنے لگا۔ اسے لگا جیسے وہ اس پر اپنی اہمیت جتا رہی ہو۔ چاچا پھر ان کے سامنے آبیٹھا۔

"تو پھر آپ تیار ہیں ناں؟ کسی قسم کی فکر مت کیجئے گا۔ آپ لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور گلو میرے ساتھ ہوگا۔" جانو نے چاچا کے بیٹھتے ہی کہا۔

"جانو! بیٹا میں تم لوگوں کا احسان مند ہوں کہ تم نے اور احسان اللہ نے میرے بچے کو بچا لیا۔ ہمیں خوف سے بچا لیا مگر۔ اس احسان کے بدلے میں تمہیں اپنا گلو نہیں دے سکتا۔" چاچا نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "میری تمام فکریں تو اسی کے دم سے ہیں۔ یہ نہیں ہوگا تو میں بے فکر کیسے ہو سکتا ہوں۔" چاچا نے بلا مروت صاف صاف کہہ دیا تھا۔

جانو حیرت سے چاچا کو تکتا رہ گیا۔ چند ثانئے بعد ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ کھنکارا پھر بولا۔ "مگر چاچا.......... میں آپ سے گلو کو مانگ تو نہیں رہا۔ میں تو.......... میرا مطلب تو یہ تھا کہ اگر یہ ہماری مدد کرے گا تو.........."

"نہیں تو جانو' تو چاچا وغیرہ کو بھی کراچی لے چل۔ ہم وہیں ایک ساتھ رہیں گے پھر چاچا کو پریشانی نہیں ہوگی۔ میں ہر کام کروں گا پر رات کو لوٹ کر تو اپنے ہی گھر آؤں گا ناں!" گلو کو اچانک ہی احساس ہوا کہ چاچا کا ایسا کہنا درست نہیں تھا۔ وہ تو جانو سے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر چکا تھا اور یوں بھی گلو کا مقصد صرف چاچا اور نازاں کو ساتھ رکھنے کا تھا۔ گلو جانتا تھا کہ جانو اگر ان تینوں کو ساتھ لے کر جائے گا تینوں ہی کی حفاظت کا بندوبست کرے گا۔

"ہاں.......... یہ ہو سکتا ہے۔" کچھ دیر سوچ کر جانو نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم لوگ اپنے پرانے گھر میں نہیں رہ سکتے۔ وہاں فتح کے آدمیوں سے خطرہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

گلو اس دوران چپ چاپ سر جھکائے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ اتنی دیر میں نازاں چائے لے آئی۔

"ہم ساتھ رہیں گے تو کوئی حرج تو نہیں ہے ناں!" نازاں نے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا اور چائے کا کپ جانو کو تھما دیا۔ "یہ تو یوں بھی دن بھر گھر سے باہر رہنے کا عادی ہے۔ کچھ بھی کرے' ہمیں اس سے کیا۔ رات کی رات گھر میں رہے گا تو بوڑھے چاچا کو مضبوط سہارے کی خوش فہمی تو رہے گی ناں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو کا جی چاہا ہاتھ میں پکڑا چائے کا گرم گرم کپ اس کے منہ پر اچھال دے۔

"حرامزادی.......... باتیں تو ایسی کرتی ہے جیسے میں نے غلامی لکھوا لی ہو۔ اب تو مر بھی جاؤں گا تو اس سے شادی نہیں کروں گا۔" اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا اور بھنچے بھنچے لہجے میں بولا۔ "تو چپ کر جا۔ ہم خوش فہمیوں میں ہی جینے کے عادی ہیں۔ تو کہاں سے ہماری ہمدرد آ گئی۔"

"دیکھ گلو!.........." وہ تنتنا کر بولی تھی۔ اگر چاچا نے گھور نہ دیا ہوتا تو دونوں جانو کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر ہی جھگڑ پڑتے اس لئے کہ گلو بھی کپ زمین پر رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"چپ رہا کرو تم دونوں.........." چاچا اس بار اتنی زور سے چیخا تھا کہ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ جانو جو حیرانگی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا' ہاتھ سے کپ رکھ کر چاچا کی طرف لپکا۔ نازاں بھی سب کچھ بھول بھال کر پانی کا کٹورا لینے دوڑ گئی۔ گلو نے چاچا کی کمر سہلانا شروع کر دی۔

دونوں ہی چاچا کی حالت دیکھ کر دہل گئے تھے۔ چاچا کی آنکھیں سرخ ہو کر حلقوں سے باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ گلو تو اندر ہی اندر خود کو گالیاں دے رہا تھا کہ جب وہ نازاں کی طبیعت اور زبان درازی سے واقف ہے تو اس کے منہ ہی کیوں لگتا ہے۔ بار بار اس سے بات نہ کرنے کا فیصلہ کر کے اس پر قائم کیوں نہیں رہتا۔

"گلو! چاچا کا علاج لگ کر کراؤ۔" جانو نے دھیرے سے کہا۔ وہ کچھ خجل سا تھا۔

"نہیں جی.......... یہ کوئی بیماری تھوڑی ہے۔" چاچا مسکرا کر بولا تھا۔ گلو کے ساتھ ہی جانو بھی چونک اٹھا۔

"جی!" جانو نے حیرت سے دیکھا۔

"یہ آپ نہیں جانیں گے صاب.......... پتہ نہیں کون لوگ ہوتے ہیں جو اکیلا رہنا پسند کرتے ہیں' جب آدمی اکیلا رہتا ہے تو وہ جی کیسے لیتا ہے۔ نہ جھگڑا' نہ فساد' نہ تو تو میں میں.......... یہ بھلا کیا زندگی ہوئی.......... میں تو اب سے پہلے زندہ ہی نہ تھا میجر صاب.......... ابھی تو جیا ہوں اور یہ زندگی کے چونچلے ہیں مجھے ان سے جدا نہ کریں۔ میں اپنے گلو کے ساتھ ہی رہوں گا۔ جہاں بھی یہ رہے۔ جو بھی کرے بس لوٹ کر گھر

آئے۔" چاچا کی آواز میں زندگی کی کھنک تھی۔ جیتے رہنے کا اشتیاق تھا۔

گلو نے خود کو اندر سے شرمندہ سا محسوس کیا۔ پھر شدت سے احساس ہوا کہ چاچا کے لئے چھوٹی چھوٹی باتیں کتنی اہم مگر کتنی دل آویز ہیں جن سے وہ ہر روز توبہ کرتا ہے۔

"ٹھیک ہے چاچا.......... تنہائی کا دکھ میں بھی جانتا ہوں.......... آپ لوگ تیاری کر لیں۔ ہم کل ہی کراچی چلے چلیں گے۔" جانو کے انداز میں اداسی جھلک رہی تھی۔ تبھی گلو کو یاد آ گیا کہ جانو نے ایک بار پہلے بھی اس سے کہا تھا کہ وہ یونہی ان چکروں میں نہیں پڑ گیا.......... بہت کچھ کھویا ہے اس نے۔

پھر جانے کیا ہوا گلو اس کی کہانی سن نہیں سکا۔ آج پھر اس نے سوچ لیا کہ موقع ملتے ہی وہ اس کے دکھ کا سبب جاننے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اس سے یہ بھی پوچھے گا کہ اس کے گھر والے کہاں ہیں.......... اس کے ماں باپ' بہن بھائی یا بیوی بچے' کوئی تو ہو گا۔

چاچا یہ سن کر خوش ہو گیا تھا۔ گلو بھی خوش تھا' کراچی سے دور رہ کر اس کا پل پل بھاری ہو گیا تھا۔ لگتا تھا جیسے کسی دوسرے شہر میں نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک میں آ گیا ہو۔ اس نے بے اختیار نازاں کی طرف دیکھا۔ اس کے حساب سے تو اسے بھی خوش ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ بھی تو کراچی میں ہی پلی بڑھی تھی مگر جانے کیوں اسے دھچکا سا لگا۔ اس کے چہرے پر سائے سے گزرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ خوشی کی رمق تک نہ تھی تبھی گلو کے نتھنے بے اختیار پھولنے اور پچکنے لگے۔

برابر والے گھر کا ڈاکٹر لونڈا اس کی آنکھوں میں ناچ گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ یہ سوچ کر خوش ہو گیا کہ اب انجانے اندیشوں سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ کام پر جائے گا تو یہ کھٹکا تو نہ ہو گا کہ وہ..........

"اچھا گلو!" جانو نے اسے چونکا دیا۔ "میں چلتا ہوں۔ کل صبح سویرے یہاں سے نکل چلیں گے تا کہ سورج سر پر آنے سے قبل وہاں پہنچ جائیں۔ میں جا کر تم لوگوں کے لئے انتظامات کرتا ہوں۔"

گلو نے سر ہلا دیا۔ جانو جاتے جاتے اسے پھر سمجھا گیا کہ اسے چاچا کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہونے دینا چاہیے جس سے چاچا کو دکھ ہو۔ اس نے پھر سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلا کر اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔

سارا معاملہ اس کی مرضی کے مطابق حل ہو گیا تھا۔ کہنے کو تو وہ بھی احسان اللہ اور جانو سے صاف کہہ سکتا تھا کہ وہ کراچی اکیلا نہیں جائے مگر جانے کیا چیز آڑے آ گئی تھی۔

وہ گلیاں اور اس کے درودیوار بھی تو اسے کھینچ رہے تھے اور پھر وہ چبوترا..........

اس میں بے چینی کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔

"چاچا یہاں کی چوڑیاں بہت مشہور ہیں۔" نازاں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ اب تک کواڑ کھولے کھڑا تھا اور جانو کب کا جا چکا تھا۔ اس نے دھیرے سے کواڑ بھیڑے اور اندر آ گیا۔

"پکے قلعے میں چوڑیوں کا بازار ہے۔" چاچا کی آواز میں بھی چوڑیاں سی بجنے لگیں۔ "برسوں پہلے میں اسے لے کر آیا تھا۔ ہم کراچی گھومنے آئے تھے۔ حیدر آباد بھی آ گئے۔ اماں کی کوئی جاننے والی رہتی تھی یہاں۔ میں پندرہ سولہ برس کا تھا شاید.........."

نازاں اس کے قریب چارپائی پر ٹک گئی تھی۔ چاچا تکیے پر سر رکھ کر چت لیٹا گہرے نیلے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ گلو چارپائی پر ترچھا لیٹ گیا۔ اس کے کان چاچا کی آواز کو سمیٹنے میں لگے تھے۔

"اس نے کہا تھا یہاں کی چوڑیاں بہت مشہور ہیں۔ اماں نے مجھے اس کے ساتھ بھیج دیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنی بہت سی خوبصورت چوڑیاں دیکھی تھیں اور جب اس نے گوری گوری کلائیاں چوڑیوں سے بھر لیں تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ وہ شخص جس نے یہ چوڑیاں بنائی ہوں گی کتنا حسن پرست ہو گا۔ ضرور کسی سے پیار کرتا ہو گا۔ ہر چوڑی اس نے اپنے حصے کی کلائیوں کے لئے ہی بنائی ہو گی۔" اس کا لہجہ ڈوبتا جا رہا تھا۔

"کون تھی وہ چاچا؟ کیا تو نے بھی کسی سے پیار کیا ہے؟" نازاں نے بڑے بھولپن سے پوچھا تھا۔

اور جیسے چاچا کو ہوش آ گیا۔ "کون.......... کون تھی؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"کتنا چالاک ہے یہ چاچا.........." گلو نے دانت کچکچاتے ہوئے سوچا۔ "کبھی نہیں کھلتا۔ جب کرتا ہے ادھوری بات ہی کرتا ہے۔ کیسا بن رہا ہے۔"

"وہ کون تھی جس کو تم نے چوڑیاں پہنائی تھیں؟" نازاں نے سوال پھر دہرایا۔

"قسمت تھی اپنی.........." چاچا نے گہرا سانس لیا۔ "اور کون ہوتی! جا تو جا کر چوڑیاں پہن لے۔" اتنا کہہ کر اس نے اپنے کرتے کی جیب سے دس دس کے کئی نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیئے۔ پھر گلو کی طرف دیکھ کر بولا۔ "تجھے کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ چوڑیاں پہننے چلی جائے یا تو لے جائے گا؟"

اس کا جی تو چاہا کہ غرا کر منع کر دے مگر خود پر قابو پا کر بولا۔ "اِتی دھوپ میں جانا ضروری ہے؟ شام کو لے جاؤں گا۔"

"الحمد للہ!"

چاچا کے اسی انداز نے تو اس میں آگ لگائی ہوئی تھی۔ وہ بلبلا اٹھا مگر حیرت انگیز طور پر خود کو قابو میں کیے رکھا۔

نازاں کو تو جیسے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ نوٹ بار بار گنتی رہی پھر چاچا کے ٹوکنے پر اس نے روپے دوپٹے کے پلو میں کس کر باندھ لئے۔ کتنی ہی دیر پلو کا وہ حصہ وہ بغل میں دبائے رہی پھر روٹی بھاجی کے چکر میں بھول گئی اور پلو اس کی پشت پر لٹکا رہا۔ گلو اس کے چہرے پر کئی رنگ برستے دیکھتا اور تاسف محسوس کرتا رہا۔ اسے نازاں پر ترس بھی آیا کہ جانے غربت نے اسے بھی کس کس چیز کے لئے ترسایا ہو گا۔ اس وقت اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ اس کے پاس کافی رقم تھی ابھی اسے اپنے اور چاچا کے لئے کپڑے کے جوڑے بھی لینا تھے۔ اس نے خریداری آج ہی کر لینے کا فیصلہ کر لیا اور یوں بھی اس کے بعد وقت ہی کہاں تھا۔ سویرے انہیں روانہ ہو جانا تھا۔

کھانا کھاتے' آرام کرتے سورج ڈھلنے لگا۔ نازاں کمرے میں گھسی جانے کیا کر رہی تھی۔ چاچا کچھ دیر کو سو لیا تھا۔ گلو بے وقوفوں کی طرح چارپائی پر پڑا وقت گزار رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ جانو اس سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ احسان اللہ اور اس نے کیا پروگرام بنایا ہے؟ وہ جائیں گے تو کہاں رہیں گے اور پھر کیا ہو گا؟ وہ کچھ کر بھی سکے گا یا نہیں۔ اسے نوکری ملے گی یا یونہی وہ پہلے کی طرح استعمال ہوتا رہے گا۔ یوں تو چاچا کی دکان بھری ہوئی تھی مگر کیا پتہ کہ وہ دکان کھول بھی سکے گا یا نہیں۔ ورنہ دو وقت کی روٹی کا آسرا تو وہیں سے تھا۔ چاچا دکان کھولتا تو فتح کے آدمیوں کو ضرور خبر ہو جاتی۔ تبھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو پر انکشاف ہوا کہ خوف ختم کب ہوا ہے؟ خوف تو اب بھی موجود تھا ذرا سا روپ بدلا تھا اور بس......... پھر وہ جھنجلا گیا کہ جانو اگر فوج کا میجر ہے تو فتح کے آدمیوں سے اسے اور چاچا کو بچا کیوں نہیں سکتا۔ وہ فتح جو جیل میں تھا اس کی دھاک اب بھی بیٹھی ہوئی تھی اور جانو اب بھی بے بس تھا۔

بڑی مشکل سے گلو نے ذہن کو ان سوچوں سے آزاد کیا۔ وہ نہایا' کپڑے بدلے' اپنے کمرے میں جا کر اس نے امام دین کے دیئے گئے روپوں میں سے ہزار روپے نکال کر جیب میں رکھے اور تولیہ سے سر پونچھتا ہوا صحن میں نکل آیا اور قدم جیسے زمین نے پکڑ لیے۔ ہلکے گلابی رنگ کے کپڑوں میں نازاں سجی سنوری اس کے سامنے کھڑی بال سلجھا رہی تھی۔ تمام بال شانے پر سے آگے جھول رہے تھے۔ وہ بڑی بیدردی سے کنگھی کو بالوں میں پھیر رہی تھی اور گلو حیرت سے اس کے سیاہ اور گھنے بالوں کو تک رہا تھا۔

"یہ......... اتنے بہت سے' اتنے لمبے' اتنے خوبصورت کب تھے اس کے بال؟"

"چاچا۔ تمہیں کچھ منگانا تو نہیں ہے بازار سے؟" وہ پلٹ کر چاچا سے بولی اور گلو کو لگا جیسے بل اس کی کمر میں نہیں' خود گلو کی کمر میں آیا ہے۔ جیسے کسی نے اسے رسی کی طرح بٹ دیا ہو۔ نازاں کی آواز میں عجیب سی کھنک تھی۔ فتح مندی کا سا احساس' اپنائیت اور اتراہٹ۔

"بس تیری کلائیوں میں چوڑیاں دیکھوں گا......... اور خوش ہو جاؤں گا۔" چاچا مسکرا کر اٹھ بیٹھا تب گلو کو پتہ چلا کہ وہ جاگ رہا تھا۔

"چاچا اگر......... اگر تم بھی چلو تو۔" نازاں نے بالوں کی لٹوں کو بل دیتے ہوئے پوچھا۔

اور پتہ نہیں گلو کیوں چاچا کے انکار کا انتظار کرنے لگا۔

"میں کیا کروں گا جا کر؟" وہ دکھ سے بولا۔

"چوڑیوں کے رنگ دیکھنا۔" نازاں نے شوخی سے جواب دیا تھا۔

"اب تو سب کچھ دھندلا گیا ہے بیٹا......... اب رنگوں کی پہچان ہی نہیں رہی۔"

"یہ کیا ڈراما شروع کر دیا تم لوگوں نے؟" گلو جھنجلا کر بول اٹھا۔ "اور سن......... چلنا ہے تو چل۔" اس نے آخری جملہ نازاں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"چلوں چاچا؟" اس نے بڑا سا پھول دار دوپٹہ شانوں پر پھیلاتے ہوئے پوچھا' پھر ایک طرف کا پلو سر پر ڈال لیا۔ گلو کو اس کا لمبا چوڑا دوپٹہ بھی چھوٹا محسوس ہوا۔ "میں تو برقعہ پہنا دوں گا۔" گلو نے سوچا پھر خود ہی جھینپ گیا۔ "مجھے کیا ضرورت پڑی ہے؟"

"اب چل نا۔" نازاں تیار کھڑی تھی۔ اس کی مٹھی میں دس دس کے مڑے تڑے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کیوں گلو کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ بھی چاچا سے اجازت لے لیتا یا اس کی طرف دیکھ لیتا۔

اس شام بازار میں پھرتے ہوئے جب بھی گلو نازاں سے دو قدم پیچھے ہوتا اس کے شانے پھیل جاتے' گردن اونچی ہو جاتی اور ملکیت کا احساس اسے توانائی بخشنے لگتا۔ آس پاس سے گزرتے لوگوں پر وہ یوں فاتحانہ نظر ڈالتا جیسے نازاں کوئی بہت قیمتی چیز ہو اور اب اس کی مٹھی میں ہو اور جیسے آس پاس سے گزرتے لوگ اسے رشک وحسد سے گھور رہے ہوں۔ اس سے جل رہے ہوں مگر جونہی نازاں اس کے برابر ہوتی اس کے پہلو میں چلنے لگتی یا قدم دو قدم پیچھے رہ جاتی تو گلو خود کو بڑی لجلجی سی چیز سمجھنے لگتا۔ بہت حقیر' جسے لوگ تاسف سے دیکھ رہے ہوں' اس پر ترس کھا رہے ہوں اور اسے نازاں پر غصہ آنے لگتا پھر چاچا پر.........

بیچ بازار میں اس پر انکشاف ہوا تھا کہ اس کی اہمیت کم کرنے والی نازاں ہے۔ اس نے گھر میں آ کر اس سے اس کا حق چھین لیا ہے۔ چاچا کی محبت بٹ گئی ہے۔ اس سے پہلے وہ صرف اور صرف اس کے لئے پریشان ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتا تھا' اس کا انتظار کرتا تھا اور آج......... اسے یقین تھا کہ وہ اس کا نہیں بلکہ نازاں کا منتظر ہوگا۔ اس کی کلائیوں میں چوڑیاں دیکھنے کا متمنی۔ یہ جاننے کے لئے بے چین کہ بازار میں گلو نے اسے پریشان تو نہیں کیا؟ اسے اپنے برابر چلتی ہوئی نازاں دل میں کبھی سوئی کی طرح محسوس ہونے لگی تھی۔

پھر جانے کیا ہوا۔ شاید بہت سے لوگ ریلے کی شکل میں کہیں سے نکل آئے تھے۔ نازاں اس سے بچھڑ گئی تھی۔ پتہ نہیں کہاں چلی گئی تھی اور تب گلو کے حلق میں خراشیں سی پڑ گئی تھیں۔ یہ ہوش تو اسے بعد میں آیا کہ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے آوازیں دے رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح لوگوں کو دھکے دیتا ادھر ادھر پھر رہا تھا۔ اسے ہوش میں لانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والی نازاں ہی تھی جو اس کا ہاتھ تھامے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"گلو! گلو.........!" اس نے اسے جھنجھوڑ دیا۔

"آں......... ہاں......... تو......... کہاں چلی گئی تھی تو؟" گلو نے اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔

پھر وہ وہاں رکا نہیں تھا۔ اسے لے کر سیدھا گھر آگیا تھا۔ اس کی کلائیوں میں چوڑیاں تھیں' اس کی کھنک تھی اور گلو کے دل میں کانچ کی بہت سی کرچیں۔ وہ چپ چاپ جا کر چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ چاچا نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا' نازاں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں رنگ جھلملانے لگے تھے۔ پھر جب اس نے گلو کے خریدے ہوئے کپڑے نکال کر چاچا کے سامنے رکھے تو چاچا چونک اٹھا تھا......... اس کی دھندلی پتلیوں کے پیچھے کہیں ایک تیز چمک سی تیر گئی تھی۔ ہونٹوں کے کناروں میں مسکراہٹ بھر گئی تھی۔

"یہ گلو نے دلایا ہے۔" نازاں نے نارنجی پھولوں والا ہلکے ہرے رنگ کا کپڑا اس کے سامنے پھیلا دیا۔

"یہ......... یہ......... تو!" پتہ نہیں چاچا کس صدمے کے اثر سے زرد پڑ گیا۔ پھر بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں جا گھسا۔ گلو اور نازاں اس کے رد عمل پر حیران ہو کر اسے کمرے میں جاتا دیکھ رہے بلکہ اس وقت تک اس کمرے کے خالی دروازے کو تکتے رہے جب تک وہ واپس اس چوکھٹ میں نظر آیا نہیں آیا۔ اور تب دونوں ہی بھونچکے رہ گئے۔ چاچا کے ہاتھ میں ویسا ہی ہرے رنگ کا ریشمی کپڑا تھا اور اس پر نارنجی رنگ کے پھولوں کے گچھے بنے ہوئے تھے۔

"یہ......... یہ تو........." گلو ہکلا کر رہ گیا۔ "یہ تو کب لایا تھا؟"

چاچا نے جھینپ کر کپڑا اپنے پیچھے چھپا لیا۔ "میں سمجھا تھا کہ تو نے......... تو نے یہ چرا کر نازاں کو دے دیا ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے گناہ کا اعتراف کر رہا ہو۔

"تو چور سمجھتا ہے نا تو مجھے؟" گلو ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "تم لوگوں کے ساتھ تو نیکی کرنا بھی گناہ ہے؟"

"نہیں نہیں......... گلو بیٹا یہ بات نہیں ہے۔ میں تو......... یہ خیال تو ابھی......... یہ کپڑا دیکھ کر صرف لمحے بھر کو آیا تھا۔ معاف کر دے......... مگر......... یہ

کپڑا........."

"یہ کپڑا تو نے کب اور کس کے لئے لیا تھا چاچا؟" نازاں اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔ "اگر یہ میرے لئے لیا تھا تو......... اب تو میں یہ نہیں لوں گی۔ یہ واپس کر کے دوسرا لے آ۔" اس نے اترا کر کہا۔

چاچا کپڑا سینے لگائے چارپائی پر آ بیٹھا۔ "یہ تو......... یہ تو میں نے سترہ برس پہلے لاہور سے لیا تھا......... اور آج تک یونہی رکھا ہے' وہ ملی ہی نہیں۔" ایک گہرا سناٹا جیسے اس کے منہ سے نکلنے والے جملوں کے بعد اس کے اندر سے نکلا اور سارے آنگن میں پھیل گیا۔

"وہ کہاں ہے چاچا......... مجھے بتا دے' میں کسی نہ کسی بہانے اسے دے آؤں گی۔ تیرا ذکر بھی نہیں کروں گی۔" نازاں اس کے قریب سرک آئی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"چل چل جا کے کھانے کا کچھ انتظام کر۔" چاچا ایک دم بدل گیا......... اٹھا اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑا بکس میں رکھ آیا۔ گلو بہت دیر تک کچھ سوچتا رہا مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بس ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر بھرا بہت سا گاڑھا گاڑھا دھواں آج نکل گیا ہو۔

اگلی صبح وہ لوگ سپرہائی وے پر سفر کر رہے تھے۔ یہ بڑی سی گاڑی تھی۔ چاچا کو لیٹنے کی جگہ بھی مل گئی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر آرام سے سر کے کپڑوں کی پوٹلی رکھے لیٹا تھا۔ اس سے اگلی سیٹ پر نازاں اور گلو تھے اور ڈرائیونگ سیٹ کے برابر جانو تھا۔ ڈرائیور پہلے ہی کی طرح کسی روبوٹ کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔ جانو کہہ رہا تھا۔ "میں نے ایک فلیٹ کا انتظام کر لیا ہے۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز ہے۔ تم لوگ وہیں رہو گے اس وقت تک جب تک حالات قابو میں نہیں آ جاتے۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا' تمہیں بھول کر بھی اپنے گھر کی طرف نہیں جانا ہے۔"

"یار جانو! تو فتح سے ڈرتا ہے کیا؟" گلو جھنجلا گیا' کراچی جانے کا ہر تصور تو اس کی گلی' اس کے گھر اور اردگرد کے متعلق تھا۔ وہاں نہ جاتا تو اسے لگتا ہی نہیں کہ کراچی آیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بات فتح کی نہیں ہے ان لوگوں کی ہے جو فتح کو آلہ کار بنائے ہوئے تھے۔ ہونا کچھ بھی نہیں ہے، لیکن پریشانی تو ہو سکتی ہے نا! فی الوقت میں ایسے حالات میں پھنسا ہوا ہوں کہ ذرا سی ڈسٹربنس سارے معاملات پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔"

"پتہ نہیں تو کیا کہہ رہا ہے اور.......... کیا کر رہا ہے؟" گلو بیزار ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ چاچا کو بھی اونگھ آ گئی تھی ورنہ وہ یوں چپ نہ رہتا۔ نازاں البتہ بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

"ٹھیک کہتے ہیں آپ.......... یہ تو باؤلا ہے۔ اس روز جب فتح کے آدمی ہمارے گھر آئے تھے اس روز اگر یہ ان کے ہاتھ لگ جاتا تو.......... تو جانے کیا ہو جاتا۔ خالہ نے کتنے حوصلے سے ان کا سامنا کیا تھا مگر پھر وہ خود کو سنبھال نہ سکی.......... کیسا خوف بھر گیا تھا اس کے دل میں کہ دل ہی بند ہو گیا۔"

"ارے ہاں نازاں.......... تم تو بہت سمجھ دار ہو.........." جانو نے فوراً اسے مسکا لگایا۔ "اسے سمجھاؤ.......... ادھر نہ نکل جائے جب تک ہر طرح سے خطرہ نہ ٹل جائے.........."

"مگر یہ خطرہ ٹلے گا کیسے؟"

"ٹل جائے گا.......... اگر اس نے میرا ساتھ دیا تو۔" جانو نے گلو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ اسے پہچانتا ہے۔" آخری جملہ اس نے خود سے کہا تھا۔ اس جملے کی ادائیگی میں اس قدر پُراسراریت تھی کہ گلو چونک گیا۔

"کون.......... کسے.. میں؟"

"آں.......... ہاں کچھ نہیں.......... میں کچھ سوچ رہا تھا۔" وہ جلدی سے سیدھا ہو گیا۔

آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ موسم تو برسات کا تھا مگر تیز ہوا منٹوں میں بادل اڑا لے جاتی تھی۔ سارے ملک میں جگہ جگہ بارش ہو رہی تھی، مگر سندھ میں ویسی ہی حدت اور تپش تھی۔ سورج بادلوں کے پردے میں بھی اتنا تپ رہا تھا کہ بادلوں سے بھاپ نکلتی محسوس ہوتی تھی۔ گرم گرم.......... جھلسا دینے والی بھاپ۔ گاڑی ایئر کنڈیشنڈ تھی ورنہ ان لوگوں کے جسم پگھل گئے ہوتے۔ آج تو حیدر آباد میں صبح تڑکے ہی

سے شدید گرمی تھی۔

سپرہائی وے کے لمبے، تھکا دینے والے سفر کے بعد گاڑی جس بلڈنگ کے سامنے رکی وہ جگہ گلو کے لئے اجنبی تھی۔ "اترو!" جانو نے دروازہ کھول کر اترتے ہوئے کہا۔ چاچا جاگ چکا تھا۔ نازاں کپڑوں کی پوٹلی گود میں رکھے اترنے کو تیار تھی۔ گلو بھی دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔

"یہ کون سی جگہ ہے جانو؟"

"یہ کلفٹن کا علاقہ ہے۔ تم لوگوں کو یہاں ایک فلیٹ میں رہنا ہے جب تک حالات معمول پر نہیں آ جاتے۔"

"مگر جانو! ہم لوگ یہاں.......... یہ تو اونچے لوگوں کا علاقہ ہے۔ ہمیں تو کسی چھوٹی سی بستی میں جگہ دلا دیتا یہاں تو نیند بھی پرائی اور مہنگی لگے گی۔" گلو عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔

"تم لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہو گی گلو! ساری سیٹنگ کرنے کے بعد کچھ سوچیں گے.......... فی الحال ہمارے پاس یہی جگہ ہے.........."

پتہ نہیں یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ یہ بات صرف گلو ہی نے نہیں، چاچا اور نازاں نے بھی بیک وقت سوچی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ جانو اور احسان اللہ کے لئے کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئے ہیں۔ چاچا کے اندر تو ایک دم ابال اٹھنے لگے تھے۔ وہ تو اپنے اسی گھر میں رہنا اور پرچون کی دکان چلانا چاہتا تھا۔ اچانک ایک خوفناک خیال نے اسے لرزا دیا۔ "کہیں استاد فتح ہی کی کوئی چال تو نہیں؟" اس خیال نے اس پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ اس کا یہ جی چاہا کہ وہ گلو اور نازاں کو دونوں بغلوں میں دبا کر ایک طرف کو بھاگ اٹھے اور کبھی جانو کے ہاتھ میں نہ آئے۔ اس کے کانوں میں اچانک سائیں سائیں کی آواز گونجنے لگی تھی۔

"آیئے ناں!" جانو کی آواز نے جیسے ساری آوازوں کو ایک دم نگل لیا۔

گلو بھی یوں بلڈنگ کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے اسے کوئی زبردستی گھسیٹ کر اس سمت میں لے کر جا رہا ہو۔ جانو سب سے آگے تھا۔ چاچا نے نازاں کا ہاتھ سختی سے پکڑ رکھا تھا جیسے اگر اس کا ہاتھ چھوٹ گیا تو وہ کہیں کھو جائے گی۔ یہ لوگ آگے پیچھے چلتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے بلڈنگ کے اندر داخل ہو گئے۔ پہلی منزل پر دائیں ہاتھ کا فلیٹ ان کا تھا جس کا لاک جانو نے کھولا اور اندر جا کر گلو' چاچا اور نازاں تینوں ہی حیران ہو گئے۔ پورا سجا سجایا گھر تھا۔ یوں جیسے ابھی ابھی یہاں رہنے والے کہیں گئے ہوں اور جیسے تھوڑی دیر ہی میں واپس آنے والے ہوں۔

"یہ.......... یہ کس کا ہے؟" چاچا نے جانو سے پوچھا۔

"چاچا یہ میرے ایک عزیز کا فلیٹ ہے' وہ سنگا پور میں رہتا ہے۔ سال میں ایک آدھ بار آتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی گیا ہے۔ اب سمجھئے کہ سال بھر بعد لوٹے گا۔ اس وقت تک کچھ کر لیں گے۔"

نازاں کے سپاٹ چہرے پر اچانک خوشی برسنے لگی تھی۔ آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ اس نے تو ایسے بھرے اور سجے گھر کا خواب بھی نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔ پوٹلی سینے سے لگائے' حیران اور چمک دار آنکھوں والی نازاں گلو کے دل میں کھب کر رہ گئی مگر اس کا وہی انداز کہ دوسرے ہی لمحے اس نے دانت کچکچا کر منہ پھیر لیا۔ جانو اس سے شام کو آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اس نے کہا تھا کہ فی الحال یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے پھر بھی اگر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ بلا جھجک مانگ سکتا ہے مگر گلو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے اور کہا تھا۔ "کیوں مجھے بوجھ سے داب کر مارنا چاہتا ہے تو؟ میرے پاس پیسے ہیں میں خود ہی انتظام کر سکتا ہوں۔"

کچن خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ نازاں نے اس میں قدم رکھا تو اس قدر نپا تلا تھا جیسے وہی اس سجے سجائے فلیٹ کی مالکن ہو' اس کی چال میں اچانک تمکنت پیدا ہو گئی تھی' گردن اونچی اور کمر کا ہلکا سا خم سیدھا ہو گیا تھا اس کے انداز دیکھ کر گلو نے جل کر کہا۔ "اپنے آپ میں رہنا یہ تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے' کسی اور کا گھر ہے۔"

اور نازاں نے ایک دم پلٹ کر' چونک کر یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس نے ہاتھ مار کر اس کی ہتھیلیوں میں چھپے خواب گرا کر چکنا چور کر دیئے ہوں۔ "جانتی ہوں۔" وہ بجھ گئی تھی۔ "اپنا نصیب جانتی ہوں۔ وہی کچی اور نیچی دیواریں جن کے ہر بار سیلاب میں بہہ جانے کا خطرہ جی بھر کر سونے بھی نہیں دیتا۔ وہی دھواں لگے برتن' جیسے روٹی نہیں کوئلے نگل رہے ہوں دھواں پی رہے ہوں.......... اور.......... اونچا نیچا ناہموار

فرش.......... بالکل اپنی زندگی کی طرح' جیسے کچی سڑک پر بیل گاڑی کا سفر جاری ہو.......... یہی زندگی ہے' میں جانتی ہوں اور یوں بھی تجھ سے اچھی زندگی کی توقع کرنا ہی فضول ہے۔ تیرے جیسے ہٹے کٹے آدمی کے لئے محنت کر کے کمانا مشکل ہو تو زندگی ایسی ہی گزرتی ہے.........." اس کا لہجہ بتدریج اونچا اور تیز ہوتا گیا تھا۔

"پتہ نہیں یہ آدمی کیسا ہو گا جس نے اتنا کچھ بنا لیا۔ ایسا خوبصورت گھر' اتنے اچھے برتن.........." وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر پورے کمرے میں گھوم گئی۔

گلو کے اندر' اچانک ہی اتھل پتھل ہونے لگی.......... دیواروں پر سجی تصاویر' دروازوں کے بیچوں بیچ لٹکتے ہوئے گلدستے' فرش پر بچھا قالین اور فرنیچر سب.......... سب کچھ گھومتے ہوئے محسوس ہونے لگے.......... اگر چاچا کی سرگوشی نے چونکایا نہ ہوتا تو شاید اسے چکر ہی آ جاتے۔

"گلو! مجھے یہ سب کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔" وہ وہیں قالین پر بیٹھ گیا تھا۔ "تو نے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں سارے راستے سوچتا رہا ہوں۔ اب یہاں بیٹھ کر مجھ سے کھل کر بات کر' تو چاہتا کیا ہے! کیوں ان لوگوں کو گلے کا ڈھول بنا لیا ہے تو نے.......... کسی کے احسان کا بدلہ یوں نہیں چکایا جاتا اور یہ بتا احسان کیسا؟ استاد فتح مرا ہی نہیں تھا' تو قاتل ہی نہیں تھا پھر کیسا احسان' صرف اطلاع ہی تو دی ہے ان لوگوں نے.......... پھر.......... یہ سارا گورکھ دھندا ہے؟ اور تو کون سا ایسا محب وطن ہے کہ اپنی زندگی داؤ پر لگانے کو تیار ہو گیا ہے۔ ایسے حکومتیں بنتی ہیں بگڑتی ہیں' سسرا کوئی آ کر ہمیں کون سا کچھ دے جاتا ہے۔ ہر بار بارشوں میں بستی ڈوب جاتی تھی۔ لوگ راتیں چھتوں یا پلیوں پر گزارتے تھے۔ سامان بہہ جاتا تھا تو بارش کے بعد پھر پائی پائی جوڑ کر سامان بناتے تھے' کچے گھروں سے ڈبے بھر بھر کر پانی نکالتے تھے۔ اپنا تنکا تنکا جوڑ کر پھر گھر بنا لیتے تھے۔ مہینوں گیلے بستروں میں سوتے تھے' بیمار ہوتے تھے پھر ٹھیک ہو جاتے تھے' کون کون سے وزیر آ گئے تیری کچی بستی میں؟ کس حکومت کے کارندے آ کر گھر بنا گئے یا گھر دے گئے.......... یہ سب ڈھکوسلے ہیں' زیادہ حب الوطن بن کر مصیبتوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے اپنے گھر کی دیواریں اٹھا' اپنے گھر میں جلانے کو دیئے میں تیل ڈال بڑا' یہی گھر جڑ جڑ کر بستی' پھر شہر اور پھر ملک بنتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاچا سانس لینے کو رکا۔ گلو نے چونک کر پہلو بدلا۔ نازاں جو پوٹلی اب بھی سینے سے لگائے کھڑی تھی' وہیں اکڑوں بیٹھ گئی۔ پوٹلی اب بھی اس کی گود میں تھی۔

گلو کے چہرے پر یوں تو کوئی تاثر نہیں تھا مگر پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ چاچا کو خوشی ہوئی' شاید اس لئے کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یہ سب کچھ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔

"دیکھ گلو! تو جتنی جلدی ہو سکے' کسی بھی طرح ان لوگوں سے دامن بچا لے۔ کسی پھیرے میں آئے بغیر۔ کوئی ایسا ویسا کام کیے بغیر نکل ان لوگوں کے ہاتھوں سے۔ کچھ پڑھ لکھ لیا ہوتا تو بات جلدی سمجھ میں آگئی ہوتی۔"

اس رات نہ گلو کو نیند نہ آئی' نہ نازاں کو اور نہ ہی چاچا کو۔ تینوں کروٹیں بدلتے رہے۔ نرم نرم گدوں پر سویا ہی نہ گیا............ کھری چارپائی یاد آتی رہی اور گلو نے جب چپکے سے سر اٹھا کر نازاں کو بڑے سے بیڈ پر لیٹے دیکھا تو مایوسی سے سر دوبارہ تکیے پر ٹکا دیا۔ اس کا گدرایا ہوا بھرا بھرا جسم جہازی سائز کے بیڈ کے ایک کونے میں سمٹا پڑا تھا............ یا شاید وہ خود ہی سکڑی سمٹی لیٹی تھی۔ چارپائی تو اس کے بدن سے بھر جاتی تھی۔

"گلو!" چاچا نے یوں سرگوشی کی جیسے اس فلیٹ میں ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہوں اور ذرا سی بھی اونچی آواز ہوئی تو سب اٹھ جائیں گے۔

"ہوں!" گلو بولا۔ چاچا کی آواز سن کر نازاں تو یوں اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے کسی قید سے ایک دم چھوٹ گئی ہو۔

"چاچا مجھے نیند نہیں آتی۔" نازاں نے وہیں سے کہا۔

"مجھے بھی نہیں آ رہی بٹیا!" وہ اب اٹھ بیٹھا تھا۔ دونوں الگ الگ بیڈ پر لیٹے تھے جب کہ گلو بیچ میں پڑے دیوان پر لیٹا تھا۔ "گلو! تو سو گیا کیا؟"

"نہیں۔" اس بار گلو نے ان لوگوں کی طرف منہ کر لیا۔ وہ لوگ اس کے بالکل سامنے تھے۔

"یہ جانو آیا کیوں نہیں............ کہہ تو گیا تھا ناں کہ شام کو آؤں گا!" چاچا کی آواز میں تشویش تھی۔ "اب تو رات کے گیارہ بج گئے۔"

"پتہ نہیں کیوں نہیں آیا۔" گلو پریشان تھا۔ اس نے تو سوچا ہوا تھا کہ جانو سے کہے گا کہ اسے' چاچا اور نازاں کو ان کے حال پر چھوڑ دے............ زندگی ہو گی تو بچ جائیں گے اور نہ ہوئی تو بھلا کون روک سکتا ہے۔

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ نازاں پتہ نہیں کیوں چپ تھی مگر چاچا اور گلو اپنی اپنی جگہ گہری سوچ میں تھے............ عین اسی لمحے بیچ میں رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی اتنے زور سے چیخی کہ سب ہی اچھل پڑے۔ چاچا اور نازاں تو اچھل کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں کسی کو بھی نہیں پتہ تھا کہ یہاں ٹیلی فون بھی ہے۔ کسی کی نگاہ ہی نہ پڑی تھی۔ یہ ٹیلی فون جو مسلسل چیخ رہا تھا دو صوفوں کے درمیان ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھا تھا۔ گلو نے گھبرا کر ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو! کون............ گلو؟" دوسری طرف سے آنے والی آواز جانو کی تھی اور اتنی صاف تھی جیسے وہ بالکل سامنے کھڑا اس سے بات کر رہا ہو۔

"ہاں............ میں ہوں۔" گلو نے جواب دیا۔

"میں آج نہیں آ سکوں گا گلو! بہت ضروری کام ہو گیا تھا۔ کل آؤں گا۔" جانو کہہ رہا تھا۔

"کل ضرور آنا جانو! مجھے تجھ سے بات کرنا ہے۔ بہت ضروری بات۔" گلو نے جلدی جلدی کہا۔

"سب ٹھیک تو ہے ناں!"

"ہاں............ نہیں جانو! بس تو کل ضرور آنا............ سویرے ہی آجانا۔"

"ہاں کل ضرور آؤں گا............ تم کہیں گئے تو نہیں؟" اس کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ گلو الجھ کر رہ گیا۔

"نہیں............ لیکن اگر کل تم نہیں آئے تو............ میں اور چاچا وغیرہ یہاں سے چلے جائیں گے۔"

"آؤں گا یار............ تم بے وقوفی کی باتیں نہ کرو............ تم لوگوں کو خطرہ ہے............ ایسے گھر سے نہیں نکلنا............ کل ضرور آؤں گا............ تم لاک وغیرہ اچھی طرح چیک کرنے کے بعد ہی سونا............ گیلری مت کھولنا............ اب کسی کا فون بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئے تو ریسیور نہیں اٹھانا............ میں فون نہیں کروں گا............ تم سمجھ رہے ہو ناں!" وہ چند ثانئے چپ رہ کر پھر بولا۔ "گلو! اگر دروازے پر بھی کوئی آئے تو مت کھولنا............ اور سنو! چاچا وغیرہ کو مت بتانا کہ میں نے تم سے کیا کہا ہے۔ وہ خواہ مخواہ خوفزدہ ہو جائے گا۔ میں صبح آ کر بتاؤں گا ساری بات............"

"ہوا کیا ہے............ تم یہ سب کچھ کیوں کہہ رہے ہو؟" گلو گھبرا رہا تھا۔

"بس.. کل بتاؤں گا۔ تم میری ہدایات پر عمل کرنا۔ ورنہ کسی بھی بے وقوفی کے ذمے دار تم خود ہو گے۔ پلیز جو کچھ میں نے کہا ہے وہی کرنا۔"

پھر جانو نے اسے سمجھایا کہ ٹیلی فون کے سیٹ کے نیچے ایک چھوٹا سا پہیہ بنا ہوا ہے اسے گھما کر انتہائی دائیں طرف کر دے۔ اس طرح اس کی آواز بند ہو جائے گی۔ گلو نے ویسا ہی کیا مگر اب اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جانو کسی بڑی پریشانی میں ہے' کوئی بڑی بات ہو گئی ہے۔ جانو نے کل آنے کا وعدہ کر کے فون بند کر دیا۔ گلو نے جیسے ہی ریسیور رکھا' اس کے قریب کھڑے چاچا اور نازاں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ "وہ کون تھا؟ کیا کہہ رہا تھا؟ کیوں کہہ رہا تھا؟"

گلو نے صرف اتنا ہی بتایا کہ جانو تھا' کسی کام کی وجہ سے نہیں آ سکا اور کل آنے کو کہا ہے............ وہ جانو کی اس بات سے متفق تھا کہ اگر چاچا کو کچھ بتا دیا تو وہ خوفزدہ ہو جائے گا' مگر گلو تو خود بھی ڈر گیا تھا۔ جانو نے جو کچھ کہا تھا اور جس انداز سے کہا تھا' اس سے تو لگ رہا تھا جیسے کسی کو ان لوگوں کی یہاں موجودگی کا پتہ چل گیا ہے' کوئی یہاں پہنچ سکتا ہے یا فون کر سکتا ہے' مگر کون؟ گلو بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اسے تو اب استاد فتح کے آدمیوں کے علاوہ اور کسی سے کوئی خوف نہ تھا............؟ پھر کیا استاد فتح کے آدمیوں کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ یہاں.. اس فلیٹ میں موجود ہے؟ یہ خیال اسے پریشان کرتا رہا۔ دوسری طرف چاچا نے بڑبڑا' بڑبڑا کر اس کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر گلو نے کل ہی یہاں سے چلنے کا ارادہ نہ باندھا تو وہ نازاں کو لے کر اپنے پرانے گھر چلا جائے گا پھر جو ہو سو ہو۔

وہ رات کیسے گزری' یہ گلو کو پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ کچھ دیر کو سویا بھی تھا کیونکہ اٹھتے ہی اسے وہ خواب یاد آ گیا تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ اس نے خواب میں امام دین کو

یکھا تھا مگر کسی لاش کی صورت خون میں لت پت............ وہ مرچکا تھا مگر پھر بھی گلو کو آوازیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھا تو اس کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اب تک امام دین کا خیال نہیں آیا تھا۔ یہ خواب اسے پریشان کر گیا............ اس نے سر گھما کر اندر کمرے میں دیکھا۔ چاچا اور نازاں سو رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ لوگ بھی تڑکے ہی ئے ہوں گے۔ آدھی رات تک تو وہ جانتا تھا کہ دونوں جاگ رہے تھے۔ گلو کے سر ں درد ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ نازاں کو اٹھا کر کہے کہ وہ چائے بنا دے مگر پھر جانے ں اسے جگانے کا ارادہ ترک کر کے وہ خود کچن کی طرف بڑھ گیا۔ امریکن طرز کا بنا ہوا ن دیکھ کر اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے چولہے پر رکھی اسٹیل کی کیتلی اٹھا اس میں چائے کے لئے پانی رکھا۔ گیس کا چولہا تھا۔ ایک دو مرتبہ تمام بٹن گھمانے کے ہی اسے پتہ چل گیا کہ کون سا بٹن کس چولہے کا ہے۔ اس نے آگ جلا کر چائے کا پانی ا اور خود نہانے چلا گیا۔ خوبصورت رنگ کے ٹائلز سے بنا ہوا بڑا سا باتھ روم وہ کل ہی چکا تھا۔ عجیب خواب خواب کا سا عالم لگ رہا تھا۔ ایسے گھر' ایسے کچن اور باتھ روم کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا پھر اچانک ہی............ بالکل اچانک اس کے اندر کا گلو بیدار یا جو راتوں رات استاد فتح بننا چاہتا تھا۔ شاید اس جملے نے اسے بیدار کر دیا تھا جو نہاتے ے اچانک اس کی سماعت میں گونج اٹھا تھا۔ نازاں نے کتنی حسرت سے کہا تھا۔ "پتہ یہ آدمی کیسا ہو گا جس نے اتنا کچھ بنا لیا' اتنا اچھا گھر' اتنے اچھے برتن۔"

"کیسا ہو گا وہ آدمی؟ کیا سرخاب کے پر لگے ہوں گے اس میں؟" وہ بھنا کر بڑبڑایا۔ تو میں بھی کر سکتا ہوں بس ذرا............ ذرا............ جان ہتھیلی پر رکھنا ہو گی۔" آخری کہتے ہوئے وہ جھجک اٹھا تھا۔ وہ بہت دیر تک نہاتا رہا۔ بھول گیا کہ چولہے پر چائے کا چڑھا کر آیا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا وہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ پھر نازاں کے کہے ے الفاظ تو جیسے جلتی پر تیل چھڑک رہے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تجھ سے تو اچھی ی کی توقع کرنا ہی فضول ہے۔"

"اونہہ............ اچھی زندگی............ میں چاہوں تو ایسی زندگی گزاروں اور اسے اؤں کہ ساری عمر یاد کرے۔" وہ بڑبڑایا۔

"تو ایسا کر کیوں نہیں لیتا گلو؟" اس کے اندر ہی کسی نے سرگوشی کی تھی۔ "ایسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی اتنے بہت سے لوگ گزارتے ہیں' کسی کو بھی کچھ نہیں ہوتا.......... نڈر ہو کر اور بے خوفی کے ساتھ مرجانا.......... یہی تو زندگی ہے۔ ایک ہی بار تو ملتی ہے۔ تو کو کیوں نہیں کرتا؟ یہ تیرا حق ہے.......... اچھی طرح زندہ رہنا تیرا بھی تو حق ہے۔"

وہ نہا کر نکلا تو کافی کچھ سوچ چکا تھا۔ پہلی بات تو وہ یہی طے کر چکا تھا کہ خدا اتنے اچھے گھر میں رہنے کا موقع دیا ہے تو اسے بے وجہ کھری چارپائی پر سونے کی خوا میں ضائع کرنا انتہائی بے وقوفی ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح چاچا کو منا لے گا۔ وہ بے ان چیزوں کا عادی نہیں ہے' رفتہ رفتہ عادی ہو جائے گا۔ نازاں کو بہلانا تو خیر بہت آ تھا اور یوں بھی اس نے اب تک یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش کا کوئی اظہار کیا تھا۔ البتہ اس کی مایوسی کا احساس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اگر وہ اس سے کہ کہ یہ گھر اور اس میں سجی ساری چیزیں' اچھے اچھے برتن سب تیرے ہیں تو وہ ہواؤں میں اڑنے لگتی.......... اس نے تولیہ سے سر پونچھتے ہوئے سوچا۔

"لے چائے۔" وہ اچھل پڑا۔ تولیہ منہ کے سامنے سے ہٹایا تو سوجی سوجی آنکھ والی نازاں چائے کا خوبصورت مگ لئے کھڑی تھی۔ اس کی کلائیاں کانچ کی رنگین چوڑ سے بھری ہوئی تھیں۔

"تو کب اٹھی؟" اس نے مگ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ایک گھنٹا پہلے' جب تو نہانے گیا تھا۔" اس نے ایک گھنٹا' پر زور دے کر "تیرا کیا خیال تھا گلو کہ اس غسل خانے میں دیر تک نہانے سے تو گورا ہو جائے گا؟" منہ دبا کر ہنسی۔

خلاف توقع گلو اس کی بات سن کر بھڑکا نہیں' دھیرے سے مسکرا دیا۔ "نہیں ہونے کی خواہش نہیں ہے' جیسا ہوں' ویسا ہی رہوں گا۔"

"صابن کتنا اچھا ہے ناں! خوشبو والا۔" وہ ایک دم سب کچھ بھول بھال کر بچوا طرح خوش ہوتی ہوئی بولی۔

"ہاں.......... نازاں اگر کوئی کہے کہ یہ گھر.......... یہ ساری چیزیں تیری تو..........؟" گلو نے پہلی بار اس سے کوئی بات کی تھی اور وہ بقول اس کے سیدھے

"ہائے اللہ۔" اس نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر آنکھیں

ں۔ "میں سمجھوں گی کہ میں کوئی حسین سا خواب دیکھ رہی ہوں.......... اور اگر یہ بات یری سمجھ میں آ گئی کہ یہ خواب ہے تو میں.......... میں ساری زندگی نہیں اٹھوں ی.......... بس سوتی ہی رہوں گی.......... اور ایسے ہی مرجاؤں گی۔" یہ کہہ کر اچانک ں نے آنکھیں کھولیں' پھر آنکھیں پھیلا کر گلو کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی رانی تھی۔ "مگر.......... تو یہ کیوں کہہ رہا ہے؟ اور یہ.......... آج تو.......... اتنے اچھے ڈ میں باتیں کیسے کر رہا ہے؟"

"میں بھی تو انسان ہوں نازاں.......... کیا میرا جی نہیں چاہتا کہ لوگوں سے اچھی ح باتیں کروں مگر.......... یہ چاچا.......... اور اب تو.......... تم دونوں مجھے جلانے اور ھانے والی باتیں کرتے ہو۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

نازاں اب بھی حیران تھی۔ "تو خود ہی تو ہر وقت پھاڑ کھانے کو تیار رہتا ہے۔ چاچا ھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ پتہ ہے' ہر وقت تیری باتیں کرتا رہتا ہے تیرے بچپن کے سناتا رہتا ہے۔ جب تو بہت اچھا تھا۔ اس کی ہر بات مانتا تھا تب کی بہت سی باتیں کرتا ۔ گلو! تجھے.......... کیا مسئلہ ہے تیرے ساتھ جو تو سب سے اتنی نفرت کرتا ہے' اور سے بھی۔"

پتہ نہیں اس کا آخری جملہ سوال تھا یا.......... گلو نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پتہ نہیں کیا تھا۔ گلو نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

"چاچا سو رہا ہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"اسے یہاں رہنے پر راضی کر نازاں۔ ہمارا اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں دیکھ' میں اب کسی نئے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا مگر جس چکر میں پڑ چکا ہوں اس سے تو ہے ناں مجھے! ہم اگر وہاں جائیں گے تو استاد فتح کے آدمی ہمارے پیچھے پڑ جائیں گے۔ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں نازاں' وہ جیل میں رہ کر بھی اثر و رسوخ رکھتا ہے اور تو نے سنا کہ جانو کہہ رہا تھا' ان لوگوں کے پیچھے کچھ دوسرے لوگ ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا بہت ہے۔ جب تک سب کچھ ٹھیک نہ ہو جائے ہمیں یہیں رہنا چاہیے.......... اور پھر ا گھر.......... سجا سجایا.......... ہمارے نصیب میں کہاں ہے؟"

"گلو!" وہ ذرا سا سرک کر اور قریب آ گئی۔ "گلو کیا.......... کیا ہمارا گھر بھی ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں ہو سکتا؟" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

"اس کے لئے بہت پیسا چاہیے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تو اتنا پیسہ نہیں کما سکتا؟" اس کے انداز میں ترغیب تھی............ "گلو دیکھ نا............ اب بندہ جیئے تو اچھی طرح جیئے ناں!"

گلو سر اٹھا کر اسے دیکھتا رہا۔ جو کچھ وہ سوچ چکا تھا اگر نازاں نے اس کی سوچ تقویت نہ دی ہوتی تو شاید وہ اندر سے کمزور پڑ جاتا مگر اب............ اس نے خود کو مز طاقتور محسوس کیا............ اسے سب سے بڑی دیوار چاچا لگا............ اس کے راستے مے حائل............ وہ جانتا تھا کہ چاچا کو قابو میں کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے............ پائی پائی حساب رکھتا تھا وہ اور یہ استاد فتح والے چکر کے بعد تو اس نے اپنی نظروں کو گویا دو دھار تلوار بنا لیا تھا۔ گلو کو اس وقت اپنا سب سے مضبوط سہارا نازاں لگی............ نازاں چاہ تو اسے سنبھال سکتی تھی۔ چاچا کو سمجھا سکتی تھی اور تب گلو نے دھیرے دھیرے ا پڑھانا شروع کر دیا کہ اچھی زندگی گزر سکتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا مگر چا تو چاہتا ہے کہ بس لگے بندھے کام کرتا رہے، جس میں صرف دو وقت روٹی مل جائے اگر وہ لوگ یہیں رہیں تو گلو کو جانو کوئی اچھی سی نوکری دلا دے گا پھر رفتہ رفتہ وہ لوگ پیسہ جمع کر کے اپنا گھر بھی بنا لیں گے۔

نازاں اس کے خیالات اور ارادوں سے متفق تھی............ اس نے فوراً ا خدمات پیش کر دی تھیں کہ چاچا کو وہ سنبھال لے گی۔ یہاں رہنے پر تیار کر لے گی۔ ا ایک ہی شرط رکھی تھی اس نے کہ گلو کوئی ایسا کام نہ کرے جو اسے مجرم بنا ڈالے اور کلاں چاچا اس کا گریبان پکڑ لے............ گلو نے وعدہ بھی کر لیا تھا اور یہ وعدہ اس صدق دل سے کیا تھا کہ وہ اس بات کا خیال رکھے گا۔

پھر پتہ نہیں وہ لوگ کتنی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چاچا اگر اس وقت اٹھ تو شاید حیرت سے گر کر بے ہوش ہو جاتا۔ وہ دونوں پہلی بار دوستوں کی طرح قریب باتیں کر رہے تھے بلکہ مسکرا بھی رہے تھے............

گلو کو لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سینے پر رکھی بھاری سل سرکا دی ہے۔

کپڑے بدل کر جانو کا انتظار کرنے لگا۔ نازاں نے کچن میں آٹا تلاش کر کے پراٹھے بھی پکا لیے، چائے بنا کر وہ چاچا کو اٹھانے چلی گئی............

اب سورج سامنے آ چکا تھا۔ شاید صبح کے دس بجے ہوں گے کہ کال بیل بجی۔ چاچا پتہ نہیں کال بیل کی آواز سے اٹھا تھا یا نازاں کے اٹھانے پر، تیزی سے باہر آ گیا۔

"کون ہے؟" گلو نے دروازے کے قریب جا کر پوچھا۔

"میں ہوں۔" دوسری طرف سے جانو تھا۔

گلو نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ جانو کا رنگ پیلا ہو رہا تھا یا شاید گلو کو ایسا لگا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی یا ممکن ہے کہ یہ بھی گلو کا وہم تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے پوچھ لے اور اگر چاچا بھی ایک دم نہ آ گیا ہوتا تو وہ پوچھ بھی لیتا مگر اس وقت خاموش رہنا ہی بہتر تھا............ جانو نے خود کو سنبھالا اور مسکرا کر چاچا کو سلام کیا۔ "آپ لوگ............ ٹھیک تو ہیں ناں!؟"

"ہاں............ خیریت ہے۔" چاچا کے کچھ بولنے سے پہلے ہی گلو بول اٹھا۔

نازاں بہت سمجھ دار تھی فوراً ہی چاچا سے بولی۔

"چاچا! تم ہاتھ منہ دھو لو بلکہ نہا لو............ میں ناشتہ بنا چکی ہوں۔ سب ساتھ ہی ناشتہ کر لیں گے۔"

چاچا کے پلٹتے ہی جانو گلو کا ہاتھ تھام کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"کیا بات ہے جانو؟" گلو کو اب گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ پھر جو کچھ جانو نے بتایا اس نے گلو کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

وہ تو غنیمت تھا کہ چاچا کمرے میں نہیں تھا ورنہ غضب ہو جاتا۔ جانو گلو کو بتا رہا تھا۔ "احسان اللہ کو اغوا کر لیا گیا۔"

"کیا............ مگر............ کیوں............ کس نے؟"

"یہ سب ابھی پتہ چلا ہے مگر............ اسی لئے تو میں کہہ رہا تھا کہ تم گھر سے نہیں نکلنا۔ لگتا ہے ان لوگوں نے ہمارا تعاقب کیا ہے ورنہ............ خیر۔" وہ الجھ کر پیشانی سہلانے لگا۔ وہ کافی بوکھلایا ہوا تھا۔

"مگر جانو! احسان اللہ تو............ کون لوگ ہیں، کیا فتح کے آدمی............؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں یار' فتح کے آدمیوں میں ابھی اتنا دم نہیں ہے کہ............ بہرحال' میں حیدر آباد جا رہا ہوں۔ چند دن لگ جائیں گے۔ تم صرف اور صرف احتیاط کرو۔ شام کو ایک آدمی طفیل تمہیں فون کرکے بتا دے گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے' اگر وہ کہے گا کہ سب ٹھیک ہے' اطمینان رکھو تو سمجھ لینا کہ تم آزاد ہو' جہاں چاہو جا سکتے ہو اور اگر وہ کہے کہ کچھ مسائل ہیں اس لئے محتاط رہو تو............"

"میں سمجھ گیا جانو! مگر ایک بات بتا' یوں میں پھر وہی قید کا قید رہ گیا اب نہ چاچا میری باتوں میں آئے گا اور نہ یہ نازاں' بلکہ چاچا تو کہہ رہا تھا کہ چھوڑ دے یہ سب کچھ' زندگی ہوگی تو جی لیں گے ورنہ مرجائیں گے۔ جانو' ہم نے ایسی زندگی گزاری نہیں ہے۔ اور میرا تو تجھے پتہ ہے' گھر میں جی نہیں لگتا تھا۔"

"میں جانتا ہوں گلو! اگر تم میرے ساتھ کام نہیں کرنا چاہتے تو تمہاری مرضی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے دل میں بھی وطن کا درد ہے۔ خیر' اب تمہیں فتح کے آدمیوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کے تمام آدمی انڈر گراؤنڈ ہو چکے ہیں۔ تم چاہو تو اپنے گھر جا سکتے ہو۔ میں یہ سب احتیاط اس لئے کر رہا تھا کہ ممکن ہے ان لوگوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھا ہو اور وہ تمہیں کسی قسم کی زک پہنچانے کی کوشش کریں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ لوگ بھی اتنے بے خبر نہیں ہوں گے۔"

"دیکھ جانو! سچی بات تو یہ ہے کہ میں کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہوں جس میں بہت سے پیسے ملیں۔ تو نے کام دلانے کا وعدہ کیا تھا' اب اگر تیرے ساتھ یہ سب چکر ہے تو میں کام کیسے کروں گا!"

"میں نے وعدہ کیا ہے ناں گلو! تو میں اسے پورا بھی کروں گا۔ تم صرف چند روز صبر نہیں کر سکتے؟"

"لیکن وہ............ چاچا۔"

"اسے میں سنبھال لوں گا۔" جانو نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اتنی ہی دیر میں چاچا گیلے منہ سے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "کیا بات ہے؟" اس نے کمرے میں گھستے ہی دونوں کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"کیسے ہیں چاچا آپ؟" جانو نے مسکرا کر پوچھا۔ وہ اب بالکل نارمل تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں بیٹا! لیکن یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔ تم لوگ ہمیں معاف کر دو۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔" چاچا نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

جانو کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ شرمندگی سے سر جھک گیا اور اس نے لپک کر چاچا کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں چاچا! یہ سب تو میں نے آپ لوگوں کے لئے ہی کیا تھا' اگر آپ نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ آپ چاہیں تو آج ہی اپنے گھر چلے جائیں' میں گلو کو بتا رہا تھا کہ اب اسے فتح کے آدمیوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ سب گرفتاری کے ڈر سے روپوش ہو گئے ہیں۔"

شاید جانو نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ گلو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند ہی لمحے پہلے تو اس نے کہا تھا کہ وہ چاچا کو سنبھال لے گا اور اب............ گلو حیرت سے سوچ رہا تھا کہ اسے ہوا کیا' یہ بدل کیوں گیا؟

"بڑی مہربانی ہوگی جانو! میں............ میں یہاں رہ نہیں سکتا۔" چاچا ایک دم ہی خوش ہو گیا۔

"کوئی بات نہیں............ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے یاد رکھیے گا۔" جانو کھڑا ہو گیا مگر عین اسی وقت نازاں چائے لے آئی۔ یہاں سے جانے کی بات سن کر نازاں کا چہرہ اتر گیا تھا۔ اس نے استفہامیہ نگاہوں سے گلو کی طرف دیکھا مگر گلو چاچا کے سامنے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لئے اس نے نگاہیں چرا لیں۔

چائے کے دوران میں ہی ان لوگوں نے فی الفور یہاں سے روانگی کا پروگرام بنا لیا۔ گٹھڑیاں تو پہلے ہی بندھی ہوئی تھیں۔ جانو نے انہیں وہاں تک چھوڑنے کی آفر نہیں کی' بلکہ گلو سے کہہ دیا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اسے فون کر دے۔ اس نے اپنا فون نمبر بھی دے دیا جسے گلو نے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ چائے کے بعد جانو کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلو سے کہہ دیا تھا کہ فی الحال وہ فلیٹ کی چابیاں وہ اپنے پاس ہی رکھے' وہ جیسے ہی فارغ ہوا اس سے چابیاں لے جائے گا۔

جانو کے جاتے ہی چاچا کھڑا ہو گیا۔ "چل گلو! اپنے گھر کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ سکون ہی سکون ہوتا ہے اپنے گھر میں۔"

"اونہہ............ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ سکون کسے کہتے ہیں۔" نازاں بڑبڑائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سمجھ میں تو کچھ آ ہی نہیں رہا تھا۔ کبھی جی چاہتا کہ گھر چلا جائے' کبھی چاہتا کہ یہیں رہ کر اچھی زندگی گزارنے کا خواب پورا کرے' ذہن کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ کچھ الجھن سی ہو رہی تھی۔ عجیب سا لگ رہا تھا' بے چینی تھی جس کا سبب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہرحال' نازاں کی ضد پر ان لوگوں نے ناشتہ وہاں کیا' نازاں خوشبو دار صابن سے گھنٹا بھر نہائی' پھر پورے گھر کو حسرت سے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلنے کو تیار ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے ایسا گھر زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھا ہے اور اب وہ کیونکہ زندگی بھر ایسے کسی گھر کو نہیں دیکھ سکے گی اس لئے اسے جی بھر کر دیکھ لینے دیا جائے۔ چاچا تو اس کی باتوں پر ہنستا رہا تھا مگر گلو کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے کئی بار عزم کیا کہ کچھ بھی ہو' وہ ایسا گھر بنا کر رہے گا۔

☆============☆============☆

وہ لوگ گلی میں داخل ہوئے تو محلے کے تمام لوگ انہیں دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ فتح کے قتل کی خبر تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ سب کا خیال یہی تھا کہ گلو جیل میں ہو گا اور چاچا کو تو امام دین رات کے اندھیرے میں چھپ چھپاتے لے گیا تھا۔ اسی لئے محلے کے لوگ پریشان تھے۔ کئی روز تک ان دونوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں' کچھ لوگ پریشان بھی ہوئے مگر کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ان کی تلاش میں نکلتا پھر جہاں معاملہ پولیس کا ہو وہاں سب کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔ سو سرگوشیاں چند ہی دنوں میں دم توڑ گئیں۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے اس بند دروازے کو دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک پان والے مرزا صاحب ہی تھے جو کبھی آتے جاتے' دروازے پر پڑے تالے کو دیکھ کر سرد آہ کھینچتے' گلی میں کوئی مل جاتا تو اسے یہ بتانا نہ بھولتے کہ یہ سب گلو کی حرکتوں کا نتیجہ ہے ورنہ بڈھا چاچا تو ٹھیلے سے ہی عزت کی دو روٹیاں کما کر عزت کی دو روٹیاں کما کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہا تھا۔

آج چاچا' گلو اور ساتھ خالہ حمیدہ کی بھانجی نازاں کو دیکھ کر ہجوم سا جمع ہو گیا۔ پہلے یہ ہجوم ذرا فاصلے پر رہا پھر ان لوگوں کے چہروں پر اطمینان دیکھ کر دھیرے دھیرے قریب آ گیا۔ خیر خیریت پوچھی تو چاچا نے سب سے پہلے انہیں یہی اطلاع دی کہ فتح زندہ ہے۔ زخمی ہوا تھا مگر گلو سمجھا تھا کہ مر گیا' اور اس کے آدمیوں نے بھی یہی بات اڑائی مگر اب

سب ٹھیک ہے۔ لوگوں کو بھی انہیں خوش اور مطمئن دیکھ کر یقین کرنا پڑا۔ چاچا نے قمیض کے نیچے والی جیکٹ سے چابی نکال کر گلو کو دی۔ گلو نے تالا کھولا۔ اس کا دل مٹھی میں آ گیا۔ آنگن میں ہی چارپائی الٹی پڑی تھی۔ الگنی پر پھیلے کپڑوں پر مٹی جمع تھی۔ بالٹی اور ڈونگا بیچ آنگن میں اوندھے پڑے تھے۔ اس کے باوجود اندر قدم رکھتے ہی اسے جیسے قرار آ گیا۔

چند لمحوں بعد چاچا بھی اندر داخل ہوا' اس کے چہرے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔ گلو نے آگے بڑھ کر چارپائی سیدھی کی اور نازاں نے اسے میلے کپڑے سے اچھی طرح جھاڑا تو چاچا فوراً ہی اس پر چت لیٹ گیا۔ "کتنا سکون ہے یہاں!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

نازاں کا منہ بنا ہوا تھا مگر پھر چند ہی لمحوں بعد وہ سب کچھ بھول بھال کر گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ اس نے پائنچے چڑھا کر جھاڑو اٹھائی تو اس کی چاندی ایسی گول پنڈلیاں گلو کی آنکھوں میں بھر گئیں۔ چاچا نے اسی وقت اسے چونکا دیا۔ "جا گھر کے لئے سامان لے آ۔ کچھ بھی نہیں ہے گھر میں۔"

گلو کو یاد آیا کہ جس روز وہ فتح کو زخمی کر کے بھاگا تھا اس روز صبح اسے پورے دس ہزار روپے ملنے کی توقع تھی اور اس نے سوچا تھا کہ وہ گھر کا بہت سا سامان لے کر آئے گا مگر............ وہ سب کچھ اچانک ختم ہو گیا تھا بلکہ اسے تو دوبارہ گھر میں قدم رکھنا ہی نصیب نہ ہو سکا تھا۔ پیسے اس کے پاس موجود تھے۔ وہ سر ہلا کر گھر سے نکل گیا۔

"گلو! گلو!" چاچا اس کے پیچھے ہی دوڑا آ گیا۔ "کسی سے الجھنا نہ بیٹا۔ خیال رکھنا۔" اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

"ہاں چاچا............ بس کر' اب نصیحتوں کی پٹاری نہ کھول دینا پھر سے............ اتنی عقل ہے مجھ میں۔" وہ چڑ گیا۔

"عقل ہوتی تو یہ سب ہوتا؟" چاچا نے پلٹ کر فوراً جواب دیا۔

"چاچا تو............" وہ بھنا کر بولا۔

"اچھا بس جا۔ تیرے ہی بھلے کو کہہ رہا ہوں۔ اور سن' مرزا جی ملیں تو خیر خیریت بتا دیجیو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو گلی میں نکلا تو اس کے چوڑے شانے پھیلے ہوئے تھے۔ گردن اکڑی ہوئی تھی' وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ راستے میں کئی لوگ ملے' سب نے ہی پہلے اسے حیرت سے دیکھا' پھر ان کے چہرے پر خوشی پھیلی اور آخر لپک کر اس کے سینے سے لگ گئے۔ سبھی نے خیریت دریافت کرتے ہوئے چاچا کا حال پہلے پوچھا تھا۔ کئی ایک نے دبے دبے اسے ملامت بھی کی تھی کہ بے وجہ عزت کی روٹی چھوڑ کر استاد فتح جیسے بدمعاش کے چکر میں پڑا' نہ اس کی چاکری کی ہوتی نہ یوں گھر سے بے گھر ہوا ہوتا۔ گلو سب سے ملتا ملاتا پان کے کھوکھے کے قریب پہنچا تو وہ جگہ دیکھ کر اس کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا جہاں چاچا کا ٹھیلا کھڑا رہتا تھا' یہ جگہ پان والے مرزا جی کی تھی جو اب خالی پڑی تھی۔

مرزا جی کی نگاہ جونہی گلو پر پڑی' پہلے تو انہوں نے سرسری سی نگاہ ڈال کر ہٹا لی' پھر دوسرے ہی لمحے وہ اچھلے۔ سر اٹھا کر اسے دیکھا' اتنی دیر میں گلو ان کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مرزا جی نے آنکھیں بند کیں' پھر کھولیں' پلکیں جھپکیں۔

گلو ہنس پڑا۔ "مرزا جی' چشمہ بھی صاف کر لیں' شاید اس کے دھندلے شیشوں سے میں دکھائی نہیں دے رہا۔"

"گلو! یہ.......... تم ہو؟" انہوں نے چاروں طرف نگاہ ڈال کر یوں سرگوشی کی جیسے یہ بات کسی اور نے سن لی تو گلو ہی نہیں وہ خود بھی پکڑے جائیں گے۔

"جی مرزا جی میں.......... میں گلو ہوں.......... ٹھیلے والے چاچا کا بیٹا۔" گلو نے زور سے کہا۔

"آہستہ.........." انہوں نے دانت کچکچا کر تیز سرگوشی کی۔

"کیوں مرزا جی؟" اس بار گلو نے بھی سر آگے کر کے سرگوشی کی۔ "کیا کوئی چکر ہے؟"

"اماں باؤلے ہوئے ہو! جو چکر تمہارے ساتھ تھا کم خوفناک تھا کیا؟" انہوں نے ذرا جھنجلا کر زور سے کہا پھر سرگوشی کی۔ "جیل سے کب رہا ہوئے اور وہ چاچا کہاں ہے تمہارا؟ اس بے چارے کی تو تم نے زندگی تباہ کر دی۔"

گلو زور سے ہنس پڑا اور مرزا جی منہ کھولے اسے تکتے گئے۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" وہ پھر جھنجلا کر بولے۔

"ہنسنے کی بات تو ہے مرزا جی! یہ آپ سے کس نے کہا کہ میں جیل چلا گیا؟ میں نے کون سا جرم کیا تھا؟"

"ہیں..........! اور وہ فتح کا قتل..........؟"

تب گلو نے انہیں ساری کہانی سنا دی' یہ سن کر وہ ہونق رہ گئے کہ استاد فتح مرا نہیں تھا اور یہ کہ اب وہ خود جیل میں ہے۔ بہرحال کہانی سن کر ان کی جان میں جان آئی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی اسے وہ جگہ آفر کر دی جہاں چاچا ٹھیلا لگاتا تھا مگر گلو نے سختی سے انکار کر دیا۔ انہیں بتا دیا کہ اب وہ خود پرچون کی دکان سنبھالے گا اور چاچا صرف اور صرف آرام کرے گا۔ پرچون کی دکان کی چابی اور دیکھ بھال انہی کے ذمے تھی۔ انہوں نے گلو کو بتایا کہ دکان اس کی امانت ہے۔ وہ جب چاہے ان سے چابی لے کر دکان کھول لے۔ چلتے چلتے انہوں نے گلو سے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ دکان بند کر کے چاچا سے ملنے گھر آئیں گے۔ وہاں سے گلو سیدھا بازار گیا۔ گھر کی ضرورت کی ہر چیز خریدی اور رکشہ میں رکھ کر گھر پہنچ گیا۔

"یہ سب کہاں سے آیا؟" چاچا اپنی پچھلی جون میں واپس آ رہا تھا۔ اس نے غراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"پیسے تھے میرے پاس۔" اس نے بھی اپنے پرانے انداز کو اختیار کر لیا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر ذرا نرمی سے جواب دیا تو چاچا کے سوالات بڑھتے ہی چلے جائیں گے اور نوبت چیخ پکار تک پہنچ جائے گی۔

"اب یہ مت پوچھنا کہ کہاں سے آئے!" اس نے اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر کہا۔ "یہ مجھے امام دین نے دیئے تھے اور میں اسے قرض سمجھتا ہوں۔"

"چاچا ہر بات پر کیوں الجھتے ہو تم اس سے۔ اتنا بڑا مرد ہے' اچھا برا جانتا ہے' جو کچھ نہیں جانتا وہ خود ٹھوکر کھا کر جان لے گا۔ تم کیوں بے وجہ ماحول خراب کرتے ہو؟" زاں نے بڑی سمجھداری کی بات کی تھی۔ چاچا نے آنکھیں پٹ پٹا کر اسے دیکھا پھر پلٹ لیا۔

گلو کو یقین ہو گیا کہ چاچا نازاں کے قابو میں ہے۔ اسے نازاں اپنی ضرورت بنتی سوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی بہت مدد کر سکتی تھی مگر اس خیال ہی سے اس کا جی ہولا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتا تھا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ بغیر شادی کیے وہ پورے گھر پر چھا گئی تھی۔ اس پر یوں حق جماتی جیسے وہ زر خرید غلام ہو یا واقعی اس کا شوہر ہو۔ وہ جانتا تھا کہ ذرا سکون ہو جانے کے بعد چاچا ایک ہی راگ الاپنے لگے گا کہ اب اسے شادی کر لینا چاہیے' اس نے سوچ لیا تھا کہ وقت آنے سے پہلے وہ کوئی بہانہ گھڑ لے گا۔ فی الحال اسے اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ گھر کی ضرورت کی تمام چیزیں دیکھ کر چاچا کے چہرے پر عجیب سی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ گلو نے زندگی میں پہلی بار گھر میں دلچسپی لی تھی یا پہلی بار چاچا کے بتائے بغیر وہ ہر چیز لے آیا تھا۔ رات تک گھر سمٹ چکا تھا۔ سامان رکھتے ہوئے نازاں نے اسے ہزار دوسری چیزیں بتا دیں جن کی ابھی مزید ضرورت تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مسالوں کے ڈبوں سے لے کر پتیلیوں تک ہر چیز کی ضرورت ہے۔

"اچھا بس.......... زیادہ نہ پھیل۔" گلو نے اسے جھڑک دیا۔ "جو بھی ہے اسی سے کام چلا۔"

"اور وہ.......... اچھا گھر.......... ویسا ہی۔" نازاں نے آنکھیں چمکائیں جیسے گلو کا کوئی وعدہ اسے یاد دلا رہی ہو۔

"کھڑے کھڑے تو سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب نوکری کے لئے نکلوں گا۔ دیکھو جانو کیا کہتا ہے؟ اچھی نوکری تو وہی دلا سکتا ہے۔" گلو نے چارپائی کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

نازاں کھانا تیار کرتی رہی اور وہ لیٹا آگے کے بارے میں سوچتا رہا۔ چاچا جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ گلو نے ایک بات تو طے کر لی تھی کہ وہ جانو سے نوکری کے لئے کہے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس سلسلے میں وہی اس کی مدد کر سکتا ہے ورنہ اسے تو اچھی نوکری ملنے سے رہی۔ پھر اسے امام دین کا خیال آ گیا۔ وہ سمجھ رہا ہو گا کہ گلو حیدر آباد میں ہے۔ وہ یہ سوچ کر مسکرا اٹھا کہ جب وہ امام دین کے پاس ہنستا مسکراتا پہنچے گا تو وہ کیسا ہونق ہو جائے گا۔ کہاں تو وہ سہما ہوا خوفزدہ گلو اسے یاد ہو گا جسے اپنے قاتل ہونے کا یقین تھا اور جو کئی راتیں اس کے پیچھے چھپا رہا تھا اور کہاں اس کے سامنے ایک دوسرا گلو کھڑا ہو گا۔

"چلو اٹھو.......... روٹی کھا لو۔" نازاں نے ان دونوں کو ہی چونکا دیا تھا۔ وہ دونوں ہی اٹھ بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

"ارے گلو! او گلو!" برابر کے گھر والے رحمان چاچا کی آواز دروازے کے پاس

سے آئی تھی۔

"آجاؤ رحمان میاں!" چاچا نے وہیں سے آواز لگائی اور جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ رحمان چاچا سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ ٹیکسی چلاتے تھے اور رات گئے لوٹتے تھے۔

"کیسے ہو بابا جی!" رحمان چاچا نے اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا اور چاچا کو سینے سے لگا لیا۔ "میں گھر آیا تو خوشخبری سنی۔ ورنہ دور سے تمہارے گھر میں روشنی دیکھ کر میں ٹھٹکا تو تھا مگر یہ تو گمان بھی نہیں تھا کہ تمہی لوگ لوٹ آئے ہوں گے۔ بھئی اللہ نے بڑا کرم کیا۔ گلو بیٹوا! اب تو عقل آ گئی ہو گی۔"

گلو بھنا گیا مگر جو کچھ ہوا تھا اس میں سارا دوش اسی کا تھا سو اسے چپ چاپ سننا تو تھا۔

"بھئی ابھی کچھ روز پہلے ایک عورت میری ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے اسی محلے میں چلنے کو کہا۔ میں لے آیا۔ اس نے ٹیکسی تمہارے گھر کے آگے رکوائی میں تو ذرا حیران ہوا۔ پوچھا کہ آپ کو یہاں کس سے ملنا ہے.......... تو بابا اس نے تمہارا نام لیا۔ دروازے پر تالا دیکھ کر وہ سخت پریشان تھی۔ مجھے مناسب نہیں لگا کہ اسے ساری بات بتاتا۔ میں نے کہہ دیا کہ یہ لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کچھ روز میں شاید آ جائیں۔"

"کون تھی وہ؟" گلو نے سر اٹھا کر سرسری انداز میں رحمان چاچا سے پوچھا۔ عین اسی لمحے اس کی نگاہ چاچا کے چہرے پر پڑی۔ ایک طوفان سا اٹھا اس کے اندر اور وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے چاچا ابھی گر کر بے ہوش ہو جائے گا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار تھے۔ آنکھیں پھیل کر جیسے سارے چہرے پر چھا گئی تھیں۔

"یہ تو نہیں بتایا مگر پھر آنے کو کہہ گئی۔" رحمان چاچا کی آواز نے گلو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "میں نے اسے بتایا کہ میں برابر والے گھر میں رہتا ہوں۔ وہ اگر کچھ دیر ٹھہرے تو میں گھر سے ہو لوں۔ اس نے خود بھی پانی پینے کو کہا تو میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ کافی دیر بیٹھی رہی۔ عصمت سے باتیں کرتی رہی۔ گلو کے بارے میں بھی پوچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی۔"

"نام نہیں پوچھا آپ نے.........؟" بے اختیار گلو کے منہ سے نکلا۔

"نہیں.......... یہ پوچھا تھا کہ آپ کا کیا رشتہ ہے' کہاں سے آئی ہیں کچھ بتا دیں تاکہ میں تم لوگوں کو بتا سکوں مگر وہ ٹال گئیں۔"

"ہاں.......... آں.......... وہ رشتے دار ہے ہماری۔" ایک دم چاچا جیسے اپنے حواسوں میں آگیا۔ "گاؤں سے آئی ہو گی۔"

"گاؤں سے..........؟" رحمان چاچا نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔ "ارے بھئی وہ تو امریکا سے آئی ہوئی لگ رہی تھی۔ جبھی تو میں حیران ہوا تھا اور یوں بھی تمہاری کوئی ایسی رشتے داری تو آج تک نہیں دیکھی۔ لے دے کے یہی گلو تھا وہی ہے۔" پھر ان کی نگاہ نازاں پر پڑی۔

"ارے نازاں!"

"جی چاچا!" نازاں نے دھیرے سے کہا۔

وہ جانے نازاں سے کیا باتیں کرنے لگے مگر گلو تو جیسے کہیں اور ہی پہنچ گیا تھا۔ اسے اپنے اردگرد کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے دماغ میں شور سا بھر گیا تھا۔ کوئی لڑ رہا ہو' جیسے کوئی رو رہا ہو۔ ایک طوفان سا تھا جو اس کے وجود کو بہائے لیا جا رہا تھا۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کہ رحمان چاچا کب گئے اور کب نازاں نے بتی بجھائی۔ وہ یونہی کھری چارپائی پر چت لیٹا رہا۔

چاند کی روشنی تیز ہو کر پورے آنگن میں بھر گئی تب اسے ہوش آیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی چبوترے پر جا کر سو جائے۔ بے چینی کی لہر سی تھی جس کی وجہ سے وہ اٹھ بیٹھا۔

"گلو! تو سویا نہیں؟" چاچا کی آواز کہیں کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"چاچا وہ.......... وہ کون تھی؟"

"یہ کتنی خوشی کی بات ہے گلو کہ.......... کہ وہ ہم سے واقف ہے۔ وہ ہمارے قریب ہی ہو گی.......... وہ یہاں آئی تھی مگر.......... مگر کیوں گلو! کیوں آئی تھی وہ؟" چاچا بڑبڑا رہا تھا۔

"چاچا.........." گلو نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہی لمحے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چاچا کا ہاتھ جل رہا تھا۔ اسے شدید بخار ہو گیا تھا۔

گلو نے گھبرا کر نازاں کو آواز دی جو شاید غنودگی میں تھی۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ چاچا کو شدید بخار ہے تو وہ اس کی خدمت میں لگ گئی۔ چاچا کو بالکل ہوش نہیں تھا اور گلو حیرت زدہ تھا کہ اتنی ذرا سی دیر میں چاچا اتنی شدت سے کیوں پھنکنے لگا۔ وہ جو بھی تھی ایسا کیا مسئلہ تھا کہ چاچا یوں بے حال ہو گیا۔

"یہ وہی ہو گی گلو! جس کے لئے چاچا نے وہ کپڑا خریدا ہو گا۔ جسے وہ حیدر آباد میں چوڑیاں پہنانے گیا تھا۔ یہ اس عورت سے بہت پیار کرتا ہو گا گلو! پر سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اسے ملی کیوں نہیں!" نازاں نے ٹھنڈے پانی کی پٹی چاچا کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھ اگر بخار کم نہیں ہوا تو میں دوا لے آتا ہوں۔" گلو نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"گیارہ بارہ تو بج رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر مل جائے گا؟"

"کوشش کرتا ہوں۔ اگر کلینک پر نہ ملا تو ڈاکٹر وزیر علی کے گھر چلا جاؤں گا۔" گلو یہ کہتا ہوا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ گولیاں لئے واپس آگیا۔ کلینک بند ہو چکا تھا مگر اگلی گلی والے ڈاکٹر وزیر علی مل گئے تھے۔ انہوں نے دوا دے کر گلو کو ہدایت کی تھی کہ سویرے چاچا کو کلینک میں لے آئے۔ گلو نے چاچا کو دوا دے دی۔ اچھی طرح کمبل میں لپیٹ دیا۔ کچھ دیر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے رہنے کے بعد چاچا کو نیند آگئی۔ بخار بھی کافی کم ہو گیا تھا۔ گلو چارپائی پر جا لیٹا۔ نازاں البتہ جاگ رہی تھی اور چاچا کے پاؤں دبا رہی تھی۔

"سو جا تو بھی۔"

"سونے کو عمر پڑی ہے۔" اس نے طنز کیا۔ "ایک رات جاگ کر گزار دیں گے تو کون سی کمی آ جائے گی۔"

"تیرا جی چاہ رہا ہے تو جاگ.......... یہ سو گیا' بخار بھی اتر گیا' اب کیا ہے؟"

نازاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ گلو کروٹ لے کر لیٹا اور کچھ ہی دیر میں سو گیا۔

☆==========☆==========☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سویرے اس کی آنکھ کھلی۔ نازاں بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ جانے کب تک جاگی تھی۔ چاچا بھی سویا ہوا تھا۔ گلو منہ ہاتھ دھو کر چائے بنانے لگا۔ برتنوں کی آواز سے چاچا کی آنکھ کھل گئی۔ گلو چائے بنا کر چاچا کے قریب لے آیا تو اس کے چہرے پر چھائی وحشت نے اسے پریشان کر دیا۔

"چاچا.......... کیا وہ وہی تھی جس کے لئے تو نے شادی نہیں کی؟" گلو نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

چاچا نے ایسے تڑپ کر اسے دیکھا' جیسے ابھی بلک پڑے گا مگر منہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ گلو پر گہرا سناٹا چھا گیا۔ اسے دکھ ہوا کہ چاچا اس خوشی سے بھی اس کی وجہ سے محروم رہ گیا۔ اگر وہ ان چکروں میں نہ پڑا ہوتا تو شاید وہ چاچا کو مل جاتی۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ جانتی ہے کہ تو کہاں ہے' کہاں رہتا ہے پھر.......... اب سے پہلے کیوں نہ آئی؟" گلو نے پھر دھیرے سے پوچھا۔

اس بار بھی چاچا نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا' اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر گلو کو ان میں سمندر ساٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے بتاتا کیوں نہیں چاچا.......... میں اسے لے آؤں گا۔ تو مجھے اس کا حلیہ بتا' تو بھی جانتا ہوگا ناں کہ وہ کہاں ہے!"

"میں.......... میں جانتا تو.......... چھوڑ دے گلو۔ ان باتوں کو چھوڑ دے۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے چہرے پر لمبے سفر کی تکان تھی' بدن نڈھال تھا۔

گلو جانتا تھا کہ وہ زندگی کے کسی پل نہیں کھلا تو بھلا اب کیوں کھلے گا۔ چائے پی کر وہ باہر نکل آیا۔ رحمان چاچا ٹیکسی صاف کر رہے تھے۔ اسے گھر سے نکلتا دیکھ کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گلو ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"بٹوا اب تسلی سے رہنا۔ جو کچھ ہو چکا وہ برا ہوا۔ ایسا کام دھندہ پکڑ لو جس میں عزت سے روٹی مل سکے۔" انہوں نے ٹیکسی کی چھت صاف کرتے ہوئے کہا۔

معاً گلو کے دماغ میں کوندا سا لپکا۔ "چاچا! اگر مجھے بھی ٹیکسی مل جائے تو.........."

رحمان چاچا نے گلو کو چونک کر دیکھا۔ "چلانا آتی ہے؟"

"جی!" پھر گلو نے انہیں بتایا کہ وہ ڈرائیونگ سیکھ چکا ہے مگر پریکٹس نہ ہونے کی

وجہ سے گھبراتا ہے۔ رحمان چاچا نے وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے مالک سے معلوم کرے گا۔ رحمان چاچا ایک پٹھان ٹرانسپورٹر کی ٹیکسی چلاتے تھے۔ انہوں نے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ جلد ہی اسے ٹیکسی چلانے کی پریکٹس کرا دیں گے۔

"مگر بٹوا' خود کو قابو میں رکھنا پڑے گا۔ یہ دھندا ہے خطرناک' دس طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ حلال کی روزی دماغ میں ہو تبھی ایمان جما رہتا ہے ورنہ ڈگمگانا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔"

"میں جانتا ہوں چاچا' اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔" جانے گلو کے دماغ میں کیوں یہ بات آ گئی تھی ورنہ تو وہ جانو کا منتظر تھا۔ "چاچا!" گلو نے دھیرے سے اسے پکارا۔

"ہوں..........!" انہوں نے کپڑا پاس رکھی ہوئی بالٹی میں سے دھوتے ہوئے سر اٹھایا۔

"وہ جو آئی تھی.......... وہی' ہمارے گھر جو آئی تھی وہ کون تھی.......... میرا مطلب ہے کہ اس نے بتایا نہیں کہ وہ کون ہے اور.......... کیسی تھی وہ؟"

"صاف بات ہے گلو مجھے تو تیرے چاچا کی بات پر یقین نہیں آیا کہ وہ تیرے چاچا کی رشتہ دار ہو سکتی ہے۔ بڑے اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ پڑھی لکھی بھی لگ رہی تھی۔ پھر اس کا حلیہ.......... اچھی خاصی فیشن ایبل تھی۔" وہ دروازے دھوتے ہوئے بولے۔

"حلیہ تو بتاؤ.......... ایک عورت پہلے بھی آئی تھی.......... شاید وہی ہو۔" گلو نے اسے بہکایا۔

"بڑی خوبصورت تھی.......... گوری چٹی.......... گول چہرہ.......... بڑی بڑی ہیل کی جوتی.......... مگر.......... کچھ عجیب طرح چل رہی تھی۔ میں نے اتنا غور نہیں کیا تھا مگر جب وہ یہاں تک آئی پھر میں نے اسے واپس پی ای سی ایچ ایس میں اتارا تو میں نے غور کیا تھا۔"

"کیا..........؟" گلو کا دل دھڑک اٹھا۔ "کیسے چل رہی تھی؟"

"کچھ.......... ایک طرف کو جھک کر.......... جیسے ٹانگ میں یا پیر میں فرق ہو۔ ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ان سب کی توقع کے باوجود گلو کے اندر بگولے سے اٹھنے لگے۔ اسے یقین تھا کہ وہ وہی ہوگی پھر بھی جانے کیوں اضطراب کی بے شمار لہریں اس کے وجود میں اٹھ اٹھ کر بل ڈال گئیں۔ بہروہ رکا نہیں.......... بڑی تیزی سے گھر میں داخل ہو گیا۔ "وہ وہی تھی۔" چاچا کے پاس جاکر وہ پھٹ پڑا۔

"کک.......... کیا.......... کون وہی تھی؟" چاچا لمحہ بھر کے لئے بوکھلا گیا۔

"وہ جو آئی تھی۔" گلو نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔

"ابے کون تھی وہ؟" چاچا نے خود پر کمال قابو پالیا تھا۔ "مجھے کیا پتا.......... تو بتا دے کون تھی؟"

"وہی لنگڑی۔" اور گویا چاچا کے کان کے قریب کوئی بم پھٹ گیا ہو۔ آنکھیں دہشت سے پھٹ گئیں اور رنگ سفید ہو گیا۔

"تجھے.......... تجھے کیسے پتہ؟" اس کے منہ سے آواز جھنجھناہٹ کی طرح نکلی تھی۔

اور گلو اس کی چارپائی پر ٹک گیا۔ "چاچا! آج تجھے بتانا پڑے گا کہ وہ کون ہے۔ تو اس کا ذکر سن کر کیوں خوفزدہ ہو جاتا ہے.......... وہ کہاں ہے، کہاں رہتی ہے، یہ سب کچھ بتانا پڑے گا چاچا۔" گلو دو ٹوک انداز میں بات کر رہا تھا۔

"باؤلا ہو گیا ہے تو؟ میں کیا جانوں کون ہے! آئے گی، دیکھوں گا تو پہچانوں گا۔" چاچا نے حسب سابق بات کو ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

"تو نے بتایا تھا نا کہ وہ.......... وہ جہاں آرا تھی، میری ماں.......... لنگڑی۔"

"گلو! میں تجھے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہر لنگڑی عورت تیری ماں نہیں ہو سکتی۔ جانے کہاں ہو گی وہ.......... وہ تو غریب سی عورت تھی، وہ بھلا یوں ہوائی جہازوں میں، ٹیکسیوں میں پھرتی پھرے گی؟"

"ہوں.......... تو تجھے یاد ہے کہ میں نے بتایا تھا وہ ہوائی جہاز سے جا رہی تھی۔ میں نے اسے ایئرپورٹ پر چھوڑا تھا۔ تجھے یاد ہے ناں! کیوں.......... کیوں یاد ہے؟ بقول تیرے وہ میری ماں تو نہیں ہو سکتی تھی پھر.......... تجھے کیوں یاد رہ گئی وہ بات؟" گلو نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

"گلو اگر میں جانتا ہوتا بیٹا تو.......... ایک بار جاکر اس سے یہ ضرور پوچھتا کہ وہ

ساری دنیا کو چھوڑ گئی مگر میں نے شکوہ نہیں کیا۔ پر وہ تجھے.......... تجھے کیوں اور کس کے سہارے چھوڑ گئی۔" چاچا ہار گیا۔ اس کا اکڑا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ وہ ایک طرف کو جھکتا جا رہا تھا۔ اسی لمحے دور کھڑی نازاں لپک کر قریب آگئی۔

"گلو! کیسا انسان ہے تو؟.......... چاچا کی حالت تو دیکھ۔ ہٹ یہاں سے، تجھے اپنی ماں کو تلاش کرنا ہے تو جا.......... ڈھونڈ اسے.......... اس کی جان کیوں کھاتا ہے؟"

اور پھر گلو کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا، ایک دھماکے کی سی آواز تھی جس کے ساتھ ہی نازاں کی چیخ بھی گونج اٹھی تھی۔ جانے کب اور کیسے گلو کا ہاتھ اٹھا تھا اور نازاں پوری کی پوری گھوم گئی تھی۔

"گلو!" چاچا بھی چیخ اٹھا۔ "نکل جا یہاں سے.......... نکل جا.......... حرامزادے.......... الو کے پٹھے.......... عورت پر ہاتھ اٹھاتا ہے عورت پر.......... نکل۔" وہ غصے میں بے قابو ہو گیا تھا۔

گلو خود بھی حیران رہ گیا تھا کہ یہ کیا ہوا مگر جو کچھ ہوا تھا وہ ایسے اچانک اور ایک دم ہو گیا تھا کہ وہ بھی سوچنے سمجھنے سے قاصر تھا۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ فوراً نکل جائے اور اس نے یہی کیا.......... وہ تیزی سے باہر آگیا تھا۔ رحمان چاچا ٹیکسی موڑ رہے تھے۔ اس نے بے اختیار انہیں ہاتھ دیا۔ وہ رک گئے پھر گلو نے انہیں ایسی پٹی پڑھائی کہ وہ اسے اسی وقت ساتھ لے جانے کو تیار ہو گئے۔

☆============☆============☆

پٹھان ٹرانسپورٹر پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے گلو کو کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ چند باتیں کیں پھر رحمان چاچا کی گارنٹی دینے پر وہ مطمئن ہو گیا۔ رحمان چاچا سے کہہ دیا کہ اسے کچھ روز پریکٹس کے بعد لے آئیں۔ لائسنس بنوا دیں گے۔ گلو نے چند ہی روز میں گاڑی چلانے میں مہارت حاصل کر لی۔ یہ چند راتیں اس نے چبوترے پر سو کر گزاریں۔ چاچا تو آیا نہیں، مگر نازاں کئی بار منانے آئی، پہلی رات ہی اس نے کہہ دیا کہ اب وہ گھر میں نہیں آئے گا۔ اس چبوترے پر اسے گھر کا سکون ملا ہے۔ وہ رحمان چاچا کے ساتھ نکلتا اور رات کو انہی کے گھر کے قریب اترتا تھا۔ پھر وہاں سے پیدل چبوترے پر پہنچ جاتا تھا۔ پہلی رات جب وہ چبوترے کی طرف جا رہا تھا تو دور سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہاں ایک سفید رنگ کی کار دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ چند لمحے رک کر اس نے دیکھنے کی کوشش کی کہ کار میں کون ہے مگر اندھیرے کی وجہ سے دیکھ نہیں پایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی اترے گا مگر کوئی بھی گاڑی سے نہیں اترا۔ پھر خیال آیا کہ شاید سامنے کی گلی میں کوئی گیا ہو جو اپنی کار وہاں کھڑی کر گیا ہو۔ مگر کافی دیر انتظار کے بعد بھی گلی سے کوئی نہ نکلا تو گلو الجھ گیا۔ اسے ساری فکر اپنی تھی۔ نیند سے بوجھل اور شل بدن لئے وہ کھڑا تھا۔ سونا چاہتا تھا مگر کار کی موجودگی میں ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جانو کے اندیشے بھی قریب ہی سرسراتے محسوس ہو رہے تھے کہ کہیں یہ لوگ ایسے ویسے نہ ہوں۔ وہ لوگ نہ ہوں جو احسان اللہ کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔

اچانک کار کی لائٹس آن ہوئیں' وہ اسٹارٹ ہوئی اور رینگتی ہوئی اسی جانب مڑ گئی جدھر گلو کھڑا تھا۔ وہ لپک کر دیوار سے جا لگا۔ گاڑی زن سے اس کے سامنے سے گزری تو اندھیرے کے باوجود اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہستی کو عورت کی حیثیت سے پہچان لیا۔ اس کے بال اڑ رہے تھے۔ وہ ہونقوں کی طرح کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایک دم اچھل کر درمیان میں آ گیا مگر گاڑی کی بیک لائٹس دور ہوتی جا رہی تھیں۔

"وہ......... وہ کون تھی؟ وہاں کیا کر رہی تھی؟ کیا میں......... کیا یہی میری ماں تھی؟" سوال سانپ کی پھنکار بن کر اس کے دماغ کو گرم کر رہے تھے۔

"یہ چبوترا جیسے مجھے کھینچے لئے چلا آتا ہے' اسی طرح اسے بھی تو کھینچتا ہو گا۔ کیا اسے چبوترے پر میری تلاش ہے؟ کیا وہ واقعی میری ماں ہے؟ اگر میری ماں ہے تو کیا وہ نہیں جانتی کہ میں چاچا کے پاس ہوں؟ جانتی ہو گی تبھی تو آئی تھی......... اتنے برس بعد کیوں آئی تھی؟ اسے مجھ سے محبت ہوتی تو وہ مجھے چھوڑ کر ہی کیوں جاتی؟ وہ مجھے کیوں چھوڑ گئی۔ یوں بھی بھلا کوئی ماں اپنے بچے کو چھوڑتی ہے؟"

گلو خود سے باتیں کر رہا تھا' سنسان اندھیری گلی میں گاڑی کے گزر جانے کے بعد بھی اسے یوں لگتا رہا تھا جیسے گاڑی اب بھی گزر رہی ہے' گزرتی ہی چلی جا رہی ہے' اس کی ہیڈ لائٹس' اس کی سرخ بیک لائٹس......... اس کے انجن آواز سے پیدا ہونے والا ارتعاش' جیسے ابھی تک گلی میں موجود تھا۔ سب کچھ گلی میں موجود تھا سوائے گلو کے' اور گلو پتہ نہیں کہاں تھا؟

اسے ہوش آیا تو وہ چبوترے پر بیٹھا تھا۔ سامنے دور سڑک کے کنارے پر لگے پول کی روشنی وہاں آتے آتے مدھم ہو گئی تھی مگر پھر بھی گاڑی کے ٹائرز کے نشان گلو کو صاف نظر آ رہے تھے جو عین اس کے سامنے تھے......... اور پورے چبوترے کا یہی حصہ تھا جو گلو کو ماں کی سی آغوش لگتا تھا......... "وہ تیری ماں تھی گلو!"

کسی نے اندر ہی اندر سرگوشی کی اور گلو پہلی بار بپھرنے کی بجائے وہاں لڑھک کے بے حال ہو گیا۔ وہ بڑے دنوں بعد رویا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر......... بہت دیر تک روتا رہا تھا مگر اسے نیند بھی اچھی آئی تھی۔ سورج کی پہلی کرن اس کے اندر قوت بن کر دوڑی تھی اور وہ جو چارپائی پر گھٹنوں پڑا کسمسایا کرتا تھا ایک دم ہی اٹھ بیٹھا تھا۔

وہیں سے رحمان چاچا کے پاس چلا گیا تھا۔ رحمان چاچا بھی سویرے سویرے نکلتا تھا۔ چاچی بینائی کی کمزوری کی وجہ سے معذور ہو گئی تھی اور اس کی بہو بہت حرافہ تھی۔ چند ہی روز بعد اس نے اپنا کھانا پکانا الگ کر کے رحمان چاچا کو بے بس کر دیا تھا۔ اب رحمان چاچا گھر سے نکل کر ناشتہ نکڑ والے ہوٹل پر کرتا تھا۔ گلو نے بھی اس کے ساتھ ناشتہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ نازاں کو پیسے دے چکا تھا۔ اس سے کہہ دیا تھا کہ جس چیز کی ضرورت پڑے' لے لے۔ نازاں نے کئی بار سویرے سویرے دروازے پر آ کر اس سے بات کی تھی۔ جس وقت رحمان چاچا کی ٹیکسی صاف کر رہا ہوتا تھا۔ چاچا بھی واقف تھا کہ وہ رحمان چاچا کے ساتھ ٹیکسی چلا رہا ہے مگر اس نے کبھی نکل کر اسے منانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ شاید اس کا غرور توڑنے کے چکر میں تھا یا ساری عمر کے لئے اس کو سدھارنے کی قسم کھالی تھی اس نے' نازاں تو اگلے روز ہی معاف کر چکی تھی۔ اس نے کہا بھی تھا کہ گلو کو بلا لے' وہ جان چکی تھی کہ ماں باپ کے نام پر ہی گلو بدک جاتا ہے اور یہ بات اسے خود چاچا نے بتائی تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ عورت پر ہاتھ اٹھانے والا مرد نہیں ہوتا۔ گلو جب تک اس کے آگے ناک نہیں رگڑے گا' خدا کی قسم نہیں کھائے گا اس وعدے کے ساتھ کہ وہ ساری زندگی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا' وہ اسے معاف نہیں کر سکتا۔ گلو کو نازاں نے پہلے ہی دن یہ بات بتا دی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے گلو ایسا کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ بہت بیزار تھا۔ اسے زندگی اب سے پہلے ایسی اجیرن نہیں لگتی تھی۔ اس وقت بھی نہیں جب گلو صرف چاچا کی گالیاں سنا کرتا تھا اور استاد فتح کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس کام کرنے کے خواب دیکھنے کے علاوہ اس کے دوسرے ملازمین کی جھڑکیاں بھی برداشت کیا کرتا تھا۔ اس کی وجہ وہ خواب تھے جو اس نے ہوش میں آنے کے بعد دیکھے تھے۔ بچپن تو جیسے ہوش و خرد سے بیگانہ ہی گزرا تھا' اس نے اگر خواب دیکھے بھی ہوں گے تو محبتوں اور شفقتوں کے خواب ہوں گے۔ ان کی تعبیر نہ ملی تھی نہ ملنے کی امید تھی مگر بہت سا پیسہ حاصل کر کے اچھی زندگی کے خوابوں کی تعبیر پا لینا تو اس کے اپنے ہاتھ میں تھا' اسی کوشش میں وہ استاد فتح کو اپنا آئیڈیل بنا کر اس تک پہنچا تھا مگر وہی سر منڈاتے ہی اولے پڑنے والی مثال اس پر صادق آئی تھی۔

اب اس کے سامنے کوئی لمبا چوڑا پلان تو نہیں تھا' مگر اس کی خواہش ابھی زندہ تھی' اتنا وہ جان چکا تھا کہ دن رات محنت بھی اسے اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں دے سکتی' خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں خودغرضی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ جہاں ہر شخص دوسرے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا چاہتا تھا' جہاں انسان کو انسان سمجھنے کا تصور دھیرے دھیرے مٹتا چلا جا رہا تھا۔ "اسے فوراً ہی آگے بڑھنا ہوگا۔" یہ فیصلہ اس نے چبوترے پر گزرنے والی تیسری رات کے پہلے پہر کیا تھا۔ ٹیکسی چلانے کا فیصلہ تو اچانک ہی ہوا تھا۔ اب سوچنے کے لئے اس کے پاس بہت سا وقت تھا۔ ٹیکسی چلاتے دیکھ کر چاچا کے علاوہ اور لوگوں کے بھی منہ بند ہو گئے تھے۔ اس طرح گلو کو کم از کم لوگوں کی باتیں سننے سے نجات مل گئی تھی۔

پھر رحمان چاچا کی سنائی ہوئی اس لنگڑی عورت والی کہانی کا سرا پکڑنا بھی اسے آسان لگ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی روز اسی طرح کبھی اس سے بھی ٹکرائے گی۔ اور اس بار وہ کسی قسم کا تکلف برتے بغیر اسے پکڑ کر چاچا کے سامنے کھڑا کرے گا۔ ساری بات صاف کر کے چھوڑے گا' اس کا خیال تھا کہ اب اسے ماں نام کی کسی ہستی کی ضرورت نہیں ہے مگر وہ اس سے اتنا ضرور پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کون سی وجہ تھی جس نے اسے یوں بے یارومددگار چھوڑ جانے پر مجبور کیا تھا۔ اسے پورا احساس تھا کہ اس کے اندر عورت سے نفرت اس بری طرح جڑ پکڑ چکی ہے کہ اس کے بس میں نہیں رہا لیکن عورت بہرحال زندگی کی بہت بڑی ضرورت ہے' اس میں کشش ہے' انسان لامحالہ اس کی خواہش رکھتا ہے مگر یوں' ایسی کڑی نفرت کے ساتھ وہ کسی عورت کے

بارے میں سوچنا اور پھر نفرت اور محبت کے درمیان معلق رہنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے تو یوں لگتا تھا کہ جیسے اس کی زندگی کے صرف اور صرف دو ہی مقصد ہیں' ایک ماں کو تلاش کر کے اس سے اس کی حرکت کی وجہ دریافت کرنا اور دوسرا بہت دولت حاصل کر کے اچھی بلکہ بہترین زندگی گزارنا۔ اور اب گویا اس نے شروعات کر دی تھیں۔

چوتھے ہی روز رحمان چاچا نے اسے لائسنس بنوا دیا۔ خان آفریدی نے اسے ٹیکسی بھی دے دی تھی اور تنبیہہ بھی کر دی تھی کہ وہ پوری احتیاط سے ٹیکسی چلائے۔ اس روز اس نے توقع سے زیادہ کمایا' اب بھی اس نے وقت ملتے ہی کسی خالی میدان میں جا کر پریکٹس کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مہارت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ بہت جلد اس کا اعتماد بحال ہو گیا۔ گویا ایک چھوٹا سا خواب تھا جو اس نے صرف کچھ دنوں میں پورا کر لیا تھا۔ گھر سے نکلے اسے آٹھ دن ہو چکے تھے۔ نازاں نے اسے خود گھر چھوڑ چلے جانے کی دھمکی بھی دے دی تھی تب بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو وہ اگلی رات دہلیز پر چاچا رحمان کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ گلو اب زیادہ دیر سے آتا تھا۔ بقول چاچا رحمان "اس کا خون گرم تھا' ہڈیوں میں طاقت تھی اور اندھیری راتیں گزارنے کا حوصلہ بھی' اسی لئے وہ رات گئے ٹیکسی چلا سکتا تھا۔"

اس روز چاچا رحمان آخری سواری کو اتار کر گھر پہنچا تو نازاں پر اس کی نگاہ سے پہلے ہیڈ لائٹس کی چمک پڑی تھی۔ اس نے ٹیکسی آگے گھر تک لے جانے کی بجائے وہیں روک لی کیونکہ ٹیکسی دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

"بیٹا سب خیر تو ہے ناں!" اس نے منہ کھڑکی سے باہر نکال کر اسے تشویش بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"جی چاچا! آپ سے بات کرنا ہے۔" نازاں اسے گھر میں لے آئی۔ اسے گلو کی ضد کے بارے میں بتایا' اسے منا کر لے آنے کی التجا کی' اس دوران میں چاچا چپ چاپ دیوار کو تکتا رہا تھا۔ رحمان چاچا کن انکھیوں سے اسے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ اسے اس وقت سے جانتا تھا جب وہ یہاں آیا تھا۔ رحمان کے سامنے ہی اس نے اینٹیں اٹھا کر دیواریں کھڑی کی تھیں' اس کے سامنے وہ گلو کو بھتیجا بنا کر گھر لایا تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ گلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے محبت کی کوئی نہ کوئی ایسی وجہ ضرور ہے جسے اس نے اپنے بنجر سینے کسی گہرے غار میں دفن کر رکھا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ اسے صبر آتا جائے گا اور اپنے سینے کے بھاری پن سے نجات پانے کی خواہش بڑھی تو وہ یا تو اس راز کو اگل دے گا یا پھر سب کچھ بھول جائے گا۔ جب اس نے پہلی بار گلو کو سینے سے لگا کر سلایا تو اس کے علاوہ جنت بی بی بھی بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ بھی نہ صرف گلو سے واقف تھی۔ بلکہ اس اکیلے' بولائے ہوئے دینو سے بھی خوب واقف تھی۔ تبھی تو ہر وقت اسے ہوش میں آ جانے کی نصیحت کرتی رہتی تھی مگر دینو نے کبھی بھی ہوش میں آ کر نہیں دیا' بس اس روز وہ جب جنت بی بی کے گھر سے نکلا تھا تو اور زیادہ گھبرایا ہوا تھا یوں جیسے جنت بی بی نے اس پر کوئی سحر پھونک دیا ہو۔ وہ گرتا پڑتا چبوترے تک پہنچا تھا اور پھر گلو کو سینے سے لگا کر' سر آسمان کی طرف اٹھا کر ایسے چیخ چیخ کر رویا تھا کہ گلو بھی بلبلا کر اس کی بانہوں کے حصار سے بھاگ نکلا تھا اور کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ تب دینو کچھ دیر کے لئے ہوش میں آیا تھا۔ آنسو پونچھ کر اس نے گلو کو یقین دلانے کے لئے کہ وہ اس کا چاچا ہے بڑی بڑی جھوٹی قسمیں اٹھائی تھیں مگر پھر جس طرح اس نے گلو کو پالا اور جیسے اس کے دکھ سہے' رحمان چاچا کو اس کی ساری جھوٹی قسمیں سچی لگنے لگی تھیں۔ محلے میں چند ہی تو گھر تھے پھر جب دینو نے دیواریں اٹھا کر گھر بنایا تھا تب ایک اور گھر کے اضافے نے صرف تین گھروں کو خوشی بخشی تھی۔ ایک جنت بی بی کے گھر کو' دوسری خود رحمان کے گھر کو اور تیسری غلام رسول کو' غلام رسول دینو کے برابر ہی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ اکیلا تھا' سارا گھر پنجاب میں تھا۔ ایک روز وہ اسی کوٹھڑی میں پڑے پڑے مر گیا تھا۔ جوان آدمی تھا' محنتی تھا' نوکری کر کے پیسہ گھر بھیجتا تھا مگر دل پر جانے کیسا بوجھ لئے تھا کہ ایک رات سویا تو اگلی صبح اٹھ ہی نہ سکا۔ اس کی لاش دینو اور رحمان ہی نے اس کے گاؤں پہنچائی تھی۔

جنت بی بی رحمان چاچا کو دینو کی حقیقت بتائے بغیر ہی ایک روز چپ چاپ مر گئی تھی اور خود دینو!! وہ تو سب کے لئے سربستہ راز ہی رہا تھا' سو آج اتنے برس گزر جانے کے باوجود کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا' اس کے رشتے دار کون ہیں اور کہاں ہیں! وہ یہاں کیوں آیا اور برسوں لاتعلق رہنے کے بعد ایک روز اچانک جنت بی بی کے گھر

سے نکل کر والہانہ انداز میں چبوترے پر پڑے رہنے والے سات آٹھ برس کے بچے کو سینے سے لگا کر کیوں لایا تھا اور پھر اسے کیوں لے کر پال لیا؟ اور ایسے پالا کہ اب تو نئے آنے والے ہی کیا' محلے کے وہ چند پرانے لوگ جو اب تک یہاں تھے اس حقیقت کو ہی فراموش کر چکے تھے کہ گلو دراصل وہ لاوارث بچہ ہے جو چبوترے پر پلا اور جانے کیسے پلا؟

آج بھی رحمان نے کن انکھیوں سے دینو کی طرف دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ کسی سیاہ مضبوط چٹان کو دیکھ رہا ہے۔ نازاں بتا رہی تھی کہ چاچا گلو کو بہت چاہتا ہے۔ اس کے بغیر پل بھر نہیں رہ سکتا اور وہی گلو اب گھر نہیں آتا۔ اسے خود چاچا نے نکالا ہے' نیند تک حرام کر بیٹھا ہے مگر اسے منا کر لانے کو تیار نہیں ہے۔ حالانکہ اگر وہ خود جائے تو گلو فوراً واپس آ جائے۔

"مگر گلو پھر کہاں رہتا ہے؟ یہیں تو آتا اور یہیں سے تو جاتا ہے۔" پہلی بار یہ بات سن کر وہ حیران ہو کر بولا تھا اور جب ساری بات سن لی تو اسے لگا جیسے بات کچھ اور ہے۔ اس لئے گلو کو منا کر لانے سے پہلے اس مضبوط چٹان میں سے نہر نکالنا بہت ضروری ہے۔ کام کتنا مشکل تھا وہ بھی جانتا تھا مگر برسوں سے دبے ہوئے تجسس نے اسے پھر اسی طرح بے چین کر دیا جس طرح وہ اکثر جوانی میں بے چین ہوا کرتا تھا۔ اس نے سرتوڑ کوشش کی تھی کہ کچھ پتہ چل سکے' مگر اس کے سوا کچھ معلوم نہ کر سکا تھا چبوترے پر پلنے والا بچہ اس بھکارن کا تھا جسے اس نے خود تو نہیں دیکھا تھا' البتہ چبوترے کے سامنے والی دیوار کے قریب بنی جھونپڑی میں اس عورت کی موجودگی کا کبھی احساس اسے ضرور تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اکیلی قطعی نہیں ہو گی مگر بعد میں جب بچہ چبوترے پر پڑا ہوا ملا تو محلے والوں کے ساتھ وہ بھی معلومات کے لئے جھونپڑی میں گیا تھا جہاں جا کر پتہ چلا تھا کہ وہ اکیلی تھی۔ جانے کب اس نے بچہ جنا' کب تک اسے پالتی رہی اور کیوں اسے چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ ایک جنت تھی جسے لوگوں نے اکثر اس جھونپڑی میں آتے جاتے دیکھا تھا اور اس سے کچھ معلوم بھی کرنا چاہتا تھا مگر اس نے بات ہی ٹال دی۔ بچہ اٹھا کر گھر لے گئی مگر پتہ نہیں کیا بات تھی وہ بچہ گھٹنوں پر چلتا ہوا چبوترے پر ضرور پہنچتا تھا اور وہیں سو جاتا تھا اور پھر یہ سلسلہ طویل ہو کر اس وقت تک جاری رہا جب تک دینو اسے اٹھا کر نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے گیا بلکہ اس کے بعد بھی اکثر گلو اسی چبوترے پر سوتا مگر اب اس کے ساتھ چاچا بھی ہوتا تھا۔ اس کے بے خبر سوتے ہی وہ دھیرے سے اٹھا کر اسے سینے سے بھینچ لیتا تھا اور گھر لے آتا تھا۔

تب تجسس نے اسے بہت بے چین کیا تھا' اس نے جب بھی جنت بی بی سے کچھ معلوم کرنا چاہا تو اس نے جھڑک دیا۔ دینو سے پوچھا تو اس نے خالی خالی آنکھوں سے خلاؤں میں گھورتے ہوئے اسے ایسی کہانی سنا دی جس کے جھوٹے ہونے کا ثبوت اس کے اپنے چہرے کا تاثر ہوا کرتا تھا اور آج.......... آج نازاں کی باتیں سن کر رحمان پھر بے چین ہو گیا تھا۔

"اتنا دم انسان میں کہاں ہوتا ہے دینو؟" اس نے اس کے قریب بیٹھ کر سرگوشی کی تو چاچا کی ساکت آنکھوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ پتلیاں بے چین ہو کر پھیل گئیں۔

"کیا.......... کیا مطلب ہے تیرا؟"

"بڑے بڑے راز وقت کی آندھی میں دھول بن کر بکھر جاتے ہیں یا اڑ کر کہیں اور چلے جاتے ہیں مگر تو.......... تو"

"اس میں کسی راز کی کیا بات ہے! تو جانتا ہے کہ گلو کو میں نے اپنے بچے کی طرح پالا ہے۔ اس سے محبت کرنا میری عادت ہے اور ضرورت بن چکی ہے۔ اسے اچھی طرح زندہ رکھنا میری پہلی اور آخری خواہش ہے۔ وہ غلط حرکت کرتا ہے تو.......... تو میں کیسے بخش دوں؟ ایک قصہ تو تیرے سامنے ہے۔ اب بھی کیا اسے تمیز نہیں آئے گی؟" وہ بے قراری سے اٹھ بیٹھے گا۔

"مگر اس بات سے اس قصے کا کیا تعلق..........؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نازاں بتا رہی تھی کہ وہ ماں کا ذکر سن کر غصے میں آیا تھا اور اس نے نازاں کو مار دیا تھا۔"

"ہاں!! اور جب وہ جانتا ہے کہ میں عورت پر ہاتھ اٹھانے کو دنیا کی ذلیل ترین حرکت سمجھتا ہوں تو اس نے ایسا کیوں کیا؟" وہ اب غرانے لگا تھا۔ "جب تک وہ مجھ سے معافی نہیں مانگے گا میں.......... میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

"اگر اس نے معافی نہ مانگی تو؟"

"تو ٹھیک ہے.......... مرے جا کر کہیں بھی.......... میری بلا سے' اتنی زندگی گزر

گئی.......... باقی بھی گزر جاتی ہے۔"

"تو پھر تو اسے وہاں سے اٹھا کر کیوں لایا تھا دینو.......... اگر اسے واپس وہیں جانا تھا تو تو نے اسے گھر کی چاردیواری کا عادی کیوں بنایا تھا؟ تو ہر روز اسے دیکھتا تھا' لاتعلقی کا اظہار کر کے گزر جاتا تھا' مجھے یقین ہے کہ تیری اس سے کچھ بھی رشتے داری ہوتی تو وہ کبھی کسی کو وہاں نظر آتا ہی نہیں' پھر بھی.......... ایک روز اچانک تیرے اندر اس کی محبت نے جنم لے لیا۔ تو اسے اٹھا کر لے آیا۔ اس کی خاطر اپنی زندگی اجیرن کر لی۔ اسے پالا پوسا' اتنا بڑا کر دیا اور آج.......... آج پھر اسی طرح اچانک تیرے دل سے اس کی محبت ختم ہو گئی۔ یہ چکر کیا ہے دینو! اب تو بتا دے یار۔"

اور کمرے کی دیوار کے اس طرف بیٹھی نازاں کو یوں لگا جیسے وہی نہیں پورا گھر اس سمیت کسی گہرے کنویں میں اتر رہا ہو' جہاں عجیب گونجتا ہوا سناٹا تھا جس کی سنسناہٹ اس کے سینے میں بل سے ڈال رہی تھی۔ چاچا چپ تھا' یوں جیسے مر گیا ہو اور اب کبھی بھی' قیامت تک کچھ نہیں بولے گا۔

"بتا دے دینو! اتنا بوجھ تو سینہ پھاڑ کر باہر آ جاتا ہے یار میرے۔ میں شروع سے تجھے دیکھ رہا ہوں۔ سمجھا تھا کہ شاید تو کبھی کھل جائے گا مگر.......... پھر میں سب کچھ بھول گیا۔ آج جب نازاں نے بتایا کہ گلو لوٹ گیا' اس چبوترے پر جہاں سے تو اسے اٹھا کر لایا تھا تو مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔"

چاچا پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاچا رحمان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پل کی پل میں پپڑیاں سی جم گئی تھیں۔ بدن میں لرزا سا بھر گیا تھا۔ "وہ.. کہیں نہیں گیا۔" وہ بولا تو یوں جیسے اس کے گلے میں خراشیں سی پڑ گئی ہوں اور اس سے بولا نہ جا رہا ہو۔ جانے آواز میں کیسا درد تھا' جیسے وہ بولا نہیں ہو' چیخا ہو۔ جیسے ایک دم حلق پھاڑ کر رو دیا ہو۔ نازاں گھبرا کر باہر آ گئی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ مٹکے کی طرف لپکی اور کٹورا بھر کر اس کے سر پر پہنچ گئی۔ چاچا نے اسے یوں تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا تھا جیسے لمبے تپتے صحرا میں لب مرگ کسی نے ہونٹوں کو تر کرنے کا سامان کر دیا ہو۔ وہ گھونٹ گھونٹ پانی پی کر اس کی تری کو محسوس کرتا رہا۔

رحمان چاچا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور چاچا کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھونٹ چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے جیسے وہ یہ پانی کبھی ختم نہیں کرنا چاہتا صرف اسی لئے کہ کٹورا خالی ہو گیا تو رحمان چاچا پھر اس سے وہی سوال پوچھنے لگے گا جنہیں سن کر اس کا حلق ہی نہیں روح تک پیاس سے چیخ گئی تھی۔ گھونٹ قطروں میں بدل گئے اور خالی کٹورا نازاں کو دیتے ہوئے اس نے ایسی خالی آنکھوں سے نازاں کی طرف دیکھا کہ وہ لرز اٹھی۔

"رحمان چاچا! پہلے تم جاؤ اور گلو کو منا کر لاؤ۔ اب تو آ گیا ہو گا وہ............" نازاں چاچا کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی تھی۔ چاچا حیران ہو گیا' اس سے پہلے بھی اس نے کئی بار اسے حیران کیا تھا۔ وہ بہت سمجھدار تھی' ہر بات بن کہے جان لیتی تھی' گلو کا بھی یہی خیال تھا' شاید اسی لئے وہ ان دونوں کی اہم ضرورت بنتی جا رہی تھی۔

"وہ تو میں لے آؤں گا مگر............"

"اگر مگر کچھ بھی نہیں۔ دیکھتے نہیں چاچا کتنا بیمار ہے۔ اس بے وقوف کو بتاؤ کہ اس کی زندگی چھوٹی کر کے اسے کچھ ملنے والا نہیں ہے اور یہ بھی بتانا کہ اپنے ہی ڈانٹتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں' غیر ہوں تو انہیں کیا پروا! کچھ بھی کرتا پھرے............" پھر جیسے اسے خود ہی احساس ہو گیا کہ یہ جملہ تو اور جلتی پر تیل کا سا اثر دکھائے گا۔ وہ بوکھلا گئی۔ اس نے پلٹ کر چاچا کی طرف دیکھا۔ جانے اس کے چہرے پر کیا تھا۔ وہ ایک دم ہی کٹورا لے کر مٹکے کی طرف بڑھ گئی۔ مٹکے سے پانی نکال کر بے وجہ پیتے ہوئے اس نے کٹورے کے اوپر سے رحمان چاچا اور چاچا کو دیکھا۔ دونوں ہی چپ تھے۔ چاچا کی نگاہیں تو چارپائی کی پٹی پر جمی دھول کی طرح اسی پر جم گئی تھیں............ اور رحمان چاچا جیسے اس کی نگاہیں اٹھنے کا منتظر ہو۔

"ٹھیک ہے دینو بابا!" اچانک اس کے چہرے پر تھکن چھا گئی۔ وہ زیادہ تر اسے بابا ہی کہتا تھا' گو عمروں میں اتنا فرق نہ تھا۔ یوں بھی وہ دینو کا دوست تھا مگر دینو تو جیسے گلو کے علاوہ ساری بستی کا بابا تھا۔ خود نازاں بھی اسے شروع میں بابا ہی کہتی تھی بلکہ خالہ حمیدہ بھی اسے بابا کہتی تھی مگر جب سے نازاں گلو کے ساتھ اس گھر میں آئی تھی اس نے جانے کیا سوچ کر اسے چاچا کہنا شروع کر دیا تھا۔

"ایک بات بتا دوں! کبھی کبھی چھوٹی سی بات دل پر چٹان کی طرح بڑی اور مضبوط ہو جاتی ہے اور پھر یہی چٹان ہر جذبے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ ضرور سوچنا کہ جسے تم

گلو کی محبت سمجھتے ہو وہ............ وہ کہیں نفرت تو نہیں............ کسی اور کی............ جس نے گلو کے وجود میں سرایت کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دی ہو۔ خود کو ٹٹولنا ضرور دینو بابا۔"

رحمان چاچا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر وہ نہ رکا' نہ اس نے پلٹ کر چاچا کے اندر اٹھنے والے طوفان کو دیکھا' تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

کچھ تھا...... ... شاید گہرا سناٹا' یا شاید............ بہت زیادہ شور۔ طوفان آنے سے پہلے کی خاموشی یا طوفان آنے کے بعد کی تباہی جس نے نازاں کو بالکل ساکت کر دیا تھا۔ وہ کٹورا ہاتھ میں لئے ویسی کی ویسی کھڑی تھی۔ چاچا دروازے میں پڑے' ہلتے ہوئے پردے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بلا کا کرب تھا............ آنکھوں میں وحشت تھی' پھر اچانک چاچا نے گھبرا کر نازاں کی طرف دیکھا اور دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر وحشت انگیز انداز میں بولا۔

"یہ............ یہ کیا کہہ گیا؟ یہ اس نے کیا کہہ دیا نازاں! نفرت............! میں نے تو کب کی نفرت کرنا چھوڑ دی............ زندگی میں پہلی اور آخری بار میں نے راجہ سے نفرت کی تھی۔ راجہ جو مجھ سے میرا سب کچھ چھین کر لے گیا تھا۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں گویا گدلے پانی کا سیلاب سا امنڈ آیا۔ وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ نازاں گھبرا گئی۔ اس نے کٹورا مٹکے پر رکھنا چاہا مگر کٹورا مٹکے کے کنارے سے ٹکرا کر پکے فرش پر شور کرتا دور تک لڑھکتا چلا گیا مگر اس نے پلٹ کر اسے اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہ لپک کر چاچا کے قریب آ گئی۔

"چاچا............ خدا کے لئے خود کو سنبھالو! کہنے دو اسے' اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے! تم نفرت کرنا جانتے تو سب سے پہلے اس سے نفرت کرتے جو تم ایسے محبت کرنے والے کو چھوڑ کر چلی گئی۔" جانے کیوں نازاں کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور ایسا کہتے ہوئے گلو کا تمتماتا چہرہ بھی نگاہوں میں گھوم گیا۔

"نہ بٹوا' وہ کب چھوڑ گئی تھی؟ اس نے تو جان دینے کی قسم کھا لی تھی۔ ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا اور وہ تو............ وہ تو ساتھ ہی تھی' اب بھی ساتھ ہے' سائے کی طرح میرے گرد منڈلاتی رہتی ہے نازاں............ وہ وعدے اور قسمیں ہی تو اس کے پاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی زنجیریں بنی ہوئی ہیں جو اسے اتنی دور جا کر بھی مجھ سے دور نہیں ہونے دیتیں۔

"وہ اس وقت بھی یہیں تھی جب میں نے یہ گھروندا بنایا تھا' یہ تو میری بدقسمتی تھی کہ میں اسے نہ دیکھ سکا مگر مجھے یہ یقین ہے کہ وہ مجھے روز دیکھتی ہوگی۔

"یہ یقین تو مجھے اسی روز آ گیا تھا جب جنت بی بی نے پہلی بار بتایا تھا کہ گلو..........

جہاں آرا کا بیٹا ہے۔ وہ یہیں رہتی تھی' جھونپڑی میں' پیٹ میں بچہ چھپائے وہ نو دس ماہ کی اذیت میں مبتلا رہی مگر اس نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا سوائے جنت بی بی کے' اور اسے بھی صرف اتنا کہا تھا کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرے بچے کو دینو کے حوالے کر دینا یا اسے بتا دینا کہ یہ بچہ میرا ہے.......... اور جب وہ چلی گئی تب جنت بی بی بالکل بھول گئی یا شاید اس نے جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ ایک ڈیڑھ برس تک مجھ سے چھپائے رکھا پھر اس کی جان بھی لبوں پر آ گئی تب اس نے مجھے بتایا تھا۔" چاچا اتنا کہتے کہتے ہانپ گیا۔

نازاں کو لگا جیسے اب وہ اس بوجھ کو سہارے رکھنے کی طاقت کھوتا جا رہا ہے جبھی تو بغیر پوچھے بولنے لگا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر نازاں نے اسے دو تین تکیوں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"کیا چاچا.......... کیا بتایا تھا اس نے اور وہ کہاں چلی گئی تھی؟"

"اسے راجہ اٹھا کر لے گیا تھا۔" چاچا کے لہجے سے آنچ سی آنے لگی۔

"کون راجہ؟"

"گاؤں کا بدمعاش تھا۔ مجھے تو کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ وہ ایسا کرے گا مگر اس برس باڑ آ گئی۔ لوگ جان بچانے کی فکر میں لگ گئے تھے۔ کافی افراتفری تھی۔ میں گاؤں میں نہ تھا' جب پہنچا تو پتہ چلا کہ سیلاب تو آیا تھا' گاؤں کے ہرے بھرے کھیت اجڑے تھے' کھیتوں کے کناروں پر بنے گھروں کی دیواریں بھی بہہ گئی تھیں مگر.......... مگر میری تو زندگی ہی اجڑ گئی تھی۔ بنیاد ہی ہل گئی تھی۔ راجہ جھاراں کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ میری ماں جیسے مجھے میری تباہی کی خبر دینے کو ہی زندہ تھی۔ میں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ اپنی اکیلی رہ جانے والی بہن کی بیڑی پاؤں میں ڈالے جگہ جگہ اسے ڈھونڈتا رہا مگر.......... میرے قریب' جانے کیسے دن بتاتی ہو گی وہ.......... کب کب مجھے دیکھتی ہو گی اور.......... مجھ کمبخت کو یہ احساس ہی نہ ہوا کہ وہ میرے قریب ہے جسے میں ساری دنیا میں تلاش کر کر

کے تھک گیا ہوں۔"

چاچا بولتے بولتے بھی تھک گیا تھا۔ اس نے خاموش ہو کر نازاں کو دیکھا جو ہاتھوں میں اپنے چہرے کو لئے بڑے انہماک سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ چونکی' چاچا اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے جلدی سے فرش پر پڑا کٹورا اٹھایا۔ دھویا اور اس میں پانی بھر لائی۔ وہ بڑی تیزی سے یہ سب کر رہی تھی جیسے اسے ڈر ہو کہ چاچا کو ہوش آ جائے گا' وہ چونک اٹھے گا اور پھر کہے گا۔ "کون.......... کون جھاراں.. باؤلی ہوئی ہے کیا؟"

وہ کٹورا لے کر چاچا کے قریب گئی تو وہ چت لیٹا آسمان پر چمکتے ستاروں کو تک رہا تھا۔ "پھر چاچا.......... تمہیں کیسے پتہ لگا کہ وہ یہیں تھی..........!" نازاں نے ڈرتے ڈرتے داستان کا سرا تھامنا چاہا۔

"پتہ نہیں جنت بی بی نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ وہ کہتی تھی' میں اسے نہیں جانتی تھی حالانکہ وہ.......... وہ اس کی سہیلی تھی۔ پتہ نہیں کیوں..........؟ پھر جب اس کی حالت خراب ہو گئی۔ بیمار ہو گئی تب میں نے سنا اور اس کی عیادت کو چلا گیا۔ گلو کو ہم سب ہی دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ اسی بھکارن کا بچہ ہے جو اچانک ایک روز اسے چبوترے پر سوتا چھوڑ کر غائب ہو گئی تھی۔ اس روز گلو جنت بی بی ہی کے گھر پر تھا۔ اس کی بہو اس سے نالاں تھی۔ بیٹا یہاں تھا نہیں۔ جنت ہی اسے سنبھالا کرتی تھی اور جب اسے لگا کہ وہ اب نہیں بچے گی تو اسے خیال آیا ہو گا.......... تب اس نے مجھے بتایا کہ گلو جھاراں کا بیٹا ہے۔ اس نے میرے گاؤں کا نام لے کر بتایا کہ وہ وہاں سے آئی تھی۔ اسے راجہ نام کا آدمی لے کر آیا تھا' پھر ایک روز راجہ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ وہ بڑا بدمعاش تھا۔ یہاں آ کر تو اس نے پوری ٹولی بنا ڈالی تھی۔ وارداتیں کرتا تھا' شراب پیتا تھا' نشے میں جھاراں کو مارتا پیٹتا تھا اور اس پر زور دیتا تھا کہ وہ اس علاقے اور جھونپڑی کو چھوڑ دے۔ وہ اچھی جگہ رہنا چاہتا تھا مگر وہ پٹتی رہی۔ جوتے کھاتی رہی مگر یہاں سے نہ گئی پھر.......... پھر وہ مارا گیا اور وہ اس کی نشانی لیے ساری دنیا سے چھپی رہی.. اور میں.......... میں اتنا بے خبر رہا۔ جنت بی بی سے یہ سن کر کہ گلو اس کا بچہ ہے میں پاگل ہو گیا۔ وہ گلو جسے میں اکثر دیکھتا تھا' اکثر اسے ٹافی یا کھٹی میٹھی گولیاں دیا کرتا تھا'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کبھی جھڑک دیتا تھا' وہ جھاراں کا بیٹا تھا۔ یہ سن کر میں واقعی پاگل ہو گیا تھا اور تب.......... تب میں جا کر اسے لے آیا اور اب یہ.......... یہ مجھے چھوڑ کر پھر اسی جگہ چلا گیا۔ تو بتا.......... تو بتا نازاں! میں اس سے نفرت کر سکتا ہوں؟ اس جھاراں کے وجود کے حصے سے جسے اپنی کوکھ میں پالتے ہوئے بھی وہ مجھے دیکھتی ہو گی۔ جس کی نسوں میں میری جھاراں کا لہو دوڑ رہا ہے.......... جس میں سے جھاراں کی خوشبو آتی ہے۔ ارے اسے تو میں نے برسوں سینے پر سلایا ہے کہ پہلی بار سینے سے لگاتے ہی میری نس نس میں جھاراں کی خوشبو اتر گئی.......... میں اس سے نفرت کیسے کر سکتا ہوں۔ اور یہ رحمان.......... یہ کہتا ہے کہ میری یہ محبت دراصل نفرت ہے.......... راجہ کا تو عکس بھی نہیں پاتا میں اس میں.......... وہ تو میری جھاراں کا ہے.......... میری اپنی.........." اور چاچا کی لرزتی کانپتی آواز میں گھلا کرب دھویں کی طرح سارے گھر میں پھیل گیا۔

"پھر.......... وہ تجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی چاچا! جب راجہ مر گیا تھا تو وہ تیرے پاس کیوں نہ آئی؟"

"پتہ نہیں بیٹی.......... پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا؟ یا شاید میری محبت کا بھروسہ ختم ہو گیا تھا اور ٹھیک ہی تو ہے.......... وہ میرے اتنے قریب تھی اور میں نے فضا میں اس کی خوشبو کو محسوس نہیں کیا۔ یہ کیسی بدقسمتی تھی میری.......... کیسی محبت تھی میری کہ.......... کہ اسے ساری دنیا میں ڈھونڈتا رہا اور جب وہ میرے پاس آ گئی تو میں ہار کر' تھک کر سب کچھ بھول گیا۔ مگر میں اسے تو نہیں بھولا تھا.......... آج تک نہیں بھولا.......... اسی میں گم ہو گیا' اتنا کہ وہ مجھے نظر ہی نہ آئی۔"

"چاچا.......... گلو.......... گلو جانتا ہے کہ وہ اسی جھاراں کا بیٹا ہے جس کے لئے تو نے دنیا چھوڑ دی اور.........."

اور لگا جیسے چاچا کو کرنٹ چھو گیا ہو.......... وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نازاں کو دیکھنے لگا۔ "کک.......... کون.......... کون جھاراں؟" اس کی آواز پھٹ گئی۔

"چاچا!!" نازاں اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر رو دی۔ "جو بوجھ اتار دیا ہے اسے دوبارہ نہ اٹھا.......... میں.......... میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں گی چاچا! میں قسم کھاتی

ہوں.......... اللہ کی قسم کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی گلو کو بھی نہیں۔"

اور چاچا بہت دیر تک خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھے گیا۔ اس کی حالت ہارے ہوئے' تھکے ہوئے مسافر کی سی تھی۔ جو ساری عمر تپتے صحرا میں ننگے سر اور ننگے پاؤں پھرتا رہا اور پھر لوٹ کر اسی جگہ پہنچ گیا ہو جہاں سے چلا تھا۔ "اسے نہ بتانا نازاں ورنہ وہ.......... وہ پتہ نہیں کیا کرے گا؟ وہ یہ تو جانتا ہے کہ وہ جھاراں کا بیٹا ہے اسی عورت کا جو چبوترے کے پاس جھونپڑی میں رہتی تھی اور ایک روز اسے چبوترے پر چھوڑ گئی تھی مگر.......... مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ میں اسے سینے سے لگائے کیوں زندہ ہوں۔ یہ بھی نہیں جانتا کہ جھاراں ہی تو میری زندگی تھی.......... جس کی تلاش میں' میں عمر کا تمام حصہ گزار آیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ یہ جان کر کیا کرے گا مگر.......... مگر میں اسے ایسا کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا جس سے اس کا اعتماد ٹوٹ پھوٹ جائے۔ کچھ بھی سہی' وہ میری عزت تو کرتا ہے۔ مجھ سے محبت بھی بہت کرتا ہے' ویسی ہی جیسی جھاراں کرتی تھی.......... مارنے اور مار دینے والی' بپھر کر طوفان بن جانے والی۔ میری ہی وجہ سے تو اس نے فتح کو زخمی کیا تھا۔ مگر نازاں.......... میں نہیں چاہتا کہ جھاراں مجھ سے اپنا بیٹا مانگے اور میں.......... میں خالی ہاتھ جھلاتا رہ جاؤں۔ وہ اسے میرے حوالے کر گئی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ گلو میرے پاس ہے شاید.......... شاید رحمان کے ساتھ وہی آ گئی تھی۔ تبھی تو گلو باؤلا ہو گیا۔"

چاچا نے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔ نازاں اس کے چہرے پر چھائی تھکن سے پریشان ہو گئی تھی۔ یوں بھی اب پوچھنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنی چارپائی لیٹ گئی۔

"سو جا چاچا! گلو کہیں نہیں جائے گا.......... میں اسے لے آؤں گی چاچا۔ میں نے کہا تھا ناں کہ وہ نفرت نہیں محبت کرتا ہے۔ بس اسے اپنی محبت کا اظہار کرنا نہیں آتا.......... مگر.......... مگر میں نے بھی قسم کھا لی ہے۔ اس سے اظہار کروا کر ہی چھوڑوں گی.........." نازاں نے آخری جملہ کہا تو عزم اس کے لہجے میں بسا ہوا تھا۔

چاچا کو سینے میں سکون سا اترتا محسوس ہوا۔ سیاہ آسمان سے اترتی ہلکی ہلکی ٹھنڈک نکلتے چاند کی چاندنی میں گھل کر جیسے اس کے اندر اتر گئی تھی۔ اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اسے یقین آ گیا کہ وہ آج پہلی بار.......... برسوں کے بعد پہلی بار سکون کی نیند سوئے گا اور واقعی چند ہی لمحوں میں اس کے خراٹے فضا میں ہلکا سا ارتعاش بن کر پھیلنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور سمٹنے لگے۔

☆============☆============☆

رات دو بجے تک رحمان چاچا نے اس کا دماغ کھایا تھا۔ جو باتیں وہ کر رہے تھے، سب اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں مگر پتہ نہیں کیا تھا جو گلو کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس نے گھر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ رحمان چاچا کل پھر آنے کا کہہ گیا تھا۔ گلو نے کوئی جواب دیئے بغیر کروٹ لے لی تھی۔

چاچا رحمان چلا گیا تھا اور گلو سو گیا تھا مگر اس رات کئی بار اس کی آنکھ کھلی تھی۔ ہر بار اسے لگتا تھا جیسے چاچا اس پر جھکا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اس کے چہرے کی جلد کو جھلسا رہے ہیں۔ وہ ہر بار اچھل کر اٹھ بیٹھا تھا مگر دور دور تک سنسان علاقے اور گہرے سناٹے نے ہر بار اسے تھپک کر سلا دیا تھا۔

آج اسے یہاں وہ سکون نہیں ملا تھا جو یہاں کا خاصا تھا۔ وہ اندر سے بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا مگر فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ حیرت تو اسے تب ہوئی تھی جب اس نے پہلی ہی رات نازاں کو خواب میں دیکھا تھا۔ خواب تو وہ صبح اٹھ کر بھول گیا تھا مگر اتنا اسے یاد رہ گیا تھا کہ وہ نازاں تھی۔ پتہ نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ بس تھی نازاں، اور پھر اس نے کچھ بھی نہ سوچا۔ رات کو ہی کچھ بے چینی اور نیند گھیر لیتی تھی۔ ورنہ دن تو اس کا بڑے مزے سے گزر رہا تھا۔ ان دس بارہ دنوں میں اس نے اچھی خاصی کمائی کر لی تھی۔ خان آفریدی نے اسے تنخواہ پر رکھا تھا جو روز کے روز کمائی پر رکھا ہوتا تو وہ کافی کما چکا ہوتا۔ یہ اس نے سوچ لیا تھا کہ حتی الامکان بچت کی کوشش کرے گا اور پھر ایک نہ ایک روز اپنی ٹیکسی خرید لے گا.......... "اور وہ اچھا والا گھر.......... قیمتی برتن!" نازاں کی کھنکتی ہوئی آواز نے اسے پل بھر کو چونکا دیا تھا۔ بے ساختہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر دوڑ گئی تھی۔

"بناؤں گا.......... وہ بھی بنا ہی لوں گا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا اور پھر ہزاروں پلان اس کے دماغ میں گھوم گئے تھے۔ اسی روز اس نے جاگتے میں بڑا حسین خواب دیکھا تھا کہ کوئی امیر آدمی اس کی ٹیکسی میں بیٹھا ہے اور اترتے ہوئے اپنا بریف کیس چھوڑ گیا ہے۔ وہ گھر لا کر اسے کھولتا ہے تو اس میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہیں اور پھر اس کی زندگی کے

دن پھر گئے۔ وہ بڑی سی کوٹھی، بہترین فرنیچر اور بڑی سی خوبصورت نئے ماڈل کی کار کا مالک ہے۔ چاچا بھرے بھرے گال اور چمکتی آنکھیں لئے اس کے سامنے بیٹھا ہے اور نازاں دونوں کلائیوں میں چوڑیاں چھنکاتی پھر رہی ہے.......... اور تبھی وہ ہوش میں آگیا تھا۔ "نازاں کیوں..........؟"

اور اس پھنکار نے ہی اسے احساس دلایا تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگا ہے۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ ابھی تک تو وہ امام دین کا قرضہ اتارنے کے قابل بھی نہیں ہو سکا ہے۔ پہلے تو اس کا قرض اتارنا ہے، وہ اسی چکر میں اب تک اس سے ملنے بھی نہیں گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے پیسے پورے کر کے ہی جائے۔ اس کی دی ہوئی رقم میں سے آدھی سے زیادہ اس کے پاس موجود تھی مگر لگتا تھا کہ وہ آسانی سے یہ قرض نہیں اتار سکے گا پھر خیال آیا کہ بچی ہوئی رقم اسے دے کر باقی ہر مہینے دے دیا کرے۔ یہی بات معقول محسوس ہوئی اور اس نے اگلے روز صبح سویرے امام دین کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی لئے وہ جلدی سونا چاہتا تھا مگر رحمان چاچا رات دو بجے تک اس کا دماغ چاٹتا رہا تھا۔ وہ جھنجلاتا رہا، بڑبڑاتا رہا پھر جانے کب سو گیا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ٹیکسی تو رحمان چاچا کی ٹیکسی کے پاس ہی کھڑی کرتا تھا۔ اسی کے ساتھ ہوٹل پر ناشتہ کرتا تھا مگر آج اس کا ارادہ امام دین کے ساتھ ناشتہ کرنے کا تھا۔ وہ چاچا کا انتظار کیے بغیر ہی ٹیکسی لے کر امام دین کے گیراج کی طرف چل پڑا۔ اسے چھوٹا بھی یاد آگیا جس کی تانیں اب بھی اس کی سماعت میں گونج رہی تھیں۔ اس کا اسٹائل یاد کر کے وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ امام دین مجھے ایسے دیکھ کر کتنا حیران ہو گا.......... اس نے سوچا اور پھر ہنس پڑا۔ اسے یقین نہیں آئے گا.......... وہ بار بار پلکیں جھپکائے گا، آنکھیں ملے گا.......... اور بالکل وہی کچھ ہوا.......... اسے دیکھ کر امام دین کے ہاتھ سے پانا گر گیا۔ اور اس کے چہرے پر شرارت اور مسکراہٹ دیکھ کر تو وہ بت ہی بن گیا۔

"ماے! ابے او ماے.........." اس نے اسے جھنجوڑا۔

"یہ.......... یہ تو ہی ہے ناں گلو!" وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے گلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو یوں اوپر سے نیچے تک ٹٹولا جیسے کوئی اور شخص گلو کا خول چڑھائے سامنے کھڑا ہے اور امام دین وہ خول اتارنا چاہتا ہے۔

"ارے.......... یہ کیا کر رہا ہے تو؟" وہ کسمسایا۔

"دیکھ رہا ہوں گلو کہ.......... کہ واقعی تو زندہ ہے؟ مجھے تو.......... مجھے تو پتہ چلا تھا کہ تجھے کسی نے حیدر آباد میں گولی مار دی۔ میں نے اسی خوف سے احسان اللہ سے بھی رابطہ نہیں کیا کہ.........."

"کیا.......... گولی مار دی؟" گلو ٹھٹک گیا۔

"ہاں.......... مجھے فتح کے آدمی' جانو نے بتایا تھا کہ تجھے گولی مار دی گئی ہے اور اسی نے کہا تھا کہ میں اس طرف کا رخ نہ کروں نہ کسی اور طرح سے رابطے کی کوشش کروں۔"

اور گلو کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے۔ "جانو.......... جانو نے کہا تھا.......... مگر.........."

"آجا.......... اندر چل' یہاں خطرہ ہے۔" اچانک امام دین نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے وہاں بنی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گلو بغیر جانے بوجھے قدم اٹھا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں تو جیسے پٹاخے پھوٹ رہے تھے۔

"یہاں بیٹھ۔" امام دین نے اندر پڑی ہوئی چارپائی پر اسے دھکیل دیا۔

"میں.......... میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا لڑکوں کو دھندے سے لگا دوں۔" اتنا کہہ کر امام دین کمرے سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر گیا تھا۔ گلو کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ بھلا جانو ایسی بات کیسے کر سکتا تھا۔ اسے تو پل پل کی خبر تھی پھر وہ جانتا تھا کہ امام دین گلو کا دوست ہے' وہ کبھی نہ کبھی تو امام دین سے ملے گا ہی پھر.......... یہ جھوٹ کیوں بولا گیا؟

اس سوال نے اسے بے وجہ مضطرب کر دیا تھا۔ ابھی اسے یہاں بیٹھے چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ امام دین واپس آ گیا۔

"اب بتا کیا ہوا تھا؟" اس نے سوال کیا' اور گلو نے اسے الف سے ی تک کی ساری داستان سنا ڈالی۔

"کیا.......... جانو کون ہے؟ کیا کہہ رہا ہے تو؟" اس نے گلو سے یہ سن کر کہا کہ جانو میجر ہے' اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"وہ فوج میں میجر ہے' ان دہشت گردوں کے خلاف کام کر رہا ہے امام دین' اسی نے تو تو.........."

"گلو!! میرا خیال ہے کہ تو کسی چکر میں آ گیا ہے.........." امام دین کے لہجے میں اس قدر تشویش تھی کہ گلو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

"مطلب کیا ہے تیرا؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"بیٹھ جا.......... سکون سے میری بات سن.........." امام دین نے اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا پھر شاید بات شروع کرنے کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ گلو کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ امام دین کا ہاتھ اس کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا جو دھیرے دھیرے منوں بھاری محسوس ہونے لگا تھا۔

"بول ناں' بات کیا ہے؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"جانو میرے پاس آیا تھا۔ وہ بتا رہا.........." ابھی امام دین نے جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ باہر تیز ہارن بجنے کی آواز سن کر دونوں ہی اچھل پڑے۔ گلو نے محسوس کیا کہ امام دین کے چہرے پر ہارن سنتے ہی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ "گلو.......... گلو.......... تو بیٹھ میں آتا ہوں۔"

اتنا کہتے ہی وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس بار وہ باہر سے دروازہ بند ہی نہیں کر کے گیا تھا بلکہ اس نے کنڈی بھی چڑھا دی تھی۔

گلو تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے میں کوئی روزن ڈھونڈنا چاہا' اسے ناکامی نہیں ہوئی درمیان میں لگی کنڈی کے پاس چھوٹا سا سوراخ موجود تھا۔ گلو نے فوراً ہی آنکھ اس سوراخ سے لگا دی۔

باہر کھڑی گاڑی کے قریب امام دین کھڑا تھا جس کے پیچھے کھڑا آدمی براؤن شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ لمبا چوڑا اور فربہ بدن کا آدمی تھا مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے کہ دروازے کی طرف پیٹھ کیے امام دین عین اس شخص کے سامنے کھڑا تھا۔ ذرا سا وہ ادھر ادھر ہوتا تو گلو اس آدمی کو دیکھ لیتا۔ یونہی کافی دیر گزر گئی۔ گلو کو لگا جیسے اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریڑھ کی ہڈی گل کر گر جائے گی' جھکے جھکے اس کی کمر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں مگر وہ ابھی تک اس شخص کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔

امام دین تو جیسے پتھر کا بن کر اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ درد کی تیز لہر نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ سیدھا ہو جائے' وہ آنکھ سوراخ سے ہٹانے ہی والا تھا کہ اچانک براؤن شلوار قمیض والا آدمی پہلو بدل کر دوسری جانب ذرا سا جھکا اور اس کا چہرہ گلو کے سامنے آگیا۔

اس شخص کو دیکھ کر گلو اچھل پڑا۔ اسے دیکھ کر گلو کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے اور بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے اور اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ توڑ کر بھاگ نکلے............ مگر............

سر میں ہونے والے دھماکوں کی وجہ سے وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔ براؤن سوٹ میں ملبوس آدمی احسان اللہ تھا۔ وہی احسان اللہ جس کے بارے میں جانو نے اطلاع دی تھی کہ اسے اغوا کر لیا گیا ہے۔ "یا اللہ! یہ میں کن چکروں میں پڑ گیا ہوں۔ میرے مالک مجھے پناہ دے۔ ان لوگوں سے نجات دے جو زمین پر فساد پھیلاتے پھر رہے ہیں۔" اس نے صدق دل سے دعا مانگی۔ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا تھا کہ آخر جانو کی ان افواہوں کا مطلب کیا تھا؟ اس نے احسان اللہ کے اغوا کی خبر اسے کیوں دی جبکہ وہ اس کے سامنے موجود تھا' پھر خود اس کے بارے میں بھی امام دین کو غلط اطلاع دی تھی۔ بھلا امام دین کو اس کی موت کی اطلاع دینے سے کیا مقصد تھا۔

بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اب امام دین کا انتظار کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ پلٹ کر پھر چارپائی پر جا بیٹھا پھر پتہ نہیں' کتنا وقت گزر گیا' اسے تو لگ رہا تھا جیسے دن پر دن بیتتے چلے جا رہے ہوں۔ اندر باہر گہرا سناٹا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دم سادھے بیٹھا تھا کہ اچانک دروازے پر آہٹ محسوس کر کے چوکنا ہو گیا۔ باہر کنڈی کھل رہی تھی۔ وہ بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر آنے والا امام دین تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

"گلو!"

"کیا بات ہے ماے؟ وہ............ وہ احسان اللہ تھا ناں!"

"ہاں............ وہ احسان اللہ تھا۔ وہ اسماعیل سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مگر مجھے تو جانو نے بتایا تھا کہ احسان اللہ کو کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔" گلو کی بات سن کر امام دین بڑی زور سے چونکا تھا۔

"اغوا کر لیا؟"

"ہاں اور............ ابھی وہ تیرے سامنے............"

"گلو! یار میرے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ احسان اللہ اور جانو دونوں بہروپئے ہیں۔" امام دین نے آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ اس طرح میں تجھے اس چکر سے بچا لوں گا مگر............"

"تو ان لوگوں کو کیسے جانتا ہے؟" گلو نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"بتایا تو تھا تجھے............ کہ میں نے اسماعیل وغیرہ کے چکر سے احسان اللہ کے بھائی کو بچایا تھا............ مگر یہ جانو تو............ یہ فتح کا آدمی تھا۔ میں تو خود اسے دیکھ کر حیران ہوا تھا اور جب اس نے مجھے اطلاع دی کہ تجھے کسی نے گولی مار دی ہے تو میں نے اس سے کچھ بھی نہ پوچھا کہ تو کیسے جانتا ہے' میں سمجھا کہ تجھے فتح کے لوگوں نے ہی گولی ماری ہو گی............ اور وہ تو فتح کا آدمی ہے۔ میں نے ایسے ظاہر کیا جیسے میں تجھے زیادہ نہیں جانتا' کبھی دوستی تھی جو زمانے کے سرد و گرم میں گھل کر بس یاد کی صورت باقی رہ گئی ہے' میں نے سرسری سا اظہار افسوس بھی کیا تھا۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ میری چالاکی کو سمجھ گیا ہو گا۔ تبھی مجھے چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔"

"ہاں! وہ جانتا تھا کہ تو نے ہی مجھے احسان اللہ کے پاس بھیجا ہے۔" گلو نے دھیرے سے کہا۔

"گلو! مجھے لگتا ہے کہ اسماعیل اور جانو ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ہم نے دلدل میں قدم رکھا تھا جو کسی صورت باہر نہیں نکلنے دیتی بلکہ اندر ہی اندر کھینچے لئے جاتی ہے۔" امام دین متفکر انداز میں کہہ رہا تھا۔

"مگر یہ لوگ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ جھنجھلا گیا۔ "جو کام وہ کروانا چاہتے ہیں ہم اسے کرنے کو تیار نہیں ہیں پھر............ پھر کیا زبردستی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"دیکھ گلو! میرا دماغ تو ابھی کام نہیں کر رہا.......... کچھ دیر سکون سے بیٹھ۔ تجھے جلدی تو نہیں ہے ناں۔" امام دین نے دونوں کن پٹیوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے کہا۔

"میں.......... میں تو آج کل چاچا کے ساتھ بھی نہیں رہ رہا۔ اسی چبوترے پر ہوں جہاں پیدا ہوا تھا۔" گلو نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"آں.......... کیا؟ اب تو ایک بوڑھے آدمی سے بھی نباہ نہیں کر سکا۔"

"بات نباہ کرنے کی نہیں ہے یار.......... چھوڑ اس چکر کو' تو خلاصی کی ترکیب سوچ.........."

اور امام دین یوں بیڑی جلا کر اور ہتھیلی میں چہرہ بھر کر بیٹھ گیا جیسے تب تک نہیں ہلے گا جب تک ترکیب نہ سوچ لے.......... گلو بے چین تھا مگر پھر بھی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

"بات سن!" اچانک امام دین نے سیدھا ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہاں!" وہ چونک اٹھا۔

"اگر دم ہے تو ٹھیک ہے.......... چڑھ جا سولی پہ' رام بھلی کرے گا.........."

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں کرتا رہ۔ اس طرح بہت سارا روپیہ تو بن ہی جائے گا۔ پولیس کے چکر میں یہ لوگ نہیں آنے دیں گے۔ ہم یہ سوچ کر ہی کچھ کریں گے کہ ہمارے ہاتھ زیادہ گندے نہ ہوں۔ مطلب یہ کہ دامن بچا رہے۔ ان لوگوں کا اصل مقصد بھی سامنے آجائے گا پھر جب موقع ملے گا پھوٹ لیں گے بلکہ ان لوگوں کو آسانی سے پھنسا دیں گے۔"

"تو.......... پھر.......... مطلب یہ کہ.........."

"ہاں یار' اب دیکھ نا اس طرح خوف زدہ رہ کر جینا بھی کوئی جینا ہوا؟ سسرے عزت کی روٹی کمانے کے چکر میں دن رات ایک کرو اور عزت کی روٹی بھی نصیب نہ ہو بلکہ ہر وقت ایک تلوار سی لٹکی رہے۔ دیکھ گلو! اپن کا تو کوئی ہے نہیں پیچھے رونے والا۔ جتنا بھی جیئے غنیمت جانیں گے اور جو یہ دن محلوں میں گزر گئے تو سمجھ اچھا جی لیے۔ وہ میری والی ہے ناں! وہی۔" امام دین کا رویہ اچانک بدل گیا تھا۔ اس نے آنکھ دبا کر کہا تھا۔

"اسے بڑا شوق ہے گاڑیوں میں گھومنے اور محلوں میں رہنے کا۔ اس نے بھی ساری زندگی روتے بسورتے گزاری ہے۔ ایک بھائی تھا وہ بھی اسماعیل کے چکروں میں چالاکی دکھا کر مارا گیا۔ بڑی بہن کے ساتھ رہتی ہے۔ بہنوئی شرابی ہے۔ ہر وقت اس سے خوفزدہ رہتی ہے۔ خوف.......... ہر طرف خوف ہے.......... سوچ لے گلو! ہم مرد ہیں اگر ہم بھی خوف زدہ رہ کر جئے تو ہماری ان دم چھلیوں کا کیا ہوگا اور ہاں.......... وہ لڑکی کہاں گئی.......... وہی جو.........."

"چاچا کے ساتھ ہے۔" گلو نے جواب دیا۔

"ارے.......... چاچا سیریس ہے کیا؟" اس نے مضحکہ خیز انداز میں آنکھیں پھیلائیں۔

"بکواس مت کر.......... میرا مطلب یہ نہیں۔" گلو نے برا سا منہ بنایا۔ "اور یہ.......... اچانک تجھے کیا ہوگیا۔ ایک منٹ سوچنے کے لئے بیٹھا اور بالکل بدل گیا۔"

"نہیں گلو.........." اس نے گہرا سانس لیا۔ "میں نے ایک منٹ نہیں سوچا میں تو کئی دنوں سے سوچ رہا تھا' اس وقت سے جب سے جانو نے آکر تیرے بارے میں اطلاع دی تھی اور اس کے فوراً بعد اسماعیل نے مجھے بلوایا تھا۔ اس نے مجھے بڑی اچھی آفر دینے کے بعد دھمکی آمیز انداز میں کہا تھا۔ تیری مرضی' خوش نصیبی بار بار دستک نہیں دیتی' ان دستکوں کے بعد ایک اور دستک بھی ہوتی ہے اور وہ دستک بد نصیبی کی ہوتی ہے اور تبھی سے میری کھوپڑی چٹخی ہوئی تھی۔ کراچی پر ان لوگوں کا راج ہے گلو۔ یہاں تو لگتا ہے کوئی بھی ان کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔" اس بار امام دین بہت سنجیدہ اور متفکر تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی مصنوعی شوخی ایک دم غائب ہوگئی تھی۔

"تو سوچ لے گلو! میں تو فیصلہ کرچکا ہوں کہ گیدڑ کی طرح زندگی نہیں گزاروں گا۔ تیرے پاس ابھی وقت ہے۔ وہ لوگ جلد یا بدیر تجھے بھی کھوج لیں گے۔ جانو میجر ویجر نہیں ہے۔ وہ تجھے بے وقوف بنا کر تجھ سے وہی کام کراتا جو تو اپنی سمجھ بوجھ سے کر سکتا ہے' اس طرح کم ازکم تجھے کسی نہ کسی صورت فائدہ تو ہوگا نا!"

گلو چند لمحے اسے یوں دیکھتا رہا جیسے خلاؤں میں تک رہا ہو پھر اس نے پلکیں جھپکیں' گہرا سانس لیا اور بولا۔ "ٹھیک ہے' اگر تو ایسا مناسب سمجھتا ہے تو ٹھیک ہے مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک بات بتا دوں مجھے ایسا ویسا کام نہیں کرنا ہے۔ نہ میں کسی کو مار سکتا ہوں۔ نہ کہیں بم رکھ سکتا ہوں۔"

"وہ تو مجھ پہ چھوڑ دے.......... ایسی ترکیب لڑاؤں گا کہ تو صاف بچ جایا کرے گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ ایک دم خوش نظر آنے لگا تھا۔ "اب ٹھیک ہے' اب کم از کم ایک طرف ہو کر تو سوچ سکیں گے۔ اچھا یہ ٹیکسی کس کی ہے؟" اس نے ایک دم ہی موضوع بدل دیا۔

گلو نے اسے تمام گزرنے والے حالات کے بارے میں بتایا۔ یہ سن کر اسے کچھ حیرت ہوگئی تھی کہ چاچا اور گلو اپنے پرانے گھر میں واپس آگئے ہیں مگر وہ بولا کچھ نہیں۔

"یار تو بڑا ہمت والا ہے۔" اس نے گلو کی کمر پر دھپ جماتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹیکسی والا کام بھی زبردست ہے۔ ٹھیک ہے.......... ٹھیک ہے.......... کام بن جائے گا۔"

آخری جملے اس نے یوں کہے جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ کہیں اور ہو۔ "ٹھیک ہے گلو! اب تو جا۔ میں پلاننگ کرتا ہوں' اسماعیل سے ملتا ہوں جیسے ہی کچھ طے ہو گیا' تجھے تیرے گھر پر.......... تیرے چبوترے پر اطلاع کر دوں گا۔ بس اب تو ساری فکروں سے آزاد ہو جا اور سن۔ جانو اگر کہیں نظر آجائے تو اسے بتانا مت کہ تو مجھ سے ملا تھا یا تو نے یہاں احسان اللہ کو دیکھا تھا۔ تو ایسا ہی معصوم بنا رہ.......... میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا۔"

اور کچھ دیر بعد گلو وہاں سے لوٹ آیا۔ اس نے ناشتہ امام دین کے ساتھ ہی کیا تھا مگر یہ ناشتہ چھوٹے نے نہیں کرایا تھا امام دین نے بتایا کہ چھوٹا کہیں گیا ہوا ہے۔ اس کا کوئی رشتے کا ماموں مر گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید اس نے کوئی جائیداد یا بینک بیلنس چھوڑا ہو' اس نے شادی نہیں کی تھی اس لئے اولاد کا چکر بھی نہیں تھا۔ ماموں بھی اکلوتا تھا اسی لالچ میں گیا ہے اور کہہ گیا تھا کہ شاید اب کی بار آؤں تو تم سب مجھے پہچان نہ پاؤ.......... اب گیراج کے سارے لڑکے اور ہوٹل کے ملازم اس کے منتظر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ جوتے چٹخاتا ہوا جلد ہی واپس آکر ڈیوٹی سنبھال لے گا..........

گلو ٹیکسی لے کر نکل گیا۔ سارا دن سڑکوں پر پھرنے' کسی سایہ دار درخت کے نیچے ستانے اور پھر چلتی پھرتی سیاہ سڑکوں پر گاڑی دوڑانے میں شام اتر آئی۔ اس نے

لس بیلہ کے پل کے قریب والے ہوٹل کے باہر ٹیکسی روک کر کڑک دار چائے کا آرڈر دیا اور دروازہ کھول کر سیٹ پیچھے کر کے اس پر نیم دراز ہو گیا۔ جیسے اب کہیں جا کر اسے کچھ سکون ملا تھا۔ سر سیٹ کی پشت سے ٹکاتے ہی اس کے دماغ میں جیسے جھکڑ چلنے لگے۔ وہ پھر جانو' اور احسان اللہ کے پُراسرار رویے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اس کے ساتھ یہ سب کرنے سے ان کا مطلب کیا تھا۔ اگر وہ مان لیتا کہ جانو اب بھی فتح کا آدمی ہے تو پھر اسے فوراً ہی فتح کے پاس لے جانا چاہیے تھا۔ اچانک یہ سوچتے ہی گلو اچھل پڑا۔ یہ بات بھی تو جانو نے ہی بتائی تھی کہ فتح جیل میں ہے مرا نہیں ہے اور وہ جو بھاگا پھر رہا ہے تو سب بیکار ہے۔ فتح قتل نہیں ہوا اور اس لئے اسے یوں بھاگے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اس کے بعد ہی اس نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ وہ آزادانہ گھوم پھر نہ سکے۔ پھر کیا وہ غلط کہہ رہا تھا۔ کیا فتح قتل ہو چکا تھا؟ کیا پولیس اب بھی اس کی تلاش میں ہے؟ یہ سوالات کسی زہریلے ناگ کی طرح اس کے اندر پھنکاریں مارنے لگے تھے۔ اضطراب نے اسے سیدھا بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی لمحے ہوٹل کا آدمی کڑک دار چائے لے آیا۔ گلو نے چائے کو پرچ میں ڈال کر جلدی جلدی پی لیا۔ اسی دوران میں وہ طے کر چکا تھا کہ یہ کام امام دین ہی کر سکتا ہے' وہی فتح کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتا ہے لہٰذا اسے سیدھا اسی کے پاس جانا چاہیے۔

کسی نہ کسی طرح گرم گرم چائے حلق میں انڈیلتے ہی اس نے آواز دے کر باہر والے کو بلایا' اسے پیسے تھمائے اور ٹیکسی اسٹارٹ کر کے موڑ لی۔ راستے میں کئی لوگوں نے اسے ہاتھ دے کر روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکا نہیں۔ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا امام دین کے گیراج پر پہنچ گیا۔ امام دین نے دور ہی سے اس کی ٹیکسی کو پہچان لیا اور ہاتھ میں پکڑا پانا رکھ کر' میلے کپڑے سے ہاتھ رگڑتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ گلو ٹیکسی سے اترا نہیں نسبتاً اندھیری جگہ پر گاڑی کھڑی کر کے اس میں بیٹھا رہا۔ امام دین کے قریب آنے پر اس نے برابر والا دروازہ کھول دیا۔

"کیا بات ہے؟" امام دین نے اندر بیٹھتے ہی پوچھا۔

گلو نے اپنے سارے اندیشے اس کے سامنے اگل دیئے۔ امام دین کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے۔ اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو چندھیا کر دور خلاؤں میں گھورا اور پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ یہ سب اطلاع غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اچھا.......... تو جا۔ میں کرتا ہوں کچھ.........."

"کیا کرے گا؟"

"معلوم کروں گا کہ فتح کا ہوا کیا؟"

"کیسے؟"

"اب یہ تیرا معاملہ نہیں ہے۔ کسی بھی طرح معلومات حاصل کروں گا۔ ایک بات یاد رکھ' اب تو دن کے اجالے میں اس طرف نہیں آئے گا اور اس سامنے والی سڑک پر تو آئے گا ہی نہیں۔ جانو اور احسان اللہ اس طرف سے ہی آتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ زیادہ رات میں آنا اور پچھلی گلی سے آکر اس شٹر کے پاس گاڑی کھڑی کرنا' وہاں اکثر ٹھیک ہونے والی گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔ اب پھوٹ لے۔ یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہو گا سویرے تک سامنے آجائے گا۔"

وہ یہ سب کہہ کر چند لمحے گلو کے چہرے پر کچھ تلاش کرتا رہا پھر بولا۔ "گلو! کل میں رات کو گیارہ بجے تیرا انتظار کروں گا۔ یہاں نہیں رکیں گے' تیرے چبوترے پر چلیں گے۔ ساری باتیں وہیں ہوں گی۔ ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے ناں؟"

پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ شاید وہ کوئی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں اور اس کے لہجے میں ایک عجیب طرح کا ٹھہراؤ تھا۔ کچھ جماؤ سا تھا جو عام طور پر کسی فیصلے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ گلو کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر امام دین نے اتر کر دروازہ بند کر دیا' پھر کھڑکی میں جھک کر بولا۔

"اس میں کچھ بھی پریشانی نہیں ہے اس لئے تو اپنا دھندہ کر اور جا کر آرام سے سو جا۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ جا' کل گیارہ بجے رات انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں پلٹ کر گیراج کی طرف چلا گیا۔ گلو چند لمحے وہیں کھڑا اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گہرا سانس لے کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔ امام دین سے باتیں کر کے وہ ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ اب اس کی وہ حالت نہیں تھی جو چائے پینے کے دوران ہوئی تھی۔ اس نے ٹیکسی وہیں سے گھما کر گلی میں موڑی۔ امام دین نے ٹھیک کہا تھا' مین

روڈ سے یہاں تک آنے والی سڑک پر اسے خطرہ تھا کیونکہ ہر آنے والا اسی راستے سے آتا تھا ورنہ گلی کی طرف سے آنے میں کافی دشواری تھی۔ ایک تو وہ بہت پتلی گلی تھی' پھر جگہ جگہ گڑھے تھے۔ گلو نے واپسی اسی گلی سے مناسب سمجھی۔ وہ گھوم کر پل کے دوسری طرف نکل آیا۔ پان کے کھوکھے سے سگریٹ خریدا' وہیں کھڑے کھڑے اسے سلگایا اور ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ اب اس نے گرومندر کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ چند فرلانگ ہی گیا ہو گا کہ سڑک کے کنارے کھڑے ایک مرد نے اسے ہاتھ دیا۔ اب ہلکا اندھیرا پھیل چکا تھا مگر یہ مرد اور چادر میں لپٹی عورت اب پول کے نیچے دکانوں کے پاس کھڑے تھے اس لئے وہ چونک اٹھا۔ وہ آدمی غلام رسول تھا جو حیدر آباد جاتے ہوئے اسے بس میں ملا تھا' وہی جو فتح کا ملازم تھا۔ اسے دیکھتے ہی گلو کو یاد آگیا کہ اس نے بتایا تھا' فتح نے اسے ایک بنگلے میں کام کرنے کی ذمہ داری دی ہے اور وہاں ایک عورت اور ایک لڑکی رہتی ہے۔ پہلے تو گلو کا جی چاہا کہ اسے اس کے نام سے مخاطب کرے' مگر پھر جانے کیا سوچ کر اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ گاڑی بڑھا کر ایسی جگہ روکی جہاں کچھ تیز روشنی نہیں تھی۔

"ڈی ڈیفنس چلو گے؟" غلام رسول نے اس کے دائیں جانب آکر پوچھا۔

گلو نے چہرے کو کچھ جھکا کر اندھیرے میں کر لیا جیسے ٹیپ ریکارڈر ٹھیک کر رہا ہو اور بولا۔ "بیٹھیں۔"

غلام رسول نے دروازہ کھولا' عورت کو پنجابی میں اندر بیٹھنے کو کہا پھر خود بھی اندر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ایک بیگ تھا اور ایک کپڑے کا تھیلا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی گاؤں سے واپس پہنچا ہے۔ گلو نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ فتح سے اس کا تعلق اب بھی ہے یا نہیں' وہ چاہتا تو اسے مخاطب کر کے اپنی پہچان کروا کر بھی پوچھ سکتا تھا۔ مگر پے درپے ہونے والے دھوکوں نے اسے محتاط کر دیا تھا۔ اسے اعتبار ہی نہیں رہا تھا کسی پر۔ وہ سوچ رہا تھا' کیا پتہ غلام رسول بھی جانو اور احسان اللہ جیسا نکلے پھر اسے یاد آگیا کہ اس روز بس میں غلام رسول نے فتح کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ زخمی ہوا ہو' یا مر گیا ہو۔ اسے تو شاید یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ اسے زخمی یا قتل کرنے والا گلو خود ہے۔ اس کے دماغ میں کھد بد سی ہونے لگی۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلد از جلد بہت کچھ جان جانا چاہتا تھا مگر پھر اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو قابو میں کر لیا۔ وہ خاموشی سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر غلام رسول کا تعلق اب بھی فتح سے ہوا تو یقیناً اسی بنگلے میں جائے گا جہاں بقول اس کے وہ لڑکی اور وہ عورت رہتی ہے۔ اگر یہ وہی عورت تھی جسے گلو دیکھ چکا تھا اور جو لنگڑی تھی' تو گلو کا ایک مسئلہ تو حل ہو ہی سکتا تھا۔

"دیکھو چھیماں! احتیاط سے رہنا۔ پردے کا خیال رکھنا۔ کسی کے سامنے مت آنا۔" اچانک غلام رسول کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ساتھ والی عورت سے پنجابی میں کہہ رہا تھا۔

"اونہہ.........." اس عورت نے غالباً کسمسا کر پہلو بدلا تھا۔ "تو نے تو کہا ہے کہ وہاں صرف دو عورتیں رہتی ہیں۔"

"ہاں.......... مگر مالک بھی تو آتا رہتا ہے۔ وہ.......... وہ نظر کا اچھا نہیں ہے۔ بس مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔" غلام رسول کی بات سن کر گلو کو یک گونہ اطمینان ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اب اس بنگلے کی نگرانی کر کے یہ ضرور معلوم کر سکتا ہے کہ فتح زندہ ہے یا نہیں اور جیل میں ہے یا جیل سے باہر۔

"تو ایسے آدمی کے پاس کام کیوں کرتے ہو؟" عورت نے پیار سے کہا۔ گلو کا اندازہ تھا کہ غلام رسول شادی کر کے واپس آیا ہے حالانکہ اس نے بس میں گلو سے کہا تھا کہ اس کی بہن کی شادی ہے۔ ممکن ہے اس نے خود بھی شادی کر لی ہو۔ ویسے بھی پنجابیوں میں عام طور پر وٹے سٹے کی شادیوں کا رواج ہے۔

"اتنا روپیہ کوئی دوسرا مالک نہیں دے سکتا۔ اگر اس کی چاکری نہ کر رہا ہوتا تو نہ زبیدہ کی شادی کر پاتا نہ اپنی۔ اب دیکھ' تُو تو راج کرے گی ہی' زبیدہ کیسی شان سے رہے گی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بھاجی تو بہت خوش تھا۔" عورت نے مسرور انداز میں کہا۔

"بس تو ذرا سی احتیاط کرنا' سب کچھ ٹھیک رہے گا اور ہاں.......... وہ عورت کچھ کچھ پاگل ہے' جھلی سی' کبھی کبھی اس پر غصے کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔ اسے تو پیار سے سمجھائے گی ناں تو تیرے عیش ہو جائیں گے۔ جب وہ دینے پر آتی ہے تو نئے

جوڑے' برتن' پیسے نہ جانے کیا کیا دے ڈالتی ہے۔" غلام رسول بڑا پُرجوش تھا۔ "زبیدہ اور تیرے لئے کتنے ہی سوٹ تو اس نے ہی دیئے تھے۔"

"تو فکر نہ کر.......... میں تو یوں انہیں مٹھی میں لے لوں گی۔ اتی خدمت کروں گی کہ بس.........."

"کدھر مڑنا ہے؟" گلو نے چوڑی سڑک پر گاڑی کی رفتار ہلکی کرتے ہوئے پوچھا پھر غلام رسول اسے رستہ بتاتا گیا اور وہ چلتا رہا۔ ٹیکسی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رکوا کر اس نے پیسے پوچھے' گلو ڈر رہا تھا کہ وہ پہچان نہ لے' گو اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا مگر پھر بھی وہ اگر جھکتا تو اسے دیکھ لیتا۔ اسی لمحے گلو نے سیٹ کی پشت پر پڑا تولیہ اٹھا کر یوں چہرے اور سر پر لپیٹ لیا جیسے سردی لگ رہی ہو۔ ہوا میں واقعی خنکی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ وہ تولیہ لپیٹ لیتا۔ غلام رسول نے اس کی اس حرکت پر دھیان نہ دیا بلکہ جیب سے پیسے نکال کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ جنہیں گلو نے بغیر گنے جیب میں رکھا اور ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔

غلام رسول اور اس کی بیوی تھیلے سنبھالے ہوئے اسی بنگلے کی طرف بڑھ گئے جس کا مین گیٹ اندر سے بند تھا۔ گلو نے ٹیکسی آگے لے جا کر ایسی جگہ کھڑی کر دی جہاں کافی اندھیرا تھا۔ اس نے ٹیکسی کا رخ بھی لائٹ جلائے بغیر اسی طرف موڑ لیا تھا۔ اب وہ انہیں آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ غلام رسول نے بیگ ہاتھ سے رکھ کر بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھول دیا۔ وہ کوئی مرد تھا۔ یہاں سے اسے پہچان لینا بہت مشکل تھا مگر شلوار قمیض میں ملبوس وہ شخص گلو کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ غلام رسول اور اس کی بیوی اندر داخل ہو گئے۔ ان کے اندر جانے کے بعد کافی دیر تک گلو وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ وہ اندر کے بارے میں کیسے جانے گا۔ کیسے ان عورتوں کو دیکھ پائے گا مگر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے گہرا سانس لے کر ٹیکسی اسٹارٹ کر دی۔ اس بار وہ اس بنگلے کے سامنے سے گزرا اور بہت ہلکی رفتار میں گزرا مگر گیٹ اتنا اونچا تھا کہ اگر وہ اتر کر' کھڑا ہو کر بھی دیکھنے کی کوشش کرتا تو ناکام رہتا۔ دیواریں بھی کافی اونچی تھیں اور ان کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف اونچے درخت لگے ہوئے تھے۔ اندر کی روشنی ان گھنے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ گلو نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی وہ راستے ذہن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نشین کر چکا تھا۔

☆==========☆==========☆

رات گئے تک سڑکوں پر پھرنے کے بعد وہ گلی میں داخل ہوا اور گلی اس کی ٹیکسی کی لائٹس سے منور ہوئی تو وہ ٹھٹھک گیا۔ نازاں دروازے پر کھڑی ہاتھ مل رہی تھی۔ لائٹس پڑتے ہی وہ جلدی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ گلو کا پاؤں بے ساختہ بریک پر پڑا اور دروازے تک پہنچتے پہنچتے ٹیکسی رک گئی۔

"نازاں!" اس نے آواز دی۔

اس کی آواز سنتے ہی نازاں چھپاک سے باہر آ گئی۔ "گلو! گلو.......... چاچا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ بہت بیمار ہے۔ اسے اسپتال لے چل۔"

اور گلو سب کچھ بھول گیا۔ وہ طوفان کی طرح ٹیکسی سے اترا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ "چاچا.......... چاچا.........." وہ ایسے آوازیں دے رہا تھا جیسے کسی چھپے ہوئے بچے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوا تو چاچا کو چارپائی پر بے سدھ پڑا دیکھ کر اس پر جھک گیا۔ "چاچا..........!" اس نے دھیرے سے پکار کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے لگا جیسے اس نے انگارہ چھو لیا ہو۔ "یہ.......... یہ تو.......... چل جلدی چل.........." گلو نے ایک دم پلٹ کر نازاں سے کہا اور چاچا کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ "چل جلدی سے تالا ڈال.......... نہیں.......... پہلے ٹیکسی کا دروازہ کھول' جلدی کر.........." وہ بالکل بوکھلا گیا تھا۔

نازاں بھاگتی ہوئی اس سے پہلے باہر نکل گئی۔ اس نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا' گلو نے چاچا کو سیٹ پر لٹا دیا۔ اتنی دیر میں نازاں باہر کے کواڑوں کو بند کر کے تالا ڈال چکی تھی۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ وہ چادر لینا بھی بھول گئی تھی' وہ لپک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گلو نے جھٹکے سے ٹیکسی چلا دی اور پھر وہ صرف چند منٹوں میں قریبی سرکاری اسپتال پہنچ گیا۔

چاچا بے ہوش تھا۔ نازاں بوکھلائی ہوئی گلو سے لگی کھڑی تھی اور ڈاکٹر چاچا پر جھکے اس کا معائنہ کرتے رہے۔ انہوں نے گلو اور نازاں کو کمرے سے باہر کھڑا رہنے کے لئے کہا تھا اور ان دونوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اندر پہنچ جائیں۔ تھوڑا سا وقت گلو کے

لئے صدی بن گیا تھا۔ بار بار اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے جاتے۔ وہ چہرہ دوسری طرف کر کے انگلیوں کی پوروں سے انہیں صاف کر لیتا۔ اسے بے پناہ دکھ ہو رہا تھا کہ وہ کیوں چاچا کو چھوڑ کر گیا تھا۔ کیسے اطمینان سے سوتا اور سڑکوں پر مٹرگشت کرتا پھرا اور چاچا کی خبر ہی نہ لی۔ "اللہ مجھے معاف کر دے۔ اب میں کبھی بھی اسے یوں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔" اس نے بے ساختہ ہاتھ جوڑ کر چہرہ آسمان کی طرف اٹھا دیا۔

"گلو!.......... چاچا ٹھیک ہو جائے گا ناں؟" نازاں کی سرگوشی میں خوف بھرا تھا۔

"ہاں.......... وہ ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے بڑے مضبوط اور پُراعتماد لہجے میں جواب دیا اور اس کمرے کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا جس میں ڈاکٹر اب بھی چاچا کا معائنہ کر رہا تھا۔ ایک نرس چاچا کو انجکشن لگا رہی تھی۔ اسی وقت ڈاکٹر نے گلو کی طرف بڑھتے ہوئے اسے ایک پرچہ تھما دیا۔

"یہ دوائیں لے آئیں.......... یہ بہت ضروری ہیں۔"

پیسے گلو کے پاس تھے۔ اسے امام دین کو پیسے دینے یاد ہی نہ رہے تھے۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ نازاں کو وہیں کھڑے رہنے کی تاکید بھی کر گیا تھا۔ نازاں نے پکار کر کہا تھا۔ "گلو جلدی آنا.......... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

اور گلو کے دل میں کوئی تیر سا اتر گیا تھا۔ وہ تمام راستے خود کو کوستا اور خدا سے چاچا کی زندگی کی دعائیں کرتا رہا۔ دوائیں بہت مہنگی تھیں مگر اس وقت یہ سب سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اس نے دوائیں لیں اور پلٹ کر اسپتال میں داخل ہو گیا۔

پھر پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ گلو ٹہل ٹہل کر تھک گیا۔ نازاں پہلے ہی تھک کر ایک بنچ پر بیٹھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف زدہ کر دینے والا سکوت تھا۔ اسپتال میں اس طرف انتشار نہیں تھا مگر دوسری طرف کافی لوگ تھے۔ وہ شاید ایمرجنسی وارڈ تھا۔ گلو ڈاکٹر کا منتظر تھا پھر اس وقت وہ چونک اٹھا جب ڈاکٹر نے باہر آ کر پوچھا۔ "یہ آپ کے کون ہیں؟"

"یہ.......... یہ میرا سب کچھ ڈاکٹر.......... چا.......... چاچا ہے میرا۔ کیا ہوا ہے اسے.......... ٹھیک تو ہے ناں؟"

"ہاں.......... فی الحال تو ٹھیک ہیں مگر کچھ ٹیسٹ ہوں گے۔ یہ سب ضروری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔" اس نے پھر ایک پرچہ گلو کو تھما کر کہا۔

"یہ کہاں سے ہوں گے؟"

ڈاکٹر نے اسے لیبارٹری کے بارے میں بتایا جو اسی اسپتال کی تھی پھر جب اسے پتا چلا کہ ڈاکٹر فی الحال چاچا کو گھر بھیجنے کے حق میں نہیں ہیں تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اس کا تو جی چاہ رہا تھا کہ چاچا کو ہاتھوں میں اٹھا کر گھر لے جائے اور پھر ساری زندگی اس کے قدموں سے لپٹا بیٹھا رہے۔ نازاں بھی چاچا کے اسپتال میں داخل ہونے کا سن کر پریشان ہو گئی تھی۔ چاچا کا بخار ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ اسی وقت اسے داخل کر لیا گیا اور پھر گلو اور نازاں کی ساری رات، اسپتال میں گزر گئی۔

اگلے روز اس کے کچھ ٹیسٹ ہونا تھے۔ ٹیسٹ ہوئے۔ سب بہت مہنگے تھے۔ گلو کے پاس جتنے پیسے تھے وہ دواؤں اور ٹیسٹ میں ختم ہو گئے۔ نازاں بھی خالی ہاتھ تھی اور چاچا کے پاس تو یوں بھی کچھ نہ تھا۔ دکان ویسی ہی بند پڑی تھی۔ وہ چل رہی ہوتی تو کچھ نہ کچھ بن جاتا۔ گلو کو بھی تنخواہ ملنے میں دیر تھی۔ اگلے روز صبح سویرے وہ اپنے مالک خان آفریدی کے پاس پہنچ گیا۔ اسے چاچا کے بارے میں بتایا۔ بڑا خدا ترس آدمی تھا۔ اس نے بلا کسی حیل حجت کے پانچ ہزار روپے اس شرط پر گلو کو دے دیئے کہ وہ ہر ماہ اس کی تنخواہ سے کاٹ لے گا۔ گلو نے فوراً منظور کر لیا۔ اس وقت اس کے نزدیک صرف چاچا کا وجود اہم تھا۔

دوسرے روز چاچا کی رپورٹ آ گئی۔ گلو کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔ نازاں بے ساختہ رو پڑی۔ ڈاکٹر نے برین ٹیومر بتایا تھا۔ گلو سوچتا رہ گیا کہ دکھ دماغ میں ناسور بھی بن جاتے ہیں کیا؟ یہ تو سنا تھا کہ دل میں ناسور ہو جاتا ہے دل بند ہو جاتا ہے، ٹی بی ہو جاتی ہے مگر یہ برین ٹیومر..........؟ اس نے بہت دیر ڈاکٹر سے بات کی، ڈاکٹر بے حد شفیق اور رحم دل تھا۔ اس نے گلو کے ہر سوال کا جواب بڑی تفصیل سے دیا۔ اسے بتایا کہ جب مسلسل آدمی ٹینشن میں رہے، اسے سر میں درد رہتا ہو یا ہر وقت سوچتا رہے تو اسے برین ٹیومر ہو جاتا ہے۔ وہ جانے کیا کیا بتاتا رہا مگر گلو اتنا ہی سمجھ پایا کہ چاچا تو بڑا سخت جان ہے، یہ سب تو اسے بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا بلکہ اسے تو برسوں پہلے مرجانا چاہیے تھا مگر جانے وہ کس انتظار میں رہا۔

"یہ بڑا صبر آزما علاج ہے اور مہنگا بھی ہے۔" ڈاکٹر نے اسے سوچتے دیکھ کر کہا۔

"کچھ بھی ہو.......... میں.......... میں ابھی اسے مرنے نہیں دوں گا۔ آپ صرف یہ بتائیے کہ چاچا بچ جائے گا ناں؟"

"ہاں بیٹا! ہم تو اپنی پوری کوشش کریں گے۔ باقی اللہ سے رحم مانگو۔ زندگی اور موت تو اسی کے ہاتھ میں ہے ناں۔" وہ اس کی کمر تھپ تھپا کر کھڑے ہو گئے۔ "بس خیال رکھنا کہ علاج میں تعطل نہ آنے پائے۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپریشن کی ضرورت نہ پڑے، مگر ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ شعاعوں سے علاج کامیاب ہو گیا تو سمجھو کہ بات بن گئی ورنہ پھر.........."

اور گلو لرز کر رہ گیا۔ آپریشن کی بات سن کر اسے ہول آنے لگے۔ خون میں لت پت چاچا کا وجود اس کی نگاہوں میں پھرنے لگا مگر اس میں تو خون ہے نہیں کہ آپریشن میں بچ سکے۔ اس خیال نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب.......... کچھ ایسا کر دیں کہ آپریشن نہ کرنا پڑے۔ اس میں خون تو ہے نہیں اور آپریشن میں تو بہت خون بہتا ہے ناں!"

"خون تو چڑھایا بھی جا سکتا ہے۔ ویسے تم دعا کرو کہ اس کی ضرورت نہ پڑے۔"

اور گلو نے زندگی میں دوسری بار خدا کے حضور سر جھکا دیا۔ وہ وہیں، اسپتال کے احاطے میں بنی مسجد میں جا بیٹھا۔ پہلی بار وہ اس وقت مسجد میں گیا تھا جب فتح کو قتل کر کے بھاگا تھا، اور مسجد سے اس نے کسی کے جوتے اس وعدے پر چرائے تھے کہ انہیں واپس کر دے گا مگر پھر وہاں سے نکل کر اسے یاد ہی نہ رہا تھا۔ وہ خدا کے آگے سر جھکا کر رو پڑا۔ شرمندگی نے اس کی آنکھوں میں سمندر کا روپ دھا لیا تھا۔ وہ خدا کے سامنے اقرار کر رہا تھا کہ وہ بہت وعدہ خلاف اور خود غرض ہے۔ جب جان پر بنی تھی تو وعدہ کر لیا تھا اور جب پُرسکون ہو گیا تو اسے وہ وعدہ بھول گیا۔ وہ بہت دیر تک اپنے کیے کی معافی مانگتا رہا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ معافی کے سوا کچھ مانگنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور اس وقت اسے چاچا کی صحت اور زندگی کی سخت ضرورت تھی۔ اس کی صحت یابی کے لئے دعا مانگنا بہت ضروری تھا۔ وہ کتنی دیر سجدے میں پڑا رہا اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ احساس اس وقت ہوا جب مسجد کی کھڑکی سے ڈوبتے سورج کی سرخ روشنی بہہ کر اس تک چلی آئی۔ آج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارا دن وہ اسپتال میں گزار چکا تھا۔ سویرے کا آیا' شام ہو گئی تھی مگر وہ دھندے پر نہیں گیا تھا جبکہ اسے وعدے کے مطابق لگی بندھی رقم مالک کو دینا تھی تب اس نے ہمت کر کے خدا سے چاچا کی صحت کی بھیک مانگی اور آنسو پونچھ کر کھڑا ہو گیا۔

مسجد سے باہر آیا۔ سیڑھیوں کے نیچے رکھے جوتوں میں پاؤں ڈالتے ہی اسے جیسے کرنٹ لگا۔ اسے لگا جیسے کسی کی نگاہیں اس پر جمی ہیں۔ وہ پھر وعدہ خلافی کا مرتکب ہو رہا تھا' اسے اب اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے۔ اسے احسان نے پھر اس کی آنکھیں بھگو دیں۔ اس نے دھیرے سے اپنا پاؤں واپس کھینچ لیا اور ننگے پاؤں مسجد سے باہر نکل آیا۔ "یا اللہ! یہ جوتے کسی ایسے غریب کو دے دینا جس سے میرا کفارہ ادا ہو جائے۔" اس نے دل ہی دل میں کہا اور پلٹ کر اسپتال پہنچ گیا۔

نازاں پریشان کھڑی باہر والے دروازے کو تک رہی تھی۔ شاید وہ اسی کی منتظر تھی۔ وہ لپک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ "کیا ہوا.......... چاچا کہاں ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا مگر نازاں کے چہرے پر پھیلے اطمینان نے اس کا اضطراب کم کر دیا۔

"گلو' وہ اچھا ہے۔ بخار اتر گیا ہے۔ تجھے پوچھ رہا تھا پھر ڈاکٹر نے انجکشن دے کر سلا دیا ہے۔ یہ کچھ دوائیں لانا ہیں اور اس کے لئے سوپ بھی۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اسے ہلکی غذا کی ضرورت ہے۔"

"نازاں! میں.......... میں تیرا بہت شکر گزار ہوں۔ تو اگر نہ ہوتی تو.......... تو جانے کیا ہوتا' کون چاچا کی دیکھ بھال کرتا۔" گلو نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"چل ٹھیک ہے۔ اب شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تجھے تو پتہ ہی نہیں کہ میرے لئے تو اور چاچا کیا بن گئے ہیں اور جو اس روز تو مجھے نکال دیتا تو.........."

"بس کر.........." گلو نے نگاہیں چرا کر دھیرے سے کہا۔ "بولا تو ہے کہ.."

"اچھا جا.......... چاچا کے اٹھنے سے پہلے لے آ.........." نازاں اسے پرچہ دے کر کمرے میں چلی گئی۔

گلو نے نازاں کی وجہ سے چاچا کو الگ کمرا دلایا تھا۔ پہلے روز اسے اس وقت بہت برا لگا تھا جب چاچا جنرل وارڈ میں تھا اور شام کو ایک ہجوم مریضوں سے ملنے آیا ہوا تھا۔ گلو اس وقت خان آفریدی کے پاس سے لوٹا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ

چاروں طرف چکراتی ہوئی چاچا کے پاس بنچ پر بیٹھی نازاں پر پڑی تھی اور تبھی اسے احساس ہوا تھا کہ نازاں چادر نہیں لائی۔ پہلے تو اسے سخت غصہ آیا تھا مگر پھر خیال آیا کہ چاچا کو اسپتال لاتے ہوئے ہوش ہی کب تھا کہ چادر ڈھونڈتی۔ خود اسے کب خیال آیا تھا۔ ساری رات ہی وہ ڈاکٹروں کے درمیان بولائی بولائی پھرتی رہی تھی۔ عین اسی لمحے نازاں نے اسے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا۔ گلو کی آنکھوں میں دہکتے انگاروں نے اسے سمٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اسے بری طرح گھور رہا تھا۔

"کیا ہے.......... کیوں گھور رہا ہے؟" نازاں نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

"چادر کہاں ہے تیری؟"

"وہ.......... وہ تو.........."

"دوپٹا ٹھیک سے اوڑھ.........." گلو نے اس کی بات کاٹ دی اور پھر اسی دن وہ گھر سے بڑی سی چادر لے آیا تھا۔ چادر لیتے ہوئے نازاں کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اور آنکھوں میں غرور سا تھا اور اگلے روز گلو نے ڈاکٹر سے بات کر کے چاچا کو الگ کمرا دلا دیا تھا۔ اس سلسلے میں خان آفریدی نے بھی مدد کی تھی۔ اس کا کوئی ڈاکٹر جاننے والا تھا' اس نے کمرے کا انتظام کر دیا تھا ورنہ سرکاری اسپتال میں کمرہ ملنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ پیسہ تو لگتا نہیں' سفارش ہی چلتی ہے۔

☆============☆============☆

نازاں نے کہا تھا کہ چاچا اسے پوچھ رہا تھا۔ اس وقت تو اس نے دھیان نہیں دیا مگر جب وہ دوائیں اور چکن سوپ نازاں کو دے کر اسے چاچا کا خیال رکھنے کا کہہ کر ٹیکسی لے کر نکلا تو نازاں کا کہا ہوا جملہ اس کے دماغ میں گھنٹے کی آواز کی طرح گونجنے لگا۔ "پتہ نہیں چاچا کس مٹی سے بنا تھا۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتا تو اپنے جیسے کمینے آدمی کو زندگی بھر کے لئے دھتکار چکا ہوتا جسے خود غرضی کے سوا کچھ آتا ہی نہ ہو۔" یہ گلو نے بڑی سچائی کے ساتھ سوچا تھا۔ بھلا بات ہی کیا تھی جس پر وہ گھر چھوڑ کر چبوترے پر جا بسا تھا۔ اسے واقعی نازاں پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہاتھ اٹھانا اور وہ بھی عورت پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑی کمینگی تھی اور دوسری سب سے اہم بات یہ تھی کہ نازاں پر اس کا حق ہی کیا تھا؟ اس نے ایسا کون سا جرم کر دیا تھا؟ اس خیال کے ساتھ ہی ایک لنگڑا وجود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی سوچوں میں در آیا۔ اس نے اس کی ماں کے بارے میں کوئی بات کی تھی اور وہی سن کر اس کا دماغ الٹ گیا تھا مگر کیوں.......... وہ اپنی ماں سے محبت کی انتہا تھی یا نفرت کی آخری حد.......... وہ کیا بات ہے جو اسے بپھرا ہوا طوفان بنا دیتی ہے۔ "میں کیوں پاگل ہو جاتا ہوں.......... میں کیا چاہتا ہوں.......... وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اب اگر لوگ اسے برابھلا ہی کہیں تو مجھے کیا.......... میرے ساتھ اس نے ایسا کون سا اچھا سلوک کیا ہے کہ میں یوں پاگل ہو جاؤں۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اسی وقت تیز ہارن کی آواز اسے حواسوں میں لے آئی اور اس میں بجلی سی بھر گئی۔ اگر لمحہ بھر کی دیر ہو جاتی تو سامنے سے آتا ٹرک اسے کچل ہی ڈالتا۔ اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ موڑا۔ اس کی ٹیکسی فٹ پاتھ پر چڑھ کر رک گئی اور بریک چرچرانے کی آواز گونج بن کر دور تک پھیل گئی۔ سڑک پر جاتی گاڑیاں لمحہ بھر کو رکیں۔ لوگوں نے ٹھٹک کر دیکھا۔ ایک آدھ کی تو چیخ بھی نکل گئی مگر وہ بچ گیا۔

"میاں! زندگی بڑی قیمتی چیز ہے اپنی بھی اور دوسروں کی بھی.........." ابھی وہ اپنا سانس درست کر رہا تھا' خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کھڑکی کے قریب ایک چہرہ دیکھ کر چونک اٹھا۔ "کھاردر چلو گے؟"

"جی!" اس نے سر جھٹک کر کہا۔ "بیٹھیے۔"

وہ آدمی دروازہ کھول کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ گلو نے چند لمحے خود کو قابو کرنے میں لگے پھر ہوش وحواس سے ٹیکسی فٹ پاتھ سے اتار کر سڑک پر ڈال دی۔

"کسی پریشانی میں ہو؟"

اس آدمی نے دفعتاً پوچھا تو گلو نے بیک مرر میں اس شخص کو غور سے دیکھا۔ ابھی اندھیرا نہیں پھیلا تھا' فضا میں سرمئی پن البتہ گھل چکا تھا۔ وہ چالیس بیالیس برس کا پُروقار سا آدمی تھا۔ لباس سے سفید پوش لگ رہا تھا۔ اس کی کن پٹیوں سے قلمیں سفید ہو چکی تھیں۔ بڑی چمکدار آنکھوں کا مالک تھا۔ رنگ گندمی مگر سرخی مائل تھا۔ وہ بڑے غور سے گلو کو دیکھ رہا تھا۔ اسے آئینے میں اپنی ہی جانب دیکھتا پا کر گلو نے نگاہیں جھکا لیں۔

"نہیں جی بس.........."

"پریشان ہونا ہی دراصل انسان کو انسان ثابت کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے بھی تو لوگ

ہیں جو کچھ بھی کریں' ان کے ساتھ کچھ بھی ہو جائے' کسی کے ساتھ بھی کوئی حادثہ ہو' انہیں پریشانی نہیں ہوتی۔ وہ بے حس ہو جاتے ہیں اور کسی بات پر پریشان ہونے کا مطلب ہے کہ آدمی ابھی بے حسی کی منزل تک نہیں پہنچا۔"

اس شخص نے بلاوجہ اتنی لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ گلو بولنے یا سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کا تمام دھیان چاچا کی طرف لگا ہوا تھا۔ "یہاں بے حس لوگ عیش کرتے ہیں جی!" اس نے مختصر سا جملہ کہہ کر گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی۔

"وہ عیش نہیں ہوتا لڑکے۔ ایک بے چینی ہوتی ہے جس کی تہہ بہت موٹی ہوتی ہے۔ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس موٹی کھال کے نیچے کتنے طوفان مچل رہے ہیں۔ پھر ایک نہ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ اوپر کی موٹی کھال پھٹ جاتی ہے اور آدمی کو سنبھلنے کا موقع مل ہی نہیں پاتا۔"

یہ بات گلو کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی تھی۔ وہ چپ رہا۔ اسے غلام رسول کا خیال آ رہا تھا۔ تھوڑا سا افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس نے بہترین موقع گنوا دیا ہے۔ اگر وہ اس سے بات کر لیتا' ان عورتوں اور فتح کے متعلق پتہ کر لیتا تو یوں الجھن میں نہ ہوتا۔ اب پتہ نہیں وہ اسے کب ملے۔ یوں بھی دھندا چھوڑ کر اس گھر کی نگرانی کرنا اس کے بس کا کام کہاں تھا۔ وہ چاچا کو دیکھتا' ٹیکسی چلا کر خان آفریدی کا قرضہ اتارنے کی سبیل کرتا یا جاسوسی۔ اس نے سر جھٹکا۔

"بس میاں.......... یہاں اتار دو۔"

وہ چونک اٹھا۔ پیچھے بیٹھا شخص آگے کی طرف سرک آیا تھا۔ گلو نے ٹیکسی روک دی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلا کر وہ پلٹا مسافر جیب سے پیسے نکال چکا تھا۔ گلو نے پیسے لے کر جیب میں رکھے۔

"یہ لو۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ اگر کبھی کوئی پریشانی ہو تو چلے آنا۔"

"بابو صاحب! پریشانی تو زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑے گی یہاں تو ہر شخص پریشان ہے۔ کیا آپ سب کی پریشانی دور کرتے ہیں؟" گلو اب کچھ مشکوک ہو گیا تھا۔ دماغ میں گھنٹی سی بج اٹھی تھی۔

"کوشش کرتا ہوں کہ کسی کے کام آسکوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں تمہاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشانی دور نہیں کر سکوں اور معذرت کر لوں لیکن اگر ہو سکا تو تمہاری مدد ضرور کروں گا۔"

گلو نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور اخلاقاً کارڈ لے کر جیب میں رکھ لیا۔

☆============☆============☆

رات گئے وہ ہوٹل سے کھانا لے کر اسپتال پہنچ گیا۔ چاچا کے لئے فروٹ اور سوپ لینا نہیں بھولا تھا۔ اسے سخت بھوک تھی مگر وہ جانتا تھا کہ نازاں بھوکی ہوگی۔ چاچا کی طرف سے بھی پریشانی تھی۔ اب تک وہ اس سے بات نہیں کر سکا تھا۔ پہلے بے ہوش تھا چاچا' پھر گیا تو نازاں نے بتایا کہ انجکشن لگایا تھا اس لئے سو رہا ہے۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

"کہاں رہ گیا تھا تو؟" اس کے دروازہ کھولتے ہی نازاں بول اٹھی۔ "بابا گھر جانے کی ضد کر رہا تھا۔ اتنی مشکل سے اسے سمجھایا ہے' کہتا تھا کہ گلو آئے تو گھر چل۔"

گلو نے دیکھا اس کا بستر خالی تھا۔ "کہاں ہے وہ؟"

"وہاں۔" نازاں نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ گلو سامان رکھ کر بینچ پر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر آئے تھے؟"

"ہاں........... آئے تھے اور انہوں نے کہا ہے کہ تو ان سے صبح مل لینا۔"

"خیر تو ہے ناں!" گلو بہت پریشان تھا۔

"پتہ نہیں گلو........... میرا دل تو ڈرتا ہے۔ یہاں سے بھاگ جانے کو جی چاہتا ہے۔ باہر سے جب چیختے چلاتے مریض گزرتے ہیں تو........... تو میرا دل بہت زور زور سے دھڑکتا ہے۔"

"اللہ خیر کرے گا۔" گلو نے بے چینی سے پہلو بدلا پھر خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ چاچا اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

"آ گیا تو۔"

"ہاں چاچا..........." وہ لپک کر آگے بڑھا اور چاچا کے سینے سے جا لگا۔ "مجھے

معاف کر دے چاچا۔" وہ بے ساختہ اور ایک دم ہی رو پڑا۔

"ارے........... ارے باؤلا ہوا ہے کیا؟" چاچا نے اس کا چہرہ اپنے لرزتے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "چل ٹھیک ہے بیٹا۔ غلطی ہر آدمی کرتا ہے' اپنی غلطی مان لینا تو برا نہیں ہوتا۔"

گلو اسے سہارا دیئے بستر تک لے آیا۔ نازاں جانے کیوں رو پڑی تھی۔ بستر کا تکیہ ٹھیک سے رکھتے ہوئے اس نے دوپٹے سے فوراً ہی آنکھیں رگڑ لی تھیں۔ گلو نے اسے لٹایا۔ "چاچا تجھے تکلیف ہے؟"

"نہیں گلو۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مجھے گھر لے چل۔"

"چاچا ابھی ڈاکٹر گھر بھیجنے کو تیار نہیں ہے۔ تیرا علاج ضروری ہے۔ گھر جا کر بھی تجھے لیٹنا ہے ناں' یہاں لیٹا رہ۔ علاج بھی ہوتا رہے گا اور آرام بھی۔" گلو نے اس پر کمبل ڈالتے ہوئے کہا۔

"گھر کا سا آرام گھر سے باہر نہیں ملتا گلو! پتہ نہیں تیرے نزدیک گھر کی اہمیت ہے بھی یا نہیں!"

وہ شاید طنز کر رہا تھا۔ گلو کٹ کر رہ گیا۔ واقعی وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ پہلے وہ سارا سارا دن آوارہ گردی کرتا تھا' پھر فتح کے چکر میں سارا وقت باہر گزارتا رہا اور اب لڑ کر چبوترے پر جا بسا تھا' گھر کی اہمیت سے واقف ہوتا تو گھر کیسے چھوڑتا۔

"میں جانتا ہوں چاچا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "لیکن گھر جا کر تو علاج بھول جائے گا۔ اپنا خیال نہیں رکھے گا اور........... اور اب یہ بہت ضروری ہے۔"

"کچھ ضروری نہیں بیٹا۔ جتنی سانسیں اوپر والے نے لکھی ہیں' وہ پوری کر کے ہی جاؤں گا۔ پتہ نہیں کیوں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ علاج سے یا اپنی کسی تدبیر سے ہونی کو روک سکتے ہیں۔ یہ کفر ہے گلو' ہم اپنے وقت پر لکھے ہوئے طریقے سے ہی مریں گے۔ اسے اپنی کھوپڑی میں بٹھا لے کہ علاج ولاج موت کو نہیں روک سکتا۔"

"مانتا ہوں چاچا پر علاج سے بیمار آدمی تو بھلا چنگا ہو جاتا ہے ناں۔ جتنی زندگی لکھی ہے وہ تو آسان ہو جاتی ہے' سسک سسک کر تو نہیں مرنا پڑتا۔ چل تو یہ سوپ پی لے۔ تیرے لئے فروٹ بھی لایا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اب میرا معدہ تھوڑی پھیل گیا ہے۔ جتنے نوالے پہلے اس میں آتے تھے اتنے ہی اب آتے ہیں۔ تو بے وجہ پیسہ ضائع نہ کر اور پھلوں کی تو شروع سے عادت نہیں ہے۔"

گلو نے نازاں سے کھانا نکالنے کو کہا اور خود ہاتھ منہ دھونے کے لئے چلا گیا۔ انہوں نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد نازاں چاچا کو کینو اور موسمیاں چھیل چھیل کر کھلاتی رہی۔ چاچا کی ہر بات گھر سے شروع ہو کر گھر پر ختم ہوتی رہی۔ وہ بار بار گلو کو سمجھاتا رہا کہ یہ ڈاکٹر لوگ علاج کے نام پر پیسہ بٹورنے کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ لمبی چوڑی خطرناک بیماری بتا کر آدمی کو پھانس لیتے ہیں۔ موت کا خوف دنیا کا سب سے بڑا خوف ہے اس لیے آدمی بے سوچے سمجھے ان کی باتوں میں آ جاتا ہے اور وہ کیونکہ ان کی ساری چالیں سمجھتا ہے اس لئے اسپتال میں رہنے کو تیار نہیں ہے۔ گلو کو بھی یہ بات سمجھ لینا چاہیے مگر گلو نے ساری تقریر سننے کے بعد صرف اتنا کہا۔

"چاچا تیرا علاج ضروری ہے۔ تو نے کبھی میری بات نہیں مانی' دن دن بھر دھوپ میں کھڑا دماغ تپاتا رہا' اب چپ چاپ یہاں پڑا رہ۔ ڈاکٹر کہیں گے تو گھر لے چلوں گا۔ کوئی پیسہ ویسہ خرچ نہیں ہو رہا تو اس کی فکر نہ کر.......... بس"

"پتہ نہیں اللہ تجھے عقل کب دے گا۔" چاچا نے نڈھال ہو کر خود کو بستر پر گراتے ہوئے کہا۔

"جتنی عقل دی ہے' وہی کافی ہے۔ اسی سے کام سے چل رہا ہے۔" گلو نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بخار تو نہیں ہے؟"

"نہیں.......... بس سر میں درد ہے' مجھے یہاں نیند نہیں آتی۔" پھر وہ گڑبڑا گیا غالباً اسے یاد آ گیا تھا کہ ابھی وہ آٹھ نو گھنٹے بعد جاگا ہے۔ "نیند تو آتی ہے پر چین سے نہیں آتی۔ نرس انجکشن لگاتی ہے تو آجاتی ہے اور گلو آدمی جب اپنی نیند سوتا ہے ناں تبھی چین آتا ہے۔"

"چاچا! تو نے کبھی میری بات نہیں مانی۔ اس بار مان لے۔" گلو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ملتجی انداز میں کہا۔

وہ کچھ دیر گلو کو دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

نازاں برتن دھو کر بچا ہوا کھانا بیڈ کے سرہانے رکھی ڈولی میں رکھ رہی تھی۔ اسی وقت ڈاکٹر راؤنڈ پر آ گیا۔ "کیسے ہو بابا؟" اس نے ہونٹوں پر جمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور آگے بڑھ کر اس کی نبض تھام لی۔

چاچا تو جیسے انتظار میں تھا۔ فوراً گھر جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اسے سمجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا کہ گھر کا سا آرام اسے کہیں نہیں مل سکتا۔ اسے علاج کی بھی ضرورت نہیں ہے' بخار اب اتر چکا ہے۔ سر میں درد دو گولیاں کھا کر ٹھیک ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

"یہاں کوئی تکلیف ہے آپ کو؟" ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا اور پھر اس کے بیڈ کے سرہانے رکھی فائل کو کھول کر پڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ آئی ہی نرس نے پھر انجکشن تیار کرنا شروع کر دیا۔ نازاں چاچا کی آستین اوپر کرنے لگی۔

"اور کیا.......... یہ دن میں چھتیس انجکشن لگائے گی تو تکلیف نہیں ہو گی کیا؟"

چاچا نے پھٹ سے کہہ ڈالا۔

"یہ انجکشن آپ کے لئے ضروری ہے' تھوڑی سی تکلیف تو ہو گی مگر بڑی تکلیف سے بچ جائیں گے۔" نرس نے ہنس کر کہا اور انجکشن کی سوئی اس کے سوکھے بازو میں گھسا دی۔

بابا ہم کوشش کرتے ہیں کہ یہاں سے آدمی بھلا چنگا ہو کر جائے۔" ڈاکٹر نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔

"میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔" چاچا نے سینہ پھلا کر کہا۔

"بس دو دن اور.......... پھر آپ گھر چلے جایئے گا۔" ڈاکٹر نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ وہ کمرے سے باہر جانے لگا تو گلو ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

"ڈاکٹر صاحب!" وہ لپکا۔

"جی؟" انہوں نے رک کر اس کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر صاحب' چاچا.........."

"دیکھو گلو! ابھی ہم انہیں گھر جانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں وہ نہیں کہہ رہا میں تو چاہتا ہوں' اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کاعلاج مکمل ہو مگر یہ کتنا لمبا ہو گا اور وہ ٹھیک ہو جائے گا ناں؟"

"گلو یہی دیکھنے کے لئے تو ہم انہیں یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بیماری سے بعض لوگ نارمل لائف گزارتے ہیں' بہت عرصے تک کھینچ لیتے ہیں مگر بعض اوقات مریض صرف چند دن میں ختم ہو جاتا ہے۔ تم نے کچھ دیر ضرور کی ہے مگر پھر بھی.......... اس کے بچنے کے کافی چانس ہیں۔ ہم برین ٹیومر کو پہلے شعاعوں سے ختم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیں گے اگر کوئی رزلٹ نہ نکلا تو پھر آخری علاج آپریشن ہے۔ ایک بات بتاؤں۔ سرکاری اسپتال ہے' یہاں شعاعوں کے علاج کا بندوبست نہیں ہے۔ اس کے لئے تمہیں پرائیویٹ کلینک جانا ہو گا اور پھر علاج ویسے بھی بہت مہنگا ہے۔"

"وہ کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر صاحب پیسوں کا بندوبست تو میں کرلوں گا۔ آپ بس جلدی سے کچھ کریں۔"

ڈاکٹر طمانیت سے مسکرایا تو نہ جانے کیوں گلو کو چاچا کی بات یاد آگئی جو اس نے ڈاکٹر کے آنے سے پہلے کہی تھی کہ ڈاکٹر لوگ پیسہ بنانے کے لیے خطرناک بیماری بتا دیتے ہیں۔

"ٹھیک ہے' تم بندوبست کرلو۔ فی الحال چند روز انہیں یہاں پر رکھو۔ ابتدائی علاج یہاں ہوتا رہے گا۔ جب ضرورت پڑے گی میں تمہیں اپنے پرائیویٹ کلینک کا ایڈریس دے دوں گا۔"

اور پھر جیسے ساری بات ہی گلو کی سمجھ میں آگئی۔ اسے یقین آگیا کہ چاچا ہی ٹھیک کہہ رہا تھا مگر وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اس ڈاکٹر کے کلینک میں دکھانے سے پہلے وہ کسی اور ڈاکٹر کو بھی دکھائے گا۔ کیا پتہ چاچا ہی صحیح کہہ رہا ہو۔ وہ کمرے میں لوٹ کر آیا تو چاچا کی پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ نازاں بینچ پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس کی آہٹ پاتے ہی وہ چونک اٹھی۔

"گلو! یار گھر لے چل مجھے.........." چاچا کی آواز میں بہت بے بسی تھی۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے یار۔"

"بس چاچا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دو تین روز کے بعد تم گھر جا سکتے ہو۔" وہ چاچا کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا۔ چاچا کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے مگر شاید

انجکشن نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان سی ہو کر ادھر ادھر پھسلنے لگیں' پلکیں بار بار گرنے لگیں اور پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے گہری نیند سو گیا۔

"میں گھر جاتا ہوں۔ تو اندر سے کنڈی لگا لے۔ سویرے آؤں گا۔" گلو نے دھیرے سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

نازاں نے کچھ کہا نہیں بس سر ہلا کر کھڑی ہو گئی۔

☆===========☆===========☆

گلو نے اندھیری گلی میں جب ٹیکسی موڑی تو بری طرح چونک اٹھا۔ رحمان چاچا اس کے گھر کے دروازے پر پریشان کھڑے تھے۔ گلو نے قریب پہنچ کر بریک لگا دیئے۔

"ارے گلو.......... گلو یار تم کہاں چلے گئے تھے یہ تمہارا چاچا اور نازاں کہاں گئے؟"

"آیئے چاچا رحمان! اندر آیئے۔" اتنا کہہ کر گلو نے جیب سے چابی نکال کر کواڑ کھولے۔ اس نے اسپتال میں نازاں سے چابیاں لے لی تھیں۔ رحمان چاچا مضطرب سے اس کے پیچھے آگئے۔ گلو سے ساری بات سن کر وہ پریشان ہو گئے۔

"وہ تو ہونا تھا.......... یہ ڈر تو مجھے تھا۔" وہ بڑبڑانے لگا۔ "پھر بھی بڑا سخت جان ہے۔ میں ہوتا تو کب کا مر چکا ہوتا۔"

وہ بار بار ہاتھ مل رہے تھے۔ انہوں نے گلو سے کہا کہ وہ سویرے اس کے ساتھ ہی اسپتال چلیں گے پھر وہ دیر تک گلو کو سمجھاتے رہے کہ اسے چاچا کی محبت کا اندازہ نہیں ہے۔ اسے ساری دنیا چھوڑ کر اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد رحمان چاچا اپنے گھر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی گھر کی ویرانی گلو کو خوفزدہ کرنے لگی۔ وہ حیرت سے سوچ کر رہ گیا کہ یہاں چاچا کو چین کی نیند کیسے آتی ہو گی۔

گلو نے چارپائی جھاڑی اور نڈھال ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا اچانک اسے کچھ یاد آگیا اور وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بالکل بھول گیا تھا۔ آج تو رات گیارہ بجے امام دین نے اسے بلایا تھا۔ اس نے کتنا انتظار کیا ہو گا۔ وہ بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا مگر اب تو شاید رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسے یاد آجاتا تو وہ تھوڑی دیر کو وہاں جا کر چاچا کے بارے میں تو بتا ہی سکتا تھا۔ پتہ نہیں امام دین نے کیا سوچا ہو گا۔ پتہ نہیں اسے کیا پتہ چلا ہو گا۔ گلو سوچتا ہی رہ گیا۔ "اللہ تو سب خیر کرنا" اس نے لرزتے دل سے دعا مانگی۔ چاچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ کوئی افتاد پڑنے پر اس کا مقابلہ کر پاتا۔ پھر وہ بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں سوچتا رہا۔ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ پچھلی ساری رات تو اس نے اسپتال میں جاگتے گزاری تھی دن میں بھی اسپتال اور سڑکوں پر ہی دوڑتا رہا تھا نیند تو آنا ہی تھی۔ نیند میں ڈوبتے ذہن میں آخری بات یہی تھی کہ وہ پہلے امام دین کے پاس جائے گا۔

صبح سویرے اگر رحمان چاچا اسے نہ جگاتا تو وہ جانے کب تک پڑا سوتا رہتا۔ وہ جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مار کر' اور کپڑے بدل کر باہر آ گیا۔ رحمان چاچا اپنی ٹیکسی کے ساتھ ہی اس کی ٹیکسی بھی کپڑے سے صاف کر چکے تھے۔ اسے شرمندگی ہوئی۔ "چاچا میں کر لیتا۔"

"ایک ہی بات ہے۔ چل جلدی کر' رات اس پریشانی میں گزاری کہ پتہ نہیں کیا ہوا ہے اور آج رات اس کی بیماری کا سن کر نہیں سو سکا۔" وہ اپنی ٹیکسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

گلو نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور پھر اسپتال کی طرف چل پڑا۔ پیچھے رحمان چاچا کی ٹیکسی تھی۔ گلو نے رحمان چاچا کو رات ہی بتا دیا تھا کہ وہ خان آفریدی کے پاس گیا تھا اور اس نے تنخواہ کاٹ لینے کی شرط پر اسے پانچ ہزار روپے بھی دیئے ہیں۔ رحمان چاچا نے یہ سن کر حیرانی کا اظہار کیا تھا کہ وہ گئے تھے مگر اس نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔ یہ تو خان آفریدی کا بڑا پن تھا کہ اس نے قرض دے کر اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا مگر رحمان چاچا کو افسوس اس بات کا تھا کہ کم از کم اسے بیماری کا تو بتا دیتا۔ گلو نے یہ کہہ کر انہیں تسلی دی تھی کہ شاید اس نے سمجھا ہو کہ آپ تو برابر میں رہتے ہیں' آپ کو تو علم ہو گا ہی۔ رحمان چاچا فوراً ہی مان گئے تھے۔

اسپتال میں چاچا اور نازاں اس کے منتظر تھے۔ گلو نے اسپتال کے باہر سے نازاں اور چاچا کے لئے کھانے کی چیزیں لے لی تھیں۔ رحمان چاچا نے بھی پھل خریدنے کی کوشش کی تھی مگر گلو نے منع کر دیا کہ ابھی بہت پڑے ہیں' چاچا وہ بھی کھانے کو تیار نہیں ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو چاچا ہشاش بشاش تھا۔ اس کے ساتھ رحمان چاچا کو دیکھ کر اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے رحمان چاچا

پھر گلو کو دیکھنے لگا۔

"فکر نہ کر.......... ہلکے پلڑے کا نہیں ہوں۔" رحمان چاچا نے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "یہ سب کیا کر لیا؟"

رحمان چاچا کی بات نے چاچا کو ایک دم ہی پُرسکون کر دیا تھا ورنہ اسے تو ڈر لگا تھا کہ کہیں رحمان چاچا نے جذبات میں آ کر گلو سے کچھ نہ کہہ دیا ہو۔

"چاچا! مجھے کام سے جانا ہے۔ جلدی واپس آؤں گا تم رحمان چاچا کے ساتھ ناشتہ کرو۔"

چاچا پوچھتا رہ گیا' ناشتے کو کہتا رہ گیا مگر گلو رکا نہیں۔ اسے امام دین کی فکر تھی پھر وہ صرف پندرہ بیس منٹ میں امام دین کے گیراج کی پچھلی گلی سے ہوتا ہوا اسی ٹین کے شیڈ تلے جا رکا جہاں کے لئے امام دین نے کہا تھا۔ اس نے وہاں رکتے ہی ہارن دیا۔ امام دین جو ایک پتھر پر بیٹھا سائلنسر ٹھیک کر رہا تھا' چونک اٹھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی امام دین نے جس طرح مین روڈ کی طرف دیکھا تھا اس نے گلو کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا نہیں اور شاید یہی امام دین چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔

"گلو! پچھلی طرف سے نکل کر تو قاسو کے ہوٹل پر چل' میں وہیں آتا ہوں۔" اس نے جھکے بغیر کہا اور گلو کا جواب سنے بغیر پلٹ کر واپس گیراج کی طرف چل دیا۔ گلو نے تیزی سے ٹیکسی ریورس کی اور چند ہی منٹ بعد وہ پچھلی سڑک پر بنے قاسو کے ہوٹل کے باہر اتر رہا تھا۔ اس نے ٹیکسی اس طرح کھڑی کی تھی کہ وہ ایک گاڑی کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ مین روڈ سے گزرنے والے کی نگاہ اس پر نہیں جا سکتی تھی۔ پتہ نہیں اس نے ایسا کیوں کیا تھا ورنہ کوئی اس ٹیکسی پر بھلا کیوں دھیان دیتا۔ یہ شاید اس کے اندر کا خوف تھا۔ وہ چابی جیب میں ڈالتا ہوا ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ اندر کافی رش تھا۔ لوگ ناشتہ کر رہے تھے اس نے اندر کی جانب نگاہ ڈالی۔ انتہائی دائیں جانب کونے والی میز پر دو آدمی تھے مگر لگتا تھا جیسے وہ اٹھنے ہی والے ہیں۔ ان میں سے ایک جیب سے پیسے نکال رہا تھا۔ گلو اسی طرف بڑھ گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ لوگ کھڑے ہوئے اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ گلو کرسی سرکا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین کا رویہ بڑا پُراسرار لگا تھا۔ "کوئی نہ کوئی عجیب بات ہوئی ہے۔" کوئی اندر ہی اندر گلو کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہاں صاحب!" اچانک الہ دین کے چراغ کے دیو ایسا ویٹر اس کے سر پر آ گیا۔

"دو چائے اور ایک کیک پیس۔" گلو نے جیب سے بیڑی نکالتے ہوئے کہا۔

اس نے ہونقوں کی طرح اس کے چاروں طرف دیکھا پھر ذرا جھک کر بولا۔ "کوپ بھی دو لانے ہیں؟"

"ہاں یار' میرا ساتھی آ رہا ہے۔" وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

ابھی ویٹر چائے لے کر پہنچا بھی نہیں تھا کہ اسے امام دین نظر آ گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اسی طرف چلا آ رہا تھا۔ جس جگہ گلو بیٹھا تھا وہاں سے گیراج کی طرف جانے والی گلی صاف نظر آتی تھی۔ اندر آ کر امام دین کی نگاہوں نے جلد ہی اُسے ڈھونڈ لیا۔ "کل کہاں رہ گیا تھا؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

گلو نے ساری بات بتائی۔

"اوہ یار یہ برین ٹیومر تو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔"

"یہ ہوتا کیا ہے؟" گلو نے اب تک ڈاکٹر سے یہ سوال اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اتنا جاہل ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ناسور ہوتا ہے۔" امام دین نے یوں اطلاع دی جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔ گلو اچھل پڑا۔

"کیا.......... کیا کہہ رہا ہے تو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ دماغ کا کینسر ہوتا ہے۔ اچھا چھوڑ' اس کا علاج تو ہو ہی رہا ہے۔" اس نے بلاوجہ ڈرامائی انداز اختیار کر لیا۔ "فتح نہ صرف یہ کہ زندہ ہے بلکہ آزاد بھی۔"

اس بار پھر گلو اچھل پڑا۔

"ابے کرسی توڑے گا کیا؟" امام دین نے تیز لہجے میں کہا۔ اسی وقت ویٹر چائے لے آیا۔ ساتھ کیک پیس دیکھ کر امام دین نے بڑا برا سا منہ بنایا۔ "میں نے ناشتہ نہیں کیا ہے اور میں ناشتے میں پراٹھا کھاتا ہوں۔"

گلو نے ویٹر سے پراٹھے کے لئے کہا۔ اس کے جاتے ہی امام دین بولا۔ "فتح آزاد ہے گلو! اور جانو ہی نہیں احسان اللہ بھی اس کا آدمی ہے۔ اسماعیل اس کا مخالف ہے۔ احسان اللہ کوئی کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ میں اسماعیل سے ملا تھا۔ میں نے اسے جو کہانی سنائی ہے اسے غور سے سن اور یاد رکھ۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ تو احسان اللہ کے پاس جا کر رہا تھا میرے کہنے پر' کیونکہ میں تجھے آزمانا چاہتا تھا کہ تو میرے کام کا بندہ ہے کہ نہیں۔ تو نے بڑا زبردست کام کیا ہے۔ احسان اللہ اور جانو کی باتیں سن کر پتہ چلا لیا ہے کہ گردیزی کی کوٹھی میں بم فتح نے رکھوایا تھا۔ اب احسان اللہ خود کو درمیان کا آدمی ظاہر کر کے اس سے ملنا چاہ رہا ہے اور یہ پروگرام بھی تو سن چکا ہے۔ میں نے یہ بھی بتا دیا کہ تیری بات سچی نکلی اور احسان اللہ میرے پاس اسی مقصد کے لئے آیا تھا کہ میں اسے اسماعیل سے ملوا دوں۔ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا کہ تو فتح کو مار کر بھاگا تھا۔ یہ اطلاع ان لوگوں کو مل گئی تھی اس کے بعد اسماعیل نے مجھ سے تیرے لئے بات بھی کی تھی۔ وہ تجھے اپنے ساتھ ملانے کو تیار ہیں۔ اب تجھے یہ بتانا ہے کہ میں نے تجھے احسان اللہ کے پاس بھیجا تھا مگر مقصد یہ تھا کہ تو ان کے بارے میں پتہ کرے۔ وہ تجھے ادر تو انہیں دھوکا دیتا رہا۔ تو نے ان پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ تو اس بات سے واقف ہے کہ وہ لوگ فتح کے آدمی ہیں۔ اب وہ تیرے الگ ہونے سے صرف اس لئے مطمئن ہیں کہ تو کسی پارٹی میں نہیں ہے۔"

"تجھے یہ سب کیسے پتہ چلا؟" گلو نے حیرت سے ساری داستان سنی پھر بولا۔

"اس کو چھوڑ دے۔" امام دین نے پراٹھا منہ میں ٹھونستے ہوئے جواب دیا۔

"اب گلو تو اچھی طرح سوچ لے۔ اسماعیل تجھے عیش کرا دے گا اور ویسے بھی اب تجھے پیسوں کی ضرورت پڑے گی۔ چاچا کا علاج تو بتا رہا تھا کہ بہت مہنگا ہے۔"

"ہاں ماہے.......... وہ میں تیرے پیسے لے کر آیا تھا مگر دینا بھول گیا اسی رات چاچا کو اسپتال لے جانا پڑا اور.........."

"بس۔" امام دین نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "وہ بات بھول جا۔ یار بات یہ ہے کہ اتنی زندگی میں شاید یہ پہلی نیکی ہوئی تھی اپن سے۔ اس کو تو کنویں میں سٹ ڈال۔ کیا پتہ یہی نیکی نجات پانے کا ذریعہ بن جائے۔ اچھا اب بول کیا کہتا ہے؟"

"ماہے سچ بات تو یہ ہے کہ بہت تھک چکا ہوں۔ جیسے ہوا میں معلق ہوں۔ سمجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ چاچا نیکی کے سبق دیتا رہتا ہے۔ زندگی دکھ دیتی ہے۔ لوگ موت بن جاتے ہیں تو دل کرتا ہے کہ سب کو چیر پھاڑ دوں۔ اتنی طاقت اور دولت حاصل کرلوں کہ کوئی میرے سامنے دم نہ مار سکے۔ یہ سب سوچ کر فیصلہ کرلیتا ہوں کہ تو سالا چاچا لوہے کی دیوار بن جاتا ہے۔"

"اچھا ایسا کر تو چپ چاپ میرے کہنے پر عمل کرتا رہ۔ میں ایسا چکر چلاؤں گا کہ چاچا بھی خوشی خوشی رہنے لگے گا اور تو بھی۔ تجھے جو کچھ چاہئے' ملے گا۔ یار یہ زندگی ہے۔ قدم قدم پر دکھ دیتی ہے۔ بندہ آنکھ کر کھول کر نہ چلے تو دنیا بھر کے دکھ پتھر بن کر راستے بند کر دیتے ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ زندگی ایک ہی مرتبہ ملتی ہے۔ کئی بار ملا کرتی تو میں اپنے ہر جنم کو بانٹ دیتا' ایک میں برائی کرتا' دوسرے میں نیکی' ایک کسی کے لئے قربان کر دیتا اور دوسرا اپنے لیے۔ پر ایسا تو ہوتا ہی نہیں۔ اچھا تو بتا! تیری زندگی کا کوئی تو مقصد ہوگا ناں؟ آخر تجھے اللہ نے کیوں پیدا کیا ہے؟ جس طرح تو زندگی گزار رہا ہے ایسے تو ہزاروں کلبلا رہے ہیں یار........ ابے مقصد پیدا کر مقصد۔ وہ اچھا ہو یا برا' آدمی بدکردار ہو یا باکردار' بس بے کردار نہ ہو۔"

"ماے!" گلو کے انداز میں حیرت تھی۔ "تو تو بالکل جانو کی طرح باتیں کر رہا ہے۔ پڑھے لکھوں جیسی۔"

"اس میں پڑھے لکھوں والی کون سی بات ہے۔ ابے زندگی گزارنا خود ایک علم ہے سالے اسکولوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ تو تاریخ ہوتا ہے حال کا تو آدمی کو زندگی ہی علم دیتی ہے۔ میں زندہ ہوں۔ زندگی گزار رہا ہوں میں نے جیسے لوگ دیکھے ہیں' جتنے دھوکے کھائے ہیں' جیسی ذلتیں اٹھائی ہیں اور اب جو میں نے اپنی کچھ نہ کچھ عزت بنالی ہے تو ان سب سے کچھ سیکھا ہے ناں! ہاں بس تیری طرح آنکھیں اور کان بند کر کے جینا اور بات ہے جیسے تو جیتا ہے۔ آنکھیں کھول کر جی۔ سب سیکھ جائے گا۔"

گلو حیرت سے منہ پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ امام دین پراٹھے کے بڑے بڑے نوالے لے رہا تھا۔ گلو نے چائے اور منگالی۔ پھر زیادہ گفتگو چاچا کی بیماری کے متعلق ہوئی۔ امام دین نے گلو سے کہا کہ اگر اسے پیسے کی اور ضرورت ہو تو بلا تکلف کہہ دے مگر گلو نے انکار کر دیا۔ یہی طے ہوا کہ چاچا کا مکمل علاج ضروری ہے۔ اس کی باتوں میں آئے بغیر گلو

سختی کرے اور اس کا علاج مکمل کرے۔ گلو کو اسپتال جا کر پھر دھندے کو نکلنا تھا۔ وہ امام دین سے رخصت ہوا تو شام کا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ اسے سات بجے پھر یہاں آنا تھا۔ امام دین اسی ہوٹل میں اس کا منتظر ہوتا۔ یہاں سے انہیں اسماعیل کے پاس جانا تھا اور وہاں سے بقول امام دین نئی زندگی شروع کرنی تھی۔

گلو ہوٹل والے کو بل دے کر باہر آگیا۔ امام دین کو گیراج کے قریب چھوڑ کر اس نے ٹیکسی اسپتال لے جانے کے لئے موڑلی۔ اگلی ہی سڑک سے اسے اسی جگہ کی سواری بھی مل گئی۔ وہ اسپتال میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ ضرورت کی چیزیں دے کر نازاں کو چاچا کا خیال رکھنے کی تاکید کرنے کے بعد وہ رات کو آنے کا کہہ کر اٹھ گیا۔ رحمان چاچا کافی دیر بیٹھ کر گئے تھے۔ چاچا کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی اس نے گلو سے پھر گھر جانے کی رٹ لگا دی گلو نے حسب سابق اسے چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکی دی کہ اگر وہ اب اس کی بات نہیں مانا تو وہ یہ شہر ہی چھوڑ کر چلا جائے گا۔ پھر اس کا جو جی چاہے کرے۔ اس بار چاچا کسی لڑاکا مرغ کی طرح نہیں بولا بلکہ چپکے سے بستر پر لیٹ گیا۔ علاج سے اسے فائدہ ہو رہا تھا اس کا خود چاچا کو احساس تھا۔

گلو نے اس روز اچھی خاصی کمائی کرلی۔ شام کو اسے امام دین کے پاس جانا تھا اور اس کا حلیہ ہی نہیں حالت بھی کافی خراب تھی۔ بدن میں شدید درد تھا۔ تھکن اور نیند نے آنکھوں کے گرد حلقے بنا دیئے تھے۔ وہ شام چھ بجے ہی گھر چلا آیا۔ کپڑے نکال کر وہ نہانے چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو آدھ گھنٹے کے لئے بستر پر ڈھے گیا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد وہ اٹھ کر باہر آیا۔ اب اس کی حالت اور حلیہ قدرے بہتر تھا۔ ٹیکسی نکال کر امام دین کے گیراج کی طرف چل دیا۔ ایک نہ معلوم سا احساس تھا جس نے اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کے مضمحل سے احساس کو دبا دیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آج کسی نئے سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔ کسی ایسے سفر پر جس کی اسے خوشی ہے۔ آج اس کے اندر کوئی سرگوشی نہیں ابھری۔ آج نہ اسے دانیال گردیزی کی کوٹھی میں ہونے والے دھماکے کا خیال آیا تھا نہ جیل کی سلاخوں نے خوف دلایا تھا' نہ فتح کو زخمی کرنے والا واقعہ یاد آیا تھا آج اسے صرف چاچا کی بیماری یاد تھی یہ خیال تھا کہ آپریشن کے لئے بہت زیادہ پیسہ چاہیے ہوگا۔ یہ احساس تھا کہ گھر میں چاچا کو آرام نصیب نہیں ہو سکتا اور جہاں وہ داخل ہے وہ سرکاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسپتال ہے جہاں کسی بھی صورت اس کی دیکھ بھال اور مناسب علاج ممکن نہیں۔ ڈاکٹر پرائیویٹ کلینک میں آپریشن کرنا چاہتا ہے اور بس............

وہ ٹھیک سات بجے قاسو کے ہوٹل پہنچ گیا۔ امام دین ابھی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ وہ باہر ٹیبل پر بیٹھ کر امام دین کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے چائے منگوا لی ابھی وہ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا کہ امام دین پہنچ گیا۔ گلو نے جلدی سے چائے کا بڑا گھونٹ حلق میں انڈیلا اور کاؤنٹر پر پیسے ادا کرکے ٹیکسی کی طرف چلا آیا۔ امام دین ٹیکسی کے پاس ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ تقریباً پون گھنٹے کے بعد ہی وہ ڈیفنس جانے والی چوڑی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔

”گلو تو دل سے چل رہا ہے ناں! میرا مطلب ہے کہ کوئی زبردستی تو نہیں ہے ناں؟“

”کیسی زبردستی؟“ گلو نے الٹا سوال کر دیا۔

”نہیں میرا مطلب ہے کہ کل تو پھر رٹ لگانے لگے کہ وہ............ کیا ہوتا ہے آدمی کے اندر............ وہی یار ضمیر و میر............ وہ تجھے ملامت کر رہا ہے۔ میں نے تجھے اچھی زندگی گزارنے کا ایک طریقہ بتایا تو اپنے طور پر جتنی گزار چکا ہے اس میں دیکھ چکا ہے کہ لوگ استعمال کرتے ہیں' اپنا کام نکالتے ہیں اور دھتکار دیتے ہیں۔ دنیا میں دو ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک بے وقوف جو استعمال ہوتے ہیں اور دوسرے چالاک جو بے وقوفوں کو استعمال کرتے ہیں۔ تو استعمال ہو چکا ہے اب اپنا کردار بدل لے۔ پھر دیکھ یہ دنیا تیرے لئے کیا ہو جائے گی۔“

===========☆===========☆

☆ ہماری دیگر مطبوعات ☆

ایم اے راحت

O نایاب		۱۰۰/=
O احساس		۸۰/=
O وحشت کدہ		۱۲۰/=
O آسیب		۱۶۰/=
O سوکھے گلاب		۱۸۰/=
O کھلاڑی		۲۲۵/=
O سرفروش	(دو جلدیں)	۳۲۰/=
O راز داں	(دو جلدیں)	۳۰۰/=
O سامون	(تین حصے)	۱۳۵/=
O سمندر کا بیٹا	(تین حصے)	۱۲۰/=
O جھرنے	(تین حصے)	۱۵۰/=
O باغی	(دو حصے)	۸۰/=
O شہ زور	(دو حصے)	۱۰۰/=
O ہمالیہ	(چار حصے)	۲۰۰/=
O بساط	(چار حصے)	۲۰۰/=
O پارس		۴۵/=
O پرواز		۴۵/=
O خون آشام		۵۰/=

علیم الحق حقی

O عشق کا عین	۱۳۰/=
O شناخت	۲۰۰/=
O اماوس کا دیا	۱۵۰/=
O ببول	۱۵۰/=
O پرماتما	۱۶۰/=
O تاش کے پتے	۱۵۰/=
O ہٹلر کی واپسی	۱۳۰/=
O آنکھوں میں دھنک	۸۰/=
O میر کارواں	۸۰/=
O کلاکار	۱۰۰/=
O برف کے باٹ	۱۰۰/=
O انسانی قیامت	۱۰۰/=
O زندان نامہ	۱۰۰/=
O طوفان کے بعد	۱۵۰/=

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: ۷۲۴۷۴۱۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوری آنکھوں سے ٹپکتے آنسوؤں کی دلگداز داستان

- ایک نوجوان کی داستان الم جس نے خواب دیکھے اور انہیں اپنی کوری آنکھوں میں سجالیا مگر.........
- ایسے لوگوں کی کہانی جو خواب دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے۔
- ایک بے حیثیت شخص کی کہانی۔ وہ محبت کا چلتا پھرتا تاج محل تھا۔
- ایثار اور بے لوث محبت کی ایسی داستان جو آپ کی جذباتی دنیا میں زلزلے برپا کردے گی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

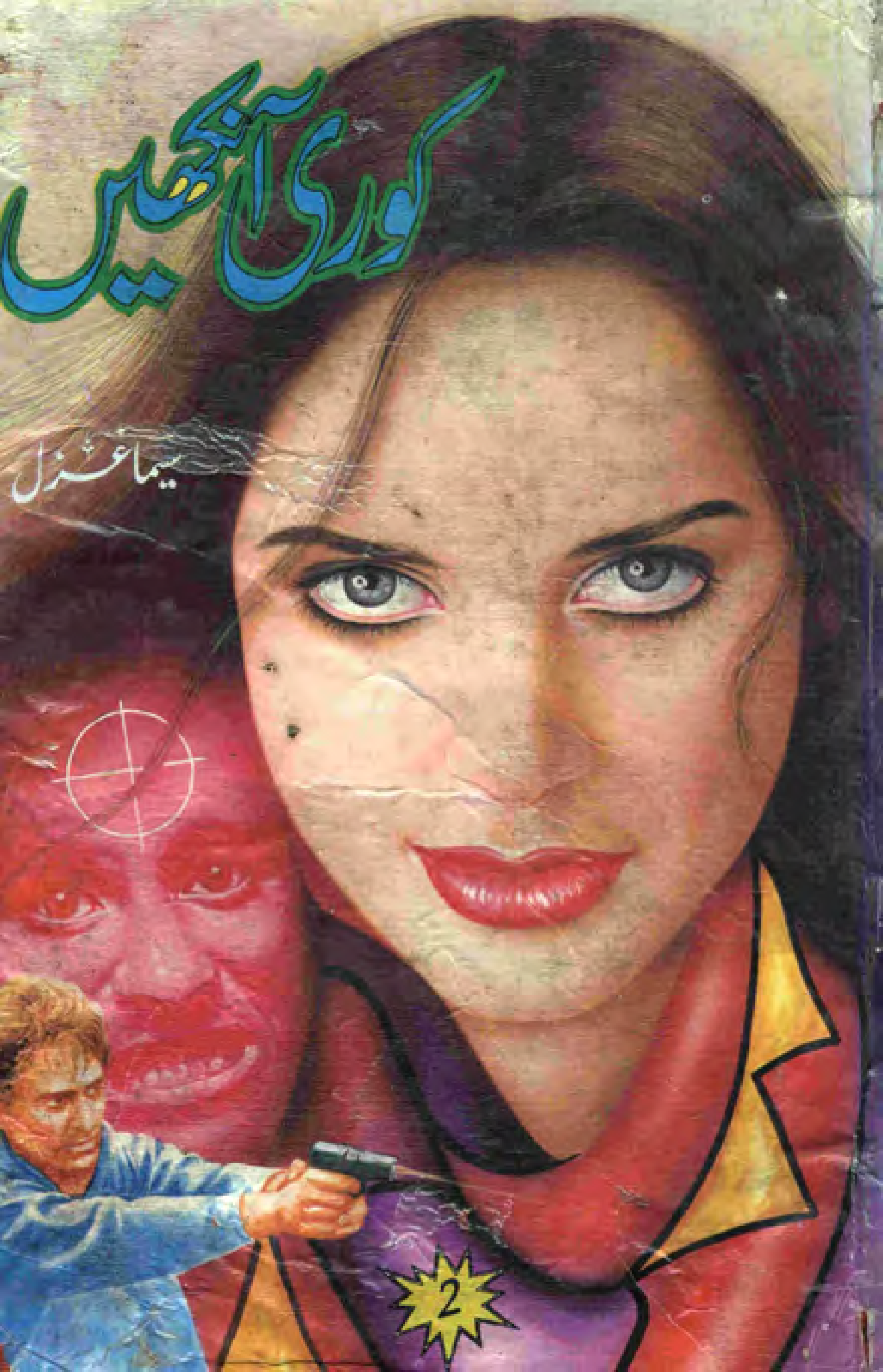

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین اپنے اندر شاید کسی قسم کی الجھن محسوس کر رہا تھا ممکن ہے اسے دوستی کے تقاضے نے کچھ کچوکے دیئے ہوں یا آنے والے حالات کی کچھ واضح تصاویر اس کے ذہن میں ہوں۔ آنے والے خطرات اسے خوفزدہ کر رہے ہوں۔ بہرحال اگر وہ یہ سب خود کو یا گلو کو تسلی دینے کے لئے کر رہا تھا تو بیکار ہی کر رہا تھا۔ فیصلے کے بعد ایک سکوت گلو پر طاری ہو چکا تھا۔ اس کے اندر نہ کوئی الجھن تھی' نہ خدشہ' نہ اندیشہ نہ خوف۔ وہ بیزاری سے اس کی گفتگو سنتا رہا پھر بولا۔ "اسماعیل کوئی چالاکی تو نہیں کرے گا؟" لمحہ بھر کو چونک اٹھنے والا امام دین ایک دم خوش ہو گیا۔ جیسے گلو نے اس کی خواہش کے عین مطابق رویہ اختیار کر لیا ہو۔ "ارے نہیں یار' وہ اس معاملے میں بڑا کھرا بندہ ہے۔ ہر برے آدمی کا ایک بڑا زبردست کردار ہوتا ہے۔ مضبوط' وعدہ پورا کرنے والا اور جان تک کی پروانہ کرنے والا۔ وہ قول کا پکا ہے' نہ چالاکی کرتا ہے' نہ چالاکی برداشت کرتا ہے۔ تو کچھ عرصہ اس کے ساتھ رہے گا ناں تو............ تو مجھے بھول جائے گا۔"

اور گلو خاموش رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بولا۔ "ویسے امام دین............ یہ لوگ کون ہیں............ کیا کرتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں' مجھے صرف اتنا بتا دے۔"

"یار میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہر وہ کام کرتے ہیں جو عام لوگ نہیں کر سکتے۔ بعض سیاسی پارٹیوں کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔ اسمگلروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ تو نے کبھی ڈرگ مافیا کا نام سنا ہے؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"اسی لئے تجھ سے کہتا ہوں کہ اس چکر میں مت پڑ............ تجھے کیا' وہ کچھ کرتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔ جو کام تجھ سے لیں گی اس کا اتنا معاوضہ دیں گے کہ تیرے وارے نیارے ہو جائیں۔ فتح بھی وہی کرتا تھا۔ میں تیرے سوالات کا جواب نہیں دے سکتا یار' میں کون سا افلاطون ہوں.........." وہ جھلا گیا۔

اتنی ہی دیر میں سامنے موڑ آ گیا۔ امام دین نے اس سے سیدھے ہاتھ کو لمبی چوڑی سڑک پر مڑنے کو کہا۔ گلو موڑ کاٹتے ہی اسماعیل کی کوٹھی پہچان گیا۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر دانیال گردیزی کی سرخ اینٹوں والی کوٹھی کا ملبہ اب بھی اسی حالت میں پڑا تھا۔ لمحہ بھر کو.......... صرف لمحہ بھر کو گلو کی آنکھوں میں دھند چھائی۔ جانو کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں کہ وہ کوٹھی گلو کے رکھے ہوئے بم سے نہیں بلکہ خود فتح کے رکھے ہوئے بم سے تباہ ہوئی تھی۔ ساتھ ہی جانو کا کردار بھی سامنے آ گیا اور اسے لگا جیسے اس نے ساری باتوں کی طرح یہ بھی جھوٹ بولا ہو۔ وہ کوٹھی اسی کے رکھے ہوئے بم سے تباہ ہوئی تھی اور یوں وہ ان معصوم بچوں اور ان کے ماں باپ کا قاتل ہے جو دانیال گردیزی کے ملازم تھے۔ اس سے قبل کہ وہ دھند شدت اختیار کرتی اسماعیل کی کوٹھی کا گیٹ قریب آ گیا۔ چوکیدار شاید انہی کا منتظر تھا' اس نے قریب آ کر ٹیکسی میں جھانکا۔ امام دین کو تو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ الٹے قدموں واپس ہوا اور گیٹ کا پھاٹک کھول دیا۔

گلو ٹیکسی اندر لیتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ کوٹھی کے اندر کاریڈور سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ "آؤ امام دین میں تمہارا ہی منتظر تھا۔" وہ غالباً اسماعیل ہی تھا' امام دین نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے چہرے پر عقیدت اور انکساری چھا گئی تھی۔ اسماعیل اس کے شانوں کے اوپر گلو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ امام دین کو جلدی احساس ہو گیا۔

"اسماعیل صاحب! یہ ہے گلو!"

اسماعیل پینتالیس اور پچاس کے درمیان ہو گا مگر اس کا صحت مند جسم' چمکتا چہرہ اور کنپٹیوں کے سفید بال اسے باوقار بنائے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر گلو سے ہاتھ ملایا اور اس کا ہاتھ تھامے صوفے تک چلا آیا۔ گلو پر ایک سحر سا طاری تھا۔ یہ سحر اس کی شخصیت سے زیادہ اس کے کمرے کی آرائش و زیبائش کا تھا۔ دبیز قالین' خوبصورت اور

قیمتی بھاری پردے' دیواروں پر آویزاں بڑی بڑی سینریز' چھت پر لٹکے ہیروں جیسے فانوس جن میں جلتے بلب کی روشنیاں منعکس ہو کر چاروں طرف کی دیواروں کو عجیب خواب ناک سا بنائے ہوئے تھیں۔ قیمتی صوفے' شیشے کی میزیں' ان پر رکھے شیشے کے گلدان اور جانے کیا کیا تھا جو گلو نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ ایک ہلکی سی' موسیقی کی لے تھی جو پتہ نہیں کہاں بجائی جا رہی تھی' اس کی آواز جیسے ہوا کے دوش پر اڑتی پھر رہی تھی اور پورا کمرا خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ اسماعیل کو کم اور چاروں جانب زیادہ دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب کچھ.......... میں نے بڑی مشکلوں کے بعد حاصل کیا ہے گلو!" اسماعیل شاید اس کے اندر کی کیفیات جان چکا تھا۔ "میں نے بھی زندگی ایک جھونپڑی سے شروع کی تھی۔ میں گاؤں سے کراچی کمانے کے لیے آیا' برسوں سڑکوں پر جوتے چٹخائے۔ ایک کچی بستی میں چھپر ڈال کر جھونپڑی بنائی۔ وہاں اونچے محلوں کے خواب دیکھتا رہا' کچھ زنجیریں توڑ کر آیا تھا کچھ پاؤں میں خود باندھ کر لایا تھا۔ اسی زنجیر کو زندگی مانتا تھا مگر یہاں آ کر احساس ہوا کہ یہ زنجیر زندگی نہیں موت ہے۔ زندگی تو صرف پیسہ ہے۔ دولت.......... بے پناہ دولت' سو وہ زنجیریں توڑ ڈالیں۔ بلکہ ایک گہری سیاہ رات کو جب انکشاف ہوا کہ وہ زنجیر اپنا حلقہ بڑھا رہی ہے' تبھی وہ زنجیر کاٹنے کا عہد کر لیا اور پھر اس سے پہلے کہ زنجیر کا دوسرا حلقہ میرے دوسرے پاؤں پر پڑتا' میں نے ایک اور بھیانک' طوفانی رات کو وہ بستی چھوڑ دی۔ پھر میں کن راستوں سے گزرا' کہاں کہاں ٹھہرا یہ ایک سنسنی خیز' دہشت انگیز اور اذیت ناک کہانی ہے مگر اپنی منزل پا لی۔ ایک سیاہ رات میں کیا جانے والا فیصلہ میری زندگی میں ایسی صبح اور ایسا اجالا لے کر آیا کہ میں نے اپنے سارے خوابوں کی تعبیر پا لی۔ اب پلٹ کر اپنی پچھلی زندگی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو.......... تو خود سے ہی شرم آتی ہے۔ ایک ایسی ہی صبح اور ایسا ہی اجالا تمہارا بھی منتظر ہے گلو.......... مجھے یقین ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے.........." آخری جملہ کہتے ہوئے اس نے گلو کا ہاتھ دبایا۔ یہ دباؤ بڑا پُرخلوص اور محبت آمیز محسوس ہوا۔ وہ اب بھی سحر زدہ سا بیٹھا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسماعیل اپنی کہانی نہ سنا رہا ہو' خود اس کی کہانی سنا رہا ہو' ماضی کی بھی اور مستقبل کی بھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں.......... زندگی چاہتا ہوں سر! دولت بھی، سکون بھی۔ سب کچھ چاہتا ہوں۔ میں آپ کا ساتھ دینے ہی کے لئے آیا ہوں۔ یہاں تک آنے اور فیصلہ کرنے میں، میں بھی بڑی اذیت سے گزرا ہوں۔" گلو نے دھیمے، خواب آلود سے لہجے میں جواب دیا۔

"گڈ.......... ویری گڈ.......... مجھے تم پسند آئے، جو لوگ فیصلہ کر لیتے ہیں، فیصلے کے لمحات کی خوشی اور اذیت کو محسوس کر کے بھی اس فیصلے پر قائم رہتے ہیں۔ وہ بڑے جری ہوتے ہیں گلو! پھر راستے کی مشکلیں موم بن کر پگھل جاتی ہیں۔ پہلا قدم اٹھاتے ہوئے تو بچہ بھی گھبراتا ہے۔"

اس نے بات ختم کی تو ملازم شیشے کی ایک ٹرالی لئے اندر داخل ہوا جو چائے کے برتنوں اور کھانے پینے کی کئی چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔ انہوں نے چائے پی گلو اب بھی سحر زدہ سا بیٹھا سوچ رہا تھا کہ زندگی وہ ہے جو وہ گزار رہا ہے یا یہ..........؟

پھر گلو، امام دین اور اسماعیل باتیں کرتے رہے، ان کے درمیان عام باتیں ہوئیں۔ نہ کسی کام کا ذکر آیا، نہ کسی خوفناک واقعے کا۔ جب امام دین نے اسماعیل سے اجازت لی تو اس نے مزید بیٹھنے پر اصرار کیا تبھی امام دین نے اسے گلو کے چاچا کی بیماری اور اسپتال میں داخل ہونے کے بارے میں بتایا۔ اس نے گلو سے اس کی بیماری کے بارے میں پوچھا۔ اسے تسلی دی۔ ایک کارڈ دیا اور اسے کہا کہ وہ اگلے ہی روز اس کارڈ پر دیئے گئے پتہ پر چلا جائے۔ وہ کسی دماغ کے ماہر ڈاکٹر کے کلینک کا پتا تھا۔ اسماعیل نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ علاج اور آپریشن کے خرچے کے سلسلے میں قطعی پریشان نہ ہو۔ یہ سب کچھ وہ خود کرے گا مگر گلو ڈر گیا۔

"نہیں سر! میرا چاچا الٹے مغز کا آدمی ہے۔ وہ کبھی تیار نہیں ہوگا۔"

تب امام دین نے مختصراً اس کی سوچ کے بارے میں بتایا کہ گلو ایسے آدمی کو کنویں کا مینڈک بنانے والا وہی چاچا ہے۔

"ٹھیک ہے، تب ایک کام کرو۔ تم جہاں بھی علاج کرانا چاہو کرا لو۔ جس طرح بھی وہ چاہے، اور یہ.......... یہ رکھ لو۔" اسماعیل نے پاس رکھے بریف کیس کو کھول کر نوٹوں کی ایک گڈی گلو کے حوالے کر دی۔

اتنے نوٹ دیکھ کر گلو کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے جبکہ امام دین کی آنکھوں میں جیسے تراوٹ اتر گئی۔ اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ جانتا تھا کہ گلو اس وقت پیسوں کے لئے کتنا پریشان ہوگا۔ خود اس کے پاس تھوڑی بہت تو رقم تھی جو وہ ضرورت پڑنے پر اسے دے سکتا تھا مگر اتنی نہیں تھی کہ جس سے گلو کی ساری پریشانی جڑ سے ہی ختم ہو جاتی۔ "مگر.......... یہ تو.........."

"گلو رکھ لو.......... یہ ہمارے تمہارے معاہدے کی پہلی شرط ہے جو مجھ پر عائد ہوتی ہے اور اسے میں پورا کر رہا ہوں بلکہ خوش ہوں کہ بروقت پورا کر رہا ہوں۔"

گلو تو شاید پھر انہیں واپس لینے پر اصرار کرتا مگر امام دین نے فوراً شکریہ ادا کیا اور رخصت چاہی۔ "ٹھیک ہے، انشاء اللہ پھر ملیں گے اور گلو فی الحال تم پوری توجہ سے چاچا کا علاج کرا لو۔ فرصت مل جائے تو آ جانا، ورنہ پریشان نہ ہونا۔ تم امام دین سے تو ملتے ہی رہتے ہو ناں! کوئی پروگرام مل بیٹھنے کا بن گیا اور تم فارغ ہوئے تو یہ تمہیں بتا دے گا.......... فی الحال اس رقم کو مصرف میں لا کر اپنی پریشانیاں دور کرو۔ ضرورت پڑے تو بلا تکلف چلے آنا یا امام دین سے کہلوا دینا بلکہ میں آؤں گا تمہارے چاچا کو دیکھنے۔"

اور آخری جملہ اسے یوں لگا جیسے بچھو کا ڈنک.......... وہ گھبرا گیا۔ "نہیں سر.......... اس کی ضرورت نہیں ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ زحمت نہ کریں۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے یار!"

"بات یہ ہے کہ سر وہی بات ہے.......... چاچا بدک جائے گا اور پھر گلو کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، وہ کچھ کرنے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔" امام دین نے گلو کی مشکل حل کر دی۔

"اوہ.......... اچھا اچھا.......... ہوتے ہیں بعض لوگ ایسے......." اسماعیل فوراً سمجھ گیا۔ "کوئی بات نہیں۔ اب اسے زندگی بھر ہوا نہیں لگے گی کہ میں کون ہوں اور ہوں بھی کہ نہیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

گلو خجل سا ہو گیا۔ چاچا کی وجہ سے وہ کافی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ لوگ رخصت ہوئے۔ اسماعیل مین گیٹ تک ان کے ساتھ آیا اور جب تک گلو کی ٹیکسی مین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روڈ کی طرف نہیں چل پڑی وہ کھڑا رہا۔

☆==========☆==========☆

"عیش ہو گئے تیرے تو۔" سڑک پر پہنچتے ہی امام دین نے گلو کی کمر پر دھپ جمایا۔

"امام دین! یہ پیسے لے' اس میں سے اپنے پیسے نکال لے۔" گلو نے جیب میں ٹھسی ہوئی گڈی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

"اس میں میرے پیسے نہیں ہیں' صرف تیرے ہیں۔" امام دین نے گڈی پھر اس کی جیب میں ٹھونس دی۔

"میرا مطلب ہے کہ جو پیسے تجھ سے لئے تھے۔"

"ابے یار' پھر وہی.......... میں نے کہا تھا کہ مجھے ایک نیکی کرنے دے یار.........." اس نے یار کو کھینچ کر کہا اور ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچنے لگا۔ منہ ایسا بنا لیا کہ گلو بے ساختہ ہنس پڑا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر سے ابل پڑنے والی ہنسی بہت اجنبی سی تھی۔ بہت کھنک دار بڑی پُررونق سی' تبھی اس کا جی چاہا کہ وہ زور زور سے قہقہے لگائے۔ بہت ہنسے.......... ہنستے ہنستے لوٹ جائے۔ اس کے جبڑے دکھنے لگیں' اس کے پیٹ میں درد ہونے لگے اور اس کی ہنسی نہ رکے۔ دل واقعی ہنسنے لگا۔ ہنسنے کا بہانہ تو مل ہی گیا تھا۔ وہ ہنستا چلا گیا۔ پہلے تو امام دین بھی ہنس دیا مگر جب کافی دیر تک گلو کی ہنسی نہ تھمی تو امام دین نے گہری نگاہوں سے گلو کو دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ٹیکسی کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ ہاتھ اسٹیرنگ سنبھال نہیں پا رہے تھے۔

"گلو!" امام دین نے گھبرا کر کہا۔ گلو نے ہنستے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "بس کر یار۔ اتنا ہنسنا اچھا نہیں ہوتا۔"

پتہ نہیں اس کے لہجے میں کون سا خوف' کیسی دھمکی تھی کہ وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ اس نے وہیں قریب ہی ایک بہت بڑے کولڈ اسپاٹ کے باہر ٹیکسی روک دی۔

"ٹھنڈا پیئے گا؟" اس نے مسکرا کر امام دین سے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔"

سفید وردی میں لڑکا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دو کوک کی بوتلوں کا آرڈر دے کر

وہ امام دین کی طرف پلٹا۔ "نہ ہنسی اچھی ہوتی ہے اور نہ غم.......... برسوں بعد ہنسا ہوں اور.......... جانتا ہوں کہ ہنسی اچھی نہیں ہوتی.......... میں ان قہقہوں کی وہ گونج سننا اور محسوس کرنا چاہتا تھا جہاں سے غم شروع ہوتا ہے مگر.......... مجھے ایسا کہیں محسوس نہیں ہوا۔ آئندہ مجھے کبھی مت ٹوکنا.........."

امام دین حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا.......... لڑکا کوک کی بوتلیں لے آیا اور عین اسی وقت ایک گاڑی برابر میں آ کر رکی۔ لمحہ بھر کو گلو کی نگاہ اس گاڑی کی طرف اٹھی اور دوسرے ہی لمحے کوک کی بوتل اس کے ہاتھ سے پھسل کر اس کی گود میں جا گری۔

ایک لمحے کو.......... صرف ایک لمحے کو اُسے یوں لگا تھا کہ جیسے وہ گاڑی استاد فتح کی ہو.......... لیکن دوسرے ہی لمحے اُس کا شک سگریٹ کے دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ برابر میں آ کر رکنے والی گاڑی سفید ضرور تھی مگر استاد فتح کی ہرگز نہیں تھی۔

حیرت اور دہشت کا وقتی دھچکا اتنا شدید تھا کہ وہ کچھ دیر یوں ہی ساکت و صامت بیٹھا رہا۔ گود میں گرنے والی بوتل سے بہتی کوک جب کپڑوں سے گزر کر بدن تک پہنچی تو اس کا ٹھنڈا لمس اُسے واپس حقیقت کی دُنیا میں کھینچ لایا۔ اُس نے چونک کر قمیض کے دامن پر نگاہ ڈالی جہاں ابھی تک بوتل کی گیس کے بلبلے پھوٹ رہے تھے۔

"لعنت ہے۔" وہ بڑبڑایا

"ابے تو مضبوط گرفت رکھنی تھی نا۔" امام دین نے کہا۔ "تجھے کس نے کہا تھا گیلی بوتل پر ڈھیلے ہاتھ ڈال۔"

"ہوں.........." گلو کو شاید اُس کی طرف سے کسی تبصرے کو توقع نہیں تھی۔

"ہاں.......... شاید بے دھیانی میں.........."

"کسی دن بے دھیانی میں تو سانس لینا بھول جائے گا۔" امام دین نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "میرا خیال ہے اب گھر چلتے ہیں۔"

"نہیں یار۔ ابھی تھوڑا سا اور گھومتے ہیں۔ اطمینان سے چلے چلیں گے۔" گلو نے انگڑائی لی۔

"میں گیراج واپس جانے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" امام دین نے بوتل خالی کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے سفید وردی والے لڑکے کو تھما دی۔ "مجھے آج گھر جانا ہے۔"

"ابے چھوڑ یار۔ تیرا وہاں کون انتظار کر رہا ہے!" گلو ٹیکسی کے فرش پر گری بوتل اٹھانے کے لئے جھکا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" امام دین نے بناوٹی غصے سے کہا۔ "ہمارا راہ بھی کوئی دیکھتا ہی ہے۔"

گلو لڑکے کو پیسے دیتا دیتا رک گیا۔ اُس نے امام دین کی طرف ایک حیرت بھری نظر ڈالی پھر رفتہ رفتہ اُس کی حیرت مسکراہٹ میں تبدیل ہو گئی۔

"کون ہے وہ؟" اُس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہے کوئی.........." امام دین نے بے نیازی ظاہر کی۔ "تجھے اس سے کیا؟"

"تجھے اس سے کیا؟" گلو نے اُس کی نقل اتار دی۔ پھر ایک آنکھ دبا کے بولا۔ "چکر کیا ہے استاد؟"

"دیکھ گلو۔" امام دین گھبرا گیا۔ "جو تو سمجھ رہا ہے ویسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"یار.......... وہ ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے۔" امام دین صفائی پیش کرنے لگا۔ "ماں باپ اُس کے بچپن میں گزر گئے۔ پھر ماموں اور ممانی نے اُسے رکھ لیا.......... اُس کی ممانی ہمیشہ اُس سے اڑی کرتی تھی.......... حالانکہ ممانی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی پھر بھی.......... ماموں کا سالا بھی اُس سے الٹی سیدھی باتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک نمبر کا بدمعاش تھا سالا۔ کچھ عرصے پہلے ممانی کو اُس کی موت نے آ پکڑا۔ وہ یرقان میں مرگئی تھی پھر ماموں بھی فالج کے حملے میں مرگیا اور اب وہ سالا.......... وہ بھی مارا گیا۔ اب وہ بالکل اکیلی ہے۔ میں اس کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہوں مگر میری ہمت نہیں ہوتی کہ میں.......... میں اس سے شادی کی بات کروں اور یار.......... تُو تو جانتا ہے کہ اپن کا کوئی ہے ہی نہیں جو.........."

"میں جو ہوں ماے.......... اگر تو نے یہ سب کچھ بتایا ہوتا تو اب تک تو میں تیری شادی کروا بھی چکا ہوتا۔"

امام دین نے چونک کر گلو کی طرف دیکھا۔ "تو..........؟"

"ہاں.......... چل ابھی چل.......... میں ابھی یہ معاملہ نمٹا دیتا ہوں۔"

"نہیں.......... ابھی چھوڑ۔ اب تو وہ سو چکی ہو گی اور تجھے بھی تو اسپتال جانا ہے ناں!"

گلو چونک اٹھا۔ کافی رات ہو گئی تھی۔ اسے واقعی اسپتال جانا تھا۔ اس نے گاڑی موڑلی۔

"یار گلو! ہم لوگوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ خوشی دیکھی نہ پیار نہ شفقت۔ رشتوں میں کتنی کشش ہوتی ہے' یہ جانتے ہیں مگر رشتے بنالینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ جو رشتے پیدا ہونے والے بچے کی بند آنکھوں میں قید ہوتے ہیں اور بند مٹھی میں چھپے رہتے ہیں۔ وہی تو سچے ہوتے ہیں ناں! جب ہمیں رشتوں کی وہی سچائی نہ مل سکی تو بھلا خود جوڑنے والے رشتوں میں کیسے مل سکتی ہے؟ اور تو' تو پھر خوش قسمت ہے کہ ایک باؤلا بڈھا مل گیا جو کسی نہ کسی ناتے تجھے چاہتا تو ہے۔ میں تو رشتوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو سیلاب میں بہتی لاشوں کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ میرے سارے رشتے اسی سیلاب میں بہہ گئے۔"

امام دین بہت دکھی ہو رہا تھا۔ گلو نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں گلو نے پہلی بار نمی دیکھی تھی۔ "ماے.......... جو رشتے آدمی جوڑ لیتا ہے' کشش اس میں بھی ہوتی ہے اور جو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں وہ دل میں چھید کر دیتے ہیں۔ اس کے باوجود سچائی ہر رشتے میں ہوتی ہے۔ چاچا میرا کوئی نہیں ہے پھر بھی میرے لئے تڑپتا ہے۔ میں اس کے خلاف کسی سے کچھ نہیں سن سکتا اور وہ نازاں.......... وہ بھی تو ہماری کوئی نہیں ہے ماے.......... ہم سب وہ لوگ ہیں جن کا کوئی اور نہیں ہے' کوئی بھی نہیں.......... اور جن کا کوئی نہیں ہوتا وہ کسی نہ کسی کی تلاش میں رہتے ہیں.......... ہمیشہ.......... بے سوچے سمجھے کسی نہ کسی کو اپنا لینے کا جنون ہوتا ہے انہیں۔ اگر.......... سکینہ کا کوئی نہیں ہے تو وہ بالکل تیری ہی ہو جائے گی ماے.......... اسے اپنا لے۔"

"یہی تو بات ہے گلو! یوں لگتا ہے جیسے اس کا کوئی ہے.......... کہیں پر ہے کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس کی اسے تلاش ہے اور جب کسی کا کہیں پر کوئی ہوتا ہے تو وہ کسی کا بھی نہیں بن پاتا۔ ہمیشہ ٹوٹا بکھرا اور الجھا رہتا ہے۔ میں منتظر ہوں گلو کہ اس کا وہ کھویا ہوا شخص مل جائے اگر اس سے ملنے کے بعد بھی وہ میرے پاس آگئی تب تو وہ.......... وہ بالکل میری ہو گی۔ ورنہ........... میں زندگی بھر اسے ڈھونڈتا رہوں گا اور وہ کسی اور کو۔"

اور گلو کو لگا جیسے امام دین نے ایک سربستہ راز کھول دیا ہو۔ اس کے چاچا سے ہروقت لڑتے رہنے کی وجہ' ہروقت چڑتے رہنے کا سبب بتا دیا ہو۔

"ہاں.. تو' تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" اس نے زیر لب کہا اور تبھی ایک معصوم سا چہرہ' چادر میں لپٹا' ہونٹوں کے قریب دانے کے گرد سرخ سوجن لئے اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ "تو سچ کہتا ہے ماے........... تلاش ہمیں کسی کے ساتھ نہیں جڑنے دیتی۔ یہ تلاش ختم ہونی چاہیے.......... ماے میں.......... میں بھی تلاش میں ہوں اس لئے چاچا کو اور.......... نازاں کو اپنا نہیں پاتا۔"

وہ بے خیالی میں کہہ گیا۔ وہ بھول گیا کہ اس نے اب تک امام دین سے اپنے دل کی باتیں نہیں کی تھیں۔ اسے اب تک نہیں معلوم تھا کہ وہ کسے اور کیوں تلاش کر رہا ہے؟ پہلی بار جب امام دین نے اس سے پوچھا تھا کہ تو اکیلا ہے تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "ماں ہے؟"

گلو نے جواب دیا۔ "نہیں!"

"باپ؟"

"وہ بھی نہیں ہے۔" گلو نے سر ہلا کر کہا تھا اور اس کا دیا ہوا بر گر کھانے لگا تھا۔

امام دین نے بہت دیر تک اسے دیکھا تھا مگر آج تک کچھ نہیں پوچھا تھا مگر اب گلو کی بات سن کر وہ چونک اٹھا تھا۔ اسے تو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ گلو کسی کی تلاش میں ہو گا۔ اس کا تو ایک گھر تھا جہاں وہ بوڑھا اس کا منتظر رہتا تھا اور اب گویا آسمان سے ٹپکی ہوئی وہ لڑکی بھی اس سے وابستہ ہو گئی تھی۔ کم از کم امام دین کا یہی اندازہ تھا۔

وہ نازاں سے پہلی بار اسی وقت ملا تھا جب وہ چاچا کا پتہ کرنے گیا تھا اور اسے پتہ

چلا تھا کہ اس کی خالہ حمیدہ مرگئی۔ یہ لڑکی وہاں اکیلی تھی۔ اسے فتح کے آدمیوں سے خطرہ تھا تب وہ اسے لے آیا تھا اور جب اس نے نازاں سے کہا تھا کہ تو اگر چاہے تو میں تجھے گلو کے پاس پہنچا سکتا ہوں تو اس کی بجھی ہوئی آنکھیں لمحہ بھر کو جگمگا گئی تھیں اور وہ جان گیا تھا کہ اسے گلو کا انتظار تھا۔ وہ اس کے لئے پریشان تھی اور کسی کے لئے پریشان تو وہی ہوتا ہے جو اسے کچھ جانتا ہو۔

"کیوں گلو! نازاں تو شاید.........."

"پتہ نہیں ماے۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ "ایک چہرہ ہے جو کچھ آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ وہ کون ہے' کس کا چہرہ ہے' میں کچھ بھی نہیں جانتا پھر بھی میرے اندر جیسے ٹیلے سے بن گئے ہیں جنہوں نے راستہ روک رکھا ہے اور میں.......... پھر کچھ آوازیں.......... جھگڑنے کی.......... رونے کی.......... اور.......... اور.........."

گلو ایک دم چپ ہو گیا۔ ایک خوبصورت چہرے کی جھلک ہی اس کے ذہن کے تاریک پردے پر چمکی تھی۔ یوں جیسے بجلی کوند جائے۔ صرف لمحہ بھر کو۔ پھر چہرہ صاف دکھائی نہیں دیا۔ نقوش واضح نہیں ہو پائے صرف اتنا کہ ایک چہرہ ہے جس کی آنکھوں میں محبتوں کے سمندر ہیں۔ گلو کی آنکھیں بلا وجہ ہی بھیگ گئیں حالانکہ اس نے کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا مگر پھر بھی آنکھیں تر ہو گئیں۔

"اوہ یار.......... پھر چھوڑ دے سب کچھ.......... یہ سب کچھ بیکار ہے۔ یہ سارے جعلی رشتے' یہ.......... یہ زبردستی کی محبتیں' یہ تو آدمی کو بالکل بے ڈھب کر دیتی ہیں۔ زندگی گزارنے کا سلیقہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ محبت نفرت میں نفرت محبت میں بدل جاتی ہے۔ ایک جذبے کی جگہ کوئی دوسرا جذبہ لے لیتا ہے۔ ان لوگوں سے تیرا کوئی رشتہ' کوئی تعلق نہیں ہے گلو۔ یہ صرف گندم کا قرض ہے۔ اسے گندم سے اتار دے۔ جو خلوص کا ہے' بے لوث خدمت کا ہے اسے خلوص اور بے لوث خدمت سے اتارا جا سکتا ہے یار۔ اس کے لئے تو اپنے آپ کو ضائع مت کر۔ ایسے رشتے تو میرے بھی بہت ہیں۔ وہ موٹا سا گنجا آدمی جس نے مجھے پہلی بار اپنے موٹے موٹے ہاتھوں میں اٹھا کر سیلاب سے بچا لیا تھا اور وہ موٹی لڑکی یاد ہے؟ وہی جہاں چاچا جا کر رہا تھا۔ وہ اسی موٹے آدمی کی لڑکی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے میں نے گھر بنا کر دے دیا اور ضرورت پڑنے پر روپیہ پیسہ بھی دے آتا ہوں۔ اس کا اتنا ہی رشتہ تھا مجھ سے۔ اس نے مجھے سہارا دیا تھا پھر میں یہاں آ گیا۔ یہاں بھی کچھ لوگوں نے بلاوجہ میرا ساتھ دیا تھا۔ میں نے ان کا قرض بھی اتار دیا۔ ایک کو پھول کی دکان کھلوا دی۔ ایک کو ٹھیلا لگوا دیا۔ یہ رشتے اسی طرح نبھائے جاتے ہیں گلو! سچی بات بتاؤں آدمی اپنے اندر سے بہت کمینہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو اسے اپنی کمینگی کا خود بھی پتہ نہیں چلتا۔ چکر میں آتا ہے تب بھرم کھلتا ہے۔ یقین کر گلو جب کوئی کسی پر اعتبار کر رہا ہوتا ہے، اندھا اعتماد کر لیتا ہے اس پر تو ایک روز وہ.......... منہ کے بل گرا دیتا ہے، انگڑی لگا دیتا ہے، ایسے کہ گرنے والے کو یقین ہی نہیں آتا۔ سچ کہتا ہوں یہ چاچا.......... یہ عورت جو آج بے آسرا ہو کر تیرے گھر میں بیٹھی ہے، انہیں تجھ سے محبت نہیں، تو ان کی ضرورت ہے یار! اور ضرورت تو یہ بھی ہوتی ہے کہ دنیا میں ایک شخص ہے جسے دروازے پر دستک دینا ہے۔ آخر ہر دروازے پر دستک ہوتی ہے ناں! ہر گھر کے دروازے پر دستک دینے والے ہوتے ہی ہیں۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی کا انتظار بھی کرنا ہوتا ہے۔ تو، تو ان کی وہ ضرورت ہے۔ اس بات کو سمجھ لے تو یہ ساری دنیا تیری جیب میں پڑی ہو گی۔"

گلو اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔ امام دین کی بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی مگر کھانستے ہوئے ڈھانچے سے چاچا کی دھندلی آنکھوں میں اسے ضرورت نہیں، محبت نظر آ رہی تھی۔ "ماے اس.......... اس چاچا کو تو میری ضرورت نہیں تھی۔ بوڑھا تو وہ اب ہوا ہے ماے۔ اس نے تو مجھے تب لیا تھا جب.........."

"وہ بھی ضرورت تھی۔" امام دین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تو سمجھ کیوں نہیں رہا کہ آدمی کا کسی سے پیار کرنا اس کی اپنی ضرورت ہوتا ہے۔" ماے نے الجھ کر جواب دیا۔ "اچھا تو بتا.......... وہ اکیلا بوڑھا ساری زندگی کیسے بسر کرتا؟ یہ دکھ، یہ خوشیاں، یہ جھگڑے، یہ لڑائیاں کس کے دم سے ہیں؟ تیرے دم سے ناں!"

گلو نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے ہی تک رہا تھا۔ یہ بات گلو کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے چاچا نے جادو کر کے اس کے دماغ کو جکڑ

رکھا ہے۔ وہ کم از کم اس کے لئے ایسا کچھ سوچنے پر تیار نہ تھا۔ اس وقت بھی امام دین اس کی آنکھوں کے خالی پن کو دیکھ کر جھلا گیا۔ اس نے اپنے اٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گرا دیئے اور نتھنے پھلا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اس سامنے انسان نہیں، چٹان ہے۔

"چل.......... رات بہت ہو گئی ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "تیرا وہ چاچا بھی انتظار کر رہا ہو گا۔" امام دین کے انداز میں گہرا طنز تھا۔

☆============☆============☆

گلو اسے گیراج پر اتار کر اور اس سے دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے سیدھا اسپتال پہنچا تھا۔ کمرے کے دروازے پر یوں ہی دستک دی، دروازہ کھٹک کی آواز کے ساتھ ہی کھل گیا۔ نازاں سامنے کھڑی تھی، یوں جیسے اب تک دروازے سے لگی کھڑی ہو۔ "تو ان کی ضرورت ہے یار، ضرورت تو یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی ہے جسے دروازے پر دروازے پر دستک دینا ہے۔" امام دین کا جملہ اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کے دماغ میں گونجا۔

"کیا تو دروازے پر کھڑی تھی؟" گلو ایک دم بھنا گیا۔ یوں جیسے امام دین کے سامنے اس کی سبکی ہو گئی ہو۔

"ہاں۔" اس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا۔ اس کے انداز میں بپھری ہوئی لہروں کا سا شور تھا۔

"کیوں؟" گلو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"تجھے پتا نہیں ہے؟" اس بار گلو کو یوں لگا جیسے کوئی موج اس کے پیروں میں آ کر چپکے سے لوٹی ہو۔

"زیادہ ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں ہے۔" گلو نے اسے جھڑک دیا۔ اس کے سفید ہوتے ہوئے چہرے نے لمحہ بھر کو اسے لڑکھڑا دیا تھا مگر وہ فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔

چاچا شاید جاگ رہا تھا۔ آنکھیں موندے پڑا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ گلو آ گیا ہے مگر پتا نہیں کیوں اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ گلو نے قریب پہنچ کر نازاں سے پوچھا۔ "کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نرس پھر انجکشن لگا کر گئی ہے؟"

"آئی تھی مگر.......... اس نے نہیں لگوایا۔" چند لمحے کی خاموشی کے بعد نازاں کی آواز آئی۔ آواز بڑی دھیمی اور کچلی ہوئی سی تھی۔ گلو نے بس لمحہ بھر کو محسوس کیا پھر چاچا پر جھکا۔

"چاچا!" اس نے اسے آواز دی۔

"ارے تو.......... آگیا؟" چاچا نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ گلو کا جی چاہا کہ اسے بھی کہہ دے کہ زیادہ ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں ہے مگر وہ کہہ نہ سکا۔

"ہاں چاچا! اب کیسا ہے تو؟"

"بیٹا! یہاں رہ کر بیمار ہو گیا ہوں۔ اللہ کے واسطے یہاں سے لے چل۔"

"دیکھ چاچا! تو سمجھنے کی کوشش کر۔"

"نہیں سمجھتا۔" چاچا ایک دم چیخ پڑا۔ گلو بھونچکا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ "اس کو.......... اس جوان لڑکی کو لے کر یہاں پڑا رہوں۔ نیند کے انجکشن لگواتا رہوں۔ ہر وقت بے ہوش رہوں اور تو.......... تو سڑکوں پر.........." چاچا یوں ہانپنے لگا جیسے سانس اس کے سینے میں چک پھیریاں ڈال رہا ہو۔

پر پتا نہیں گلو کو کیا ہوا۔ وہ پلٹا اور نازاں پر جھپٹ پڑا۔ "کیا بات ہے؟ کیا کیا ہے تو نے؟"

"میرے اندر کچھ کرنے کی طاقت ہوتی گلو! تو.......... میں تم لوگوں کے آسرے پر نہ پڑی ہوتی۔" آنسو دھار بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

پھر گلو نے کچھ نہیں سنا' نہ انہوں نے کچھ بتایا۔ وہ اسی وقت سامان اٹھا کر چل پڑا۔ چاچا نازاں کو یوں تھامے ہوئے تھا جیسے وہ خود چل بھی نہ سکتی ہو۔ گلو نے اس پر ذرا بھی دھیان نہ دیا بس اسے تو یوں لگا تھا جیسے چاچا اسے چکمہ دے کر گھر لے جا رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا کو یہاں کیا' کہیں بھی چین نہیں آئے گا۔ اب اسے علاج کی بھی فکر نہ رہی تھی۔ اس کی جیب میں نوٹوں کی گڈی تھی۔ اب وہ اس کا کہیں بھی اچھے سے اچھا ڈاکٹر کر کے علاج کروا سکتا تھا پھر سرکاری اسپتال میں اسے ڈالے رکھنے کا یوں بھی کوئی

جواز نہیں تھا۔ اسے نازاں پر ضرور غصہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے چاچا سے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو گی جس کی وجہ سے وہ اس کی طرف سے پریشان ہو گیا ہو گا۔ خود اسے بھی کب اچھا لگا تھا نازاں اسپتال میں رہے اور ایک روز تو اسے بہت غصہ بھی آیا تھا جب ایک ڈاکٹر بار بار آ کر چاچا کو دیکھتا رہا تھا۔ وہ بار بار نازاں سے اس کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ تب اس نے نازاں کو ڈانٹا بھی تھا کہ اسے جواب کیوں دیتی ہے۔ نازاں نے تنگ کر کہا تھا۔ "مجھ سے پوچھتا ہے تو جواب نہ دوں کیا؟"

اور تبھی چاچا نے گلو کو جھڑک دیا تھا۔ "اس سے کیوں لڑتا ہے؟ چل' لے چل یہاں سے مجھے.........."

اور وہ چپ ہو گیا تھا۔ ڈر گیا تھا کہ یہاں بات کی تو چاچا کے ہاتھ بہانہ آ جائے گا اور پھر وہ دوسرے ہی چکروں میں لگ گیا۔

☆============☆============☆

وہ گھر پہنچے تو کافی رات گزر چکی تھی۔ پتہ نہیں گلو کو تھکن تھی یا فیصلہ کر لینے کے بعد والا اطمینان کہ بستر پر لیٹتے ہی اسے ایسی نیند آئی جیسے وہ برسوں سے سویا ہی نہ ہو۔ چاچا کو دوائیں اسی نے اپنے ہاتھ سے کھلائی تھیں بلکہ آتے ہوئے ڈاکٹر سے سب ہدایات بھی لکھوالی تھیں۔ نازاں کو تو وہ بالکل بھول ہی چکا تھا۔ کھانا وہ ساتھ لے کر آیا تھا۔ اسے بالکل بھوک نہیں تھی۔ پتہ نہیں چاچا اور نازاں نے کب کھانا کھایا اور کب سوئے؟

صبح اسے جگانے والی نازاں تھی جو کہہ رہی تھی۔ "سویرا ہو گیا رحمان چاچا بلا رہا ہے۔"

گلو نے محسوس کیا کہ نازاں بہت نڈھال ہے۔ اس کی آنکھیں سرخ اور پپوٹے سوجے ہوئے لگ رہے تھے۔ اسے خیال آیا کہ وہ اس سے وجہ پوچھے مگر یہ خیال صرف ایک ہی پل میں کہیں گم ہو گیا۔ اس کی جگہ ایک دوسرے خیال نے لے لی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ نازاں اسے جگا کر پلٹنے ہی والی تھی کہ گلو نے اسے روک لیا۔ چاچا اپنے کمرے میں تھا۔ گلو نے اسے کھلے آنگن میں سونے سے منع کر دیا تھا۔ رحمان چاچا کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ چاچا سے باتیں کر رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا بات ہے؟" نازاں کی آواز میں ٹھہراؤ اور چہرے پر سنجیدگی تھی۔

"نازاں! میں نے اتنے عرصے میں بہت سا پیسہ اکٹھا کر لیا ہے۔" گلو نے کہہ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا' جہاں کوئی جذبہ' کوئی احساس یا کوئی سلوٹ نہیں تھی۔ ویسے کا ویسا سپاٹ پن تھا۔ اس نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ اس نے اتنے سے عرصے میں آخر کیسے اور کتنا پیسہ جوڑ لیا ہے۔ "اب چاچا کا علاج بہت آسان ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اسے سمجھا بجھا لے کہ وہ بے وجہ مجھ سے بحث نہ کرے اور............ تجھے اچھا سا گھر اور قیمتی برتن چاہئے تھے ناں! اگر تو چاچا کو تیار کر لے تو ایسا ہونا بھی آسان ہے۔" گلو کا خیال تھا کہ وہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جائے گی۔ اسے شدت سے احساس ہو جائے گا کہ اب گلو اس کا محتاج ہے' مجبور ہے اور وہ اس کی مجبوری سے خوب فائدہ اٹھا سکتی ہے مگر اس وقت گلو منجمد ہو گیا جب اس نے بغیر کسی تاثر کے سر اثبات میں ہلایا اور بولی۔

"ایسا ہی ہو گا۔ چاچا تجھے کچھ نہیں کہے گا۔ تو جہاں کہے گا' وہ چلا جائے گا۔ اور کچھ؟"

"آں............" وہ بوکھلا گیا۔ "نہیں بس............ بس وہ............"

"ناشتہ کر لے چاچا تیرا انتظار کر رہا ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا اور دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ گلو الجھا الجھا سا بیٹھا رہا پھر اس نے سر جھٹک دیا اور بڑبڑایا۔ "سالی ہر وقت ڈرامے بازی میں لگی رہتی ہے۔" پتہ نہیں جاتی ہوئی نازاں نے یہ بڑبڑاہٹ سنی یا نہیں.. وہ اٹھ کر باہر ٹنکی کے پاس آ بیٹھا۔

چاچا کی حالت آج بہتر تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے کا لٹکا ہوا اور سوجا ہوا حصہ آج کچھ کم محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں تھکاوٹ کی بجائے صحت مندی تھی۔ وہ رحمان چاچا سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہا تھا کہ گلو کو داخل ہوتے دیکھ کر چپ ہو گیا۔

"آجا بھئی گلو!" رحمان چاچا نے پلنگ پر سرک کر اسے جگہ دی۔ انہوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا مگر نازاں جانے کن کاموں میں مصروف رہی۔ چاچا نے ناشتے کو کہا تو اس نے کہہ دیا کہ وہ ناشتہ کر چکی ہے۔ چاچا چہک رہا تھا۔ گلو کو یقین آ گیا کہ گھر کا سا آرام اسے واقعی کہیں محسوس نہیں ہوتا ہو گا تبھی وہ اتنا چاق وچوبند تھا۔

ناشتا کر کے وہ اور رحمان چاچا ساتھ ہی ٹیکسیاں لے کر نکل گئے۔ آج اس کا امام دین سے ملنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ دوائیاں ابھی موجود تھیں۔ ڈاکٹر نے کل کلینک آنے کو کہا تھا۔ گلو نے اسماعیل کے دیئے ہوئے پیسے گھر میں رکھ دیئے تھے مگر تین ہزار روپے اب بھی اس کی جیب میں تھے۔ وہ خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دن بھر وہ سڑکوں پر ٹیکسی دوڑاتا رہا' گنگناتا رہا اور عین دوپہر میں جب سڑکیں سنسان ہو گئیں' وہ لالو کھیت پہنچ گیا۔ اس نے پلاسٹک کا ڈنر سیٹ خریدا۔ ایک استری' کچھ دیگچیاں' کچھ مصالحوں کے ڈبے وہ ڈگی میں رکھ کر پھر بازار میں چلا آیا۔ وہ شیشے کے گلاس دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے آواز آئی۔ "یہ پائل کتنے کی ہے؟"

اس کی نگاہیں بے اختیار آواز کی سمت اٹھ گئیں۔ سامنے کی دکان پر ایک لڑکی سیاہ برقعہ پہنے' نقاب کو چہرے پر لپیٹے دکان دار سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ فوراً ہی گلو کی نگاہ پائل پر پڑی۔ چاندی کی طرح جگمگاتی' گھنگرو بجاتی پائل گلو کو بہت اچھی لگی اور تبھی گلو کو خیال آیا کہ وہ نازاں کے لئے پائل خرید لے۔ وہ بہت خوش ہو گی۔ گلو نے گلاسوں کی قیمت چکائی اور جیولری کی دکان پر آ گیا۔

"وہ پائل دکھانا۔" اس نے لڑکی کے برابر کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میں لے چکی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے دونوں کی نگاہیں ملیں اور گلو کو پتا نہیں کیوں ایسا لگا جیسے اس کی آنکھیں پتھر کی ہو گئی ہیں۔ وہ بھی پلک جھپکے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ یہ لے لیں جی!" دکان دار کی بھاری آواز نے گلو کو چونکا دیا۔

"نہیں............ مجھے ایسی ہی پائل چاہیے۔" گلو نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

"اسی ڈیزائن کی؟"

"جی! اسی ڈیزائن کی۔" اس بار گلو نے چہرہ موڑ کر پھر اس لڑکی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی بات تھی۔ گلو کو لگ رہا تھا جیسے وہ ان آنکھوں کو پہچانتا ہے۔ اچھی طرح جانتا ہے یا جیسے یہ اس کی اپنی آنکھیں ہوں یا پتہ نہیں............ جیسے ان کا آنکھوں کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاثر اس کی روح میں اتر گیا ہو۔ ان آنکھوں میں لہریں لیتی حیرانی، تجسّس........... الجھن سب سے وہ اچھی طرح واقف ہو۔

"یہ لیں بی بی.." دکان دار نے پائل پلاسٹک کی چھوٹی سی تھیلی میں ڈال کر اس لڑکی کو تھما دی اور گلو سے بولا۔ "آپ ذرا دیر کو بیٹھ جائیں۔ میں نے اسی ڈیزائن کی پائل منگوائی ہے۔"

گلو دیوار کے ساتھ لگی بینچ پر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی پائل لے کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی دکان سے باہر چلی گئی۔ جاتے جاتے اس نے پھر چہرہ گھما کر گلو کو دیکھا۔ بے چینی کی ایک تیز لہر گلو کے وجود میں اٹھی اور اٹھتی چلی گئی۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ یہ آنکھیں کس کی ہیں؟ ان میں وہ کیا بات محسوس کر رہا ہے؟ اس نے لڑکی کے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہی ذہن کو جھٹکا اور کھڑے ہو کر شوکیس میں سجے زیورات کو دیکھنے لگا۔

اتنی دیر میں دکاندار کے پاس ایک بچہ آیا اور اسے پائل دے کر چلا گیا۔ "یہ لیں جی!" دکان دار نے پلاسٹک کی تھیلی میں پیک پائل اسے تھما دی۔ گلو نے پیسے دیئے۔ آخری بار شوکیس میں سجے زیورات پر نگاہ ڈالی اور تبھی........... تبھی اسے لگا جیسے اس شوکیس میں وہی دو آنکھیں چمک رہی ہوں۔ ہیرے کی طرح........... سیاہ، خوفزدہ اور عجیب سی بے بسی کی کیفیت لئے دو آنکھیں۔ وہ آنکھیں جو اسے بچپن سے آج تک نظر آتی رہی تھیں۔ چبوترے پر جب اس نے اس لڑکی کو ڈانٹ کر بھگایا تھا تب ہی دو آنکھیں اس کے اندر اتر گئی تھیں۔ معصوم سے چہرے پر جڑی التجا کرتی ہوئی بے بس ہیرا جیسی آنکھیں اور........... تبھی گلو کی نگاہ اس کے ہونٹوں کے قریب سوجے ہوئے دانے پر پڑی تھی۔

یہ خیال آتے ہی گلو جھپٹ کر دکان سے باہر آ گیا پھر وہاں سے گزرنے والے ہر شخص نے اسے پاگلوں کی طرح بھاگتے دیکھا۔ وہ کبھی سامنے کی طرف دوڑتا اور کبھی پلٹ کر پیچھے کی طرف، کبھی دائیں ہاتھ کی گلی میں جاتا اور کبھی بائیں ہاتھ کی۔ جہاں برقعہ پہنے کوئی عورت نظر آتی وہ دوڑ کر اس کے سامنے پہنچ جاتا۔ پتہ نہیں کتنا وقت وہ دیوانوں کی طرح ہزاروں لوگوں کو کھوجتا پھرا پھر تھک ہار کر ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ ساری زندگی ہار دینے کا

سا احساس اسے شل کئے ہوئے تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کی تلاش میں ہو۔ وہی آنکھیں اس کی اندھیری زندگی کو روشن کر سکتی تھیں جنہیں اس نے خود کھو دیا۔ پہلی بار نہیں، دوسری بار۔ یہی کیفیت اس کی اس روز بھی ہوئی جب وہ چادر میں لپٹی ملتجی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تھی۔

وہ رات........... وہ رات اس کی پوری زندگی پر چھا گئی تھی۔ اس وقت تو وہ اپنی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ نہ اسے یہ احساس تھا کہ وہ لڑکی جاتے جاتے اپنی آنکھیں اس کے اندر سمو گئی ہے مگر آج........... اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "کاش یہ سب کچھ مجھے ذرا دیر پہلے یاد آ گیا ہوتا........... تو میں اسے کبھی بھی کہیں جانے نہیں دیتا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ اسی وقت اس کی گود میں رکھی پائل بج اٹھی اور اس کے دماغ میں جیسے چھناکے سے ہونے لگے۔ "پائل..........." اس نے اسی ڈیزائن کی پائل خریدی تھی۔ اب یہی ایک چیز تھی جو ان دو چمکتی آنکھوں سے جڑ چکی تھی۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا آیا کہ اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آہستہ رفتار سے آگے بڑھا دی۔ بس اسٹاپ پر برقعہ پہنے کافی عورتیں کھڑی تھیں۔ اس نے کئی پسنجرز کو کہیں لے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ ہر برقعہ پوش عورت کے قریب جا کر ٹیکسی روکتا پھر مایوسی سے آگے بڑھا دیتا۔ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی۔ اس نے ایک کونے میں ٹیکسی کھڑی کر دی اور بازار سے باہر آنے والی عورتوں پر نگاہ جما کر بیٹھ گیا۔

"ابے........... تو........... تو...........!" کھڑکی کے قریب آ کر کوئی جھکا۔

گلو چونک اٹھا۔ وہ امام دین تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا تھا۔ "ہاں.. تھک گیا تھا۔ تو کہاں؟"

"ارے یار یہ عورتوں کی جھک جھک اور ان کی ضرورتیں بھی آدمی کو پاگل کر دیتی ہیں۔ سالی روز کسی نہ کسی چیز کی کمی کا رونا رو دیتی ہے۔ ایک لمبی لسٹ تھما دی تھی کہ لا کر دو۔ رعب ایسا جماتی ہے جیسے جورو ہو۔ آج تو میں نے پیسے دے کر جھڑک دیا کہ جو کچھ لانا ہے، خود لا۔ میں تیرا نوکر نہیں ہوں۔" اس نے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر جب گیراج پر دوپہر میں ذرا دیر دم لینے کو لیٹا تو خیال آیا، عورتوں والی چیزیں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ خرید لے گی مگر پنکھا خریدا تو سالے اسے چیٹ کر جائیں گے۔ اسی لئے چلا آیا۔"

گلو نے حیرت سے اس کے ہاتھ میں لٹکے تھیلے کی طرف دیکھا جس میں پنکھا نہیں، پھل تھے۔ امام دین سمجھ گیا، ہنس پڑا۔ "ابے یہ تو گیراج کے بچوں کے لئے ہیں۔ پنکھا تو اب لوں گا۔ چل.......... چلے گا میرے ساتھ؟"

"نہیں یار.......... تو جا پنکھا لے آ۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ کافی دیر سے چیزیں خرید رہا تھا۔ جا تو لے کر آ۔ میں یہیں انتظار کروں گا پھر تجھے چھوڑ دوں گا۔"

امام دین نے پچھلی سیٹ پر پیکٹ رکھے دیکھے اور بولا۔ "ہاں بھئی! تیرے تو مزے ہو گئے۔ اب تو پیسہ ضائع مت کرنا اور وہ لڑکی.......... کیا نام ہے اس کا؟ ہاں نازاں.......... اس کے لئے بھی کچھ لے لینا۔ آخر اتنی خدمت کرتی ہے تیری۔"

تبھی گلو کو پائل کا خیال آیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ وہ گھوم کر رہ گیا۔ ناچ گیا۔ جیبیں ٹٹولیں ادھر ادھر دیکھا۔ پچھلی سیٹ پر ڈھونڈا۔

"کیا ہو گیا.......... کیوں ناچ رہا ہے؟" امام دین نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے یار.......... اس کے لئے لی تھی ایک چیز۔" گلو نے پریشان لہجے میں کہا اور جھک کر اپنے پیروں کے پاس دیکھا۔ وہیں پلاسٹک کی تھیلی پڑی تھی۔ اس کا دم میں دم آیا۔ اس نے تھیلی اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ لمحے بھر کو امام دین کی نگاہ اس چمکتی ہوئی چیز پر پڑی۔

"ان سالیوں کو ہر وقت چھن چھنانے کا شوق ہوتا ہے۔ اچھا چل ٹھیک ہے پھر ملیں گے۔ تو جا۔ مجھے پتہ نہیں کتنی دیر لگے گی؟"

اور جیسے گلو یہی چاہتا تھا۔ اس کی آمد کی وجہ سے وہ باہر توجہ نہیں دے سکا تھا اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ شاید وہ اس دوران جا چکی ہو۔ وقت بھی کافی گزر چکا تھا۔ امام دین کو خدا حافظ کہہ کے اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

☆==========☆==========☆

وہ سامان لے کر گھر پہنچا تب اسے نازاں کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ اسے احساس تھا کہ اس کا رویہ نازاں کے ساتھ مناسب نہیں ہے مگر وہ اس سلسلے

میں خود کو بے بس پاتا تھا۔ ایک غیر محسوس سا احساس تھا جو اس کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اسے چاچا بھی کبھی اس بات پر قائل نہیں کر سکا تھا کہ زندگی کے لئے عورت کا وجود کسی بھی شکل میں اہم ہے۔ ایک بار.......... صرف ایک بار اسے عورت ضروری لگی تھی۔ جب پہلی بار اس نے نازاں کو دیکھا تھا تو اس کے وجود میں ایک گدگدی سی محسوس ہوئی تھی۔ ایک اچھوتا سا جذبہ اس کے اندر ابھرا تھا۔ اس نے چاچا سے شادی کے لئے حامی بھر لی تھی مگر تب جلد ہی اس کے اندر کے تمام جذبے پتھرا کر سخت اور کھردرے ہو گئے تھے۔ یوں جیسے اس کے وجود کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں۔ ایک ٹکڑا جاذب اور لطیف تھا جبکہ دوسرا پتھریلا اور سفاک۔ وہ تھیلے لئے گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بجھی بجھی سی نازاں یہ سب دیکھ کر کھل اٹھے گی مگر جب اس کی جذبوں سے عاری نگاہیں اٹھیں تو لمبی اور تپتی دوپہر کا احساس گہرا ہو گیا حالانکہ اب دھوپ میں تپش کم ہو چکی تھی۔

"یہ کیا اٹھا لایا تو؟" چاچا نے بڑے پیار سے پوچھا تھا اور چاچا کا یہی انداز اس کا سینہ پھلا دیا کرتا تھا۔ فخر پیدا کر دیا کرتا تھا۔ اس نے ساری چیزیں اس کے سامنے ڈھیر کر دیں۔

"یہ ہر وقت طعنے دیتی تھی کہ برتن اچھے نہیں ہیں۔ مسالوں کے ڈبے ٹوٹ گئے۔ گلاس گھر میں نہیں ہے میں لے آیا تاکہ اس کے طعنوں سے جان چھوٹے۔" گلو نے نازاں کو چھیڑنے کے لئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سن کر نازاں بھڑک اٹھے گی مگر وہاں تو گہرا سکوت چھایا رہا۔ چاچا نے بھی حیرت سے سوئی میں دھاگا ڈالتی نازاں کو دیکھا۔ وہ اس کی قمیض کا دامن سی رہی تھی اور گلو کو یوں لگا جیسے سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا ہو۔ اس کے اندر ایک خوشی کا سارا احساس دم توڑ گیا۔

"نازاں! تجھے اچھا نہیں لگا؟" گلو کے دل کی بات چاچا کی زبان پر آ گئی۔

"اچھا ہے۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا پھر یوں مسکرا دی جیسے اس کی مسکراہٹ اس وقت گلو اور چاچا کی اہم ضرورت ہو۔ وہ سوئی قمیض میں لگا کر اٹھی۔ برتن دیکھے، گلاس اور ڈبے سمیٹے اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ "کھانا کھا لیا تو نے؟" اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاتے جاتے پلٹ کر گلو سے پوچھا۔

"نہیں۔ کیا پکایا ہے؟" گلو نے آستین اوپر کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

"سیم کی پھلی اور قیمہ۔"

"میں منہ دھو لوں پھر نکال لینا۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے پھر چاچا سے پوچھا۔ "چاچا تو نے کھا لیا؟"

"نہیں۔ تیرے ساتھ کھالیں گے۔ ویسے تو آج اس وقت کیسے آگیا؟"

"یونہی تھکن بھی تھی، بھوک بھی لگی تھی۔ ہوٹل میں کھانے کو جی نہیں چاہا اور پھر یہ چیزیں بھی لینا تھیں۔" گلو یہ کہہ کر کمرے سے باہر آگیا۔

ٹنکی کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کی جیب میں رکھی پائل بج اٹھی۔ اس نے پلٹ کر باورچی خانے کی طرف دیکھا۔ نازاں سر جھکائے جانے کس سوچ میں تھی۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت، بکھرے ہوئے بال اور اس کی پُراسرار خاموشی اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ منہ دھو کر اسی کی طرف چلا گیا۔ سوچا اس نے یہ تھا کہ کسی ہمدرد و مونس کی طرح اس سے خیریت پوچھے گا مگر جب نازاں نے اس کی آہٹ سن کر سر اٹھایا تو اس کے منہ سے نکلا۔ "تیرا کون مرگیا ہے جس کا سوگ منا رہی ہے؟"

بے ساختہ ایک کرب انگیز مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ گلو کو فوراً ہی احساس ہوا کہ اس نے بات کی شروعات ہی غلط کی ہے مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جانے کب کی اور کہاں کی نفرت تھی جو ہر وقت اس کی زبان سے لپٹی رہتی تھی۔

"کسی کے مرنے پر ہی سوگ نہیں منایا جاتا گلو............ خود اپنے مرنے پر بھی تو سوگ منا سکتے ہیں؟"

"اچھا............ یعنی تو مرگئی ہے؟"

"ہاں گلو! میں مرگئی ہوں۔"

"تیرے حلئے سے تو یہی لگ رہا ہے۔ اچھا میں تجھے زندہ کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر گلو نے جیب سے پائل نکالی۔ پلاسٹک کی تھیلی کھولی اور بولا۔ "لا پاؤں ادھر کر۔" اور جب نازاں نے اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پاؤں آگے کیا تو گلو کو لگا جیسے وہی دو چمکتی ہوئی

حیران آنکھیں اسے تک رہی ہیں۔ اس نے پاؤں پر نگاہ ڈالی اور نیچے بیٹھ گیا۔ اس لمحے وہ بالکل بھول گیا کہ اس کے سامنے نازاں ہے۔ برقعے میں لپٹا وجود اس کے دماغ پر چھا رہا تھا۔ اس نے بے خودی کے عالم میں پائل اس کے پیروں میں پہنا دی۔

"گلو!" نازاں کی حیرت بھری آواز نے اسے چونکا کر گویا جاگ جانے پر مجبور کر دیا۔

"ہاں۔" گلو نے سر اٹھایا۔ برقعے میں لپٹا وجود جیسے دیگچی سے اٹھتی بھاپ میں پگھل کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ "وہ............ تو جو کسی روح کی طرح اڑتی پھر رہی تھی ناں! تو اب............ جب تو چلے گی تو لگے گا جیسے زندہ اور جیتی جاتی لڑکی ہے۔" وہ جھینپ کر بولا۔

"نہیں گلو! پائل کی یہ آواز............ آواز بھی تجھے روح کا بین محسوس ہوگی۔"

"بات سن!" گلو نے کھڑے ہو کر شہادت کی انگلی اس کے چہرے کی طرف تان کر کہا۔ "یہ ڈائیلاگ نہ بولا کر۔ میرے کچھ پلے نہیں پڑتے۔ صاف اور آسان اردو میں بات کیا کر۔" گلو نے انتہائی اکھڑپن سے کہا تھا۔ "چل بھوک لگ رہی ہے اور سالن............ دیکھ۔ جل گیا شاید۔" وہ تیزی سے پلٹ کر کمرے میں آگیا۔

چاچا کھانے کا منتظر تھا۔ ذرا سی دیر میں نازاں ٹرے اٹھائے چلی آئی اور زور سے بجنے والے گھنگھروؤں کی آواز کمرے کے دروازے پر آکر رکی تو گلو کہیں کھو گیا اور چاچا چونک اٹھا۔

"کک............ کون ہے؟" اس نے دروازے کی طرف دیکھا جہاں نازاں کھڑی تھی پھر چاچا کی نگاہ اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کے گورے گورے پیروں میں جا الجھی۔ لمحہ بھر کو اس کا چہرہ سفید ہو گیا۔ اسے لگا جیسے جھاراں روٹی کی چنگیر اور سالن کی پلیٹ لئے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے۔ "تو............ تو کیسے آگئی؟" چاچا خواب کے سے عالم میں بڑبڑایا۔ گلو نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کون کیسے آگئی؟" اتنا کہہ کر گلو نے نازاں کو دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے چاچا کو دیکھ رہی تھی۔

"اوہ تو............ جلدی لا۔ بھوک لگی ہے۔" چاچا کے چہرے کا رنگ بڑی تیزی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بدلا تھا۔ اس نے فوراً سر جھکا لیا تھا۔

گلو بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "اب کہہ دے کہ یہ پائل بھی میں نے تیرے بکسے سے چرائی ہے۔" اچانک اسے حیدر آباد والا قصہ یاد آگیا جب اس کے لائے ہوئے کپڑے کو دیکھ کر بھی اس کا رنگ بدل گیا تھا اور دوڑ کر بکسے سے وہ کپڑا نکال لایا تھا جو بالکل اسی کے لائے ہوئے کپڑے جیسا تھا۔

"کون.......... کیا؟ باؤلوں جیسی کی باتیں مت کر۔ اچھا یہ پائل تو لایا ہے؟ اچھی ہے۔" وہ گڑبڑا کر بولتا چلا گیا۔ "آ جا نازاں تو بھی کھالے۔" چاچا نے اس بار اسے گہری نظر سے دیکھا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے چاچا۔" وہ پھر سوئی دھاگا لے کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیوں' تو نے لوہے کے چنے چبانے شروع کر دیئے ہیں کیا؟" گلو کو اب تشویش ہوئی۔ وہ پھر دھیرے سے مسکرائی۔ "چاچا کیا یہ نیر سلطانہ کی کوئی فلم دیکھ کر آئی ہے؟"

"بک بک نہ کیا کر۔" چاچا نے اسے جھڑک دیا پھر نازاں سے بولا۔ "تو نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ کھانا کھالے ورنہ.......... میں بھی نہیں کھاؤں گا۔"

نازاں نے صرف لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھا پھر اٹھ کر ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس کے باہر جاتے ہی گلو بولا۔ "اسے کیا ہو گیا ہے؟"

"پتا نہیں.......... جب سے اسپتال سے آئی ہے' بجھی بجھی ہے۔" چاچا پُرخیال انداز میں بولا۔

"پھر کوئی ڈاکٹر پسند آگیا ہوگا۔ یہ ڈاکٹروں سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ اس سے کہہ دینا ہوش میں رہے۔"

"پھر دماغ گھوم گیا تیرا؟" چاچا غصے میں بھنا گیا۔ "اس سے انسانوں کی طرح بات کیا کر۔ تو سمجھتا کیوں نہیں ہے کہ ہمارے سوا اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"کسی کا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا۔" گلو نے ہاتھ نچا کر کہا اور بڑا سا نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

لمحہ بھر کو چاچا کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس نے پل کے پل گلو کی طرف دکھ بھرے

انداز میں دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ گلو نے اسے یوں دیکھتے نہیں دیکھا تھا ورنہ ابھی اس کی بکواس ختم نہ ہوتی۔

نازاں آکر ان کے ساتھ بیٹھ گئی مگر وہ کھانا اس طرح کھا رہی تھی جیسے چاچا اور گلو کو بہلا رہی ہو۔ گلو کے دماغ میں اب کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کی طرف سے تشویش' نہ اس کے بجھے بجھے رہنے پر فکر نہ کچھ اور' وہ تو اب اسی برقعہ پوش لڑکی کی آنکھوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک بار پھر اسے اپنی یاد دلا کر کہیں کھو چکی تھیں۔ ایک اطمینان اسے ضرور تھا کہ بچپن کے دھندلے نقش اب بھی واضح تھے۔ اب اگر وہ دوبارہ اسے دیکھ لیتا تو فوراً پہچان جاتا۔ اس کا قد کاٹھ۔ اٹھی ہوئی ستواں ناک پر ٹکا نقاب۔ گندمی سنہرا رنگ۔ برقعے سے نظر آتے ہوئے سیاہ بال اور کمان کی طرح تنی ہوئی گھنی سیاہ بھنویں اب اس کے دماغ میں نقش ہو چکی تھیں۔ وہ کھاتا رہا پھر جانے کب اشتہا ختم ہوئی اور کب اس نے ہاتھ روک لیا اسی دوران میں اس نے قطعی نازاں کو نہیں دیکھا۔ نہ اسے پتہ چلا کہ اس نے کتنا کھانا کھایا۔

آج اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بدن میں عجیب میٹھی میٹھی سی اینٹھن تھی۔ ایک ایسی تھکن کا احساس جس میں سراسر سرور تھا۔ وہ کھانا کھا کر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ چاچا نے پوچھا بھی کہ وہ ٹیکسی لے کر کیوں نہیں جا رہا مگر اب اسے پیسے کی بھی فکر نہیں رہی تھی پھر چاچا کو تو ایک ہی جملہ کافی تھا کہ تھکن ہے۔ چاچا کے نزدیک اس کی تکلیف کے آگے کوئی چیز اہم نہیں تھی۔ گلو نے بستر پر لیٹتے ہوئے سوچا تھا کہ شام کو سیدھا خان آفریدی کے پاس جائے گا۔ اس سے لیا ہوا قرض واپس کرے گا۔ کلینک کی طرف چکر لگائے گا تاکہ ڈاکٹر سے ٹائم لے سکے پھر.......... پھر ان دو آنکھوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوگا۔

دیوار پر پھیلی دھوپ دبے پاؤں اوپر چڑھتی جا رہی تھی۔ گھر میں سناٹا طاری تھا۔ شاید چاچا سو چکا تھا۔ نازاں جانے کس کونے کھدرے میں پڑی تھی شاید آج پہلی بار گلو کو اس کی موجودگی میں ایسی خاموشی میسر آئی تھی ورنہ وہ تو ہر وقت اس سے لڑنے جھگڑنے میں ہی وقت گزارا کرتی تھی۔ گلو کے لئے تو یہ خاموشی کے لمحات بڑے غنیمت تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ کہاں ہو گی؟" اس کے اندر سے کسی نے سرگوشی کی تھی اور گلو بڑی دیر تک اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا۔ یہیں ہو گی' یہیں کہیں مگر کتنی عجیب بات تھی کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے برسوں گزر جانے کے باوجود آج پہلی بار اسے دکھائی دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتا' وہ چلی بھی گئی۔ اب جانے کتنے برسوں بعد نظر آئے گی؟ اسی خیال نے گلو کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا۔ "میں اسے تلاش کروں گا۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"کسے تلاش کرے گا؟"

نازاں کی آواز سن کر وہ اچھل پڑا۔ "تو.......... تو ایسے چوروں کی طرح کمرے میں مت آیا کر۔ تمیز نہیں ہے تجھے؟" وہ بگڑ گیا۔

وہ دروازے پر کھڑی اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ گلو کو اس کی آنکھوں کی تپش جھلسائے دے رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ کروٹ لے لے مگر وہ ایسے کھڑی تھی کہ وہ بندھ کر رہ گیا۔ "کیا چاہتی ہے؟" آخر اس نے بھنا کر کہا۔

"کچھ نہیں گلو!" اس نے دھیمے سے مسکرا کر کہا۔ "تجھ سے کچھ چاہتی بھی تو کیا ملتا؟"

"ٹھیک سمجھی ہے تو۔ جا اپنا کام کر۔" اس بار گلو نے ہمت کر کے کروٹ لے لی مگر پیٹھ پر جیسے چیونٹیاں رینگتی ہی رہیں۔ وہ جانے کب چلی گئی۔ گلو جب بری طرح بے چین ہو کر اٹھا تب پلٹا۔ دروازے کی چوکھٹ خالی تھی۔

دن تو جیسے تیسے گزر ہی گیا مگر رات گلو کے لئے جہاں بہت سے ستارے لے کر آئی وہاں اس کے اندر اٹھتے ہوئے سمندروں کی موجوں میں بہت سے سنگریزے بھی لائی تھی جو یہاں سے وہاں تک بکھر گئے۔ تنہائی کی دھوپ میں انہی سنگریزوں نے تپ کر اس کی آبلہ پائی کرنا تھا اور اس کی اذیت گلو ابھی سے محسوس کر رہا تھا مگر منہ اٹھائے گلیوں میں آوارہ پھرتا گلو جسے کبھی کبھی اس لنگڑی کی تلاش روک دیا کرتی تھی' اب وہ پوری طرح چوکنا ہو گیا تھا۔ ماں کا خیال تو ٹوٹتے تارے کے پیچھے دھویں کی لمبی لکیر سی بن کر رہ گیا۔ اس کی ٹیکسی کی ونڈ اسکرین پر ہر لمحہ دو آنکھیں پلکیں جھپکنے لگی تھیں اور وہ تمام

دن ان تک پہنچنے کی چاہ میں پوری تندہی سے ساری کراچی سے پسنجر اٹھا لیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی یہ لمبا سفر رائیگاں محسوس ہوتا اور وہ تھکن سے نڈھال ہو کر سوچتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر پھر چبوترے پر جا بسے جہاں اس کے بدن کی خوشبو اسے میٹھی نیند سلا سکتی تھی پھر وہ انجانی سی شفقت جو پتھریلے چبوترے کو نرم اور جاذب بنا دیتی تھی مگر چاچا کا علاج شروع ہو گیا تھا۔

گلو نے ایک بہت بڑے ڈاکٹر سے بات کر لی تھی۔ اس ڈاکٹر کے پاس اسماعیل خود لے کر گیا تھا مگر پھر اسی شام گلو چاچا کو لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے کلینک میں داخل کرنے کی بات نہیں کی۔ اگر کرتا بھی تو چاچا نہ رکتا کہ جانے سے پہلے ہی اس نے گلو سے صاف کہہ دیا تھا کہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ وہ پھر نئے سرے سے ٹیسٹ لے رہا تھا۔ دوائیں اور مخصوص غذائیں شروع ہو گئی تھیں۔ نازاں انسان سے کسی سائے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس بات کی تشویش چاچا کو تو تھی مگر گلو کو نہیں۔ وہ جب بھی کہتا۔ "دیکھ تو اسے کیا ہو گیا ہے؟ بالکل چپ ہو کر رہ گئی ہے۔"

تو گلو سر اٹھائے بغیر جواب دیتا۔ "تمیز آ گئی ہے گھر میں رہنے کی۔ میں نے سکھائی ہے۔ ہر وقت دھوم دھڑکا' چیخ پکار پسند نہیں ہے مجھے۔"

وہ بے آواز قدموں سے کمرے سے باہر یا ان دونوں سے دور چلی جاتی تو گلو کو بغیر دیکھے ہی پتہ چل جاتا کہ وہ اب ان کے قریب نہیں ہے' تب وہ جھلا کر چاچا سے کہتا۔ "وہ جو روز جھک جھک ہوتی تھی' وہ پسند ہے تجھے؟"

"بیٹا یہ جھک جھک ہی تو زندگی ہے' پگلے جس گھر میں یہ ہنگامے نہ ہوں وہ کوئی گھر ہوتا ہے؟"

اور گلو کے اندر صرف لمحے بھر کو سناٹا چھا جاتا پھر وہ اپنے آپ میں مگن ہو جاتا۔ ٹیکسی لے کر نکل جاتا۔ دن بھر سڑکوں اور گلیوں میں گھومتا اور رات گئے لوٹ کر آتا تو چاچا اس کا منتظر ہوتا۔

دن گزرتے رہے۔ اس دوران میں وہ دو بار امام دین کے پاس گیا۔ وہاں اسے پتہ چلا کہ ان دنوں میں صرف ایک بار احسان اللہ اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اسماعیل سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملنے کو کہا تھا مگر اسماعیل کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اس لئے امام دین نے اسے ٹال دیا۔
اب تک اسماعیل نے گلو سے بھی کوئی کام نہیں لیا تھا۔ گلو کو الجھن ہو رہی تھی۔ جو پیسہ وہ اسماعیل سے لے چکا تھا' اسے حلال کرنا چاہتا تھا۔ ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے امام دین سے کہا تو اس نے تسلی دے دی۔ اس روز امام دین فارغ تھا۔ گیراج سر شام ہی بند کر دیا تھا اور گلو کے ساتھ گھومتا پھرا تھا۔ امام دین نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ جہاں کچھ برقعہ پوش خواتین کھڑی ہوتیں۔ اس کی نگاہیں ان کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے پیروں پر جا کر اٹک جاتی تھیں پھر گلو ٹیکسی آگے بڑھا دیتا تھا۔

"کیا بات ہے گلو؟ میرا خیال ہے کہ تو آوارہ تو نہیں تھا۔"

"ہاں.......... آں.......... کیا؟" گلو نے چونک کر اس کو دیکھا۔ "اوہ نہیں یار.......... بس یونہی.........." وہ جھینپ گیا۔

"گلو کیا تجھے بھی کسی کی تلاش ہے؟" امام دین اس وقت کافی سنجیدہ تھا۔

"نہیں تو.......... چھوڑ اس موضوع کو۔ بھوک لگی ہے۔ گھر چلے گا؟"

"چل! تیرا چاچا مجھے دیکھ کر نہیں بھڑکے گا؟"

"نہیں.......... اب اس میں ہنگامہ کرنے کا دم نہیں رہا۔" گلو نے مسکرا کر جواب دیا اور ٹیکسی گھر کی طرف موڑ دی۔

شام گہری سرمئی ہو چکی تھی۔ شام ہوتے ہی گلو پر تھکن طاری ہو جاتی تھی شاید اسی لئے کہ اسے یقین تھا کہ وہ رات کو گھر سے نہیں نکلتی ہوگی۔ اس نے ٹیکسی گلی میں موڑی تو چاچا دروازے پر پریشان کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھ آیا۔ "کیا بات ہے؟" گلو نے ٹیکسی روک کر پوچھا۔

"نازاں گئی تھی بازار.......... ابھی تک نہیں آئی۔" چاچا کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔

"بازار کیوں گئی تھی؟" اب گلو نے اطمینان کا سانس لے کر پوچھا ورنہ چاچا کو یوں کھڑے دیکھ کر اسے یہ فکر ہو رہی تھی کہ کہیں اسے کوئی تکلیف شروع نہ ہو گئی ہو۔

"پتہ نہیں۔ کہتی تھی کہ کچھ ضروری چیزیں لینا ہیں۔ میں نے کہا بھی کہ گلو کو آنے دے وہ لا دے گا مگر.........."

"مگر اس نے نہیں سنا۔" گلو نے اس کی بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں جواب دیا۔
"تو نے اسے سر پر چڑھا لیا ہے چاچا۔ اپنی من مانی کرنے پر آتی ہے تو کچھ نہیں سوچتی۔"
گلو ٹیکسی لاک کر کے گھر میں داخل ہوا۔ امام دین نے چاچا کو سلام کیا تھا مگر چاچا نے پریشانی میں اس پر دھیان ہی نہ دیا۔ "پتہ نہیں کھانا بھی پکایا ہے یا نہیں؟" آخری جملہ اس نے خود سے کہا۔

"تو بکواس نہ کیا کر۔ تیرا جنم بھرنے کا انتظام کر کے گئی ہے۔ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اگر کبھی گئی بھی تو جلدی لوٹ آئی۔ ذرا قریب کے بازار تک جا کے دیکھ۔"

گلو تو اسے جھڑکنے والا تھا مگر امام دین نے اس کا بازو پکڑ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ "چل دیکھ لیتے ہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا اور چاچا نے چونک کر اسے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔

اسے بھوک تھی۔ وہ جھلا گیا مگر امام دین اسے لے کر باہر چلا آیا۔ "یار گلو! بہت افسوس کی بات ہے۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔" امام دین سنجیدہ تھا۔

"ہوتی ہوگی۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ "اب کہاں ڈھونڈوں گا اس کو؟"

"تو میرے ساتھ چل۔" امام دین نے اسے بازو سے پکڑا اور قدم بڑھا دیئے۔

☆============☆============☆

تقریباً آدھا گھنٹا وہ لوگ جگہ جگہ پھرے مگر نازاں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ گلو اس کے محلے میں بھی گیا۔ پاس پڑوس میں بھی پوچھا۔ اب لوگ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ لہو گلو کی کنپٹیوں پر ٹھوکر مار رہا تھا۔ امام دین کے چہرے پر سخت پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ شام رات کے اندھیرے میں گم ہوتی جا رہی تھی اور گلو کے حواس معطل ہو رہے تھے۔ پتہ نہیں کیوں اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ نازاں اس کی ذمے داری تھی اور اس کی وجہ سے کہیں چلی گئی ہے۔

وہ گھر لوٹا تو گھر میں اندھیرا تھا اور چاچا دونوں ہاتھوں میں سر کو تھامے بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ ان دونوں کی آہٹ بھی اسے نہ چونکا سکی۔ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر گلو کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل حلق میں آگیا تھا۔ "چاچا!" اس نے قریب پہنچ کر اسے چھوا۔

اس نے سر اٹھایا اور چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ "ملی؟" سرگوشی سسکی کی طرح ابھری تھی۔

"نہیں.......... تو اندر تو چل.........." اس نے چاچا کی بغلوں میں ہاتھ ڈالا اور اسے سہارا دے کر اندر لے آیا۔ پورے گھر کا اندھیرا اور ڈستی ہوئی ویرانی گلو کے سینے میں برچھی بن کر اتر گئی۔

"بیٹا! غضب ہو جائے گا.......... میں خدا کو کیسے منہ دکھاؤں گا؟ ڈھونڈ اسے.......... ڈھونڈ اسے گلو.........." وہ ایک دم رو پڑا تھا۔

عین اسی لمحے رحمان چاچا کی بیوی کی آواز آئی۔ وہ گلو کو آوازیں دے رہی تھی۔ گلو نے لپک کر دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ نازاں کو کھڑے دیکھ کر جیسے اسے سکتہ ہو گیا۔

"ہٹ پرے.......... بچی اتنی بیمار تھی اور تو.........." وہ نازاں کو سہارا دیئے اندر لے آئی۔ گلو کسی بت کی طرح کھڑا رہ گیا۔ "بتی تو جلا۔" چاچی کی آواز پر وہ چونک اٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بتی جلا دی۔ اب امام دین اور چاچا بھی کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ چاچا تو بے قرار سا آگے بڑھا اور نازاں کو سینے سے لگا لیا۔

"کہاں چلی گئی تو؟"

"میں بہو کے ساتھ بازار سے واپس آ رہی تھی۔" چاچی نے برقع اتارتے ہوئے کہا۔ "اچانک میری نظر ایک بند دکان کے تھڑے پر پڑی تو وہاں نازاں کو بیٹھے دیکھ کر میں تو باؤلی ہو گئی۔ اتنی رات کو جوان لڑکی.......... بھوت (بہت) غصہ آیا مجھے پر جب قریب جا کر بازو پکڑا تو تپ میں پھنک رہی تھی۔ اے بابا! اس کی ذمہ داری اللہ نے تمہیں سونپی ہے۔ یوں بے پروا رہتے ہو بچی سے؟ اور جو میں نہ دیکھتی تو.......... اور اللہ نہ کرے اسے وہیں کچھ ہو جاتا تو؟"

وہ سخت غصے میں تھیں.......... گلو سر جھکائے کھڑا تھا۔ امام دین کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ چاچا نازاں کو بانہوں میں سمیٹے ہوئے روئے جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"بٹیا مجھے بتایا ہوتا.......... مجھ سے کہا ہوتا بٹیا.......... اکیلی کیوں چلی گئی؟"

"لٹاؤ تو اسے.........." چاچی نے پلنگ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

وہ لیٹی تو اس کے چہرے پر کھنڈی زردی گلو کو صاف نظر آگئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر نقاہت تھی۔ چاچی نے اسی وقت دودھ گرم کر کے اسے دیا۔ چاچا نے پیناڈول کی دو گولیاں اسے دودھ کے ساتھ کھلا دیں.......... امام دین ان سے اجازت لے کر کھانا کھائے بغیر چلا گیا اور جاتے جاتے گلو سے سویرے گیراج پر آنے کو کہہ گیا۔

گلو کی بھوک اڑ چکی تھی۔ چاچا نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ نازاں نے ضد کر کے کھانا نکالا اور ان دونوں کو لے کر بیٹھ گئی۔ "زندگی میں تو بہت کچھ ہوتا ہے چاچا۔ لوگ کھانا پینا تو نہیں چھوڑتے۔ کھانا چھوڑنے سے کون سے مرجاتے ہیں اور جب مرتے ہی نہیں تو اذیت اٹھانے سے کیا فائدہ؟ میں تو پھر غیر ہوں۔ ایک نہ ایک روز مجھے یہاں سے جانا ہی ہے تو پھر.......... تم دونوں کھانا چھوڑ کر کیا کرو گے؟"

گلو کا جی چاہا کہ اسے کہہ دے کہ اب تقریریں کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر کہہ نہ سکا۔ اس کا تو یہ بھی جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے پوچھے کہ تو گئی کہاں تھی؟ اتنی دیر کہاں رہی؟ مگر ڈرتا رہا کہ چاچا سالن کی پلیٹ اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارے گا۔ وہ اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا۔ "کم از کم چاچا کو تو پوچھنا چاہیے تھا۔" اس نے غصے سے بھناتے ہوئے سوچا۔

"تو کیوں گئی تھی نازاں.......... اور کہاں گئی تھی؟" اچانک چاچا نے پوچھ لیا جیسے وہ گلو کے دماغ کے اندر ہی بیٹھا ہو۔

یہ سن کر گلو نے سر اٹھایا۔ نازاں کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ وحشت سوا ہو گئی اور گلو کو یوں لگا جیسے اسے چاچا نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

"میں.......... چاچا میں لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔"

"کیوں؟" گلو خود پر قابو نہ رکھ سکا۔

"بخار تھا ناں! اس لیے۔" اس نے بوکھلا کر جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ ڈاکٹر صلاح الدین جو بیٹھتا ہے نکڑ پر۔" گلو نے نوالہ نگلتے ہوئے کہا۔

"وہ............ میں نے کہا کہ تو............ تو ناراض ہو گا۔" اس کی آواز کے ساتھ اب اس کے ہاتھ بھی لرزنے لگے تھے۔

"کیوں............ تو میری جورو ہے کیا؟"

اور گلو کو لگا جیسے وہ دھماکے سے پھٹ جائے گی یا گر کر بے ہوش ہو جائے گی۔ اس کی حالت کچھ ایسی ہی ہو گئی تھی۔

"اچھا چپ کر تو............" چاچا نے ایک دم ہاتھ سے نوالہ پھینک کر اسے جھڑکا۔

اور گلو واقعی چپ ہو گیا لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ نازاں اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ پانی لینے کے بہانے اٹھ گیا۔ جانتا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا رہا تو زبان پہ قابو نہیں پا سکتا لیکن جاتے جاتے بھی بڑبڑایا۔ "ڈاکٹر کے پاس جانا تھا تو کہہ نہیں سکتی تھی۔"

"کس سے کہتی؟" نازاں ایک دم پھٹ پڑی۔ چیخ اٹھی۔ "کسے اپنا دکھ بتاتی؟ کون ہے میرا جو میری مدد کرتا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

گلو دم بخود رہ گیا۔ اسے امید نہیں تھی کہ نازاں اس سے اس لہجے اور اس انداز میں بھی بول سکتی ہے۔ وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ چاچا نے کیا کہا اور نازاں نے کیا سمجھا۔ اس رات گلو کو نیند بالکل نہیں آئی۔ کبھی اس کی آنکھوں کے آگے چمک دار آنکھیں تیرنے لگتیں اور کبھی نازاں کے آنسو۔ امام دین کا رویہ بھی اسے شرمندہ کیے ہوئے تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے گلو کے بارے میں اچھا نہیں سوچا ہو گا۔

"پھر کیا کروں............ کیا کروں میں؟" وہ بڑبڑایا۔

"اس سے شادی کر لے۔" چاچا کی آواز سن کر وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ چاچا دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا۔ "گلو! خدا سہارا دینے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اسے عزت دے دے۔ یوں اس کا اس گھر میں رہنا بھی مناسب نہیں ہے۔ میں بہت دن سے پریشان ہوں۔ تجھے تو پتہ نہیں محلے والے باتیں بنا رہے ہیں۔ رحمان بتا رہا تھا اور آج اس کی بیوی بھی کہہ رہی تھی کہ............"

اس نے پھر انکار کرنا چاہا۔ چاچا سے لڑنا چاہا۔ اسے بتانا چاہا کہ اسے دو چمکدار آنکھوں کی تلاش ہے۔ ان آنکھوں کی جن کو اس نے دوسری بار کھو دیا ہے مگر عین اسی لمحے رحمان چاچا بھی آ گیا۔ چاچا نے اس کے سامنے ہی ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بھی اپنی بیوی سے نازاں کا حال سن کر آیا تھا۔

"ٹھیک کہتا ہے یہ۔" چاچا رحمان نے فوراً ہی تائید کی پھر وہ دونوں اسے اونچ نیچ سمجھاتے رہے۔ وہ سنتا رہا مگر ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے زبان سے اقرار کر کے نہ دیا مگر اگلی صبح جب امام دین نے اسے جی بھر کر ذلیل کیا۔ اسے بے حس، انسانیت سے عاری اور بے غیرت کہا تب گلو کو لگا کہ اسے ان لوگوں کی بات مان لینی چاہیے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر بے وجہ پھرتا رہا۔ کہیں پنیجر اٹھائے، کہیں ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا چلا گیا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ایک گیٹ کے آگے رک گیا ہے۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ اس نے کب بریک پر پاؤں رکھا اور کب گاڑی جھٹکا کھا کر رک گئی۔ جب اس نے سر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھا تو اس کا دل اچھل پڑا۔ یہ وہی گیٹ تھا جہاں وہ کچھ روز پہلے غلام رسول اور اس کی بیوی کو چھوڑ کر گیا تھا۔ سامنے سیاہ رنگ کا بڑا سا گیٹ تھا۔ وہ عین اسی گیٹ کے سامنے کھڑا تھا اس لئے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ذرا دور آگے درخت کے نیچے کھڑی کر دی۔

"میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔ "کیا اس لنگڑی کی تلاش میں؟ مگر کیوں............؟" وہ خود سے پوچھتا رہا مگر اس کے پاس کسی بات کا جواب نہیں تھا۔

دن ڈھل چکا تھا۔ رات آ رہی تھی۔ امام دین کی جھڑکیاں، چاچا کی منتیں اور نازاں کی سسکیاں اس کے اندر چک پھیریاں ڈال رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کا بیکار اور فالتو ترین آدمی سمجھ رہا تھا جو اپنے لئے نہ پیدا ہوا، نہ ہی جی رہا تھا اور نہ شاید مرے گا۔ وہ اسٹیئرنگ پر سر رکھے گھنٹوں بیٹھا رہا پھر اس نے گھر جانے کا فیصلہ کیا تو اس کے چہرے پر سکون تھا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ آج ہی چاچا سے کہہ دے گا کہ نازاں سے شادی کے لئے تیار ہے اور امام دین نے بھی تو کہا تھا کہ تو ایسی کسی عورت کو آخر کب تک ش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرے گا جو تجھے جانتی بھی نہیں۔ آج امام دین نے اس سے سب کچھ اگلوا لیا تھا اور جب گلو نے اسے بتایا تو وہ اتنا ہنسا' اتنا ہنسا کہ گلو کو اپنی تضحیک محسوس ہوئی۔

"کیا تو............ تجھے یقین ہے کہ وہ جب بھی تجھے ملی' تجھ سے اقرار محبت کر کے شادی بھی کر لے گی؟ سالے اس نے ٹھکرا دیا تو ساری زندگی پچھتائے گا اور پھر محبت............ محبت تو شادی سے بالکل الگ چیز ہے گلو............ اگر کبھی مل بھی گئی اور محبت کا اقرار بھی کر لیا اس نے تو............ تو کیا ہو گا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ تجھ سے جدا ہو جائے گی مگر یہ احساس کہ اس دنیا میں کوئی تجھے اور تو کسی کو چاہتا ہے' تیرے زندہ رہنے کو کافی ہو گا۔"

اور یہ آخری بات ہی گلو کو پگھلا گئی تھی۔ تبھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور جب اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے بتیاں جلائیں تو اچانک ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر کوئی اندر بیٹھ گیا۔ یہ اتنے اچانک ہوا کہ گلو کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ وہ ابھی پلٹا بھی نہ تھا کہ ایک آواز نے اس کے وجود کو جھنجھنا کر رکھ دیا۔ "سیدھے چلو۔"

گلو کے بدن سے یوں پسینہ پھوٹ پڑا جیسے کہ اچانک ابکائی آتی ہے۔ یہ آواز وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس آواز کو سننے کے لئے اس نے مہینوں جانو کے گھر کے چکر لگائے تھے۔ اس کی گاڑی اپنی قمیض کے دامن سے رگڑ رگڑ کر صاف کی تھی۔ اسی آواز پر لپک جھپک کر بڑا آدمی بن جانے کا خواب اس نے لڑکپن سے جوانی تک دیکھا تھا۔ اس وقت اس کرخت اور کھردری آواز میں اسے بے پناہ مٹھاس اور لوچ محسوس ہوتا تھا حالانکہ اس وقت بھی یہ آواز سن کر اس کا دل اتنی ہی زور سے دھڑکتا تھا جتنی زور سے آج دھڑکا تھا اور حلق میں آ کر لوہے کے گولے کی طرح کوئی چیز پھنس گئی تھی۔ آج پہلی بار اسے اندھیرا اپنی پناہ گاہ محسوس ہوا تھا۔ اس نے ڈھیلے اور ٹھنڈے پڑتے ہاتھ پاؤں کو مشکل سے سنبھالا' گیئر ڈالا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اس کا جی تو چاہا تھا کہ وہ گاڑی کسی گہرے اندھیرے کونے میں کھڑی کر کے کسی پتلی گلی میں اتر کر بھاگ لے مگر............ اس میں تو اس کی بھی ہمت نہیں تھی۔ باہر چلنے والی خنک ہوا نے جیسے اس کے کانوں میں کوئی سرگوشی کی۔ ٹیکسی کی رفتار ذرا سی کم ہوئی۔ اس نے دونوں سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا

تولیہ نکال کر سر پر ڈالا۔ یوں جیسے سردی لگ رہی ہو۔

یہ تولیا دوسری بار اس کے کام آیا تھا۔ لس بیلہ سے اس سیاہ گیٹ تک وہ اسی کو لپیٹے رہا تھا کہ کہیں غلام رسول اسے نہ پہچان لے اور آج بھی اسی سیاہ گیٹ کے قریب اسے اس تولیے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ گاڑی تھوڑی سی لہرائی تھی جبھی پیچھے سے غراہٹ کی آواز آئی۔

"سامنے دیکھو............ اور رفتار تیز کرو............" استاد فتح کی گرجدار آواز نے گلو کے بدن میں کانٹے سے اتار دیئے۔

کنپٹیوں سے کانوں کی لو تک آ جانے والا پسینہ ایک دم ہی اس کے جبڑے تک پہنچ گیا۔ اس نے بے ساختہ ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی کو ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ تیز رفتاری سے چکنی سڑک پر پھسلتی چلی گئی۔ آگے چورنگی تھی۔ گلو کا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ پیچھے بیٹھا ہوا موت کا فرشتہ کس طرف جائے گا؟ نہ ہی اس نے بتایا اور پوچھنے کی ہمت تو گلو میں تھی ہی نہیں۔ چورنگی قریب آتی جا رہی تھی' گاڑی کی کم ہوتی ہوئی رفتار کے ساتھ ساتھ گلو کا سانس پھولتا جا رہا تھا............ پھر وہ گلا پھلا کر آواز کو بھرا کر پوچھنے ہی والا تھا کہ پشت پر سے ایک بار پھر آواز آئی۔

"سنو!"

"جی!" اس نے یہ چھوٹا سا لفظ بھی ایسے ادا کیا تھا جیسے حلق میں کسی کھچیاں کھڑی کر دی ہیں۔

"یہاں الٹے ہاتھ کو سفید عمارت کے قریب گاڑی لے چلو' رفتار آہستہ رکھنا............"

گلو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ گاڑی سروس روڈ پر لے لی اور رفتار آہستہ کر لی مگر اب اس کے لئے خطرہ بڑھ گیا تھا۔ الٹے ہاتھ پر روشنیوں سے جگمگاتی دکانیں تھیں' بڑے بڑے شاپنگ سنٹر تھے۔ اسے خوف تھا کہ فتح اسے پہچان لے گا مگر جب تک وہ اس کی پشت پر بیٹھا تھا' وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں اگر وہ گاڑی سے نیچے پاؤں اتارتا تو شاید گلو زن سے گاڑی نکال کر لے جاتا۔ گلو دعا بھی مانگ رہا تھا کہ کسی طرح جان بچ جائے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ جانتا تھا کہ اگر فتح نے اسے پہچان لیا تو شاید یہیں اسے ختم کر دے گا مگر بعد میں اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ابھی' اس وقت پوزیشن میں نہیں ہے کہ گلو پر ہاتھ ڈال سکے اور یہ اندازہ اسے اس وقت ہوا جب اچانک فتح نے آگے سرک کر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھ دیا اور گلو دہشت سے اچھل پڑا۔

"گھبراؤ نہیں.........." اس نے اچانک نرم اور ہلکی آواز میں سرگوشی کی۔ "یہ لو۔"

گلو نے اپنے دائیں کاندھے کی طرف دیکھا' کڑک دار سو کا نوٹ اسے دیکھے بغیر ہی اپنی موجودگی کا احساس دلا چکا تھا۔ اس نے چپ چاپ نوٹ لے لیا۔

"اسی دکان کے باہر رکنا۔ اور سنو! میرے آتے ہی ٹیکسی بھگا لے جانا۔ اسٹارٹ رکھنا' منزل پر پہنچ کر تمہیں انعام بھی مل جائے گا۔" اس نے اتنا کہتے ہی اس کے کاندھے پر دباؤ ڈالا اور پھر دروازہ کھول کر رینگتی ہوئی گاڑی سے اتر گیا.......... وہ تیزی سے ایک جنرل سٹور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے جنرل اسٹور میں داخل ہوتے ہی گلو نے پھر ایکسی لیٹر پر دباؤ ڈالا اور زن سے گاڑی نکال لے گیا.......... وہ ایسے ٹیکسی بھگا رہا تھا جیسے موت اس کا تعاقب کر رہی ہو۔ کافی دور آ کر اس کے اوسان بحال ہوئے تو اس نے سر پر پڑے تولیے کو اتار کر اس سے پسینہ پونچھا اور ٹیکسی کی رفتار دھیمی کر لی۔

گلو کو یقین تھا کہ فتح اسی کوٹھی سے باہر آیا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لڑکی اور لنگڑی عورت اب بھی وہیں تھیں.......... "مگر.......... میں کیا کروں؟" وہ خود کلامی کرنے لگا۔ "میں یہاں کیوں آیا تھا؟ کس کی تلاش تھی..........؟ کس کس کو تلاش کروں گا؟"

اس نے سر کو جھٹکا دیا اور غصے میں رفتار پھر بڑھا دی۔

"لعنت ہے ایسی زندگی پر' سالا نہ چین ہے نہ سکون.........." وہ دانت کچکچا رہا تھا۔ راستے میں کئی لوگوں نے اسے ہاتھ دیا مگر وہ نہیں رکا۔ اس کا رخ لس بیلہ کی طرف تھا۔ ابھی وہ گرومندر پر ہی پہنچا تھا کہ اچانک اس نے بریک لگا دیا۔ پیچھے آنے والے کئی لوگ چیخ اٹھے' کئی گاڑیوں کے بریک چرچرائے مگر گلو کو جیسے کسی کو پروا ہی نہیں تھی۔ وہ تو سڑک پر لڑکھڑاتے ہوئے چاچا کو دیکھ کر باؤلا ہی ہو اٹھا تھا۔ اس نے تیزی سے دروازہ

کھولا اور چاچا کی طرف لپکا' قریب پہنچتے ہی وہ پھٹ پڑا۔

"کیا کر رہا ہے تو یہاں؟"

"گلو.......... گلو وہ.......... وہ چلی گئی.........." چاچا اس کے سنبھالتے سنبھالتے فٹ پاتھ پر ڈھے گیا۔

"اٹھ.......... یہاں سے اٹھ چاچا۔" گلو نے پوچھا ہی نہیں کہ کون چلی گئی تھی۔ اسے تو چاچا کی حالت نے پریشان کر دیا تھا۔ وہ اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے سہارا دیتا ہوا ٹیکسی تک لے آیا۔ ٹیکسی میں اسے پچھلی سیٹ پر بٹھا کر وہ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ "اب بول.......... کیا ہوا.......... کون چلی گئی؟" اس نے بیک مرر درست کرتے ہوئے کہا۔

"وہ نازاں گلو.......... نازاں چلی گئی.........." چاچا اس بار رو پڑا۔

"نازاں چلی گئی؟" وہ حیرت سے بولا۔ "کہاں.......... کیوں چلی گئی؟"

"پتہ نہیں۔ رحمان کا پوتا بتا رہا تھا کہ وہ کہہ گئی کہ اب اسے تلاش نہ کیا جائے۔ وہ ہمیشہ کے لئے جا رہی ہے۔"

"اچھا تو رو تو نہیں.........." وہ جھنجلا گیا۔ چاچا کے آنسو جیسے اس کے اندر سیلاب سا بہا لے آئے تھے۔ "چلی گئی تو ٹھیک ہے چلی گئی۔ ہم نے کون سا ساری عمر کا ٹھیکہ لیا تھا.......... کچھ سوچ سمجھ کر ہی گئی ہو گی.........." اسے نازاں پر غصہ آنے لگا۔ "بڑی کمینی تھی' احسان فراموش۔" وہ بڑبڑایا۔

"کمینی وہ نہیں تھی' تو تھا.........." چاچا جیسے بل کھا کر سیدھا ہو گیا۔ "تو احسان فراموش ہے۔"

"اچھا بس.......... یہ تیرا گھر نہیں ہے۔ سڑک ہے۔" گلو نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔ پہلے ہی اس کا دماغ چٹخا ہوا تھا۔ یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ چاچا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں گزرتی روشنیوں میں یوں چمک چمک کر بجھ رہی تھیں جیسے سگنل پر پیلی روشنی رات گئے خود ہی خود جلنے بجھنے لگتی ہے اور ڈرائیور محتاط ہو جاتے ہیں۔ گلو بھی محتاط ہو گیا تھا۔ بیک مرر میں چاچا کی آنکھوں کی چمک اور پھر ان میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سکڑتا پھیلتا اندھیرا اس میں عجیب طرح کا خوف پیدا کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے ٹیکسی گلی میں موڑ دی۔ چاچا کو اتار کر گھر میں داخل ہوا۔

اسے پلنگ پر لٹاتے ہوئے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھیں تو اسے چاچا پر غصہ آنے لگا۔ عجیب آدمی تھا، محبت کرنے کا ہوکا تھا اسے، ہر کسی سے محبت کرنے لگتا تھا۔ وہ اپنا ہو یا غیر، تمیز ہی نہیں تھی اسے۔

"گلو! جا اسے دیکھ.......... تلاش کر اسے۔" وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تلاش..........؟" یہ لفظ گلو کے اندر سے بگولے کی طرح اٹھا۔ "کس کس کو تلاش کروں گا میں۔ میری تمام زندگی لوگوں کو تلاش کرنے ہی میں گزرتی رہے گی کیا؟!" وہ پھٹ پڑا۔

چاچا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کسے تلاش کر رہا ہے تو.........."

سرسراتی سی آواز اس کے حلق سے نکلی جو خوف میں لپٹی ہوئی تھی۔ گلو کی آنکھیں جلنے لگیں مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ اس نے صراحی سے ٹھنڈا پانی گلاس میں انڈیلا اور چاچا کو تھما دیا۔ چاچا کی آنکھیں گلو پر جمی ہوئی تھیں۔ گلو نگاہیں چرا گیا۔ چاچا نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔

"وہ اب نہیں ملے گی چاچا، جو آدمی کھو جاتا ہے وہ مل جاتا ہے مگر جو.......... چلا جاتا ہے وہ نہیں ملتا۔ کبھی نہیں ملتا.........." ایسا کہتے ہوئے گلو اچانک ہی ہلکا پھلکا ہو گیا۔

اسے ایک دم ہی اپنا کام بہت کم لگنے لگا۔ وہ بھی تو بالکل بے وقوف تھا، اپنی ماں کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کو، جو خود اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور جو کچھ اس نے ابھی ابھی چاچا سے کہا تھا۔ اسے اب سے پہلے وہ خود بھی نہیں جانتا تھا ورنہ..........

"گلو! وہ بے سہارا کہاں جائے گی؟"

"کہیں بھی چلی جائے گی، تیرے جیسے اور بھی تو بے وقوف ہوں گے دنیا میں، اب چل سنبھال اپنے آپ کو، ہر کسی سے اتنی توقعات باندھ لیتا ہے کہ بس.......... وہ تیری کوئی سگی تھی؟ ساری عمر کیوں تیری خدمت کرتی؟" وہ جھنجھلا گیا۔

"گلو! خدا کے واسطے کبھی تو انسانوں کی طرح بھی سوچا کر.......... سوچ تو..........

کیسے اور کہاں گزارے گی؟"

"مگر وہ گئی کیوں ہے؟ صبح تو ٹھیک تھی۔"

"کہاں ٹھیک تھی گلو، یہی تو فکر ہے مجھے، اسے تو بخار بھی تھا۔ میں نے تو کچھ کہا نہیں تھا۔ میں تو روٹی کھا کے ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹا تھا۔ گھنٹہ بھر بھی نہ گزرا ہو گا کہ میں نے اسے آواز دی۔ کوئی جواب ہی نہیں ملا تو اٹھ کر دیکھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ باہر نکلا تو رحمان کا پوتا ٹیپو آ رہا تھا دہی لے کے، اس نے بتایا کہ نازاں رستے میں ملی تھی اور مجھ سے کہہ گئی ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے جا رہی ہوں۔"

"اچھا اب تو چلی گئی ناں ہمیشہ کے لئے اب کیا کروں؟" گلو اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"گلو! میرے بچے اسے ڈھونڈ.........."

اور گلو پورے محلے میں ڈھونڈتا ہوا خالہ حمیدہ کے محلے میں بھی جا کر پوچھ آیا۔ سارے علاقے میں دھوم مچ گئی کہ نازاں غائب ہو گئی۔ جن لوگوں کو اس کے یہاں رہنے پر دال میں کچھ کالا لگا کرتا تھا وہ جھٹ چاچا کے پاس پہنچ گئے۔ کرید کرید کر پوچھتے رہے اور چاچا تفصیل بتا بتا کر تھک گیا اور جب گلو نے امام دین کو بتایا کہ نازاں چلی گئی تو وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھتا رہا گیا۔

"کہاں چلی گئی؟"

"مجھے کیا پتہ.......... مجھے بتا کر گئی ہوتی تو میں لے نہ آتا۔" وہ پھر چڑ گیا۔

"گلو! کیا وہ تجھے پیار کرتی تھی؟"

"ہیں.........." گلو حیران رہ گیا۔ یہ خیال تو اسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ شروع شروع میں اس سے شادی کی بات تو ہوئی تھی مگر خالہ حمیدہ کی موت کے بعد تو اس نے ایسی کوئی بات نہ کی تھی نہ ظاہر ہونے دی تھی۔ اور ظاہر کرتا بھی کیسے؟ اچانک ہی تو اسے لگا تھا کہ وہ غلط کر رہا تھا پھر اس نے کبھی اس حد تک بڑھنے ہی نہ دیا کہ وہ ایسا کچھ سوچتی یا اس سے کچھ کہتی۔

"بول ناں!" امام دین نے اسے کھویا دیکھ کر پھر مخاطب کیا۔

"ہیں.......... نہیں تو.......... پتہ نہیں ماما.......... ایسا اس نے کچھ کہا تو نہیں تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ویسے بھی مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔" گلو ایک دم ہی اکھڑ گیا۔

"کیسی عجیب بات ہے گلو! وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ میں اسے پیار کرتا ہوں مگر وہ.......... وہ کچھ بھی نہیں کہتی۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ میں کہیں جھوٹ بولتا ہوں' کہتا ہوں منگیتر ہے' شادی کر رہا ہوں' کہیں کہتا ہوں دوست کی بہن ہے' بے سہارا ہے' اچھا لڑکا ڈھونڈ رہا ہوں' وہ دونوں باتیں سنتی ہے' کانوں میں پڑ ہی جاتی ہیں۔ مگر.......... کچھ بھی نہیں کہتی۔ نہ لڑتی ہے کہ جھوٹ کیوں بولا۔ نہ کہتی ہے جھوٹ بولا ہے تو نبھا دو۔"

"تو اس سے پوچھتا کیوں نہیں؟" گلو قریب سرک آیا۔

"ڈرتا ہوں۔ جس آس میں زندگی اچھی لگ رہی ہے وہ آس ٹوٹ گئی تو کیا کروں گا؟"

"پھر اگر وہ کچھ نہیں کہتی تو شادی کرلے' میں پوچھوں اس سے؟"

"تو.......... مگر تو کیسے پوچھے گا؟" وہ کچھ کچھ تیار ہو گیا۔

"بس پوچھ لوں گا.........." گلو نے کچھ کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں یار گڑبڑ ہو جائے گی۔ چھوڑ' جیسی گزر رہی ہے گزار دوں گا۔ اور پھر ضروری تھوڑی ہے کہ جسے پانا چاہو وہ مل ہی جائے۔" امام دین نے پاس سے گزرتے ہوئے لڑکے کو پانا اٹھانے کو کہا۔

اور گلو اٹھ گیا.......... امام دین روکتا رہا مگر اسے ساری فکر چاچا کی تھی۔ اسے پتا تھا کہ گھر کا سناٹا اس کے گلے میں پھندا بن کر پڑا ہوگا۔ وہ تو اس کے غم میں گھل گھل کر جان دے دے گا۔ چلتے چلتے اسے یاد آگیا کہ آج ہی کہیں شروع ہونے والی شام اسے نئے عذابوں میں ڈال گئی ہے۔ اس نے امام دین کو فتح کے بارے میں بتایا اور جب اس نے جنرل اسٹور پر چھوڑ کر فرار ہونے والا قصہ سنایا تو امام دین کا رنگ ایک دم سفید ہو گیا۔

"کون سا جنرل اسٹور تھا وہ؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں مگر تین تلوار والی چورنگی پر دائیں طرف والا۔" اس نے پہلے سرسری انداز میں جواب دیا پھر اس کے سفید ہوتے ہوئے رنگ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں.......... تو جا۔" وہ ہاتھ اپنی پینٹ سے رگڑتا ہوا کھڑا ہو گیا مگر گلو کو لگ رہا تھا جیسے زمین نے اس کے قدم تھام لئے ہیں۔ اس کی چھٹی حس گھنٹیاں سی بجا رہی تھی۔ شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔

"جا یار! تیرا وہ بوڑھا چاچا گلی میں بیٹھا ہوگا۔"

امام دین کا انداز ایسا تھا کہ گلو اس سے کچھ بھی نہیں پوچھ سکا اور بوجھل قدموں سے ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

☆============☆============☆

امام دین نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ چاچا سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سیڑھی پر بیٹھا تھا۔ آج اس کے ساتھ رحمان چاچا بھی تھا جو وہیں بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ گلو کو دیکھتے ہی چاچا کی بجھی ہوئی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے روشنی سی چمکی مگر ٹیکسی میں سوائے گلو کے کسی اور کو نہ پا کر وہ پھر ڈھے گیا۔ گلو کے اترنے سے پہلے ہی اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا.......... ملی؟"

"رحمان چاچا! اسے بتا یار.......... سمجھا کہ گھر چھوڑ کر جانے والے ملا نہیں کرتے.......... جو گئے تھے' وہی نہ لوٹے آج تک۔" چاچا نے اسے دکھ بھری نگاہوں سے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

گلو نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ رحمان چاچا نے اسے سمجھایا یا نہیں اتنا تو پتہ نہیں چلا مگر کچھ دیر بعد جب گلو نہا کر نکلا تو چاچا تیار بیٹھا تھا۔ رحمان چاچا بھی تیار تھا۔ آج انہیں ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔ وہ ان دونوں کو لے کر اسماعیل کے بتائے ہوئے ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ڈاکٹر بہت اچھا تھا۔ اس نے دو گھنٹے کا معائنہ کیا' ٹیسٹ لئے' ایکسرے کیا پھر دوائیں تجویز کر کے گلو کو کچھ ہدایات دیں' تسلی دلائی اور یہ بتانے کے لئے اصل میں چاچا کو کیا تکلیف ہے' اگلے روز کا ٹائم دے دیا۔ شاید اسماعیل کی اس سے بات ہو چکی تھی اسی لئے وہ اتنی توجہ اور شفقت سے چاچا کی ہر معقول نامعقول بات سن رہا تھا۔ جب چاچا نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ "دیکھو بھیا ڈاکٹر صاب! کچھ بھی کرلینا' کڑوی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کڑوی دوا دے دینا' جتنے چاہو انجکشن لگوا دینا' مگر اسپتال میں نہیں رہنے کا میں۔"

تب ڈاکٹر ہنس پڑا تھا۔ "میں کون سا تمہیں رکھ رہا ہوں یار میرے بہت بکھیڑے ہیں۔ تم گھر پر رہو اور عیش کرو' بس دوا وقت پر لینا اور چیک اپ کرانے کے لئے وقت پر پہنچنا۔"

ڈاکٹر نے گلو کو اطمینان دلا دیا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ چاچا کو برین ٹیومر نہیں ہے۔ گلو کو یوں لگا تھا جیسے کسی نے اس کے جکڑے ہوئے دماغ کو ایک دم آزاد کر دیا ہو۔ کیا عجیب سا خوف تھا اسے جو بری طرح جکڑے ہوئے تھا۔ ایک دم اکیلے رہ جانے کا خوف........... حالانکہ بقول امام دین وہ اب بھی اکیلا تھا۔ ہر شخص اکیلا ہے پھر بھی.......... گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے پر زنجیر کھولنے والا کتنا اہم ہوتا ہے' اس کا اسے شدید احساس تھا۔ اس چاردیواری میں جہاں سکون ہو' داخل ہونا ہی تو سکون پانے کا سبب ہوتا ہے اور یہاں گلو کے لئے چاچا اہم تھا۔

پھر گلو نے ساری دوائی لے کر دے دی۔ رحمان چاچا نے بڑی فراخ دلی سے پیش کش کر دی تھی کہ اب چاچی اور وہ خود چاچا کا خیال رکھیں گے اور انہوں نے ایسا کر کے دکھا دیا۔ اگلے ہی روز سے چاچی نے ان دونوں کے کھانے پکانے کی ذمے داری پوری کر شروع کر دی۔ بڑی مشکل سے گلو نے اس پر راضی کیا تھا کہ وہ پکانے کی تمام چیزیں گ کے گھر سے لیا کریں گی پھریوں ہونے لگا کہ بکھیڑا اٹھا کر اپنے گھر لے جانے کی بجائے وہیں آ کر پکانے لگیں اور جب گلو کو ادھر اطمینان ہو گیا تو زندگی ٹھہرے ہوئے پانی پر تیر محسوس ہونے لگی۔ گلو کو حیرت تھی کہ اسماعیل اسے نوٹوں کی گڈی دے کر بھول گیا۔ روز سے امام دین کی طرف بھی نہیں جا سکا تھا۔ وہ بھی نہیں آیا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلا اس روز فتح کے بارے میں سن کر اس کا رنگ سفید کیوں ہوا تھا اور وہ کیوں ایک دم کھ ہو کر اس سے الجھ گیا تھا کہ وہ چلا جائے۔

بڑے دنوں کے بعد گلو نے آج واپسی پر ٹیکسی امام دین کے گیرج کی طرف موڑ گلی میں داخل ہوتے ہی اسے چھوٹے کی تان سنائی دی تو دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ گو ٹرے ایک ہاتھ پر رکھے ہوٹل اور گیراج کے درمیان کی سڑک کراس کر رہا تھا۔ "یہ آ

مجھ کو کیا ہوا لرا لرا لرا۔"

بے اختیار گلو کا جی چاہا کہ بھاگ کر اسے سینے سے لگا لے۔ اس نے ٹیکسی کی رفتار بڑھائی اور اس کے قریب لے جا کر ایک دم بریک لگا دیا۔ وہ ایک لمحے کو اچھل پڑا' جونہی اس پر نگاہ پڑی۔ اس کی باچھیں کھل اٹھیں' وہ ایک دم مٹکنے لگا۔ گیراج پر ہی نہیں' ہوٹل پر بھی موجود ہر شخص ہنس رہا تھا۔ خوش تھا۔ وہ اداسی جو اس کے جانے سے لے کر آج تک یہاں طاری تھی کہیں ہواؤں میں تحلیل ہو چکی تھی۔ گلو ٹیکسی سے اترا تو چھوٹا دوڑ کر اس سے لپٹ گیا۔ "چھوٹے کیسا ہے تو؟" گلو نے سینے میں نرم نرم سی لہریں بہتی محسوس کیں۔

"جیسا گیا تھا بالکل ویسا ہی.........."

گلو نے سنا تھا کہ وہ یہاں سب سے کہہ کر گیا ہے کہ وہ اب آئے گا تو اسے کوئی پہچانے گا بھی نہیں' اس لئے کہ اس کا کوئی رشتے دار مر گیا ہے اور وہ اس کے لئے بہت سی دولت اور جائیداد چھوڑ کر مرا ہے مگر نہ تو اس کے حلیے میں فرق آیا تھا' نہ اس کے چہرے کا رنگ ہی نکھرا تھا۔ وہی آنکھوں میں تنہائی اور وہی چہرے پر اکیلے پن کا احساس کھنڈا ہوا تھا۔ واقعی وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا گیا تھا.......... وہی انداز' وہی تانیں اڑانا وہی مٹکنا۔ اور وہی کام' یہ گول ٹرے امام دین نے بتایا تھا کہ ہوٹل کے مالک نے اس کے جانے کے بعد لکڑی کی اس الماری میں رکھوا دی تھی جہاں وہ اپنے دھلے ہوئے کپڑے اور برتن رکھا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ ٹرے اس نے چھوٹے کے لئے خریدی تھی کیونکہ وہ پرانی ٹرے میں برتن لے جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ آج وہی ٹرے اس کے ہاتھوں میں تھی۔

امام دین شاید اسے دیکھ کر ہی کسی گاڑی کے نیچے سے برآمد ہوا تھا مگر اس پر نگاہ پڑتے ہی گلو کے حلق سے قہقہہ ابل پڑا تھا۔ اس کا سر اوپر لگے بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس کے گھنے بال آج اس کے سر پر نہیں تھے۔

"کیوں ہنس رہا ہے؟" امام دین نے قریب آ کر نتھنے پھلا کر پوچھا۔

"یہ.......... یہ کیا کیا تو نے؟ اتنے اچھے بال.........."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شرط ہار گیا تھا اور تجھے پتہ ہے میں قول کا پکا ہوں۔"

"کیسی شرط؟" گلو نے بنچ کو اندر کی طرف سرکا کر اس پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اس حادثے کا ذمہ دار میں ہوں۔" اسے پیچھے سے چھوٹے کی غمزدہ آواز سنائی دی۔

"کیا مطلب؟" گلو نے حیرت سے چھوٹے اور امام دین کو دیکھا جو چھوٹے کو خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں نے تو اسے منع کیا تھا کہ اتنے اچھے بال بے وقوفی کی شرط پر ضائع مت کر مگر.........." اس نے کندھے اچکائے۔

"چل بھاگ یہاں سے۔" امام دین نے اسے مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا اور چھو اچھل کر دو قدم پیچھے ہو گیا۔ "چائے لا' خوب کڑک دار۔" پھر امام دین نے بتایا کہ چھوٹے کے چلے جانے دو ہفتے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ واپس نہیں آئے گا۔ اس نے جان بوجھ کر ہوٹل کے مالک ملک حسین سے تذکرہ چھیڑ دیا۔ اسے یقین تھا کہ چھو چاہے سال بعد واپس آئے مگر آئے گا ضرور' اسے کوئی دولت نہیں ملنے والی اور امام دین کوئی بری بات منہ سے نہ نکالنے کے چکر میں ہی کہتا رہا کہ اب وہ کبھی نہیں آئے گا' ازکم چھوٹے کے روپ میں واپس نہیں آئے گا۔ ہاں ممکن ہے کبھی آئے تو پہچانا نہ جائے۔ اب اس کی زندگی کے دن پھر گئے ہیں۔ ملک حسین نے شرط لگالی حالانکہ اس کے سر پر بہت کم بال تھے اور اسے ان بالوں سے بے پناہ محبت تھی۔ بقول امام دین کے وہ جان دے سکتا تھا مگر سر نہیں منڈوا سکتا تھا۔ امام دین کو کوئی شرط ہارے ہوئے زمانے گزر گئے تھے۔ اسے اب بھی یہی غرور تھا کہ اب اس کے بال کبھی نہیں منڈیں گے مگر کل رات چھوٹا جس حلئے میں گیا تھا' اس سے بدتر حلئے میں لوٹ آیا۔ ملک حسین نے رات اس کی واپسی کا جشن منایا۔ گلی کے سب دکان داروں اور گیراج کے سارے لڑکوں کو مفت کھانا کھلایا اور عین کھانے سے چند منٹ پہلے گلی ہی کے نائی فلک بخش سے اس کا سر منڈوایا تھا۔ چھوٹا منع کرتا رہ گیا مگر امام دین قول کا پکا تھا۔

ساری داستان سن کر گلو خوب ہنسا۔ امام دین کا سر چٹیل میدان بنا ہوا تھا اور وہ

بار اپنا ہاتھ اپنے سر پر پھیر رہا تھا۔ اچانک گلو کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ "ماے! وہ.......... اس روز کیا ہوا تھا؟"

"کس روز؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں نے تجھے بتایا تھا ناں کہ فتح.........."

"اچھا اچھا۔" امام دین ایسے بول اٹھا جیسے اس کی بات کاٹنے کا مقصد اسے خاموش کرانا ہو پھر اس نے چاروں طرف یوں دیکھا جیسے فتح کا کوئی آدمی قریب ہی موجود ہو۔ گلو اس کا یہ انداز دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گیا تھا۔

"اس رات.......... وہاں دو آدمی قتل ہوئے تھے۔" چند لمحوں بعد امام دین نے آگے کو جھک کر سرگوشی کی۔

"کیا.......... کون؟" گلو اچھل پڑا۔

"ہوش میں رہ کر سن.......... زیادہ اچھلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان قتل ہونے والوں میں ایک اس کا اپنا آدمی احسان اللہ تھا اور دوسرا اسماعیل کا آدمی جانو۔" اس بار پھر اس کے تنبیہہ کرنے کے باوجود گلو بڑی زور سے اچھلا۔ امام دین دانت پیس کر رہ گیا۔

"احسان اللہ اور.......... اور جانو! اسماعیل کا آدمی.......... جانو..........؟"

"چپ کر جا ورنہ گلا دبا دوں گا۔"

گلو نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش بیٹھا رہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بولا تو حلق سے آواز پھٹ کر بلند ہو گی اور ساری دنیا کو پتہ چل جائے گا کہ اس روز دو قتل ہوئے تھے' ایک احسان اللہ کا اور دوسرا جانو کا اور جانو اصل میں فتح کا نہیں اسماعیل کا آدمی تھا۔

"تو.......... تو نے مجھے بتایا نہیں؟" اس نے کچھ دیر بعد آواز دبا کر شکوہ کیا۔

"تجھے اچھالنے کو بتاتا یا.......... تو دونوں کو قتل کے بعد بھی زندہ کروا دیتا؟" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"یہ کیسے پتہ چلا کہ جانو اسماعیل کا آدمی تھا؟"

"اسماعیل نے بتایا تھا۔ تجھ سے یہ سنتے ہی کہ اس جنرل اسٹور پر تو نے فتح کو اتارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے' میں نے اسے اطلاع کر دی تھی۔ اس نے جانو کو وہاں چھپا رکھا تھا۔ احسان اللہ ا
سے ملنے گیا تھا۔ شاید مخبری ہو گئی تھی۔ فتح کو اندازہ نہیں تھا کہ احسان اللہ بھی وہاں ۔
گا۔ وہ تو صرف جانو کے لئے گیا ہو گا۔ اسے وہاں دیکھ کر سمجھا کہ وہ بھی ان لوگوں سے
ہوا ہے حالانکہ وہ حرامزادہ جانو کو دوبارہ فتح کے پاس لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ خیر یہ لمبی
داستان ہے تو چھوڑ' یہ بتا چاچا کیسا ہے؟ اور وہ ملی............ کیا نام تھا اس کا؟"

"نازاں؟"

"ہاں۔"

"نہیں............ وہ ملنے کے لئے نہیں گئی ہو گی۔ البتہ چاچا کو صبر آ گیا ہے۔"

عین اسی لمحے تھرکتا' مٹکتا چھوٹا گول ٹرے بڑی مہارت سے نچاتا ان کے قریب گیا۔ ٹرے میں رکھی چائے کی پیالیاں یوں جمی ہوئی تھیں جیسے وہ بڑی احتیاط سے لایا ہو۔ ایک قطرہ بھی نہیں چھلکا تھا۔

"یہ کام چھوڑ کر تو اس کام میں زیادہ ماہر ہو گیا ہے۔" امام دین نے پیالی اٹھاتے ہوئے چھوٹے سے کہا۔

"میں ہر کام میں ماہر ہوں دادا............ کبھی آزما کر تو دیکھو۔" اس کی چھوٹی چھوٹی تیز چمک دار آنکھوں میں چیلنج تھا۔

گلو نے امام دین کو چونکتے پھر چھوٹے کو یوں گھورتے دیکھا جیسی وہ کسی بات فیصلہ کر رہا ہو' اور اپنے فیصلے کو تول رہا ہو۔ چھوٹا بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ گلو ہی نے اس سکوت اور عجیب و غریب قسم کی کیفیت کو جھٹکے سے توڑ دیا۔

"بسکٹ کہاں ہیں؟"

وہ دونوں ہی چونک اٹھے۔ "بسکٹ لاؤں کیا؟" چھوٹے نے پہلے مشینی سے اندا میں کہا پھر ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ "ارے ہاں............ میرا پیا گھر آیا او رام جی' میرا پیا گھر آیا............" وہ مٹکتا ہوا ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

گلو ہنس پڑا تھا۔ وہ جاتے ہوئے چھوٹے کو دیکھ رہا تھا تبھی اسے احساس ہوا کہ د اکیلا ہنسا ہے۔ امام دین پر اب بھی سکوت اور سکتہ طاری ہے اس نے پلٹ کر امام دین ک

طرف دیکھا وہ اب چائے کی پیالی سے اٹھتی بھاپ کو گھور رہا تھا۔ "مامے!" اس نے محسوس کر لیا کہ امام دین کسی گہری الجھن میں ہے۔

"ہوں!" اس نے بھنویں اچکا کر نظریں اٹھائیں۔

"یار میرے ساتھ یہ ڈرامے بازی نہ کیا کر۔ میں تجھ سے باتیں کرنے آیا ہوں تیرے پوز دیکھنے نہیں۔"

"گلو" اس نے گلو کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی سنجیدگی سے کہا۔ "ایک کام ہے۔ کام بڑا ہے۔ معاوضہ بھی بڑا ہے۔ میں چاہ رہا تھا کہ............ تو کر لے تو............"

"کیسا کام؟" گلو نے ایک ہی گھونٹ میں چائے کو حلق میں انڈیل لیا۔

"تھوڑا سا خطرناک ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بندہ گرانا ہے۔" اس نے گلو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"ک ک............ کیا؟" گلو پھر اچھل پڑا۔ آج اسے پے درپے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"کیا اس نے مجھے پیسے اس لئے دیئے تھے؟ کیا وہ اسی طرح مجھے پھنسانا چاہتا تھا؟"

"نہیں یار! یہ بات نہیں ہے۔ یہ کام اس نے مجھے دیا تھا' تجھے تو جیسے وہ بھول ہی گیا ہے۔"

"پھر............ تو کیوں نہیں کر رہا؟" گلو نے مشکوک انداز میں اسے دیکھا۔ "اس لئے کہ بندہ گرانا ہے' اور یہ کام تو مجھ سے کروانا چاہتا ہے۔"

"ابے تو کون سا کسی دینی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ تو نے جو اس کے ساتھ کام کرنے فیصلہ کیا تھا تو تجھے کیا یتیم خانے کا چندہ جمع کرنا ہے۔" وہ اچانک بھڑک اٹھا۔

لمحہ بھر کو گلو بھی سکتے میں رہ گیا۔ وہ کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔ اس نے اتنے بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں لینے سے پہلے ہی اس کے ساتھ کام کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس وقت وہ ہر طرح سے تیار تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے اتنی باریکی سے نہیں سوچا تھا کہ اسے کیا کام کرنا ہے مگر کام کے بارے میں اسے اتنا اندازہ تو تھا ہی کہ وہ کام غیر قانونی ہی ہو گا' اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غیر قانونی کام تو پھر غیر قانونی ہوتا ہے ایسے ہر کام کی سزا ہوتی ہے۔ جو ملنا ہی ہوتی ہے۔ جب اس نے نوٹوں کی گڈیاں دی تھیں تو اس نے بے سوچے سمجھے ہی تو نہ لے لی ہوں گی ناں.......... کیا وہ اب اسماعیل کو دھوکا دے رہا ہے۔ یا اپنے آپ کو؟ یہ سوال اس کے دماغ میں گونجا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر امام دین کو دیکھا۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کتنا معاوضہ ملے گا؟" پتہ نہیں گلو کے اندر سے کون بولا تھا۔

"پچاس ہزار روپیہ۔" امام دین کے ماتھے کی سلوٹیں ایک دم صاف ہو گئی تھیں۔

اور گلو کے چہرے پر لکیروں کا جال سا بچھ گیا۔ "پچاس ہزار.........."

"ہاں گلو!" امام دین اس کے قریب سرک آیا۔ "اتنا روپیہ کوئی کام یا نیا بزنس شروع کرنے کو کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر تو یہ کام کرلے گا تو.........."

گلو نے تھوک نگلا تو اسے احساس ہوا کہ اس کا حلق ایک دم ہی خشک ہو گیا تھا جو رقم اسے اسماعیل دے چکا تھا وہی کم نہ تھی پھر مزید پچاس ہزار تو اس کی زندگی میں انقلاب لانے کو کافی تھے مگر اس پچاس ہزار کے لئے ایک قتل کرنا تھا' یہ خیال بار بار اس کا حلق خشک کر رہا تھا۔

"وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے اور اسے کیوں مارنا ہے؟" یہ تین سوال کرتے کرتے گلو کو لگا جیسے اس کے اندر تین بڑے بڑے طوفان گزر گئے ہوں مگر جونہی اس نے سوال مکمل کیے' اسے اپنے اندر سکون سا پھیلتا محسوس ہوا یوں جیسے اندر باہر ایک دم سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔

"یہ تفصیل تجھے اسماعیل ہی بتائے گا۔ اس نے مجھے کل بلایا ہے۔ اگر تو ساتھ چلے تو.........."

"ٹھیک ہے۔ چلتے ہیں' کیا ہے؟" گلو نے جیسے خود کو تسلی دی ہو۔

اور پھر وہ اٹھ گیا۔ تمام راستے اسے اپنے اندر گہرا سکوت سا محسوس ہوتا رہا۔ اس سکوت میں بھی عجیب سا خوف تھا۔ دل بیٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر دماغ میں آندھیاں سی اٹھنے لگیں۔ جانو اور احسان اللہ کا خیال آیا تو زندگی کی بے ثباتی نے اسے بے چین کر

دیا۔ فتح کے خیال سے ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ دل کے کسی کونے میں انجانا سا خوف سرسرانے لگا۔ اسی خیال نے کہ فتح جسے چاہے قتل کر سکتا ہے اس نے اپنے دست راست کو بھی قتل کر دیا تو دشمن کو مارنے میں بھلا اس کو کیا قباحت ہو گی' گلو کو جکڑ کر رکھ دیا۔ اس نے موت کے قدموں کی آہٹ کو تعاقب کرتا محسوس کیا۔ اگر گھر نہ آیا ہوتا تو شاید یہ کیفیات اسے نڈھال کر دیتیں مگر گھر کے دروازے پر پہنچتے ہی اسے چاچا کے خیال نے گھیر لیا۔ "پتہ نہیں اس نے دوائی کھائی ہو گی کہ نہیں۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور دروازے پر دستک دینے کو ہاتھ بڑھا دیا۔ دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔ جب سے نازاں گئی تھی دروازہ کھلا ہی رہتا تھا۔

چاچا اس کا منتظر تھا۔ اسے اندر داخل ہوتا دیکھ کر اس کی نگاہوں نے اس کی پشت پر خالی چوکھٹ کو دیکھا اور دھیرے سے آنکھیں موند لیں۔ گلو کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے۔ "کس کا انتظار کر رہا ہے؟ جھاراں کا یا نازاں کا؟" اور پھر جواب بھی خود ہی دے کہ جیسے جھاراں نے تیری آدھی سے زیادہ زندگی کو انتظار کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اسی طرح نازاں بھی نہیں آنے والی اور پھر نازاں کیوں آنے لگی؟ صرف تیری خدمت کرنے کو؟ صرف اس لئے کہ تیری چاردیواری میں آوازیں گونجتی رہیں۔ تیرا دل لگا رہے' تجھے اکیلے پن کا احساس نہ ہو' چاہے وہ ہر وقت اکیلے پن کا زہر اپنے حلق میں انڈیلتی رہے۔ وہ یہ سب کچھ سوچتا رہا مگر بولا کچھ نہیں۔

احسان چاچا کی بیوی نے ٹیکسی کی آواز سن لی تھی شاید' کچھ ہی دیر بعد رحمان چاچا اور چاچی دونوں آ گئے۔ چاچی نے گرم گرم روٹیاں ڈالیں۔ چاچا کے چہرے پر رنگ سے آتے جاتے رہے۔ گلو سوچتا رہا کہ اسے بھرے گھر کی رونق ملی ہی کب ہے تبھی تو نازاں کا دم غنیمت لگتا تھا اب بھی اسے یقین تھا کہ اسے نازاں یاد آ رہی ہو گی۔ روٹیاں پکاتے ہوئے چاچا ہمیشہ اس کے قریب جا بیٹھتا تھا اور جانے کہاں کہاں کے جھوٹے سچے قصے سنا کر اسے ہنسایا اور کبھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ آج تو اسے بھی کئی بار نازاں کا خیال آیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت' چاچی کے برتن کھڑکھڑاتے وقت' جب رات کو وہ بستر پر لیٹا تو.......... ان پچاس ہزار روپوں کے خیال کے ساتھ ہی نازاں کا سراپا بھی لہرا گیا تھا۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتی اور پچاس ہزار کی رقم ملنے کا سنتی تو اس کے چہرے پر تو ہزاروں دیپ روشن ہو جاتے۔ آنکھیں پھٹ جاتیں اور وہ کہتی۔ "ہائے گلو! پھر تو سارا گھر بھی بہت اچھا ہو جائے گا اور برتن.......... برتن بھی قیمتی ہوں گے۔"

تبھی اچانک گلو کو احساس ہوا کہ وہ پچاس ہزار کی رقم کو اپنا سمجھ رہا ہے۔ کیا اس کے اندر کا سکوت اسی فیصلے کے بعد کا سکوت تھا۔ کیا وہ قتل جیسا کریہہ فعل کر سکتا ہے؟ کیا اسے ایسا کرنا چاہیے؟ جنگ شروع ہوئی تو ساری رات جاری رہی۔ گھمسان کا رن پڑا مگر سویرے وہ زخموں سے چور ہونے کے باوجود جیت چکا تھا۔ اس کے اندر کی سفاکی، سختی اور سکوت گہرا ہو چکا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ پچاس ہزار کی رقم کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ کر بزنس کر سکتا ہے اور کچھ نہ کرے تو بھی سیکنڈ ہینڈ ٹیکسی تو خرید ہی سکتا ہے۔ ٹیکسی کا ڈرائیور اور مالک ہونے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ چاچا کو دوائیں کھلا کر گھر سے نکلا تو سیدھا خان آفریدی کے پاس پہنچ گیا۔ اپنی طرف نکلنے والی رقم ادا کر کے وہ امام دین کے گیراج پر چلا گیا۔

امام دین کہہ چکا تھا کہ وہ اپنے فیصلے سے اسے صبح ہی کو آگاہ کر دے تاکہ وہ اس کے مطابق پروگرام بنا سکے۔ امام دین شاید اسی کا منتظر تھا۔ آج اس کے چہرے پر کل والی پریشانی اور اضطراب نہیں تھا گلو کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ لپک کر قریب آ گیا۔ "ہاں گلو؟"

"کس وقت جائے گا تو؟" گلو نے اس سے نگاہیں چراتے ہوئے پوچھا۔

"شام سات بجے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آجاؤں گا۔" اتنا کہہ کر گلو نے ٹیکسی اسٹارٹ کی دور کھڑا چھوٹا اچھل کر سڑک کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ٹیکسی اتنی ہی اسپیڈ سے نکالی تھی کہ اسے اچھل کر دور ہو جانا پڑا۔

☆===========☆===========☆

امام دین کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اسے یقین تھا کہ گلو تیار ہو جائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ کمزور آدمی تمام عمر کتے کی سی زندگی گزارتا رہتا ہے اور زندگی ایک ہی بار ملتی ہے۔

گلو میں فیصلہ کر کے بھی پچھتانے کی عادت تھی، وہ بس اسی عادت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ فیصلہ اچھا ہو یا برا، درست ہو یا غلط، اسے سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور اس کے بعد پچھتانے جیسی بے وقوفی نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ جب کوئی اکیلا آدمی خود فیصلہ کرتا ہے تو اپنے اندر کے اچھے یا برے کردار سے مشورہ کر کے ہی کرتا ہے یوں اس کا باطن بھی ظاہر ہو جاتا ہے اور سمجھدار آدمی کے لیے اس کا باطن پہچاننے کو یہی کافی ہوتا ہے ورنہ تو کسی اچھے یا برے کا زندگی بھر پتہ ہی نہ چلے۔

"کیا ہوا ماے! گلو چلا کیوں گیا؟" امام دین چھوٹے کی آواز پر چونک اٹھا۔

"دھندے پر گیا ہے.......... کیا نہ جاتا؟" اس نے کندھے پر پڑے کپڑے سے ہاتھوں کو رگڑا پھر اس کے کولہوں پر دھپ جما کر بولا۔ "چل تو کڑک دار چائے لا۔ تانیں اڑا، تاکہ گلی بھر میں رونق ہو جائے۔" چھوٹا ہنستا ہوا ہوٹل کی طرف چلا گیا۔ "سالے نے سب کو اپنی تانوں کا عادی بنا دیا ہے ہاتھ میں پھرتی ہی نہیں آتی اس کے ٹھمکے دیکھے بغیر۔" وہ بڑبڑایا اور سامنے کھڑی گاڑی کا بونٹ اٹھا کر اس پر جھک گیا۔ اسے دو بجے سے پہلے اپنے سارے کام نمٹانے تھے۔ ٹھیک دو بجے اسے اسماعیل کو فون کرنا تھا۔ ڈھائی بجے عثمان دادا اسے پتہ دے کر جاتا اور پھر اسے فوراً ہی نکل کر اس پتے پر پہنچنا تھا۔ ساری معلومات اکٹھی کر کے اسے شام سے پہلے واپس گیراج پر بھی آنا تھا تاکہ ٹھیک سات بجے وہ گلو کو لے کر اسماعیل کی کوٹھی پر پہنچ سکے۔ تمام کام اس کی توقع کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ وہ گاڑی پر لگا تو نہ اسے چھوٹے کی تانیں یاد رہیں نہ ٹھنڈی ہوتی ہوئی چائے۔

اس نے گاڑی کا بونٹ بند کر کے گھڑی دیکھی تو ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کھانے کا آرڈر دے کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ نہا کر تیار ہونے میں اسے صرف پندرہ منٹ لگے تھے۔ الٹے سیدھے نوالے کھا کر اس نے پیٹ بھرا اور ٹھیک دو بجنے میں چار منٹ پہلے ہی پی سی او پر پہنچ گیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیا۔ پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔ توقع کے مطابق دوسری جانب عثمان دادا تھا۔ امام دین کی آواز سنتے ہی اس نے پوچھا۔ "گاڑی ٹھیک ہو گئی؟"

"ہاں! بالکل فٹ ہے، تم گاڑی لے جا سکتے ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے تم واقعی کام کے آدمی ہو۔" دوسری جانب سے کہا گیا اور پھر رابطہ منقطع ہو گیا۔

امام دین واپس گیراج پہنچ گیا۔ اب اسے صرف انتظار کرنا تھا۔ ڈیفنس سے یہاں تک کا فاصلہ نارمل رفتار سے طے کیا جاتا تو عثمان دادا کو یہاں پہنچنے میں بیس سے پچیس منٹ تو لگنا ہی تھے۔ وہ بھی اس لئے کہ اس وقت سڑکوں پر اتنا رش نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ آنے والے وقت میں اسے کتنا بھاگنا دوڑنا تھا۔ کتنی محنت کرنا تھی' اسے کچھ پتہ نہیں تھا۔ اسی عرصے سے فائدہ اٹھا کر وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔

اس فیصلے تک پہنچنے کے لئے بھی اسے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ اپنے آپ سے جنگ کرنا' تمام نظریات کو ایک دم بدل ڈالنا' زندگی گزارنے کے تمام اصولوں سے لے کر انسانیت کے تمام فلسفوں کو یکسر تبدیل کر دینا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ اپنے ہی کردار کو توڑ پھوڑ کر نیا کردار تعمیر کرنا اور پھر ذہن کو اس سے مانوس کرنا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اس تمام ٹوٹ پھوٹ اور تعمیر میں اسے پورے تین دن اور تین راتوں کو صدیوں کی طرح بتانا پڑا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ اس دوران میں گلو اس سے ملنے نہیں آیا تھا اور جب اسماعیل نے اسے یہ کہہ کر قائل کرنا چاہا کہ اس کا چاچا کوئی سگا چاچا نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ' نہ بہن نہ بھائی اور نہ ہی اس کی راہ تکنے والا کوئی ہے تو اسے اچانک ہی چاچا سے اس کا اور چاچا کا اس سے رویّہ یاد آگیا پھر نازاں کا چلا جانا۔ گلو کا یونہی بے پرواہ ہو کر اپنے آپ میں مگن رہنا یاد آیا تو اسے لگا جیسے وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس نے اس بار نگاہ اٹھا کر اسماعیل کو دیکھا تو اسماعیل یوں کھل اٹھا جیسے کسی بنجر زمین پر محنت کرتے کرتے مایوس ہو جانے والے کو اس زمین میں ہری کونپل دکھائی دے گئی ہو۔

"دیکھو امام دین' اللہ نے ہر انسان کو کسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے اور ہر ایک کی موت کا طریقہ کار' وقت اور سبب بھی متعین کیا ہے۔ تم خود سوچو کہ جن کی قسمت میں قتل ہونا لکھا ہے تو خدا نے کسی کے مقدر میں قاتل ہونا بھی تو لکھا ہوگا ناں! وہ قاتل کون ہوگا..؟ کوئی انسان...... ایسا ہی انسان نا جسے کسی نے پیدا کیا ہوگا' جس کا کوئی باپ بھی ہوگا اور ہر ماں' ہر باپ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ذرا سی تکلیف سے تڑپ

اٹھتا ہے۔ یہ تو بڑا غنیمت ہے کہ گلو کا کوئی نہیں ہے۔ چاچا بھی تو سگا نہیں ہے' روئے گا' ضرور روئے گا۔ آخر جانور پالو تو اس سے بھی انسیت ہو ہی جاتی ہے۔ یہ تو انسان ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ رو رو کر مر جائے مگر ایسا وہ اس کی محبت میں نہیں کرے گا' اپنی خودغرضی کی وجہ سے کرے گا۔ اکیلا جو رہ جائے گا اور پھر سب سے اہم بات یہ کہ خدا نے اس کے مقدر میں ایسی موت لکھی ہوگی۔ اگر ایسی موت لکھی ہے تو اس کا سبب بھی تو پیدا کرے گا ناں! سو پیدا ہوگا۔ ہم کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کر رہے ہیں' یہ سب کچھ متعین ہے۔"

امام دین میں ٹوٹ پھوٹ اسی وقت شروع ہو گئی تھی۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ انسان کتنا خبیث ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے معاملات کو بھی اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی راہیں اور دلیلیں نکال لیتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ خدا نے برائیوں کا ذکر کر کے ان کے لئے سزا بھی تجویز کی ہے اور اس کے نتائج سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس سے روکا بھی ہے اور اس کا اجر بھی واضح کیا ہے۔ اسے تو اتنا ہی یاد رہ گیا کہ اس کی اور گلو کی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے اور اللہ اسی منزل پر پہنچنے کے اسباب پیدا کرنے پر قادر و محیط ہے۔ وہ تو الٹا اسماعیل سے مرعوب ہو گیا تھا۔ تب تین دن اور تین راتیں لگی تھیں اسے خود کو ہرا دینے اور جیت جانے میں۔ اس نے کسی مغرور فاتح کی طرح چھٹے دن کی صبح کو تیکھی نگاہ سے دیکھا تھا اور ذرا بھی گمان نہ تھا کہ اس کے قدموں کے نیچے ڈھلوان شروع ہو گئی ہے۔ اسماعیل کا کام تو اسے چوٹی پر پہنچانا تھا۔ یہ بتانا نہیں کہ آگے رستہ کیسا ہے۔

اور جب اسی روز گلو پہنچ گیا تو اس کے فیصلے کے تابوت میں گویا آخری کیل ٹھونکی گئی۔ وہ ایک کانٹا سا جو کہیں چبھتا ہوا کبھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ نکل گیا۔ اسے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ گلو آسانی سے تیار ہو جائے گا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے کچھ دن دم لے کر نئی ہمتیں جمع کرنا ہوں گی تاکہ دوسری جنگ لڑتے ہوئے اس کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔ گلو اس کے اندر کی چیز نہ تھی کہ جس کی جزئیات سے اسے مکمل طور پر آگاہی ہوتی۔ وہ قطعی طور پر باہر کی چیز تھا اور اس کے اندر کتنی بھول بھلیاں تھیں' وہ اس سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھا مگر اس نے وہاں وار کیا کہ جہاں سے عمارت کمزور تھی۔ وہ اتنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمزور ہو گی اس کا تو گمان بھی نہ تھا۔ سب کچھ بلکہ شروع سے سب کچھ اس کی توقع کے خلاف ہوتا چلا گیا اور اب اسے نئے سرے سے زندگی کی شروعات کرنا تھی۔ گلو اس کے لئے بڑا مضبوط سہارا تھا اب سے نہیں بلکہ لڑکپن سے۔ اس کی وجہ اس کا منحنی سا دبلا پتلا جسم تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے پاس اعلیٰ اور طاقتور دماغ ہے۔ اس نے بچپن سے ایسے معاملات دیکھے تھے' ایسے کرب سے تھے اور ایسی چالیں چلی تھیں کہ آج اسے خود حیرت ہوتی تھی۔ اگر کبھی مار کھائی تو عمل میں' اور عملی زندگی میں گلو نے اسے بے وجہ ہی ڈھارس کا احساس دلایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ہی اپنے آپ کو مضبوط سمجھنے لگتا تھا۔ اب تو اسے یقین تھا کہ وہ دونوں مل کر اپنے اردگرد کی دنیا کو یکسر تبدیل کر دیں گے۔

☆===========☆===========☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ "کون ہے؟" اس نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

"کوئی آیا ہے۔" کسی نے آواز دے کر کہا۔

امام دین اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اسے علم تھا کہ کون آیا ہو گا۔ وہ باہر آیا تو سامنے ہی سفید ہنڈا سوک کھڑی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔ موٹا سا گنجا اور سفید رنگ کا عثمان دادا اسٹیئرنگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر دھوپ سے بچاؤ کا قیمتی چشمہ تھا' انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں اور گلے میں سونے کی موٹی سی چین تھی۔ اسے دیکھ کر امام دین کو ہمیشہ ہی رشک آیا کرتا تھا۔ آج اس کے ساتھ وہ لڑکی نہیں تھی جو اکثر و بیشتر ہوا کرتی تھی اور جسے دیکھ کر ایک بار گلو خوف سے پیلا ہو گیا تھا جب فتح کو اپنی دانست میں قتل کر کے بھاگا تھا یہ اس کا کہنا تھا کہ یہ لڑکی فتح کے بنگلے میں ملی تھی مگر امام دین کو یقین ہی نہیں تھا کیوں کہ فتح اتنی باریک تیلیوں کا پنجرہ کبھی نہیں بنایا کرتا تھا جس میں سے کوئی مینا اڑ کر آزاد ہو سکے۔ آزاد تو خیر یہ لڑکی بھی نہ ہو گی جو اکثر عثمان دادا کے ساتھ نظر آیا کرتی تھی۔

"یہ لو۔ یہ ساری تفصیل ہے۔" اس نے ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ اس طرح اسے دیا کہ اگر کوئی خاص طور پر دیکھ بھی رہا ہوتا تو اسے گمان نہ ہوتا کہ کیا دیا ہے یا کچھ دیا بھی

ہے یا نہیں۔

"تم بونٹ کھولو۔ یوں آنا اور چلے جانا مناسب نہیں ہے۔ میں کچے کام نہیں کرتا۔" امام دین نے بھنچے بھنچے ہونٹوں سے کہا۔

عثمان دادا نے بونٹ کھول دیا۔ امام دین کاغذ کا پرزہ مٹھی میں دبائے بونٹ پر جھک گیا۔ ذرا دیر بعد ہی اس نے قادر کو آواز دی۔ اس دوران میں وہ بریک آئل لیک کر چکا تھا اور کاغذ کا پرزہ اس کی جیب میں منتقل ہو چکا تھا۔ قادر کو سمجھا کر وہ بنچ پر جا بیٹھا۔ قادر نے پانچ منٹ میں سب ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ عثمان دادا نے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔ امام دین نے لپک کر قادر کے ہاتھ سے نوٹ لے لیا اور اس کا سرخ ہوتا ہوا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ اس نے کھلا کر کے تیس روپے قادر کے ہاتھ پر رکھے اور باقی ستر روپے عثمان دادا کی طرف بڑھا دیئے۔

قادر کے لئے تو شاید تیس روپے ہی بہت تھے۔

"آئندہ یہ حرکت نہ کرنا۔" اس نے غرا کر عثمان دادا سے کہا۔

"کیوں.........کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اس نے درشت لہجے میں کہا۔

"نظر میں آنا چاہتے ہو؟ وہ ہمیشہ تمہارا انتظار کرے گا اور تم جب جب آؤ گے' وہ ہمیشہ تمہاری طرف بھاگے گا۔" امام دین نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ عثمان دادا سے اس لہجے میں بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر جو کام اس بار اسماعیل نے جس اعتماد کے ساتھ اس کے حوالے کیا تھا اور جس قدر اعتماد کے ساتھ وہ انجام دینے کی راہ ہموار کر چکا تھا۔ اس نے اسے کافی مضبوط بنا دیا تھا۔

"تم واقعی عقل مند ہو۔" عثمان دادا کے چہرے پر پڑ جانے والی ساری لکیریں ایک دم ہی غائب ہو گئی تھیں۔

"جاؤ' میں رات کو یعنی سات بجے آؤں گا۔ پیغام دے دینا اور کہنا سب کچھ اسی طرح ہو گا جیسا وہ چاہتے ہیں۔ میرے ساتھ دوسرا بھی ہو گا۔"

یہ تمام گفتگو اس نے اس طرح کی تھی جیسے وہ بریک چیک کر رہا ہو۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ جھکا ہوا تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کر سیدھا ہو گیا۔ عثمان دادا گاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھا کر لے گیا تو امام دین ہاتھ دھو کر اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ آج گیراج پر کام زیادہ تھا۔ جو ایک دو گاڑیاں تھیں ان پر ملازمین کام کر رہے تھے۔ امام دین نے کمرے میں جاتے ہی کاغذ نکالا۔ اس پر آدمی کا نام' پورا پتہ' اس کے آفس کا پتہ' حلیہ سب کچھ لکھا تھا۔ بلکہ ساتھ ایک تصویر بھی تھی۔ تصویر بہت واضح تھی' بھول چوک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ چالیس سے پینتالیس برس کی درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ پتہ آسان تھا' امام دین پڑھتے ہی جان گیا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

وہ پانچ منٹ میں تیار ہو گیا۔ ایسے کاموں کے لئے اس نے ایک ٹیکسی رکھی ہوئی تھی جس کی ظاہری حالت کافی خراب تھی مگر اس کا انجن بہترین تھا۔ اس پر خصوصی طور پر امام دین توجہ دیا کرتا تھا۔ اسے کسی اور کے حوالے بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ ایک موٹی دری اس پر پڑی رہتی تھی جو اسے دھول سے محفوظ رکھتی تھی۔ وہ ٹیکسی نکالنے کے لئے اس نے صبح ہی کہہ دیا تھا۔ اس کی دھول جھاڑ کر اس میں پانی اور تیل وغیرہ بھی وہ چیک کر چکا تھا۔ اس نے باہر آ کر لڑکوں کو کچھ ہدایات دیں اور ٹیکسی لے کر مطلوبہ ایڈریس کی طرف چل پڑا۔

دھوپ کی تمازت میں کمی آ گئی تھی۔ وہ آدھے گھنٹے ہی میں مطلوبہ جگہ پہنچ چکا تھا اس نے اس مکان سے دس قدم فاصلے پر ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی تھی۔ وہاں ٹیکسی سے ٹیک لگا کر کھڑا اخبار پڑھتا رہا تھا۔ وہیں سے کن انکھیوں سے اس گیٹ کی طرف دیکھتا رہا تھا جو دو بار کھلا تھا' ایک بار اس میں سے ملازم ٹائپ کا آدمی کھجور کی چٹائی سے بنی ٹوکری لے کر نکلا تھا اور دوسری بار دو بچے کاندھوں پر بیگ لئے ہنستے کھیلتے برآمد ہوئے تھے۔ جنہیں ایک لڑکی اپنے ساتھ سوزوکی کار میں غالباً سکول لے گئی تھی۔ دونوں بار امام دین دروازہ بند کرنے والے کو نہیں دیکھ سکا تھا۔

یہ مکان دو منزلہ تھا۔ بہت خوبصورت بنے اس مکان میں اندر یقیناً کوئی لان بھی تھا۔ بیرونی دیوار کے اندر کی طرف لگائے جانے والے درخت اور بیلیں باہر سے دکھائی دے رہی تھیں۔ مکان کی بناوٹ مالک مکان کی امارت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ بنانے والا کافی باذوق بھی محسوس ہوتا تھا' مکان پر سرمئی سا رنگ تھا اور کھڑکیاں اور دروازے کا

رنگ کے تھے۔ اندر کی طرف دو گاڑیوں کے پارک کرنے جتنی جگہ تو ضرور ہوگی کیونکہ جب اندر سے سوزوکی نکلی تھی تو وہ اندر کہیں سامنے سے باہر آئی تھی جبکہ امام دین نے دائیں جانب بھی گیراج بنا ہوا دیکھا تھا جہاں اس وقت گاڑی نہیں تھی اور اس پر بنے چھجے پر بیل چڑھی ہوئی تھی۔ امام دین نے پورا اخبار پڑھ لیا تھا۔ اب وہ کمرشل اشتہارات پڑھ رہا تھا اور ابھی صرف چار بجے تھے۔ اس نے اکتا کر چاروں طرف دیکھا پھر اندر سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ ایک دو سواریاں بھی آئیں مگر امام دین نے یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا کہ اس کے ساتھ سواری ہے۔ اسے اس وقت تک وہاں رکنا تھا جب تک کہ مطلوبہ آدمی گھر نہ آ جاتا۔ کاغذ پر لکھا تھا کہ وہ پانچ اور سوا پانچ بجے کے درمیان گھر پہنچ جاتا ہے۔ پورا ایک گھنٹہ کاٹنا اسے عذاب لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

ایک گھنٹہ کتنا عذاب تو تھا مگر آدمی آخر عذاب کاٹ ہی لیتا ہے۔ امام دین نے اسے بھی کاٹ لیا۔ وہ پونے پانچ بجے ٹیکسی سے باہر آ گیا۔ سامنے ہوٹل پر ہی اس نے منہ دھویا' آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور چائے کا آرڈر دے کر پھر ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ ٹھیک پانچ بجے ہلکے نیلے رنگ کی ہنڈا سوک کالے گیٹ پر آ کر رکی۔ ہارن کی تیز آواز کے ساتھ ہی گیٹ کھل گیا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔ امام دین نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور پیسے دے کر گیراج کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ کل اسے صبح نو بجے پھر یہاں پہنچنا تھا۔ اس کی گاڑی کا پیچھا کرنا تھا اور اسے آفس تک پہنچا کر ہی لوٹنا تھا۔ آج کا کام زیادہ بور تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے لئے اتنے گھنٹے ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی اگر وہ پونے پانچ بجے بھی یہاں پہنچتا تو کام ہو سکتا تھا اور وہ مشکوک ہونے سے بچ جاتا۔ ہوٹل والوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ یہ ٹیکسی والا اتنی دیر سے بے وجہ کیوں کھڑا ہے.......... مگر پتہ نہیں اسماعیل کے دماغ میں کیا تھا اور وہ اس کے دماغ کو چیلنج کر نہیں سکتا تھا۔

یہ کام اسے کب تک کرنا تھا۔ اسے علم نہیں تھا۔ ممکن ہے ایسا کرنے سے اسماعیل کا مقصد اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ہو۔ وہ کہاں کہاں جاتا ہے' کس کس سے ملتا ہے۔ وہ سب کچھ جاننا چاہتا ہو۔ یہی سب سوچتا ہوا امام دین گیراج پہنچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔ ابھی پانچ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ گلو کو آنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر نوری کے پاس جانا یوں ضروری تھا کہ اسے گھر کا سودا دیئے ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔ وہ ایسی چلتر تھی کہ اگر وہ دو چار روز اور نہ جاتا تو وہ چادر لپیٹے گیراج پر پہنچ جاتی۔ خوب کھری کھری سناتی جیسے اس کی دیکھ بھال' اس کا سودا سلف اور اس کی ضروریات پوری کرنا اسی کا فرض ہے اور اسے یہ اعتماد خود امام دین نے ہی دیا تھا۔

کبھی کبھی وہ اس پر چیخ پڑتا تھا مگر اس لئے نہیں کہ وہ اس سے کیوں مانگتی ہے بلکہ اس لئے کہ وہ گیراج پر خود کیوں آتی ہے۔ مگر اس بات پر چیخنے سے پہلے سر جھکا کر اس کی کڑوی کسیلی سنا کرتا تھا۔ معافی مانگتا تھا' صفائی پیش کرتا تھا اور اسے یقین دلاتا تھا کہ بس اب وہ آنے ہی والا تھا۔ دونوں کے درمیان جس ان جانے رشتے کی ڈور بندھی تھی اسے نام دینے کی اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ شروع میں تو وہ پُریقین تھا کہ شاید اس خوبصورت رشتے کے ناتے روزی اس سے جڑی ہوئی ہے مگر پھر اس کے رویئے نے اس کی آنکھوں کے اضطراب نے اس سے اس کا یقین چھین لیا تھا۔ شاید وہ اس لمحے سے ڈرتا تھا۔ جب نوری اس کی بات سن کر اسے ٹکا سا جواب دے دیتی اور وہ اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ ملازموں کو گلو کے بارے میں ہدایات کر کے کہ اسے بٹھالینا' گھر کی طرف چل پڑا۔ نوری اسی کے گھر میں رہتی تھی بلکہ بس وہی رہتی تھی۔ آج تک امام دین نے نوری کے آنے کے بعد کوئی رات اس گھر میں نہیں گزاری تھی۔ ہاں دن میں اکثر وہ چلا جاتا تھا۔ نوری کے بارے میں سارا محلہ جانتا تھا کہ اس کے رشتے کے بھائی کی موت کے بعد امام دین نے ہی اسے سہارا دیا ہے اور امام دین سے سبھی واقف تھے۔ کچھ کو یقین تھا دونوں شادی کر چکے ہیں۔ کچھ جانتے تھے کہ شادی کرنے والے ہیں اور کچھ ان باتوں اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ نوری نے کبھی اپنی زبان سے کچھ نہ کہا تھا اور امام دین کو اس بات نے حیران بلکہ مضطرب کیا ہوا تھا۔

☆============☆============☆

گلو امام دین سے سات بجے آنے کا وعدہ کر کے چلا تو آیا تھا مگر جو باتیں امام د

نے اس سے کی تھیں' وہ ابھی تک ریت کے بگولوں کی طرح اس کے دماغ میں چکرا رہی تھیں۔ فیصلہ کر لینے کے بعد بھی کہیں چبھن سی تھی۔ اطمینان کے باوجود کہیں اضطراب لہریں سی لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنی اس کمزوری سے خوب واقف ہو چکا تھا اور یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ وہ اپنی اس کمزوری پر بہت جلد قابو پالے گا۔ اصولاً تو رات کے فیصلے کے بعد اسے قطعی طور پر مضطرب نہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ بے وجہ سب سے الجھتا رہا۔ چاچا تو اس کا موڈ دیکھ کر ہی سہم گیا تھا۔ بس ایک بار ہی اس نے کہا تھا۔ "گلو' نازاں کہیں دور نہیں ہوگی۔ مجھے یقین ہے یہیں کہیں' کسی جاننے والے کے گھر چھپی بیٹھی ہوگی۔"

"تو کیا کروں؟" وہ ایسے بولا تھا جیسے کاٹ کھائے گا۔ "گھر گھر چھاپہ ڈالوں' اندر گھس جاؤں اور اسے زبردستی پکڑ کر لے آؤں؟"

"نہیں گلو......... میرا مطلب ہے کہ اگر پتہ چل جائے تو........."

"تو بھی کچھ نہیں ہونے والا۔" اس نے ہاتھ نچا کر کہا تھا۔ "تو......... چاچا تو جھاراں کو بھول گیا۔ جو بقول تیرے تیری زندگی تھی۔ اپنی اس بہن کو بھول گیا جسے بچانے کے لئے تو نے دن رات ایک کر دیئے تھے تو نازاں کو نہیں بھول سکتا؟"

چاچا کے دل پر چھریاں سی چل گئی تھیں۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ وہ سب کو بھول سکتا ہے مگر جھاراں کو نہیں' ایک اسی کی آس میں تو سانس کی الجھی ڈوری ابھی زندگی سے اس کا رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ وہ بتاتا بھی کیا اور کیسے؟ بس چپ کا چپ رہ گیا۔ اکیلے پن کا زہر اس نے ساری زندگی پیا تھا اور پیار بھی کیا تھا۔ نازاں کی اگر اسے فکر تھی تو صرف اس لئے کہ وہ اکیلی تھی اور اس نے اس کی آنکھوں میں جلتے بجھتے وہ جذبے بھی دیکھے تھے جو جھاراں کی آنکھوں میں بھی لو دیتے تھے۔ مگر گلو سے کچھ کہنا بالکل بیکار تھا۔ یوں بھی اس کا لہجہ اس قابل نہیں تھا کہ زیادہ بات کی جاتی سو اس نے کروٹ لے لی۔

اس رات گلو پل بھر کو بھی نہیں سویا تھا۔ یہ بات چاچا نے محسوس ہی نہیں کی بلکہ بار بار بے چین ہو کر اسے بستر سے اٹھتے بھی دیکھتا رہا مگر رات بھر کی اس بے چینی کے برعکس صبح وہ کافی پُرسکون تھا۔

دن بھر سڑکوں پر گھومنے اور مسافروں کو منزل تک پہنچانے میں وقت ربڑ کی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھنچا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ کسی طرح شام ہی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سات بجے سے پہلے ہی امام دین کے گیراج پر پہنچ گیا۔ ملازم لڑکے نے بتایا کہ وہ گھر گیا ہوا ہے۔ آنے ہی والا ہو گا۔ اسے دیکھ کر چھوٹا اسی کے پاس چلا آیا تبھی گلو نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ تو کبھی نہ آنے کے لئے گیا تھا پھر کیوں لوٹ آیا اور جب اس نے اپنی داستان سنائی تو گلو خود کو بے پناہ خوش قسمت سمجھنے لگا۔ ساتھ ہی اسے چھوٹے پر ترس بھی آیا۔ قتل جس کے بارے میں سن کر ہی اسے پسینہ آ جاتا تھا' بڑا معمولی کام لگا اس لئے کہ چھوٹے کے خاندان میں قتل کسی زنجیر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ جب اس نے کہا۔ "میری ماں کو میرے باپ نے قتل کر دیا تھا۔"

تو گلو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ابے تیرے باپ نے کیوں مار دیا؟"

"تو اور کون مارتا۔ ساری حرکتیں باپ ہی تو دیکھتا تھا؟ میرا باپ بڑا غیرت والا تھا اور میری ماں کو پورے گاؤں کے سارے چھوکروں کے نام زبانی یاد تھے۔ بس اسی بات پر وہ بھڑکتا تھا اور وہ بھڑکاتی تھی۔ اسے عشق کرنے کی بیماری تھی شاید!" چھوٹے نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔

"شاید کیا مطلب؟ کیا تجھے یقین نہیں ہے؟"

"مجھے کیا پتہ! میں تو اس وقت بہت چھوٹا تھا۔"

"پھر تجھے کیسے پتہ؟" گلو نے پوچھا۔

"میری دادی بتاتی ہے۔ میری نانی بہت سا پیسہ چھوڑ کر مری تھی۔ میری ماں وہ سارا پیسہ گاؤں کے چھوکروں پر لٹا دیتی تھی۔ ہر کسی کو یار بنا لیتی تھی۔ میرا باپ جب جب پیسے مانگتا تھا وہ لڑتی تھی۔ کہتی تھی یہ پیسہ میرے بچے کا ہے مگر دادی کہتی ہے کہ مجھے تو اس نے پالا ہے۔ میری ماں کو بننے سنورنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ میرا باپ کچھ نہیں کرتا تھا اور کچھ کرتا بھی کیوں! آخر میری ماں کے پاس پیسہ تھا۔ یہ جھگڑا بڑھتا گیا۔ ایک روز میرے باپ نے میری ماں کو ایک چھوکرے کے ساتھ دیکھ لیا۔ وہ بتاتی ہے کہ اس وقت میں بھی اس کی گود میں تھا۔ میرے باپ کو دیکھ کر میری ماں نے کہا کہ وہ مجھے لے کر اسپتال گئی تھی کیونکہ مجھے دست اور الٹیاں لگ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ اسپتال

جانے والا کوئی نہیں تھا اس لئے اس نے برابر میں رہنے والے کے بیٹے کو بلا لیا تھا۔ بس۔ میرا باپ سمجھ گیا........... پاگل ہو گیا اور اس نے وہیں اسے ختم کر دیا۔ اس کی ساری دولت ابّے کو مل گئی۔ تین مکان' دو دکانیں اور چھ بھینسیں۔ پھر میرے چاچا کی شادی میرے ابّے نے بڑی دھوم دھام سے کی۔ اس کی بیوی نے آکر گھر میں فساد ڈال دیا........... جھگڑا بڑھا تو میرے چاچے نے میرے باپ کو قتل کر دیا۔ جیسے میرا باپ قانون کی زد سے بچ گیا تھا اس طرح اس کا قاتل بھی بچ گیا۔ سارے مکان اور دکانیں اور بھینس اسی کی ہو گئیں۔ دو برس بعد ہی میری چاچی نے اپنے آشنا کے ساتھ مل کر میرے چاچا کو مروا دیا۔ دونوں پھنس گئے انہیں سزا ہو گئی۔ میری پھوپی نے اچانک مجھ سے نفرت کرنی شروع کر دی۔ میں گھر چھوڑ کر بھاگ آیا۔ دادی نے پھوپی کی شادی کر دی تو سارے مکانوں اور دکانوں کی دیکھ بھال میرا پھوپا کرنے لگا۔ یہ سب کچھ میری دادی کے نام تھا۔ اس نے مجھے کہلوا بھیجا کہ وہ ساری جائیداد میرے حوالے کرنا چاہتی ہے۔ میں فوراً پہنچوں مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مر گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اب میں ساری جائیداد کا وارث ہوں مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ اگر میں اور کچھ دن وہاں رہا تو ابا اور چاچا کی طرح قتل کر دیا جاؤں گا۔ گاؤں والوں نے کہا کہ دادی کو میری پھوپی اور اس کے خاوند نے زہر دیا ہے مجھے بھی دے دیں گے سو میں لوٹ آیا۔"

اس ساری داستان میں سب سے اہم چیز گلو کو قتل ہی لگی تھی۔ گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔ پھر اتنے بہت سے قتل میں صرف دو آدمی پکڑے گئے تھے۔ ایک چاچی اور ایک اس کا آشنا۔ باقی سب مزے میں زندگی گزارتے رہے تھے۔ آج پہلی بار گلو نے چھوٹے کی آنکھوں میں نمی محسوس کی تھی۔ وہ کتنا اکیلا تھا' کیسا بے بس تھا بس اسی بات نے گلو کو دکھی کر دیا۔

"چھوٹے! تو میرے ساتھ میرے گھر رہا کر۔" اچانک ہی اس نے کہا تو چھوٹے نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی........... میں بھی تو اکیلا ہوں۔ پھر میرا چاچا بہت اچھا ہے۔ سب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے ایک دم محبت کرنے لگتا ہے اور تو یہاں رہتا ہے اس چھپر کے نیچے۔ سردی' گرمی' طوفان' آندھی یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ۔ جیسے میں کام پر نکلتا ہوں ایسے تو بھی یہاں آجایا کر پھر رات کو گھر.........."

اس سے پہلے کہ چھوٹا اسے جواب دیتا' امام دین آگیا۔ "چل بھئی! دیر ہو گئی" وہ بہت جلدی میں تھا۔ گلو فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ تمام راستے خاموشی رہی۔ گلو کے دماغ میں گہرا سناٹا چھایا رہا۔ نہ چھوٹے کی باتیں یاد رہیں نہ چاچا کا غم' کچھ عجیب سی کیفیت تھی جو اسے امام دین سے بے تکلف ہونے سے روک رہی تھی۔ وہ اس سے یوں نگاہیں چرائے بیٹھا تھا جیسے وہ اس کی اصلیت جان گیا ہو۔ جب آدمی پہلا جرم کرتا ہے اور اس میں اس کا اپنا ارادہ بھی شامل ہوتا ہے تو شاید اس کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ تو خود اپنے آپ سے بھی بات کرتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کن انکھیوں سے امام دین کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ بھی کسی گہری سوچ میں تھا۔ گلو کے لئے یہی غنیمت تھا۔ وہ زیادہ تر ونڈ سکرین سے باہر دیکھتا رہا۔

سارا دن تو وقت رینگتا محسوس ہوتا رہا تھا مگر اس وقت پل کے پل میں جیسے رات اتر آئی تھی اور وہ لمحوں ہی میں اسماعیل کی کوٹھی کے دروازے پر کھڑے ہارن بجا رہے تھے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار انہیں دیکھتے ہی گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ گیٹ کھلتے ہی گلو نے ٹیکسی اندر لے لی۔ پورچ میں کھڑی کر کے وہ دونوں اترے ہی تھے کہ اندرونی عمارت کے بڑے برآمدے کا دروازہ کھلا اور اسماعیل باہر آیا۔ وہ جس بے تکلفی اور خلوص سے ملا اس نے گلو کو بے حد متاثر کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے پرانے دوستوں سے بڑے دنوں بعد مل رہا ہو۔ گلو کا ہاتھ تھامے اور دوسرے ہاتھ میں اخبار لئے وہ ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ اس دوران چاچا کی طبیعت' ڈاکٹر کی رپورٹ' اس کے علاج اور پرہیز کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ غالباً ان کے آنے سے پہلے وہ اخبار بینی کر رہا تھا۔ انہیں بیٹھنے کو کہہ کر وہ بھی سامنے بیٹھ گیا۔

"کتنے دن سے علاج ہو رہا ہے؟" اس نے اخبار ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاید چار یا پانچ روز ہو گئے۔" گلو نے جواب دیا۔

"چار پانچ روز..........! اور تم نے ابھی تک مجھ سے رابطہ ہی نہیں کیا۔ پیسوں کا کیا کیا ہو گا؟"

"پیسے ہیں جی۔" گلو جو اس کے رویے سے پریشان ہو گیا تھا ایک دم پُرسکون ہو گیا۔

"اوہ.......... اس کا مطلب ہے کہ تم اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں کر رہے۔ اس کے علاج اور دواؤں میں کنجوسی کر رہے ہو۔ یار گلو! اس دنیا میں سب کچھ تمہارا چاچا ہی تو ہے۔ اسے تو ایسے سنبھال کر رکھو جیسے کوئی نازک سے بلور کو سنبھال کر رکھتا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اور ضرورت ہو تو بے تکلف ہو کر مانگ لینا۔ خیر.......... تم جیسے آدمی کو مانگنا نہیں چاہیے.......... تم تو چھین لینے کی صلاحیت رکھتے ہو.......... تم تو دنیا سے اپنا حق چھین سکتے ہو' تم جیسے جری اور بہادر آدمی کی شخصیت کا اہم پہلو یہی ہونا چاہیے۔" آخری جملے وہ یوں ادا کر رہا تھا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی ایسے تھے جیسے وہ خود بھی گلو سے بہت متاثر ہو۔

امام دین اسماعیل کی اداکاری پر دل ہی دل میں اسے داد دے رہا تھا۔ اسماعیل کتنا پُرخلوص انسان ہے.......... اسے خوب اندازہ تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس بے اندازہ دولت تھی یا وہ یوں دونوں ہاتھوں سے غریبوں پر اپنی دولت لٹا کر خوش ہوتا تھا۔ کوئی حاتم طائی تھا بلکہ وہ جانتا تھا کہ گلو اس کے لئے کتنا اہم ہے۔ اس پر اگر وہ لاکھوں بھی خرچ کر دے تو اسے منافع کے ساتھ وصول ہو جائیں گے۔ وہ جس طرح چاچا کے بارے میں تشویش ناک انداز میں گفتگو کر رہا تھا تو اسے فکر چاچا کی نہیں تھی بلکہ وہ گلو کو پوری طرح مٹھی میں بند کر لینا چاہتا تھا۔ امام دین اسے بتا چکا تھا کہ گلو کی سب سے بڑی کمزوری چاچا ہے.......... نہ کوئی لڑکی' نہ ماں' نہ باپ نہ کوئی.......... اور یہ سن کر اسماعیل کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ ایسے ہی مہروں کی تو اسے تلاش رہتی تھی۔ ایسے ہی لوگوں کو شکار کرتا رہا تھا وہ اور گلو کو تو قدرت خود ہی اس کے کچھار میں لے آئی تھی۔ گلو ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ وہ تو سامنے بیٹھے شخص کو دنیا کا پُرخلوص ترین اور انسانیت کا علمبردار سمجھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ انسانیت جو اب بھی کہیں نہ کہیں باقی ہے تو اس کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سبب سو فیصد اسماعیل ہے۔

"بہرحال گلو! میں چاچا کی بیماری کے لئے اس کے علاج میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ مانگنا خوددار آدمی کے لئے کتنا اذیت ناک فعل ہے مگر کسی اپنے سے کسی پریشانی کا ذکر کرنا اور حق مانگنا انا کو مجروح نہیں کرتا۔ اب اگر تم نے اس سلسلے میں کوئی بھی بے پروائی کی تو میں سختی سے پیش آؤں گا۔"

اس بار اس نے سخت لہجے میں کہا اور یہ وہ سخت لہجہ تھا جو آدمی کے اندر اتر کر اس کی بنجر ذات کو قدرے جاذب بنا دیا کرتا ہے۔ گلو نے بھی یوں سر جھکا لیا تھا جیسے اپنی کسی سنگین غلطی کا اعتراف کر رہا ہو۔ امام دین کو یقین تھا کہ اب گلو کے نزدیک چاچا سے بھی زیادہ اہم اسماعیل ہو گا۔ اب اگر اس نے گلو کے سامنے اسماعیل کو گالی دی تو وہ یقیناً استاد فتح کی طرح اسے بھی قتل کر کے بھاگ جائے گا۔

انسانی نفسیات اسماعیل کی گویا مٹھی میں تھی وہ جو کراچی کی سڑکوں پر پھٹے حالوں پیدل پھرتا رہتا تھا۔ اس کی کامیابی کا راز بھی یقیناً اس کی یہی مہارت تھی ورنہ کراچی جیسے آدمیوں کے جنگل میں ایسے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ تھے جو سڑکوں پر پیدا ہوتے۔ وہیں جوان ہوتے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے باوجود انہی سڑکوں پر بوڑھے ہو کر فاقوں سے مر جاتے تھے۔

کافی دیر گزر چکی تھی اور اسماعیل اپنے مطلب کی بات پر نہیں آیا تھا۔ اب امام دین کو الجھن ہو رہی تھی۔ البتہ گلو بالکل بھول چکا تھا کہ وہ یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ جب امام دین بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا عین اسی لمحے اسماعیل نے صوفے کی سائیڈ ٹیبل پر نیچے کی طرف رکھی بیل پر پاؤں رکھ دیا۔ دور کہیں ہلکی سی موسیقی گونجی اور چند لمحوں بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ اس کا ملازم ٹرالی لئے کھڑا تھا جس پر چائے کے ساتھ کھانے کے لوازمات بھی تھے۔ چائے پینے کے دوران میں ہی اسماعیل نے غیرمحسوس انداز میں گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ وہ گلو سے پوچھ رہا تھا۔ "تم ٹیکسی کیوں چلاتے ہو؟"

"جی.......... روزی تو کمانی ہے نا!" اس نے یوں شرمندہ ہو کر جواب دیا جیسے ٹیکسی چلانا کوئی عیب کی بات ہو اور اسے اصل میں کسی اعلیٰ عہدے پر ہونا چاہیے تھا مگر

حالات کی وجہ سے یہاں تک پہنچ گیا۔

"سالا!" امام دین نے دل ہی دل میں اسے گالی دی۔

"ہاں.." اسماعیل بھی ایک ہی تھا' یوں بولا جیسے اسے یاد ہی نہ ہو کہ روزی حاصل کرنے کے لئے انسان کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ "چلو ٹھیک ہے مگر تم تو دیہاڑی پر کام کرتے ہو گے۔"

"جی' خان آفریدی تنخواہ دیتا ہے۔"

"تو اپنی ٹیکسی کیوں نہیں لے لیتے؟"

"ایسا پروگرام تو ہے سر' انشاء اللہ لے لوں گا۔"

"ایسا کرو ٹیکسی میں دلا دیتا ہوں' تم جب اتنا کما لو کہ قرضہ اتار سکو تو دے دینا۔ نہ دے سکو تو بھائی کی رقم سمجھ کر ہضم کر جانا۔" اسماعیل نے مضحکہ خیز انداز میں جواب دیا۔ گلو ہنسا تو وہ خود بھی قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "یہ حق ہے تمہارا۔ ان لوگوں سے جو کم محنت کر کے زیادہ کما رہے ہیں ان لوگوں کو زیادہ محنت کر کے کم کماتے ہیں' اپنا حق چھین لینا چاہیے۔ مجھ سے چھین لینا بھی تمہارا حق ہے.........."

امام دین ان دونوں کا ساتھ دینے کو ہنس دیا تھا ورنہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ٹیبل کو لات مار کر کھڑا ہو جائے مگر اچانک ہی اسماعیل نے اس کی طرف دیکھا' یوں جیسے اس کے خیالات سے واقف ہو گیا ہو یا شاید اس کی ہنسی میں بیزاری کی کھنک تھی۔

"ارے ہاں.......... میں تو بھول ہی گیا' وہ حسن ارشاد کا کیا ہوا؟" حسن ارشاد اس آدمی کا نام تھا جس کے بارے میں امام دین کو معلومات اکٹھا کرنے کا حکم ملا تھا۔

"جی! میں گیا تھا۔" پھر امام دین نے اسے ساری تفصیل سنا دی۔

"ہوں.........." وہ پُرسوچ انداز میں اسے دیکھ کر ہنکارا.......... "دو بچے ہیں اس کے؟"

"شاید! ایک لڑکی تھی جو انہیں اسکول لے کر گئی تھی۔ شاید حسن ارشاد کی بیٹی تھی۔" امام دین نے کہا۔

"اس کی بیوی ہے.........." اسماعیل نے اطمینان سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین چونک اٹھا..........''بیوی مگر..........''

''عثمان بتا رہا تھا کہ تم..........'' وہ شاید جان بوجھ کر چپ ہو گیا تھا۔

''جی سر!'' امام دین جلدی سے بولا۔ ''گلو کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا یہ کام وہ کر لے تو اس کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔''

''خیر اسے پیسوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر ایک بات ہے' جتنی بہادری اور ہوشیاری سے گلو کام کر سکتا ہے تم نہیں کر سکتے۔ تم ذرا اپنے اندر کچھ بہادری پیدا کرو یار' اپنی شخصیت میں کچھ رعب' کچھ وقار بھی پیدا کرو.......... اور گرج تو تم میں ہے نہیں.......... اب گلو کو دیکھو.......... جہاں سے گزر جائے' لوگ نگاہ اٹھا کر دیکھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ حالانکہ اس کا حلیہ دیکھو.......... بغیر استری کا جوڑا پہن رکھا ہے وہ بھی پرانا' پھٹیچر ٹیکسی میں پھرتا ہے' تھکن اور پریشانی نے آنکھوں کی چمک اور چہرے کی لالی چھین لی ہے مگر پھر بھی.......... یہ ذرا سا اپنے آپ کو سنوار لے تو دنیا ادھر سے ادھر کر سکتا ہے۔''

اسماعیل کی ساری باتیں امام دین کا خون جلا رہی تھیں اس لئے بھی کہ گلو پھولتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی لالی تو چار جملے سن کر ہی واپس آ گئی تھی حالانکہ یہ باتیں کرنے سے پہلے ہی اسماعیل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اشارہ کر دیا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسماعیل گلو کی آخری ڈور انگلی کے گرد لپیٹ رہا ہے مگر پھر بھی.......... گلو کے مقابلے میں اس کا احساس کمتری پہلے ہی سے موجود تھا۔

''ہاں مجھے بتائیے۔'' گلو ایک دم بول اٹھا۔ ''امام دین مجھے کچھ بتا چکا ہے۔ میں اسی لئے یہاں آیا ہوں کہ..........'' وہ شاید پھر کمزور پڑنے لگا تھا مگر اسماعیل نے اسے سنبھال لیا۔

''یار! میں اس بات کا قائل ہوں کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اسے تمام انسانوں میں مساوی تقسیم ہونا چاہیے۔ اللہ کا قانون یہی ہے مگر یہاں لوگوں نے لوگوں کا رزق اپنے ہاتھ میں لے کر لوگوں کو بھوکوں مارنا شروع کر دیا ہے۔ ان کمزور لوگوں کو جو اپنے ہاتھ کا نوالہ چھنتا ہوا دیکھ کر کچھ نہیں کر پاتے۔ میں ایسے لوگوں کا ساتھی ہوں۔ میں

انہیں ان کا حق دلواؤں گا۔ جو لوگ خون پسینہ بہا کر اونچے اونچے محل بناتے ہیں وہ ان میں رہ نہیں سکتے تو اس کی محنت سے اپنے لئے جھونپڑا تعمیر کرنا ان کا حق ہے۔ انہیں اتنا معاوضہ ملنا چاہیے مگر نہیں ملتا۔ وہ تو اس معاوضے میں دو وقت کی روٹی بھی اپنے بیوی بچوں کو نہیں کھلا پاتے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ حسن ارشاد وہ شخص ہے جو ایک کنسٹرکشن کمپنی کا مالک ہے۔ ہزاروں مزدوروں سے اونچی اونچی عمارتیں بنواتا ہے اور انہیں بھوکا مارتا ہے۔ خود لاکھوں بٹور رہا ہے اور ان کی ہتھیلی پر چند سکے رکھ دیتا ہے۔ ایسے شخص کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔'' اس نے آخری جملہ کہتے ہوئے ٹیبل پر مکہ مارا۔ چھن کی آواز کے ساتھ ہی وہ شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ اس کی کرچیں دور دور تک بکھر گئیں پھر کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

گلو کو یوں لگا جیسے چھن کی آواز اس کے سینے کے اندر سے آئی ہو۔ جیسے اندر بہت کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا ہو۔ پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔

اسی گہرے سناٹے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ امام دین' گلو اور اسماعیل تینوں چونک اٹھے۔

''کون ہے؟'' اسماعیل نے پوچھا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا' ملازم اندر داخل ہوا' اس کے ہاتھ میں وزیٹنگ کارڈ تھا۔ اس نے کارڈ اسماعیل کی طرف بڑھا دیا۔ گلو اور امام دین کی نگاہیں اسماعیل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک وزیٹنگ کارڈ پر نگاہ پڑتے ہی اسماعیل اچھل پڑا۔

اس کے چہرے کا متغیر ہوتا ہوا رنگ گلو اور امام دین سے چھپا نہیں رہ سکا۔ وہ دونوں بھی یوں چوکنے ہو گئے جیسے دشمنوں کی فوج اسماعیل کے دروازے پر پہنچ چکی ہے اور اب حملہ کرنے ہی والی ہے۔ ملازم ہونقوں کی طرح اسماعیل کے حکم کا منتظر کھڑا کبھی اسے اور کبھی گلو اور امام دین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسماعیل نے عقابی نگاہوں سے امام دین اور گلو کی طرف دیکھا۔ امام دین تو ایک دم کھڑا ہو گیا۔ جیسے اسماعیل اگر اسے آگ میں کودنے کا حکم دے گا تو وہ اس میں بھی کود جائے گا۔ گلو نے بھی اس کی تقلید کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا بات ہے سر!" یہ امام دین تھا۔ "کیا ہو گیا؟"

"انہونی ہو گئی ہے امام دین.......... تم تماشا دیکھتے جاؤ۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں کچا کام نہیں کرتا۔ ایسا جال بچھاتا ہوں کہ دشمن اپنے آپ ہی اس جال میں کھنچا چلا آتا ہے۔" گلو اور امام دین نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

گلو نے محسوس کیا کہ امام دین کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا ہے۔ وہ یوں چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے چھپنے کے لئے موزوں جگہ کا انتخاب کر رہا ہو۔

"یہ میرے لئے دنیا کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔ مجھے تو اب خود پر بھی حیرت ہو رہی ہے امام دین.........." اب اسماعیل دونوں ہاتھ پھیلا کر یوں گھوم گیا تھا جیسے بے پناہ خوشی اس سے سنبھالی نہ جا رہی ہو۔ "میں.......... میں اتنا ذہین ہوں.......... اتنا چالاک ہوں.......... اتنا خطرناک ہوں امام دین.......... مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

اس کے الفاظ سنتے ہی امام دین ایک دم اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے دھیرے سے اسماعیل سے کچھ کہا تھا۔ سرگوشی اتنی مدھم تھی کہ گلو باوجود اس کی طرف توجہ ہونے کے سن نہیں سکا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اسماعیل ایک دن نارمل ہو گیا تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ کن انکھیوں سے گلو کی طرف دیکھا، پھر ہاتھ میں تھامے وزیٹنگ کارڈ کو دیکھا۔

"تم.......... تم دونوں یہاں ٹھہرو۔" اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے نارمل انداز میں کہا تھا مگر اضطراب اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش پیدا کر چکا تھا۔ پھر اس نے دوبارہ کچھ کہنا چاہا، دو قدم آگے بڑھا، ٹھٹکا، گلو کی جانب دیکھا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کا ملازم اب بھی منہ کھولے اسی پوزیشن میں کھڑا تھا جس میں کافی دیر سے کھڑا تھا۔

"اے.......... کیا بات ہے؟" امام دین نے اس کے قریب جا کر چٹکی بجائی۔ وہ یوں اچھلا جیسے چٹکی کی آواز میں دوڑتا کرنٹ ہوا کے دوش پر سفر کرتا ہوا اس کے جسم میں سرایت کر گیا ہو۔

"جی.......... جج.......... جی ہاں!" وہ بوکھلا گیا پھر اس نے چاروں طرف دیکھا شاید

تبھی اسے اپنی احمقانہ حرکت کا احساس ہوا تھا۔ وہ بھی اسی تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا جس تیزی سے اسماعیل باہر گیا تھا۔

امام دین دروازے کو تک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر فکر کی لکیر گہری ہو چکی تھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں حیرت کی بڑی بڑی تصویریں سی لہرا رہی تھیں۔

"ماے!" گلو بولا تو اس نے چونک کر گلو کی جانب دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی نارمل ہو گیا۔

"ہوں.........." وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "بیٹھ.......... کھڑا کیوں ہے؟" اس نے اپنے برابر کی جگہ تھپتھپائی۔

"تو کیوں کھڑا ہو گیا تھا؟" گلو اسے گہری نگاہوں سے تک رہا تھا۔

"نہیں.......... ہاں..........!! میں سمجھا تھا کہ شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے مگر.........."

"اوہ یار! یا تو میری عقل خراب ہو گئی ہے یا پھر یوں لگتا ہے جیسے میں کوئی انگریزی فلم دیکھ رہا ہوں۔ جس میں سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا بس تصویر ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے تاثرات کچھ سمجھا دیں، ویسے جب انگریزی فلم ختم ہوتی ہے تو سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ زبان سمجھ میں نہ آنے کے باوجود۔"

"اوہ.......... تو انگریزی فلمیں بھی دیکھتا ہے؟" امام دین بلاوجہ ہی ہنس دیا۔

"کبھی دیکھی تھی جب مار دھاڑ اچھی لگتی تھی اور.......... اور فتح میرا آئیڈیل تھا۔" اس نے نگاہ چرائی۔

"آئیڈیل..........!!! زبردست، تو تو انگریزی بولنا بھی جانتا ہے یار!"

"مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں۔ ہزاروں لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور پھر مہینوں جانو کے گھر کے چکر کاٹے تھے۔ گھنٹوں اس کے فلسفے سنتا تھا، اتنے الفاظ تو کراچی کا فقیر بھی بول لیتا ہے۔ جاہل اور ان پڑھ فقیر۔"

"تو تو ناراض ہو گیا یار! میں تو.........." وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر باہر سے آنے والی نسوانی آواز نے اسے اور گلو دونوں کو چونکا دیا۔ کوئی عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

"راجے! میں نے قسم کھائی ہے کہ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ نہیں چھوڑوں گی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندہ............ مگر یہ بھی جان لے کہ تیرے سینے میں گولیاں اتار کر تیری موت کو آسان نہیں کروں گی۔ آگ بھردوں گی تیرے سینے میں' آگ........... ایسی بھٹی سلگاؤں گی جیسے تو نے میری زندگی میں بھڑکائی تھی۔ تیرا بال بال' روم روم جلاؤں گی۔ آہستہ آہستہ ماروں گی۔ تجھ سے تیرا سب کچھ چھین لوں گی۔ اس طرح جس طرح تو نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میری شناخت' میرا گھر' میرے ماں باپ' میری محبت اور........... میرا بچہ........... جیسی تو نے میری کوکھ جلائی ہے راجے ایسے ہی میں تیری بیوی کی کوکھ جلاؤں گی۔ تو کیا سمجھتا تھا کہ میں' میں مرگئی؟ یا تجھے بھول گئی؟ نہیں راجے........... تو نے تو میرے ننھے سے بچے کو چھینا تھا مگر میں........... میں تیری اولاد کے جوان ہونے کا انتظار کر رہی تھی' میرے دل میں ٹھنڈک ہے راجے کہ میرا بچہ زندہ ہے۔ کہیں نہ کہیں........... دنیا کے کسی بھی کونے میں زندہ ہے مگر........... مگر تجھے تین جوان بیٹوں کے جنازے اٹھانے ہوں گی۔ سن رہا ہے تو...........؟"

اس عورت کا ایک ایک لفظ صاف سنائی دے رہا تھا۔ گلو کو لگا جیسے ہر لفظ تیزاب کا قطرہ بن کر اس کے حلق کے ذریعے سینے میں اتر رہا ہو۔ وہ تو یہ آواز سن کر ہی دروازے کی طرف لپکا تھا مگر امام دین کسی دیوار کی طرح اس کے سامنے آگیا تھا۔

"باہر مت جانا........... یہ........... ان کا آپس کا جھگڑا ہے۔"

"مگر یہ........... راجے کون ہے؟" گلو کو عورت کے چیخنے کے درمیان کہیں کہیں اسماعیل کی آواز بھی سنائی دے چکی تھی جو اس عورت کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس نے آواز بلند نہیں ہونی دی تھی۔

"اسماعیل راجہ اس کا پورا نام ہے وہ........... وہ شاید اس کی کوئی جاننے والی ہوگی۔"

"مگر جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہ..........." گلو اپنے سینے میں گہرا اضطراب محسوس کر رہا تھا۔

"ابے یار یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تو' تو کیا کرلے گا' ہیں؟ اسماعیل برداشت کرے گا کہ تو اس کے گھر کے جھگڑے میں بولے؟" امام دین کو ایک دم غصہ آگیا تھا۔

وہ خود بھی سخت بے چین تھا۔ اگر وہ وزیٹنگ کارڈ اس عورت کا تھا تو اسماعیل نے جس رد عمل کا اظہار کیا تھا' وہ موجودہ صورت حال سے قطعی مختلف تھا۔ اگر وہ کارڈ اس کا نہیں تھا تو یہ کون تھی؟ اور وہ کون تھا جس کا کارڈ دیکھ کر اسماعیل کو اپنی ذہانت اور چالاکی پر رشک آیا تھا۔ یہ ساری الجھنیں تھیں اور اس پر گلو کی مصیبت۔ وہ گلو سے محض اس لئے چڑتا تھا کہ اسے ایک بات سمجھانے میں آدمی کے سارے انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے تھے۔ اسے دنیا میں ہونے والے کسی بھی واقعے' کسی بھی جھگڑے سے لاتعلق رکھنا بے حد مشکل کام تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ماے مگر وہ عورت اگر ٹھیک کہہ رہی ہے اور اس کا بچہ اسماعیل نے چھینا ہے تو..........."

"تو! تو کیا کرلے گا؟" امام دین اب دونوں ہاتھوں کو کمر پر رکھ کر مقابلے کی سی پوزیشن میں آگیا تھا۔ "اس کا بچہ اس عورت کو دلوائے گا؟ ابے سنا نہیں کہ وہ اسماعیل کی اولاد کے جوان ہونے کا انتظار کر رہی تھی اور اسماعیل نے اس سے اتنا چھوٹا بچہ چھینا تھا کہ اب وہ........... اچھا یہ بتا! اس عورت کو نہیں پتا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ وہ کہہ نہیں رہی تھی کہ اس کا بچہ جہاں کہیں بھی ہوگا زندہ ہوگا۔" امام دین کا چہرہ اب غصے سے سرخ ہوگیا تھا۔ "اچھا جا........... اگر کچھ کر سکتا ہے تو کرلے جا۔" اس نے غصے سے گلو کو دروازے کی طرف دھکیلا۔

گلو وہیں جم گیا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ بھلا کیا کر سکتا تھا اور وہ کون ہوتا ہے اسماعیل کے ذاتی معاملے میں بولنے والا۔ کیا پتا یہ اس کی بیوی ہو' پہلی یا دوسری........... یا ممکن ہے تیسری بیوی........... یا پھر........... کوئی بھی........... کوئی بھی ایسی عورت جس سے کبھی اس کے تعلقات ہوں۔ وہ چپ چاپ صوفے پر آبیٹھا۔ باہر سے اب بھی شور شرابے کی آوازیں آرہی تھیں مگر اب ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ ڈرائنگ روم سے کافی دور ہوگئے ہوں۔ ممکن ہے اسماعیل اسے دھکے دیتا ہوا گیٹ تک لے گیا ہو۔ امام دین دیوار کے پاس کھڑا دیوار گیر گھڑی کو گھور رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف نہیں دیکھا۔ نہ ہی گلو کی طرف دیکھا کہ وہ باہر گیا یا وہیں ہے۔ وہ اب بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں ہتھیلیاں کمر پر جمائے' ٹانگوں کو کچھ پھیلائے کھڑا تھا۔

گلو باہر کی آواز پر کان لگائے بیٹھا رہا۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ پوری کوٹھی اچانک سناٹے میں ڈوب گئی ہے۔ یہ سناٹا صرف چند لمحوں کا تھا پھر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے' گیٹ بند ہونے اور کسی کے چلنے کی آوازیں آپس میں گڈ مڈ ہو گئیں۔ شاید دو یا تین منٹ بعد ہی قدموں کی چاپ دروازے کے قریب آکر ختم ہو گئی۔ پھر اسماعیل کی آواز گونجی۔ وہ کسی قاسم کو آواز دے رہا تھا۔ غالباً" قاسم وہیں قریب ہی تھا۔ اسماعیل نے اسے ٹھنڈی بوتلیں لانے کو کہا اور چند سیکنڈ بعد وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔

امام دین پہلے ہی چونک کر پلٹ چکا تھا۔ اس کی نگاہ صوفے پر بیٹھے گلو پر پڑ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب نے سکون کا روپ دھار لیا تھا اور اب وہ دروازے سے اندر داخل ہونے والے اسماعیل کی طرف متوجہ تھا۔

"سوری یار!" اسماعیل نے پہلے گلو کو پھر امام دین کو دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے پر پریشانی ضرور تھی مگر ایسی نہیں تھی جسے دیکھ کر تشویش ہوئی۔

"پاگل ہے.......... میرے گاؤں کی ہے۔ کسی کے ساتھ بھاگ کر یہاں آگئی تھی۔ میں نے اسے اس بدمعاش سے بچایا۔ ٹھکانے کا انتظام کیا اور.......... اور یہ نیکی بھی گلے پڑ گئی۔" وہ ایسے بول رہا تھا جیسے خود کلامی کر رہا ہو۔

گلو کا جی چاہا کہ وہ پوچھے تم نے اس کا بچہ چھینا تھا' مگر بات سینے میں ہی گونج کر رہ گئی۔

"اچھا چھوڑو.......... دماغ خراب کر دیا اس عورت نے۔ پتا نہیں اسے یہاں کا پتا کس نے بتا دیا۔"

وہ سامنے صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کن پٹیوں کو دبانے لگا۔ اسی لمحے ملازم ٹھنڈی بوتلیں لے آیا۔ گلو کو تو سخت بھوک لگ رہی تھی۔ یہاں آئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ اسے چاچا کی بھی فکر تھی۔ وہ جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ اسماعیل کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ وہ پچھلی ساری باتیں بھول چکا ہے۔ وہ عورت اسے بالکل کھوکھلا کر کے چلی گئی تھی۔ وہ اعتماد' وہ ہاتھ پھیلا کر' چاروں طرف گھوم

کر اپنی ذہانت پر اس کی حیرت آمیز خوشی سب رفو چکر ہو چکی تھی۔ یہ بھی نہیں لگتا تھا کہ اب وہ کسی سنجیدہ معاملے پر سوچ سمجھ کر گفتگو کر سکے گا' مگر پھر بھی وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"پیو!" اس نے ٹیبل پر رکھی کوکا کولا کی بوتلوں کی طرف اشارہ کیا پھر ایک بوتل اٹھا کر منہ سے لگا لی۔ گلو نے بھی بوتل اٹھائی مگر اس سے پہلے کہ وہ بوتل منہ سے لگاتا' اسماعیل آدھی بوتل خالی کر کے ٹیبل پر رکھ چکا تھا۔ وہ ایک ہی گھونٹ میں آدھی بوتل خالی کر گیا تھا۔

"ٹائم کیا ہو گیا؟" اچانک اس نے چونک کر سامنے کی دیوار پر ٹنگی قیمتی وال کلاک کی طرف دیکھا۔ "اوہ.......... نو بج رہے ہیں۔ چلو یار! باہر کھانا کھاتے ہیں۔ مجھے تو یہاں سخت وحشت ہو رہی ہے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

گلو کا دم بھی گھٹنے لگا تھا اور بھوک نے بھی سر چکرا دیا تھا۔ وہ لوگ کمرے سے باہر آگئے۔ اسماعیل نے ٹیکسی وہیں چھوڑ دینے کو کہا اور اپنی گاڑی نکال لی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ "سی گل" پر کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے دوران گلو صرف چاچا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ جب سے نازاں گئی تھی' چاچا ادھ مؤا ہو گیا تھا۔ پریشانی تو اسے گلو کے باہر رہنے سے پہلے بھی ہوتی تھی مگر اب تو دیوار پر سایہ اترتے ہی وہ بے چین ہو جاتا تھا اور بعض اوقات تو ایسی حالت ہو جاتی تھی کہ خوب بک بک کرتا' ساری رات بڑبڑاتا اور گلو کا جی چاہتا کہ یا تو خود گلے میں پھندا ڈال کر مر جائے یا کہیں سے نازاں کو ڈھونڈ کر لائے اور گلا گھونٹ کر مار دے۔

وہ اس وقت بھی جلدی گھر پہنچ جانا چاہتا تھا مگر بات ختم ہوتی تو کیا' شروع ہوتی ہی نظر نہیں آرہی تھی اور پچاس ہزار والی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ اگر ہو جاتی تو شاید گلو کی دلچسپی برقرار رہتی' کچھ دیر کو تو وہ چاچا کو بھی نظر انداز کر دیتا مگر اب تو اس کا جی اکھڑ گیا تھا۔

کھانے کے برتن ویٹر لے گیا تو اسماعیل نے رخ پھیر کر گلو کی طرف دیکھا۔ کافی معنی خیز انداز تھا جو سامنے لگی رنگین روشنیوں میں صاف دکھائی دے گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"گلو یہ جو پیسا ہے ناں! یہ.......... یہ نوٹ.......... کرارے اور خوشبودار.......... یہ آدمی کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں۔ جس زندگی سے نفرت ہوتی ہے' وہی حسین لگنے لگتی ہے۔ جن سڑکوں پر گھومتے ہوئے اپنے لاوارث ہونے کا احساس ہوتا ہے' وہی سڑکیں اپنی سلطنت بن جاتی ہیں۔ پیسا.......... بس پیسا ہونا چاہیے۔ میں جب پہلی بار کراچی آیا تھا تو ٹھکانہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پاؤں سوج گئے تھے' ٹوٹے ہوئے جوتوں میں پھنسے کنکر اور کانچ کے ٹکڑے پاؤں زخمی کر دیتے تھے مگر آج.......... آج میرے پیروں میں ڈیڑھ ہزار روپے کا جوتا ہے جو اگر میں میلوں چلوں تو بھی نہ ٹوٹے' مگر مجھے چلنا ہی نہیں پڑتا۔ گاڑی جو ہے اور.......... درختوں کے نیچے' پلیا کے نیچے' ریل کے ڈبوں میں رہتے رہتے میں نے ایک روز جھونپڑی بنالی تھی۔ وہ بھی اپنے لئے نہیں.......... میں خود تو شاید وہ بھی نہ بناتا مگر اب.......... اب میں جس محل میں رہتا ہوں وہ تم دیکھ ہی چکے ہو۔"

وہ ایسے بول رہا تھا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ اس منتر کا جادو گلو کے دماغ میں بھی بھرتا جارہا تھا۔ اسے پہلے چبوترا' پھر گلیاں' پھر محلے والوں کے دیئے ہوئے روٹی کے ٹکڑے' پھر چاچا کا گرم سکڑا ہوا سینہ اور چاچا کے گھر کی کچی دیواریں سب یاد آرہی تھیں' یوں جیسے یہ کہانی اس کی اپنی ہو۔ اس کی مندی ہوئی آنکھوں میں دروازے سے کھلتے دکھائی دے رہے تھے' اپنے پیروں کی سخت کھال مخمل ایسی نرم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے گھر کی کچی دیواروں پر محرابیں سی بن گئی تھیں۔ لال' ہرے' نیلے ہر رنگ کے کڑکڑاتے نوٹوں سے اس کی دونوں جیبیں بھرنے لگی تھیں۔

"یہ دو ہاتھ.......... یہ زبان.......... یہ دو پیر اور.......... ایک دماغ' بس یہ چھ چیزیں ہیں جو آدمی کی کایا پلٹ دیتی ہیں۔ بس انہیں دل کے ذریعے قابو میں کرنا ہوتا ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں ناں کہ دل کی بات نہ مانو' بکواس کرتے ہیں سب' ان چھ چیزوں کو چلانے والا یہی دل ہوتا ہے۔ جاہل کے بچے یہ بھی نہیں جانتے کہ اگر آدمی میں دل نہ ہو تو آدمی ہی نہیں ہوتا۔"

اسماعیل کی آواز سے اس کی مندی ہوئی آنکھ کھل گئی تھی اور پھر سارے مناظر ساری کیفیات دھواں بن کر اڑ گئیں۔ اس کے پیروں کی سخت کھال پر خارش ہونے لگی

تھی۔ جوتا کاٹ رہا تھا۔ چاچا کے سکڑے ہوئے سینے کی ٹھنڈک کا خیال آتے ہی گھبراہٹ شروع ہوگئی تھی اور گھر کی کچی دیواروں نے یاد آکر اسے گزرتے وقت کا احساس دلا دیا تھا۔ وہ جانا چاہتا تھا مگر..........

اسے یہ احساس بھی ہوگیا تھا کہ خوش قسمتی اس کے در پر دستک دے رہی ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ "یہ دستک تین بار ہوتی ہے۔" پہلی بار آدمی بے وقوفی میں نہیں سنتا' دوسری بار اسے نیک بننے کا خبط اٹھنے نہیں دیتا اور تیسری بار.......... ضمیر نام کا ایک بڈھا کھوسٹ اس کے اندر' اس کا گلا دبائے بیٹھا ہوتا ہے حالانکہ گلو کے لئے اس بڈھے کو دھکا دے کر آگے بڑھنا قطعاً مشکل نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ایک بار سہم چکا تھا۔

یہی بڑی عجیب بات تھی کہ خوش قسمتی چوتھی بار دستک دے رہی تھی۔ یا ممکن ہے یہی تیسری اور آخری بار ہو۔ گلو نے پوری آنکھیں کھول کر سوچا۔ وہ بالکل چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ساتھ بیٹھے امام دین پر نگاہ ڈالی جو دنیا سے بیزار بیٹھا سگریٹ کے کش پر کش لے رہا تھا اور غالباً اپنے ضمیر کو سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولوں میں لپیٹ کر پھونک چکا تھا۔

"جب امام دین جیسا کمزور آدمی یہ کر سکتا ہے تو میں..........!!" اور پھر گلو نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ فوراً ہی اس سے سگریٹ مانگی۔ اسماعیل نے اپنے قیمتی لائٹر سے اسے سلگا کر گویا آخری شعلہ ان کے اندر اتار دیا تھا۔ یہی شعلہ تھا جس نے اس کے اندر بیٹھے خرانٹ بڈھے کو جلا کر خاکستر کر ڈالا۔

"مجھے کرنا کیا ہوگا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔ لہجہ مضبوط اور اٹل تھا۔

امام دین نے چونک کر' بلکہ اچھل کر اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھا مامے!" اسماعیل نے پہلے اسے' پھر مامے کو دیکھ کر ستائشی انداز میں کہا۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ گلو بے وقوف نہیں ہے۔ غربت اور بے بسی آدمی کو بزدل بنا دے تو اسے کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور نہ ہی اس پر بے وقوفی کا لیبل لگانا چاہیے۔ ایسے حالات میں تو اندر کا آدمی یوں بھی باہر نہیں آپاتا' اب میں تمہیں دکھاؤں گا کہ گلو کیا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے گلو کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور گلو کو لگا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر اس کے اندر کا سب کچھ بدل دیا ہو۔ ہزاروں آنکھیں تھیں جو اس کے روم روم میں اگ آئی تھیں یا پسینے کے قطروں کی طرح پھوٹ پڑی تھیں۔ اسے پوری دنیا نظر آنے لگی' پوری طرح.......... بالکل صاف۔ یوں جیسے اس کے سامنے پھیلی گاڑھے سیاہ دھوئیں کی تنی چادر کہیں تحلیل ہوگئی ہو۔

"مجھے.......... صرف پیسا چاہیے سر! میں بھیک مانگنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا ہوں۔ میں نے بچپن سے بھیک ہی مانگی ہے' کبھی محلے والوں سے روٹی کی' کبھی کپڑے کی' کبھی خدا سے رحم کی' کبھی رشتوں کے مقدس لمس کی۔ پھر.......... لڑکپن سے ہی میں جانو کے آگے گڑگڑانے لگا تھا' اس سے فتح تک پہنچنے کی بھیک مانگتا رہا اور جب.......... جب وہ مل گیا تو.......... اس سے.......... خدا سے.......... سب سے' حتیٰ کہ اپنے کچے گھر کی دیواروں سے بھی پناہ مانگتا گلیوں میں بھٹکتا پھرا۔ مجھے کچھ بھی مانگنے سے نہیں ملا سوائے روٹی کے ان چند ٹکڑوں کے جن کے سبب میں.......... میں بن گیا' اتنا بڑا ہو گیا۔ کاش مجھے وہ ٹکڑے بھی نہ ملے ہوتے تو.......... یہ سب گورکھ دھندا ہی نہ ہوتا۔"

☆==========☆==========☆

اتنی روشنیوں کے باوجود امام دین کو اندھیرا سا پھیلتا محسوس ہوا' جانے یہ اندھیرا گلو کے الفاظ سے نکل کر پھیل رہا تھا یا حلق میں پھنسے آنسوؤں سے۔ اچانک باہر کی تمام آوازیں بھی معدوم ہوتی محسوس ہوئیں تھیں اور یوں لگا جیسے گلو ہچکیاں لے کر رونے لگا ہو۔ وہ جو ساکت رہ گیا تھا ایک دم پلٹا اور گلو سے لپٹ گیا۔ "گلو!.......... گلو تو۔" اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

"کیا بات ہے ماے!" کیا ہوا؟ گلو کی آواز اب بالکل نارمل تھی۔ امام دین نے چونک کر اسے دیکھا اور خجل سا ہو گیا۔ گلو تو بالکل ٹھیک تھا۔ اس کی آنکھیں خشک اور چہرہ سپاٹ تھا۔ شاید یہ اس کا گلو سے والہانہ لگاؤ تھا کہ وہ اس کے اندر کی تمام ہچکیاں سن چکا تھا اور یوں بھی وہ خود بھی مرد تھا۔ کتنی ہی بار وہ خود.......... اپنے اندر چیخ چیخ کر رویا تھا مگر باہر والوں کو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ کچھ بھی نہیں لگا تھا۔ اس کے اندر

آنسوؤں کا سیلاب بھی آیا تھا' تمام تمام رات وہ اس سیلاب میں ڈوبتا ابھرتا رہا تھا مگر کبھی تکیہ بھی گیلا نہ ہوا تھا۔ وہ جان گیا' گلو رویا تھا۔ ہچکیوں سے.......... سسکیوں سے مگر جو بھرم قائم رکھنا تھا وہ تو رکھنا ہی تھا۔

"اب تم بھیک نہیں مانگو گے گلو!" اسماعیل نے گرجدار مگر دھیمی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں فتح مندی تھی۔ جیسے وہ محمود غزنوی ہو' جیسے اس نے ایک گلو کو نہیں.......... اس کے اندر چھپے سترہ گلوؤں کو فتح کر لیا ہو۔ "اب لوگ تم سے بھیک مانگیں گے' روٹی کے چند ٹکڑوں سے لے کر زندگی جیسی قیمتی اور نایاب چیز تک کی بھیک اور.......... اور پھر تم بااختیار ہو گے گلو! کسی کو اپنے در سے خالی ہاتھ نہیں جانے دینا گلو! خدا سائلوں کو خالی ہاتھ لوٹانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ سمجھ رہے ہو نا تم! کوئی تمہارے در سے خالی ہاتھ نہیں جانے پائے۔ اس لئے کہ تم بااختیار ہو گے۔ گلو! یہ دنیا ہے.......... یہاں لوگ زندگی کی بھیک بھی مانگتے ہیں اور.......... اور موت کی بھی.......... موت کی بھیک.......... اور تم.......... بااختیار ہو گے۔" وہ اب ایسے لہجے میں بول رہا تھا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ گلو کو اب صرف اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے شعلے اس کے پیٹ کے اندر سے بلند ہو کر سینے میں اور پھر حلق سے ہوتے ہوئے اس کی کن پٹیوں کو سلگا رہے ہوں۔ یا جیسے اس نے تیزاب سے بھری بوتل پی لی ہو۔ وہ اندر سے جل رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں سے اور آنکھوں سے آگ کی لپٹیں سی نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

☆==========☆==========☆

امام دین آنکھیں پھاڑے گلو کے چہرے کو تک رہا تھا۔ روشنیاں تیز ہو چکی تھیں۔ اسے گلو کے بھنچے ہوئے جبڑے اور گردن کی پھولی ہوئی رگیں تک صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسماعیل کی آواز تیز دھار چھری کی طرح اس کی سماعت میں نہیں' اس کے سینے میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

اسے پہلی بار اپنے گناہ کا احساس ہوا۔ ایک ایسے گناہ کا جو اس نے جانتے بوجھتے کیا تھا۔ ایک انسان کو درندہ بنا دینے کا گناہ' ایک معصوم کو شیطان بنا دینے کا گناہ' اسے یقین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو چکا تھا کہ جب وہ گلو کو اپنی ٹیکسی میں لے کر اسماعیل کے گھر سے نکلے گا تو وہ.......... گلو نہیں ہو گا' ایک اور اسماعیل بن چکا ہو گا۔ وہی اسماعیل جسے کراچی کی گلیوں نے' یہاں کے لوگوں نے' یہاں کی بے حسی نے راجہ سے اسماعیل بنا دیا تھا۔ معصوم سے دیہاتی آدمی کو جو اپنی محبت کو گاؤں سے بھگا کر کراچی آیا تھا تاکہ اس کے ساتھ زندگی کو حسین بنا سکے مگر لوگوں نے اس کی محبت بھی اس سے چھین لی بلکہ خریدلی اور اس کے اندر کے راجے کا گلا گھونٹ کر اسے درندہ بنا دیا تھا۔ جس کے لئے آدمی کو قتل کر دینا اور قتل کروا دینا معمولی سا کام تھا۔

"بہت دیر ہوگئی ہے اسماعیل صاحب.........." وہ گھبرا کر بول اٹھا۔

"اوہ ہاں.......... بہت دیر ہوگئی ہے۔" اسماعیل چونک کر سیدھا ہوگیا۔ اس نے ہارن بجایا اور ویٹر کے آتے ہی ہاتھ میں تھامے کرارے نوٹ اسے پکڑا دیئے۔ "باقی رکھ لو۔" اس نے ویٹر کو جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھ کر کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ویٹر نے زور دار سلوٹ مارا اور الوداعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر ذرا سا خم ہوا۔

اسماعیل نے تیزی سے گاڑی ریورس کی اور پھر گھما کر اسے چوڑی سڑک پر ڈال دیا۔ اب وہ خاموش تھا' اور وہی کیا' یوں تو گلو بھی خاموش تھا اور امام دین بھی' مگر جتنا شور امام دین کے اندر تھا' اس سے کہیں زیادہ گلو کے اندر بھی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ امام دین خود کو گالیاں دے رہا تھا' اسماعیل کو اور اس لمحے کو کوس رہا تھا جب وہ اسماعیل جیسے جادوگر کی باتوں میں آکر گلو کو یہاں لایا تھا اور گلو! مفلسی کو گالیاں دے رہا تھا۔ جانو' احسان اللہ' فتح.......... اپنی ان دیکھی ماں اور اپنے انجانے بے غیرت باپ کو گالیاں دے رہا تھا۔ ان سب کو گالیاں دے رہا تھا جو اسے کبھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان لوگوں کو گالیاں دے رہا تھا جنہوں نے ہمیشہ اس پر ترس کھایا تھا یا نیک انسان بننے کی تلقین بھی طنزیہ انداز میں کی تھی۔ انہیں کوس رہا تھا جو اسے نکھٹو.......... بے غیرت اور بے حس کہتے تھے۔ آج تو وہ خان آفریدی کو بھی کوس رہا تھا جو اس سے سارے دن کی محنت کی کمائی لے کر صرف دو ہزار روپے تیس دن کے حساب سے اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کرتا تھا۔ آج وہ ساری دنیا کو گالیاں دے رہا تھا اور اس کے اندر اتنا شور تھا کہ اس کا دم گھٹنے

لگا تھا۔

کب اسماعیل کی کوٹھی آئی' کب چوکیدار نے گیٹ کھولا اور کب گاڑی پورچ میں جا کر رکی' گلو کو قطعی احساس نہ ہوا' وہ چونکا اس وقت جب امام دین کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ اس سے اترنے کو کہہ رہا تھا۔ گلو جلدی سے اتر آیا۔ اسماعیل اب سامنے ہی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"آج سے دوستی پکی؟" اس نے اپنا سیدھا ہاتھ گلو کی طرف بڑھایا تو اس کی انگلی میں پڑی انگوٹھی میں جڑے چھوٹے چھوٹے ہیروں کی چمک گلو کی آنکھوں میں بھر گئی۔ اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ بڑھا دیا۔

امام دین کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس نے تھوک نگلا۔ "اچھا سر! اجازت!!"

اس نے اپنی لرزتی آواز پر قابو پانے کی پوری کوشش کی تھی مگر اسماعیل' اور گلو دونوں ہی چونک اٹھے۔

"کیا ہوا ماے؟" پہلے گلو بولا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے بخار ہوگیا ہے.......... یا.......... شاید ہونے والا ہے۔ ایک دم ہی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔" امام دین نے اپنی ہتھیلی ماتھے پر رکھتے ہوئے نگاہیں چرالیں۔

"رات میں ٹھنڈ ہو جاتی ہے اور تم ذرا بھی احتیاط نہیں کرتے۔" اسماعیل نے کہا۔ "جاؤ' کوئی ٹیبلٹ لے کر سونا۔ مجھے ابھی تم لوگوں کی ضرورت ہے۔"

"جی سر!.........." امام دین نے مختصر سا جواب دیا اور برابر میں کھڑی ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

"حسن ارشاد کا کیا ہوگا!؟"

امام دین کو اپنی پشت پر گلو کی آواز سنائی دی تو اس کا ہاتھ لرز گیا۔ اسے چابی لاک میں ڈالنے کے لئے جھک کر سوراخ دیکھنا پڑا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ بات فی الحال آئی گئی ہوگئی۔ بعد میں اسماعیل کچھ سوچے گا تو دیکھا جائے گا۔ ایک دو دن تو مل ہی جائیں گے گلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو............ شاید وہ............ شاید وہ کچھ سوچ لیں۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"ہاں' وہ............ اس کا! کچھ کریں گے' اب تو دیر ہو گئی ہے' پھر بات کریں گے۔ ویسے جلدی نہیں ہے۔ یوں بھی مجھے کچھ دنوں کے لئے اسلام آباد جانا ہے' واپسی پر ملاقات ہوگی۔ سچ پوچھو تو اب میں اس کی طرف سے اتنا فکر مند نہیں ہوں۔ مجھے جس مضبوط سہارے کی ضرورت تھی' وہ مجھے مل گیا ہے۔ اس کا معاملہ تو کوئی بھی نمٹا سکتا ہے۔"

امام دین کا جی چاہا کہ اس کا گریبان پکڑ کر اتنی زور سے بھینچے کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ جائیں۔ وہ جان گیا تھا کہ وہ حسن ارشاد کو گلو کے ہاتھوں قتل کرا کے صرف اسے بلیک میل کرنا چاہتا تھا مگر گلو تو بغیر قتل کئے ہی اس کا وزیر بن چکا تھا پھر اسے پیدل کی جگہ ضائع کرنے سے اسے کیا فائدہ ملتا۔ یہ معمولی سا کام تو اس کا کوئی معمولی سا کارندہ بھی کر سکتا تھا۔

مگر مسئلہ یہ تھا کہ اسماعیل کا گریبان جو اس سے اس قدر قریب محسوس ہو رہا تھا' دراصل اس کی پہنچ سے بہت دور تھا' اتنی دور کہ وہ اس پر ہاتھ ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسماعیل کے گریبان کی طرف بڑھنے والے ہاتھ پھر کسی جسم پر نہیں رہ سکتے اور اسے ابھی اپنے ان ہاتھوں سے بہت کام کرنا تھے۔ وہ تو بغیر ہاتھوں کے جینے کا تصور تک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ٹھیک ہے سر! جب میری ضرورت ہو تو مجھے طلب کر لیجئے گا۔" گلو بے دام غلام بن چکا تھا۔

"ارے ہاں............" اسماعیل نے چونک کر کہا تو گلو کے اٹھتے ہوئے قدم جم گئے۔

"جی سر!"

"ایک منٹ............" اس نے اشارے سے اسے ٹھہرنے کو کہا پھر خود اندر چلا گیا۔ امام دین ٹیکسی میں بیٹھ چکا تھا۔ گلو وہیں ٹھہرا رہا۔ اسماعیل کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں دو لفافے تھے۔ اس نے ایک لفافہ گلو کی طرف اور دوسرا امام دین کی طرف بڑھا دیا۔

"مجھے فی الحال ضرورت نہیں ہے۔" امام دین باوجود کوشش کے اپنی بیزاری اور ناگواری کو چھپا نہیں پایا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ جلدی سے بولا۔ "آپ کے احسان بہت ہیں اسماعیل صاحب' پتا نہیں اتار بھی پاؤں گا یا نہیں۔ مجھے ضرورت ہوئی تو............ تو مانگ لوں گا۔"

"مانگنا اچھی بات نہیں ہے۔" اسماعیل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور لفافہ اس کی گود میں رکھ دیا۔

اتنی دیر میں گلو بغیر کچھ کہے لفافہ لے کر جیب میں رکھ چکا تھا۔ وہ خوب جان گیا تھا کہ مانگنا اچھی بات نہیں ہے۔

اسماعیل نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ایک بار پھر ہاتھ ملایا اور بولا۔ "چاچا کا علاج پوری توجہ سے کراؤ۔ کسی چیز کی کمی نہ ہونے دو۔ میں لوٹوں تو مجھے یہی خوش خبری ملے کہ چاچا ٹھیک ٹھاک ہے۔ سمجھے تم!"

"جی سر!"

"خدا حافظ۔" اس نے ہاتھ اٹھایا۔ امام دین نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ انجن کی آواز سنتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ ٹیکسی گیٹ سے باہر آکر سڑک پر اتری تو امام دین نے ایک دم اسپیڈ بڑھا دی۔ وہ اپنا تمام غصہ ایکسی لیٹر پر اتار رہا تھا۔

"آہستہ چلا ماے' بہت تیز ہے۔" گلو بھی گھبرا گیا۔

"کیوں............؟ آج تجھے گھر پہنچنے کی جلدی نہیں ہے؟ کیا آج تجھے چاچا کی پریشانی بھی نہیں ہے۔" اس کے انداز میں گہرا طنز تھا جس کا احساس گلو کو فوراً" ہی ہوا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اسے چاچا کی فکر ستانے لگی۔ واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔

"کیا بجا ہے؟" گلو نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"ساڑھے گیارہ۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔" امام دین نے اسی انداز میں جواب دیا۔ گلو کو یقین نہیں آیا تو اس نے امام دین کا وہ بازو پکڑ کر اپنی طرف گھمایا جس میں گھڑی تھی۔ واقعی رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔

"یقین آگیا تجھے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہوں!! آج تو چاچا قیامت کر دے گا۔ اب تک تو پورا محلہ سر پر اٹھا چکا ہو گا۔"
وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"کوئی بات نہیں۔ بکنے دینا اسے۔ اب تو یوں بھی تیرے دن پھرنے والے ہیں اب تجھے ان چھوٹی موٹی پریشانیوں کو تو ذہن سے نکال کر پھینک دینا چاہیے۔" امام دین کے منہ سے زہر ٹپک رہا تھا۔

گلو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ جان نہیں سکا تھا کہ امام دین اس سے اس انداز میں بات کیوں کر رہا ہے' اگر دیر ہونے پر غصے میں ہے تو بھلا اس میں گلو کا اپنا کیا قصور ہے۔ اس نے تو جان بوجھ کر دیر نہیں کی اور کوئی اور بات ہے تو.......... یہ وقت اس سے نہ بحث کرنے کا تھا نہ پوچھنے اور صفائیاں پیش کرنے کا' وہ بات بڑھانے کی بجائے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ کلفٹن کا پل اترتے ہی ویرانی کا احساس ہونے لگا تھا اور جوں جوں ان کی ٹیکسی ان کے علاقے کی طرف بڑھ رہی تھی' ویسے ویسے ویرانی اور وحشت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

"سالی ساری رونقیں امیروں کے لئے ہیں۔" وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"کیا؟ رونقیں..........؟" امام دین ہنس پڑا۔ پتا نہیں کیوں۔

گلو نے پھر اسے حیرت سے دیکھا۔

"اب تو' تو بھی امیروں میں شامل ہونے والا ہے میرے یار .... اب تو یہ ساری رونقیں تیرے گھر کی باندی بن جائیں گی۔ تو کیوں فکر کر رہا ہے۔"

"ماے تو.......... تو کیا مجھ پر طنز کر رہا ہے؟"

"نہ.......... نہ یار' طنز کیسا' میں تو یونہی کہہ رہا ہوں۔ چھوڑ اس بکواس کو' تیری گلی آ رہی ہے۔ آئندہ گھر سے نکلنا تو توا ضرور ٹیکسی میں رکھ لیا کرنا تاکہ واپسی پر سر پر توا باندھ کر دروازے پر اترے اور سن! میں دروازے تک نہیں جاؤں گا بلکہ گلی ہی میں نہیں جاؤں گا' مجھے تیرے محلے والوں کے سامنے تماشہ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پھر آج تو سر پر بال بھی نہیں ہیں۔ چپت بھی پڑی تو پوری کراچی ہی گونج اٹھے گی۔"

گلو بے ساختہ ہنس پڑا حالانکہ خود وہ بھی یہی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے گا۔ چاچا

کو مطمئن کرنا کبھی بھی اس کے لئے آسان نہیں رہا تھا۔ مزے کی بات تو یہ تھی کہ آج وہ اپنی ٹیکسی میں بھی گھر نہیں آیا تھا ورنہ.......... اور بھی ایک ترکیب اس کی سمجھ میں آ گئی۔

"ابے ہاں.........." وہ بول اٹھا۔ "ٹیکسی تو تیرے گیراج میں ہے۔ چاچا سے کہہ دوں گا' ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اسی لئے دیر ہو گئی۔"

"ٹھیک ہے' تیرا چاچا ہے' تیرا معاملہ ہے' مجھے کیا۔ ویسے اس اپنے رحمان چاچا کو کیسے مطمئن کرے گا جب اسے پتا چلے گا کہ ٹیکسی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ابے گھامڑ! وہ چھ برس سے ٹیکسی چلا رہا ہے' اسے پتا ہے کہ ٹھیک ہونے والی ٹیکسی کیسی ہو جاتی ہے۔ خیر یہ بھی تیرا ہی معاملہ ہے۔ چل اتر۔" اس نے گلی کے کونے پر ہی بریک لگا دیا۔

گلو نے گلی میں جھانکا اور اس کا خون خشک ہو گیا۔ گلی بھر میں چراغاں کا سا سماں تھا۔ تمام گھروں کے دروازے کھلے تھے۔ لوگ اتنی خنکی میں بھی گھروں سے باہر' گلو کے دروازے پر جمع تھے۔ چاچا کہیں ان لوگوں کے درمیان سر تھامے بیٹھا ہو گا' اس کا گلو کو یقین تھا۔ یہ منظر امام دین بھی دیکھ چکا تھا اسی لئے اس کے ٹیکسی سے اترتے ہی اس نے پوری قوت سے ایکسی لیٹر دبا دیا تھا۔

گاڑی کے انجن کی آواز نے مجمع کو کائی کی طرح کاٹ دیا تھا۔ لوگ ایک دم پلٹے تھے اور تبھی گلو کو چاچا بھی دکھائی دے گیا۔ اسے رحمان چاچا سنبھالے بیٹھا تھا۔ گلو پر نگاہ پڑتے محلہ پورا کا پورا اس کی جانب لپکا۔ سب اس سے خیریت پوچھ رہے تھے۔ چاچا دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو ہٹاتا ڈگمگاتا اس کے قریب آ پہنچا تھا۔

"گلو.......... گلو! کہاں تھا تو؟" اس کے انداز میں غصہ نہیں بے بسی تھی مگر گلو جانتا تھا کہ اگلا جملہ غصے کی آگ میں لپٹا ہوا ہو گا۔

"آج تو بچ گیا چاچا۔" گلو نے آستین سے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے چاروں طرف کھڑے لوگوں کو دیکھا۔

"کک.......... کیا مطلب؟" ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں اور پھر گلو نے ایک لمبے چوڑے ایکسیڈنٹ کی کہانی سنا دی جس میں قدرت نے اسے بال بال بچا لیا تھا اور گلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو یقین تھا کہ اس معجزے میں چاچا کی دعاؤں کا بڑا ہاتھ ہے ورنہ آج اس کا بچنا ناممکن ہی تھا۔

یہ کہانی سنتے ہی چاچا اس سے لپٹ گیا۔ لوگ اسے ہمدردی کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ رحمان چاچا اور چاچا اسے یوں سنبھال کر گھر کے اندر لے گئے جیسے وہ واقعی زخمی ہو۔ گلو کو بھی ایسی اداکاری کرنا پڑی جیسے اس کا بدن ڈول رہا ہو۔ اس سے چلا نہیں جارہا ہو لیکن اس نے چاچا کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کی تھی کہ اسے خراش تک نہیں آئی ہے بس دہشت کی وجہ سے وہ نڈھال ہے اور اسے اپنے بچ جانے پر حیرت بھی اس قدر ہے۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اتنے خوفناک حادثے میں بھی لوگ زندہ بچ سکتے ہیں۔

اسے پوری طرح ٹٹول لینے' اور اطمینان کر لینے کے باوجود چاچا نے فوراً ہی گرم گرم دودھ میں ہلدی اور پھٹکری گھول کر اسے پلادی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے ضرور اندرونی چوٹیں آئی ہوں گی اور اندرونی چوٹیں گرم ہوں تو پتا نہیں چلتا مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔ گلو نے ناک بند کر کے وہ دودھ پی لیا تھا اور اب پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔

محلے کے بہت سے لوگ اس کے گھر میں اور کچھ دروازے پر کھڑے تھے جنہیں رحمان چاچا نے یہ کہہ کر گھر بھیج دیا کہ اب گلو کو آرام کی ضرورت ہے۔ لوگ چلے گئے۔ رحمان چاچا نے اسے لٹایا' چاچا کو بھی آرام کا مشورہ دیا اور گھر چلا گیا مگر چاچا کا چین آرام تو جیسے ختم ہو گیا تھا۔ گلو پہلے پیار سے کہتا رہا کہ وہ سو جائے۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن جب وہ نہ مانا تو گلو نے شور مچانا شروع کر دیا۔ چاچا صرف اس خوف سے جا کر پلنگ پر لیٹ گیا کہ زیادہ چیخنا چلانا گلو کے لئے تکلیف دہ بھی ہو سکتا ہے پھر بھی اس نے اپنا پلنگ گلو کے پلنگ کے ساتھ ہی لگا لیا تھا۔

گلو جان گیا تھا کہ اب وہ اسے تمام رات سونے نہیں دے گا۔ اٹھ اٹھ کر اسے دیکھتا رہے گا اور اسی بات سے وہ جھنجلا بھی رہا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا مگر یہ اس وقت تک ناممکن تھا جب تک چاچا کے پلنگ کے چوں چاں جاری رہتی' گلو کچھ سوچ ہی

نہیں سکتا تھا۔

"سو گیا بیٹا؟" چند ہی لمحوں بعد چاچا کی آواز آئی۔

"تو سونے دے گا تو سوؤں گا۔" گلو نے دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا.......... ٹھیک ہے۔ بس آرام سے سوجا۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے نا! پانی وانی.........."

نہیں.......... مجھے صرف خاموشی اور سکون کی ضرورت ہے۔" اس نے سر اٹھا کر کہا اور تکیہ اپنے سر کے اوپر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا' اس نے کروٹ لی تو اس کی جیب میں پڑے نوٹوں کے لفافے نے اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا کر ایک دم ہی بے چین کر دیا۔ اس نے گنا بھی نہیں تھا کہ کتنی رقم ہے۔ اچھا خاصا موٹا لفافہ تھا۔ "بیس پچیس ہزار تو ہوں گے ہی۔" اس نے سوچا' جیب کو اپنے بھاری جسم تلے دبایا اور اپنی بے چینی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اس نے اسماعیل کی باتوں پر سوچنا چاہا تھا مگر ذہن پر سفید براق سی دھند پھیلی رہی یوں جیسے اس کے پاس سوچنے کو کچھ بھی نہ ہو۔ جیسے جو کچھ اسے سوچنا تھا' وہ سوچ چکا ہو۔ اس کیفیت سے اس نے قدرے سکون محسوس کیا اور پھر دھیرے دھیرے آنکھوں میں اندھیرا اور ذہن میں سناٹا اترتا چلا گیا۔

☆----------☆----------☆

امام دین گیراج پر نہیں گیا۔ وہ اتنی رات گئے وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ انجانا سا خوف تھا جو اسے اس سڑک پر جانے سے روک رہا تھا۔ یہ خوف کس کا تھا' یہ وہ سمجھ نہیں پایا۔ احسان اللہ اور جانو تو ختم ہو چکے تھے۔ فتح سے اس کا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی اور سے دشمنی اس نے پالی نہیں تھی' جو کام بھی کیا تھا وہ اتنی صفائی سے کیا تھا کہ اسے کسی قسم کا دھڑکا نہیں تھا مگر پھر بھی کوئی اندر ہی اندر اسے گیراج جانے سے روک رہا تھا۔

اس نے ایک دم ہی ٹیکسی کا رخ گھما کر گھر کی طرف کر لیا۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ زیبی اتنی ہی خردماغ لڑکی ہے کہ ممکن ہے دروازہ ہی نہ کھولے اور یہ رات اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی میں ہی سو کر گزارنی پڑے مگر اتنا اطمینان بھی ضرور تھا کہ محلہ اپنا ہے۔ پھر در بجا کر وہ کمبل مانگے گا تو وہ تو اسے مل جائے گا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ پوری فضا گہری نیند میں ڈوبی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی ٹیکسی کا شور اور بتیوں دونوں نے خوابیدہ گھروں میں لحہ بھر کو زندگی سی بکھیری تھی۔ ٹیکسی دروازے پر کھڑی کر کے ابھی وہ اترا ہی تھا کہ اسے دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ زیبی دروازے کے ادھ کھلے حصے کے درمیان دیوار کی طرح تنی کھڑی تھی۔

"تم.......... اس وقت؟"

"وہ.......... میں گیراج پر نہیں گیا۔" امام دین بوکھلا سا گیا' جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو۔" وہاں جانا ٹھیک نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے کہ.........."

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات اس سے کی کیوں نہیں جارہی۔ وہ اپنے ہی دروازے پر اجنبی کی طرح کھڑا تھا اور زیبی کی آنکھوں سے نکلتی سرد لہریں اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ "پھر بھی مجھے یوں ہکلانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کون ہوتی ہے مجھے میرے ہی گھر میں جانے سے منع کرنے والی۔" اس نے اچانک ہی سوچا اور قدم آگے بڑھا دیا۔ "ہٹو راستے سے۔" اس بار وہ ہکلایا تھا نہ ہی بوکھلاہٹ نے اسے کھسیانے پر مجبور کیا تھا۔

زیبی کی آنکھوں میں الجھن سی بھر گئی اور قدم بے ساختہ پیچھے کی جانب ہٹے۔ دروازے کے خلا سے اس کے ہٹتے ہی امام دین اندر داخل ہو گیا۔

"کیا تم آج یہاں سوؤ گے؟" زیبی کی آواز اسے پشت پر سے آئی۔ وہ ابھی تک دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"ہاں.......... اور ایسا میں مجبوراً کروں گا۔ تم جانتی ہو کہ میں........ یہاں نہیں سوتا۔ گیراج پر سوتا ہوں مگر.......... آج وہاں خطرہ ہے۔" اس نے پلٹ کر کہا اور وہاں پڑے تخت پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

"خطرہ تو.......... یہاں بھی ہے مگر.......... تمہارے لئے نہیں۔" پتا نہیں وہ بے خیالی میں بلند آواز سے بول اٹھی تھی یا جان بوجھ کر اس نے امام دین کو سنانے کے لئے

آواز اونچی کر لی تھی۔

"ہوں؟؟" امام دین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ دروازے کی چٹخنی لگا رہی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں کی چوٹی اس کی کمر سے نیچے لہرا رہی تھی۔ امام دین کو لگا جیسے واقعی خطرہ یہاں بھی ہے۔

"تمہیں اکیلے میں ڈر نہیں لگتا؟" امام دین نے گھر میں پھیلے سناٹے کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"آدمی ساری عمر اکیلے ہی جیتا رہے تو عادی ہو جاتا ہے۔ شاید لوگوں کے ہجوم سے ڈر لگے۔ تم کھانا کھاؤ گے؟" وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

"نہیں.......... اگر چائے مل جائے تو.......... یا چھوڑو۔" اس نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگا۔

اس نے سنا نہیں یا اہمیت نہیں دی۔ چائے کا پانی رکھ دیا۔ اس گھر میں دو کمرے تھے۔ ایک نسبتاً چھوٹا تھا اور دوسرا بڑا۔ یہ مکان امام دین نے خود اپنی محنت سے بنایا تھا مگر مکان بنانے کے تیسرے ہی مہینے زیبی کا ماما اور مامی حادثے کا شکار ہو گئی' وہ رشتے کے بھائی کے ساتھ رہتی رہی مگر وہ بھی جلد ہی مارا گیا تو وہ بالکل اکیلی رہ گئی۔

امام دین برسوں سے اسے جانتا تھا۔ اس کے بھائی سے دوستی بھی تھی' زیبی بھی اس کی شرافت کی قائل تھی' جب اس نے کرائے کے مکان کو خالی کروانے کا سنا تو اسے اپنے گھر رہنے کی دعوت دے دی' جو پہلے پہل تو اس نے مسترد کر دی تھی مگر اس وقت بھائی زندہ تھا۔ امام دین کو بے وقوف بنا کر غالباً گھر ہتھیانا چاہتا تھا۔ فوراً زیبی کو لے کر یہاں اٹھ آیا۔ آہستہ آہستہ اس کی کمینگی امام دین پر کھلنا شروع ہوئی تو کچھ اس کی شرافت آڑے آگئی اور کچھ زیبی سے انجانے جذبوں کی ڈور سی بندھی محسوس ہوئی۔

اس نے بھی امام دین کی مسکراتی نگاہوں پر اعتراض نہ کیا تھا' نہ تیوری پر بل آیا تھا سو ہمت بڑھی تو جذبے شدید ہوتے گئے۔ بھائی مارا گیا تو شدت سے لگاؤ محسوس ہوا۔ سہارا بنا تو زندگی بھر سہارا دینے کا عہد خود ہی کر لیا۔ زیبی سے بات کرنے کی ہمت' بزدلی کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ اب موقع ملا اور بات کر کے بات آگے بڑھانے کی ہمت کی تو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی سرد مہری نے قدم جکڑ لئے۔ تب پتا چلا کہ تیوری پر بل نہ ڈالنا' مسکراتی آنکھوں پر اعتراض نہ کرنا اس کی عادت تھی یا اس کی ذات کا سپاٹ پن۔

بقول اس کے وہ بچپن سے اکیلی رہی تھی۔ نہ ماما نے تحفظ کا احساس دلایا تھا نہ مامی نے دو سراہٹ کا۔ بھائی کی کمینگی کو وہ اس کے خراب خون پر محمول کرتی تھی۔ یوں بھی وہ اس کا اپنا بھائی تو تھا نہیں' مامی کا بھائی تھا اور مامی کے بھائی سے بھلا اس کا کیا رشتہ؟ امام دین کو یقین نہیں تھا کہ وہ اس کے ساتھ رہ لے گی مگر جب وہ اکیلی بھی اس گھر میں رہ گئی تو اسے جہاں حیرت ہوئی وہاں یہ یقین بھی پختہ ہو گیا کہ یہ سب اسی کے جذبوں کا کمال ہے مگر جب زیبی نے کہا۔

"میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں زندگی بھر غیروں کے ساتھ گزارا کرتی آئی ہوں۔ وہ کون سے اپنے تھے کہ تمہارے اپنے یا غیر ہونے کا سوچوں۔"

"محلے والوں سے.......... دنیا والوں سے.........." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"کوئی واسطہ نہیں۔ مجھے کسی کی پروا بھی نہیں ہے' ہاں اگر تم مجھے نہیں رکھنا چاہتے تو یہ دوسری بات ہے۔ میں کسی کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنا چاہتی۔ یہ گھر میرا نہیں' تمہارا ہے۔ یہ بات میں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

اور تبھی سے امام دین نے گویا دل سے یہ گھر اس کے نام کر دیا تھا۔ گیراج میں کمرا بنالیا۔ شروع میں کبھی دن میں آجاتا تھا۔ کبھی رات میں' ٹھکانہ پکا ہوتے ہی رات کو گھر آنا چھوڑ دیا۔ پہلے سوچتا تھا وہ ڈرے گی' مگر جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ خود کو اکیلے میں زیادہ محفوظ خیال کرتی ہے۔ اسے بھی اطمینان ہو گیا۔ لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں بھی دبائیں' باتیں بھی بنائیں۔ وہ جھوٹ بولتا رہا' کنی کتراتا رہا' مگر زیبی نے کبھی پلٹ کر کسی کی کسی بات کا جواب ہی نہ دیا۔ یوں بہت جلد دونوں کی زندگی سیٹ ہو گئی۔ رفتہ رفتہ محلے والوں کی باتیں بھی معدوم ہو گئیں.......... اور آج.......... وہ بڑے دنوں بعد رات کو گھر رہنے آیا تھا۔

جتنی دیر میں' امام دین نے منہ ہاتھ دھویا' اتنی دیر میں زیبی چائے بنا چکی تھی۔ اپنے لئے بھی بنائی تھی مگر اس نے امام دین سے بہت دور بیٹھ کر چائے پی۔ وہ گہری چپ

اوڑھے' نظریں زمین پر جمائے چائے پیتی رہی اور بہت دنوں بعد امام دین نے محسوس کیا کہ وہ واقعی بہت اکیلی ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ انجانے میں ظلم کا مرتکب ہو رہا ہے' یوں لگا تھا جیسے اس نے اپنے خالی گھر میں ایک چھوٹے سے پنجرے میں کسی چڑیا کو بند کیا ہوا ہے جسے وہ دانا پانی دے کر پھر دنیا کی گہما گہمی میں کھو کر بھول جاتا ہے۔ اس خیال ہی سے اس کا دم گھٹنے لگا کہ اس کا دنیا میں خود اس کے سوا کوئی بھی نہیں ہے جسے وہ ملتی ہو یا باتیں کرتی ہو یا کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اس کے بارے میں سوچتا ہو۔

اسے یوں تو زندگی نہیں گزارنا چاہیے تھی۔ وہ جوان تھی' اس کا دل بھی تھا اور دماغ بھی۔ اس کے دل میں بھی عام لوگوں کی طرح خواہشیں پیدا ہوتی ہوں گی۔ وہ بھی اپنے بارے میں یا آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتی ہو گی اور اس نے تو دو وقت کی روٹی' برتن یا گھر کی ضرورت کی اشیاء کی سوا کچھ بھی نہیں مانگا تھا۔ "کیا عورتوں کو ان اشیاء کے سوا کچھ نہیں چاہیے ہوتا؟" اس نے حیرت سے سوچا۔ خود اس کا بھی کبھی عورت نام کے کسی رشتے سے کب واسطہ رہا تھا۔

اس میں اور گلو میں صرف اتنا ہی فرق تھا کہ اس کی ماں تھی' اس نے وہ لمس محسوس بھی کیا تھا' اسے دیکھا بھی تھا اور اسے سیلاب اپنے ساتھ بہالے گیا تھا جب کہ گلو نے اپنی ماں کو دیکھا تک نہ تھا۔ نہ اس کا لمس محسوس کیا تھا اور یہ بات بھی اس نے اسے بچپن ہی میں بتائی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک ان کے درمیان ان رشتوں کے سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اس نے تو جان بوجھ کر ہی یہ ذکر کبھی اس کے سامنے نہیں چھیڑا تھا۔ وہ گلو کے زخم کریدنا نہیں چاہتا تھا۔

"سو جاؤ۔" یہ زیبی کی آواز تھی۔ وہ اس کے سامنے سے پیالی اٹھا رہی تھی۔

"ہیں!!!" وہ چونک اٹھا مگر وہ پیالی لے کر پلٹ چکی تھی۔

"زیبی..........!!" بے ساختہ وہ اسے پکار اٹھا۔

"کیا ہے؟" انداز بہت روکھا تھا۔

"وہ.......... زیبی اگر تم چاہو تو.........." وہ پھر گھبرا گیا۔

"کیا چاہو تو؟" اس کا انداز ہی ایسا تھا کہ امام دین جو کچھ کہنا چاہتا تھا سب بھول جاتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔

"مطلب یہ کہ یہاں تم.......... گھٹن تو محسوس نہیں کرتیں؟"

"یہ گھٹن تو پوری دنیا میں ہے۔" وہ شاید ایک دم ہی اس کی بات سمجھ گئی تھی۔

"تم سو جاؤ۔"

اس کے بعد وہ رکی نہیں اور گلو نے بھی سو جانے ہی میں عافیت محسوس کی تھی حالانکہ وہ آج اس سے بہت سی باتیں پوچھ لینا چاہتا تھا۔ اس کا دماغ بہت بوجھل ہو چکا تھا۔ ایک تو گلو سے اسماعیل کی ملاقات کروا کر ہی وہ خود کو عجیب سا محسوس کر رہا تھا پھر دوسرا بوجھ اسے زیبی کی تنہائی اور خاموشی دیکھ کر سینے پر محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے زبردستی آنکھیں موند لیں پھر وہ بہت دیر تک جاگتا رہا مگر اس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ اس نے صرف محسوس کیا تھا کہ زیبی اس کے جاگنے تک جاگتی ہی رہی تھی۔ پتا نہیں اس کے سونے کے بعد سوئی تھی یا جاگتی ہی رات گزار دی تھی مگر اس سوال کا جواب اسے صبح سویرے ہی مل گیا۔

جب سورج کی پہلی پہلی کچی نرم کرنیں دیوار سے اتر کر اس کے پلنگ تک پہنچیں تو کسمسا کر جاگ اٹھا۔ زیبی اس سے کچھ دور دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔ چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھا اور نگاہیں خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا رخ ترچھا ہونے کے باوجود امام دین کو اس کی آنکھوں میں گہری سرخی صاف دکھائی دے گئی۔ وہ بہت آہستگی سے اٹھا تھا مگر وہ یوں اچھل کر اس کی جانب مڑی جیسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہو تو امام دین کو لگا جیسے اس کے سامنے دو دیئے سے جل رہے ہیں' اس کی آنکھوں میں جلے دیئے کی لَو سرخ تھی۔ وہ شاید ساری رات ہی جاگتی رہی تھی۔

تب امام دین کو اپنی رات کی پریشانی بے وجہ لگی بلکہ اب تو وہ پشیمانی بھی محسوس کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ زیبی اس کی موجودگی کے خطرے کی وجہ سے جاگتی رہی ہوگی۔ یہ خوف کسی بھی لڑکی میں بے وجہ ہی پلنا شروع ہو جاتا ہے۔ شاید اس کا سبب معاشرہ تھا یا ممکن ہے کہ زیبی کی چھوٹی سی زندگی کا کوئی تجربہ یا مشاہدہ بھی شامل ہو۔ یہ کوئی عجب بات نہیں تھی بلکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو عجیب و غریب بات ہوتی۔ امام دین کو اس

پر ترس آ رہا تھا اور وہ سپاٹ چہرہ مگر سلگتی آنکھیں لئے باورچی خانے کی طرف پلٹ چکی تھی۔

امام دین چند منٹوں ہی میں منہ ہاتھ دھو کر آ گیا۔ اس نے منہ صاف کرتے ہی جوتے پہن لئے' وہ کھڑا ہونے ہی والا تھا کہ زیبی نے چائے کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"نن.......... نہیں بس.......... میں گیراج پر ہی پیوں گا۔"

"تم یہاں مہمان نہیں ہو اور.......... نہ یہ سب کچھ میرا ہے۔" اس نے چائے کی پیالی کی طرف نگاہوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں نسبتاً بہت نرمی تھی اور شاید کہیں دور دکھ بھی تھا۔ تہی دامنی کا احساس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ یوں جیسے اسے آج پہلی بار پتا چلا ہو کہ یہ گھر اس گھر کی ساری چیزیں اس کی نہیں ہیں۔ امام دین کی شرمندگی بڑھ گئی تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے چائے کا پیالہ تھام لیا۔

وہ دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا۔ اپنی بزدلی پر بھی اسے غصہ آ رہا تھا۔ "بھلا اگر وہ گیراج پر جاتا تو کیا ہوتا؟ کون آتا اور اسے کھا جاتا..........؟ کیا خوف تھا ایسا جس نے اسے وہاں جانے سے روکا تھا۔" کافی دیر سوچنے کے بعد بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تب اس نے بڑی ایمانداری سے اپنی اس حرکت کو اپنی کمینگی پر محمول کیا اور جلدی جلدی چائے کے گھونٹ لینے لگا۔

رات اس نے زیبی سے بات کرنے کی جو ہمت پیدا کی تھی وہ تو اس کے سرد رویے اور گہری خاموشی نے نگل لی تھی مگر آج کا یہ نرم مگر دکھی کر دینے والا جملہ اسے پھر ہمت دلا رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اب ٹھہرنے پھر بات کرنے کا ارادہ باندھے اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہی سب کچھ کہہ ڈالے۔

"ناشتا تیار ہے۔ تم چاہو تو ناشتا کر سکتے ہو۔" اس نے امام دین کو چونکا دیا۔

"نہیں.......... بس ناشتا نہیں کروں گا۔" وہ پھر بوکھلا گیا۔

"میں نے تیار کر لیا ہے۔" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم نے کرلیا ناشتا؟"

اس نے پلٹ کر امام دین کی طرف دیکھا۔ "نہیں۔ اب کروں گی۔" وہ پھر کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

امام دین بیٹھ گیا۔ آج شاید پہلی بار یہ سب کچھ ہو رہا تھا پھر زیبی پر چھائی خاموشی' سخت لہجے کا نرم ہونا' چائے پھر ناشتے پر اصرار' ان سب باتوں نے پھر امام دین کو سہارا دیا۔ وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ دس منٹ بعد ہی وہ گرم چائے' پراٹھے اور سبزی لے آئی۔ وہیں پلنگ پر رکھ دینے کی بجائے پہلے کمرے سے جاکر اونچی سی چوکور ٹیبل اٹھا لائی۔ جس پر چوخانے کا کپڑا بچھا ہوا تھا۔ امام دین اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ اٹھ کر اس کے ہاتھ سے ٹیبل لے لے۔ سامنے ٹیبل رکھ کر اس نے ناشتے کی ٹرے رکھی۔ سلیقے سے پلیٹ اس کے سامنے رکھی پھر کمرے سے کرسی اٹھا کر لائی تو امام دین حیران رہ گیا۔ یہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی تھی۔ اس کی پشت پر سفید کور چڑھا ہوا تھا۔ کرسی رکھ کر اس نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

امام دین کسی سحرزدہ شخص کی طرح اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور جب وہ ٹشو پیپر کا ڈبا بھی اٹھا لائی اور اسے ٹیبل پر رکھ دیا تو امام دین کو حیرت سے پسینے آگئے۔ یہ چیزیں اس نے نہیں خریدی تھیں۔ یہ چیزیں زیبی نے کب لیں' کیسے لیں' اسے کچھ پتا نہیں چلا اور اس نے تو مہینوں سے کمروں کے اندر جھانکا بھی نہیں تھا۔ پتا نہیں اس نے اس مکان کو گھر کب اور کیسے بنا دیا تھا۔ جو برتن ناشتے میں استعمال ہو رہے تھے وہ بھی قیمتی اور خوبصورت تھے۔

چند چیزیں تو اس نے ضرور امام دین سے منگوائی تھیں اور کچھ چیزیں وہ امام دین کے ساتھ بازار سے جاکر لائی تھی مگر اس نے کبھی بھی دھیان نہیں دیا تھا کہ وہ کیا لا رہی ہے۔ امام دین کا جی چاہا کہ وہ جاکر کمروں میں جھانکے۔ مگر جانے کیوں وہ بیٹھا رہ گیا۔

"ٹھنڈا ہو جائے گا۔" اس نے پھر سناٹے کو توڑا۔

امام دین نے چونک کر اسے دیکھا۔ "تم نہیں کرو گی؟"

اس نے لمحہ بھر کو اس کی طرف دیکھا پھر اندر جاکر دوسری کرسی بھی اٹھا لائی اور امام دین کو لگا جیسے وہ کسی بہت اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں کھانا کھا رہا ہے۔ یہ احساس صرف اس لئے ہوا تھا کہ وہ تو اس انداز میں اور اس طرح گھر میں کھانے کا تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ بچپن میں اس نے ماں کو دیکھا تھا' اس کے ساتھ کھانا بھی کھایا تھا مگر اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ ایک میلی سی پرانی دری بچھا لیا کرتی تھی' وہیں سب بیٹھ کر کھاتے تھے۔ گھر کا ایسا ہی تصور اس کے ذہن میں بھی تھا مگر............! "کتنا سلیقہ ہے اس میں' یہ گھر کو جنت بنا دینے والی عورتیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔" وہ خوش ہو گیا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

اچانک زیبی کی آواز سے کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی اور اس کا دل حلق میں آگیا۔ "گویا وہ بھی کچھ کہنا چاہتی ہے۔" اس نے سوچا' نوالہ بغیر چبائے نگل لیا اور پیالی ہاتھ سے رکھ دی ورنہ شاید چائے چھلک جاتی۔

"ہاں............ کہو۔" وہ بے قابو ہوتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اب وقت نہیں ہے مگر............ میں چاہتی ہوں کہ تم شام کو آؤ۔"

"نہیں' نہیں............" وہ ایک دم بوکھلا گیا۔ "بہت وقت ہے۔ آج یوں بھی مجھے کام کوئی نہیں ہے۔" اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں اچانک آجانے والا یہ لمحہ' طوفان کی کسی بڑی سی لہر کی طرح ابھی پلٹ کر گہرے سمندروں میں گم ہو جائے گا۔

"مگر مجھے کام ہے۔ میں آج پھر کچھ سوچنا چاہتی ہوں۔ کچھ وقت اور چاہتی ہوں۔"

"کیا اتنے عرصے میں تم نے کچھ نہیں سوچا؟" وہ مرجھائے ہوئے انداز میں بولا۔

"کوئی بھی بڑا فیصلہ کرتے وقت آدمی کو بہت سوچنا پڑتا ہے امام دین............ کچھ نہ سوچ کر فیصلہ کر دینے کی خاصیت مردوں میں ہوتی ہے' عورتوں میں نہیں۔"

"ہاں وہی............" اس نے انتہائی بے وقوفی میں سر کو ہلایا۔ تیز دماغی اور چالاکی کا سارا زعم ہمیشہ اس گھر کی چوکھٹ کے باہر ہی رہ جاتا تھا۔" ویسے مجھے تمہارا ہر فیصلہ قبول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ میں تو.......... میں تو بہت عرصے سے سوچ رہا تھا۔ بلکہ 'رات میں نے سوچا بھی تھا کہ تم سے خود ہی بات کرلوں مگر.......... پھر سوچا کہ.........."

"اور میں اسی لمحے سے ڈرتی تھی جب تم بات کرو۔ اچھا ہوا کہ تم نے رات بات نہیں کی۔ ورنہ.......... جو کچھ مجھ میں بچا ہے شاید وہ بھی ختم ہو چکا ہوتا۔" اس نے پیالی سے اٹھتی بھاپ پر نگاہ جما کر کہا۔

"کیا.......... کیا ختم ہو جاتا؟"

"کچھ نہیں.........." اس نے یوں مسکرا کر دیکھا جیسے کسی بے وقوف بچے کو دیکھ کر کوئی بڑا مسکرا دے۔ "شام کو آؤ گے تو بات کروں گی۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا اور ناشتے میں مصروف ہو گئی۔

امام دین کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ اس سے بات کرنے پر تیار ہو گئی ہے۔ وہ جانتا تھا' اسے یقین تھا کہ بس.......... ان کے درمیان اب بات کرنا ہی رہ گیا تھا' وہ بھی بقول زیبی کے' شام کو ہو جائے گی۔ امام دین کی ساری کسل مندی' تمام پریشانی اور رات والا وہ احساس قطعی زائل ہو گیا جس کے تحت اسے زندگی انتہائی بے درد' بے رحم اور ذلیل چیز لگ رہی تھی۔ مارے خوشی کے اس سے ناشتا کیا ہی نہیں گیا زیبی کے ہاتھ کے گرم گرم پراٹھوں نے اس کی پوروں میں زیبی کے ہاتھوں کی جو حرارت بھر دی تھی اسے وہ پانی سے دھو کر ختم نہیں کرنا چاہتا تھا' نہ زیبی کے لائے ہوئے ٹشو پیپرز کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ پیالی خالی کرکے وہ اٹھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ یہیں پاگلوں کی طرح نہ ناچنے لگے۔

"میں چلتا ہوں.......... شش.......... شام کو آؤں گا۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف جھپٹا۔

☆==========☆==========☆

گلو کی جان بچ گئی تھی ورنہ جو چاچا کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ وہ امام دین کے ساتھ تھا اور ایک ایسے آدمی کے پاس سے رات گئے آیا ہے جس نے بغیر کسی کام کے نوٹوں سے بھرا لفافہ اسے دیا ہے اور وہ لفافہ اب بھی اس کی جیب میں ہے تو.......... تو پتا نہیں کیا

ہوتا؟ گلو صرف تصور کرکے ہی کانپ اٹھا تھا۔ اتنے بہت سے نوٹوں کی موجودگی کا احساس اس کی نیند نگل چکا تھا۔ تمام رات اس کا پورا وجود سماعت بن کر چاچا کے پلنگ کی آوازوں کو سمیٹنے میں لگا رہا اور آسمان کی سیاہی سرمئی ہونے لگی۔

آنگن سے باہر' دروازے کے قریب لگے گھنے درخت پر بسیرا کرنے والے پرندوں نے دھیرے دھیرے چہچہا کر صبح کاذب کا اعلان کر دیا تھا۔ اسی لمحے گلو چونک اٹھا تھا۔ اس نے تو اب سے پہلے بہت لمبی لمبی راتیں جاگ کر بتائی تھیں۔ یہ کیسی رات تھی' جو پل کے پل میں بیت چکی تھی۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ پھر ایک بار چونکا۔ ہلکے سے خراٹوں کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے دھیرے سے کروٹ لی۔ اس کا دایاں ہاتھ سن ہو چکا تھا تب اسے احساس ہوا کہ وہ تمام رات اسی کروٹ پر لیٹا رہا اور اس کے اعصاب تمام رات کھنچاؤ کا شکار رہے ہیں۔ اس نے اپنی تکلیف بھول کر چاچا کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی خراٹے لے رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے گلو پلنگ چھوڑ چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں غسل خانے کی طرف بڑھا۔ دروازہ اچھی طرح بند کرکے اس نے سب سے پہلے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ نوٹ گنتے گنتے اسے پسینہ آ گیا۔ پانچ پانچ سو کے پورے پچاس نوٹ تھے۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگالی۔ سانس ایسے پھول گیا جیسے وہ دور سے بھاگتا ہوا آیا ہو۔ "پچیس ہزار.......... یونہی.......... بے وجہ..........؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس نے سوچا مگر پھر دوسری سرگوشی نے اسے پُرسکون کر دیا تھا۔

"کام ہو گا بھی تو کرنا پڑے گا گلو.......... اب تو بچہ تو نہیں رہا کہ کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ پیسے میں طاقت ہوتی ہے۔ دنیا پیسے والے کی عزت کرتی ہے' تمام عیش انہیں ہی میسر ہوتے ہیں۔ سارے عذاب مفلسی کے' سارے دکھ غریبی کے اور تمام تکلیفیں صرف غریبوں کے حصے میں آتی ہیں۔ کیا یہ ساری باتیں تو نے نہیں سنیں؟"

"سنی ہیں۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر وہ چونک اٹھا۔ اس نے پیسے پھر لفافے میں رکھے۔ لفافے کو بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ کر دھیرے سے باہر نکل آیا۔ چاچا ابھی تک سو رہا تھا۔ وہ چپکے سے بستر پر جا لیٹا۔ آج اسے اپنے دل میں کوئی بوجھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک مضبوطی تھی' عجیب سی' جو انسان کو باہر سے مضبوط مگر اندر سے کمزور بنا دیتی ہے مگر اس کمزوری کا احساس اسے قطعاً نہیں ہوتا۔ گلو کو بھی نہیں تھا۔ لیٹے لیٹے بھی اس کی گردن اکڑ گئی' یوں جیسے وہ کسی سلطنت کا بادشاہ ہو اور رعایا کے درمیان سے گزر رہا ہو۔ رعونت اس کی جیب میں سرسراتے نوٹوں کی خوشبو میں لپٹی اس کی پورے وجود میں پھیل رہی تھی۔ غیر محسوس انداز میں پھر صبح کی لطیف خنکی میں بسی' ہوا کے نرم و ملائم جھونکوں نے اسے ہلکورے سے دیئے تھے اور اس نے مسکرا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ اسے لوری دے رہی تھی' اس لمحے دور مسجد میں دی جانے والی اذان اسے قطعی سنائی نہیں دی' یوں جیسے اس نے اپنی تمام تر سماعتیں سمیٹ کر اپنی جیب میں رکھے لفافے میں بند کر دی ہوں۔

☆==========☆============☆

"گلو! اٹھ بیٹا.......... کیسی طبیعت ہے؟"

چاچا نے اسے اٹھایا تو پہلے تو اس نے کروٹ لے لی' پھر دوسرے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ پتا نہیں کیسا خوف تھا جو اسے بے وجہ ہی یوں چوکنا کر گیا۔ "صبح.......... صبح ہو گئی کیا؟"

"طبیعت کیسی ہے؟ تیرے لئے دودھ گرم کر دیا ہے' پی لے۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا پیتل کا بڑا سا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ وہ فوراً ہی دودھ لے کر پینے لگا۔

"اب آج گھر سے مت نکلنا۔ بس آرام کرتا رہنا۔ میں نے رحمان سے کہہ دیا ہے وہ تیرے خان آفریدی کو کہہ دے گا۔ یہ تو بتا ٹیکسی کہاں ہے؟ کس جگہ چھوڑی تھی۔ رحمان کہہ رہا تھا کہ اس کی مرمت میں بڑا پیسا خرچ ہو گا۔ بچی بھی ہے یا پوری کی پوری ختم ہو گئی۔"

چاچا کی باتوں نے اسے احساس دلا دیا کہ رات بولا جانے والا جھوٹ رحمان چاچا کے ذریعے کسی بھی وقت کھل سکتا ہے۔ ٹیکسی تو امام دین کے گیراج پر بالکل ٹھیک حالت میں کھڑی تھی۔ وہ صرف پل بھر کو گھبرایا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا۔ "ٹیکسی کو اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے' وہ تو میں نے ٹھیک کرنے کے لئے دے دی تھی۔ آج

شام تک ٹھیک ہو جائے گی۔"

"چل یہ تو بہت اچھا ہوا۔" اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ "اب تو یہ کر کہ.........."

"بس چاچا.........." اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "نصیحت سننے کا موڈ نہیں ہے میرا' میں تنگ آ گیا ہوں تیری باتوں سے۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اپنا اچھا برا خوب سمجھ سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کے فیصلے بھی خود کر سکتا ہوں۔ دنیا میں رہتا ہوں اس لئے دنیا والوں سے میل جول کا طریقہ بھی جان گیا ہوں۔"

پتا نہیں اس کے لہجے میں کیا تھا؟ اس کے انداز میں کیسی سفاکی تھی کہ چاچا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور گلو اٹھ کر غسل خانے میں چلا گیا۔ وہ نہا کر واپس آیا تو بھی چاچا گم صم بیٹھا تھا۔

گلو نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور چولہے پر چڑھی چائے کی دیگچی کو اتار کر چائے پیالے میں انڈیلنے لگا۔ چاچا بالکل چپ رہا۔ گلو کے گھر سے نکلنے تک وہ کسی بت کی طرح بیٹھا اسے تکتا رہا تھا۔ گلو نے کئی بار اسے کن انکھیوں سے دیکھا مگر بات یوں نہ کی کہ اس کا سکتہ ٹوٹ جاتا تو وہ اسے گھر ہی سے نہ نکلنے دیتا۔ جب کہ وہ امام دین سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ خان آفریدی سے بات کرنا چاہتا تھا کہ وہ قسطوں پر ٹیکسی اسے دے دے۔ جیب میں پڑی رقم کیڑوں کی طرح اس کی جیب میں پڑی کلبلا رہی تھی۔ گلو کو یوں لگ رہا تھا جیسے لفافہ کسی بلی کی طرح کسی بھی وقت جیب سے باہر جھانک لے گا اور چاچا کو پتا چل جائے گا کہ اس کے پاس اتنا بہت سا روپیہ ہے۔

وہ گھر سے نکلا تو چاچا ویسا ہی گم صم بستر پر لیٹ چکا تھا۔ نکلتے ہوئے اس نے اتنا کہہ دیا تھا کہ وہ ٹیکسی لینے جا رہا ہے۔ دوائیں وقت پر کھانے کی تاکید بھی کی تھی۔ گھر سے نکلا تو رحمان چاچا سامنے سے آ رہا تھا۔ وہ چاچا سے ملے بغیر نہیں جاتا تھا۔ اسے یوں دیکھ کر حیران بھی ہوا۔ اسے آرام کرنے کو کہا مگر گلو نے جب بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے تو وہ بھی چپ ہو گیا۔ اسے چاچا کا خیال رکھنے کا کہتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔ بس اسٹاپ پر پہنچ کر اس نے اخبار والے سے اخبار خرید لیا۔ خود اسے تو پڑھنا اتنا نہیں آتا تھا مگر امام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دین اچھا خاصا پڑھ لیتا تھا۔ اسی وقت خالی رکشا دیکھ کر گلو نے ہاتھ دے دیا اور پندرہ منٹ بعد ہی وہ امام دین کے گیراج پر پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر امام دین کھل اٹھا۔

"ابے یار.......... تو؟.......... تو نے اچھا کیا کہ آگیا۔" امام دین لپک کر اس کے قریب چلا آیا۔

گلو نے رکشا والے کو پیسے دے کر فارغ کیا' وہ پلٹا تو امام دین پر نگاہ پڑتے ہی چونک اٹھا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "کیا بات ہے' کیا تیری لاٹری نکل آئی ہے؟"

اسے اس بات سے خوشی ہوئی تھی کہ رات اس نے امام دین کا جو موڈ دیکھا تھا وہ اس وقت نہیں تھا۔

"ہاں.......... لاٹری نکلی ہے اور.......... اور ایسی ویسی لاٹری نہیں.......... تو ادھر آ.......... وہاں بیٹھتے ہیں۔" وہ اس کا ہاتھ کھینچ کر کمرے میں لے گیا۔

گلو کے بیٹھنے سے پہلے ہی اس نے زیبی کے بارے میں بتانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت وہ گلو کو کوئی ایسا معصوم سا بچہ لگ رہا تھا جسے اس کا من پسند کھلونا اچانک ہی مل گیا تھا جس کے ملنے کی اسے کبھی توقع ہی نہ ہو۔ اسے خوشی ہوئی کہ امام دین کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ آج اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ جو پیار دل میں کہیں دبا رہ جائے وہ بڑا شدید ہوتا ہے۔ جس لمحے وہ امام دین کی باتیں سن رہا تھا اس لمحے اس کے دماغ کی روشن اسکرین پر پھر وہی معصوم سا چہرہ ابھر ابھر کر ڈوب رہا تھا جو بچپن سے آج تک اس کے ذہن کے کسی تاریک خانے میں محفوظ تھا۔

وہی آنکھوں میں دکھ اور حیرانی' وہی آنسوؤں کی میلی میلی لکیریں' وہی ہونٹوں کے پاس سرخ ابھرا ہوا دانہ.......... اس چہرے میں کوئی کشش' کوئی خوبصورتی نہ ہونے کے باوجود وہ اسے بہت پیارا لگتا تھا۔ بے کلی یوں پورے وجود میں پھیل جاتی تھی جیسے کسی اہم چیز کے کھو جانے کو بھلا دینے اور پھر اچانک یاد آجانے پر ہوتی ہے۔

"وہ آج خود بات کرے گی۔"

امام دین کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "آں.......... ہاں.........." وہ بے وجہ ہی

مسکرا دیا۔ "یہ اچھی بات ہے۔ وہ بے چاری بھی آخر کب تک یوں دنیا والوں کی باتیں سنتی اور میں تو حیران ہوں کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے.......... اسے تو پہلے ہی یہ سب کر لینا چاہیے تھا۔ ویسے تو اس معاملے میں بالکل بے وقوف ہے۔"

"بات بے وقوفی کی نہیں ہے یار.......... پتا نہیں اس میں ایسی کیا بات ہے؟ بندہ اس کے سامنے ہو تو لگتا ہے اس کی آنکھوں سے نکلنے والی جادوئی لہروں نے اسے پتھر کا بنا دیا ہے۔"

"پاگل ہے تو اور کچھ نہیں.........." گلو ہنس دیا۔ "اچھا چھوڑ.......... میں کل والے معاملات پر تجھ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے اخبار بینچ پر رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر میں آج کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" امام دین نے برا سا منہ بنایا۔

"وقت کم ہے یار اور.......... تجھے پتا ہے' بات صاف نہ ہو تو دماغ میں بلا وجہ کیڑے کلبلانے لگتے ہیں اور اب یوں بھی تیرے ساتھ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے نا! اس وقت۔ اسے بات ہی کرنا ہے' پھر تیاری ساری میں کروں گا تو آرام سے پڑا رہنا۔"

"لگتا ہے کل رات ہی میری قسمت کا ستارہ نکل آیا ہے۔ سالا پتا نہیں اب تک کہاں دبکا پڑا تھا۔" امام دین نے ساتھ والے پلنگ پر لیٹ کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھتے ہوئے بڑی سرشاری سے کہا۔ "یوں بھی اب اس پر بات کیا کرنی ہے۔ صرف تاریخ طے کرنا ہوگی شادی کی۔"

"میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں چاچا کا کیا کروں یار!"

"چھوڑ دے۔" اس نے بڑی آسانی سے کہہ دیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یا تو چاچا کو چھوڑ دے.......... یا.......... پھر اسماعیل کو۔ نیکی اور بدی کے فرشتے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ ہاں دائیں بائیں کندھوں پر بٹھا کر تو دونوں کو چلا سکتا ہے' وہ بھی اس طرح کہ دائیں ہاتھ کی خبر بائیں والے ہاتھ کو نہ ہو۔" وہ ہنسا' یوں جیسے کوئی لطیفہ سنا رہا ہو۔

"اگر دونوں کو نہ چھوڑ پایا تو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو ترازو کے بیچ میں لٹکی ڈنڈی کی طرح ادھرادھر ہوتا رہے گا۔ نہ یہ کر پائے گا نہ وہ۔" امام دین نے اس انداز میں کہا جیسے اسے اس سارے معاملے سے قطعی دلچسپی نہ ہو۔ جیسے اسماعیل سے ملانے وہ نہ لے گیا ہو بلکہ وہ کہیں گلو کو خود ہی مل گیا ہو۔ گلو کو غصہ آگیا۔

"اٹھ کے بیٹھ۔" اس نے اسے کاندھے کے نیچے ہاتھ ڈال کے اٹھا کر بٹھا دیا۔

"ہوش میں رہ کر میری بات سن۔ لاٹری تیری نکلی ہے میری نہیں' میں اس معاملے میں بہت پریشان ہوں۔ اگر وہ ہوتی.......... نازاں تو.........."

"ابے ہاں' وہ نازاں کہاں گئی؟" امام دین کے انداز نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"جہنم میں۔ تو سیدھی طرح میری بات سنے گا یا نہیں؟" گلو نے منہ بنایا اور اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ امام دین نے دونوں ہاتھ سامنے کرکے سر جھکا دیا اور شاید تبھی اس کی نگاہ پاس رکھے اخبار کی سرخی پر پڑی۔ سرخی کے برابر ہی بنے ایک چوکھٹے میں ایک تصویر دیکھ کر وہ یوں اچھلا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔ "گلو..........!!" وہ چیخا اور ساتھ ہی گلو کی نگاہ بھی اخبار کی طرف اٹھ گئی۔

وہ یہ چہرہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ تو امام دین سے بھی زیادہ زور سے اچھلا تھا۔ "یہ.......... یہ تو..........؟"

"ہاں.......... ٹھہر!.........." امام دین نے اخبار جھپٹ لیا۔ وہ خبر پڑھ رہا تھا۔

"زور سے پڑھ.......... کیا ہے؟" امام دین نے اخبار جھپٹ لیا۔ وہ خبر پڑھ رہا تھا۔

"اعظم بستی کے کنارے زخمی حالت میں پڑی عورت کے ورثا کی تلاش۔" امام دین نے سرخی پڑھی اور پھر تیزی سے ساری خبر پڑھ گیا۔ اخبار کی خبر کے مطابق وہ لڑکی زخمی حالت میں ملی تھی اور اب تک اسپتال میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کی کمر اور سر پر شدید چوٹیں تھیں۔ پولیس کا خیال تھا کہ راہ چلتے اسے کسی گاڑی نے ٹکر ماری ہے اور ڈرائیور اسے وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ پولیس کو اس کی بے ہوشی کی وجہ سے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوسکا اور اسے اس کے ورثا کی تلاش ہے۔

"کس اسپتال میں ہے نازاں؟" گلو بھی جیسے رونے ہی والا تھا۔

"ایک منٹ.........." امام دین نے انگلی اٹھائی پھر وہی انگلی اخبار کی سطروں پر پھیرتا ہوا ایک جگہ رک گیا۔ "عباسی شہید میں۔" اس نے سر اٹھا کر۔

"چل ماے.......... ورنہ.......... اگر چاچا کو خبر مل گئی تو' تو جانتا ہے سارے شہر میں ڈولتا پھرے گا' دھاڑیں مارتا ہوا۔" گلو ایک دم کھڑا ہوگیا۔

"ہاں چل.......... مگر.......... سن!" وہ ایک دم رک گیا۔ "وہاں پولیس ہوگی۔ وہ تجھ سے اس کا رشتہ پوچھے گی۔"

گلو بھی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کے چہرے پر الجھن پھیلی مگر دوسرے ہی لمحے اس نے کہا۔ "کہہ دوں گا.......... میری ہونے والی ہے۔"

"مگر وہ بے ہوش ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق کیسے کریں گے؟ اگر تجھے ہی دھر لیا تو؟"

"ماے.......... ایسا کرتے ہیں' چاچا کو لیتے ہیں.......... اور رحمان چاچا اور چچی کو بھی۔ ان سب کو دیکھ کر تو پولیس کچھ نہیں کہے گی ناں! اور اگر اسے پھر بھی پوچھ کچھ کرنا ہوگی تو ٹھیک ہے.......... کرلے محلے بھر میں جاکر پوچھ لے۔ جب میں نے کچھ نہیں کیا اور اس کا ہمارے سوا کوئی وارث بھی نہیں تو.........."

امام دین اسے لئے کمرے سے باہر چلا آیا۔ ملازم لڑکے منہ اٹھائے اسے دیکھتے ہی رہ گئے اور وہ سیدھا گلو کی ٹیکسی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گلو کے قدم بھی اس طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اس ٹیکسی کے متعلق وہ چاچا اور رحمان چاچا سے جھوٹ بول چکا ہے۔ اسے تو صرف اخبار' اس کی سرخی' زخمی اور بے ہوش' نازاں کی تصویر ہی یاد رہ گئی تھی۔ اخبار اب بھی اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

☆==========☆==========☆

مشکل سے آدھا گھنٹا لگا ہوگا انہیں گھر پہنچنے میں۔ رستہ تو طویل نہیں تھا مگر صبح کا وقت تھا۔ ٹریفک بہت تھی۔ گلو راستے میں آنے والی ہر گاڑی' بس اور موٹر سائیکل چلانے والے کو گالیاں دے رہا تھا۔ کئی جگہ تو جھگڑا ہوتے ہوتے بچا۔ امام دین اس کی بے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قراری کو دیکھ کر بہت کچھ جان رہا تھا۔ اسے ایک ذرا اطمینان بھی محسوس ہوا تھا کہ نازاں کے جانے پر گلو نے جس بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا' وہ اس کے اندر کی نہ تھی۔ وہ گھر کے دروازے پر پہنچا تو رحمان چاچا کی ٹیکسی گلی کے کونے تک پہنچ چکی تھی۔ ٹیکسی کی رفتار کم ہوتے ہی گلو نے حلق پھاڑ کر رحمان چاچا کو آواز دی تھی اور ساتھ ہی رینگتی ہوئی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اسی طرف بھاگ پڑا تھا۔ رحمان چاچا گلی سے گاڑی بہت آہستہ آہستہ رفتار میں نکالتے تھے شاید اسی لئے انہوں نے اس کی آواز سن لی تھی یا شاید بیک مرر میں اسے بھاگ کر ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ٹیکسی روک کر منہ کھڑکی سے باہر نکالا۔ اسے حیرت سے دیکھا پھر ٹیکسی ریورس کرلی۔

"کیا بات ہے گلو؟ خیریت ہے؟" اس کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے پوچھا۔ رحمان چاچا پڑھے لکھے تھے' کم از کم اتنا ضرور پڑھا ہوا تھا کہ چھٹی کے روز یا جب وہ گھر سے نکلا کرتے تو انہیں چاچا اور دوسرے کچھ لوگوں کو اخبار پڑھ کر سناتے دیکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا اخبار کھول کر ان کے سامنے کر دیا۔ اس کی تو سانس ایسے پھول رہی تھی جیسے بڑی دور سے بھاگتا ہوا آیا ہو۔ رحمان چاچا بھی نازاں کی تصویر کو نہ صرف پہچان گئے تھے بلکہ لمحوں کے لئے تو وہ بھی سناٹے میں رہ گئے تھے پھر انہوں نے جلدی جلدی ساری خبر پڑھنا شروع کر دی۔

اتنی دیر میں امام دین ٹیکسی کنارے کھڑی کرکے ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ "اب! وہ بڈھا تو باؤلا ہو جائے گا یہ دیکھ کے۔" انہوں نے سر اٹھا کر گلو کو دیکھا پھر ٹیکسی کو کنارے کھڑی کرکے نیچے اتر آئے۔

"چاچا! تو............ تم تو جانتے ہو ناں! کچھ کرو۔" گلو نے کہا اور پھر وہ' امام دین اور رحمان چاچا کافی دیر یہ فیصلہ کرتے رہے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔

گلو نے اپنے خیال کا اظہار کیا اور چاچی کو بھی ساتھ لینے کا مشورہ دیا تو رحمان چاچا تیار ہو گیا مگر مسئلہ صرف چاچا کو قابو کرنے کا تھا۔ گلو کو بھی اندازہ تھا کہ یہ خبر کچھ دیر کو تو اسے ضرور تلپٹ کر دے گی پھر رحمان چاچا نے سب سے پہلے یہ خبر چاچی کو پڑھ کر سنائی۔ اس نے تو فوراً ہی رونا دھونا مچا دیا۔ خالہ حمیدہ اس کی بھی سہیلی تھی۔ نازاں سے اسے

بھی پیار تھا۔ بڑی مشکل سے چاچا نے سمجھایا کہ اسے یہ خبر واویلا مچانے کے لئے نہیں بتائی گئی۔ اس لئے بتائی گئی ہے کہ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ کہ گلو کے چاچا کو دھچکا نہ پہنچے اور مسئلے کو الجھانے کی بجائے اسے سلجھانے پر تیار ہو سکے۔

وقت بیتا جا رہا تھا۔ گلو کی بے چینی عجیب سے اضطراب میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی جو اس کے لئے تکلیف دہ تھا۔ وہ انتشار محسوس کر رہا تھا اور غیر محسوس انداز میں اس کے اندر اشتعال بھی پیدا ہو رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رحمان چاچا' چچی اور امام دین سے الجھ پڑا۔ "تم لوگ چلتے ہو تو چلو' ورنہ میں اکیلا جا رہا ہوں۔"

رحمان چاچا نے ایک نگاہ اسے دیکھا پھر کھڑا ہو گیا۔ "چلو! دیکھا جائے گا۔"

وہ لوگ سب ایک ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئے تو چاچا ابھی تک پلنگ پر لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ آہٹ پر چونک کر اس نے سر گھمایا پھر جیسے اس کی چھٹی حس نے اسے چوکنا کر دیا۔ وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ گلو کو ساتھ دیکھ کر اسے کچھ اطمینان ہو گیا تھا پھر بھی وہ بول اٹھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں............ سب ٹھیک ہے۔" رحمان چاچا نے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دی پھر وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ گلو نے دوسرا پلنگ قریب کر لیا۔ ان سب کا انداز عجیب اور نگاہ کا مرکز چاچا تھا اور چاچا بے وقوف نہیں تھا۔ پڑھا لکھا ہو یا نہیں' اس نے جو زندگی گزاری تھی اس کے پل پل کو پڑھا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ اس نے سب کو باری باری دیکھا۔

"بات کیا ہے رحمان! جلدی اور صاف صاف بتا؟ گلو کے ایکسیڈنٹ سے کچھ ہوا ہے کیا؟"

اور پھر جب رحمان چاچا نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ کر بتایا کہ نازاں زخمی ہے' اسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔ تو اس کے چہرے کی سیاہی ایک دم نیلی سی ہو گئی۔ آنکھیں پھٹ کر نم ہو گئیں مگر اس نے اپنے آپ کو پوری طرح قابو کئے رکھا تھا۔ اسے یوں سنبھلا دیکھ کر سب سے زیادہ اطمینان گلو اور امام دین کو ہوا تھا اس لئے کہ سب سے زیادہ انہی دونوں کو اس کے واویلے کا دھڑکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ ہی دیر بعد رحمان چاچا اور چاچی اپنی ٹیکسی میں اور گلو اور امام دین اپنی ٹیکسی میں اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے.......... چاچا بہت پریشان تھا۔ اس کی بے چینی اس کی آنکھوں سے مترشح تھی۔ وہ اسپتال پہنچے تو نازاں کے بارے میں معلومات کرکے اس کے کمرے تک پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے ہوش تو آچکا ہے مگر اس کی حالت کے پیش نظر اسے نیند کا انجکشن دیا گیا ہے۔ یہ بات چاچا نے بھی سنی تھی مگر اس کے قریب پہنچتے ہی اس نے رونا شروع کر دیا اور گلو کے روکتے روکتے ہی اس نے زخمی نازاں کا' جس کا سر پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا' ہاتھ تھام کر رونا شروع کر دیا۔

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ گلو اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے نازاں پر ترس اور خود پر شدید غصہ آرہا تھا۔ یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ وہ مرد ہوکر بھی اکیلے پن کی اذیت کو اتنی شدت سے محسوس کرتا ہے تو یہ بے چاری تو لڑکی تھی۔ اسے کتنا دکھ ہوا ہوگا اور جب نازاں نے آنکھیں کھولیں اور اس پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو کا قطرہ جھلملایا تو سب کچھ بھول کر وہ اس کی طرف لپکا۔ یوں جیسے وہ اسی کو دیکھنا چاہتی ہو اور اسی کو پکارنا شروع کردے گی مگر جب اس کے قریب پہنچتے پہنچتے اس نے سر موڑ کر چاچا کو پاس بیٹھے دیکھا تو ایک دم بلک اٹھی۔

"کہاں چلی گئی تھی تو؟ ارے! کوئی یوں اپنا گھر چھوڑ کر بھی کہیں جاتا ہے؟" اس نے نازاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ لے کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ "نہ رو.......... پگلی.......... نہ رو۔" اس دوران میں گلو تو وہیں کھڑا رہا مگر امام دین' رحمان چاچا کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ اس نے پولیس ریکارڈ کے لئے کچھ بتایا' ڈاکٹر سے کیا کہا' گلو کو پتا نہیں چلا۔ اتنا علم ہوگیا کہ فی الحال اسے گھر جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ کچھ دن علاج ضروری ہے۔ اس کی کمر کا زخم اتنا گہرا نہیں ہے جتنا سر کا۔

بعد میں نازاں نے بتایا کہ وہ رات کو اپنی ایک جاننے والی کے گھر جانے کو بس میں سوار ہوگئی تھی۔ دن تو اس نے اپنے پرانے محلے میں بیٹھ کر گزار دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چاچا ضرور اسے تلاش کرے گا اسی لئے رات کو نکلی تھی۔ جاننے والی کا گھر ملیر میں تھا۔ وہ ملیر کے اسٹاپ پر اتری تو تاریکی گہری ہو چکی تھی۔ اسے باوجود تلاش کے' اس کا گھر نہیں

ملا۔ وہ گھبراتی جارہی تھی۔ آخر رات زیادہ ہو جانے کے خوف سے اس نے واپس آنے کا فیصلہ کیا اور دوبارہ بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ ایک گلی کو کراس کرتے ہوئے اس نے گھبراہٹ میں دائیں طرف نہیں دیکھا اور تیزی سے کراس کرنا چاہا۔ گلی سے نکلنے والی گاڑی اسے ٹکر مارتی ہوئی گزر گئی۔ ڈرائیور رکا نہیں۔ وہ گری تو پتھر اس کی کمر میں لگا اور سر پتھریلی سڑک سے ٹکرایا۔

پتا نہیں کسی نے اسے دیکھا نہیں یا کسی کھپلے میں پڑ جانے کے خوف سے اٹھایا نہیں' وہ رات بھر وہاں بے ہوش پڑی رہی اور صبح کسی دودھ والے نے پولیس کو اطلاع دی تب اسے اسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ خون زیادہ بہ جانے کی وجہ سے اس کی زندگی کو خطرہ تھا مگر اللہ نے کرم کیا۔ اسے ایک عورت نے خون دے دیا جو مریض سے ملنے آئی تھی۔ اسی کے گروپ کا خون تھا ورنہ مشکل ہو جاتی۔ گویا ان تین چار دنوں میں وہ خطرناک دور گزار چکی تھی۔ ہنگامہ اس وقت ہوا جب نازاں نے گھر جانے کی ضد شروع کردی۔ گلو نے اسے سمجھانا چاہا تو وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"میں تیرے گھر نہیں.......... چاچا کے گھر جارہی ہوں۔ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔"

"ارے..........! پاگل ہوگئی ہے کیا؟ مجھے پریشانی کیوں ہوتی؟" وہ جھینپ کر ہنس دیا۔

اسی وقت ڈاکٹر آگیا۔ اس نے نازاں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ ایسی کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتی۔ رہی پٹی بندھوانے کی بات تو وہ قریبی ڈاکٹر سے بندھوالیا کرے گی۔

"ٹھیک ہے.......... ہماری ذمے داری نہیں ہے۔ اگر آپ کے شوہر دستخط کر کے دے دیں کہ وہ اپنی ذمے داری پر آپ کو لے جارہے ہیں تو آپ جاسکتی ہیں۔"

"ہیں.......... شوہر..........؟" نازاں کا رنگ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"ہاں.......... آپ جانتی ہیں کہ آپ کی حالت.........."

"ایک منٹ۔" نازاں نے اس کی بات کاٹ دی پھر ان سب کی طرف دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چاچا! آپ سب کو لے باہر جائیے۔"

"کیوں........... ایسا تو کوئی..........."

گلو نے کہنا چاہا۔

"گلو!" ایک دم امام دین بول اٹھا۔ "ان سب کو لے کر باہر جاؤ۔" رحمان چاچا نے بھی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور امام دین کی تائید میں سر بھی ہلایا تھا۔

گلو نے ایک نگاہ رحمان چاچا کی طرف پھر امام دین کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر چپ ہوگیا تھا اور ان لوگوں کے کمرے سے باہر جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ نازاں کے چہرے کا پھیکا پن اور گہرا ہوگیا تھا۔ چاچا کو گلو نے اٹھا دیا۔ چاچی بیٹھی رہی مگر رحمان چاچا نے اسے بھی باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ لوگ باہر چلے گئے مگر امام دین وہیں کھڑا تھا۔

"آپ بھی..........." نازاں نے کچھ کہنا چاہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ یہ سسپنس کیوں پیدا کر رہی ہیں؟" ڈاکٹر نے الجھ کر کہا پھر امام دین سے بولا۔ "دیکھیے! آپ ان کے شوہر کو بلائیں۔ مجھے ان سے بات کرنا ہے۔"

"ڈاکٹر! وہ........... وہ بہت، میرا مطلب ہے کہ وہ کچھ دوسرے قسم کا آدمی ہے۔ بہت جذباتی ہے۔ اگر اسے پتا چلا کہ بات خطرے کی ہے تو وہ........... آپ نازاں سے کہہ دیں........... ہمیں بتا دیں مسئلہ کیا ہے؟"

"کیا........... کیا ہوا؟" نازاں پریشان رہی۔

"بی بی! بات یہ ہے کہ فی الحال آپ کا گھر جانا ٹھیک نہیں ہے۔ شکر کیجیے کہ آپ خوشخبری سے محروم نہیں ہوئیں ورنہ اس سے پہلے وہیں ایکسیڈنٹ میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہاں وہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ بس آپ کم از کم تین چار روز اور رہ جائیں۔ یہ اطمینان ہوتے ہی کہ اب اسقاط کا خطرہ نہیں ہے ہم آپ کو جانے کی اجازت دے دیں گے ورنہ بچے کے ضائع ہو جانے کی ذمے داری ہم پر عائد نہیں ہوگی۔"

نازاں اب سٹپٹا کر امام دین کو دیکھ رہی تھی پھر اس نے ایک دم سر جھکا لیا۔ ڈاکٹر امام دین سے کچھ کہتا رہا مگر اس کے کانوں میں تو سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ جو جرم اس نے نہیں کیا' اس کی سزا اسے کیوں مل رہی ہے؟ جانے کب اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوگئے تھے؟ کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر کمرے سے باہر چلا گیا۔ امام دین جانتا تھا کہ اب گلو اور چاچا وغیرہ فوراً ہی آجائیں گے۔ وہ نازاں سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا' بہت کچھ کہنا چاہتا تھا اور وقت کم تھا۔ وہ تیزی سے نازاں کی طرف بڑھا۔

"بھیا...........! خدا کی قسم........... میرا کوئی قصور نہیں ہے۔" نازاں نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے رونا اور بولنا شروع کر دیا۔ "اس نے زبردستی..........."

"گلو نے؟" امام دین نے اس کی بات کاٹ دی۔ دکھ اور شرمندگی سے ماے کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گلو ایسی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔

"نن........... نہیں........... وہ تو یہاں..........." ابھی وہ جملہ پورا نہ کرپائی تھی کہ سب لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔

"بعد میں..........." امام دین نے ہونٹ بھینچے بھینچے آہستہ سے کہا اور دو قدم پیچھے ہوگیا۔ اس بات نے کہ وہ گلو نہیں تھا اسے ایک دم ہی نارمل کر دیا مگر اب جتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا' یہی سوچتا رہا کہ وہ کون ہے........... کون تھا؟ جس نے نازاں کو اس بدنامی سے دوچار کر دیا۔ اس کے علم کے مطابق تو نازاں حمیدہ خالہ کے مرنے کے بعد ہی' جب سے وہ اسے لے کر آیا تھا تب سے گلو ہی کے گھر پر تھی۔ یہی دو چار دن گزرے تھے کہ وہ گھر سے باہر رہی ہو مگر ڈاکٹر جس طرح کہہ رہا تھا اس سے تو لگتا تھا جیسے بات ابھی کی نہ ہو۔

اس کا دماغ گھومتا رہا۔ نازاں وحشت بھری نگاہوں سے سب کو دیکھتی رہی۔ کبھی کبھی اس کی نگاہ امام دین پر آکر ٹھہرتی تو وہ اشارے سے اسے خاموش رہنے کو بھی کہتا اور تسلی بھی دیتا رہا مگر اس کی وحشت کم نہ ہو سکی۔ اس نے چاچا کو اتنا کہہ دیا کہ ڈاکٹر ابھی گھر جانے کی اجازت نہیں دے رہا۔ وہ لوگ بہت دیر تک وہیں رہے مگر بالآخر نرس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آکر کہا کہ کوئی ایک اس کے پاس رہ سکتا ہے۔ باقی سب کو جانا ہوگا۔

چاچی نے بڑی فراخدلی سے اپنی خدمات پیش کردیں مگر نازاں ایک دم بدک گئی۔ اس نے کہہ دیا کہ یہاں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ نرس اس وقت وہیں موجود تھی۔ نازاں کی بات سن کر اس نے کہا۔

"ہاں.......... ویسے ضرورت کسی کی نہیں ہے' ہم ہوتے تو ہیں رات بھر.......... آپ لوگ فکر نہ کریں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ خواہ مخواہ چاچی پریشان ہوگی۔" امام دین ایک دم بول اٹھا۔

"یہ ٹھیک ہے بس کچھ دنوں کی تو بات ہے۔ پھر یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

اسی نے چلنے کی جلدی مچائی تھی۔ رحمان چاچا کو بھی احساس دلایا تھا کہ اسے ٹیکسی لے کر جانا ہے۔ چاچا سے بھی کہا تھا کہ اسے آرام کرنا چاہئے۔ گلو سے الگ کہا کہ اسے اسماعیل کے سلسلے میں کوئی اہم بات کرنا تھی اور یہ بھی بتایا کہ وہ خود بھی زیبی کے معاملے پر مشورہ چاہتا ہے۔ وہ یہ ہنگامہ نہ کرتا تو ان میں سے کسی کا بھی اٹھنے کا ارادہ نہ تھا۔

نرس نے بھی بار بار نازاں کو اکیلا چھوڑنے کا شور نہ مچایا ہوتا تو چاچا' امام دین کی بکواس پر ذرا بھی توجہ نہ دیتا۔ آخر اسے اٹھنا ہی پڑا۔ وہ کسی لٹے ہوئے مسافر کی طرح ہاتھوں کو بار بار اٹھا اٹھا کر جھٹکتا رہا جیسے اللہ سے شکوہ کر رہا ہو' تقدیر کی ستم ظریفی کا رونا رو رہا ہو۔

امام دین سوچ چکا تھا۔ ان سب کو ٹھکانے بٹھا کر اسے پھر واپس آنا ہوگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ نازاں نے یہ سب کب اور کیسے کرلیا؟ اسے یہ بھی پتا تھا کہ اب تو چاچا اسے کہیں بھی نہ جانے دے گا' اپنے ساتھ لے جاکر ہی دم لے گا۔ گلو کا رویہ نازاں کے ساتھ تبدیل ہو رہا تھا۔ اس سے خود امام دین بھی واقف تھا۔ اگر اس حرکت کا ذمے دار گلو ہوتا تو نازاں کا مستقبل تاریکی میں نہ رہتا مگر ایسی صورت میں جب نازاں خود اس بات سے انکار کر چکی تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب نازاں اس گھر میں کیسے رہ پائے گی اور کب تک..........؟ جب چاچا کو یا محلے والوں کو اس بات کا پتا چلے گا تو کیا ہوگا؟

لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ شاید اس بات کا اندازہ خود نازاں کو بھی نہیں ہوگا۔ اسی بات نے امام دین کو پریشان کر دیا تھا بلکہ اس نے تو اندازہ لگایا تھا کہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا اس سے نازاں قطعی ناواقف تھی۔ ڈاکٹر سے بات کرنے جب امام دین' رحمان چاچا کے ساتھ گیا تھا تبھی اس نے بتایا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ بڑا غنیمت تو یہ ہوا کہ رحمان چاچا اس وقت پولیس ریکارڈ کے لئے گلو کے گھر کا پتا درج کروا رہا تھا۔ اگر اس نے بھی یہ سن لیا ہوتا تو جانے کیا ہوتا؟

امام دین نہیں جانتا تھا کہ رحمان چاچا کون ہے؟ کس ٹائپ کا بندہ اور اس کے گلو یا اس کے چاچا سے کیسے مراسم ہیں؟ وہ تو صرف ایک بات جانتا تھا کہ حالات نے اسے نازاں کا امانت دار بنا دیا ہے جو بات اس کے علم میں آئی تھی' وہ اس وقت تک نازاں کی امانت تھی جب تک وہ اس موضوع پر نازاں سے بات نہ کر لیتا اور وہ اسے اجازت نہ دے دیتی کہ وہ کسی کو بتائے۔

اس نے نازاں کی بات سے اتنا اندازہ ضرور لگالیا تھا کہ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو نازاں بے قصور ہے' اب قصور وار کون ہے؟ یہی جاننا اس کے لئے ضروری ہوگیا تھا۔ گلو کے گھر کی وجہ سے وہ اسے اپنا فرض ضرور سمجھتا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے۔ امام دین نے جو زندگی سڑکوں پر گزاری تھی' اس نے اسے اتنا ضرور سمجھا دیا تھا کہ ہر برے کام میں پہل مرد ہی کرتا ہے۔ اب تک تو کوئی عورت ایسی اس کی نگاہ سے گزری نہیں تھی جو خوشی سے برائی کرنے پر آمادہ ہو حتیٰ کہ ایک بار تو زیبی کے بھائی نے اس کی ملاقات ایک طوائف سے بھی کرا دی تھی مگر جب امام دین نے اس سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے تو اس کے چہرے پر نفرت کا ایک ایسا جال سا پھیل گیا تھا جس نے اس کے اچھے خاصے خوبصورت نقش مسخ کر دیئے تھے اور تب اس نے کہا تھا۔

"ایک سے شادی کرکے زندگی گزارنے کا خواب اس کی موت نے توڑا تھا۔ دوسرے سے شادی ہوئی تو اس کی اصلیت کچھ ہی دن میں کھل گئی۔ وہ کمانا نہیں کموانا چاہتا تھا۔ حرامی تھا۔ چوری چکاری کرکے جو کچھ لاتا تھا' اس میں ٹھرا پی جاتا تھا۔ مار پیٹ کے گھر سے نکال دیا۔ نوکری کی کوشش کی تو اتنے حرامی ملے کہ آنکھ کی حیا ہی جاتی رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر بھی ایک کتے سے یہ سوچ کر شادی کی تھی کہ سدھر جائے گا۔ کہتا تھا عزت سے گزارہ کرنا چاہتا ہوں مگر شادی کے بعد پتا چلا کہ جسے وہ عزت سے گزارا کہتا تھا' وہ عورت بیچ کر ٹھسے سے گزارہ کرنا تھا۔ شریفوں کی بستی میں رہنا ہی اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ انہیں دیکھ کر ماضی یاد آئے گا تو دل میں ہوک اٹھے گی اور شریف لوگ بھی بے چارے خطرے میں پڑ جائیں گے۔"

امام دین دیکھتا رہ گیا تھا۔ یہ بات اس کے دل میں بیٹھ گئی کہ عورت کو خراب کرنے میں مرد کا ہاتھ ہے۔ چاہے کسی بھی انداز میں ہو اور جب نازاں نے سفید چہرے' وحشت سے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اور لرزتے کانپتے لہجے میں کہا تھا۔ "جو جرم میں نے نہیں کیا اس کی سزا مجھے کیوں ملی؟" تو امام دین کے سامنے وہی طوائف آگئی تھی جسے دیکھتے ہی احساس ہوتا تھا کہ اس نے اپنے آپ ملمع چڑھا رکھا ہے۔

☆==========☆============☆

گلو نے چاچا کو گھر چھوڑا۔ رحمان چاچا اسے تسلیاں دے کر ٹیکسی لے کر چلا گیا۔ امام دین اسپتال ہی کے باہر سے رکشا لے کر گیراج چلا گیا تھا اور کہا تھا کہ ابھی تو اسے ضروری کام ہے۔ گلو شام کو ضرور گیراج آجائے۔ چاچی نے چائے ناشتا دیا اور چاچا کو تسلی بھی کہ اب اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ تک کہا کہ اسے اب صرف خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ نازاں خدانخواستہ غلط ہاتھوں میں نہ پڑی' یہ حادثہ کسی بھی دوسرے خوفناک حادثے سے غنیمت ہی تھا۔ اس نے گلو کو بھی سمجھایا کہ اسے نازاں ایسی بن ماں باپ کی بچی کو سنبھال کر رکھنا چاہئے بلکہ اگر اس میں ذرا سی بھی شرافت ہے تو اس سے شادی کر لینا چاہئے۔

چاچا کی تو باچھیں کھل اٹھیں۔ اس نے بھی بات بڑھائی۔ "گلو بیٹا! انسان اپنے لئے تو سب کچھ کرتا ہے' اگر دوسرے کے لئے بھی کچھ کر لے تو اس کا من شانت رہتا ہے۔ ایک ایسا سکون ملتا ہے جس کا کوئی مول نہیں۔"

"لیکن چاچا تو جانتا ہے کہ نازاں میرے ساتھ.........."

"شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ تو بھی تو اسے کم تنگ نہیں کرتا۔" چاچا نے

اس کی بات کاٹ دی۔ "سوچ بیٹا! بے سہارا لڑکی کو سہارا دینا کتنا نیک کام ہے۔"

"گلو! اگر میرا کوئی بیٹا کنوارا ہوتا تو اللہ کی قسم میں تو نازاں کو اپنی بہو بنا لیتی۔ ارے! جتنے گن اس لڑکی میں ہیں اگر میری بہو میں آدھے بھی ہوتے تو ہم دونوں بڈھے یوں بے اولادوں کی طرح اکیلے نہ بیٹھے رہتے۔ کفران نعمت کر رہا ہے تو۔" چاچی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! یاد رکھ' ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ تجھے دوسری بار ملی ہے۔ یہاں تو اتنے چھوٹے سے شہر میں آدمی کا کوئی اپنا بچھڑ جائے تو وہ اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے بڈھا ہو جاتا ہے اور.......... وہ نہیں ملتا۔"

ماضی بوڑھے چاچا کی آنکھوں میں آنسو بن کر پھر جھلملا اٹھا اور گلو نے سوچا' چاچا کتنا سچ بولتا ہے۔ وہ اپنی جھاراں کو اب تک نہیں ڈھونڈ پایا۔ خود گلو ہی اپنی ماں کو کب تلاش کر سکا تھا اور وہ.......... وہ معصوم سا چہرہ جو اس چبوترے پر پہلی بار نظر آکر ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن کے پردے پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی دیے کی طرح اس کے ذہن کے گہرے اندھیروں میں لو دیا کرتا تھا۔ وہی کب اسے مل سکا تھا۔ پھر.......... پھر یہ نازاں.......... جو چلی گئی تھی' جسے اس نے اس طرح تلاش بھی نہ کرنا چاہا تھا جیسے ان دونوں کو تلاش کر رہا تھا پھر اسی نے تو امام دین سے کہا تھا کہ وہ اب کبھی نہیں ملے گی اس لئے کہ وہ خود انہیں چھوڑ کر گئی ہے' کھوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسے مل گئی؟ وہ معصوم چہرے والی اسے آج تک کیوں نہیں ملی؟ اور اگر وہ یونہی.......... کبھی نہ ملی تو.......... اور پھر کیا خبر وہ ملے تو کسی اور کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہو.......... تب.......... تب وہ کیا کرے گا؟ وہ کس برتے پر ساری عمر اس کا انتظار کرتا رہے گا؟ اس کا دل اندر سے لرز کر رہ گیا تھا۔

اسے نازاں سے محبت نہ سہی مگر ضروری تو نہیں کہ شادی کر کے بھی اس سے محبت ضرور کی جائے۔ گھر کو گھر بنانے کے لئے بھی تو ایک عورت کی ضرورت ہوتی ہے' چاچا کی کِل کِل بھی ختم ہو جائے گی' گھر کی ذمے داریاں بھی بٹ جائیں گی اور وہ پوری توجہ اپنے کام پر دے سکے گا۔ وہ کام جس کی تشریح چاچا کو روز بتانا پڑتی تھی' نازاں آئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گی تو اسے بہت سے دھندوں اور مصیبتوں سے نجات مل جائے گی اور ثواب کا ثواب کمالے گا۔

اس نے یہ فیصلہ جتنی جلدی کیا تھا' اتنی جلدی تو اس نے آج تک منہ دھونے یا نہانے کا فیصلہ بھی نہ کیا ہوگا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کا ذہن پہلے ہی نازاں کو قبول کرچکا تھا پھر اسے' اس سے اپنے سرد رویے کا احساس بھی شدت سے ہوا تھا اور گھر سے نکلنے سے لے کر اخبار کی سرخی بننے تک وہ جس اذیت سے گزری ہوگی' اس کے دکھ اور افسوس نے اسے یوں بھی نرم بنا دیا تھا۔

"گلو! بیٹا کبھی تو اس بڈھے کی بات مان لیا کر۔ اس نے ساری زندگی تجھ پر لٹا دی۔ ایک بات مان کر احسان ہی اتار دے۔ اس بیچارے نے تو تجھے گود لے کر بھی زندگی کے آدھے سے زیادہ برس اکیلے گزار دیئے۔" چاچی کا لہجہ طنزیہ نہ تھا۔ اس میں دکھ تھا اور گلو کو جیسے اسی جملے کا انتظار تھا۔ وہ فوراً" بولا۔

"تو میں نے کب انکار کیا ہے؟"

"کک.......... کیا.......... کیا کہہ رہا ہے گلو؟" چاچا کو بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ "تو نے سنا بھی کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں یا یونہی واہی تباہی سوچا اور بول دیا۔"

"اب تو مجھے بالکل پاگل سمجھنے لگا ہے کیا؟" گلو نے مسکراہٹ کو ہونٹوں کے کناروں میں دبا کر کہا۔

"یعنی تو.......... یعنی کہ تو نازاں سے نکاح کرنے کے لئے تیار ہے؟" اس نے بالکل اس طرح چبا چبا کر ایک ایک لفظ الگ الگ کرکے کہا جیسے گلو نے واقعی بنا سوچے سمجھے اور سنے ہی کچھ کہا ہو۔

"لیکن ایک بات بتا!" اس نے ہونٹوں کے کناروں میں دبی مسکراہٹ کو آزاد کر دیا۔ "پھر تو چوبیس گھنٹے میری جان تو نہیں کھائے گا ناں!"

"ارے.......... ارے نہیں یار گلو!" چاچا خوشی سے کھڑا ہو کر اس سے لپٹ گیا۔

"کبھی نہیں کھاؤں گا چندا!"

"اور لڑے گا بھی نہیں۔" گلو نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کو خود

سے کچھ دور کرکے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

"نہیں یار! پھر کیوں لڑوں گا۔ جب تو میری بات مانے گا تو.......... تو پھر کیسا جھگڑا؟" وہ پھر اس کے ہاتھ بغل میں ڈال کر اس کے سینے سے لپٹ گیا۔

"چل بھئی! بابا مبارک ہو۔ اب آج کے آج ہی محلے میں لڈو بٹنے چاہئیں۔" چاچی نے بھی مسکرا کر گلو کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

کیوں.......... لڈو کس بات کے' شادی ہوگی تو کھانا کھلاؤں گا سب کو۔" گلو نے ہنس کر چاچا کو خود سے الگ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ارے! وہ تو سب کھلائیں ہی۔ یہ لڈو میں تیری شادی کی خوشی میں نہیں' پہلی بار اپنے چاچا کی بات ماننے کی خوشی میں بٹواؤں گی اور جب نازاں گھر آجائے گی تو شادی طے ہونے کے بھی بٹواؤں گی' سمجھا تو؟" وہ پیار سے بولی۔

"اور بھیا! یہ سن لو کہ اب نازاں یہاں نہیں رہے گی۔" اس نے چاچا سے کہا۔

"کیوں.......... وہ تو یہیں رہے گی۔" گلو نے پٹ سے کہا۔ "الگ نہیں رکھوں گا میں۔ چاچا ہی کے لئے تو کر رہا ہوں شادی کہ اس کا اکیلا پن ختم ہو۔" چاچا بھی اس کی بات سن کر حیرت سے رحمان چاچا کی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔

چاچی نے مسکراتی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا پھر پان سے بھرا منہ کھول کر زور سے قہقہہ لگایا۔ "دونوں باؤلے ہو' شادی کی ہو تو پتا بھی ہو۔ ارے جب تیری بات طے ہوگئی تو اس کا اس گھر میں رہنا غلط ہے۔ وہ میرے گھر رہے گی یوں سمجھ کہ میں اس کی ماں ہوں اور رحمان اس کا باپ.......... اور تم دونوں.......... اس کے سسرالی۔ بھلا شادی سے پہلے وہ کیوں آکر رہے گی؟ تماشا بنوانا ہے کیا؟"

بات چاچا اور گلو دونوں کی سمجھ میں آگئی۔ دونوں ہی جھینپ گئے۔ چاچا تو زور سے ہنس بھی پڑا حالانکہ گلو یہ ہنسی سن کر یوں چونکا تھا جیسے اس نے کسی کے رونے کی آواز سنی ہو مگر چاچا.......... وہ تو ہنس رہا تھا' ہنستا چلا گیا۔ ہنستا ہی رہا۔ جب آواز تھمی تو آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"چاچا..........!" گلو ایک دم آگے بڑھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہنستے ہنستے آ گئے۔" چاچا نے قمیض کی آستین سے آنکھیں رگڑ لیں پھر شاید خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ جب بولا تو اس کی آواز میں ہلکی سی بھراہٹ تھی۔

"وہ.......... مجھے تو یاد نہیں رہا کہ اس کا تو کوئی میکہ ہی نہیں ہے۔ گلو بیٹا.......... بیٹا! میں تجھے بتا نہیں سکتا کہ آج میں کتنا خوش ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج میں نے اپنی غلطیوں کا ازالہ کر دیا ہو۔ جیسے.......... گناہوں کا کفارہ تھا مجھ پر، جسے ادا کرنا میرے بس میں نہیں رہا تھا۔ مگر آج.......... آج میں نے وہ کفارہ ادا کر دیا ہو۔ جیتا رہ بیٹا.......... جیتا رہ.........."

تب گلو کو پہلی بار احساس ہوا کہ کسی کو خوشی دینا آدمی کو کس طرح اندر تک جگمگا دیتا ہے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ گہرے اندھیرے سے نکل کر بہت زیادہ روشنیوں میں آ گیا ہے۔ اسے اسماعیل کی بات یاد آئی کہ سائل دروازے سے خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ آدمی جس معاملے میں بھی بااختیار ہو اسے دے دینا چاہیے۔ وہ چاچا کو یہ خوشی دینے پر قادر تھا۔ بااختیار تھا، اب اسے کچھ مانگنا نہیں تھا۔ دینا تھا اور دینے کا مزہ کیسا ہوتا ہے، نشہ کیسا ہوتا ہے، اسے لمحوں میں ہی پتا چل گیا تھا اور اس نشے کا سرور ایسا تھا جس نے اسے بے خود کر دیا تھا۔

پھر چاچا کے ہاتھ ایک نیا موضوع لگ گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا۔ بس نازاں ہی کے لئے سوچتا اور گلو سے باتیں کرتا رہا۔ بہت سے پروگرام تو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہی چاچی سے طے کر لئے۔ وہ تو چاچی ہی کو خیال آ گیا کہ کھانا پکانا ہے تو وہ اٹھ گئی۔

گلو نے سوچا کہ کچھ دیر کو ٹیکسی لے کر خان آفریدی سے ملنے چلا جائے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ یہی ٹیکسی لینے کی کوشش کرے گا اور نہ دی تو یہ کام وہ امام دین کے حوالے بھی کر سکتا تھا۔ وہ اس کی مدد کر ضرور کرتا۔ گو اس کے پاس بکنے والی ٹیکسیاں نہیں تھیں مگر وہ کوشش کر سکتا تھا۔ اس نے چاچا سے کہا کہ وہ اب سب کچھ بھول کر کچھ دیر کو سو لے تب اس نے کہہ دیا کہ وہ شام کو نازاں کے پاس جائے گا۔

"وہاں میں ہو لوں گا۔ تجھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" گلو نے آنگن میں رکھی ٹنکی کے نیچے منہ دھوتے ہوئے کہا۔

"نہیں گلو! یہ خوشخبری اسے میں سناؤں گا۔ تو خود بات نہیں کرنا۔ پتا نہیں کیا کہہ

دے۔ تجھے اس کی کسی بات پر غصہ آ جائے۔ میں کوئی بدشگونی نہیں چاہتا۔ کہے دیتا ہوں، تو مت جائیو۔"

"اچھا بابا! تو ہی بتانا مگر ابھی تو آرام کر لے۔ اسپتال میں ملنے کا وقت ہوتا ہے اور چار بجے سے پہلے کسی کو وہاں جانے نہیں دیتے۔" گلو نے تولیہ سے منہ پونچھا۔ "اور میں آ جاؤں گا گھنٹا بھر میں۔ تجھے ساتھ لے چلوں گا۔"

"مگر سن لے، اگر تو ساڑھے تین بجے تک نہ آیا تو میں نہیں رکنے کا۔" اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔ گلو ہنس پڑا مگر آواز سے نہیں، چپکے سے۔ اس نے ٹیکسی نکالی اور سیدھا خان آفریدی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے بڑے تحمل سے گلو کا مدعا سنا پھر اسے دیکھا اور بولا۔

"اچھی بات ہے۔ تم اچھا آدمی ہے۔ جو مرد اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے۔ پیسا کیسے دے گا؟ ایک دم یا..........؟"

"ایک دم تو مشکل ہے، البتہ دو یا تین قسطوں میں دے سکتا ہوں۔" گلو نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ ابی تم کتنا دے سکتا ہے؟"

"بیس ہزار۔"

"اتنا پیسا ہے تمارا پاس؟" اس نے کچھ حیرت سے کہا۔

"ہاں.........." گلو کا جی چاہا تھا کہ جھوٹ بول دے۔ تھوڑا تھوڑا دے مگر خان آفریدی ایسے کھرے آدمی سے جھوٹ بولنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔

وہ کچھ دیر مشکوک نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "یہ ٹیکسی ستا ہے۔ تم پندرہ پندرہ کر کے ام کو پینتالیس ہزار دے دینا۔"

اور گلو خوش ہو گیا۔ اس نے تو بیس ہزار بھی اس لئے کہے تھے کہ پانچ ہزار وہ نازاں کے علاج کے علاوہ شادی سے پہلے گھر پر بھی لگانا چاہتا تھا۔ شادی کے لئے وہ اسماعیل سے اور بھی لے سکتا تھا۔ اب تو پانچ اور بچ گئے تھے۔ اس نے فوراً ہی پندرہ ہزار خان آفریدی کے حوالے کر دیئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جب سارے پیسے دے دوں گا تو ٹیکسی میری ہو جائے گی۔ کاغذات تم خود بنوا کر رکھو۔"

"نہیں۔ ٹیکسی ابھی سے تمارا ہوگیا۔ ہاں کاغذ کے لئے ام آدمی بھیج دے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ مرد کا زبان ہوتا ہے اور کچھ اس کا ایمان ہوتا ہے بس۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ گلو حیران ہوگیا۔ ایسا آدمی تو اس نے پہلے ہی بار دیکھا تھا ورنہ............

"شکریہ خان!" اس نے ہاتھ بڑھایا مگر خان آفریدی نے اسے گلے لگا کر مبارک باد دی اور بولا۔

"ام جب کسی غریب آدمی کو حلال رزق کی کوشش کرتے دیکھتا ہے تو............ بھوت (بہت) خوش ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ برکت دے گا۔ ابی تم جاؤ۔"

گلو کا دل ایک دم بوجھل ہوگیا تھا۔ وہ خوشی جو چند لمحے پہلے تک اسے محسوس ہوئی تھی' عجیب بے جان سی لگی۔ وہ مرے مرے قدموں سے آکر ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

☆==========☆============☆

امام دین نے رکشا تو لے لیا تھا مگر وہ دو چار سڑکوں پر رکشا گھما کر دوبارہ اسپتال پہنچ گیا۔ اسپتال کے گیٹ سے ہی اس نے کچھ فروٹ لے لئے تھے۔ ایک تھیلی میں چائے بھی لے لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ملاقات کا ٹائم نہیں ہے۔ یوں خالی ہاتھ اسے جانے نہیں دیا جائے گا۔ سیڑھیوں پر کھڑے چوکیدار کو بھی اس نے دس روپے تھما دیئے تھے۔ اس نے امام دین کے ہاتھ میں سامان دیکھ کر اسے جانے دیا تھا۔ وہ نازاں کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو نرس باہر نکل رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔

"میں نے انہیں انجکشن دے دیا ہے۔ آپ زیادہ وہ دیر ان سے باتیں مت کیجئے گا۔ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

"بس میں سامان دینے آیا تھا۔" امام دین نے جلدی سے کہا اور اندر داخل ہوگیا۔

نازاں جو کروٹ لے کر لیٹ رہی تھی' اسے دیکھ کر سیدھی ہوگئی۔ وحشت اس کی آنکھوں میں اب بھی ٹھاٹھیں مار رہی تھی۔ رنگ سفید ہو رہا تھا۔ اس کی چہرے پر کرب تھا۔

"نازاں............! یہ بات............" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس سے کیسے پوچھے۔

نازاں کی آنکھیں پہلے ہی بھر آئی تھیں۔ وہ ایک دم بول اٹھی۔ "بھائی جی! اللہ گواہ ہے کہ میں............ میں بے قصور ہوں۔"

"یہ تو تم پہلے بھی کہہ چکی ہو۔ میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ قصووار کون ہے؟ مجھے امید نہیں ہے کہ گلو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں.......... نہیں..........." اس نے پھر پہلے ہی کی طرح اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ڈیڑھ ماہ پہلے کی بات ہے' جب چاچا یہاں داخل تھا۔ گلو نے کبھی احساس نہ کیا کہ وہ یہاں مجھے چھوڑ جاتا ہے۔ یہاں.......... کیا.......... کہیں بھی درندوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ بھی ڈاکٹر تھا یہیں کا مگر اب نہیں ہے۔ میں نے سب سے پوچھ لیا۔ کسی بھی نرس نے اس حلیے کے آدمی کو نہیں پہچانا' اس نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر نہیں کوئی وارڈ بوائے ہو سکتا ہے۔ میں چاچا کے پاس تھی۔ ایک رات وہ اچانک آگیا۔ اس سے پہلے وہ اس وارڈ میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اگر اس کے گلے میں دھڑکن دیکھنے والا آلہ نہ ہوتا تو.......... تو شاید میں ڈر جاتی۔ وہ آلہ اس کے گلے میں دیکھ کر میں سمجھی کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ وہ کاریڈور (Corridor) سے گزر رہا تھا۔ میں چائے بنانے کے لئے کچن کی طرف جارہی تھی۔ ابھی میں دروازے سے نکلی ہی تھی کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ کچھ مسکرایا اور بولا۔ "کیسا ہے آپ کا مریض؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے قدم کمرے کی طرف بڑھائے۔ میں سمجھی رات کے راؤنڈ پر یہی ڈاکٹر ہے۔ میں واپس اندر گئی کہ یہ چاچا کو دیکھ کر چلا جائے گا تب چائے بنالوں گی۔ میں چائے اس لئے پینا چاہتی تھی تاکہ مجھے نیند نہ آئے۔ گلو آکر جا چکا تھا۔ کافی رات گزر چکی تھی۔ کافی مریض سوچکے تھے۔ اس نے چاچا کو سوتا دیکھا پھر اس کے بیڈ سے لٹکا فولڈر چیک کرنے لگا اور بولا۔

"کمال ہے۔"

میں چونک اٹھی۔ "کیا ہوا ڈاکٹر صاحب!"

"انہیں جن دواؤں کو شروع کرا دینا چاہئے تھا' وہ ابھی دی ہی نہیں گئیں۔ اس طرح تو ان کی حالت بگڑ سکتی ہے۔"

میں گھبرا گئی۔ "کون سی دوائیں ڈاکٹر؟"

"آپ گھبرائیے نہیں۔ میں کرتا ہوں کچھ" وہ انگلی سے سر پر ایسے کھجانے لگا جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا ہو۔ "مسئلہ یہ ہے کہ وہ دوائیں اسپتال میں نہیں ہیں۔ باہر سے منگوانا پڑیں گی اور باہر کی ڈسپنسری میں بھی یہ دوائیں نہیں ملیں گی۔" وہ پھر کچھ دیر

کے لئے چپ ہوا۔

"نرس انہیں دوائیں دے کر گئی ہے ڈاکٹر!" میں بہت پریشان ہو چکی تھی۔

"نہیں.......... ان میں وہ گولیاں شامل نہیں ہیں۔ وہ گولیاں ان کے لئے بہت ضروری ہیں بی بی۔ اگر نہیں دی گئیں تو.......... تو.......... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی نیند کبھی نہ ٹوٹے۔"

"اس نے بہت خوفناک لہجے میں کہا تھا۔ بھائی جی! میں تو جی جان سے لرزا اٹھی تھی۔ میں جانتی تھی کہ اگر چاچا کو کچھ ہوگیا تو گلو.......... گلو پاگل ہو جائے گا۔ میں اس کا دکھ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ "پھر اب کیا ہوگا؟" میں یہ کہہ کر رونے لگی تھی۔ مجھے ایک دم ایسا لگ رہا تھا جیسے چاچا.......... چاچا واقعی مرچکا ہے۔ اس کا سانس ختم ہو چکا ہے۔

"ایسا کریں۔ ٹھہریں' میں انہیں چیک کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ اپنے آلے سے چاچا کو چیک کرنے لگا پھر اس نے سر اٹھایا تو اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ "بی بی! آپ کو ذرا سی زحمت کرنا ہوگی۔" اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ اسٹور تک چلنا ہوگا۔ وہاں میں ان گولیوں کو تلاش کرکے آپ کو دے دوں گا۔ آپ کو میرے ساتھ آنا ہوگا۔"

"میں اتنی گھبرا چکی تھی کہ اس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ اس کے ساتھ میرا اسٹور تک جانا کیوں ضروری ہے؟ میں فوراً اس کے ساتھ چل پڑی۔ ڈیوٹی روم کے باہر اس نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ خود اندر چلا گیا۔ میں وہاں سے نرسوں کو بیٹھا دیکھ رہی تھی۔ ان دونوں کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ میرے سامنے کھڑا ان سے کچھ کہہ رہا تھا پھر وہ تیزی سے باہر آگیا۔ میں آگے بڑھ گئی۔ وہ بہت تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ہمارے قدموں کی چاپ سوئے ہوئے اسپتال میں گونج رہی تھی۔ ہم سیڑھیاں اتر کر ایک طرف بڑھ گئے۔ وہ آگے آگے تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ چاروں جانب دیکھتا ہوا چل رہا ہے مگر میرا ذہن تو چاچا میں اٹکا ہوا تھا۔ مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ وہ اس انداز سے کیوں چل رہا ہے؟ وہ جس جانب بڑھ رہا تھا' اس طرف اندھیرا تھا مگر مجھے بالکل ڈر نہیں لگا۔ اگر کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہمیں دیکھ رہا تھا تو وہ یہی سوچ رہا ہوگا کہ میں اس کے ساتھ ہوں اور سب کچھ ٹھیک ہے۔

آگے جاکر ایک لمبا کاریڈور آگیا۔ وہ اس میں داخل ہوگیا۔ یہ حصہ اسپتال کی عمارت سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہاں بلب بھی کم ہی جل رہے تھے۔ زیادہ حصہ گہری تاریکی میں لپٹا ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے ہی کاریڈور میں داخل ہوگئی۔ دائیں بائیں کمرے بنے ہوئے تھے۔ تقریباً تمام ہی دروازوں پر تالے پڑے تھے۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا مگر میں اب بھی نہ ڈری۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ بس ذہن میں بگولے سے اٹھ رہے تھے۔ صرف یہی خیال تھا کہ جلدی سے گولیاں مل جائیں اور چاچا بچ جائے۔

اسی وقت اس نے ایک دروازے پر رک کر جیب سے چابی نکالی۔ دروازے پر پڑا تالا کھولا۔ میں وہیں رک گئی۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بٹن دبایا اور پیلی سی روشنی اس کمرے میں پھیل گئی۔ "آؤ۔" اس نے کہا اور ان بڑی بڑی الماریوں کی طرف بڑھ گیا جہاں دوائیں رکھی تھیں۔ گتے کے بڑے بڑے ڈبے رکھے تھے۔ میں دو قدم آگے بڑھی۔ عین اسی لمحے بتی بجھ گئی اور ساتھ ہی مجھے دروازے کی چٹخنی لگانے کی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتی اور چیختی' اس کا مضبوط ہاتھ میرے منہ پر جم گیا۔ میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو وہ غرایا۔

"اگر آواز نکالی تو یہیں زہر دے کر مار دوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی اور وہ............ وہ بڈھا بھی مر جائے گا۔ اسے دوا نہ ملی تو اس کی زندگی میں کبھی صبح نہیں ہوگی۔ چپ چاپ پڑی رہو۔ مجھے اچھی چیزیں ہمیشہ سے پسند رہی ہیں اور یہ بھی میری عادت ہے کہ کسی اچھی چیز کو دیکھ لینے کے بعد مجھے نیند نہیں آتی۔ میں چار روز سے جاگ رہا ہوں۔"

وہ بول رہا تھا اور میرا دم نکلا جارہا تھا۔ اس کا مضبوط اور بڑا سا ہاتھ میرے منہ پر اتنی طاقت سے جما ہوا تھا کہ میں پوری قوت لگانے کے باوجود آواز نہیں نکال پارہی تھی حالانکہ میں یہ بھی جان گئی تھی کہ میں نے آواز نکالی بھی تو میری چیخ وہاں تک نہیں پہنچے

گی جہاں میں اکا دکا لوگوں کو دیکھ چکی تھی پھر بھی میری کوشش یہی تھی کہ وہ میرے منہ سے ہاتھ ہٹالے۔ میں اس سے التجا تو کرسکوں۔ رحم کی بھیک ہی مانگ سکوں مگر اس درندے نے ایک نہ سنی۔ وہ اسی طرح مجھے گھسیٹتا ہوا اندر کی طرف لے گیا

بڑی بڑی الماریوں کے درمیان لے جاکر اس نے میری کن پٹیوں کو اس زور سے دبایا کہ میں بے ہوش ہوگئی۔ میری بے ہوشی زیادہ لمبی نہیں تھی مگر جب میں ہوش میں آئی تو میں............ میں............"

"بس کر۔" امام دین کو لگا جیسے اس کے دماغ میں اٹھنے والے شعلے اس کے پورے وجود کو جلا کر بھسم کردیں گے۔

"میں............ میں کیا کرتی؟ بتا............ میں کیا کرتی؟ کس سے فریاد کرتی؟ اگر گلو کو پتا چل جاتا تو وہ............ وہ تو قتل کر دیتا اور............ اگر چاچا کو پتا لگ جاتا تو............ وہ مر جاتا۔" نازاں اب بری طرح رو رہی تھی۔

"اس کا نام کیا تھا؟ تم نے یہاں کسی سے پوچھا؟"

"نہیں............ بھائی جی! نہ تو مجھے نام پتا ہے' نہ میں نے کسی سے پوچھا۔ اس نے تو مجھے اسٹور سے نکال کر کہا تھا کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتایا تو وہ مجھے اسٹور میں دوائیں چوری کرنے کے الزام میں پکڑوا دے گا۔ میری ماں ہوتی یا خالہ حمیدہ ہوتی تو شاید میں اس کی گود میں گر کر رو لیتی۔ سب کچھ بتا دیتی مگر............ مگر گلو اور چاچا کو کیا کہتی؟ پھر میں نے جب اس کا حلیہ نرس کو بتا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ اس حلیے کا کوئی ڈاکٹر تو یہاں نہیں ہے۔ ممکن ہے وارڈ بوائے ہو۔ میں نے بھی اسے پھر نہیں دیکھا۔ اب بھی میں اسی لئے ڈر رہی تھی مگر یہاں............ یہاں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔ وہ تو مردانہ وارڈ تھا۔"

"ٹھیک ہے............ مگر اب کیا ہوگا؟" امام دین مسئلے کی پیچیدگی کو سمجھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نازاں ایسی لاوارث لڑکی کے لئے اس حادثے کا واویلا واقعی ناممکن تھا۔ واقعی گلو تو ایک دم ہنگامہ مچا دیتا یا پھر............ چاچا کا دل بند ہو جاتا اور اگر یہ سب بھی نہ ہوتا تو نازاں کی بدنامی اسے جینے نہ دیتی۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں نے تو اسی لئے گھر چھوڑا تھا کہ اب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

..........میں گلو کو بھی دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی حالانکہ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس روز کی بے بسی میری کوکھ میں جنم لے رہی ہے مگر اتنا تو میں جانتی تھی کہ میں کسی شریف آدمی کے قابل نہیں رہی اور ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے جو.......... جھوٹا کھالے۔"

"اب ارادہ کیا ہے؟" امام دین چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ رونا بند کردے اور آنے والے حالات کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرلے۔

"اب.......... میں چاچا کے گھر تو کبھی نہیں جاؤں گی۔" اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔

"پھر.......... پھر کہاں جاؤ گی؟ یہاں تو پھر ہم لوگ ہیں؟ اب یہ بدنامی تو تمہارے ساتھ ہی رہے گی۔ دیکھو! یہ ٹھیک ہے کہ تمہارے ساتھ جو حادثہ ہوا ہے' وہ کم سنگین نہیں ہے مگر جب تم کہہ چکی ہو کہ تم اس شخص کو نہیں جانتیں۔ وہ شخص کبھی تمہیں نظر بھی نہیں آیا تو.......... تو تم کسی پر اپنی بے گناہی بھی ثابت نہیں کر سکتیں۔ تمہیں یہ سب کچھ بھول کر اب صرف یہ سوچنا چاہیے کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔"

"میں.......... میں خودکشی کرلوں گی۔" اس نے بڑے عزم سے کہا تھا۔

"بے وقوفی کرو گی۔" امام دین دل میں ڈر رہا تھا مگر پھر بھی سخت لہجے میں بولا۔ "تمہارے مرنے کے بعد تو اس بدنامی کو پر لگ جائیں گے۔ ہوتا ہے.......... ایسے حادثات ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ شخص میرے ہاتھ آگیا ہوتا تو میں اسے ختم کر دیتا مگر.......... اس وقت.......... اس وقت سب سے پہلا مسئلہ یہی ہے کہ.........."

"میرے زندہ رہتے ہوئے کون سا یہ معاملہ دب جائے گا؟ بلکہ گلو تو میرا ہی گلا دبا دے گا۔"

وہ پھر رو پڑی۔ اس کی آنکھیں بہت سرخ ہو رہی تھیں۔ پلکیں بھی بوجھل ہو چکی تھیں۔ کچھ تو رونے کی وجہ سے اور کچھ شاید اس انجکشن کی وجہ سے جو نرس اسے دے چکی تھی اور جاتے جاتے امام دین کو بھی بتا گئی تھی۔

"اور وہ چاچا.......... میں کیسے ان لوگوں کے دل میں اپنی عزت پیدا کروں گی؟"

"سنو! روؤ نہیں' سوچو۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا اور شام کو وہ لوگ

ضرور آئیں گے۔"

"میں کچھ نہیں سوچ سکتی لیکن بس.......... میں نے کہہ دیا ہے ناں کہ میں.......... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"گلو کو تو میں سمجھالوں گا۔ اس کی فکر تم مت کرو۔"

"نہیں.........." وہ خوفزدہ ہو گئی۔ "تم گلو سے کوئی بات نہیں کرو گے۔"

"اچھا پھر.......... تم میرے گھر آجانا۔ وہاں زیبی اکیلی رہتی ہے۔ میں گیراج میں رہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر امام دین نے اسے زیبی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اب اس کے پریشان چہرے پر کچھ ٹھہراؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ "بعد میں سوچیں گے کہ کیا کیا جائے؟" امام دین نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں قسم ہے' تم گلو کو کچھ نہیں بتانا۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

امام دین نے وعدہ کرلیا کہ وہ گلو ہی سے نہیں کسی سے بھی اس موضوع پر اس وقت تک بات نہیں کرے گا جب تک وہ خود نہیں کہے گی۔ نازاں' امام دین سے یہ وعدہ لے کر اور یہ سب کچھ بتا کر ہلکی ہو چکی تھی۔

"اب تم سو جاؤ۔ فکر مت کرنا۔ جو بھی ہوگا' دیکھا جائے گا۔" امام دین اسے تسلی دے کر باہر آگیا۔ اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھ گیا تھا۔ وہ تو کل رات سے بہت خوش تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آج کا سارا دن سمندر کے کنارے بیٹھ کر گزارے گا۔ وہاں بیٹھ کر سوچے گا کہ اسے زیبی سے کیا کہنا ہے اور پھر اگر تاریخ طے ہوگئی تو ایک دم سے کام کتنے بڑھ جائیں گے پھر اس نے سوچا کہ چلو گلو تو ہے' کافی کام تو وہ بھی نمٹالے گا مگر اب سمندر پر جاکر کچھ سوچنے کا وقت بیت چکا تھا۔

دوپہر ہو چکی تھی۔ شام آنے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ وہ سیدھا گیراج چلا آیا۔ یہاں ایک اور مصیبت اس کی منتظر تھی۔ گیراج کا ایک ملازم سخت بخار میں پڑا تپ رہا تھا۔ اسے اس گاڑی میں کام کرنا تھا جس کا مالک شام کو گاڑی لینے آنے والا تھا۔ یہ صورت حال دیکھتے ہی امام دین آستینیں چڑھا کر اس گاڑی کا بونٹ اٹھا کر کام میں لگ گیا۔ وہ اس کام کو بھی شام سے پہلے ختم کرنا چاہتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆==========☆============☆

گلو کو ٹیکسی چلاتے ہوئے اس بات کی ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی تھی کہ وہ خان آفریدی اسے دے چکا تھا۔ سارا دکھ اسے اس بات کا تھا کہ وہ اس اسماعیل کے پیسے دے کر خریدی ہے اور اسماعیل حلال طریقے سے نہیں کماتا تھا۔ خود اس نے بھی تو اس رقم کو حلال نہیں کیا تھا۔ کچھ کر چکا ہوتا تب بھی اسے اطمینان ہوتا مگر.......... وہ بڈھا کھوسٹ جسے ضمیر کہتے ہیں' شاید ابھی تک اس کے اندر پڑا ہانپ رہا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی اس نے جبڑے بھینچ لئے۔ "کتنا سخت جان ہے.......... بالکل چاچا کی طرح۔" وہ بڑبڑایا۔

اسی لمحے ایک سواری نے اسے ہاتھ دیا۔ اس نے ٹیکسی روک لی اور پھر ذہن کو خالی کرکے دھیان سڑکوں پر مبذول کرلیا۔ کافی دیر پھرتے رہنے کے بعد اس نے گھڑی میں دیکھا۔ سوا تین بج رہے تھے۔ اسے تو امام دین کے پاس بھی جانا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے ٹیکسی اس کے گیراج کی طرف موڑلی۔ وہ گیراج پر پہنچا تو امام دین بہت مصروف تھا۔ یوں بھی اسماعیل کے معاملے پر تو بات کرنے کا اب وقت نہیں تھا البتہ وہ امام دین سے ضرور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کی کون سی لاٹری نکلی تھی مگر امام دین بہت مصروف تھا۔

اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ ایک منٹ بھی یہ گاڑی نہیں چھوڑ سکتا۔ بڑے پرانے گاہک کی گاڑی تھی اور وہ سب سے موٹی آسامی تھی۔ ڈبل پیسے مانگنے کے باوجود اوپر سے بھی کچھ نہ کچھ دے جاتا تھا۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ امام دین نے پانچ برسوں میں کبھی اس سے وعدہ خلافی نہیں کی تھی۔ وہ ایسا آج بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ گلو کو گھر پہنچ کر چاچا کو لینا تھا' پھر اسپتال جانا تھا اس لئے وہ وہاں رکا نہیں۔ رات کو آنے کا وعدہ کرکے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس نے تیز رفتاری سے راستہ عبور کیا۔

ٹیکسی دروازے پر رکی ہی تھی کہ چاچا تالا چابی لئے باہر نکل آیا۔ اگر گلو دو منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو شاید وہ نکل چکا ہوتا۔ اسے دیکھ کر چاچا کی باچھیں کھل اٹھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ گلو بھی خوش ہے ورنہ ایسی وفا اس نے اب سے پہلے کون سے وعدہ میں دکھائی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر رحمان چاچا کا در کھٹکھٹایا۔ چاچی کو جلدی آنے کا کہا اور خود ٹیکسی میں گلو کے برابر بیٹھ گیا۔

وہ کچھ ہی دیر میں اسپتال پہنچ گئے۔ ملاقات کے لئے آنے والے شاید وہی پہلے لوگ تھے۔ گلو نے باہر سے فروٹ خریدے۔ کچھ اور کھانے پینے کی اشیاء لیں اور چاچا' چاچی کو لئے اس کے کمرے تک پہنچ گیا۔ وہ جاگ رہی تھی۔ چاچا تو جاتے ہی اس کی طرف لپکا تھا۔ اس کا دہانہ مارے خوشی کے کانوں تک پھیلا ہوا تھا۔ چاچی بھی بہت خوش تھی اور گلو خوشی اپنے سینے میں بھی بھری ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ وہ تھیلا لے کر آگے بڑھا۔

"کیسی ہے تو بٹیا!" چاچا اس سے پوچھ رہا تھا مگر گلو کی نگاہیں نازاں کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ اسے لگا تھا جیسے انہیں دیکھ کر وہ اور زیادہ وحشت زدہ ہوگئی ہے۔ اس کا رنگ کچھ اور پیلا پڑ چکا تھا۔

نازاں.......... بیٹا کیا بات ہے؟ تو ٹھیک تو ہے ناں؟" چاچا بھی شاید اس کی وحشت کو محسوس کر گیا تھا۔

"آں.......... ہاں.......... میں.......... میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔"

گلو نے تھیلا اس کے بیڈ کے برابر والی الماری پر رکھنا چاہا اور وہاں رکھے تھیلوں میں فروٹ دیکھ کر حیران ہوگیا۔ "یہ.......... یہ کون لایا؟" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"اوہ.......... یہ.......... یہ.......... یہ تو.......... میں۔" نازاں ہراساں ہوگئی۔

"میں نے منگوائے تھے۔" پھر وہ جلدی سے بولی۔ "ڈاکٹر نے کہا تھا کہ کمزوری بہت ہے۔ تم.......... تم لوگ تو کچھ بھی نہیں لائے تھے ناں!"

"اچھا.......... اچھا.......... اچھا کیا۔ ہمیں تو اس وقت ہوش ہی نہیں تھا بیٹا..........! ڈاکٹر آیا تھا؟" چاچا اس کے ہاتھ تھام کر پاس پڑی بنچ پر بیٹھ گیا۔

"جی چاچا..........!"

"ارے ہٹو جی! تمہاری تو ہمت ہی نہیں ہو رہی۔" ایک دم چاچی آگے بڑھیں۔ انہوں نے نازاں کو اپنے سینے سے لگایا پھر اس کا ماتھا چوم کر بولیں۔ "بیٹا! اللہ جو کرتا ہے' انسان کی بہتری کے لئے کرتا ہے۔ اب اگر تو نہ ملتی' یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تو.......... بھلا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تقدیر کا لکھا کیسے پورا ہوتا؟"

"جی.......... جی چاچی.......... وہ.......... میں تو.........." نازاں ایک دم رو پڑی۔

اسے شدید دکھ ہوا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ امام دین یوں ان سب کو سب کچھ بتادے گا۔ آنسو اس کے حلق میں اٹک گئے۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اسے اب مرجانا چاہیے۔ مرنے کے بعد بدنامی کو پر لگتے ہیں تو لگ جائیں۔ زندہ رہتے ہوئے بھلا وہ یہ دکھ کیسے جھیل سکے گی، مرہی تو جائے گی۔

"ارے.......... کیا ہوا؟" چاچا ایک دم گھبرا گیا۔

وہ تو غنیمت ہوا کہ نازاں کے حلق میں پھنسے ہوئے آنسوؤں نے اسے بولنے یا چیخنے نہ دیا، ورنہ چیخیں اور سسکیاں تو اس کے سینے میں بھر کر اس کا دم گھونٹ رہی تھیں۔

"اے لو..........! تم مٹھائی تو لائے ہی نہیں۔"

چاچی نے پلٹ کر گلو کی طرف دیکھا جو سر جھکائے کونے والی بنچ پر جا بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نازاں کیوں دکھی ہو رہی ہے۔ اس نے واقعی بہت ذلیل حرکت کی تھی۔ اس کا رویہ اس کے ساتھ دشمنوں جیسا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ اپنے رویے کی تلافی کر دے گا۔ اسے کبھی بھی.......... آج کے بعد کبھی دکھی نہیں ہونے دے گا۔ اس نے سر اٹھا کر چاچی کی طرف دیکھا۔

"چل یہ کینو ہی چھیل کردے مجھے۔" چاچی نے گلو کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر کہا۔

گلو نے ہونٹوں کو بھینچ کر نازاں کی طرف دیکھا جو چاچی کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ "میں بٹیا کا منہ میٹھا کراکے دوں گی، اسے خوشخبری۔"

"چاچی.......... کک.......... کیا ہوا؟" وہ خوفزدہ ہرنی کی طرح سب کو باری باری دیکھنے لگی۔

"گلو کی شادی طے کر دی ہے ہم نے۔"

چاچی نے ذرا سا لہرا کر کہا اور کینو چھیلنے لگی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ سامنے ساکت بیٹھی نازاں کو کس بلا کا طوفان اڑا کر کہاں سے کہاں لے گیا؟ وہ گم صم بیٹھی رہ گئی۔ گلو

نے کن انکھیوں سے نازاں کی طرف دیکھا۔ وہ بت بنی بیٹھی چاچی کو گھور رہی تھی۔ گلو کو غصہ آگیا۔

"چاچی! بتا کیوں نہیں دیتی اسے۔" اس نے دانت کچکچا کر سوچا۔

"یہ لے.......... پہلے تو منہ میٹھا کر۔" چاچی نے کینو کی پھانک نازاں کے سوکھے ہوئے ہونٹوں سے لگا دی۔

"یہ.......... نن.......... نہیں.......... میں.......... میں نہیں کھاؤں گی۔" اس نے تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کیا۔ "کب.......... کہاں ہو رہی ہے؟" اس نے پپڑی جمے ہونٹوں سے پوچھا۔

"ہاں..........! یہی تو ہے مزے کی بات؟ اب بوجھ کہ وہ کون ہے؟"

چاچی تو جیسے مزے لے رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ نازاں پر کیا بیت رہی ہے۔ چاچا بھی چپکا بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"کک.......... کون ہے؟" نازاں نے بہ مشکل پوچھا۔

"میری بیٹی سے طے ہوئی ہے بات!" چاچی نے پھر بات میں سسپنس پیدا کر دیا۔

اس کی تو کوئی بیٹی تھی ہی نہیں۔ دو بیٹے تھے۔ ایک پندرہ برس کا ہو کر مرگیا تھا۔ ایک شادی شدہ تھا۔ بیٹی کا ارمان پورا ہی نہیں ہوا تھا۔

"تمہاری بیٹی!" اس نے حیرت سے چاچی کو دیکھا۔ چاچا تو قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور گلو کا جی چاہا کہ جلدی سے نازاں کو سب کچھ بتا کر اسے تسلی دے دے۔

"اے ہاں میری بیٹی! اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔ بھئی! وہ قادر مطلق ہے۔ جسے چاہے نواز دے۔ اب اس نے مجھے ایک بیٹی دے دی۔ پلی پلائی، جوان، خوبصورت اور.......... لاکھوں میں ایک یہ.......... کم بخت گلو تو چراغ لے کر بھی ایسی دلہن ڈھونڈتا تو اسے کہیں نہ ملتی۔"

"ارے! اب بتا بھی دو بھاگی جی! کیوں اسے ہلکان کئے دیتی ہو۔" چاچا نے ہنستے ہوئے کہا تو گلو کی جان میں جان آئی۔ وہ فوراً سر نیہوڑا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ساری توجہ تو ان لوگوں کی گفتگو پر تھی مگر آنکھیں انگلیوں کے درمیان گھومنے والی ٹیکسی کی چابی پر۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بھئی! ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب تو یہاں سے کہیں نہیں جائے گی۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے گھر نہیں جائے گی بلکہ......... میرے گھر جائے گی۔ اب ان حالات میں تیرا وہاں رہنا بدنامی کا باعث ہوگا۔" چاچی نے بقراط کے سے انداز میں کہا۔

نازاں کی تو گھگھی بندھ گئی۔ نازاں کو لگا جیسے وہ اب پٹ سے گر کر مرجائے گی۔ اس کا رنگ مزید سفید ہوگیا تھا۔ "چاچی.........! میں......... میں۔" اس نے کچھ کہنا

"جب تک شادی نہیں ہو جاتی تو میرے گھر ہی رہے گی۔ بھئی سسرال میں شادی سے پہلے لڑکیاں تھوڑی رہتی ہیں۔" وہ اس کی حالت سے بے خبر کہہ رہی تھی۔

"اور اب تو گلو سے پردہ کرے گی سمجھی تو؟" وہ ذرا مصنوعی غصے سے بولی۔

نازاں نے اپنی گیلی ہتھیلیوں کو کمبل سے رگڑا۔ "کیا......... کیا کہہ رہی ہے تو چاچی! "

"ارے باؤلی مت بن۔" چاچا نے چاچی کو ٹھوکا دیا۔ "میں بتاتا ہوں نازاں بیٹا میں نے اور گلو نے طے کرلیا ہے کہ اب تو ساری عمر ہمارے ہی پاس رہے گی۔ میری بیٹی اور......... بہو بن کر۔ اب اس کے ڈرامے تو تجھے پتا ہیں۔" آخری جملہ چاچا نے ہنس کر کہا۔ اس کا اشارہ چاچی کی طرف تھا۔ "اتنی سی بات کہنے کے لئے گھنٹوں کھینچ لئے۔"

اور نازاں نے آنکھیں بند کرکے سر بیڈ کے سرہانے ٹیک دیا۔ وہ تو ڈر ہی گئی تھی کہ شاید بدنامی کو امام دین نے پر لگا کر خود ہی اڑا دیا ہے مگر یہاں تو بات ہی اور تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی ہوتی مگر اس وقت اسے یہ سن کر اور رونا آرہا تھا۔ وہ تو کبھی بھی گلو کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ گلو کو پتا چل جاتا تو......... تو شاید ابھی اور اسی وقت وہ اسے اسپتال سے بھی دھکے دے کر نکال دیتا۔ شادی تو دور کی بات تھی۔

آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ وہ تقدیر کے اس ڈرامائی انداز پر بہت دل گرفتہ تھی۔ اگر ایسا دو ماہ پہلے ہو چکا ہوتا تو......... تو اس وقت وہ یوں اسپتال میں نہ پڑی ہوتی۔

اسے حیرت تھی کہ گلو اس پر کیسے راضی ہوگیا؟ اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں کی روزن سے گلو کی طرف دیکھا۔ وہ اب دیوار پر لگے انسانی بدن کے چارٹ کو دیکھ رہا تھا۔

ٹیکسی کی چابیاں اس کی انگلیوں کے درمیان تیزی سے حرکت کر رہی تھیں اور ان کے چھنچھنانے کی آواز گونج رہی تھی۔

"تجھے......... تجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہے ناں نازاں!" چاچا اس کی مرضی معلوم کئے بنا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو تھا کہ وہ گلو کو پسند کرتی ہے مگر وہ اپنے دل پر کسی قسم کا بوجھ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ نازاں اپنے منہ سے اقرار کرے۔

"چاچا.........!! اس پر بعد میں بات ہو سکتی ہے۔ ابھی......... یہاں......... میں' میں یہاں بات........."

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ ہم کون سا یہاں رشتہ طے کرنے آئے ہیں۔ وہ تو میں چاہتا تھا کہ تیرے دل سے اکیلے پن کا خوف نکال دوں اور تو نے جو یہ حرکت کی تھی ناں! گھر چھوڑ کر جانے والی......... تو ایسی بے وقوفی تو اب نہ کرسکے۔ بیٹا! وہ گھر پہلے بھی تیرا تھا اور اب بھی تیرا ہی ہے۔ یہ شادی والی بات تو الگ رہی' تو نے اپنے گھر کو چھوڑنے کی ہمت کیسے کرلی تھی؟ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھلا کوئی یوں گھر چھوڑتا ہے اور تو......... تو' تو بہت سمجھدار ہے۔ گلو چبوترے پر چلا گیا تھا تو' تو کیسے اسے سمجھا رہی تھی۔ ہیں......... اب نہیں کرنا کبھی بھی ایسا۔"

اور نازاں بے اختیار بلک بلک کر رودی۔ گلو اور چاچا نے جو اسے مقام دیا تھا' جو عزت افزائی کی تھی۔ ایک بے سہارا کو سمیٹ لیا تھا اور اب جو اتنا بڑا فیصلہ کرلیا تھا' اس احسان کا بدلہ تو وہ اتار ہی نہیں سکتی تھی اور اب وہ انہیں کیسے بتاتی کہ وہ گلو جیسے آدمی کی بیوی بننے کے قابل نہیں رہی۔ کیسے کہتی کہ وہ تو اس گھر میں اب کبھی نہ جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔

وہ سب گھبرا گئے۔ گلو بھی اٹھ کر قریب چلا آیا۔

"نازاں......... بس بیٹا.........! اب تو کچھ مت سوچ......... اب تیرے دکھ کے دن نہیں رہے۔ بیٹا! میں نے کہا تھا ناں! اللہ جو کچھ کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔" چاچا اس کا سر اپنے سینے سے لگائے کہہ رہے تھا اور نازاں سوچ رہی تھی کہ بھلا اس میں اللہ کی کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مصلحت ہو سکتی ہے۔ اس میں کس کی بہتری کا پہلو ہے۔

"مت رو بیٹا......... یہ تو خوش ہونے والی بات ہے ناں!" چاچا اسے تسلی دے رہا تھا۔ "اب تو ہمیشہ میرے پاس رہے گی اور اب تو گلو بھی بالکل بدل گیا ہے۔ یہ تو تجھے جانے کہاں کہاں تلاش کرتا پھرا تھا؟ بس اب مت رو۔"

اسے چپ ہونا ہی پڑا۔ اپنا دکھ آنسوؤں میں بہا سکتی تو اب تک روتی ہی رہتی مگر وہ تو امام دین کے جانے کے بعد ہی چپ ہو گئی تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ تو بہت دیر تک سوچتی رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ امام دین نے اسے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت بھی دے دی تھی مگر اس نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا کہ وہ وہاں بھی نہیں جائے گی۔ وہ اس شہر میں ہی نہیں رہے گی تاکہ کم از کم چاچا کو اس بات کی بھنک نہ پڑے۔ گلو اسے قصوروار سمجھ کر اس کے سینے میں بھالے نہ اتارے۔ اگر وہ امام دین کے پاس بھی رہتی تو کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں گلو سے مڈبھیڑ ہو ہی سکتی تھی۔ کیسے سامنا کرتی وہ ان لوگوں کا؟ کیسے یقین دلاتی اپنی بے گناہی کا مگر......... اب......... اب چاچا چاچی سے یہ سن کر کہ انہوں نے اسے بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ صرف اپنی تقدیر کی ستم ظریفی پر روئی تھی مگر کب تک روتی؟ اسے چپ ہونا ہی تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اسی وقت چاچا سے انکار کر دے مگر جانے کیا چیز تھی جو اسے بولنے سے روک رہی تھی۔ شاید وہ اس کی بوڑھی آنکھوں میں جھلملاتی خوشی کو بجھتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی تھی یا شاید اس میں ہمت نہیں تھی کہ سامنے منزل دیکھ کر پلٹ سکے۔ وہ در جو اسے ہمیشہ بند ملا تھا' آج کھلا بھی تو کیسے وقت کہ اس میں ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی تاب نہ تھی۔ وہ گلو جس سے ایک جملہ' اظہار محبت میں کہنے کے لئے وہ ہمت پیدا نہ کر سکی۔ اسے قبول کر چکا تھا مگر کس لمحے میں! جب اس کا وجود خود اس کی نگاہوں میں کراہیت پیدا کر چکا تھا۔

چاچا نے اس کا چہرہ اٹھا کر اس کی پیشانی چومی۔ اپنی کھردری ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھے' اسے پچکارا۔ "بس......... اچھے بچے نہیں روتے۔" اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ اٹھے۔ چاچا سے کہے کہ اسے بار بار اچھا نہ کہے۔ اسے سینے سے نہ لگائے۔ اسے تسلیاں

نہ دے۔ اب وہ کسی قابل نہیں رہی اور وہ نہیں چاہتی کہ اس قدر پیار اور اپنائیت کے بعد اسے ٹھکرائے جانے کا منظر بھی دیکھنا پڑے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ چاچا اسے بے غیرت ہونے کا طعنہ دے۔ گلو مار کر اسے گھر سے نکال دے۔ یہی چاچی جو اسے اپنے گھر رہنے کا مژدہ سنا رہی ہے۔ یہی ناک پر انگلی رکھ کر کہے۔ "آئے ہائے! یہ کرتوت تھے تیرے' اور کیسی پارسا بنی پھرتی تھی۔ اے اسی لئے گلو کا گھر چھوڑ کر بھاگی تھی۔"

وہ گھبرا کر لیٹ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ تینوں اسے گالیاں دے رہے ہوں۔ طعنے دے رہے ہوں۔ اسے چکر سے آنے لگے تھے۔ بدن کی جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نڈھال ہو چکی تھی۔

"چل یہ کینو کھا لے۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے۔ چل میری بچی' اٹھ یہ کھا کے سو جانا۔" چاچی نے چھلا ہوا کینو پلیٹ میں رکھ کر اسے دیا۔

"نہیں......... چاچی......... میں......... میں بعد میں کھا لوں گی۔" اس نے انکار کر دیا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ وہ لوگ چلے جائیں۔ جلدی سے اور وہ اکیلی بیٹھ کر خوب روئے۔ پھر اس کے آنسو خشک ہو جائیں' تب وہ سوچے کہ اب کیا کرنا ہے' کس طرح چاچا کو انکار کرے' کون سا بہانہ بنائے کہ......... کہ اسے دکھ نہ ہو حالانکہ اسے یقین تھا کہ اسے دکھ ہو گا۔ وہ تو گھر چھوڑ کر بھی چین نہ پا سکی تھی۔ اسے پتا تھا کہ گلو کو یاد آئی ہو یا نہیں مگر چاچا اس کے یوں چلے جانے پر بہت رویا ہو گا۔ بہت تڑپا ہو گا۔

"اچھا! اب تو جلدی سے ٹھیک ہو جا۔" گلو پتا نہیں کیا کہنا چاہتا تھا کہ یہ کہہ بیٹھا۔

اس نے لمحہ بھر کو گلو کی طرف دیکھا اور حیرت زدہ سی رہ گئی۔ جس پیار کو اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے لئے اس نے لاکھ جتن کئے تھے' وہ اس وقت اس کی آنکھوں میں موجیں مار رہا تھا۔ گلو کا چہرہ پھر دھندلا گیا۔ آنسو کا قطرہ اس کے اور نازاں کی بینائی کے درمیان دیوار بن گیا۔ نازاں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنی سی دیر میں اتنا بہت سا وقت پتا نہیں کب بیت گیا؟

باہر سے گزرنے والے وارڈ بوائے کے ہاتھ میں ہلتی ہوئی گھنٹی کی آواز نے سبھی کو چونکا دیا۔ ساتھ ہی وہ آواز لگا رہا تھا۔ "ملاقات کا ٹائم ختم ہو گیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نازاں نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ گلو اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت سی ان کہی باتیں تھیں۔ نازاں نے نگاہ چرالی۔ اس کے چہرے پر پھیلے سپاٹ پن کے باوجود گلو نے کچھ محسوس نہیں کیا۔

عین اسی وقت ایک ڈاکٹر' دو نرسوں کے ساتھ وارڈ میں داخل ہوا۔ وہ سامنے کے بیڈ پر لیٹی عورت کے قریب رک گیا۔ اس کے پاس کوئی نہیں تھا شاید اس لئے وہ اسے چیک کرنے لگا۔ مریضوں کے پاس آئے لوگ ڈاکٹر کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔ کچھ لوگ دروازے سے باہر جارہے تھے۔ نازاں پر بھی گھبراہٹ طاری ہوگئی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان لوگوں کے سامنے ڈاکٹر کے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکلے۔ امام دین نے بتایا تھا کہ ان لوگوں نے پولیس ریکارڈ کے لئے گلو کو اس کا شوہر ہی بتایا ہے۔ پولیس نے جب اس سے تصدیق چاہی تھی تو اس نے بھی انکار یا اقرار نہیں کیا تھا بلکہ بات ایسی گھما پھرا کر کی تھی کہ انہیں بھی یہی اندازہ ہوا کہ گلو اس کا شوہر ہے۔ ڈاکٹروں کو بھی یہی پتا تھا۔ وہ کوئی بھی بات ان کے سامنے یا ان میں سے کسی سے کرسکتا تھا اس لئے وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"چاچا! اب تم لوگ جاؤ۔ یہ ڈاکٹر بہت سخت ہے۔ لوگوں کے جانے سے پہلے اسی لئے آجاتا ہے تاکہ لوگ اسے دیکھ کر جلدی سے کمرا خالی کردیں۔"

"تجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے ناں!" گلو نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"نہیں بس تم لوگ جاؤ۔" وہ خوفزدہ ہوکر سکڑ کے بیٹھ گئی تھی۔

"کھانا.......... رات کو میں کھانا لے آؤں گا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ نازاں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے رویے کی معافی بھی تو مانگنا تھی اسے۔

"نہیں.......... یہاں سے کھانا ملتا ہے۔ مجھے.......... مجھے منع ہے باہر کا کھانے کو۔ تم لوگ جاؤ۔" اس کے لہجے میں بلا کی بیقراری بھر چکی تھی۔

"چل اٹھ۔" چاچا اور چاچی کھڑے ہوگئے۔ گلو نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆============☆========

چاچی اور چاچا کو اس نے رکشا میں بٹھا دیا۔ وہ امام دین سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ امام دین آج زیبی سے بات کرے گا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ شام کے چھ بجنے والے تھے۔ اس نے سوچا۔ وہ بھی امام دین کے پاس پہنچ جائے' اسے اپنی خوشخبری بھی سنا دے۔ امام دین کی خوشی دوبالا ہو جائے گی۔ خود اس کے دل میں بھی لڈو سے پھوٹ رہا تھے۔ آج وہ بھی خوش تھا اور امام دین بھی' حالانکہ اس دوران میں اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ خود کیوں خوش ہے؟ نہ تو اسے نازاں کو پالینے کی آرزو تھی اور نہ ہی اس سے محبت۔ ہاں وہ اسے سہارا دینے اور وہ بھی چاچا کی دوسراہٹ کے عوض ضرور تیار ہوگیا تھا مگر جلد ہی اسے یہ احساس بھی ہوگیا کہ یہ خوشی کسی کو کچھ دینے کا سرور ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو' وہ خوش تھا اور اپنی خوشی میں امام دین کو شریک کرکے خود بھی اس کی خوشی میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

وہ گیراج پر پہنچا تو دور ہی سے چھوٹا مل گیا۔ گلو کا جی چاہا کہ اسے بھی اپنی خوشی میں شریک کرلے پھر یہ سوچ کر چپ ہوگیا کہ پہلا حق امام دین کا ہے۔ اس کا' جو اس کی ہر تکلیف اور ہر دکھ میں شریک رہا تھا۔ جس نے ہر برے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ گیراج میں داخل ہوا تو اسے پتا چلا کہ امام دین جاچکا ہے۔

"کہاں.......... کہاں گیا ہے' گھر؟" اس نے ملازم لڑکے شرافت سے پوچھا۔ امام دین جہاں بھی جاتا تھا' شرافت علی کو بتا کر اور ہدایات دے کر جاتا تھا۔

"گلو بھائی! گیا تو وہ گھر ہی ہے پر.........." وہ جھجک کر چپ ہوگیا۔

"پر کیا؟"

"پر کہہ گیا ہے کہ تم آؤ تو یہیں انتظار کرو۔"

"کب تک؟"

"یہ تو نہیں بتایا' بس کہا تھا کہ گلو بھائی آئے تو اسے بٹھا لینا اور یہ بھی کہا تھا کہ اسے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" گلو نے کاندھے اچکائے۔ اب اسے ٹیکسی لے کر نکلنے اور رات کو خان آفریدی کو پیسے دینے کی بھی فکر نہیں تھی۔ گھر جاتا تو چاچا دماغ کھالیتا اور پھر وہ امام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دین کو خوشخبری سنائے بغیر گھر جاتا کیسے؟ وہ وہیں بنچ پر بیٹھ گیا۔ شرافت نے دور پڑی چار پائی لاکر سائے میں بچھا دی۔ گلو اس پر چت لیٹ گیا۔

☆==========☆==========☆

امام دین گاڑی سے فارغ ہوتے ہی گلی کے نائی کے پاس پہنچ گیا۔ بال تو تھے نہیں کہ کٹواتا' سر پر تو باریک گھاس سی اگی نظر آتی تھی البتہ شیو بنوانا ضروری تھا۔ اس سے شیو بنوائی' گرم گرم پانی سے نہایا۔ کئی دن پہلے اس نے سفید شلوار قمیض کو کلف لگوا کر دھلوایا تھا کہ کہیں خاص جگہ جاتے ہوئے پہنے گا۔ وہ جوڑا گیراج میں ہی بکسے میں رکھا تھا۔ وہ ساتھ لے گیا تھا' وہ پہنا۔ جوتے صبح ہی پالش کے لئے دے چکا تھا۔ اس کی تھیلی بھی ساتھ تھی۔ اس نے اپنے میلے' اتارے ہوئے کپڑے اور چپل تھیلے میں ڈال کر نائی کے پاس امانت رکھوا دیئے کہ واپسی پر لے لے گا۔

یہ وہی نائی تھا جس نے ہوٹل والے سے شرط ہار جانے کے جرم میں امام دین کو گنجا کیا تھا۔ جب امام دین نے بڑے سے آئینے میں اپنے آپ کو ہر زاویے سے دیکھا اور پھر عطر کی شیشی پر لگی پھریری کان کی لو میں پھنسالی تو اس نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"ہوں............ کیا ہے بے؟" امام دین نے جھینپ کر اسے دیکھا۔

"بڑا ہی چکر لگ رہا ہے کوئی۔" نائی نے ہنستے ہوئے کہا اور رسی پر گیلے تولیے لٹکانے لگا۔

"کیسا چکر؟" امام دین نے انجان بننے کی اداکاری کی۔

"اچھا............ ہمیں ہی چکر دے رہے ہو۔ ہم نے ہی دلھا بنایا ہے۔" وہ زور سے ہنسا تو امام دین چکنے سر پر ہاتھ پھیرتا اور جھینپتا ہوا باہر نکل گیا۔

"واپسی پر میٹھا لیتے آئیو۔" نائی نے ہانک لگائی۔

امام دین نے ہنس کر ٹیکسی اسٹارٹ کردی' ہاتھ ہلایا اور دل ہی دل میں کہا۔

"ابے پوری گلی کو مٹھائی کھلاؤں گا سالے اور مٹھائی بھی کوئی ایسی ویسی!! اصلی گھی کے لڈو' میوے والے۔"

گیراج والی گلی سے نکلتے نکلتے اس نے آئینے میں سے گلو کی ٹیکسی کو گیراج پر رکتے دیکھ لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا اس لئے وہ شرافت سے کہہ آیا تھا کہ اسے بٹھا لے۔

اگر نازاں والا چکر آج نہ ہوگیا ہوتا تو اس کی خوشی ایسی روکھی پھیکی نہ ہوگئی ہوتی۔ گلو کو دیکھتے ہی اس کا دل نہ بجھ گیا ہوتا بلکہ وہ تو اسے ساتھ ہی لئے چلتا۔ ٹیکسی میں بٹھا دیتا۔ جب زیبی سب کچھ کہہ دیتی' جب وہ بھی اس کا میدے ایسا ہاتھ تھام کر اپنے دل کے تمام زخم دکھا چکا ہوتا' جب وہ دونوں ایک دوسرے سے کہنے اور نہ کہنے کی اذیت برداشت کر چکے ہوتے اور شادی کی بات طے کر رہے ہوتے تو............ تو وہ زیبی سے اجازت لے کر گلو کو بھی اندر لے جاتا اور تب وہ تینوں ہی مل کر خوشیاں مناتے۔

"مگر کیسے............؟" امام دین کی نگاہوں میں نازاں کا چہرہ گھومنے لگا۔ "کیسے مناتا وہ خوشیاں؟ گلو تو شاید منا بھی لیتا کہ اسے تو پتا ہی نہیں کہ نازاں کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا اور اگر اسے پتا چل گیا تو وہ تو واقعی اسے دھکے دے کر نکال دے گا' حالانکہ اس کے ملنے اور زخمی ہونے کی اطلاع سن کر گلو پر جو بیتی تھی' اس نے اسے کچھ ڈھارس ضرور دی تھی۔ اسے یہ جان کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ وہ بے حس نہیں ہے اور امید بھی بندھ گئی تھی کہ اب وہ ایسی بے حسی کا مظاہرہ پھر کبھی نہیں کرے گا لیکن............ اب............ جو کچھ سامنے آیا تھا اسے دیکھ کر امام دین کے لئے یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں تھا کہ گلو اسے ایک پل بھی دیکھنا تک گوارا نہ کرے گا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے گھر کی گلی کے بالکل قریب پہنچ چکا ہے اور یہ بھی خیال آیا کہ وہ دلھا بن کر یہاں کیوں آیا ہے؟ اس نے ذہن سے نازاں کے تصور کو کھرچ کر پھینکنا چاہا لیکن اسے ایسا لگا جیسے دل کے اندر کہیں ایک چبھن سی جو موجود ہے' وہ یونہی موجود رہے گی۔

اس نے سوچا۔ "ماے یار! تھوڑی دیر کے لئے تو دنیا کے غم بھلا نہیں سکتا؟ آج کا دن تو تیرے اپنے دکھ درد بھی بھلا دینے کا ہے۔ آج............ آج............" اور پھر اچانک کسی خیال کے تحت وہ ایک دم اچھل پڑا۔ "ابے یار............ شرط نہیں لگائی۔" اس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں سخت تاسف تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ اس موقع پر گلو سے شرط لگا لیتا تو آج ہی اس کی چندیا صاف کروا سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج جیت اس کی ہے۔ آج اتنے اہم موقع پر وہ شرط لگائے بغیر ہی چلا آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ٹیکسی کو ہوائی جہاز کی اسپیڈ سے بھگا کر گیراج پہنچے' گلو سے شرط لگائے اور لوٹ آئے مگر دروازے پر ٹیکسی کے رکتے ہی دروازے کی چٹخنی کے گرنے کی آواز نے اسے ساکت کر دیا۔

وہ زیبی تھی اور دروازہ کھولے بڑی حیرت سے امام دین کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے اب سے پہلے اسے یوں لشکارے مارتا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے اترتے ہی گلاب کے عطر کی تیز خوشبو نے زیبی کو چونکا دیا تھا اور جب امام دین نے ایک پیر ٹیکسی سے نکال کر زمین پر رکھا تو چمچماتے جوتے پر پڑنے والی سورج کی آخری کرنوں نے اسے بھی جگمگا دیا پھر وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس نے کتنی ہی بار اسے میلا اور گندا دیکھ کر سوچا تھا کہ ٹوک دے مگر صرف یہ سوچ کر چپ ہو گئی کہ اسے کیا؟ وہ کون ہوتی ہے اس کے معاملے میں بولنے والی۔ وہ صاف رہے یا گندا اور جو کبھی یہ حق اس نے اپنا سمجھ کر اسے بھی کسی بات پر ٹوک دیا تو........ تو کیا وہ برداشت کر پائے گی؟ اس نے ہر بار خود سے یہ سوال کیا تھا اور جواب نفی میں سن کر اس نے ہمیشہ کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسے تو یوں بھی کسی کے معاملے میں بولنے کا کبھی کوئی شوق نہیں رہا تھا۔

لیکن آج امام دین کو اس حلیے میں دیکھ کر جہاں حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا' وہاں خوشی بھی ہوئی تھی کہ وہ دنیا میں رہنے کا ڈھنگ' آہستہ آہستہ ہی سہی مگر سیکھتا جا رہا ہے۔

"آؤ........" اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور خود دو قدم اندر چلی گئی۔

امام دین جھجکتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کے کلف لگے کپڑوں سے عجیب کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ خوشبوؤں کی لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ زیبی کو ہنسی آنے لگی مگر وہ سنجیدہ ہی رہی۔ جو کچھ وہ کہنے والی تھی' اس کے لئے سنجیدہ رہنا بہت ضروری تھا ورنہ امام دین اس کی بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتا۔ وہ اس کی طبیعت سے خوب واقف تھی۔ وہ ہمیشہ ہر سنجیدہ بات پر شرط لگا کر ہارا کرتا تھا اور ہر مذاق کی بات کو

سنجیدگی سے لے کر لڑا کرتا تھا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی باتیں سن کر وہ اسے مذاق سمجھے۔ اس نے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کیا تھا۔ وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ جس خوف نے اسے ہمیشہ جکڑے رکھا تھا' جس خوف نے امام دین کے قدموں کی ہر آہٹ کے ساتھ اس کے اندر اپنے نوکیلے پنجے گاڑے تھے' آج وہ اس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ ایسا جان جانے پر وہ اس سے لڑے گا یا پھر........ پھر پتا نہیں کیا کرے؟ زیبی نے اکثر اسے آپے سے باہر ہوتے بھی دیکھا تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ منحنی سے بدن والے لاغر سے امام دین پر' بڑا بدمعاش بننے کا بھوت بچپن ہی سے سوار تھا اس لئے کبھی کبھی وہ بھول جاتا تھا کہ وہ خود کیا ہے؟ بڑے سے بڑے پنگے میں یوں کود پڑتا کہ پھر جان بچانی مشکل ہو جاتی۔

یہاں کوئی ایسا تو نہیں تھا جس سے جھگڑ پڑنے پر اسے اپنی جان کا خطرہ ہو مگر زیبی چاہتی تھی کہ تعلقات کی وہ قسم جو ان دونوں کو ایک دوسرے کی عزت اور احترام پر مجبور کرتی آئی ہے' برقرار رہے۔ اگر وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے ایسی کوئی بات کہہ دی جو وہ سننا نہیں چاہتی تو اسے اپنی کرچیاں سمیٹنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک ذرا سی بات ہی اسے بکھیرنے کو کافی ہو گی۔ آج تک وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ذات کے ٹکڑوں کو یوں سمیٹے بیٹھی تھی جیسے اس نے کسی آئینے کے بہت سے ٹکڑوں کو ٹیپ سے چپکا رکھا ہو۔ ہر حصہ اسی ٹیپ سے لٹکا جھول رہا تھا۔ ایک ذرا سی ٹھیس ہی انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کو کافی ہوتی۔

اچانک امام دین ہولے سے کھانسا۔ شاید وہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

"اوہ........ بیٹھو!" وہ چونکی۔ اس نے شام ہی سے اس ملاقات کا اہتمام کر لیا تھا۔

"ہاں........ تم........ تم بھی بیٹھو۔" امام دین جلدی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے ایک نگاہ امام دین کو دیکھا۔ اسے لگا تھا جیسے امام دین کی آواز بھرا رہی ہو۔ وہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ان دونوں کے درمیان چوکور میز حائل تھی۔ امام دین یوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اکڑا ہوا بیٹھا تھا جیسے کپڑوں کے ساتھ خود اسے بھی کلف لگا ہوا ہو۔ بیٹھتے ہوئے بھی ا نے بڑی احتیاط سے قمیض کا پچھلا دامن اٹھالیا تھا کہ استری خراب نہ ہو جائے۔

امام دین کو لگا جیسے کسی نے ان دونوں کے درمیان ایک بہت اونچی سی دیوار بنا ہے۔ جہاں سے وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ تو سکتے ہیں مگر ایک دوسرے کی بات نہ سن سکتے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے زیبی باتیں کر رہی ہے' اظہار محبت کر رہی ہے' شکوہ رہی ہے کہ اتنے برس تک اس نے اس کی تنہائی کو محسوس کیوں نہیں کیا؟ ہاتھ بڑھا اسے سہارا کیوں نہیں دیا؟ کیوں نہیں پوچھا کہ سردیوں کی ٹھنڈی یخ راتوں میں وہ ا کیسے سوتی رہی' کیسے گرمیوں کی لمبی راتوں کو کاٹتی رہی' کیسے ساون بھادوں گزرا اور ک طرح یوں اکیلی کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح پھرتی رہی؟ وہ سب کچھ کہہ رہی ہے اور ا بھی اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا ہے اور جب وہ اسے بتانے لگا کہ وہ بھی کب سے ا سے کچھ کہنے کی ہمت کر رہا تھا مگر کہہ نہیں پارہا تھا' تب بھی وہ یوں بیٹھی ناخن کھرچتی ر جیسے اسے کچھ بھی سنائی نہ دے رہا ہو۔ اس نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ پل پل آنے والا خیال' جو زیبی کی ذات سے شروع ہو کر اسی کی ذات پر ختم ہوتا تھا اور یہ کہ اسے اس گ میں آکر کتنا اچھا لگتا ہے۔ یہ بھی کہ اس کا سلیقہ دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ بہ جلد جنت میں زندگی گزارنے والا ہے۔

مگر وہ یونہی بیٹھی تھی' جیسے کچھ نہ سنا ہو' کچھ بھی نہ کہا ہو۔ امام دین کو اچانک گھر میں پھیلی گہری خاموشی کا احساس ہوا۔ "تم.......... بیٹھو.......... میں چائے لا ہوں۔"

گہری خاموشی جس چھناکے کے ساتھ ٹوٹی تھی' اس کے شور نے امام دین شدت سے احساس دلا دیا کہ وہ دونوں بولے ہی کب تھے؟ اور زیاں کا احساس اسے بُ بے اعتماد کر گیا۔ اس نے اتنا کچھ کہا تھا مگر کچھ بھی نہ کہا۔ اتنی ہمت جو جمع کی تھی۔ اا قدر حوصلہ جو اسے پُراعتماد کر گیا تھا' سب ختم ہوگیا پھر وہی کیفیت جو ہمیشہ ہوتی تھی' ٹو پھوٹ کر بکھر جانے والی' عجیب سا خوف جیسے وہ کچھ بھی کہے گا تو وہ پل بھر میں اسے ذلیل کرکے نکال دے گی۔ ہنسے گی' طنز کرے گی اور پوچھ لے گی کہ تو کون ہوتا ہے یہ سب

کہنے یا سوچنے والا۔

اور اسے لگا جیسے اس کا اپنا ہی نہیں' کپڑوں کا کلف بھی یوں نکل گیا ہو جیسے کسی نے اسے تیز آبشار کے نیچے کھڑا کر دیا ہو جہاں کھڑے ہوتے ہوتے ہوئے وہ بری طرح ڈگمگا رہا ہو اور گر کر بالکل ٹوٹ پھوٹ جانے کا خوف گرنے بھی نہ دے رہا ہو۔

وہ کب اٹھی اور کب باورچی خانے میں چلی گئی' اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اس کے قدموں کی کوئی چاپ ہی نہ ہوئی' جیسے وہ زمین پر چلی ہی نہ ہو مگر جب وہ چائے لے کر لوٹی تو اس کے قدموں کی دھمک سے امام دین کی کنپٹیاں گونج رہی تھیں۔ پتا نہیں اس نے زیبی کے جانے کو اس طرح کیوں محسوس نہیں کیا اور اس کا آنا.......... یوں دھماکے کیوں کر رہا تھا؟

امام دین ایک دم گھبرا گیا۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ جی چاہا اٹھ کر بھاگ جائے تبھی اسے یاد آیا کہ آج زیبی نے اسے بلایا تھا' اسے اس سے کوئی بات کرنا تھی اور جو اہتمام اس نے کیا تھا' اس سے اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا سارا خوف نکل جائے گا۔ وہ دوسرے ہی پل پُرسکون ہوگیا۔ اس کا اعتماد پھر بحال ہونے لگا۔ کپڑوں پر لگے کلف اور چمکتے ہوئے جوتوں نے اسے پھر اپنے بل پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس نے سر کو جھٹک کر دیکھا' وہ قریب آچکی تھی۔ چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ میں تھی۔ ٹرے میں خوبصورت نازک سے کانچ کے کپ اور چائے دانی رکھی تھی۔ وہ دھیرے سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چینی کتنی پیو گے؟" اس نے شکر دان کھول کر اس کی جانب دیکھا۔

"دو چمچے۔" اس نے پہلی بار خشک لبوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔

وہ کپ میں چینی ڈالنے لگی اور امام دین حیرت سے سوچنے لگا کہ اب سے پہلے تو اس نے کبھی یہ سوال نہیں کیا تھا۔ ہمیشہ مناسب میٹھی چائے دی تھی۔ اسے کبھی بھی چینی کم یا زیادہ نہیں لگی تھی پھر.......... پھر آج اس نے یہ کیوں پوچھا؟ کل تو نہیں پوچھا تھا۔

"ماسے!" اس کی آواز امام دین کو گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔ "یہ پل میری زندگی میں کبھی نہ کبھی تو آنا تھا۔" اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹیک کر آنکھیں موند لیں مگر دوسرے ہی لمحے چونک کر کھول دیں۔ آسمان پر اکیلا پرندہ بڑھتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندھیرے سے ہراساں ہو کر بے چینی سے ادھر ادھر اڑتا پھر رہا تھا۔

"ہاں.......... زیبی..........!" امام دین نے پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ سب کے ساتھ.......... زندگی جب.......... آگے بڑھتی ہے تو کبھی اس کی رفتار کم اور کبھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو پلک میں کچرا بھی آجاتا ہے۔ اگر اسے نکال دیا جائے تو.........." اس نے اپنی دانست میں بہترین ڈائیلاگ بولا تھا۔

زیبی نے سر جھٹک کر اسے دیکھا۔ امام دین کو لگا جیسے اس کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے اس کے حلق میں بھڑک اٹھے ہوں' زبان جل گئی ہو اور ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم گئی ہوں۔ جملہ اس کے حلق میں ہی بھسم ہو گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اسے دیکھے گیا۔ وہ کچھ بولی نہیں بس چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ جب اس نے آنکھیں امام دین کے چہرے سے ہٹالیں تو جیسے آنچ کم ہو گئی۔

"میں.......... میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ وقت آئے جب میرا یہ آخری ٹھکانا بھی ختم ہو مگر.......... مگر کب تک؟ مجھے احساس ہوا.......... کل رات' جب تم شاید بے خیالی میں اپنے گھر کے دروازے پر آ گئے یا.......... یا جب تمہیں باہر خطرہ محسوس ہوا تو.......... تب میں نے سوچا کہ خطرہ باہر محسوس ہو تو آدمی گھر کی طرف بھاگتا ہے۔ تم اگر یہاں آئے تھے تو.......... تمہیں حق تھا' کیونکہ یہ تمہارا گھر ہے۔ تم نے اسے ایسے ہی موقعوں کے لئے بنایا ہو گا.......... بلکہ گھر تو آدمی رہنے کے لئے بناتا ہے' ہمیشہ رہنے کے لئے' ہاں.......... تم جیسا کوئی بڑے دل کا ہو' اپنے گھر کو کسی اور کی پناہ گاہ میں بدل دے تب بھی.......... کبھی نہ کبھی اسے گھر کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ بالکل ایسے جیسے تمہیں پڑ گئی اور.......... تبھی میں نے محسوس کیا کہ مجھے ایسا کوئی حق حاصل نہیں کہ میں تمہارے بنائے ہوئے گھر کو محض اپنی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کروں اور جب تم یہاں آؤ تو.......... خطرہ محسوس کروں.......... تم سے.......... تم.......... جس نے مجھے پناہ دی' جس نے باہر منہ کھولے کھڑے ہزاروں خطرات سے بچا کر مجھے پناہ دی۔ تم سے ڈرنے لگوں۔ تمہیں اپنے لئے خطرہ محسوس کروں۔ کیسی کمینگی ہے میرے اندر' کس قدر خود غرض اور.......... اور خبیث ہوں میں.......... مجھے.......... مجھے اس گھر کو گھر ہی رہنے دینا

چاہیے۔ پناہ گاہیں تو بدلتی رہتی ہیں مگر گھر.......... گھر تو ایک ہی دفعہ بنتا ہے۔"

اس نے خلا پر جمی ہوئی نگاہوں کو امام دین کے چہرے چپکا دیا' جو اب کافی وحشت زدہ نظر آ رہا تھا۔ یوں جیسے زیبی بڑی خطرناک باتیں کر رہی ہو۔ ایسی باتیں جن کی امام دین کو کوئی توقع نہیں تھی حالانکہ اس کی سمجھ میں ساری باتیں آ رہی تھیں مگر چہرے پر اڑتی ہوائیاں دیکھ کر زیبی چونک اٹھی۔ کچھ بولی نہیں' چند لمحے اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے ٹیبل پر رکھے چائے کے کپ کو دیکھنا شروع کر دیا جس میں بھری چائے بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

"یہ گھر ہے ماے.......... اور.......... اسے گھر ہی رہنا چاہیے۔" اس نے یہ جملہ کہتے کہتے آنکھیں موند لیں۔

آسمان سے برسا سرمئی پن اب سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ صحن میں پھیلا اندھیرا زیبی کے آدھے چہرے کو چھپا چکا تھا۔ امام دین کا جی چاہا کہ وہ اپنے چاروں طرف اور زیبی کے چاروں طرف اور اس کے بالکل سامنے بہت سی موم بتیاں روشن کر دے تاکہ سارا اندھیرا ایک لخت ختم ہو جائے۔ اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں اور یہ سارا گھر ہی جگمگا اٹھے۔ اسے بتائے کہ وہ بھی تو یہی چاہتا ہے کہ وہ اسے پناہ گاہ کی بجائے گھر میں تبدیل کر دے۔ ایسا گھر جہاں کسی کے آنے کے باوجود کوئی خطرہ نہ رہے اور اس کے آنے سے تو اسے تحفظ کا احساس ہو۔

"ہاں.......... ہاں زیبی.......... میں' میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں نے یہ گھر' گھر بسانے کے لئے ہی تو بنایا تھا۔ تم نے اسے پناہ گاہ بنا ڈالا اور بھی صرف اپنی پناہ گاہ.......... یہ تو میری پناہ گاہ بھی ہونا چاہیئے تھا اور میں.......... میں نے گیراج میں پناہ.........."

"بس.......... بس ماے!" اس نے چیخ کر اس کی بات کاٹ دی۔ "میں.......... مجھے افسوس ہے ماے.......... میں بہت خود غرض تھی اور ہوں۔ میں نے یہ نہیں سوچا کہ میں جس گھر کو اپنی پناہ گاہ بنا رہی ہوں اس میں بسنے والا' گھر کے ہوتے ہوئے بھی گیراج میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا ہے۔" وہ کہتے کہتے رو پڑی۔ "مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو ماے۔" اس نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین نے چاہا کہ وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام لے' اسے سینے سے لگا لے۔ کہہ دے کہ بس اب رونا مت' جتنا بھی رونا تھا' رولیا۔ اب ہمارے برے دن ڈھل چکے ہیں۔ اب کل سویرے نکلنے والا سورج ہمارے اندر جو طاقت' جو توانائی بھرے گا اس سے ہم ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔

اس کے ہر آنسو میں امام دین کا دل ٹکڑے ہو ہو کر بہنے لگا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں کی طرف بڑھائے' عین اسی لمحے اس نے ہاتھ ہٹا لئے۔ امام دین نے چونک کر دیکھا مگر وہ تو اب دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کر رہی تھی۔ اس نے تو محسوس ہی نہیں کیا تھا کہ امام دین کیا کرنے اور کیا کہنے والا تھا۔ وہ جو امام دین نے ہمت باندھی تھی پھر ٹوٹ گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی اور امام دین پھر اپنی ہمت باندھ رہا تھا۔

آج وہ اس کے دل کا ہر خوف نکال دینا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ جسے وہ اپنی پناہ گاہ سمجھ رہی ہے' وہ اس کا اپنا گھر ہے۔ وہ گھر جہاں اب اسے تمام عمر رہنا ہے' اسی گھر کو جنت بنانا ہے۔ بس فرق تو صرف اتنا پڑنا ہے کہ وہ اپنی پناہ گاہ کو چھوڑ کر اپنے گھر میں رہنے لگے۔

"زیبی!" تم اب تک جو کچھ بھی سوچتی رہی ہو سب غلط تھا۔ تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔" اس نے تھوک نگل کر پھر بولنا چاہا مگر زیبی نے حسب عادت اس کی بات کاٹ دی۔

"اس کی میں تم سے معافی مانگ رہی ہوں ماے! مجھے واقعی یہ سب نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ مجھے.......... میں جو آج تک اپنی آنکھوں میں ایک ایسے آدمی کے خواب سجائے بیٹھی رہی.......... جس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ میں نے جو تصوراتی دنیا بسائی' تو اس میں ایسی گم ہو کر رہ گئی کہ اسے ایک سائے کی طرح ہر وقت اپنے ساتھ محسوس کرتی رہی اور تمہارے گھر کو.......... تمہارے گھر کو صرف اور صرف اپنی پناہ گاہ تصور کرتی رہی۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ.......... تمہارا حق ہے۔"

امام دین کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر ناچنے لگے۔ وہ خود تسلیم کر رہی تھی کہ یہ اسی کا

حق تھا۔ مگر.......... وہ .... آدمی..........؟ اس کا سایہ؟ وہ سوچ کر چونک اٹھا مگر بہت جلد اس کی سمجھ میں آگیا وہ اسی کو کب اتنا جانتی تھی؟ وہ خود بھی تو اس کے لئے اجنبی ہی تھا۔ صرف اسے روٹی کپڑا اور ٹھکانا دینے سے وہ اس کا اپنا تو نہیں ہو گیا تھا اور.......... اور وہ تصور ہی تصور میں میرے سائے کو اپنا بیٹھی.......... کاش میں نے یہ سب کچھ محسوس کر لیا ہوتا!

"آج.......... آج تو تم نے مان لیا ناں کہ یہ.......... یہ میرا حق تھا؟" اس نے دھیرے سے کہا۔ "اب.......... یہ میرا حق مجھے دے دو۔" اور امام دین اتنا ہی کہہ کر بے دم ہو گیا جیسے ساری توانائیاں ان دو جملوں میں گندھ کر فضا میں بکھر گئی ہوں۔

"ہاں ماے..........؟ آج میں نے تمہیں اسی لئے بلایا ہے۔ آج میں یہاں کا قبضہ چھوڑ دوں گی۔ دوسرے کی جگہ کو ہتھیانے والی عادت میرے بچپن کی ہے۔ میں نے بچپن میں بھی ایک شخص کی جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ قبضہ کر بھی لیا تھا مگر.......... مگر اس نے بھی بالکل تمہاری طرح' اسی طرح آکر مجھے نہ صرف یہ احساس دلایا تھا کہ یہ جگہ اس کی ہے بلکہ اس نے تو مجھے اسی وقت وہاں سے بھگا بھی دیا تھا۔ میں تب سے پناہ گاہ کی تلاش میں تھی۔ مجھے اس کا یوں وہاں سے بھگا دینا اچھا نہیں لگا تھا۔ میرا دل دکھ گیا تھا۔ میں وہاں سے دور جا کر بہت روئی تھی۔ میں نے اسے دل ہی دل میں بہت برا بھلا بھی کہا تھا۔ میرا یہ بھی جی چاہا تھا کہ میں.......... میں اس کا منہ نوچ لوں مگر میں ایسا نہیں کر سکی تھی۔ شاید تبھی سے یہ خوف میرے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ مجھے کوئی بھی.......... کہیں سے بھی نکال سکتا ہے اور.......... اور جب کل رات تم آئے تو' مجھے پھر وہی یاد آگیا جو مجھے اپنی جگہ سے بھگا کر بھی خود میرے دل میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ بچپن سے آج تک میں.......... میں اسے بھلا نہیں سکی۔ اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں' اس کے چہرے کے تاثرات سب.......... سب کچھ اس طرح میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا کہ میں اس اجنبی ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھی اور.......... اور آج تک اسی کے سائے کے ساتھ رہ رہی ہوں مگر آج میں تمہارا گھر چھوڑ رہی ہوں تم.......... تم یہاں واپس آسکتے ہو۔ میں اپنے اس خوبصورت تصور کے ساتھ کہیں بھی رہ لوں گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کک.......... کیا کہہ رہی ہو تم؟" امام جب سمجھا تو بوکھلا اٹھا۔

"میں جارہی ہوں۔"

"نہیں.......... تم.......... کہیں نہیں جارہیں۔ زیبی.......... دیکھو!" امام دین میں جانے کہاں سے اتنی قوت آگئی کہ اس نے زیبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "دیکھو! میں یہی بتانا چاہتا تھا کہ یہ گھر میرا اور.......... تمہارا' دونوں کا ہے۔ یہ گھر تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ تم اسے "پناہ گاہ" کیوں سمجھ رہی ہو۔ اگر.......... اگر میں اور تم.......... ایک ہو جائیں تو.......... خطرہ نہ باہر رہے گا اور نہ اندر۔"

"امام دین!" وہ ایک دم چیخ اٹھی۔

اور امام دین سناٹے میں رہ گیا۔

"یہ تم نے کب اور کیسے سوچ لیا کہ میں اور تم.......... ایک بھی ہو سکتے ہیں؟ ابھی ابھی میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میں اس شخص کو چاہتی ہوں جس کا سایہ ہر وقت میں خود سے قریب پاتی ہوں اور جب کوئی کسی کا سایہ ہر لحہ اپنے قریب پاتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اس سے جدائی کا تصور تک نہیں کر سکتا تم نے ایسا سوچنے کی ہمت کیسے کی؟ اگر میں تمہارے گھر میں رہتی ہوں تو.......... تو کیا یہ سوچنا تمہارا حق ہو گیا؟ یا تم مجھے.......... میری بے بسی کو بلیک میل کر رہے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں یہاں سے جانے کی بجائے محض اس چار دیواری کی وجہ سے اپنا سودا کرلوں گی؟ اپنی ذات کا' اپنے کردار کا سودا؟"

"نہیں.......... نہیں.......... نہیں' میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو.......... میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی میری طرح.......... میرا مطلب ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو اور آج تم نے یہی کہنے کے لئے.........."

"بکواس بند کرو۔" وہ ایک دم چیخ اٹھی۔ "اگر تم نے مجھے پناہ دی ہے تو کیا تم سے محبت کرنا میرا فرض تھا؟"

"نہیں.......... نہیں زیبی خدا کے واسطے ایسا مت سوچو! ٹھیک ہے۔ میری غلطی تھی.......... میں.......... میں ایسا سوچ رہا تھا کہ تم.......... جب میں نے دیکھا کہ تم نے

لوگوں کی باتوں کا'.......... میرے جھوٹ بولنے کا.......... برا نہیں مانا تو مجھے غلط فہمی ہو گئی مگر زیبی جو کچھ میں نے بے غرض ہو کر کیا تھا اسے تو الزام مت دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد.......... کبھی.......... کبھی بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

امام دین کو زیادہ دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ زیبی اس کی نیک نیتی پر شک کر رہی تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "اسے اپنا.......... اپنا گھر سمجھو زیبی! اس پر.......... میرا کوئی حق نہیں اور اگر میری کسی بات سے تمہیں دکھ پہنچا ہو تو.......... تو مجھے معاف کر دینا۔"

وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے ایسا لگا جیسے اگر وہ فوراً ہی گھر سے باہر نہ چلا گیا تو جانے کیا ہو جائے گا مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلتا' اسے زیبی کی آواز سنائی دی۔ وہ ایک دم ہی بلک بلک کر رونے لگی تھی۔ زمین نے جیسے اس کے قدم پکڑ لئے۔ اس نے دیوار کو تھام لیا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے۔ اس نے چاہا کہ وہ اس آواز پر دھیان دیئے بغیر باہر نکل جائے مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ وہ اس بری طرح رو رہی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر چلے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے بنائے ہوئے سارے محل ٹوٹ چکے ہیں' وہ جسے اتنے عرصے چپکے چپکے چاہتا رہا' وہ کسی اور کو چاہتی ہے اور یہ علم ہو جانے کے بعد بھی کہ اس نے لوگوں کی باتیں صرف اس لئے برداشت کی تھیں کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

وہ پلٹ آیا۔ تھکے تھکے اور نڈھال قدموں سے۔ "زیبی! کیا.......... تم نے مجھے معاف نہیں کیا؟" وہ دھیرے سے بولا تھا۔

"ماے.......... ! میں اس لئے نہیں رو رہی۔ میں تو اس لئے رو رہی ہوں کہ.......... کہ تقدیر میرے ساتھ یہ کس قسم کا کھیل' کھیل رہی ہے؟ میری مجبوریاں دوسروں کو دھوکے میں کیوں مبتلا کرتی رہتی ہیں؟ میں.......... میں کتنی بری ہوں ماے.......... ! نہ چاہتے ہوئے بھی لوگ میری وجہ سے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ تم.......... بھی دھوکے میں رہے۔ میں اگر پہلے ہی تمہیں بتا دیتی تو.......... لیکن ماے! مجھے.......... مجھے معاف کر دینا۔ مجھے معاف کردو ماے اور مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں اب یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک پل نہیں رہ سکتی۔"

"زیبی! تو جسے چاہتی ہے.......... تجھے اس کی قسم' یہاں سے کہیں مت جانا.......... مجھے میرے ہی سامنے تو' تو نے شرمندہ کر ہی دیا ہے زیبی مگر.......... اللہ کے سامنے تو مجھے شرمندہ نہ کر.......... خدا کے واسطے.........."

بے اختیار امام دین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور زیبی ہکا بکا رہ گئی۔ وہ امام دین جیسے آدمی کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ رو بھی سکتا ہے! وہ اپنے بھرے گھر کے سیلاب میں بہہ جانے کا قصہ سناتے وقت بھی کبھی رنجیدہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو ماں کے ذکر پر افسردہ تک نہیں ہوتا تھا۔ وہ جو اتنے بڑے سانحے کو اس طرح بھول چکا تھا کہ اس سانحے سے متعلق اسے کوئی یاد بھی دکھی نہیں کرپاتی تھی۔ وہ اس کے گھر چھوڑ دینے کا سن کر رو رہا تھا۔ وہ اپنا رونا دھونا بھول گئی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ کتنی بڑی غلطی کی مرتکب ہوئی ہے۔

"ٹھیک ہے.......... ٹھیک ہے ماہے! میں.......... میں کہیں نہیں جاؤں گی لیکن یہ گھر.......... یہ گھر تمہارا ہے میری حیثیت مہمان کی سی ہوگی۔ جب اور جہاں بھی مجھے ٹھکانہ مل گیا' میں چلی جاؤں گی مگر اس طرح نہیں.......... تم میرے محسن ہو امام دین.......... اس غلط فہمی میں اگر میرا قصور تھا تو.......... مجھے معاف کردو۔"

"بھول جاؤ سب کچھ.......... جیسے.......... جیسے میں یہاں آیا ہی نہیں.......... جیسے ہمارے درمیان کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔" امام دین نے ہتھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے کہا۔ پھر وہ رکا نہیں.......... اسے پتا تھا کہ اگر وہ لمحہ بھر بھی ٹھہرا تو اس کے اندر ٹھاٹھیں مارتا سمندر بے قابو ہو جائے گا اور پھر جانے زیبی کیا سوچے.......... کیا کرے؟

وہ کس طرح باہر آیا' کس طرح ٹیکسی میں بیٹھا اور کب اس نے ٹیکسی چلا دی' کچھ پتا نہیں چلا۔ جانے ایسی کیفیت میں اس نے ٹیکسی کیسے ڈرائیو کرلی؟ اچانک سامنے ایک گاڑی سڑک پر مڑی اور تیز روشنی سے امام دین کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

☆==========☆===========☆

گلو کو امام دین کا انتظار کرتے کرتے دو گھنٹے ہوگئے تھے۔ اتنی دیر بھی وہ چھوٹے

کے چکر میں ٹھہر گیا تھا۔ وہ باتونی اگر نہ ہوتا تو شاید وہ کب کا گھر چلا گیا ہوتا۔ وہ اپنی خوشی میں ماہے کو شریک کرنا چاہتا تھا مگر اس قدر بوریت کے بعد نہیں' اور یہ مسئلہ ایسا بھی نہ تھا جس کے لئے رات ہی ضروری ہو۔ وہ صبح بھی اسے اپنی شادی کی خبر سنا سکتا تھا اور امام دین بھی یقیناً" اسے ایسی ہی خوشی کی خبر سنانے والا تھا۔ وہ جوش و ولولہ جو یہاں آنے پر اس کے اندر تھا' اب دھیما پڑ گیا تھا اور جب نائی نے اسے دیکھتے ہی عادت کے مطابق نعرہ لگایا اور پھر بتایا کہ امام دین دلہا بن کر کہیں گیا ہے تو گلو ایک دم ہنس پڑا پھر جو اس نے تفصیل بتائی تو ہنستے ہنستے گلو کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تجھے پتا ہے وہ کہاں گیا ہے؟" چھوٹے نے گلو کو اس قدر مطمئن دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں! مجھے پتا ہے وہ کہاں گیا ہے۔" گلو نے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" چھوٹا کان آگے بڑھا کر بولا۔

"اپنی دلہن سے ملنے اور ایک راز کی بات بتاؤں؟ کان ادھر لا۔" گلو نے چھوٹے کا سر پکڑ کر اپنے قریب کیا۔ "میری اور امام دین کی شادی ایک ساتھ ہی ہو رہی ہے۔ آج اس کی تاریخ طے ہونا ہے اور.......... اور سویرے میری۔"

اور چھوٹے نے تو ٹرے بجا بجا کر ایک دم ہی لہرانا شروع کردیا۔

دیاں دا راجہ میرے بابل دا پیارا امڑی دے دل دا سہارا نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا.......... گھوڑی چڑھیانی سیو..........

"اچھا بس..........!" گلو نے ایک دم اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ابھی کسی کو نہیں بتانا ہے۔" اس نے سرگوشی کی۔

"کک.......... کیوں..........؟ کوئی چکر وکر ہے کیا؟" وہ ایک دم دبک گیا۔

"نہیں' لیکن ابھی کچھ نہیں بتانا۔ بس کہہ جو دیا۔" گلو اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ اب تو رات کے دس بجنے والے تھے۔ "یار! اب میں انتظار نہیں کرسکتا۔ ماما آئے تو کہنا کہ میں سویرے آؤں گا۔"

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔ ٹیکسی مین روڈ کی طرف موڑتے جانے اسے کیا خیال آیا کہ.......... وہ ماہے کے گھر کی طرف چل پڑا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا گھر گیراج سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ وہ جلد ہی اس سڑک پر پہنچ گیا جہاں سے بائیں جانے والی سڑک سے کچھ آگے جاکر اس کی گلی آتی تھی۔

ابھی گلو نے ٹیکسی ذیلی سڑک پر ڈالی ہی تھی کہ وہ چونک پڑا۔ بیچ سڑک پر امام دین کی ٹیکسی کھڑی تھی اور چاروں طرف بہت سے لوگ جمع تھے۔ اس کی ٹیکسی کی لائٹیں اگر سیدھی ٹیکسی کی نمبرپلیٹ پر نہ پڑی ہوتیں تو وہ دیکھتا بھی نہیں۔

"ماے............ ماے............" وہ چیختا ہوا ٹیکسی کنارے کھڑی کر کے اس طرف بھاگا۔ اسے دیکھ کر لوگ ایک طرف ہوگئے۔ وہ سب کو ہٹاتا ہوا ٹیکسی کے قریب پہنچا اور پھر اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔

اسٹیئرنگ پر سر ڈالے وہ امام دین تھا۔ شاید بے ہوش تھا۔ اس حالت میں دیکھ کر گلو کے تو ہوش اڑ گئے پھر بھی اس نے خود کو سنبھالا اور دھیرے سے اسے سیٹ پر لٹا دیا۔ اردگرد کھڑے لوگوں کی گفتگو سے تو یہ پتا چل گیا تھا کہ سامنے سے آنے والی گاڑی کے ڈرائیور نے اسے بروقت دیکھ لیا تھا۔ اس نے بھی صحیح وقت پر بریک لگا لیا ورنہ ایکسی ڈینٹ خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ ٹیکسی کو ہلکا سا دھچکا ضرور لگا تھا مگر یہ دھچکا ایسا نہیں تھا کہ اس سے امام دین بے ہوش ہو جاتا۔ گلو نے یوں بھی اسے اچھی طرح ٹٹول لیا تھا۔ وہ بظاہر ٹھیک تھا۔

"میاں دہشت بری چیز ہے۔ خوف زدہ ہوگیا ہے بس۔" ایک بڑے میاں نے گاڑی میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ہاتھ پاؤں سہلاؤ ٹھیک ہو جائے گا۔" طبیب دکھائی دینے والے بڑے میاں نے گلو سے کہا۔ پھر اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "قریب کی دکان سے نمک کی چٹکی بھر کر چٹا دو۔ پانی پلاؤ۔"

پتا نہیں کس نے سنا۔ وہ پانی اور چٹکی بھر نمک بھی لے آیا۔ گلو نے کسی نہ کسی طرح پانی کے چند قطروں کے ساتھ نمک پلا دیا۔ ہاتھ گیلا کر کے اس کے چہرے پر پھیرا تو اسے آنکھیں جھپکتے دیر نہ لگی۔

"کک............ کیا ہے............ کیا ہوگیا؟" وہ ایک دم ہی بوکھلا کر اٹھ بیٹھا پھر اپنے گرد لوگوں کو کھڑا دیکھ کر اور حواس باختہ ہوگیا۔ ٹیکسی کے عین سامنے کھڑی گاڑی کو دیکھتے

ہی اسے یاد آگیا کہ کیا ہوگیا تھا۔ موت سامنے نظر آئی تھی۔ وہ بھی زیبی کے ہاتھ میں تھمی مشعل کی صورت۔ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ گھپ اندھیروں میں زیبی مشعل تھامے اسے لوٹ آنے کو کہہ رہی ہے۔ وہ تو شاید ابھی سانسیں باقی تھیں ورنہ موت کے اور اس کے درمیان صرف بال برابر کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ کب اس کا پاؤں بریک پر پڑا اور جانے کب سامنے والے کو آنے والے لمحوں کی سنگینی کا احساس ہوا شاید عین اسی وقت جب امام دین کو ہوا تھا۔

"مگر مجھے کیا ہوا تھا؟" وہ اٹھتے ہوئے گلو سے بولا۔

"بے ہوش ہوگئے تھے۔" گلو نے اسے سہارا دینے کو ہاتھ آگے بڑھائے مگر اس نے جھٹک دیے۔

"مگر............ مجھے تو کہیں چوٹ نہیں آئی۔" وہ تیزی سے گاڑی سے باہر نکل آیا۔

"آپ بچ گئے۔ آپ رونگ سائیڈ پر آرہے تھے اگر میں نے اور آپ نے بھی بروقت بریک نہ لگا دیا ہوتا تو جانے کیا ہو جاتا۔" ایک پُروقار سے شخص نے آگے بڑھ کر امام دین کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

کچھ لوگ "سب ٹھیک ہے" دیکھ کر ادھر ادھر ہو چکے تھے۔ چند لوگ اب بھی یوں کھڑے تھے جیسے تماشا ابھی ختم نہ ہوا ہو۔ امام دین کو یاد آگیا تھا کہ وہ گھر سے نکلا تھا تو اس کا ذہن قطعی قابو میں نہیں تھا۔

"شکریہ جی............ میں............ میری طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ آپ کا بہت شکریہ۔" امام دین نے اس شخص کا ہاتھ تھام لیا۔

"کوئی بات نہیں مگر آپ احتیاط کیا کریں ورنہ............"

"بس جی اللہ بچانے والا ہے۔" گلو نے بات جلدی ختم کرنے کی کوشش میں کہا۔

"چلو تم میری ٹیکسی میں بیٹھو۔ میں تمہاری ٹیکسی گھر کے باہر کھڑی کر آتا ہوں۔ تمہیں گیراج پر چھوڑ دوں گا۔"

امام دین اس شخص سے مصافحہ کر کے گلو کی ٹیکسی میں آبیٹھا۔ گلو فوراً اس کی ٹیکسی لے کر گھر کی طرف چل پڑا جو یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ دروازے پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی کھڑی کرکے اسے خیال آیا کہ وہ زیبی کو بتادے کہ ٹیکسی یہاں کھڑی ہے۔ یہی سوچ کر وہ آگے بڑھا مگر پھر جانے کیا سوچ کر پلٹ گیا۔ اسے اپنی ٹیکسی تک پیدل ہی جانا تھا۔ وہ امام دین کو اس میں بٹھا آیا تھا اور اب تک اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ امام دین کو ہوا کیا تھا۔ وہ تو بڑا ماہر ڈرائیور تھا۔ اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ رانگ سائیڈ پر گاڑی چلائے گا۔ بس اسی پریشانی میں اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ زیبی کو بتانے یا نہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ سویرے امام دین خود ہی ٹیکسی لینے آتا تو بتادیتا۔

گلو خاصی تیز رفتاری سے ٹیکسی تک پہنچ گیا۔ امام دین نڈھال سا پشت سے سر ٹکائے ونڈاسکرین سے آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گلو کو آتا دیکھ لیا۔ اس دوران وہ سوچ چکا تھا کہ گلو کو اپنی اس پہلی اور آخری شکست کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ گو اس شکست نے اس کے سارے کے سارے وجود کو ملبے میں تبدیل کر دیا تھا مگر پھر بھی اسے خود کو سنبھالنا تھا۔ ان لوگوں کی خاطر جن کا کوئی نہ کوئی تعلق اس سے نکلتا تھا مگر اس وقت وہ بہت نڈھال تھا۔

اس نے تو جیسے ساری عمر سفر کیا تھا۔ منزل پانے کے لئے بے تکان بڑھتا چلا گیا۔ اس کی حالت اس مسافر کی سی تھی جو لق و دق صحرا میں دھوپ کی ساری شدتوں کو محض اس لئے برداشت کررہا ہو کہ دور سے نظر آنے والا نخلستان اس کا ہے اور جب اس نخلستان میں پہنچ کر اس نے سکون پانا چاہا تو پتا چلا کہ وہ تو کب کا آباد ہے۔ اس کے لئے تو قدم رکھنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ تمام عمر کے زیاں کا احساس اس کی نسوں میں درد بن کر دوڑنے لگا۔

گلو قریب پہنچ چکا تھا۔ امام دین نے خود کو بڑی تیزی سے سنبھالا۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ گلو اس کے بارے میں پریشان ہوگا۔ گلو نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر بیٹھ کر پہلے اس نے لائٹ جلا کر امام دین کو غور سے دیکھا۔

”کیا بات ہے ماے؟ سب ٹھیک ہے نا!“

امام دین کو یوں لگا جیسے وہ بغیر بتائے ہی سب کچھ جان گیا ہو اور ایسا ہی تو وہ نہیں چاہتا تھا۔ ”ہاں.......... سب ٹھیک ہے۔“ اس نے ہونٹوں کو یوں پھیلایا جیسے ہنسنے کی

کوشش کر رہا ہو۔ ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر اس نے اندر کی لائٹ بند کر دی ورنہ گلو اس کے چہرے پر درد کی وہ دراڑیں ضرور دیکھ لیتا جو اس کے وجود کی ٹوٹ پھوٹ کا ثبوت تھیں۔

”سر میں بہت درد ہے۔“ ماے نے اسے مزید تسلی دینے کو کہا۔

”مگر یہ ہوا کیا تھا؟“ گلو نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ درد کی وجہ سے بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا۔“ امام دین نے کسی ماہر ڈاکٹر کے سے انداز میں کہا۔ ”میں گھر سے گیراج جا رہا تھا۔ اچانک ہی پتا نہیں کیا ہوا۔ ساری دنیا گھوم گئی تھی۔ بڑی زور کا چکر آیا تھا۔ سامنے سے آنکھوں پر گاڑی کی لائٹ بھی پڑی تھی اور شاید لاشعوری طور پر میں نے بریک لگا دیا تھا ورنہ.......... ویسے اب سب ٹھیک ہے۔ آرام کروں گا تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔“

”ڈاکٹر کے پاس نہ چلیں۔ عباسی شہید۔“ گلو نے کہا۔

”نہیں، نہیں.......... اس کی ضرورت نہیں.......... اور ہاں.......... نازاں کے پاس گئے تھے؟ کیسی ہے وہ؟“

گلو بالکل بھول گیا کہ امام دین کی طبیعت خراب ہے اور ابھی ابھی وہ ایک بڑے حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا ہے۔ نازاں کا نام سنتے ہی جیسے وہ اندر سے باہر تک مہک اٹھا تھا۔ بھینی بھینی سی خوشبو اسے اپنے چاروں طرف محسوس ہوئی تھی۔ اسے اپنی اس کیفیت پر خود بھی حیرت ہوئی۔ اس نے تو کبھی نازاں کے لئے اب تک ایسا کچھ بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھی اسے کچھ بھی نہیں ہوا تھا جب وہ دونوں تمام رات جاگ کر باتیں کیا کرتے تھے اور اس وقت بھی نہیں جب نازاں اس سے بے سبب لڑ کر اس کے منائے جانے کا انتظار کیا کرتی تھی۔ تب تو صرف ایک ابال ہوا کرتا تھا اس میں اور پھر وہ معصوم سا چہرہ اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے نیچے آنسوؤں کی لکیریں اسے نازاں سے پرے کر دیا کرتی تھیں۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے؟“ امام دین اس کی خاموشی پر گھبرا اٹھا تھا۔ اس کا دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ایک انجانے سے خوف نے اس کے اندر کے کرب کو کہیں اسی کے پاتال میں اتار دیا تھا اور ایسا تو ہمیشہ ہی ہوا کرتا تھا۔ پتا نہیں کتنے پاتال تھے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے اندر۔ لاکھوں دکھوں کو اتار کر بھی نہیں بھرتے تھے۔ نازاں کے بھیانک راز کے فاش ہو جانے کے خوف نے اسے ایک دم ہی چوکنا کر دیا۔ اس کا جی چاہا کہ اب وہ لائٹ جلا کر گلو کے چہرے کو دیکھے تاکہ آنے والے لمحوں کی سنگینی کا اسے پورے طور پر احساس ہو سکے۔ مگر اس وقت اس کے سارے اندیشے جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ جب گلو کی آواز میں خوشی کی رم جھم کا احساس ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ پتا نہیں ڈاکٹر نے اسے گھر جانے کی اجازت کیوں نہیں دی؟"

"اوہ.......... ہاں.......... وہ!" امام دین اطمینان کا سانس بھرنے کے چکر میں کچھ بول ہی نہ سکا۔ "اچھا ہے.......... یہاں کچھ اور روز رہ لے گی تو دوا دارو ٹھیک سے ہو جائے گی۔ وہاں.......... وہاں اس کا خیال رکھنے والا کون ہے بھلا؟" آخری جملے تک پہنچتے پہنچتے اس کے لہجے میں طنز کے علاوہ ہلکا سا تجسس بھی تھا۔ جیسے وہ گلو کے آئندہ رویے کی طرف سے مشکوک ہو اور ابھی وضاحت چاہتا ہو۔

"نہیں خیر.......... چاچا کو تو جانتا ہے۔ پٹی سے لگا بیٹھا رہے گا۔ پتا نہیں اس کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں سے آجاتا ہے۔ اکیلا ہو تو بھر بھری دیوار جیسا ہوتا ہے اور.........."

"محبت آدمی کو جینے کے کئی ڈھب سکھا دیتی ہے گلو اور نفرت.......... نفرت آدمی کو تجھ جیسا بنا دیتی ہے۔ بے حس.......... پتھریلا اور.........."

"ایک بات بتاؤں ماے..........!" گلو کا انداز اور لہجہ اچانک تبدیل ہو گیا۔ "نفرت زندگی کی ٹھوس بنیاد ہوتی ہے اور آدمی کو مضبوط بنا دیتی ہے۔ ہر کسی سے ٹکرا جانے کا جذبہ کسی بزدل آدمی کے اندر پنپ ہی نہیں سکتا اور محبت.......... محبت بڑے بڑے سورما کو خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اسے ملبے کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ خود اپنے جذبات سنبھالنے کا یارا ابھی نہیں رہتا اس میں.......... جبکہ نفرت کرنے والا اپنی ہر سانس میں اپنے ایک مضبوط دشمن کا سارا وجود اٹھا کر اپنے اندر اتارنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔"

امام دین کو لگا جیسے گلو نے اسے ننگا کر دیا ہو۔ سچ عریاں کر دیتا ہے۔ آج یقین آگیا

تھا اسے۔ گلو جو کچھ کہہ رہا تھا اسے سمجھنے کے لئے امام دین کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑا اس کے اندر جس قدر ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی' ایسی ٹوٹ پھوٹ تو اس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ نہ گھر بھر کے سیلاب میں بہہ جانے کے بعد' نہ اسماعیل کے ساتھ جرائم کی دنیا میں پھنس جانے کے بعد اور نہ ہی اس وقت جب وہ بے یارو مددگار نیلے آسمان تلے ایک فٹ پاتھ کے کونے میں تنہا بیٹھا رہ گیا تھا۔ آنسو تب بھی اس کی آنکھوں میں نہ آیا تھا' نہ کبھی اس قدر بے قابو ہوا تھا کہ اپنا آپ تک بھلا بیٹھا ہو۔ بیچ سڑک پر چکرا جانے والا واقعہ محبت ہی کی سوغات تو تھی۔

اور پھر یہ کیا کم تھا کہ امام دین جیسا آدمی زیبی ایسی اکیلی عورت کی ایک بات سن کر ہی پسینے میں نہا گیا تھا۔ حلق خشک ہو گیا تھا اور جب اس نے کسی اور سے محبت کا اظہار کر دیا تھا تو اسے پہلی بار لگا جیسے وہ اکیلا رہ گیا ہو۔ اس قدر اکیلا کہ پہلے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ چپ کا چپ رہ گیا۔

"اور ہاں تجھے ایک خوش خبری سنانی ہے پر.......... پہلے تو بتا.......... زیبی کا کیا ہوا؟"

"زیبی!!" امام دین یوں بولا جیسے گلو نے کسی اجنبی عورت کا نام لیا ہو۔ ایک ایسی عورت کا جسے ماے نے نہ کبھی پہلے دیکھا ہو نہ جانا ہو' نہ ہی اس کا نام سنا ہو۔

"ہاں.......... تیری بات ہو گئی؟" وہ اس کی کیفیت سے لاتعلق بول رہا تھا۔

"اوہ.......... وہ.......... نہیں.......... وہ دراصل اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ ایک دم چونک کر سیدھا ہو گیا۔ "اور میں خود.......... میرے خود سر میں درد تھا۔ بات ہی نہیں ہوئی۔" وہ یوں دہراتا رہا جیسے گلو کو اطلاع نہ دے رہا ہو خود کو یقین دلا کر سہارا دے رہا ہو۔

"ارے یار.......... میں تو سوچ رہا تھا کہ.......... اچھا چائے پیئے گا؟" گلو نے اچانک بات بدل دی۔

"ہاں مگر ٹیکسی میں بیٹھ کر.......... گرو مندر لے لے.......... کافی پیئیں گے۔"

گلو نے گاڑی گرو مندر کی طرف موڑ لی۔ گیارہ بج چکے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ چاچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راہ دیکھ رہا ہوگا مگر امام دین کو اس حالت میں چھوڑنا اور وہ بھی نازاں کے اور اپنے بار۔ میں بتائے بغیر اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔ خوشی اس کے اندر اچھل رہی تھی۔ بنا بتائے اسے نیند ہی نہ آتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بات سن کر امام دین کو بہت زیادہ خوشی ہوگی تو نازاں کے حوالے سے ہوگی۔ وہ اس سے قبل بھی اسے اس کے اکیلے ہونے کا احساس دلا چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہاں کافی پیتے ہوئے بتانا اور اچھا لگے گا۔

ادھر امام دین سوچ رہا تھا کہ جب نازاں کے بارے میں اسے پتا چلے گا تو کیا ہوگا اور اگر وہ کچھ بھی پتا چلنے سے پہلے پھر کہیں غائب ہوگئی تو............ گلو کا تو خیر کچھ نہیں تھا مگر چاچا کو وہ جس قدر بے چین دیکھ چکا تھا' اس کی طرف سے اسے سخت تشویش تھی۔ اس بار............ تو بڈھا شاید مر ہی جائے۔ کاغذ چننے والوں کی طرح محبتیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ کاش! نازاں کوئی ایسا فیصلہ نہ کرے مگر............ کیا وہ اپنی بدنامی کے مول یہ قربانی دے پائے گی؟"

امام دین یہ سوال صبح سے اب تک خود سے کئی بار کرچکا تھا۔ جیسے حالات تھے اس میں تو اس کے سوا کچھ حل تھا ہی نہیں کہ پھر چپکے سے کہیں کھو جائے اور جو کردار اس کا بوڑھے چاچا اور گلو کی نظر میں تھا' وہ قائم رہے۔ امام دین کو یہ یقین تھا کہ وہ کسی بھی حال میں نہیں رکے گی۔

گرو مندر پر پہنچ کر گلو نے ٹیکسی اسی لال مسجد کے سامنے روک دی جہاں اپنے چھوٹے سے اسنیک بار اور کولڈ کارنر کی سب سے مشہور چیز یہی کافی تھی۔ وہاں کی روشنیوں نے امام دین کو خوف زدہ کر دیا حالانکہ وہ گلو کو روشنی میں دیکھنے کی خواہش کر رہا تھا۔ تیز روشنی میں آتے ہی اس نے گلو کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دیکھ لی۔ اس کی آنکھوں میں بھی عجیب سی چمک تھی۔ یہ دیکھ کر اسے یقین ہوگیا کہ ابھی نازاں والا معاملہ کھلا نہیں۔ مگر اسے یہ بھی یقین تھا کہ معاملہ کھلتے ہی گلو کے جبڑے کسی بھینسے کی طرح لٹک جائیں گے اور وہ کسی بھیڑیے کی طرح غراتا پھر رہا ہوگا۔

عین اسی لمحے امام دین کے ذہن میں کہیں کوندا سا لپکا۔ جیسے گہرے اندھیرے میں کہیں دیا لو دے اُٹھے۔ وہ ٹھکرایا جا چکا تھا۔ نازاں............ نازاں بہت جلد ٹھکرائی جا

والی تھی............ پھر............؟ کیا وہ اسے سہارا نہیں دے سکتا؟ یہ سوال بہت چپکے سے دماغ میں سرسرایا تھا۔ امام دین نے اس سوچ پر بھی یوں چونک کر گلو کو دیکھا تھا جیسے وہ سارا غیب کا علم جان جاتا ہو اور یہ بھی جان گیا ہو مگر وہ پلکیں جھپک جھپک کر سامنے پھرتی سے آنے جانے والے ویٹرز کو دیکھ رہا تھا جو اس کے قریب سے گزرتے ہوئے "آیا سر" ضرور کہتے تھے اور وہ اس کا انتظار کرنے لگتا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں تھا کہ ماما کیا سوچ رہا ہے۔

امام دین کے اندر جیسے جان آگئی ہو۔ عمر کے زیاں کا احساس' محبت میں ناکامی کا احساس' تنہا رہ جانے کا احساس' نہ کچھ پانے اور نہ کچھ ہار دینے کا احساس۔ ان سب کے بعد امام دین کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ اب اسے یوں بھی اپنے لئے تو کچھ کرنا بھی نہیں تھا۔ اگر اس کی وجہ سے نازاں کو تحفظ مل سکے' سکون' عزت اور مان مل سکے تو اسے بھی کچھ ٹھنڈک پڑی رہے گی۔ کسی کے لئے کچھ کرنے کا سرور ہی آدمی میں چابی بھر دیتا ہے اور وہ دنوں نکال لیتا ہے۔ مرجانا تو کچھ بھی نہیں ہوتا' مگر زندہ رہنا اور زندہ رہنے کے لئے کچھ بھی نہ ہونا عجیب بے جانی کا سبب ہوتا ہے۔ آدمی کو پتا بھی نہیں ہوتا ہے کہ وہ کیوں بیٹھا ہے' کیوں لیٹا ہے اور کیوں کھڑا ہے اور تب جینا بڑی ذلت سے دو چار کرتا ہے۔ خالی ہاتھ جھلاتے خلاؤں میں تکتا۔ خالی الذہن کی کیفیت میں مبتلا آدمی ہمیشہ ایسا ہی رہے تو بھلا کیسا زندہ ہوا؟

کسی کے لئے کچھ کر دینا' کسی سے وابستہ ہو جانا' دھیرے دھیرے آدمی کو ایسے جکڑ لیتا ہے کہ جذبوں کے دھارے غیر محسوس انداز میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور سارا کھوکھلا پن ان میں سے نتھر جاتا ہے۔ "وہ نازاں کو سہارا دے سکتا ہے۔" یہ اس کا فیصلہ تھا اور اس فیصلے نے اس کے اندر پڑے ملبے کو اتنی جلدی یہاں وہاں کر کے تھوڑی سی جگہ بنالی کہ امام دین اک ذرا سانس لے سکے۔

باہر والا ویٹر کافی لے آیا تھا۔ بڑے بڑے بھاپ اڑاتے مگ کو دیکھ لیتے ہی امام دین کو احساس ہوا کہ اس کے اندر خاصی کپکپی تھی۔ وہ خود تو طوفان کی زد میں تھا اس لئے محسوس نہ کر سکا مگر اسے گلو پر حیرت ہوئی۔ وہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی جیسے اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ نہیں تھا۔ اب اتنی تیز روشنی میں آجانے کے بعد بھی اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ گویا وہ بے وجہ ہی ڈرا رہا تھا۔

"مامے تو پوچھے گا نہیں کہ وہ خوشخبری کیا ہے؟" گلو نے کافی کا ہلکا سا گھونٹ لیا اور مگ کو ڈیش بورڈ کھول کر اس کے ڈھکنے پر رکھ دیا۔

"خوشخبری............ کیسی............ خوشخبری؟" وہ جیسے پچھلا سب کچھ بھول گیا تھا۔

اس نے تو ذرا سی جگہ دیکھتے ہی وہاں پاؤں جمانے کی کوشش میں سارا دکھ درد بھلا ڈالا تھا۔ ایسے جلدی فیصلہ کرلینا یا متبادل تلاش کرلینا اس کی عادت نہیں تھی مگریوں جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی کافی ہوتا ہے۔ اس نے نازاں کے نام پر ایک ستون سا کھڑا کرلیا تھا۔ اب اسی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہونے کے قابل محسوس کیا تھا خود کو۔

"چاچا میری شادی کر رہا ہے۔" گلو نے بڑے جھجکتے ہوئے بلکہ لجاتے ہوئے کہا۔

"ارے............ یہ............ یہ اچانک راتوں رات ہی کیسے طے ہوگیا؟"

"بس یہ سارا چکر رحمان چاچا کی بیوی کا ڈالا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیسے باتوں باتوں میں کہہ دیا اور چاچا کا تو تجھے پتا ہی ہے۔ وہ تو موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک دم پیچھے پڑ گیا اور پھر............ میں بھی سوچتا ہوں کہ بے چارہ کب تک اکیلا دہلیز پر بیٹھا رہے گا۔ گھر میں گھر سی بات ہوگی تو اس کا دھیان گھر میں لگے گا۔ اس کی آنکھیں میرا تعاقب کرنا چھوڑیں گی تو اطمینان سے کام دھندا کر سکوں گا پھر امام دین............ اس تجربے نے یوں بھی میرے اندر کی کمینگی کو کم کر دیا ہے۔ تو سچ کہتا ہے امام دین کہ دوسرے کو خوشی دینے کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ ہم جسے چاہتے ہوں ہمیں وہی ملے۔ کبھی کبھی ہمیں اس کا بھی بن کر رہنا پڑتا ہے جو ہمیں چاہتا ہو۔ ہم اسے چاہیں یا نہ چاہیں۔"

امام دین کا دم گھٹنے لگا۔ بالکل ایسی ہی باتیں تو آج زیبی نے کی تھیں۔ اس نے کتنا بڑا دھوکا کھایا تھا۔ وہ گلو کو دیکھتا ہی چلا گیا کہ وہ جلدی سے کہہ دے اور گلو نے کہہ دیا۔

"بس اب اس سے زیادہ میں تجھے کچھ نہیں بتاؤں گا۔ پہلے تو زیبی سے بات کرلے۔ میرا ارادہ ہے کہ اگر ہوگی تو دونوں دوستوں کی شادی ایک ساتھ' ایک ہی دن ہوگی۔"

پھر وہی زیبی!! طوفان پھر اٹھا............ جیسے کروٹ سی لی ہو پھر دھیرے دھیرے اس کے اندر سناٹا سا پھیل گیا............ "ہاں............ اس سے بات ہوگی............ جب ہوگی تو ہوگی یار............ تو' تو بتا ناں!"

"نہیں' سرپرائز دوں گا تجھے۔" گلو بچوں کی طرح ضد کرنے لگا۔

"تو تو اچھی انگریزی بولنے لگا ہے یار۔" امام دین نے کئی کراہیں سینے میں گھونٹیں تب ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوپائی۔

"طنز نہ کر۔ کراچی ہے۔ یہاں انسان اچھا برا سیکھ سکتا ہے تو یہ چند الفاظ کیا ہیں۔ اتنی تو میں سندھی' بلوچی بھی جانتا ہوں۔" گلو جھینپ گیا۔

"اچھا سن! سیدھی بات یہ ہے کہ آج زیبی سے کوئی بات نہیں ہوئی اور یار............ میرا دل نہیں مانتا کہ اسے ایسا کچھ کہوں............"

"مگر تجھے کب کچھ کہنا تھا یار! بلایا تو اس نے تھا ناں!" گلو نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہاں! وہ............ وہ تو ایسے ہی کچھ دوسری باتیں تھیں۔" امام دین کو کچھ یاد ہی نہیں تھا کہ اب سے پہلے اس کے ساتھ ہوا کیا تھا اور اسے کس بات کا جواب کیا دینا چاہیے۔

"اچھا سن گلو! سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے لگتا ہے............ وہ کسی اور کو چاہتی ہے کسی کا انتظار کر رہی ہے۔" امام دین میں یہ حوصلہ ایک دم ہی پیدا ہوا تھا۔

"کہہ کر تو دیکھا ہوتا یار' ممکن ہے وہ تو ہی ہو!"

"نہیں............ وہ میں نہیں ہوں' اتنا تو مجھے یقین ہے۔ یار اب جی کسی کو نہیں چاہتا۔ کوئی قسمت میں ہوگا تو مل جائے گا............ تو بھائی ہے' دوست ہے میرا' اب بس میں تیری پسند سے کروں گا شادی۔ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ۔ بے سہارا ہو تو اس کا سہارا بن کر خوشی محسوس کروں گا۔" وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"یہ تو گڑبڑ ہوگئی۔ سوچا تھا دونوں دوست ایک ساتھ دلہا بنیں گے۔ بڑا مزہ آئے گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور عین اسی وقت کہیں سے گھڑیال کی تیز آواز آئی۔ گھڑیال نے پورے بارہ بجائے تو گلو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک تو چاچا کسی آسیب کی طرح اس کے دماغ پر سوار ہو کر رہ گیا تھا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی جاتی وہ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا اور اب ان باتوں میں پتا ہی نہ چلا۔ ابھی امام دین کو گیراج پر چھوڑنا تھا اور گھر پہنچتے پہنچتے ایک تو بج ہی جاتا۔

امام دین اس کے بوکھلانے پر جان گیا تھا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا۔ گلو نے ٹیکسی کا رخ گھمانا چاہا تو امام دین نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ "تجھے ادھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بڑا لمبا چکر پڑے گا۔ میں رکشا ٹیکسی پکڑ کر چلا جاؤں گا' تو سیدھا گھر جا۔"

اس نے گلو کی پریشانی آدھی کر دی تھی۔ "یہاں.......... پتا ہی نہیں چلا کہ بارہ بج گئے۔ مگر تو.......... مجھے چھوڑ کر.........."

"نہیں.......... میں چلا جاؤں گا۔ وہ تیرا چاچا پاگل ہو رہا ہو گا۔"

اور پھر گلو کو واقعی کچھ یاد نہیں رہا۔ امام دین کے دوسری ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی اور سیدھا گھر جا پہنچا۔ حسب توقع چاچا جاگ رہا تھا اور خلاف توقع رحمان چاچا اور چاچی اس کے قریب بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ گلو نے خدا کا شکر ادا کیا اگر رحمان چاچا اور چاچی گھر میں نہ ہوتے تو چاچا ضرور دروازے میں کھڑا ملتا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں بھی ہوتیں اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہا ہوتا۔ اسے دیکھتے ہی چاچا نے ذرا سا اکڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تیرا رات گئے آنا چھوٹے گا نہیں؟ ابے!! اب اپنی عادتیں آہستہ آہستہ بدل لے ورنہ تجھے پتا ہے نازاں کا!" چاچا نے ہنس کر ہونٹوں کے کونوں کو دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں' پتا ہے۔ وہ بھی اچھی طرح جانتی ہے مجھے۔" گلو نے ہنس کر جواب دیا پھر بولا۔ "حیرت ہے۔ آج بارہ بجے بھی سب جاگ رہے ہیں۔"

"بیٹا! تیرے چاچا کو تو خوشی سے نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ اکیلا ہی بولے جا رہا تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں کے پروگرام بنا رہا تھا۔ رحمان نے بتایا کہ وہ تو ابھی بری جوڑنے کے

چکر میں ہے تو میں یہاں آ گئی۔ اسے کچھ آتا جاتا نہیں ہے بیٹا ضائع کر دے اسے' بلا وجہ پیسے نہ ضائع کرے۔ میں خود کر لوں گی سب کچھ۔ ہمارے بیٹھے بیٹھے ہی بروکیڈ کے چھ جوڑے نکال لایا بکسے سے اور دیکھو تو سہی.......... سب کے سب ایک رنگ کے۔ اتا باؤلا ہو گا' یہ نئی پتا تھے مجھے۔"

گلو نے حیرت سے چاچا کی طرف دیکھا۔ اس کی پائنتی کو رکھی گٹھری چاچی نے کھول دی تھی۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس میں صرف گلابی یا ہلکے نارنجی رنگ کا بروکیڈ ہی تھا۔ ایک پر پھول پتے بنے تھے تو دوسرے پر جالی۔ تیسرے پر تتلیاں اڑ رہی تھیں تو چوتھے پر چھوٹے چھوٹے گول پٹے سے پڑے تھے مگر رنگ سب کا ایک ہی تھا۔

"چاچا! یہ سب تو کب لایا؟ کیا.......... آج؟" اسے چاچا کی اس پھرتی پر شدید حیرت ہوئی تھی۔

"ارے نہیں یار.........." چاچا جھینپ رہا تھا۔ "زمانوں سے لے لے کر رکھتا رہا تھا.......... اب.......... سوچا یوں کب تک پڑے رہیں گے؟ نازاں کے لئے ہی کام آ جائیں۔ میں دیکھ رہا تھا تو یہ لوگ آ گئے۔"

اور گلو جان گیا کہ وہ یہ کپڑے جھاراں کے لئے لے لے کر رکھتا رہا ہو گا۔ پتا نہیں کہاں ہے وہ جھاراں! کاش وہ اسے ڈھونڈ کر لا سکتا۔ کوئی تصویر بھی تو نہیں تھی چاچا کے پاس اس کی ورنہ تو اب تک وہ اسے تلاش کر ہی چکا ہوتا۔

"اچھا بھئی بابے.......... اب تیرا پتر آ گیا۔ پاؤں پسار کر سو جا۔ اللہ تجھے یہ سکھ مبارک کرے۔" رحمان چاچا نے چاچا کے کاندھے تھپتھپایا اور بیوی کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔

گلو نے دروازے کی کنڈی لگائی۔ چاچا کا پلنگ اندر کمرے میں ڈال دیا۔ سویرے اوس گرتی تھی جو چاچا کے لئے اچھی نہیں تھی۔ خود اسے اس میں بھیگنا اچھا لگتا تھا۔

"تو اتنی دیر میں آیا ہے۔ مجھے کچھ پیسے چاہییں ہیں۔ ابھی سے کچھ گھر ٹھیک ٹھاک کراؤں گا۔"

"ہاں.......... یہ لے۔" گلو نے ایک لمحے کی دیر کئے بغیر پانچ ہزار روپے نکال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کراس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ چاچا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

"یہ.......... یہ گلو!! اتنے بہت سے۔"

"ڈاکہ نہیں ڈالا ہے میں نے۔ تجھے اعتبار کیوں نہیں ہے مجھ پر چاچا.......... اس لئے کہ میں نے بچپن میں چوری کی تھی!!"

"نہیں نہیں.......... گلو! اس لئے کہ تجھے عقل نہیں ہے.......... آدمی کی پہچان نہیں ہے۔ تو بہت معصوم ہے گلو اور لوگ بہت چالاک۔ میں صرف اس لئے ڈرتا ہوں' فتح کی مثال تیرے سامنے ہے۔ بتا.......... کیا میں نے کچھ غلط کہا تھا؟"

"اچھا! بس میں بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ پیسے مجھے امام دین نے دیئے ہیں۔ میں اسے رفتہ رفتہ لوٹا دوں گا۔ وہ تیرا نہیں' میرا معاملہ ہے۔ یہ میں نے بھی یہی سوچ کر لئے تھے کہ نازاں کے علاج کے بعد جو بچیں گے' اس سے گھر میں کچھ کام کرالوں گا۔ رنگ و روغن ہو کر کچھ صورت نکل آئے گی۔"

"یہ تو بہت ضروری ہے اور برآمدے کی دیوار تو دھوئیں سے کالی ہو گئی ہے۔ ایک رسوئی بنا کر یہ لکڑی کا چولہا ختم ہی کر دیتے ہیں۔ دیواریں کالی ہوتی ہیں' وہ الگ اور جو آنکھیں پھوٹتی ہیں وہ الگ۔ تو مٹی کے تیل کے چولہے لے آنا۔"

"ہاں.......... اور بھی دیکھنا' ہزار کام نکلیں گے۔" چاچا بڑبڑایا۔ پیسوں کی طرف سے اسے کچھ اطمینان ہو گیا تھا۔ امام دین اسے پسند تو نہیں تھا۔ اسے تو گلو کا کسی سے بھی ملنا پسند نہیں تھا مگر اب اتنے عرصے میں اسے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ امام دین برا آدمی نہیں ہے۔ رحمان سے بھی اس نے اس کے بارے میں کافی کچھ معلوم کر لیا تھا۔ یہ سن کر کہ اس کا گیراج ہے اور وہ اسے خود ہی سنبھالتا ہے' اسے کافی ڈھارس ہوئی تھی۔

اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ امام دین اتنی رقم دے سکتا ہے اور وہ ضرور حق حلال کی کمائی ہوگی۔ وہ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ پرچون کی دکان کا تالا کھول لے۔ اچھا خاصا سامان بھرا تھا اس میں۔ اب تو اسے فتح کے آدمیوں کا ڈر نہیں تھا۔ بات تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ وہ مرا نہیں تھا سو گلو پر بھی اب کوئی الزام نہیں تھا مگر سارا مسئلہ یہ تھا کہ گلو منع کر چکا تھا۔ بلاوجہ دکان کا کرایہ ادا کرنا اسے بہت ہی کھل رہا تھا۔ اس نے یہ تجویز

بھی دی تھی کہ سامان نکال کر دکان خالی کر دے اور سامان گھر میں ڈال لے۔ اس پر گلو راضی ہو گیا تھا مگر کوئی نہ کوئی پریشانی لگی ہی رہی کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ یہ اچھا موقع تھا۔ شادی پر اسے کافی سامان کی ضرورت پڑتی سو وہ اٹھا لاتا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے پھر گلو کو پکارا۔

"اب کیا بات ہے؟" گلو چونک اٹھا

تب اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ گلو نے کچھ نہیں کہا البتہ حامی بھرلی کہ وہ خود سامان اٹھا لائے گا اور جلد ہی دکان بھی خالی کر دے گا۔ اس میں بھی خاصا فائدہ تھا۔ ایڈوانس کے طور پر دی گئی رقم بھی اس وقت ہاتھ میں آجاتی۔ چاچا اس طرف سے مطمئن ہو کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند تو گلو کو بھی نہیں آرہی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے عجیب سی الجھن اور بے چینی نے گھیرا ہوا تھا۔ کچھ کھو جانے کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے جو کچھ ہو رہا ہے۔ اسے نہیں ہونا چاہئے بلکہ کچھ اور ہونا چاہئے تھا۔ کیا.......... ! یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ جانے کب سویا تو اس کی ساری حسرتیں' ساری خواہشیں اور ساری محرومیاں جاگ اٹھیں۔

اس رات اس نے خواب میں ایک اجنبی عورت کو اپنے گھر کے آنگن میں کام کرتے دیکھا۔ یوں جیسے وہ اس کی ماں ہو۔ بہت خوب صورت.......... بڑے پیار سے دیکھنے والی اور چاچا بھی بہت خوش تھا۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ گلو کی شادی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ بڑے چاؤ سے سن رہی تھی۔ چاچا کی جمع کی ہوئی چیزیں دیکھ رہی تھی اور پھر گلو نے دیکھا کہ اس نے ایک چھوٹا سا بکس نکال کر اسے چاچا کے حوالے کر دیا ہے۔ چاچا نے بکس کھولا تو گلو اور چاچا دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس میں سونے چاندی کے ڈھیروں زیورات تھے۔

پھر اچانک سارا سین بدل گیا۔ گلو ایک پھولوں اور رنگین پنیوں سے سجے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ کامدار بڑے بڑے پایوں والی مسہری پر نازاں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ گلو کے ہاتھ میں اس اجنبی عورت کا' جسے وہ ماں سمجھ رہا تھا' دیا ہوا بکس تھا۔ وہ یہ سارے زیورات نازاں کو پہنانا چاہتا ہے۔ وہ بڑی آہستگی سے مسہری پر بیٹھتا ہے۔ نازاں کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھونگھٹ اٹھاتا ہے۔ نازاں بہت خوبصورت لگ رہی ہے مگر گلو کو ایسا لگتا ہے جیسے اس کا بدن مٹی کا بنا ہوا ہے' سوکھی مٹی کا جو دھیرے دھیرے جھڑ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ پتھریلا پن ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی کی بجائے خوف منجمد ہو چکا ہے۔ ابھی وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا ہے کہ اچانک باہر سے کسی لڑکی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ آواز دھیرے دھیرے پھیلتی ہے یوں جیسے ہوا کمرے میں رینگتی ہوئی داخل ہو اور پھر پورے کمرے میں اتنی ہوا بھر جائے کہ کوئی بھی چیز جگہ پر نہ رہے۔ پردے' پھول کی پتیاں' پنیاں.......... نازاں کا دوپٹا۔ مسہری پر بچھی چادر سب کچھ اڑنے لگا۔ اس تیز ہوا کے ساتھ ہی اس لڑکی کی سسکیاں بھی تیز ہو کر کمرے میں ہی چکرانے لگیں۔ گلو حیرت سے کھڑا ہو گیا مگر نازاں ویسے ہی بیٹھی رہی' کسی بت کی طرح۔

پھر اچانک کمرے کے دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی۔ گلو نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو وہی عورت سامنے کھڑی تھی جسے گلو ماں سمجھ رہا تھا۔ اس عورت نے گلو سے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے زیورات کا بکس لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی مگر گھر میں گونجنے والی سسکیاں اس کی نہیں تھیں۔ یہ سسکیاں دروازہ کھولتے ہی اور زیادہ تیز ہو گئیں۔ وہ عورت زیورات کا بکس لئے باہر کے دروازے کی طرف جاتی ہے۔ گلو بھی اس کے پیچھے جاتا ہے۔ اچانک گلو کو احساس ہوتا ہے کہ دروازے پہ کوئی لڑکی کھڑی ہے اور رونے کی آواز بھی اس کی ہے۔ چاچا ایک کونے میں اوندھا لیٹا ہے جیسے اسے یہ سسکیاں سنائی نہ دے رہی ہوں۔ اس اجنبی عورت نے دروازہ کھولا تو گلو بھونچکا رہ گیا۔

سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی جو بچپن میں اسے چبوترے پر ملی تھی جسے گلو نے ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔ وہی معصوم سا چہرہ' وہی ملتجی نگاہیں اور آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی وہی میلی میلی سی لکیریں جو تب سے اب تک گلو کے دماغ میں جم کر رہ گئی تھیں' جسے گلو نے جگہ جگہ تلاش کیا تھا' وہ جو ایک بار بازار میں ملی اور پھر کھو گئی تھی۔ آج اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس اجنبی عورت نے زیورات کا وہ چھوٹا سا بکس اس لڑکی کو تھما دیا اور وہ دونوں ہی آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو گئیں۔ گلو کا جی چاہا

کہ ان دونوں کو روک لے مگر عین اسی وقت اسے نازاں کی آواز سنائی دیتی ہے جو ایک بچے کو گود میں لئے کھڑی ہے اور اسے آواز دے رہی ہے۔

☆==========☆=============☆

گلو کی آنکھ اچانک کھل گئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ چاچا بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ کمرے کے سناٹے میں اس کے ہلکے ہلکے خراٹے دور تک سنائی دے رہے تھے۔ گلو پورا پسینے میں شرابور تھا حالانکہ ہوا میں غضب کی خنکی تھی۔ پتا نہیں کیا وقت ہوا تھا مگر گلو کا اندازہ تھا کہ سویرا ابھی دور ہے پھر اچانک اسے خواب یاد آ گیا۔ وہ عورت.......... وہ لڑکی اُور نازاں.......... بے چینی نے اسے لیٹنے نہیں دیا۔ وہ کتنی دیر سوچتا رہا۔ وہ لڑکی بار بار یاد آتی رہی جو دوسری بار اسے بازار میں ملی تھی۔ جب اس نے پائل خریدی تھی اور پھر ویسی ہی پائل گلو نے بھی خرید لی تھی۔ وہ اسے پھر کھو بیٹھا تھا مگر جانے کیوں بار بار یہ احساس ہو رہا تھا جیسے وہ کھوئی نہیں ہے۔ یہیں ہے۔ قریب ہی کہیں اور جیسے وہ اسے انتظار کرنے کو کہہ گئی ہے۔ ابھی آ جائے گی۔

جانے کتنی ہی دیر گلو بے سروپا باتیں سوچتا رہا۔ کبھی خود کو تسلی دیتا' کبھی ڈھارس' کبھی اسے بھول جانے کا عہد کرتا اور کبھی توڑ دیتا۔ اسی جنگ میں اسے وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ اس نے جب تھک کر آنکھیں بند کیں تو کہیں دور سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔

☆==========☆=============☆

امام دین نے رکشا والے کو پیسے دیئے۔ آج وہ ٹیکسی میں نہیں آیا تھا۔ ایک عجیب سی تھکن تھی جو اس کے رگ و پے میں لہو کے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ کل کی اعصابی ٹوٹ پھوٹ ہی کافی تھی مگر رات بھر جاگتے رہنے سے تو اس کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ صبح وہ اٹھا تو ہلکا بخار بھی تھا مگر یہ تو وہ رات ہی کو سوچ چکا تھا کہ اسے صبح نازاں کے پاس جانا ہے۔ وہ بکھر چکا تھا' ٹوٹ چکا تھا شاید اسی لئے اسے نازاں کی کیفیت یاد آ رہی تھی اور وہ دکھی ہو رہا تھا۔ کل جب نازاں اسے اپنی تباہی کی داستان سنا رہی تھی تو اس کے دل میں اتنا گداز ہی کب تھا کہ وہ اس کی تکلیف کی شدت کو پوری طرح محسوس کر سکتا۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

توسب کچھ اس طرح سنا' سوچا' محسوس کیا تھا جیسے وہ کوئی کہانی سن رہا ہو۔ اسے ہمدردی ہوئی تھی۔ دکھی بھی ہوا تھا مگر اس طرح نہیں کہ اسے مکمل تباہ ہونے سے بچانے کا کوئی عہد کر پاتا مگر جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا' جس طرح سے وہ ٹھکرایا گیا تھا' اس نے تو امام دین کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اتنے اکیلے پن کا احساس ہوا تو یہ احساس بھی شدت سے ہوا تھا کہ نازاں تو عورت ہے' وہ نہ سہہ پایا تو اس نے بھلا کیسے خود کو سنبھالا ہوگا؟

تمام رات گہرے اندھیروں نے اس کی آنکھوں ہی میں نہیں' اس کے تمام وجود میں بھی اندھیرے بھر دیئے تھے۔ وہ جو زیبی کے نام سے ایک دیپ سا اس کے وجود کو روشن رکھا کرتا تھا' وہ اس نے بڑی بے دردی سے بجھا دیا تھا۔ ایسے میں جب اسے نازاں کا خیال آیا تو یوں لگا تھا جیسے اس گھور اندھیرے میں کہیں دور دیا سا ٹمٹما اٹھا ہو۔ یہ خیال اسے اچانک ہی آیا تھا کہ وہ نازاں کو اور نازاں اس کو سہارا دے سکتی ہے۔ وہ جس اندھیری سرنگ میں سفر کر رہا ہے' اسی میں نازاں بھی محو سفر ہے مگر ایک دوسرے سے دور......... اگر یہ دوری ختم ہو جائے تو دونوں کا سفر آسانی سے کٹ سکتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا اس لئے نہیں کہ اس کے وجود کے اندھیرے چھٹنے والے تھے بلکہ اس لئے کہ صرف وہی نازاں کی مدد کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

اس نے بڑی ایمان داری سے اپنی خود غرضی کا اعتراف کیا کہ زیبی سے آس تھی تو اسے نازاں کو سہارا دینے کا خیال تک نہیں آیا تھا لیکن اس طرف کا دروازہ بند ہوتے ہی وہ نازاں کی طرف پلٹ پڑا تھا۔ نازاں کا دکھ تو اس وقت بھی ویسا ہی تھا جب وہ زیبی کے پاس جانے والا تھا مگر ایسا محسوس ہی نہیں ہوا۔ نہ اسے نازاں کی لرزتی آواز میں کرب محسوس ہوا تھا۔ نہ اس کے چہرے پر کھنڈی سفیدی نے اسے چونکایا تھا اور جب وہ بلک بلک کر رو رہی تھی تب اسے تکلیف تو ہوئی تھی مگر اس تکلیف نے اسے اس شخص کے خلاف مشتعل کر دیا تھا جو نازاں کی بربادی کا سبب بنا تھا لیکن اس تکلیف نے کہیں بھی یہ احساس اجاگر نہیں ہونے دیا تھا کہ نازاں تنہا اور بے سہارا ہے نہیں بلکہ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اسے کسی کے سہارے کی ضرورت ہے۔

یہ سب کچھ زیبی کے ٹھکرائے جانے کے بعد اسے یاد آیا تھا۔ نازاں کی آواز کا

کرب' آنکھوں میں بھری وحشت' چہرے پر کھنڈی سفیدی۔ یہ سب اسے اتنی جلدی مضمحل کر گئے کہ وہ لمحوں میں زیبی کے دیئے ہوئے زخموں کی تکلیف سے بے خبر ہو گیا اور جب اس نے ہر طرح سے سوچ بچار کر کے فیصلہ کر لیا کہ وہ نازاں کو سمیٹ لے گا تو یوں لگا جیسے اندھیرے مانوس ہو گئے ہوں حالانکہ وہ اب تک یہ نہیں سوچ پایا تھا کہ اس کی کوکھ میں جنم لینے والے بچے سے اس کا کیا رویہ ہوگا مگر وہ پھر بھی نازاں کی وجہ سے خود میں اتنی نرمی محسوس کر رہا تھا کہ وہ یہ قدم اٹھانے پر تیار تھا۔ اسے یقین تھا کہ نازاں والی بات زیادہ عرصے نہیں چھپے گی اور عیاں ہوئی تو گلو کا اکھڑ جانا لازمی ہے۔ اس کا چاچا ممکن ہے اسے پھر بھی سمیٹنا چاہے کہ اس نے یوں بھی ہمیشہ دوسرے کی اولاد کو ہی پیار دیا مگر گلو اکھڑ گیا تو اسے بھی مجبور ہونا پڑے گا۔

☆==========☆============☆

صبح کی پہلی کرن تک امام دین اس سوچ بچار میں رہا اور پھر جیسے سب کچھ طے ہو گیا۔ اس کے اندر اٹھنے والے سارے طوفان دھیمے پڑ گئے' سکوت چھایا تو اس نے فوراً ہی اسپتال پہنچنے کی تیاری شروع کر دی۔ یقین تھا کہ نازاں اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ تھام لے گی۔ وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کو تیار تھا تو نازاں کا ساتھ اسے بھی بہت سے دکھوں سے بچا لے گا۔ سورج کے طلوع ہونے سے لے کر دھوپ تک کا انتظار بڑا جان لیوا تھا مگر وہ انتظار کرتا رہا۔ اپنے آپ کو ٹٹولتا رہا۔ اسے کبھی کوئی ایسی گرہ محسوس نہیں ہوئی جو الجھن پیدا کرتی بلکہ اسے محسوس ہوا کہ وہ بوجھل پن جس نے اس کی نگاہیں تک دھندلا دی تھیں' ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جب وہ رکشا میں بیٹھا تو اسے خوشی محسوس ہوئی تھی اور اب......... جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر نازاں کے وارڈ کی طرف جا رہا تھا تو کافی پُراعتماد تھا۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ لمحہ بھر کو اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اندر کا سناٹا اس میں ہول سے ڈالنے لگا۔ اس نے دوسری بار دستک دی تو ہاتھوں میں اضطراب تھا اور آواز بھی تیز تھی۔ دروازہ ہلکے سے ہلا تو اسے پتا چلا کہ وہ اندر سے بند نہیں ہے۔ وہ گھبراہٹ میں دروازہ کھول کر اندر داخل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا۔ سامنے ہی سائیڈ ٹیبل پر نازاں کا سامان رکھا تھا۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور یہ سوچ کر انتظار کرنے لگا کہ شاید نازاں باتھ روم گئی ہو۔ لمحہ لمحہ صدی بن کر بیت رہا تھا۔ اس کے کان اندر کی آہٹ پر لگے تھے۔ اچانک اسے پشت سے آواز آئی۔

"آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں جی؟"

وہ اچھل پڑا۔ خفیف سا ہوگیا۔ سامنے نرس دواؤں کی مخصوص ٹرے لئے کھڑی تھی۔

"ہٹیں جی! راستہ تو دیں۔" اس نرس نے اپنی منمناتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ فوراً ہٹ گیا۔ نرس نے اندر جاکر دروازہ بند کرلیا۔ تب وہ حیران بھی ہوا اور مطمئن بھی۔ یقیناً نازاں اندر ہوگی۔ اس خیال نے اسے پُرسکون کردیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نرس باہر آئی۔ "جائیں جی! مگر یہ ٹائم نہیں ہے ملاقات کا۔" وہ مشینی انداز میں کہتی ہوئی کھٹ کھٹ کرتی ڈیوٹی روم کی طرف چلی گئی۔

معاً امام دین کو حلق خشک ہونے کا احساس ہوا بلکہ گھبراہٹ بھی طاری ہوئی مگر اس نے بہت جلد خود کو قابو میں کرلیا۔

"یہ زیبی نہیں ہے ماے!" اس نے دل ہی دل میں خود کو تنبیہہ کی۔ "نازاں ہے اور جن حالات سے گزر رہی ہے............" جانے وہ کیا کہنے والا تھا کہ اسے اپنی کمینگی کا احساس ہوا اور وہ سر جھٹک کر اندر داخل ہوگیا۔

"نازاں پلنگ پر لیٹی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا۔ ماے نے پھلوں کا تھیلا سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس جانب متوجہ نہیں تھی۔ اس کی نگاہیں دروازے پر تھیں۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے ساتھ گلو بھی آیا ہے۔ امام دین کو لگا جیسے اس نے نازاں کو پہلی بار دیکھا ہے۔ اس میں اور زیبی میں کوئی فرق نہیں تھا سوائے اس کے کہ زیبی کو وہ برسوں سے جانتا تھا اور برسوں ہی اس کے بارے میں اس نے سوچا تھا۔ نازاں کو اس نے دیکھا تھا مگر جیسے نگاہیں اٹھائے بغیر اور اس کے بارے میں تو بس رات ہی سوچا تھا۔ اس

کے زرد چہرے پر بلا کی معصومیت اور وحشت زدہ آنکھوں میں بے پناہ کشش تھی۔ لمبے سیاہ بال جو تکیے پر پھیلے تھے‘ ایک دم ہی امام دین کو ڈس گئے۔

"گلو نہیں آیا؟" اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

امام دین کو یقین تھا کہ وہ گلو کو چاہتی ہے مگر پھر بھی............ اسے یہ کوئی خاص بات نہیں لگی حالانکہ جب زیبی نے کہا تھا کہ وہ کسی کو چاہتی ہے تو اس کے سینے میں بل سے پڑ گئے تھے۔ جانے اس کی وجہ کیا تھی؟ شاید زیبی کی مضبوطی یا............ خود اس کے بے اعتمادی مگر نازاں کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اس کی چاہت ایسی نہیں ہوسکتی جیسی زیبی کی چاہت ہوسکتی ہے۔ اسے اندازہ تھا کہ زیبی جو سوچ لے‘ اسے پورا کرم دم لیتی ہے اور یہ بھی اسے پتا تھا کہ وہ ساری عمر بڑی دلیری سے تنہا گزارنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہے۔ حالات کی بے حسی نے اسے پتھریلا سا بنا دیا تھا مگر نازاں تو جیسے موم کی بنی ہوئی تھی۔ اسے یقین تھا‘ وہ جانتا تھا کہ موم کو ڈھال لینا آسان ہوتا ہے۔ یوں اسے گلو کے بارے میں بھی پتا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ گلو ذرا بھی اس کی طرف ملتفت نہیں ہے۔ اسے نازاں اور اس کے جذبات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔

"ماے!" نازاں نے اسے پکارا تو وہ چونک اٹھا۔ گڑبڑا گیا۔

"ہاں............ وہ............ گلو؟"

"ہاں۔ نہیں آیا؟"

"نہیں............ میں تو گیراج سے سیدھا آرہا ہوں۔" اس نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ بینچ کو ذرا اور آگے سرکائے مگر ہمت نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ آئے گا تو............ مگر میں............ پریشان تھا۔ ساری رات سوچتا رہا۔" امام دین کو کچھ کہنے میں دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ نازاں کی جگہ اگر زیبی ہوتی تو شاید اس کے حلق میں گولے سے اٹک چکے ہوتے۔

"میں بھی بہت پریشان ہوں ماے............ میں نے............ میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ مگر............ وہ کہتی ہے‘ دیر ہوگئی اور اب............ اب تو لگتا ہے............ کہ............ نہیں ماے............ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ تم چاچا کو اور گلو کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمجھاؤ.......... انہیں کیا پتا کہ میں.......... میں کن حالوں کو پہنچ گئی ہوں۔ چاچا اور گلو چاہتے ہیں کہ میں.........."

عین اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں ہی چونک پڑے۔ "کون ہے؟" نازاں نے آنکھوں کو جلدی سے رگڑا۔ دروازہ کھلا اور سامنے کھڑا گلو اندر داخل ہوگیا۔ امام دین کو وہاں بیٹھے دیکھ کر اسے عجیب سا لگا.......... پتا نہیں کیوں اسے لگا جیسے امام دین اور نازاں دونوں اس کی آمد سے گھبرا گئے ہیں۔

"تو..........؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں.......... وہ.......... سامنے گلی میں گاڑی دینے آیا تھا۔ خیال آیا کہ ضرور تم اب تک یہاں پہنچ چکے ہوگے یا چاچا تو آہی گیا ہوگا۔ نازاں کی خیریت بھی پوچھ لوں گا اور.........."

گلو نے پھلوں کا تھیلا رکھتے ہوئے، پہلے سے وہاں رکھا تھیلا دیکھ لیا۔

"یہ کیا تم لوگ پھل اٹھا لاتے ہو۔ یہ امام دین بھی اتنا بڑا تھیلا بھر لایا۔ پتا ہے یہ سب ضائع ہوتا ہے۔ اتنا کھا سکتی ہوں میں؟ سب کام والیوں کو دینا پڑتا ہے۔ چاچا کہاں ہے؟ ٹھیک ہے ناں!" نازاں بولتی چلی گئی۔

گلو کے اندر اٹھنے والی آندھی کا رخ تبدیل ہوگیا۔ "ہاں.......... ٹھیک ہے۔ مجھے تو جلدی نکلنا تھا۔" پھر وہ امام دین کی طرف پلٹ کر بولا۔ "تیری طرف ہی جارہا تھا۔"

"اچھا! چلتے ہیں۔" امام دین نے دھیمی آواز میں کہا اور دل ہی دل میں خود کو کوسنے لگا کہ دھوپ پھیلنے کا انتظار کیوں کیا تھا۔ ذرا جلدی آجاتا تو ساری بات ہو جاتی۔ اب وہ کوئی بات بھی گلو کے سامنے نہیں کرسکتا تھا۔

"ناشتا کرلیا تو نے؟" گلو نے نازاں سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ نرمی تھی۔

امام دین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی پھیلی محسوس ہوئی۔ نہ تیوری پر بل تھے نہ چہرے پر کرختگی.......... "شکر ہے.........." اس نے دل میں کہا۔ "ورنہ اس کا لہجہ تو نازاں کو ہراساں ہی کر دیتا اور خاص طور پر ان حالات

میں ایسی کوئی بھی بات ہو جاتی تو یہ پاگل جانے کیا قدم اٹھاتی!" وہ خود سے ہم کلام تھا۔ "پھر پہلے کی طرح کہیں چلی جاتی تو..........!! میں کہاں تلاش کرتا؟ مجھے دیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اسے صرف اتنا ہی کہہ دیتا کہ گھبرانا نہیں میں ہوں۔ میں ہر حال میں تیرا ساتھ دوں گا۔ ساری بدنامی اپنے سر لے لوں گا.......... تو نازاں کتنی مطمئن ہو چکی ہوتی۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے خود کو تسلی دی۔ "گلو کے جاتے ہی پھر آجاؤں گا اور اس بار وقت ضائع کئے بغیر سب کچھ کہہ دوں گا۔" اس نے فیصلہ بھی جلدی کرلیا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گلو ایک دم ہی کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوا؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"پیسے بھول گیا۔" وہ اپنی جیبیں ٹٹول کر بولا۔ "ہزار کا نوٹ دیا تھا پھل والے کو.......... واپس لینا بھول گیا۔"

"ہائے۔" نازاں ایک دم اٹھ کر بیٹھی۔ "ہزار روپے..........!! دماغ کہاں تھا تیرا جو.........."

"کہاں سے لئے تھے؟" امام دین نے پوچھا مگر گلو رکا نہیں، یہ کہتا ہوا دروازے کی طرف لپکا کہ میں ابھی آتا ہوں۔ نیچے سے ہی لئے تھے۔

یہ موقع جیسے امام دین کو اللہ نے فراہم کیا تھا۔ اس نے بغیر کسی تمہید کے نازاں سے بات کرنے کا فیصلہ لمحے کے ہزارویں حصے میں کرلیا۔ جونہی گلو کمرے سے باہر گیا، امام دین ذرا سا آگے سرک آیا۔ "نازاں.......... میں نے بتایا تھا ناں کہ میں.......... میں تمام رات جاگتا رہا ہوں۔"

"ہاں.......... نہیں تو.......... کیا ہوگیا تھا؟" اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

امام دین کا ارادہ تھا کہ وہ اسے زیبی کے ٹھکرا دینے کے بارے میں بتا کر کہہ دے کہ اب میں نے سوچا ہے کہ تمہیں اپنی پناہ میں لے لوں تاکہ آنے والے لمحوں کی خوفناکی کم ہوسکے اور وہ بھی دنیا میں بکھری خوشیوں کا کچھ حصہ سمیٹ سکیں، مگر اچانک ہی وہ ٹھٹک گیا۔ بجلی کی سی سرعت سے یہ خیال آیا تھا کہ اس طرح نازاں اکھڑ بھی سکتی ہے۔ وہ سوچے گی کہ کیونکہ اسے زیبی نے ٹھکرا دیا۔ اس لئے وہ اسے قبول کرنے پر تیار ہوگیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور یہ اس کی کھڑی کی جانے والی عمارت کی پہلی کچی اینٹ ہوگی اور بنیاد ہی جب پکی نہ ہو تو عمارت کیسے مضبوط ہو سکتی ہے۔

"بتاؤ ناں!" نازاں اب بھی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "کیوں جاگتے رہے؟ میرے بارے میں سوچتے رہے تھے؟"

"ہاں!" امام دین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"بے کار ہے مامے۔" اس نے افسردگی سے سر تکیے پر ٹکا دیا اور چھت کو تکنے لگی۔ "میرا مقدر بہت برا ہے۔ مجھے کبھی اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع نہیں ملا' کبھی کوئی ایسی خوشی نہیں ملی جیسی میں نے چاہی۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا پیار چھن گیا۔ ہمیشہ مجھے دوسروں کے گناہوں کی سزا دی گئی۔ میری ماں نے میرے باپ کے مرنے کے بعد دوسری شادی کرلی تھی تب اس کی سزا بھی مجھے یوں دی گئی کہ مجھے ماں سے بھی جدا کرکے خالہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ میں خوشی کے ایک پل کو ترستی رہی' پڑھنا چاہا تو خالو نے پڑھنے نہیں دیا۔ سوتیلے باپ سے پیدا ہونے والے بہن بھائیوں سے پیار کرنا چاہا مگر انہیں دیکھنا تک نصیب نہیں ہوا۔ ماں سب سے چھپ کر مجھے ملنے آتی تھی' جب یہ ملاقاتیں کھلیں تو بھی سزا کی مستحق میں ہی ٹھہری۔ وہ شہر چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ ماں کو ایک نظر دیکھنے کو ترسا دی گئی.......... اب.......... اب خالہ کے مرنے کے بعد چچا نے محبت دی تو گلو.......... اور پھر یہ نئی مصیبت.......... مجھے یقین ہے کہ اس کی سزا بھی مجھے ہی ملے گی.........." وہ بہت دھیمی آواز میں بول رہی تھی۔

"نازاں.......... اب ایسا نہیں ہوگا۔ دیکھو نازاں! میں اب سے پہلے بھی کہنا چاہتا تھا کہ.........." امام دین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر دیر ہوگئی تو گلو آجائے گا۔ نازاں سر گھما کر اسے دیکھ رہی تھی۔ امام دین کے لہجے میں ہلکا ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔ "نازاں میں.......... میں تجھ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تو بالکل بھی پریشان نہ ہو.......... میں.......... میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے اور اب اس فیصلے کو میرا مقدر بھی نہیں بدل سکے گا۔ میں اپنی ہر خوشی چھین لیا کروں گا۔ میں مقدر کے طوفان میں اپنے آپ کو بہا کر اپنی تباہی نہیں چاہتا۔ میں آج ہی چاچا سے بات

کروں گا۔ تو اب کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔ کہیں بھی نہ جانا نازاں اور گلو کو بھی میں دیکھ لوں گا۔"

☆==========☆============☆

نازاں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ امام دین کی آنکھوں کے کناروں میں سرخی سی بھر گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ نازاں کا وجود طوفانوں کی زد میں تھا۔ اسے تو گمان بھی نہیں تھا کہ امام دین کیا کہنے والا ہے۔ اچانک اسے ہوش سا آگیا.......... وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مامے.......... یہ.......... یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟ تجھے نہیں پتا کہ گلو.........."

"میں نے کہا ناں کہ وہ میرے اوپر چھوڑ دے۔" امام دین نے ہاتھ اٹھا کر تیزی سے کہا۔ ابھی وہ کچھ اور کہنے والا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور گلو اندر داخل ہوا۔ امام دین پر ایک دم ہی سناٹا چھا گیا۔ نازاں ابھی تک فق بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں گلو پر جم گئی تھیں۔ امام دین غیر محسوس انداز میں پیچھے سرک گیا تھا۔

"دے ہی نہیں رہا تھا۔" گلو نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کہتا تھا آپ نے ہزار کا نوٹ نہیں دیا تھا' سو روپے کا نوٹ دیا تھا۔"

جواب میں خاموشی طاری رہی تو اس نے چونک کر نازاں کو دیکھا۔ "تیری طبیعت خراب ہے کیا؟"

"آں.......... میں.......... ٹھیک ہوں میں۔" وہ بوکھلا گئی۔ "پیسے دے دیئے؟"

"ہاں.......... بڑی مشکل سے لئے ہیں۔ ایک چھولے والے نے دیکھا تھا کہ میں نے ہزار کا نوٹ دیا ہے۔ وہیں کھڑا ہوتا ہے وہ بھی' ورنہ وہ تو مکر گیا تھا۔ سالے سارے حرامی ہیں۔"

"ہاں.........." نازاں نے بے تکے پن سے جواب دیا۔

"کیا بات ہے؟" گلو کے لہجے میں تشویش تھی وہ اب اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔

"نازاں کیا تو خوش نہیں ہے؟" پتا نہیں اس نے کس خیال کے تحت پوچھ لیا۔

"ہوں!" وہ بڑے کرب سے مسکرائی۔ اس کا جی چاہا کہہ دے "میری ہر خوشی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیچھے غم لگا ہوتا ہے۔" مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ امام دین نے جس انداز سے اپنا مقدر خود بنانے کی بات کی تھی اس نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا اس کے لیے وہ امام دین کو قصور وار نہیں جانتی تھی۔ اس نے تو اس سے ہمدردی کی تھی۔ ممکن ہے محبت بھی کرتا ہو' اب حالات دیکھ کر اس کی ہمت ہوئی ہو' مگر نازاں اپنی اور اس کی بدقسمتی پر اداس تھی۔ گلو اسے اپنانے پر تیار بھی ہوا تو کیسے نازک وقت میں اور امام دین نے محبت کا اظہار کیا تو وہ بھی کس موڑ پر.......... یہ اس کی اور امام دین کی بدقسمتی ہی تو تھی۔ وہ تو جیسے سولی پر لٹک گئی تھی۔ گلو اس کی پہلی اور آخری خواہش تھا۔ جذبوں کے ایسے کچے پن میں گلو اس کے دل میں جا بیٹھا تھا کہ اسے نکال دینا اس کے بس میں نہ تھا اور.......... اور اس سے شادی کرکے' کسی اور کے حرامی بچے کو اس سے منسوب کرنا بھی تو اس کے بس میں نہیں تھا۔

وہ ایک ایسے دوراہے پر آکھڑی ہوئی تھی جہاں سے نہ لوٹنا ممکن تھا نہ آگے بڑھنا۔ امام دین اس کے لئے ایک مضبوط پناہ گاہ تھا تو گلو اس کی زندگی' اس کی محبت اور تکلیف دہ بات یہ تھی کہ امام دین جانتا تھا کہ اسے گلو سے پیار ہے مگر وہ بچے کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی گلو اور چاچا کا فیصلہ سن کر پریشان تھی' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ڈاکٹروں کے مطابق بچہ تین ماہ کا تھا۔ اسقاط بھی ناممکن تھا کہ وقت بہت گزر چکا تھا اور شادی کے صرف چھ ماہ بعد بچے کی پیدائش اس کی تمام زندگی تباہ کر سکتی تھی۔ گلو کا یہ جھکاؤ شدید نفرت میں تبدیل ہو سکتا تھا۔ اسے چھپانا ہی نہیں تھا۔ وہ تو فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ گلو کو اتنا بڑا دھوکا نہیں دے گی' بلکہ اسے یا چاچا کو کچھ بتائے بغیر یہ شہر چھوڑ دے گی' مگر اس فیصلے نے بھی اسے شدید خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ پیٹ میں بچہ لے کر کہاں جائے گی! کس کے پاس پناہ لے گی۔ کیسے اسے جنم دے گی اور پھر کیسے اسے پالے گی؟ ایک حرامی بچہ پیدا کرنا پھر اسے پالنا آسان کب تھا؟ ابھی تو وہ ایک عذاب سے ہی نہیں نکلی تھی' ایک ہی فیصلے پر تیار نہیں کر پائی تھی خود کو تو.......... امام دین..........۔"

"نازاں!" اچانک گلو نے اسے پکارا۔

"ہوں۔" وہ چونک اٹھی۔

"کیا ہو گیا ہے تجھے۔ بتاتی کیوں نہیں؟" گلو اب مشتعل ہو رہا تھا۔

"کچھ نہیں.......... بس کمزوری ہے۔ جی نہیں چاہتا بات کرنے کو۔" نازاں نے سنبھل کر جواب دیا۔ امام دین کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیا گلو نے اسے اپنے اور چاچا کے فیصلے کے بارے میں نہیں بتایا؟" نازاں نے اس کی نگاہوں کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے سوچا۔ "اگر بتا دیا تو.......... تو وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟" اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"میں باہر ہوں۔" اچانک امام دین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"آتا ہوں میں.......... جانا نہیں.........." گلو نے پلٹ کر کہا۔ امام دین آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر آگیا.......... وہ نہیں چاہتا تھا کہ نازاں اس کے فیصلے کے بارے میں گلو کو کچھ بتائے۔ وہ خود مناسب وقت دیکھ کر اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر نازاں کو منع کرنے کا نہ موقع تھا نہ وقت.......... وہ باہر برآمدے میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔

☆==========☆============☆

ذرا دیر بعد ہی گلو واپس آگیا۔ وہ کچھ الجھا ہوا تھا اور امام دین اس کے چہرے کے تناؤ میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔

"چاچا نہیں آیا؟" اس نے گھمبیر خاموشی کو توڑتے ہوئے گلو سے پوچھا۔

"ہاں.......... ہاں.......... رات بھر جاگتا رہا تھا۔ پتا نہیں کب سویا ہو گا۔ صبح اٹھ جاتا ہے مگر آج بڑی گہری نیند میں تھا۔ میں نے نہیں اٹھایا۔ اب اٹھے گا تو سیدھا اسپتال دوڑے گا۔ تجھے تو پتا ہے کہ نازاں کو وہ اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہے۔" گلو اب قدرے نارمل تھا۔

وہ دونوں اسپتال کی عمارت سے باہر آچکے تھے۔ گلو اپنی ٹیکسی میں آیا تھا جو بیرونی گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ گلو نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی تو امام دین دوسری طرف سے اندر آبیٹھا۔ وہ اسی چکر میں تھا کہ گلو سے کیسے بات کرے۔ اتنا احساس اسے ہو گیا تھا کہ یہ معاملہ جتنی جلدی نمٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ دیر نازاں کے لئے اچھی نہیں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہر گزرتا ہوا لمحہ اسے بدنامی کے خوف ناک گڑھے کی طرف دھکیل رہا تھا اور وہ اسے بچانا چاہتا تھا۔

"گیراج جاؤں گا۔" امام دین نے کہا اور گلو نے ٹیکسی اس سڑک کی طرف موڑ دی جو امام دین کے گیراج کی طرف جاتی تھی۔

"کیا ہوا ماے! زیبی سے بات ہوئی؟" گلو نے پوچھا۔

"بتایا تو تھا۔"

"ہاں.......... مگر پھر بات نہیں ہوئی؟"

"پھر کب ہوتی؟ رات تو نے ہی تو گیراج پر چھوڑا تھا۔ وہاں سے سیدھا اسپتال آیا تھا۔ وہ بے خیالی میں کہہ کیا گیا پھر خود ہی بوکھلا گیا۔

"گاڑی دینی تھی ناں یہاں.......... پھر اسپتال چلا گیا۔"

"چل میں چلتا ہوں تیرے ساتھ۔ میں بات کروں گا۔ زیبی سے.......... مجھے پتا ہے، تیری ہمت ہی نہیں ہوئی ہوگی بات کرنے کی۔ ابے تو کیسا مرد ہے، اتنے برس ہوگئے اور تو.........."

"چھوڑ گلو! اب تو میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ آدمی کی ہر امید تو پوری نہیں ہوتی ناں! میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے چاہتی ہے اور وہ خیال غلط نکلا۔ اس میں ضد، بحث والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ زبردستی خوشی حاصل کرنے کا میں قائل نہیں ہوں۔ اپنے مقدر کی نہیں تھی سو نہیں ملی۔"

"ایسے ہی طے کرلیا کہ تیرے مقدر کی نہیں تھی۔" گلو جھنجلا گیا۔

"میں نے کہا ناں کہ چھوڑ۔" امام دین نے اکتائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"کیسے چھوڑوں یار.......... اتنا لمبا چوڑا پروگرام بنایا تھا۔ میں نے.......... سوچا تھا خوب مزہ آئے گا جب تیری میری دونوں کی شادی ایک ہی دن، ایک ہی وقت میں اور ایک ہی ہال میں ہوگی۔" گلو خوش تھا۔

"ارے ہاں.......... تو بتا رہا تھا کہ چاچا نے تیری شادی طے کردی ہے۔" امام دین چونک اٹھا۔

"ہاں.......... اور میں نے یہی سوچا تھا کہ تیری بھی زیبی سے بات ہو جائے گی تو ہم دونوں ایک ہی تاریخ طے کریں گے۔ سارا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔" گلو نے منہ بنا کر کہا۔

"تاریخ تو ایک ہی طے ہو سکتی ہے مگر.......... زیبی سے نہیں.........."

"کیا مطلب!" گلو حیران ہوا۔

"مطلب یہ کہ شادی تو کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تو مجھے کرنا ہی ہے ناں! زیبی نہ سہی کوئی اور سہی!" امام دین محتاط تھا۔

"یعنی.......... تیرا چکر کسی اور سے بھی چل رہا ہے!" گلو ہنسا۔

"نہیں، چکر نہیں.......... لڑکی بہت اچھی ہے۔ ہم دونوں ہی کی طرح اکیلی، بے سہارا خوشیوں کے لئے ترسی ہوئی لیکن شریف خاندان کی لگتی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کے ہاں بات ڈال دوں۔"

"ارے تو پھر دیر کس بات کی ہے!" گلو نے خوشی سے پہلو بدلا۔ "مجھے بتا.......... میں چلتا ہوں بلکہ چاچا اور رحمان چاچا، چاچی کو بھی لے لیں گے۔"

"نہیں.......... ابھی نہیں۔" امام دین ایک دم بول اٹھا۔

"کیوں؟"

"پہلے میں لڑکی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ایک ہی بات ہے یار، اس کے گھر والے اس سے پوچھے بغیر تو ہاں نہیں کریں گے ناں!"

"اس کے گھر والے نہیں ہیں۔"

"ہیں..........!"

"ہاں۔"

"پھر کہاں رہتی ہے؟"

"جاننے والوں کے ساتھ۔"

"تو ان سے بات کرلیں گے۔" گلو کو بہت جلدی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں مگر میں پہلے اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پھر ان لوگوں سے کروں گا۔"

"جلدی کر لے یار، چاچا شاید آج ہی تاریخ طے کر لے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا ناں تو تجھے بھی وہی تاریخ رکھنا پڑے گی۔" گلو نے نخرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"چل وعدہ رہا۔ مگر یہ تو بتا کہ تیری شادی کہاں طے ہوئی؟"

"تو بتا کہاں طے ہوئی ہوگی؟"

"پاگل ہو گیا ہے کیا؟ یہ کوئی پہیلی ہے۔ مجھے کیا پتا کہ تیرے چاچا نے کون سی لڑکی پسند کی ہے۔" امام دین الجھ گیا۔

"تو جانتا ہے اسے!" گلو نے پھر مسکرا کر کہا۔

"ہیں.......... میں جانتا ہوں؟" وہ ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنے لگا۔

گاڑی گیراج پر پہنچ کر رک چکی تھی۔ ابھی امام دین اندازے لگا رہا تھا کہ چھوٹا بھاگتا ہوا قریب چلا آیا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

"ماے.......... وہ آیا تھا.......... وہ موٹا، گنجا، سفید گاڑی والا۔"

"عثمان دادا؟" بے ساختہ امام دین کے منہ سے نکلا۔

"پتا نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ امام دین سے کہنا، اسماعیل نے بلوایا ہے۔"

گلو اور امام دین ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"اچھا چل! دوڑ کے چائے لے آ۔" امام دین نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسماعیل کو کوئی ایمرجنسی ہوگی ورنہ وہ اس طرح سویرے ہی عثمان دادا کو نہ بھیجتا۔ وہ عموماً ایسے پیغامات رات کے وقت بھجوایا کرتا تھا۔ چھوٹا چائے لینے چلا گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سوچتے ہوئے، ساتھ ہی بڑی بینچ پر آ بیٹھے۔

"اسماعیل کو کوئی کام ہوگا۔" گلو نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ "پتا نہیں صرف تجھے بلوایا ہے یا مجھے بھی؟"

"ایسا کرتے ہیں، چائے پی کر اسی طرف چلتے ہیں۔" امام دین نے رائے دی۔

"فون کر لو۔"

"نہیں.......... فون کے لئے اس نے سختی سے منع کیا ہے کہ ایمرجنسی کے علاوہ

کبھی فون نہ کیا جائے اور فون پر بھی ایسی کوئی بات نہ ہو جو مشکوک ہو.......... خیر.......... جو بھی ہوگا، سامنے آجائے گا۔"

چھوٹا فوراً چائے لے آیا۔ امام دین کا ذہن اس پیغام سے الجھ گیا تھا۔ اسے اپنے اعصاب میں تناؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت توقع نہیں تھی یا وہ ایسا کوئی مسئلہ ابھی کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی ہو، وہ بہت الجھ گیا تھا۔ مسلسل سوچے جارہا تھا کہ ایسی کیا بات ہوئی ہوگی کہ اسماعیل نے صبح میں عثمان دادا کو بھیج دیا۔ گلو نے اس کی کیفیت کو محسوس کر لیا تھا۔ خود اس کا ذہن بھی بھٹک گیا تھا۔ اسے اس پیغام سے خوشی ہوئی تھی۔ وہ تو سوچ رہا تھا کہ شاید اب اسے وہ رقم حلال کرنے کا موقع مل جائے جو اسماعیل دے چکا ہے۔ پھر اسے شادی کے سلسلے میں بھی رقم درکار تھی۔ نازاں کو وہ ساری خوشیاں یکمشت دے دینا چاہتا تھا جن کے لئے وہ ہمیشہ ترستی رہی تھی۔

"چلیں۔" بڑی دیر کی خاموشی کے بعد امام دین نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آں.......... ہاں چلو۔" گلو کھڑا ہو گیا۔ یوں بھی اسے کوئی کام نہیں تھا۔ نازاں کے پاس جانا تھا مگر چار بجے کے بعد، اور ابھی چار بجنے میں بہت دیر تھی۔

اسماعیل کے گھر کی طرف جاتے ہوئے بھی امام دین گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ گلو امام دین کو بتانا چاہتا تھا اس کی شادی کس سے ہو رہی ہے مگر اس موڈ میں بتا کر وہ اپنی خوشی کو کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یوں اس نے فیصلہ کر لیا کہ واپسی پر اگر کوئی مسئلہ نہیں ہوا تو وہ امام دین کو بتا دے گا۔ اسے شدید دکھ تھا کہ زیبی نے ماے کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اسے اس بات پر حیرت بھی تھی کہ اس نے امام دین کو مسترد کر دیا۔ وہ جو اس کے گھر میں برسوں سے رہ رہی تھی، کسی اور کو چاہتی رہی مگر ماے کو علم ہی نہ ہوسکا، وہ اس کے خواب بنتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ اگر امام دین کی جگہ وہ ہوتا تو اسے لات مار کر اپنے گھر سے نکال دیتا مگر پتا نہیں یہ ماما کس مٹی کا بنا ہوا تھا؟

"کیا سوچ رہا ہے؟" امام دین اچانک بول اٹھا۔

"جو کچھ سوچ رہا ہوں اگر تجھے بتا دیا تو.........." گلو کے انداز میں غصہ تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا مطلب؟"

"یہی کہ وہ جو تیری زیبی ہے' تیرے ہی گھر میں رہ کر تجھے ہی دھوکا دیتی رہی۔ کسی اور سے عشق کرتی رہی اور تو............"

"گلو!" انداز میں تنبیہہ تھی۔ "تو جو کچھ سمجھ رہا ہے' غلط ہے۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ میں نے شاید تجھے بتایا نہیں کہ جسے وہ چاہتی ہے' وہ تو برسوں پہلے دنیا کے ہجوم میں گم ہو چکا ہے۔ اس نے کبھی بچپن میں اسے دیکھا تھا اور پھر............ وہ اس کے دماغ میں بیٹھ گیا' دل میں چھپ گیا۔ وہ اسے چاہتی رہی' یہ جانے بغیر کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے پھر وہ اسے نہیں ملا۔ زمانے کے حوادث زیبی کو کہیں سے کہیں لے آئے مگر وہ اپنے تصور سے اسے نہیں نکال سکی۔ وہ کسی شخص سے نہیں' ایک شخص کے سائے سے' اس کے خیال سے' محبت کرتی ہے............ اور یہ............ یہ بات ایسی نہیں کہ جس پر جھگڑا کیا جائے۔ اس نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر غصہ کیا جائے یا اسے الزام دیا جائے۔ تو خیال ہی خیال میں' دل ہی دل میں' کسی کو بھی چاہتا رہ............ کوئی تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ میں بھی اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اتنے برس جس طرح' جس عزت کے ساتھ رہی ہے' پورا محلہ اس کی شرافت کا گواہ ہے۔ اس نے کبھی مجھے یا کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا اور دل پر کسی کا بس ہی کہا چلتا ہے یار! یہ بھی اس کی خوبی تھی کہ اس نے جھوٹ بولے بغیر سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ یہ تو میں ہی گدھا تھا جو اس کے کچھ کہے سنے بنا اس سے محبت کرتا رہا اور اس کی خاموشی یا احترام کو محبت سمجھتا رہا۔ اپنی بیوقوفی کی سزا میں اسے کیونکر دے سکتا ہوں اور اب تو بات ہی ختم ہو گئی یار............! اب تو میں نے ایک اور فیصلہ بھی کر لیا اور میں اپنے اس فیصلے پر بہت خوش ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار صحیح فیصلہ کیا ہے' ایسا فیصلہ جو خود میرے علاوہ کسی اور کو بھی عزت کا مقام دے سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" گلو چونک اٹھا۔

"مطلب یہ کہ میں نے ایک اور لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔"

"وہ کون ہے ماسے!"

"بتا دوں گا یار! جب اس سے بات کر لوں گا تو بتا دوں گا۔ اب تو' تو بتا............ تیری شادی کب ہے اور کس سے ہو رہی ہے؟"

"شادی تو میں تب ہی کروں گا' جب تو کرے گا۔"

"بیکار کی ضد ہے۔ چاچا تاریخ طے کر دے گا اور تجھے کرنا پڑے گی۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں کل ہی یہ بات طے کر لوں گا۔ دیر تو میں بھی نہیں کر سکتا۔" آخری جملہ امام دین نے یوں دھیمے سے کہا تھا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ "اچھا چھوڑ۔ یہ بتا تیری شادی ہو کس سے رہی ہے؟ اچانک تیرے چاچا کو لڑکی کہاں سے مل گئی پھر تو کیسے تیار ہو گیا؟"

"بس یار............! میرے ساتھ بھی وہی مسئلہ ہے۔ اب میں............"

اچانک ہی وہ خاموش ہو گیا۔ وجہ سامنے کھڑی موبائل تھی۔ ان سے تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر پولیس موبائل کھڑی تھی۔ چیکنگ ہو رہی تھی۔ کئی گاڑیاں روک رکھی تھیں۔ گلو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "کیا ہو گیا؟" اس کی آواز میں خوف تھا۔

"پتا نہیں............ مگر تو کیوں ڈرتا ہے؟" امام دین نے رفتار دھیمی کر لی۔ "اس طرح وہ بے وجہ شک کریں گے۔ سنبھال خود کو۔"

بات کچھ بھی نہیں تھی مگر گلو کے دل میں شاید شروع سے ہی خوف بیٹھ چکا تھا حالانکہ اب تک اس کا واسطہ پولیس سے نہیں پڑا تھا۔ ممکن ہے اس کے اندر خوف کو بڑھانے والا اس کا اپنا ضمیر ہو اسے پوری طرح احساس تھا کہ فتح کے چکر میں آ جانے سے لے کر اب تک وہ ٹھیک نہیں کرتا رہا۔ گو ابھی تک اس سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا تھا مگر اس شخص کے لئے جس نے کبھی جرم نہ کیا ہو' جرم کرنے کا احساس ہی سب سے بڑا جرم بن جاتا ہے اور یہی گلو کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اب تک اس احساس جرم کا زندہ رہنا' اس میں خوف پیدا ہو جانا ہی اس کے ضمیر کی جیت تھی۔ اس حیثیت کو اسماعیل ہار میں تبدیل کرنا چاہتا تھا اور گلو غیر محسوس انداز میں' غیرارادی طور پر اس سے تعاون کر رہا تھا۔ اس سے تعاون کرنے کا احساس ہی تھا جو اس وقت بے وجہ ہی اسے خوفزدہ کر گیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امام دین بہت پُراعتماد تھا۔ پولیس موبائل کے قریب جاتے ہی اس نے گاڑی روک دی تھی اور استفہامیہ انداز میں باہر کھڑے آفیسر کو دیکھا۔

"خیریت ہے سر!"

آفیسر نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی خود اعتمادی اور سکون نے اسے جلد ہی مطمئن کر دیا۔ گلو پر تو اس نے زیادہ دھیان بھی نہیں دیا اور امام دین کو بتانے لگا کہ انہیں ایک گنجے اور موٹے شخص کی تلاش ہے۔ یہ تلاش کیوں ہے' یہ اس نے نہیں بتایا مگر حلیہ سن کر گلو کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے چونک کر امام دین کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ حلیہ اسے بھی چونکا دے گا مگر امام دین کو اپنے تاثرات پر مکمل کنٹرول تھا۔ وہ ویسے ہی پُرسکون انداز میں سن رہا تھا پھر ہنس کر بولا۔

"سر! گنجا تو میں بھی ہوں۔ ویسے اللہ کا شکر ہے کہ میں موٹا نہیں ہوں ورنہ ثابت کرتے کرتے اسی ڈیل ڈول تک پہنچ چکا ہوتا۔"

آفیسر' جو تیوری پر بل ڈالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا' بے ساختہ مسکرا اٹھا۔ "ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں۔"

"شکریہ۔" امام دین نے بڑی شائستگی سے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ماے............!" گلو نے کچھ کہنا چاہا۔

"چپ رہو۔" امام دین نے سرگوشی کی یوں جیسے پولیس والا ان کے ساتھ بیٹھا ہو۔

گلو پر خوف پوری طرح غالب آ چکا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ وہ جان چکا تھا کہ پولیس کو عثمان دادا کی تلاش ہے۔ اسے ایک ہی گھبراہٹ تھی کہ وہ امام دین کے گیراج پر کیا پیغام لے کر آیا تھا۔ اسماعیل نے اسے کیوں بلوایا تھا' پھر کیا ہوا؟ عثمان نے کیا کیا جو پولیس اسے تلاش کر رہی ہے؟ وہ اسماعیل کی کوٹھی کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا مگر امام دین اسی سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا جو اسماعیل کی کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ گلو نے خود پر قابو پانے کی پوری کوشش کی مگر آخر اس کے اعصاب چٹخنے لگے۔

"ماے! ادھر مت جاؤ۔"

"ادھر نہیں جا رہا۔ تم چپ بیٹھے رہو۔" امام دین کا لہجہ سن کر گلو اچنبھے میں رہ گیا۔ بڑا خونخوار انداز تھا اس کا۔ گلو نے دیکھا امام دین کے جبڑے بھینچے ہوئے تھے۔ بازو کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں اور وہ خاصے غصے میں لگ رہا تھا۔

گلو نے پھر اس سے کچھ نہیں کہا۔ سامنے سڑک پر نظریں جما دیں۔ اگلے راؤنڈ باؤٹ سے ہی امام دین نے گاڑی دہلی کالونی کی طرف موڑ دی تو گلو کی جان میں جان آئی۔

پتا نہیں کتنی دیر تک وہ لوگ بے مقصد سڑکوں پر گھومتے رہے۔ چیکنگ ایک دو سڑکوں پر نہیں بلکہ کئی راستوں پر ہو رہی تھی۔ ابھی تک انہیں علم نہیں ہو سکا تھا کہ کیا ہوا ہے؟"

"ماے! اس طرف جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اسماعیل نے اسے کیوں بھیجا ہو گا؟"

"پتا نہیں............ ایسا کرتا تو نہیں ہے' کوئی گڑبڑ ہے گلو!"

"پھر؟" گلو امام دین کے انداز میں تشویش دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"پھر کیا! تو کیوں فکر کرتا ہے؟ گھر جا کر شادی کی تیاریوں میں لگ' اپنے کام نمٹا۔ تجھے اسماعیل یا عثمان دادا سے کیا لینا دینا اور عثمان دادا تو تجھے جانتا بھی نہیں ہو گا۔"

"ہاں' امام دین ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عثمان دادا سے گلو کو قطعی کوئی خطرہ نہیں تھا اس کے علاوہ کہ وہ اسماعیل کا آدمی ہے۔ گلو اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا اور وہ بھی گلو کے بارے میں لاعلم تھا۔ ہاں گلو نے ایک بار اسے گیراج پر ضرور دیکھا تھا جب وہ فتح کی کوٹھی میں ملنے والی لڑکی کے ساتھ آیا تھا مگر اس بات کو بھی بہت زمانہ ہو گیا تھا۔

"کہاں جائے گا؟" اچانک امام دین نے اسے چونکا دیا۔

"آں............ میں............! گھر چھوڑ دے۔ جانا تو اسپتال تھا مگر وہ چاچا تو میری جان کو رو رہا ہو گا۔ اس نے کہا تھا کہ مرغی لا کر دینا' یخنی بنوا کر اسپتال لے جاؤں گا۔ اب اسی کے ساتھ نازاں کے پاس جاؤں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نازاں کانام آتے ہی امام دین کو اپنے اندر ہلکی سی فرحت انگیز ٹھنڈک پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شدت سے احساس ہوا کہ خدا نے اسے بروقت توفیق دے دی کہ وہ نازاں کو منجھدار سے نکال لے جائے۔ اس نے ایک دم ہی فیصلہ کرلیا کہ گلو کو گھر پر چھوڑ کر وہ سیدھا اسپتال جائے اسے صاف صاف بتادے گا کہ وہ ہر حال میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنی ساری پریشانیاں وہ اسے دے دے اور اسے یہ بھی کہہ دے گا کہ وہ آج ہی گلو اور چاچا اس کے رشتے کی بات بھی کرلے گا۔ گلو کو یوں بھی جلدی ہے۔ اچھا ہے اگر دونوں کی تاریخیں ایک روز طے ہو جائیں تو خوب دھوم دھڑکا ہوگا۔ دونوں یار ایک ساتھ ہی نئی زندگی کے سفر پر روانہ ہوں گے۔ اس فیصلے نے امام دین کو بڑا ہلکا پھلکا کر دیا۔ نازاں کا معصوم سا چہرہ اور بھیگی ہوئی آنکھیں اس کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ جب اس نے نازاں سے محبت کا اظہار کیا تھا تو اس نے کس کرب سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اگر گلو نہ آگیا ہوتا............تو............

"ماے!!" گلو نے زور سے پکارا۔

وہ اچھل پڑا۔ "چیخ کیوں رہا ہے؟" وہ بگڑ گیا۔

"چھ مرتبہ آواز دی ہے۔ تجھے سنائی ہی نہیں دے رہا تو چیخوں گا نہیں؟ کہاں کھو گیا تھا؟"

"ہاں............وہ............میں سوچ رہا تھا کہ چاچا سے............" وہ جھجکا۔

"چاچا سے کیا کام ہے؟"

"نہیں' میرا مطلب ہے کہ شاید میں آج ہی رات کو تجھے اپنی شادی کی تاریخ بھی بتادوں پھر تو بھی وہی تاریخ رکھ لینا۔"

"ارے............! آج ہی؟؟" گلو ایک دم خوش ہوگیا۔ "مگر تو' تو کہہ رہا تھا کہ پہلے بات کروں گا پھر۔"

"ہاں تو یہاں سے جاتے ہی بات کرلوں گا ناں!"

"چل یار! ایسا ہو جائے تو مزہ ہی آجائے۔"

☆==========☆==========☆

گاڑی گلو کی گلی داخل ہوئی۔ چاچا باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ لگتا تھا گلو ہی کا ار کر رہا ہے۔ امام دین نے ٹیکسی قریب لاکر روک دی۔ اب وہ چاچا کو دوسری نظر دیکھ رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ نازاں کا ہاتھ مانگنے اسے اسی بوڑھے کے پاس آنا ہے اس اس کا احترام تو بہت ضروری ہے۔

"بیٹا امام دین............! تم اچھے آدمی لگتے ہو۔ تم نے میرے گلو کو بہت سہارا دیا ۔ اس کا آگے بھی خیال رکھنا بیٹا! اب تو............"

اچھا چاچا بس! اب اسے لیکچر مت دینا شروع کر دینا۔" گلو نے دونوں آستینیں ھاتے ہوئے کہا۔ وہ منہ ہاتھ دھونے کا ارادہ رکھتا تھا۔

"اور ہاں............" گلو نے پلٹ کر پکارا۔ "یخنی کا کیا ہوگا؟"

"تیری آس پر زندگی گزارتا! خود دے آیا تھا اور یخنی بھی بنالی تھی۔ تو جلدی کر نہ میں اب دیر نہیں کروں گا۔" چاچا نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ تو جلدی کر رہا تھا گھر آنے کی چاچا............ مگر مجھے راستے میں کچھ کام تھا' بس یں دیر ہوگئی۔" امام دین نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے کہا۔

"مجھے ڈر ہی لگتا ہے بٹوا اس کی حرکتوں سے۔ اب شادی کرکے بھی سنجیدگی سے رہا تو کیسی بے عزتی ہوگی اور پھر تمہیں تو پتا ہے۔ یہاں ایک سے دو ہوئے اور وہاں ار ہوگئے۔ گھر بسنے کی دیر ہوتی ہے' رونقیں اترتی چلی آتی ہیں۔"

"اللہ مبارک کرے چاچا! مجھے گلو نے بتایا تو تھا کہ تم اس کی شادی کر رہے ہو مگر ب تک یہ نہیں بتایا کہ کس سے کر رہے ہو؟" امام دین نے موقع غنیمت جان کر پوچھ لیا کہ گلو نہیں ہے مگر گلو بھی تیز تھا۔ فوراً باہر نکل آیا اور چیخا۔

"چاچا مت بتانا۔ اس نے بڑی شرطیں لگائی ہیں چاچا! اب کی بار میں اس سے شرط لگانا چاہتا ہوں۔ یہ جو تھوڑی سی گھاس اگ آئی ہے سر پر اسے بھی صاف کروا دوں گا۔"

"گلو! سوچ لے' تیری شادی پر تیری چندیا صاف ہو اور............"

"یا تو تیری صاف ہو یا پھر میری۔" گلو نے صاف کہہ دیا۔

"شرط کیا ہوگی؟" امام دین نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ارے! کیا فضول باتوں میں پڑ گئے تم لوگ۔ چل گلو! دیر ہو رہی ہے۔ نازاں بھوکی ہوگی۔ وہاں اسپتال کا کھانا بھلا ایسا ہوتا ہے کہ نگلا جائے؟ میں نے کہہ دیا تھا کہ میں لاؤں گا اور ماسے معاف کرنا بھیا! ہمیں جانا ہے ورنہ........."

"ہاں' میں آپ لوگوں کو چھوڑتا ہوا نکل جاؤں گا" امام دین کا ایک پروگرام تو چاچا کی پھرتی کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا کہ وہ ابھی جاکر نازاں سے پوچھ لے گا۔ اس کا تو خیال تھا کہ گلو کو دیر لگے گی مگر یہ بڈھا تو پہلے ہی سے تیار تھا۔ اب تو بات پھر شام پر جا پڑی تھی۔

اتنی دیر میں گلو بالوں میں کنگھا کرتا ہوا باہر آگیا۔ وہ لوگ اسپتال کے لئے روانہ ہوئے تو بارہ' ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ آج رحمان چاچا کی بیوی نہیں تھی۔ اس کی بیٹی کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی' وہاں جانا تھا۔ تمام راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ امام دین تو یہی سوچتا رہا تھا کہ ان لوگوں نے زیادہ دیر بھی لگائی تب بھی پانچ بجے تک تو چلے ہی جائیں گے۔

گلو سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں چاچا تاریخ کب کی طے کرے گا؟ طے کر دیتا تو امام دین کو بتا دینے میں کتنی آسانی ہو جاتی۔ "چاچا! تو نے تاریخ طے کر دی ہے نا؟"

"تاریخ.........! ابے! تاریخ کس سے کروں گا؟ رحمان کی بیوی تو بیٹی کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ واپس آئے گی تبھی تو تاریخ دے گی۔"

"رحمان چاچا!!" امام دین دھیمے سے بڑبڑایا۔ "رحمان چاچا کی بیوی تاریخ کیوں دے گی گلو؟"

"اس لئے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔" گلو نے پھر آنکھوں میں پتلیوں کو گھما کر اسے شرط لگانے کی ترغیب دینے والے انداز میں کہا۔

"مگر......... تو' تو کہہ رہا تھا کہ اس کے ایک ہی بیٹی تھی۔ شادی شدہ' بچوں والی۔"

"ہاں تو کون سا غلط کہہ رہا تھا؟" گلو کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

اسی نوک جھونک میں وہ لوگ اسپتال پہنچ گئے۔ چاچا نے گلو سے فروٹ لینے کا کہہ

تھا۔ وہ ٹیکسی کے رکتے ہی اتر گیا۔

"چاچا!" امام دین نے موقع غنیمت جانا۔ "گلو کی شادی کس سے ہو رہی ہے؟"

"تجھے نہیں بتایا کیا اس نے؟" چاچا نے اترتے اترتے پلٹ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے امام دین کو دیکھا۔ یہ جان کر واقعی وہ حیرت سے گنگ رہ گیا تھا کہ گلو نے اپنے یار کو ہی نہیں بتایا۔

"نہیں......... جب پوچھتا ہوں ٹال جاتا ہے۔" امام دین نے مسکرا کر اس کی ...یت کی تھی۔

"بہت خبیث ہے۔ بھلا چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور یہ تو نیکی ہے۔ کسی کو سہارا دینا' اسے تحفظ دینا جس کا کوئی آسرا نہ ہو' بڑی نیکی ہے بیٹا! میری مانو تو تم بھی اپنے گلو کا سا فیصلہ کرنا۔ دینے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے' کسی کو خوشی دینا' سکھ دینا' اس کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔" وہ عجیب سرشاری کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"کون ہے چاچا؟"

"ارے یہی اپنی نازاں!"

اور امام دین کو لگا جیسے چاچا نے کچھ اور کہا ہو۔ اس کے دماغ میں نازاں گھسی بیٹھی ہے تو ساعت تک بھی پہنچ گئی یا شاید چاروں طرف پھیل گئی اس لئے اسے یوں لگا جیسے چاچا نے "نازاں" کہا ہو۔

"کک......... کون......... چاچا؟"

"نازاں......... تو نازاں کو نہیں جانتا کیا؟ ایسے حیران ہو رہا ہے جیسے........."

اور امام نے پھر کچھ بھی نہ سنا۔ چوبیس گھنٹوں میں یہ دوسرا بڑا طوفان تھا۔ ابھی تو وہ پہلے ہی سے سنبھل نہ پایا تھا کہ چاچا کے اس انکشاف نے اس کے سر میں بیک وقت کئی دھماکے کر دیئے۔ وہ سن بیٹھا رہ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر یوں بے سدھ پڑے تھے جیسے یہ اب کبھی وہاں سے اٹھ نہیں سکیں گے۔ گلو فروٹ کا تھیلا لے کر قریب آگیا۔

"چل چاچا!" پھر اچانک اس کی نظر امام دین پر پڑی۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں وحشت بھر گئی تھی۔ "چاچا..........!" گلو نے آگے جاتے چاچا کو آواز د کر روک لیا۔ "یہ تھیلا پکڑ۔ تو اوپر جا.......... میں ابھی آتا ہوں۔"

"کیوں.......... کہاں جارہا ہے؟"

"کہیں نہیں،.......... بس تو جا۔" گلو نے اسے سیڑھیوں کی طرف دھکیلا۔ چ کے پلٹتے ہی گلو امام دین کے برابر جا بیٹھا۔ "ماے!" کیا ہو رہا ہے؟ کیا تیری طبیعت خرا ہے؟"

"نہیں.......... نہیں.......... بس.........." امام دین نے سر اسٹیئرنگ پر ٹکا دیا۔

"ماے! چل باہر آ.......... ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔ کل ہی رات کو ڈاکٹر کے پاس ج چاہئے تھا تجھے اور اب تو اسپتال ہی میں ہیں۔ بے پروائی نہیں کرنا چاہئے۔ ماے چل!"

"نہیں یار!!" امام دین چیخ اٹھا۔ "کچھ نہیں ہوا مجھے جا.......... چلا جا.......... چلا یار!" آخری جملہ اس کے منہ سے نکلا تو اس کی آواز بھرا چکی تھی۔

"تو جانتا ہے ماے کہ میں تجھے ایسے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ چل میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس۔" گلو نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

"گلو! یقین کر۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔ بلڈ پریشر کم ہو جاتا ہے اور بس.......... ابھی باہر جا کر لیموں کا شربت پی لوں گا۔ ایک دم فرسٹ کلاس ہو جاؤں گا۔" اس بار اما دین نے اپنے لہجے کو بڑا مضبوط اور شوخ سا بنالیا تھا۔ "جا یار..........! نازاں تیرا انتظار کر رہی ہوگی اور ہاں سن! تاریخ تو طے کرلینا۔"

"ارے! تجھے کس نے بتایا؟" گلو اچھل پڑا۔ اس نے محسوس نہیں کیا کہ امام دین کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ "یہ چاچا ہوگا۔ کوئی بات اس کے پیٹ میں رکتی نہیں ہے۔"

"چل گلو! تجھے مبارک ہو۔" اتنا کہتے ہی امام دین نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

گلو لمحہ بھر کو جاتی ہوئی گاڑی کو دیکھتا رہ گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے دل میں چبھن سی ہوئی تھی۔ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ امام دین کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔

"کیوں.......... آخر کیوں؟ کیا ماے کو میری شادی کا دکھ ہے؟" اس نے پلٹ کر سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

نہیں.......... ایسا تو نہیں ہو سکتا اور پھر خود نازاں کے لئے ہی وہ کتنی بار نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔ اسی نے تو کہا تھا' مجھے احساس دلایا تھا کہ نازاں مجھے پسند کرتی ہے۔ وہ کیوں دکھی ہونے لگا۔ ہاں شاید اس لئے کہ ابھی تک وہ تاریخ طے نہیں کرپایا اور.........."

اس کی سوچ کا شیرازہ اس وقت بکھر گیا جب سیڑھیوں پر بیٹھے چوکیدار نے اسے روک دیا۔ "ابھی وہ بڈھا گیا ہے۔ وہ واپس آئے گا تب جائے گا تم۔"

"یار خان صاحب! مجھے دھندے پر بھی جانا ہے۔ غریب آدمی ہوں۔ ٹیکسی چلاتا ہوں اگر یہاں کے ٹائم کے چکر میں پڑ گیا تو دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ شام کا ٹائم تو تمہیں پتا ہے' دھندے کا ہوتا ہے۔ ابھی دوپہر میں مندی ہے۔ ابھی مل لینے دو۔"

"کتنا بک بک کرتا ہے تم۔" وہ پٹھان چوکیدار' گلو کی بک بک سے واقعی تنگ تھا پھر بھی اسے روکتا ضرور تھا حالانکہ کچھ ہی دیر بعد اسے اجازت دینا پڑتی تھی۔

اسے اجازت دینا پڑی ورنہ گلو بقول اس کے اس کا مغز پلپلا کر دیتا۔ وہ دروازے پر دستک دیئے بغیر ہی کمرے میں داخل ہوگیا۔ نازاں خاموش بیٹھی تھی۔ بے حس و حرکت۔ چاچا کے چہرے پر تمتماہٹ تھی۔ وہ بھی چپ تھا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر آنے سے پہلے ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہوئی ہو اور اب وہ دونوں اس کی موجودگی کی وجہ سے خاموش ہوگئے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" گلو نے قریب آتے ہوئے دونوں کو باری باری دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" چاچا نے ایک دم ہی بات بنا دی۔ موڈ ہی بدل لیا اور نازاں سے ہنس کر بولا۔ "میں نے مرغی نہ خریدی ہوتی تو آج تیرے لئے یخنی بھی نہ آتی۔ یہ تیرا گلو تو کہہ کر گیا تھا کہ جلدی آرہا ہوں پر اتنی دیر میں آیا۔"

"نازاں! کیا بات ہے' یہ چاچا تو.......... تو بتا؟"

"نہیں.......... کچھ نہیں.........." نازاں نے فوراً ہی جواب دیا۔

گلو مطمئن تو نہیں ہوا۔ اسے یوں لگتا رہا جیسے وہ دونوں اس سے کچھ چھپا رہے ہوں مگر پھر بھی جلد ہی سب کچھ بھول بھال گیا۔ چاچا نازاں سے کہہ رہا تھا کہ وہ جلد از جلد اچھی ہو جائے تاکہ شادی کی خریداری میں اس کی مدد کرسکے۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور گلو نگاہوں میں پیار بھرے اسے تک رہا تھا۔

☆==========☆============☆

امام دین کے لئے اسپتال سے گیراج تک کا سفر دوبھر ہوگیا۔ سر میں ہونے والے دھماکوں سے تباہی جیسے دل میں پھیل رہی تھی۔ کل زیبی نے اسے ٹھکرا دیا تھا اور آج نازاں نے............ زیبی نے تو اسے بتا دیا تھا کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہے مگر نازاں نے تو اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ اس کی شادی گلو سے طے ہو چکی ہے۔ وہ کہتا رہا کہ اسے اپنی پناہ میں لے لے گا' اسے تحفظ اور ہونے والے بچے کو باپ کا نام دے گا اور وہ............ وہ چپ رہی۔ کیا وہ............ وہ گلو کو بھی دھوکا دینا چاہتی ہے؟ یہ سوال اس کے دماغ میں کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ آنکھوں میں شعلوں کی سی آنچ دہکتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ جیسے تیسے گیراج پہنچا۔ اندر کی کوٹھری کھلوائی اور جاکر بے سدھ پڑ گیا۔ کل کا سارا دن عذاب جھیل لینے کے بعد اس نے رات بھر جاگ کر جو دن کی اذیت کم کی تھی' نازاں کے لئے سوچا اور فیصلہ کیا تھا' وہ سب کچھ برباد ہوگیا تھا۔ اسے دکھ تھا تو صرف یہ کہ نازاں نے اس سے یہ بات کیوں چھپائی کہ چاچا اس کو مانگ چکا ہے۔ صرف تاریخ ہی تو طے ہونا تھی ورنہ باقی تو سب طے ہوگیا تھا۔

اس نے سلگتے ہوئے دماغ سے فیصلہ کرلیا کہ وہ نازاں کے پاس جائے گا۔ ایک بار ضرور جائے گا۔ یہ پوچھنے کے لئے کہ کیا وہ اس کی طرح گلو کو بھی دھوکا دے رہی ہے؟ کیا وہ اس سے کی ہوئی ساری بات گلو سے چھپا کر دونوں کو الگ الگ بے وقوف بنانے کا ارادہ رکھتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو امام دین کو اس کی آنتیں باہر نکال دینے کا فیصلہ کرنے میں ذرا دیر نہ لگتی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ شدید بخار میں پھنکنے لگا۔ اس نے چھوٹے سے ٹھنڈا پانی اور چھوٹا تولیہ منگا لیا تھا۔ وہ بار بار تولیہ گیلا کرکے خود ہی اپنے سر پر رکھ لیتا تھا۔ اسے جو کچھ بھی کرنا تھا' جلد کرنا تھا۔ اسے دکھ اس بات کا زیادہ نہیں تھا کہ وہ گلو سے کوئی شرط لگائے بغیر ہی ہار گیا۔ وہ زیبی کے لئے بھی شرط لگانا بھول گیا تھا تو شاید اس لئے کہ قدرت اسے

ذلت سے بچا رہی تھی۔ اسے یہ بھی غم نہیں تھا کہ زیبی سے بچھڑ کر جو دکھ اسے تھا' اس میں نازاں کو اپنانے سے کمی ہوگئی تھی۔ نہ یہ خیال ہی آیا کہ وہ اتنا بے وقعت' بے حیثیت کیوں ہوگیا؟ ایسا بدقسمت کب سے ہوگیا کہ جس چیز کی طرف ہاتھ بڑھائے' وہی اس سے چھین لی جائے۔ اسے تو صرف یہ فکر تھی کہ اگر ایسا ہوگیا ہے' ہو رہا ہے تو جلد از جلد ہو جانا چاہئے۔ دو تین دن میں۔ بس فوراً ہی۔ نازاں کے پاس وقت نہیں تھا۔ ہر آنے والا لمحہ نازاں کو رسوائی کی طرف دھکیل رہا تھا۔

☆==========☆============☆

پھر وہ اسی شام نازاں کے سامنے سرخ آنکھیں لئے کھڑا تھا۔ "تو نے بتایا کیوں نہیں کہ گلو سے تیری بات طے ہوگئی ہے؟ کیا تو اسے بھی میری طرح دھوکا دینا چاہتی تھی۔"

"نہیں ماے............! میں نے تمہیں بتانا چاہا تھا مگر............ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی' گلو آگیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سے میں مستقل تمہارا انتظار کر رہی تھی مگر تم نہیں آئے۔ امام دین............ تم نے جو کچھ میری ہمدردی میں کیا اور جو فیصلہ گلو اور چاچا نے کیا'............ مجھے دکھ ہے کہ میں تو تم دونوں ہی کے قابل نہیں ہوں۔"

"دیکھ نازاں............! بکواس مت کرنا۔ کوئی الٹی سیدھی بات............' کوئی غلط جملہ مت کرنا۔ پہلے میری بات سن۔" امام دین نازاں کے بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔ 'دیکھو نازاں! میں نے تو سارے حالات سن کر فیصلہ کیا تھا۔ میری نظر میں تو ہر چیز تھی۔ تُو............ میں جانتا ہوں کہ............ سب جانتا ہوں مگر گلو! اسے تو کچھ بھی نہیں پتا۔ میرے فیصلے کو تو ہمدردی سمجھ سکتی ہے مگر گلو کا فیصلہ............ وہ تو محبت ہے نازاں' تو اسے دھوکا دے کر کہیں نہیں جاسکتی۔ تو نے تاریخ دے دی!"

"نہیں............ گلو سے تو نہیں مگر چاچا سے میں نے کہہ دیا ہے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"کک............ کیوں؟"

"کیسی باتیں کرتا ہے تو! یہ پیٹ میں کلبلاتا گناہ لے کر کیسے دلہن بن جاؤں؟ تو کیسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوست ہے گلو کا؟ ایک طرف تو' تو اس کا حمایتی بن کر آیا تھا کہ میں اس دھوکا تو نہیں دے رہی اور........... اور دوسری طرف مجھے اتنے بڑے دھوکے پر آمادہ کر رہا ہے تو۔" نازاں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"تو سمجھ نہیں رہی نازاں! دیکھ ساتویں مہینے میں بھی اگر بچہ ہو جائے تو لوگ شک نہیں کرتے۔ وہ ستوانسا کہلاتا ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ شادی جلد ہو جانا چاہیئے۔ میں ابھی چاچا کے پاس جارہا ہوں۔ مجھے جانا تو تھا تیرے لئے۔ پر اب میں اس سے کہہ دوں گا کہ وہ........... جلدی کرے........... کچھ بھی کہہ دوں گا۔"

"امام دین...........!!" اچانک نازاں کے لہجے اور انداز نے اس پر سکتہ سا طاری کر دیا۔

"ہوں۔"

"کل تم نے کہا تھا کہ تم........... مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

امام دین بیڈ سے اٹھ کر کرسی پر چلا گیا اور اس نے سر کو کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ "ہاں........... یہ بھی تم سے محبت کا ثبوت ہے نازاں' کہ میں چاہتا ہوں تم سکھی رہو۔ تم گلو کو چاہتی ہو' یہ بات میں جانتا ہوں مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ گلو بھی تمہیں چاہتا ہے۔ وہ تمہیں قبول کر لے گا۔ اب ایسا ہو گیا ہے تو یہ جتنی جلد ہو جائے' تمہارے حق میں بہتر ہے اور تمہاری بہتری ہے تم سے محبت کا ثبوت ہے۔"

نازاں نے اس کے چہرے پر پھیلی زردی' کمزوری اور اس کی آنکھوں میں بھری وحشت کو دیکھا۔ "کاش! میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

"نازاں بول! میں جا کر جلدی کا کہہ دوں ناں!"

"امام دین سوچ لو۔ اگر مجھے گمان بھی ہو گیا کہ میرے اس ناکردہ گناہ کا راز کہیں بھی' کبھی بھی فاش ہونے والا ہے تو........... تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ سوچ لو۔"

"نہیں پتا چلے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ بس تو خود نہ بتا دینا۔ اب آرام کر۔ میں جاتا ہوں۔"

☆==========☆============☆

وہ پھر نازاں کا جواب سننے کے لئے رکا نہیں۔ بخار سے تپتے بدن کو لئے وہ گلو کے گھر پہنچ گیا۔ گلو گھر پر نہیں تھا۔ چاچا نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو جلدی سے چارپائی پر لٹا کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بنانے لگا۔ امام دین اسی حالت میں بولتا چلا گیا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ چاچا کو کسی بھی قسم کی تیاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس نکاح کرے اور نازاں کو گھر لے آئے۔ وہ ڈاکٹر سے بھی مل کر آیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ کل تک اسے ڈسچارج کر دیا جائے گا۔

"رحمان گیا ہے اپنی بیوی کو لینے کے لئے۔ وہ آ جائے تو فیصلہ کریں۔ تو اب چپ چاپ لیٹ کر آنکھیں بند کر لے۔ اتنا بخار چڑھ رہا ہے۔ گلو آ جاتا تو ڈاکٹر کو دکھا لاتا۔" چاچا گھبراہٹ میں بڑبڑا رہا تھا۔

"چاچا جلدی کر لے۔ نکاح میں دیر نہیں کرتے۔ یہ بڑے بزرگ کہہ گئے ہیں۔ کیا تو نے نہیں سنا؟"

"نہیں........... میں نے ایسی کوئی بات کسی بزرگ سے نہیں سنی۔ تو چپکا نہیں رہ سکتا!" چاچا اس کے بڑھتے ہوئے ٹمپریچر سے سخت پریشان ہو گیا تھا۔ امام دین بول رہا تھا اور وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ہذیان بک رہا ہے۔

عین اسی لمحے گلو آ گیا۔ وہ بھی امام دین کو اس حالت میں پڑا دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس دوڑا۔ امام دین پر غشی طاری ہو چکی تھی۔ وہ منع کرنے کے قابل نہیں رہا تھا ورنہ اب بھی ڈاکٹر کے پاس جانے سے منع کر رہا ہوتا۔ ڈاکٹر نے دوائیں دے کر مکمل آرام کی ہدایت دی تھی۔ گلو اسے اپنے گھر ہی لے گیا۔ زیبی کا اسے پتا چل گیا کہ اب رسمی بھی علیک سلیک کیا رہی ہو گی اور گیراج پر کسی لڑکے میں اتنی ذمے داری دکھائی نہیں دی تھی کہ وہ رات بھر اور دن بھر اس کی دیکھ بھال کرے۔ یہ کام وہ خود سب سے اچھی طرح کر سکتا تھا۔ سو وہ اسے کمرے میں لٹا کر باہر چلا آیا۔

ڈاکٹر نے اسے نیند کا انجکشن بھی دیا تھا کہ وہ باتیں کم کرے اور بس سو جائے۔ چاچا نے گلو کو بتایا کہ وہ کیسے آیا تھا اور کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے جونہی سنا کہ وہ جلد از جلد شادی پر زور دے رہا ہے تو گلو کے دماغ میں بھی جیسے پٹاخے سے پھوٹنے لگے۔ اسے عثمان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دادا کا لایا ہوا پیغام یاد آیا۔ اپنا اور امام دین کا اسماعیل کی کوٹھی جاتے ہوئی عثمان دادا کی تلاش بھی یاد آئی۔ "ضرور کوئی خاص بات ہوئی ہے ورنہ وہ ایسا کیوں کہتا کہ فوراً شادی کرلو۔" یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ اس نے اسے وقت پر دوا دی' گرم گرم چائے کے ساتھ ڈبل روٹی بھگو کر کھلانے کی کوشش کی مگر امام دین نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ گلو تاریخ طے کرلے پھر وہ کچھ کھائے گا۔

"مگر بات کیا ہے؟" گلو نے سرگوشی کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چاچا کے کان میں کچھ پڑے۔

"اتنی ہی اہم بات ہے گلو! اگر ایسا نہ ہوا تو سمجھ لینا کہ سب کچھ الٹا ہو جائے گا۔ سب غلط ہو جائے گا۔" وہ اسے اور گھبرائے دے رہا تھا۔

رحمان چاچا اور چاچی نے مسئلہ ہی حل کر دیا۔ اگلے روز ہی اسپتال سے نازاں کو گھر لے آئے اور دو روز بعد آنے والے جمعے کو نکاح کی تاریخ دے دی۔ ساری تیاری دھری رہ گئی۔ وہ سارا دھوم دھڑکا جو گلو نے سوچ رکھا تھا' یونہی رہ گیا۔ چاچا کے بھی سارے ارمان دل میں ہی رہ گئے مگر گلو نے ضد ہی ایسی باندھی کہ چاچا کو ماننا پڑا۔ امام دین نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا مگر عثمان دادا اور اسماعیل کے پیغام والا معاملہ ایسا نہیں تھا کہ اسے نظرانداز کر دیا جاتا۔ گلو اسی گھبراہٹ میں ضد باندھ کر بیٹھ گیا تھا۔

☆==========☆============☆

تاریخ طے ہوتے ہی امام دین کی جان میں جان آئی۔ کچھ دواؤں نے اثر دکھایا اور کچھ گلو کی تیمار داری نے۔ اس نے گلو سے فرمائش کی کہ اسے چھوڑ آئے۔ گلو اسے گھر کی طرف لے کر چلا۔

"یہاں کہاں جارہا ہے؟" امام دین نے اسے ٹوکا۔

"گھر جارہا ہوں تیرے۔ تو بیمار ہے' تجھے گھر پر آرام کرنا چاہئے۔"

"ارے نہیں یار.........! گیراج پر چھوڑ دے۔ وہاں چھوٹا بھی ہوتا ہے اور......... وہ سارے لڑکے بھی!"

"دیکھ امام دین! اب میرا دماغ مت پھرا۔ یہ......... تیرا گھر ہے اور تجھے ڈاکٹر نے

آرام بولا ہے۔ سمجھا اگر اسے تیری موجودگی بری لگے تو کہنا کہ وہ یہاں سے چلی جائے اگر تو نہیں کہہ سکتا تو......... میں کہے دیتا ہوں۔ ابھی۔"

گلو نے ٹیکسی امام دین کے دروازے پر روکتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ہارن بھی دبا دیا۔ امام دین نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ "نہیں یار! میں خود......... کہہ دوں گا۔ تیری ضرورت نہیں ہے۔ اچھا جا! پرسوں نکاح میں آؤں گا۔"

"ارے ہاں.........! زیبی کو بھی تو دعوت دے دوں۔" گلو اتنا کہہ کر چھپاک سے ٹیکسی سے باہر آگیا جبکہ امام دین چاہتا تھا کہ وہ ٹیکسی سے نہ اترے اور وہ اس کے جانے کے بعد زیبی سے یونہی کوئی بات کرکے واپس گیراج چلا جائے مگر گلو بھی کم کب تھا۔

"زیبی جی! امام دین بہت بیمار تھا۔" اس نے دروازے پر کسی کی موجودگی کو کنڈی کھلنے کی آواز کے بعد ایک پٹ کے کھل جانے پر ہی محسوس کرلیا تھا پھر اس پٹ پر گوری گوری انگلیوں کی موجودگی نے اس میں ہلکی سی سنسنی پھیلا دی۔ "یہ دو دن میرے پاس رہا ہے۔ اب حالت کچھ سنبھلی ہے تو لے آیا ہوں۔ یہ دوائیں ہیں تھیلے میں۔ آپ اس کا خیال رکھیے گا۔ بیمار کی تیمارداری کرنے کا ثواب ملے گا۔"

گلو کو لگا جیسے اس نے پہلو بدلا ہو۔ انگلیاں بھی ایک دوسرے سے مس ہو کر بار بار علیحدہ ہو رہی تھیں۔ وہ بے چین تھی۔ اس کی بے چینی کی وجہ کیا تھی' یہ گلو خوب سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے' وہ اس کے طنز کو محسوس کر رہی ہوگی۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے کہ یہ گھر آرام کریں۔" گلو نے "گھر" کے لفظ پر زور دیا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں خیال رکھوں گی۔" جیسے کہیں جلترنگ سے بجے ہوں۔ گلو سب کچھ بھول گیا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔" امام دین نے گلو سے کہا۔

"ہاں......... اور وہ دعوت۔" گلو گڑبڑا گیا۔ "اور زیبی جی! پرسوں میرا نکاح ہے۔ امام دین کے ساتھ آپ بھی ضرور آیئے گا۔ آپ آئیں گی تو سمجھوں گا کہ عزت دی۔"

"ضرور آؤں گی اگر آپ کے دوست ٹھیک ہوگئے تو۔" وہی جلترنگ سے گونجے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں تو اسی حالت میں جاؤں گا۔" امام دین نے جواب دیا۔

گلو ان دونوں سے خدا حافظ کر کے چلا آیا۔

☆==========☆============☆

آج گلو کا نکاح تھا۔ گلو نے' چاچا نے اور چاچی نے محلے کے سارے بچوں' لڑکوں بالوں کو ساتھ لگا کر پوری گلی میں رنگین جھنڈیاں' پنیاں غبارے اور گھر میں پھولوں کی لڑیاں سجائی تھیں۔ نازاں تو رحمان چاچا کے گھر تھی۔ چاچی نے راتوں رات محلے میں بلاوا دے کر ڈھنڈورا پیٹ دیا تھا کہ نازاں کی شادی ہے پرسوں۔ رات ہی کو لڑکیاں جمع ہو گئی تھیں۔ آدھی رات تک گلی میں دھوم دھڑکا رہا۔ محلے کے بچوں نے خوب رنگ جمایا۔ چاچا نے گلو کے دیئے ہوئے پیسوں میں سارے محلے کے لئے کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ گلو نے بھی اتنی جلدی میں جتنے لوگ ہو سکے' بلا لئے تھے۔ وہ بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔

امام دین بیمار نہ ہوتا تو سارے انتظامات وہی کرتا مگر وہ بیمار تھا۔ گلو کو اس کی بھی فکر تھی۔ ان دو دنوں میں اسے وقت ہی نہ ملا کہ وہ اس کی خیر خبر لیتا اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ دن گزرتا جا رہا تھا۔ شام کے سرمئی سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ نکاح کا وقت عصر اور مغرب کے درمیان کا تھا اور عصر کا وقت ہو چکا تھا۔

"چاچا! قاضی آنے والا ہو گا۔ تم اسے بٹھانا۔ میں امام دین کو دیکھ کر آتا ہوں۔" گلو یہ کہہ کر تیزی سے باہر بھاگا۔ پندرہ منٹ میں ہی وہ امام دین کے دروازے پر پہنچ گیا۔ وہ بالکل صحیح وقت پر پہنچا تھا۔ وہ دونوں نکل رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی زیبی بڑی زور سے چونکی تھی۔ گلو نے خود محسوس کیا تھا کہ وہ ٹھٹک گئی ہے۔ وہ سیاہ برقعے میں ملبوس تھی۔ چہرے پر نقاب تھا۔

وہ تو اس نے جلدی مچائی۔ تو امام دین کے ساتھ ہی وہ بھی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ گلو ٹیکسی بھگاتا ہوا گھر پہنچا۔ محلے کے تمام لوگ قاضی سمیت گلو کے منتظر تھے۔ اس کے پہنچتے ہی نکاح شروع ہو گیا۔

مبارک باد کا شور تھا۔ گلو کو یہ سب کچھ بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

"یہ میں تیرے لئے لایا ہوں۔" اچانک امام دین کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس

نے پلٹ کر دیکھا۔ امام دین ایک بہت خوب صورت رحل لئے کھڑا تھا جس میں کلام پاک رکھا تھا۔

"گلو! یہ میں تجھے اس لئے دے رہا ہوں کہ تو ہمیشہ یہ یاد رکھے کہ اس نے مجبوروں کے ساتھ ہمدردی کا درس دیا ہے۔ عورت کی عزت اور احترام پر زور دیا ہے۔ کمزور کو تکلیف نہ دینے کا حکم دیا ہے اور.......... اور اس میں لکھا ہے گلو کہ کسی کے عیبوں کو چھپانے والے کے گناہوں کی خدا بھی پردہ پوشی کرتا ہے۔"

گلو حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

"اور گلو!" وہ پھر بولا۔ "یہ.......... یہ پکڑ اور مجھ سے وعدہ کر کہ تو نازاں کو کبھی کوئی دکھ نہیں دے گا۔"

"ہاں ماے!.......... میں اسے کبھی دکھ نہیں دوں گا۔" گلو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"چلو بھئی چلو۔" رحمان چاچا کی بیٹی انہیں دیکھتے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ساری لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر کمرے سے باہر نکالا اور خود بھی ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔

اب مسہری پر نازاں دلہن بنی سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک اور لڑکی تھی جس نے بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹا ہوا تھا اور وہ نازاں کے دونوں ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ گلو کی نگاہ نازاں کے مہندی لگے ہاتھوں پر جم گئی۔ اس کے ہاتھوں میں وہی پائل رکھی تھی جیسی گلو نے خریدی تھی۔ وہ پائل جو اسی روز بازار میں اس لڑکی نے خریدی تھی جو اچانک ہی گلو کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

گلو نے اس اتفاق کو حیرت سے دیکھا اور آگے بڑھا۔

"زیبی!" اچانک امام دین کی آواز پر اس لڑکی نے دھیرے سے پلٹ کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور اس بار دھماکے گلو کے دماغ میں ہوئے اور تباہی دور دور تک پھیلتی چلی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی خوبصورت آنکھوں سے بہنے والے آنسو لکیر کی صورت میں اس کے رخسار پر بہ رہے تھے آنکھوں میں بے بسی اور بے پناہ دکھ تھا۔ اس کے ہونٹوں کے دائیں جانب ہلکا سیاہی مائل نشان تھا۔ گلو کو لگا جیسے وہ چبوترے پر کھڑا ہے اور میلی سی چادر میں لپٹا وہ معصوم سا چہرہ وحشت زدہ سا اسے تک رہا ہے۔ آنسوؤں کی میلی میلی سی لکیریں سلاخوں کی طرح اس کے اور گلو کے درمیان حائل ہیں۔ ہونٹوں کے دائیں جانب دانہ ہے جس کے گرد سوجن اور سرخی ہے۔

"زیبی! یہ.......... گلو ہے.......... میرا یار۔" امام دین سپاٹ لہجے میں اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

"جانتی ہوں۔" اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ اس نے لمحہ بھر کو گلو کی آنکھوں میں جھانکا جیسے کچھ ڈھونڈ رہی ہو۔

گلو پلکیں جھپکے بغیر اسے دیکھے گیا۔ امام دین نے اس کی محویت ہی نہیں' اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو بھی جان لیا تھا۔ عجیب سے تاثرات تھے جیسے کچھ ہاتھوں سے نکل گیا ہو۔ جیسے اچانک وہ ٹرین چھوٹ گئی ہو جس میں سفر کرنا ہو یا جیسے.......... اچانک ہی بند مٹھی کے خالی ہونے کا انکشاف ہوا ہو۔ خود زیبی کی آنکھوں میں جو حسرت' جو دکھ' جو حیرت تھی وہ بھی ناقابل فہم تھی۔

"تم..........!!" گلو کچھ کہنے والا تھا کہ زیبی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"بہت اچھی بیوی ہے آپ کی.........." اس نے نازاں کی ہتھیلی میں رکھی پائل پر نگاہ ڈالی اور دھیرے سے اس کی کھلی انگلیوں کو بند کر دیا۔ "یہ پائل.......... میں نے.......... میں نے بہت سنبھال کے رکھی تھی۔ شاید آج ہی کے دن کے لئے.........."

گلو کا جی چاہا کہ وہ اسے دونوں کاندھوں سے پکڑ کر پوچھے کہ وہ اتنے برس سے کہاں تھی؟ اب سے پہلے کیوں نہ ملی؟ اور نہیں ملی تھی تو آج.......... آج کیوں مل گئی؟ اسے یاد آگیا کہ وہ امام دین کو لینے گیا تھا تو اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ چونکی ہے۔ ٹھٹک گئی ہے مگر یہ تو گمان بھی نہ تھا کہ یہ وہی ہوگی جو برسوں سے گلو کے دل و دماغ میں دھرنا

دے کر بیٹھی ہے اور اسے پہچان گئی ہوگی۔

"نہیں گلو! اسے تو کچھ یاد بھی نہ ہوگا!" اس کے دماغ میں ہلکی سی سرگوشی گونجی۔ "اور تو نے کون سا اچھا سلوک کیا تھا اس کے ساتھ.......... جو وہ تجھے یاد رکھتی۔ ضروری تو نہیں کہ اسے بھی تو یاد آتا ہو۔"

"آپ.......... رو رہی ہیں..........!" بے ساختہ گلو کے اندر کی چبھن لبوں پر آگئی۔ ان آنسوؤں نے اسے کچھ ڈھارس بندھائی تھی کہ شاید وہ بھی..........

"خوشی کے آنسو ہیں۔" اس نے جلدی سے چادر کا کونا پکڑ کر آنکھوں پر مل لیا۔ "منزل پاتے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے ناں.......... اس لئے۔ جب کبھی کو کچھ پاتے دیکھتی ہوں تو.........." جانے وہ اور کیا کہنا چاہتی تھی مگر آواز رندھ گئی۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔

گلو دروازے کی خالی چوکھٹ کو تکتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر پھیلا خالی پن اور آنکھوں میں بھری وحشت کو امام دین حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ زیبی کی کیفیت نے اسے یہ تو سمجھا دیا تھا کہ اس کے زخموں کے منہ کھل گئے ہیں مگر ان زخموں سے گلو کا کیا تعلق ہے' وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا اگر گلو لاتعلق رہا ہوتا تو امام دین کو ایسی پریشانی نہ ہوتی مگر دونوں ہی کی آنکھوں میں ایک سی وحشت اسے الجھا رہی تھی۔

"گلو کوئی پہلی بار تو نہیں ملا ہوگا! کتنی ہی بار گھر آیا ہے۔ اس کے ساتھ بھی اور اس کے پیچھے بھی.......... گلو نے اسے نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ پردہ کرتی ہے مگر زیبی نے تو اسے دیکھا ہوگا پھر.......... یہ کیسی وحشت تھی؟" وہ ساکت کھڑا سوچ رہا تھا۔

کمرے کی ہر چیز جیسے پتھرائی ہوئی تھی۔ گلو کمرے میں نازاں اور امام دین کی موجودگی کو یکسر فراموش کیے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رحل اور اس پر رکھا کلام پاک تھا اور نگاہیں دروازے کے باہر محلے کی لڑکیوں' بالیوں اور بچوں میں اسے تلاش کر رہی تھیں۔

"گلو!" امام دین نے دھیرے سے اسے پکارا اور وہ یوں اچھلا جیسے کوئی دھماکہ ہوا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کک.......... کیا.......... وہ ....!" پھر اسے فوراً ہی شاید سچویشن کا احساس ہوگیا۔ اس نے سامنے کھڑے امام دین کو اور مسہری پر سمٹی بیٹھی نازاں کو یوں حیرت سے دیکھا جیسے یہ منظر اچانک ہی اس کے سامنے آگیا ہو۔ اپنے ہاتھوں پہ نگاہ پڑتے ہی اس نے جلدی سے کلام پاک کارنس پر رکھ دیا اور خود مسہری کے کونے پر یوں ٹک گیا جیسے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نازاں پر اس نے دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی۔ وہ پھر خلاؤں میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"یہ.......... میری طرف سے نازاں کو پہنا دے۔" امام دین نے جیب سے سونے کی انگوٹھی کی ڈبیا نکالی۔

"ہاں..........!" گلو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا' پھر ہاتھ میں پکڑی مخمل کی ڈبیا کو یوں دیکھنے لگا جیسے بات سمجھا نہ ہو۔

"یہ میں نازاں کے لئے لایا ہوں۔ اسے تو پہنا دے۔" امام دین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے نازاں کی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

"ہاں.......... یہ.......... تو.......... خود پہنا دے۔ دے دے اسے۔ پہن لے گی۔" نازاں کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی اور بلا کی بے بسی گھل گئی۔

امام دین جان گیا کہ بات معمولی نہیں۔ اسے ہوش میں لانے کو وقت درکار ہوگا۔ اس نے نازاں کے جھکے ہوئے سر پر دھیرے سے ہاتھ رکھا پھر مخملی ڈبیا اس کی گود میں رکھ دی۔ غالباً نازاں نے ڈبیا اٹھائی تھی کہ اس کی مٹھی میں دبی ہوئی پائل کی چھنک گونج اٹھی اور گلو جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ وہ اس کے مہندی لگے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی چاندی کی پائل کو دیکھ رہا تھا پھر جانے اس کے دل میں کیا آئی۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ امام دین اس کے پیچھے جھپٹا۔

"گلو! گلو..........!" وہ اسے پکار رہا تھا مگر گلو سر اٹھائے کسی کو تلاش کرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ "گلو!" امام دین نے جھپٹ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

"گلو! کیا ہوگیا ہے تجھے؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"ماے..........! ماے.......... میں.........."

"چل باہر چل' یہاں تو.........." امام دین اس کا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھا مگر گلو اس کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے امام دین اسے زبردستی گھسیٹ کر کہیں لے جارہا ہو۔ وہ پیچھے دیکھ رہا تھا' زیبی کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ یہ احساس کہ کہیں وہ چلی تو نہیں گئی' گلو کو ہولائے دے رہا تھا۔

"ماے وہ کہاں گئی؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"باہر چل تو۔" اب امام دین کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ہاں اب بتا!" وہ دروازے سے چند قدم آگے بڑھ کر بولا۔ اندر ہونے والے شور کی آوازیں یہاں تک آرہی تھیں۔ گھر کے باہر عین سامنے لگے شامیانے میں کئی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جہاں مہمان مرد بیٹھے ہوئے تھے۔ بچے اودھم مچاتے پھر رہے تھے۔ چاچا کھانا لگوا رہا تھا۔ دیگوں کا منہ کھلتے ہی شور بڑھا گیا تھا۔ لکڑی کی میزوں پر کھانا لگایا جا رہا تھا۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ امام دین اسے لئے ہوئے چند قدم اور آگے بڑھ گیا۔

"وہ.......... ماے' وہ زیبی.........." گلو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ غلط کر رہا ہے۔ اب تک اس نے امام دین کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں ہے جو بچپن میں صرف ایک پل کو اسے نظر آئی تھی پھر جانے کہاں گئی۔

"ہاں.......... کیا ہے زیبی میں؟" امام دین نے سخت لہجے میں پوچھا۔

گلو نے لحہ بھر کو امام دین کی طرف دکھا۔ اس کی نگاہوں کی سختی کو محسوس کیا اور نگاہیں چرا گیا۔ "میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔"

"گلو!" چند لمحے کچھ سوچتے رہنے کے بعد امام دین بولا۔ "میں جانتا ہوں کہ تو ایسی کون سی بات بتانے والا ہے مگر.......... گلو دھیان رکھنا' آج تیرا نکاح ہوا ہے نازاں کے ساتھ! اور یہ سب تیری اپنی مرضی سے ہوا ہے۔ اب تو سوچنے اور عمل کرنے میں آزاد نہیں ہے۔ نازاں تیری شریک حیات ہے' تجھ پر اب اس کا حق ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”ہیں.......... ہاں.......... میں.......... ماے! یہ سب کچھ میرے ہی ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ.......... جسے میں ساری دنیا میں تلاش کر رہا ہوں‘ وہ تو میرے بالکل قریب تھی.......... ماے کیا وہ.......... کیا وہ بھی..........! تو نے بتایا تھا ناں کہ وہ بھی کسی کو چاہتی ہے‘ کسی ایسے شخص کو جو اسے پل بھر کو مل کر بچھڑ گیا تھا۔“

”گلو!“ امام دین کی آواز یوں ابھری جیسے کسی گہرے کنویں سے نکل رہی ہو۔

”تو.......... کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”ماے! میں نے تجھے بتایا نہیں تھا مگر.......... مگر خدا کی قسم ماے.......... میں بیس برس سے اس کی تلاش میں ہوں۔ اس شہر کا چپہ چپہ.......... گلی گلی چھان ماری تھی میں نے.......... وہ صرف ایک بار ملی تھی‘ بازار میں دکھائی دی تھی اور پھر.......... پھر میں پاگلوں کی طرح اسے ڈھونڈتا پھرا تھا مگر.......... اور آج جب میں.......... میں نے اسے بھول کر چاچا کے کہنے میں آکر نازاں سے رشتہ جوڑ لیا تو وہ.......... وہ خوابوں سے نکل کر حقیقت..........“

”بس کر گلو!“ امام دین کو لگا جیسے وہ گر پڑے گا۔ یہ انکشاف کہ وہ زیبی جس سے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اس نے اسے گلو کی خاطر ٹھکرا دیا تھا۔ اس کی خاطر جو اس کا جگری یار تھا اور یہ سب کچھ اس انداز میں ہوا کہ نہ وہ اپنے دوست کے کام آسکا اور نہ زیبی کو اس کی محبت اسے دلا سکا۔ نہ ہی اسے پا سکا۔ اسے یقین آگیا تھا کہ گلو ہی وہ شخص ہے جس کے سائے سے محبت کرتے کرتے زیبی اتنی دور نکل چکی تھی کہ اسے فراموش کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب زیبی کے زخموں کے دہانے ایسے کھلے ہیں کہ ان کے مندمل ہونے کا کوئی امکان نہیں‘ یوں تو شاید وہ اس کی تلاش میں تمام عمر گزار دیتی مگر.......... اسے پا کر بھی نہ پانے والا یقین اسے زندہ نہ رہنے دے گا۔ اچانک اسے بھی خیال آگیا کہ باہر آتے ہوئے زیبی کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اچانک گلو کو چھوڑ کر اندر بھاگا۔ اب اسے گلو کی نہیں‘ زیبی کی فکر تھی۔

گلو اسے پکارتا رہ گیا مگر امام دین نہیں رکا۔ گلو کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اس کے پیچھے جاتا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر نڈھال سا کھڑا ہو گیا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا

لہ اس نے اس موقع پر امام دین کو کیوں سب کچھ بتا دیا۔ اسے یاد آگیا کہ امام دین بھی تو بی کو اس قدر پیار کرتا ہے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ امام دین سے یہ سن کر کہ وہ کسی اور و چاہتی ہے اس نے کیسی اوچھی باتیں کی تھیں۔ اسے برے کردار کا سمجھنے لگا تھا۔

”مگر کیا وہ.......... واقعی مجھ سے..........“ وہ حیرت اور دکھ سے سوچ رہا تھا مگر اس سے پہلے کہ مزید کچھ سوچتا‘ وہ چونک اٹھا۔ امام دین گھر سے تنہا باہر آیا تھا اور سخت بوکھلایا ہوا تھا۔ وہ نہ گلو کے پاس آیا نہ رکا بلکہ تیزی سے گلی میں کھڑی اپنی ٹیکسی کی طرف لپکا۔ سے جاتا دیکھ کر گلو اس کی طرف دوڑا مگر اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی وہ ٹیکسی جھٹکے سے اسٹارٹ کر کے زن سے نکل چکا تھا۔

گلی میں اڑتی گرد میں گلو کو سب کچھ دھندلاتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کراکا کھڑا رہ گیا۔ اگر چاچا نے اسے دیکھ کر آواز نہ دی ہوتی تو شاید وہ ساری زندگی وہیں ساکت کھڑا رہتا۔ یہ خیال ہی اسے بے جان کر دینے کو کافی تھا کہ وہ جسے تمام عمر ڈھونڈتا رہا وہ تو اتنے قریب تھی‘ وہ کتنی ہی بار امام دین کے گھر گیا مگر ایک بار بھی اسے نہ دیکھ سکا اگر وہ جان پاتا کہ زیبی ہی وہ گمشدہ لڑکی ہے تو کبھی بھی نازاں کو نہ اپناتا اور پھر جانے کیوں اسے یقین تھا کہ زیبی بھی اس کی تلاش میں تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بھلا امام دین کو کیوں ٹھکراتی؟

”ابے او گلو!“ چاچا اس کے قریب آگیا۔ ”یہ تو راتے مرے مرے قدموں سے کیوں چل رہا ہے۔ وہاں لوگ دلہے کا انتظار کر رہے ہیں اور دلہا چھلاوہ بنا ہوا ہے۔ چل اندر‘ ابھی تو رسمیں باقی ہیں۔“

”نکاح تو ہو گیا چاچا..........! اب کون سی رسم باقی ہے؟“ وہ یوں بولا جیسے کسی نئے ستم پر احتجاج کر رہا ہو۔

”تو چل.......... مجھے تو کچھ پتا نہیں‘ رحمان کی بیوی شور مچا رہی ہے۔

چاچا اسے گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا۔ آنگن میں بریانی کی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ لوگ چارپائیوں پر‘ فرش پہ بچھی دریوں پر اور جگہ جگہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

مردانے میں یعنی باہر گلی میں لکڑی کی میزیں لگی تھیں۔ بچوں نے پورے گھر کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ عورتیں زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ مرد یہاں سے وہاں بھاگے پھر رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے اور رحمان چاچا بریانی کی دیگ پر یوں بیٹھا تھا جیسے خزانے پر سانپ بیٹھتا ہے۔ گلو کو لگا جیسے اس سارے منظر سے اس کا اپنا کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ اس بھرے آنگن میں نہیں کہیں لق و دق صحرا میں کھڑا ہو جہاں دور دور تک کچھ نہ تھا' بس اس کے سامنے گرد اڑ رہی تھی اور گرد کی اس دبیز تہہ کے پیچھے............ کہیں دور کوئی واپس جا رہا تھا۔

"ارے او گلو............!............!............ میں یہاں زردہ لئے بیٹھی ہوں اور تو اِدھر اُدھر لئے پھر رہا ہے۔" چاچی نے اترا کر کہا۔

پان کی لالی سے بھرا منہ دیکھ کر گلو کو ابکائی آ گئی۔

"کیا کرنا ہے اس زردے کا؟" اس نے رکھائی سے پوچھا۔

"ارے دلہن کو کھلانا ہے۔" وہ پھر اترائی۔

"تو کھلا دو۔" گلو آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"کہاں جا رہا ہے۔ یہ زردہ تو کھلائے گا اسے۔"

"میں............!!" اس نے ہونقوں کی طرح چاچی کی طرف دیکھا۔

"یہ رسم ہوتی ہے۔" چاچی نے قریب آ کر سرگوشی کی۔

"چاچی! میں ایک ہی رسم سے بھر پایا۔ نکاح ہو گیا' بس............ اب جو کچھ کرنا ہے' تم لوگ کرو۔ میرے سر میں درد ہے۔" وہ سیدھا کوٹھری کی طرف بڑھا۔ برابر والے کمرے میں نازاں اس کی منتظر تھی۔ اس کے پیچھے ان عورتوں اور لڑکیوں کا ٹھٹا گونجا جو اپنے اپنے کام چھوڑ کر اس کی اور چاچی کی گفتگو سن رہی تھیں۔

"لو چاچی! اصل کرنے والے کام بھی وہ تمہارے سر تھوپ گیا۔" جمشید بھیا کی بیوی ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور سے ہنسی۔

"ارے چپ کر' بے شرم۔" چاچی جھینپ گئیں اور اس کمرے کی طرف لپکیں جہاں گلو گیا تھا۔ وہ پورے زوروں میں بند دروازے سے ٹکرا کر رک گئیں۔ گلو نے اندر سے دروازہ بند کر لیا تھا۔ جمشید بھیا کی بیوی جو اب بھی انھی کی طرف متوجہ تھی' چھاتی سے لپٹے بچے کو جلدی سے ہٹا کر قمیض ٹھیک کرتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

"چاچی! لاؤ مجھے دو زردہ۔"

"ارے ہٹ............ نگوڑی ہر وقت بے ہودہ مذاق کرتی رہتی ہے۔" چاچی پریشان ہو چکی تھیں مگر اس بے نام سی پریشانی کو چھپانا بھی چاہتی تھیں۔

"لو............ اسی بے ہودہ مذاق کے لئے ہی تو نکاح کرایا ہے تم نے............" وہ پھر کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔

چاچی نے دھیان نہیں دیا' ہونق سی زردے کی پلیٹ لئے کمرے کے بند دروازے کو تکتی رہ گئیں۔ "ارے یہ لڑکا تو بالکل باؤلا ہے۔" وہ بڑبڑائیں اور چاچا کو ڈھونڈتی باہر نکل گئیں۔

☆==========☆============☆

گلو کو پتا تھا کہ باہر شور مچاتے بچے کیوں خوش ہیں۔ گھر کو رنگین جھنڈیوں سے کیوں سجایا گیا ہے؟ رحمان چاچا دری پر بیٹھے کیوں مہمانوں کی آؤ بھگت کر رہے ہیں اور چاچا کیوں بے وجہ ہی بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ گھر کے آنگن میں اس رونق کا سبب وہ خود ہے۔ نازاں............ جو اکیلی تھی' بے آسرا تھی' اسے یوں رشتے میں باندھنے کا فیصلہ بھی اس کا اپنا تھا۔ اور اپنا نہ بھی تھا تو اس کی پوری پوری رضامندی تو اس میں شامل ہی تھی۔ اس کے دل میں اچانک اس کے لئے پیار اُمڈ آیا تبھی تو چاچا نے اسے اس کے کمرے میں لا بٹھایا تھا ورنہ اس گھر میں تو وہ پہلے بھی تھی۔

اس کا دل ایک دم الٹنے لگا۔ جی چاہا گزرے ہوئے صرف تین روز واپس لوٹ جائیں۔ وہ تین روز جن میں اس نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ لوٹ جاتے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔ زیبی سے ملنے کا حق تو اس سے اب بھی نہیں چھنا تھا مگر وہ امام دین سے خوف زدہ تھا۔ وہ کتنا اصولی بندہ ہے' یہ اندازہ تو اسے پہلے ہی تھا۔ نازاں سے رشتہ نہ جڑا ہوتا تو وہ جان لڑانے کو تیار ہو جاتا مگر اب تو آہنی دیوار بن جائے گا۔

کمرے میں اچانک گھٹن کا احساس بڑھ گیا۔ اس کا جی چاہا سارے دروازے اور کھڑکیاں ہی نہیں' ساری دیواریں بھی ڈھا دے۔ بہت بڑے کھلے میدان کے بیچوں بیچ جا کر گہرے گہرے سانس لے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف پھیلا چند لمحے پہلے کا سناٹا یوں شور میں تبدیل ہو گیا جیسے اس کے گرد نہ دروازے ہوں' نہ کھڑکیاں' دیواریں تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈھے گئی ہوں مگر گھٹن بھی اس شور کی طرح بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

☆==========☆==========☆

"گلو.........گلو!" دروازے پر کھٹکا نہیں ہوا تھا' جیسے دھماکا ہوا تھا۔ آواز امام دین کی تھی۔ وہ جو چاچی کی آواز سن کر بھی انجان سا دروازہ بند کیے پڑا تھا' اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔

امام دین دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اس نے بے اختیار اسے کندھوں سے تھام لیا۔

"وہ.........وہ نہیں ہے۔"

امام دین اتنا لجلجا پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر جیسے گلو کی آنکھوں میں کھب گئیں۔ وحشت سے پھٹی آنکھوں میں اب کھب جانے کو کچھ رہ نہیں گیا تھا۔ پتلیوں کے پیچھے کہیں زیبی کا دھواں دھواں چہرہ تھا' چہرے پر لکیر بناتے آنسو اور آنکھوں میں بھری التجا۔ اس کے ماضی کی داستان کی طرح ہلکورے لے رہی تھی۔

"ماے.........!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"میں جاتا ہوں۔ تلاش کروں گا۔ صرف اتنا کہنے آیا تھا کہ تو نے یہ دیوار خود اٹھائی ہے۔ اس دیوار کے سائے میں بہت سے لوگوں کی پناہیں ہیں۔ دکھ بانٹنا بڑے لوگوں کا کام ہے گلو! میں نے تیرے بڑے پن کو دیکھ کر تجھ سے دوستی کی تھی۔ میری نیکی کو دریا میں نہ ڈال دینا۔ آدمی جب بھی کسی کو سہارا دیتا ہے' بہت سے تعلق ختم ہو جاتے ہیں۔ خود غرضی بڑھ کر اسی سہارا دینے والے کو ہی سب کچھ بنا دیتی ہے اور قسمت ہماری بستی میں ننگے پیر پھرتی ہے' کسی دھتکاری ہوئی بھکارن کی طرح۔ میں نے اسے دھتکار دیا تھا۔ تو نے بھی اور زیبی نے بھی مگر نازاں.........نازاں نے اسے عزت دی تھی۔ دھتکارا نہیں تھا۔ سب سے زیادہ پیار کرنے والی نازاں ہے یا سب سے زیادہ مستحق.........!"

"ماے.........! تو ٹھیک ہے ناں؟" گلو خوف زدہ ہوگیا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا یا شاید ہو چکا تھا۔ شاید ہونے والا تھا۔ زیبی صرف اس کے سامنے رہتی تب بھی اس کی تشنگی کنارے لگی رہتی۔ یوں ہولائی ہوئی نہ پھرتی۔ "آبیٹھ" گلو نے اسے تھام لیا۔

"نہیں.........وقت نہیں ہے گلو! دیکھنے آیا تھا کہ دوستی کتنی وزنی ہوتی ہے۔ نازاں.........نازاں کا خیال رکھنا۔"

اتنا کہہ کر امام دین رکا نہیں۔ گلو دیکھتا ہی رہ گیا۔ امام دین کا اضطراب دیکھ کر وہ خود کو بڑا بے بس لگا۔ "پتا نہیں کون' کس سے کتنی زیادہ محبت کرتا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

"اے چلو.........میٹھے کی رسم ادا کرنا ہے۔"

جمشید بھیا کی چلبلی بیوی ابھی تک وہیں منڈلا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شہد گھلا ہوا تھا۔ ہونٹوں کے کناروں میں ہنسی کے ساتھ شرارت چھپی تھی۔ پتا نہیں کتنی گہری شرارت تھی کہ ایسے عالم میں بھی گلو کو دکھائی دے گئی۔ وہ جھینپ گیا۔ وہ پلٹ کر پھر اندر جانے والا تھا کہ چاچا' رحمان چاچا کی بیوی کے ساتھ آپہنچا۔ چاچی کے ہاتھ میں پلیٹ تھی اور انگلیاں زردے میں سنی ہوئی تھیں۔ تیوری پر بل تھے اور آنکھوں میں پریشانی۔

"چل بیٹا! وہ تو تھک کر ڈھے جائے گی۔ شام پڑنے سے پہلے ساری رسمیں ادا ہو جائیں۔"

وہ جھنجلا گیا۔ "کیسی رسمیں؟"

"ایک تو بھیا اللہ بھرے' کنوارے گھر میں کوئی نہ کوئی عورت ضرور پیدا کرے۔"

چاچی نے منہ پھیر کر کہا اور جمشید بھیا کی بیوی ہنس پڑی۔

"چاچی! تم نے بھی ایک ہی کہی۔ بھلا کنوارے گھر میں اللہ کسے اور کیسے پیدا کرے؟"

"اچھا تو چپ رہ۔ کمبخت زبان پکڑتی ہے۔" چاچی بھنا گئی۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے۔ تمہارے تو شکورے بھی سیدھے نہیں ہوتے" چاچا بے وجہ ٹھٹا مار کر ہنس پڑا۔

ایسی ہنسی گلو نے پہلی بار سنی تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ چاچا کو خوشی دنیا میں پہلی بار نصیب ہوئی ہے۔ اس ہنسی کے پیچھے کی تمام سسکیاں' تمام دکھ اور تمام حادثے روشن اسکرین کی طرح گلو کے سامنے آگئے۔ وہ جو ایک پل سا سینے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آ پڑا تھا' کھل گیا۔ گھٹن کا احساس کم ہوا اور امام دین کی وحشت نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ نازاں کو پالینا عذاب بن گیا۔ ایک دیوار اٹھا کر سایہ دینا خود اسے چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر گیا۔

"ارے چل ناں!"

چاچی بے صبری ہوئی جا رہی تھی۔ جمشید بھیا کی بیوی پتا نہیں کیوں بار بار گلو سے ٹکرا جاتی۔ ہنستی۔ بچے کو ایک ذرا سا اچکا کر اوپر کرتی اور خود سے چمٹا لیتی۔ گلو اس کی موجودگی سے الجھ رہا تھا۔ ایسی تو بے تکلفی نہ اس کی تھی' نہ چاچا کی۔ کبھی اچھے برے میں پوچھنے تو آئی نہیں آئی تھی۔ محلے دار تھی۔ شادی کا بلاوا تھا' جمشید سے تو سلام دعا بھی تھی مگر ان دنوں وہ دبئی میں تھا۔ اس کی جگہ اس کا باپ بہو کو لے کر آگیا تھا۔ مہمانوں کی طرح بیٹھی رہتی تو بھی ٹھیک تھا مگر وہ تو مسلسل کسی مکھی کی طرح منڈلائے جا رہی تھی۔ اس سے الجھ کر وہ کمرے سے باہر آگیا۔

"منہ پر رومال رکھ۔ ایک جگہ بیٹھنے کی بجائے سارے جہان میں منڈلا رہا ہے اور اب یوں منہ پھاڑے سب کے بیچ سے گزرے گا تو لوگ کیا سوچیں گے؟"

چاچا نے ٹھوکا مارا۔

وہ سوچ رہا تھا۔ "کیا سوچیں گے؟ اس کی شادی میں وہ بھلا کیا سوچیں گے اور جو کوئی یوں دکھ اور سکھ کے درمیان آ پھنسے تو وہ رومال میں منہ چھپا کر کیا کرے گا؟"

وہ صرف سوچ رہا تھا۔ چلا تو بالکل بھی نہیں تھا' بچوں اور عورتوں کا ایک ریلا تھا جس نے اسے بنا ہلے ہی نازاں کے کمرے کے دروازے تک پہنچا دیا۔ "ساری طاقت جمشید بھیا کی بیوی نے لگائی ہوگی۔" اندر جاتے جاتے گلو نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر بری طرح جھینپ گیا کہ وہ چمکتی اور ہنستی آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے اسے یقین ہو کہ وہ جاتے جاتے اسے دیکھے گا ضرور۔ پہلی بار بدنیتی کی تھی۔ اس سے پہلے تو نگاہ اٹھا کر دیکھنا تو کیا' ایسا کرنے کا سوچا بھی نہ تھا۔ پہلی بار ہی پکڑا گیا۔ بوکھلا کر چاچی سے ٹکرایا۔ وہ اس کے آگے آگے جا رہی تھیں۔ جھٹکے سے وہ گرتے گرتے بچیں مگر پلیٹ کچے فرش پر الٹ گئی۔

"ہائے ہائے............! کیا کر دیا یہ............؟" وہ چیخ پڑیں۔

"چل میں دوسری پلیٹ لاتا ہوں۔" چاچا اب بھی ہنس رہا تھا۔

"دوسری پلیٹ نہ لانا۔ پہلے ہی بدشگونی ہوگئی۔" چاچی چیخ اٹھیں۔

پتا نہیں ان کی بات میں کیا تھا کہ نازاں نے جھٹکے سے گھونگھٹ پلٹ دیا۔ اس کے چہرے پر وحشت پھیلی ہوئی تھی۔ گلو کو لگا جیسے وہ ایک دم خوف زدہ ہوگئی ۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ صرف لحہ بھر کو سناٹا پھیلا پھر چھن سے ٹوٹ گیا۔ نازاں کی کلائی اپنے ہی گھٹنے سے ٹکرائی تھی اور کانچ کی تین چوڑیاں ٹکڑے بن کر اس کی گود میں آگری تھیں۔

چاچی کو چھناکا سنائی دیا تھا۔ وہ اور ہولا کر رہ گئیں۔ کچی زمین پر گرے ہوئے زردے کا اوپر اوپر سے نوالہ اٹھا کر انہوں نے گلو کی چوڑی ہتھیلی پر رکھا اور اسے نازاں کی طرف دھکیل دیا۔ "جلدی کر گلو! مغرب کا سایہ پڑنے سے پہلے بدشگونی توڑ دے۔"

"ہتھیلی میں پکڑوں گی۔" جمشید بھیا کی بیوی لپکا لگا کر دوپٹا سنبھالتی ہوئی بھیڑ چیر کر درمیان میں آگئی۔ پتا نہیں بچہ کیسے تھما آئی تھی۔ اس کا بھرا ہوا جسم پورے کمرے میں چھا گیا۔ زرد رنگ کے کپڑوں نے اجالا سا کر دیا۔ گلو کے دماغ سے سیاہی ختم ہو کر زردی مائل ہوگئی۔ وہ نازاں اور اس کے درمیان کھڑی تھی۔

"ایک سہاگن اور بلالو۔" چاچی دروازے کی طرف منہ کر کے بولی۔

"ایک نہیں دو۔ میٹھے کی رسم ہے' جوان سہاگن چاہیے۔" اس نے چاچی پر طنز کیا اور جھپٹ کر گلو کی چوڑی چکلی ہتھیلی اپنے نرم نرم ہاتھوں میں یوں پکڑلی جیسے ذرا بھی ڈھیلی گرفت ہوئی تو گلو بھاگ جائے گا۔

اور گلو کو لگا جیسے دو کبوتر اس کے ہاتھ پر آ بیٹھے ہوں۔ اندر ٹھنڈے اور گرم تھپیڑے ایک ساتھ اٹھنے لگے۔ عجیب سی متضاد کیفیات نے اسے مشتعل کر دیا۔

"کیا مصیبت ہے؟ یہ بھی کوئی رسم ہوئی؟"

چاچا اور چاچی نے سنا ہی نہیں۔ سہاگنوں کو آوازیں پڑ رہی تھیں۔ گلو کو لگا جیسے جمشید بھیا کی سہاگن کے سوا کوئی دوسری ہے ہی نہیں حتیٰ کہ نازاں بھی بے جان گٹھڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی لگی۔ بے حس اور ساکن۔ اس کا پیلا پڑتا رنگ جمشید کی بیوی کے زرد کپڑوں میں کہاں گھل گیا تھا۔ صرف اتنا خیال آیا کہ اسپتال سے آئی ہے' آتے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا۔ پتا نہیں دوا کھائی ہو گی کہ نہیں؟

"یہی تو رسم ہوتی ہے۔" جمشید کی بیوی یوں دیکھ رہی تھی جیسے دیکھ نہ رہی ہو' اندر ہی اندر اتری جا رہی ہو۔ گلو بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا مگر اپنے بازو بھر ہی کا فاصلہ پیدا کر پایا۔ ہتھیلی تو اس کی گرفت میں تھی۔ دوسری ساکن آ گئی تھی۔ عجیب مری مری سی' یوں جیسے انسان نہ ہو اس کا مٹا مٹا سا نقش ہو۔ یہ احساس گلو کو ہوا تھا اور منہ جمشید کی بیوی نے بنایا۔ وہ پھر نگاہ چرا گیا۔

پھر جب سب نے مل کر اس کی ہتھیلی کو نازاں کے ہونٹوں سے لگایا اور لگا کر ہٹالیا تب تک وہ خود بھی سارا پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ سخت گرمی کے احساس نے نازاں کے تپتے ہونٹوں کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ ساری رسم میں کبوتروں کے اڑنے' بیٹھنے پھر اڑ جانے کا احساس ہی غالب رہا۔ اس فضول سی "مصیبت" رسم میں کئی بار گلو کے ہونٹوں پر ہنسی آئی اور گئی۔ نہ امام دین یاد رہا' نہ زیبی اور نہ ہی نازاں۔ پہلی بار رنگ اس کی آنکھوں میں گھسا جا رہا تھا۔ نامانوس خوشبو سے انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ بار بار دھکا لگنے سے' ڈگمگا جانے پر بھی غصہ نہیں آ رہا تھا۔ پیچھے' دائیں' بچوں کا جمگھٹا اور شور جیسے اس کی سماعت اور بصارت سے دور کہیں تھا۔ نازاں نے کب زردے کے چاول کھالیے' کتنے نیچے گرے یہ تو پتا بھی نہ چلا۔ یہ یاد رہ گیا کہ پانچ نرم انگلیوں نے ہتھیلی سے دانے اٹھا کر منہ میں ڈال لئے تھے اور چاچی ہیں ہیں کرتی رہ گئی۔

"ارے کمبخت! ارے کیسی باؤلی ہے............ یہ دانے نہیں کھاتے............ ارے ہڑبونگی! ماں نے کچھ بتایا نہیں۔" وہ دانت کچکچا کر اسے دھکے دینے لگیں۔ وہ ہنستی چلی گئی۔ گلو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی ہتھیلی پر سرسراہٹ جم کر رہ گئی۔

"جو ماں نے بتایا تھا' وہ یاد نہیں رہا چاچی!" وہ بے حیائی سے لہرائی۔ دوپٹا گرا کر' پورا جھک کر اٹھالیا۔ گلو کے اندر تیز آندھی اٹھی۔ باقی کا دکھ' محرومی' امام دین کی وحشت' زیبی کے آنسو اور نازاں کے چہرے کی زردی سب کچھ کہیں آندھی میں اڑ گیا۔

وزن سنبھالنا مشکل لگا۔ وہیں ٹکا رہ گیا۔ چاچی جمشید بھیا کی بیوی کو دھکیلتی ہوئی اور ں کو گھسیٹتی ہوئی کمرے کے بیرونی دروازے تک پہنچ گئی۔ وہ پلٹ پلٹ کر ہنستی رہی۔ ؤ کا دھیان دروازے کی طرف لگا رہا۔ وہ بھی پلٹا۔

"سویرے کا دودھ بھی میں پلاؤں گی چاچی!" اس نے پوری شوخی سے ہانک لگائی ے چاچی سے نہیں' گلو سے کہہ رہی ہو۔

"بڑی حرافہ ہے چھمو تو۔" اس بار چاچی نے دھپ جما دیا۔

"چھمو!!" گلو نے دل میں دہرایا پھر چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز تیز ں تھی مگر اندر کی تھی' اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اپنا جینا اتھلا اتھلا سا لگا۔ یہ بھی نہ جان ا تھا کہ چھمو محلے میں رہتی ہے۔ بہت ہنستی ہے اور جو بھی بات کرے سننے والے ینپ جاتے ہیں۔ اتنی ہی دیر میں گلو نے کتنی ہی بار اسے عورتوں کے کان میں کچھ کہہ ر ٹھٹھا مارتے اور سننے والیوں کو جھینپ کر اسے جھڑکتے دیکھا تھا۔ اسے نہ اپنے روتے بچے کا ہوش تھا' نہ ہی اپنے چیختے وجود کا۔ بھری محفل میں روتے بچے کو یوں قمیض کا امن اٹھا کر اندر چھپالیتی جیسے بہلانے کا وقت نہ ہو۔ بس ایک ہی ترکیب ہو۔

"خون پیتا ہو گا۔" گلو ابھی تک اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ "مگر خود تو پوری لالی ہے۔"

"گلو! یہ دونوں وقت ملنے کا وقت ہے۔ خدا سے اچھی زندگی کی دعا مانگ کر گھونگھٹ اٹھانا۔"

چاچی نے قریب آ کر سرگوشی کی۔ پھر نازاں کے جھکے ہوئے سر کو سینے سے لگا کر اپنا نہ اس کے کان پر رکھ دیا۔

گلو ذرا دھیان دیتا تو سن لیتا مگر دھیان تو دروازے سے دائیں جانب کی کھڑکی کی طرف چلا گیا تھا۔ وہیں سے باہر جھانک رہا تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اس طرف سے آ رہی تھی۔

"بھائی جی............! مجھ سے نہیں سنبھلتا۔ پکڑو اسے۔" جانے کس کی آواز تھی۔

"یہ حرام زادہ تو مجھ سے بھی نہیں سنبھلتا۔ کسی گائے کے آگے ڈال آ اسے۔"

چھیمو کی آواز میں غصہ اب بھی نہ تھا۔

"تو گائے سے کم ہے کیا' عادت ڈالی ہے تو بھگت۔" کسی نے کچکچا کر کہا تھا۔

"ہائے..........! میں ہی تو بھگتتی ہوں۔ لادے اسے۔ پکا حرامی بنے گا بڑے ہو کر۔ دیکھ لینا۔" یوں کہا جیسے بڑے فخر کی بات بتا رہی ہو۔

"تیرے جیسا ہی ہوگا۔ اچھا اب چل یہاں سے۔ کھانا تو کھالے ٹک کر۔"

"میری تو بھوک ہی اڑ گئی۔ چار دانے زردے کے طبیعت سیر کر گئے۔" وہ پھر زور سے ہنسی تھی۔ "اسی لئے کہتی ہوں۔ مزہ ہو تو دو نوالے یا ایک گھونٹ کافی ہے۔ تیری طرح گھنٹوں کے بعد بھی چینخی ہوئی نکلتی۔"

کئی گالیاں پڑیں۔ دھموکوں کی آوازیں آئیں پھر جیسے کوئی گھسیٹ کر کہیں لے گیا۔

گلو کے اندر پپڑیاں سی جم گئیں پھر جیسے چٹخنے لگا۔

چاچی اب بھی نازاں سے کھسر پھسر کر رہی تھی پھر سیدھی ہو گئی۔

"گلو! بخار ہو رہا ہے اسے۔ سنبھالنا۔ میں گولیاں لاتی ہوں۔" وہ تیزی سے باہر چلی گئی۔

نازاں کا وجود گلو کو زندہ زندہ سا لگا۔ اس نے سوچا' بات کرے مگر باہر کی آواز پھر اسے متوجہ کر گئی۔

"کیا ہوا چاچی؟" آواز چھیمو کی تھی جیسے رزلٹ پوچھ رہی ہو۔

"چپ کر تو۔ ہر وقت ٹٹول سوجھتا ہے۔ نازاں کو بخار ہو گیا۔"

"وہ تو ہونا ہی تھا مگر گھبرانے کی بات نہیں۔ جلدی اتر جائے گا۔ مجھے بھی ہو گیا تھا۔ سویرے ہی اترا تھا۔" پھر کمینگی سے کہا گیا۔ عورتیں ہنس پڑیں۔ چاچی نے شاید سنا نہیں ورنہ پھر ایک گالی تو دے ہی جاتیں۔

بخار نازاں کو ہوا تھا' تپش گلو کے اندر بھر گئی۔ ہنسی ٹھٹھول کی آوازیں دھیرے دھیرے دور ہو گئیں مگر شور کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ برتن اب بھی بج رہے تھے۔ جانے لوگوں کو کیا ہو گیا تھا' کھائے ہی جا رہے تھے۔ جیسے کبھی پیٹ بھر کھایا ہی نہ ہو'

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو کی شادی کے انتظار میں پیٹ پر پتھر باندھے گھوم رہے تھے۔ بھوک تو گلو کے اندر بھی چکر لگا رہی تھی مگر شاید پیاس نے اور بھی برا حال کیا ہوا تھا' پھر نازاں کے بخار کی تپش.......... وہ اچانک ہی ان تینوں میں سے کسی ایک کی شدت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا مگر دماغ میں جیسے بھس بھر کر رہ گیا تھا۔ بات ذہن میں آ ہی نہیں رہی تھی۔ کچھ سوچا ہی نہیں جا رہا تھا۔ رہ رہ کر پیلا رنگ' دوپٹے کا گوٹا' چھاتی سے چمٹا بچہ اور آنکھوں میں بھری شرارت کے ساتھ ساتھ بے ساختہ قسم کی ہنسی بار بار اسے بھٹکا دیتی۔ سامنے بیٹھی نازاں پھر پتھر کی سی لگنے لگی۔ چاچی نہ آجاتی تو وہ گھبرا کر باہر آجاتا۔ کھڑکی کی دوسری طرف کی آوازیں معدوم ہوئی تھیں تو گھٹن اور سناٹے کا احساس برتنوں اور بچوں کے شور پر غالب آگیا تھا۔

"لے نازاں! یہ کھالے۔ جا گلو..........! دیکھ چاچا کچھ کہہ رہا ہے۔"

وہ بڑی تیزی سے اندر آئی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں گولیاں اور پانی کا گلاس تھا۔ گلو کو یوں لگا جیسے انھوں نے قید تنہائی سے رہائی کا مژدہ سنایا ہو۔ وہ تیزی سے باہر آگیا۔ گہرے گہرے سانس لئے تو وہی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھس گئی جو کچھ دیر پہلے نامانوس ہونے کے باوجود اپنی اور مانوس سی لگی تھی۔ چھٹی حس نے اس چونکایا' وہ پلٹا۔ سامنے جمشید بھیا کی بیوی بیٹھی چاول کھا رہی تھی بلکہ کھا نہیں رہی تھی' انگلیاں چوس رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کے سراپا پر جم گئی تھیں۔

بے پناہ ندیدہ پن تھا اس کی آنکھوں میں۔ گلو کو نہ جانے کیوں اپنی چوڑی کلائیوں پر آگے بالوں کے گچھوں پر باریک پھوار کے گرنے کا سا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹکا ضرور تھا۔ اس کی آنکھوں پر پھر اس کی انگلیوں پر لمحہ بھر کو نگاہ بھی ٹکی تھی اور چھیمو کی انگلی آدھی منہ میں ہی رہ گئی تھی مگر اس نے دوسرے ہی لمحے دوڑ لگا دی۔ بے وجہ یہ احساس ہوا تھا کہ پیروں تلے بھربھری ریت ہو اور وہ اس میں دھنستا چلا جا رہا ہو۔

گلو کے لئے یہ سب بہت سنسنی خیز تھا۔ اسے تو صرف اتنا پتا تھا کہ نازاں سے شادی ہوگی' چاچا کا دل گھر کی ویرانی میں لگنے لگے گا' نازاں اس کی دیکھ بھال کرے گی' وہ بے فکر ہو جائے گا اور بس.......... مگر یہ جمشید بھیا کی بیوی..........! اس نے سارے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

واقعے کو بہت عجیب وغریب سا بنا دیا تھا۔ گلو کے سارے احساسات اسے عجیب سی سنسنی میں مبتلا کیے دے رہے تھے۔ ایسا تو کبھی اس نے محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

"گلو بیٹا! ادھر آ.........."

چاچا ہی دو چار قدم اس کی طرف بڑھ آیا تھا ورنہ گلو کو تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک قدم چاچا کی طرف بڑھتا ہے تو دو قدم پھیمو کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اسے اپنی پشت پر اس کی ندیدی نگاہوں کی چپچپاہٹ اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"دیکھ بیٹا! نازاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رحمان کی بیوی بتا رہی تھی کہ اسے بخار ہوگیا ہے۔ میں نے کھانا جلدی لگوا دیا تھا تاکہ زیادہ رات نہ پڑے۔ تو کسی قسم کی فکر نہ کر۔ بس نازاں کا خیال رکھ۔ مہمانوں کو میں نمٹا دوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے کسی روبوٹ کی طرح کہا اور پلٹ گیا۔ لحہ بھر کو حیرت ضرور ہوئی تھی کہ بھلا چاچا یہ بے تکی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ وہ کون سا مہمانوں کی فکر میں لگا ہے۔ اسے تو امام دین تک بھول گیا تھا۔ زیبی بھی یاد نہیں رہی تھی جس کا چہرہ تمام زندگی اس کے خوابوں میں سجا رہا تھا اور برسوں سے اس کے تعاقب میں تھا پھر وہ حقیقت کا روپ بھر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اسے تو یہ احساس تک نہ رہا تھا کہ وہ کیسے دوراہے تک آپہنچا ہے وہ جو ذرا دیر کو طوفان آیا تھا اسے تو پھیمو کی ہنسی اور اس کی بیہودہ باتوں نے آن کی آن میں اڑا دیا تھا۔

امام دین اور زیبی کا دھندلا سا خاکہ پھر ذہن میں ڈگمگایا مگر اس بار قدموں میں لرزش پیدا نہ ہوئی۔ وہ اسی راستے سے بالکل اسی سیدھ میں نازاں کے کمرے کی طرف پلٹا تھا جہاں سے گزر کر چاچا کی طرف گیا تھا۔ وہ اب بھی انگلیاں چاٹ رہی تھی۔ چاول کی بھری ہوئی پلیٹ اس کے سامنے جوں کی توں رکھی تھی۔

"ارے ریشماں..........!" اسے دیکھتے ہی پھیمو نے انگلیاں منہ سے نکال لیں اور اس پر نگاہ جمائے جمائے کسی کو پکارا۔

"اے جلدی کھا۔" اس کے پیچھے سر جھکائے بیٹھی ریشماں نے اسے کہنی ماری۔

"بغیر کھائے ہی پیٹ بھر گیا میرا تو۔ ایسا مزہ آیا کہ بس.........." اس نے پھر انگلی

نہ میں ڈال لی۔

گلو رکا نہیں۔ اسے اس بار یوں لگا جیسے بپھرے ہوئے سمندر کی کوئی موج تڑپ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی ہو اور اگر وہ ذرا بھی رکا تو اسے اپنے ساتھ ہی بہا لے جائے گی۔

☆----------☆----------☆

وہ رات گزری تو سویرا زیادہ چمکیلا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی پہلی کرن نے ہی گلو کو جگا دیا۔ وہ سویا کب تھا، ایک غنودگی تھی جو کبھی کبھی اسے کہیں ڈبو دیتی اور کبھی ابھار دیتی تھی۔ باہر کا اندھیرا اندر بہت روشنی کرتا رہا۔ نازاں کا بخار تیز ہوگیا تھا مگر اس کا احساس سے سویرے ہوا۔ رات کو تو خیال تک نہ آیا۔ کسی بھی بات کا خیال نہ آیا۔ ایک خوشی ی اسے بے خود کرتی رہی۔ صرف اتنا خیال رہا کہ اس نے بڑا اچھا کیا، بڑی نیکی کا کام کیا۔ ازاں کو تحفظ دینا اور کسی کے بس کا نہ تھا، خود اسے بھی جیسے کہیں سے تحفظ مل گیا تھا اور یہ خیال آتے ہی پھسکڑا مارے، انگلیاں چوستی پھیمو نگاہوں میں گھوم گئی اور وہ کمبخت تو ساری رات ہی جیسے پھسکڑے مارے بیٹھی رہی تھی۔ باہر کے گہرے سناٹے میں بھی اس کی ہنسی، پائل کے گھنگروؤں کی طرح بجتی رہی تھی۔ گلو نے پہلی بار سوچا تھا کہ اسے یوں دنیا سے بے خبر ہو کر نہیں جینا چاہیے۔ محلے داروں کا حق رشتے داروں سے بڑھ کر ہوتا ہے اور اس نے تو کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ اس کے محلے میں کون کون رہتا ہے۔ پھر جمشید بھیا تو اس سے بڑی اچھی طرح ملتے تھے۔

آنکھ کھلتے ہی یہ تمام باتیں دماغ میں یوں جاگ اٹھیں جیسے ساری رات اس کے دماغ میں بھری رہی ہوں۔ رات کا گزرا ایک پل بھی نازاں کے حوالے سے اس کے دماغ میں نہیں تھا، بلکہ اسے تو یاد ہی نہ تھا کہ اس کے پہلو میں کوئی ہے۔ وہ سوچ رہا تھا، پھیمو کی آواز تو بھاری سی، بھرائی ہوئی سی ہے پھر ہنسی کی آواز گھنگرو کی سی کیوں ہے؟

☆----------☆----------☆

اس نے شاید کروٹ لی تھی۔ پائل بول اٹھی۔ گلو اچھل پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو نازاں کا تمتاتا چہرہ سامنے تھا۔ نگاہ اس کے چہرے سے ہوتی ہوئی کھلی چاندی ایسی پنڈلی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاکر جم گئی جہاں چاندی کی پائل پھنسی ہوئی تھی۔ اس کا حلق خشک ہوگیا۔ ایک منظر نگاہ میں گھوما' زیبی نازاں کے مہندی لگے ہاتھوں میں چاندی کی پائل رکھے بیٹھی تھی' آنسوؤں کی لکیریں اس کے چمپئی رخساروں پر جم کر رہ گئی تھیں۔

وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ نازاں جاگ گئی۔ اس کے بھاری پپوٹے لرزے۔ گلو کے دماغ سے سارا منظر بھک کرکے نکل گیا۔ پل پل یاد آگیا۔ یہ بھی یاد آیا کہ نازاں میں سے آنچ آرہی تھی اور یہ بھی کہ نازاں اب اس کی ذمے داری ہے۔ اس نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ چاچی سرہانے رکھے ٹین کے بکس پر سفید کپڑا ڈال کر ایک ٹرے رکھی گئی تھی۔ وہ ٹرے سرخ ریشمی کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جاتے جاتے اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس میں بخار کی گولیاں بھی رکھ دی ہیں' اگر بخار نہ اترے تو گلو اسے دو گولیاں اور کھلا دے۔

گلو نے ٹرے پر ڈھکا کپڑا ہٹایا۔ پیالے میں دودھ جلیبی تھی۔ دو چمچے تھے۔ گلاس میں پانی تھا اور پیناڈول کی گولیوں کا پورا پتا رکھا تھا۔

"اٹھ نازاں!" گلو نے دھیرے سے ہاتھ اس کی گردن کے نیچے سرکایا۔ "بخار تیز ہے' گولی کھالے۔"

"نہیں............ میں گولی اب نہیں کھاؤں گی۔" وہ اس کے سہارے اٹھ بیٹھی۔

"پانی............ پانی دے دے۔"

وہ بہت نڈھال تھی۔ گلو کو دکھ ہوا۔ اسے آرام کی سخت ضرورت تھی مگر............

"پھر یہ کھالے............ کمزوری کم ہوگی۔" گلو نے جلیبی کا پیالہ اٹھایا۔ اسی وقت دروازے پر رحمان چاچا کی بیوی کی آواز سنائی دی۔ چاچا اور چاچی اٹھ گئے تھے۔ اسے اتنے سویرے چاچی کی آواز سن کر حیرت ہوئی۔ "وہ کیا سویرے ہی آگئی؟" دروازہ کھولتے ہوئے اس نے سوچا اور دروازہ کھولنے کے بعد حیرت سے گنگ رہ گیا۔ سامنے چاچی ہی نہیں' چھیمو بھی کھڑی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھے' ہنسی چھپاتی ہوئی۔ چاچی کی آنکھوں میں بے نام سا تجسس تھا۔ مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی مگر چھیمو کی آنکھوں میں ایسی کوئی بات تھی کہ گلو چور سا بن گیا۔ ہڑبڑا کر دو قدم پیچھے ہوا اور جونہی چاچی اندر

اخل ہوئی' وہ باہر کی طرف لپکا۔ چھیمو ایک دم ہی سامنے آگئی۔ ٹکرائی تو گلو کو اندر کانچ سے چبھتے محسوس ہوئے۔ لمحہ بھر کو لڑکھڑا کر وہ آگے بڑھا' پلٹا۔ وہ شیشے کی تو بنی ہوئی نہیں تھی۔ پکی لال مٹی سے بنی لگ رہی تھی۔

اس کے بازوؤں پہ اگے بالوں کے سیاہ گچھے پھر بھیگنے لگے۔

"گرم پانی رکھ دیا ہے غسل خانے میں۔"

وہ پھر گھنگروؤں کی طرح بجی اور بجتی چلی گئی۔ گلو صحن میں نکل آیا اور یہ دیکھ کر س کا دماغ گھوم گیا کہ آنگن بچوں سے پٹا پڑا تھا۔ دور تک بچھی دری پر ننگے' میلے اور پاولوں سے سنے بچے آڑھے ترچھے پڑے سو رہے تھے۔ رحمان چاچا کی بیٹی ایک طرف پنے بچوں کو لئے بے سدھ پڑی تھی۔ چاچا اٹھ کر شاید باہر گیا تھا۔ چارپائی خالی تھی۔

"چاچی جی یقیناً یہیں رہی ہوگی۔ بھلا کیا تک تھی؟" اس نے غصے سے سوچا۔ محلے کے لوگ تھے' اپنے گھر جاکر سوتے۔ اسے غصہ کم شرمندگی زیادہ تھی۔ خاص طور ر چھیمو کا رات یہاں رہنا تو اسے بل کھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ چار گھر چھوڑ کر تو گھر تھا س کا تھا یہاں کیوں پڑی رہی منحوس!" وہ بے دم سا چاچا کی چارپائی پر جا بیٹھا۔

"ارے گلو!!!" چاچا پتا نہیں کب آیا تھا اندر' آتے ہی اس پر جھک گیا۔ اس کی ڑھی آنکھوں میں بھی کھوج تھی۔ پل کے پل سارا غصہ دکھائی دے گیا۔ وہ سیدھا ہوا تو رہ فق تھا۔ "کیا ہوا؟" اس نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ سارا محلہ یہاں کیوں جمع ہے؟" وہ بھنا کر بولا۔

"ارے وہ............" چاچا بے وجہ ہی ہنس پڑا۔ بلا کا اطمینان تھا اس کی ہنسی میں' رنہ گلو کا چہرہ اور آنکھیں دیکھ کر تو ڈر ہی گیا تھا کہ جانے نازاں سے لڑلیا یا کچھ اور یسا ہوگیا۔ "باؤلا ہوا ہے گلو! پہلی خوشی تھی گھر کی۔ اب تو اللہ رکھے تیری اور نازاں کی جہ سے آئے دن خوشیاں ہوں گی۔"

"تو اس میں پورے محلے کو یہاں سلانے کی کون سی بات تھی؟" وہ غرایا۔

"ابے پورا محلہ کہاں ہے! یہ سلو ہے' اپنے رحمان کی بیٹی اور اس کے بچے' .... چھیمو ہے' اکیلی ہے' ایک گود کا بچہ ہے۔ چاچی کا رہنا تو یوں بھی ضروری تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہزار کام بکھرے تھے اور رحمان کے گھر مردوں کے سونے کا انتظام تھا۔ چھیمو کا سسر باؤلا' رات شادی کا کھانا کھا کے' گھر کی چابیاں لئے لئے ہی بیٹی کے گھر راسوامی چلا گیا۔ وہ اکیلی بچی کہاں جاتی پھر تجھے پتا ہے' تیرے کتنے کام اس نے نمٹائے ہیں؟"

گلو نے سر اٹھا کر چاچا کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے اس کے سارے ہی کام اس نے نمٹائے ہیں۔

"ایک ایک برتن دھویا ہے اس نے۔ آدھی رات تک کام کرتی رہی۔ میں نے لاکھ منع کیا کہ بچہ کلبلا رہا ہے' جاکر اسے سلا اور خود بھی سو مگر.......... جانے کب تک بکھیڑے سمیٹتی رہی۔ مجھے تو تھکن سے ہوش ہی نہ رہا۔ رحمان کی بیوی بھی بے چاری ہلکان تھی' سو گئی۔ یہ جو سارا کام سمٹا لگ رہا ہے ناں تو اس کی وجہ سے۔ اب جانے کب اٹھ کر ناشتا تیار کر لیا۔ تجھے پراٹھوں کی خوشبو نہیں آ رہی؟"

اور گلو کو فکر ہو گئی کہ پتا نہیں کھڑکی رات اس نے بند کی تھی کہ نہیں۔ شرمندگی اور بڑھ گئی۔

"جا.......... جاکر نہالے۔ نازاں اٹھ گئی؟" چاچا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"اسے بخار ہے۔" گلو بولا تو زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وجہ' سامنے کھڑی چھیمو ہی تھی جس کی آنکھوں میں رت جگے کی سرخی کے ساتھ ایک عجیب سا احساس تھا۔ اس احساس نے گلو کو رات سے' بلکہ کل شام سے ہی گھن چکر سا بنا دیا تھا۔ جو کرنے کے کام تھے' ٹھیک سے کر نہ پایا اور جو سوچنا تھا' وہ بگولے کی طرح دماغ سے اڑ چکا تھا۔

غسل خانے کی طرف جاتے جاتے گلو کی آنکھوں میں جمشید بھیا کا سراپا لہرا گیا۔ لرزتا کانپتا' زرد رو' کمزور' کندھے ڈھلکے ہوئے' مگر جبڑے چڑے ہوئے۔ ہر وقت زور زور سے ہنستا ہوا مگر یہ ہنسی ہونٹوں سے اوپر کہیں آنکھوں تک نہیں پہنچی تھی کیونکہ گلو نے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ایک انجانا سا خوف ہی محسوس کیا تھا۔ سنا تھا کچھ کام نہیں کرتا' مگر یہ شکوہ یا تو اس کے باپ کو تھا یا محلے والوں کو۔ چھیمو نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن گھر میں گھسا رہتا تھا۔ باپ ہی سے جھگڑا ہوتا' وہی دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔ شور پر جمع ہو جانے والے محلے والوں کو بتاتا۔ "سالا! نہ کام کرتا ہے نہ

کما کر لاتا ہے' حرام زادہ کہیں کا۔ وہ نیک عورت اگر کچھ نہیں کہتی تو اس کا پیٹ تو ڈکراتا ہو گا۔"

اور ایک بار تو گلو نے خود دیکھا تھا' جمشید کا باپ اسے دھکے دے رہا تھا۔ چھیمو اس کی آستین پکڑ کر اندر کھینچ رہی تھی۔ وہ چیخ رہا تھا کہ یہ لڑکی بیاہ کر لایا ہے تو کما کر بھی لا' اور چھیمو ہنس رہی تھی۔ اس کی باتیں سن سن کر گلو سمجھتا تھا کہ بیوی کو فاقے کرا دیے ہوں گے۔ تبھی تو باپ دھکے دینے کی نوبت تک پہنچ گیا مگر اسی روز اس کی بھری کلائیاں دیکھ کر خیال آیا تھا' پتا نہیں کیا کھا کر گوشت چڑھا لیا ہے پھر خود ہی سوچ لیا کہ باپ محنت کرتا ہو گا پھر اچانک اطلاع ملی کہ جمشید کے بڑے بھائی نے دبئی کا ویزا بھیج دیا ہے۔ باپ خوش تھا مگر جمشید مرجھا کر رہ گیا تھا۔ کندھے اور جھک گئے تھے۔ رنگ اور زرد ہو گیا تھا۔ ان دنوں چھیمو بھی کمزور ہو گئی تھی۔ یہ بات رحمان چاچا کی بیوی نے بتائی تھی چاچا کو۔ اس نے دھیان نہیں دیا تھا مگر سنا سب کچھ تھا۔ اس کی کلائی کے سوا کچھ نظر نہ آیا تھا' سوچا بھی نہیں تھا اور اب تو اچھی بھلی' بھرے بدن کی کسی کسائی' چمکتی لپکتی اور ہنستی دیکھی۔

☆==========☆==========☆

اس نے بالٹی کا گرم پانی ڈونگے میں لے کر بدن پر ڈالا تو جیسے ایک بار پھر جھلس کر رہ گیا۔ یوں لگا جیسے جلتے توے پر پانی کے چھینٹے پڑ کر چھنچھنا گئے ہوں۔ بھاپ سی اڑی ہو۔ اس نے پوری ٹونٹی کھول کر ٹھنڈا پانی کھول دیا اور سکڑ کر نلکے کے نیچے جا بیٹھا۔

باہر بچے رو رہے تھے' کسمسا رہے تھے۔ چاچا پھر بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ چاچی نازاں کے پاس تھی اور چھیمو آنگن میں۔ وہ کترا کر کمرے کی طرف بڑھا' وہ ایک پہلو یوں بچائے آگے بڑھ رہا تھا جیسے چھیمو کا اسی پہلو ٹکرانے کا ارادہ ہو۔ ارادہ تو تھا مگر وہ بال بال بچ گیا۔ چھیمو کا بچہ آڑے آ گیا' جو گھٹنوں چلتا' اسے تلاش کرتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔ پھر گلو نے اس کے رونے اور پٹنے کی آوازیں ہی سنیں۔ وہ جی بھر کر گالیاں دے رہی تھی' پتا نہیں کس کو؟

☆==========☆==========☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ولیمے کی دعوت کا اہتمام چاچا نے زیادہ زور دار کیا تھا۔ اسی سے پتا چلا کہ دعوت کے کھانے کا انتظام امام دین نے کیا تھا۔ خود امام دین غائب تھا۔ گلو کو جیسے ہی پتا چلا' یوں لگا جیسے کھوئی ہوئی یادداشت لوٹ آئی ہو' چائے پینے کے دوران چاچا بتا رہا تھا۔ اسے ہدایت دی تھی کہ چائے پیتے ہی نکڑ والے ڈاکٹر کو لا کر نازاں کو دکھا دے۔ چاچی نے نازاں سے کہہ دیا تھا کہ تسلی رکھے' ابھی ڈاکٹر آجائے گا۔ وہ ہولا کر رہ گئی۔ بلک بلک کر رونے لگی کہ اسے ڈاکٹر کو نہیں دکھانا۔ اس نے دلھناپے کا خیال کیے بغیر کمرے سے باہر آکر چاچی سے کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر کو لینے کوئی نہیں جائے گا۔ گلو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا تھا۔ چاچی دھڑدھڑاتی رہ گئی۔ آخر گلو نے جا کر دروازہ کھلوایا' تسلی دی۔

"مجھے سونے دو بس۔ گولیاں کھالی ہیں میں نے۔"

نازاں ناراض لگ رہی تھی۔ وہ لوٹ آیا۔ چاچا نے ڈھیروں کام بتادیے۔ اسے نازاں کی طرف سے اتنی تشویش نہیں تھی' چاچی بھی بڑے انداز سے کہہ گئی تھی کہ نازاں کو سونے دیا جائے۔ چاچا چپکے سے مسکرایا تھا' جیسے ہنسی چھپانا چاہتا ہو۔ چھیمو زور سے ہنسی تھی' گلو چاچا کے بتائے ہوئے سارے کام ذہن میں دہراتا گھر سے باہر چلا گیا تھا۔

☆==========☆==========☆

امام دین سیدھا گھر پہنچا تھا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ اسے بے پناہ اطمینان ہوا۔ زیبی گھر پہنچ چکی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ پہلے اس نے چاہا کہ دروازہ کھٹکھٹائے مگر یہ سوچ کر تھڑے پر بیٹھ گیا کہ جانے وہ کھولے گی یا نہیں۔

"یوں.......... شادی کے گھر سے اس طرح چلے آنا!! یہ کیا بات ہوئی؟" اسے غصہ آنے لگا۔ "چاچی نے کیا سوچا ہوگا؟" اس کی ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ جانے کیا سوچ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ زور سے دروازے پر ہاتھ مارا۔ کوئی آواز نہیں ہوئی۔ اس نے اس بار دروازہ دھڑدھڑا دیا۔

"کون ہے؟" آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"کھولو دروازہ۔" امام دین کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔ بھاری اور گرجتی ہوئی سی۔

دروازہ کھل گیا۔ ماے کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کی سرخ اور سوجی ہوئی آنکھوں کے پپوٹے بہت بھاری ہو رہے تھے۔ ایسی وحشت تو اس نے کسی کے چہرے پر کبھی دیکھی ہی نہ تھی۔ وہ پلٹ گئی۔

"زیبی..........!" امام دین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے؟ دکھ کا اظہار کرے تو کیسے؟ تسلی دے تو کس بنا پر۔

"ماے!" وہ آنگن میں پڑی کرسی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ "سارے خواب کچی بستیوں کے مکینوں کی آنکھوں میں ہی اترتے ہیں اور.......... اور تعبیریں..........! تعبیریں کہاں جاتی ہیں؟"

وہ کیا جواب دیتا' وہ تو خود اسی بستی کا مکین تھا' ایسا مکین جس نے برسوں ایک ہی خواب کو کسی قیمتی شے کی طرح سنبھالے رکھا تھا مگر یہ بھول گیا تھا کہ اس کی ساری قیمتی چیزیں سیلابوں میں بہ جاتی ہیں۔ ایک سیلاب وہ تھا جو اس سے اس کے سارے رشتے' گھر کا سکون اور اس کے سبھی جذبوں کو بہا کر لے گیا تھا اور ایک سیلاب اس روز آیا تھا جب زیبی نے اس سے اس کی محبت' آس اور امید کی ساری قندیلیں لے کر بے حسی کے ریلے میں بہا دی تھیں۔

آدمی کتنا خود غرض ہوتا ہے' جو دکھ دوسرے کو دیتے ہوئے پتھر کا بن جاتا ہے' وہی دکھ اسے ملے تو کس قدر تڑپتا ہے۔ وہ تو رولی تھی' امام دین کو تو اپنی مردانگی کی لاج رکھنا تھی۔ وہ اندر ہی اندر کتنا تڑپا تھا مگر آنسو کا ایک قطرہ تک آنکھ میں نہیں آنے دیا تھا۔ وہ اسے بے بسی سے تکتا رہ گیا۔

"یوں لگ رہا ہے جیسے کرنے کو اب کوئی کام ہی نہیں رہ گیا ہو۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں دھیرے سے بولی۔ "آدمی کتنا بے بس ہے' جانے کیا کیا سوچتا ہے' کیسے کیسے منصوبے بناتا ہے اور.......... اور کچھ بھی نہیں کرپاتا۔ کتنے قریب تھا وہ.......... کتنی بار اس دروازے کی دہلیز پر قدم آئے تھے اس کے.......... میں.......... جو اس سے بے پناہ محبت کی دعوے دار تھی' اس کی چاپ پہچان لینے کا غرور تھا مجھ میں.......... بغیر چاپ سنے' ایک بار بھی نہ جان سکی کہ وہ ہے.......... ساری دنیا سے خود کو اس لئے چھپائے رکھا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ماے کہ............ کہ دیکھے تو وہی مگر............ یہی پردہ اس کے اور میرے درمیان دیوار بن گیا............ اور دیوار بھی کیسی؟ جو باہر سے اٹھی اور اندر تک چلی گئی ماے! نہ کچھ سنائی دیا' نہ دکھائی۔ نہ کچھ محسوس ہوا اور نہ............ نہ ہی............"

امام دین پتھر کا بت بنا سن رہا تھا اور حیرت سے سوچ رہا تھا۔ "دھوکا اس نے ہی نہیں زیبی نے بھی کھایا ہے۔ زعم اس کو ہی نہیں' زیبی کو بھی تھا' پھر پیار کیا ہے؟ وہ اعتماد' وہ اعتبار' وہ قوت جو پیار کی ہوتی ہے وہ کیا ہے؟ کہاں ہے؟ گہرائی کس میں کم تھی؟ گلو میں کہ زیبی میں............ خود اس میں یا............ یا کہیں بھی نہیں............ پیار کوئی قوت نہیں' کوئی طاقت' کوئی جذبہ نہیں............! یہ سب خود آدمی کا کھیل ہے۔ وہ چاہتا ہے تو پیار کرنے لگتا ہے' خود اپنے سہارے کو............ خود اپنی تسلی کو' اپنے اندر کی کیفیت تبدیل کرنے کو............ ہاں............ ہاں۔ وہ جیسے سارا راز پا گیا۔ اسے لگا جیسے جذبے کچھ بھی نہیں ہوتے۔ کسی جذبے میں کوئی طاقت' کوئی گہرائی نہیں ہوتی۔ سوچنا تو آدمی کو اپنے اوپر چاہیے کہ وہ کیا ہے............ کیسا گورکھ دھندہ' کیسا کٹھن چکر............؟ وہ الجھ گیا۔ خالی پن کا احساس بڑھ کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ زیبی میں کوئی کشش نہ رہی۔ صرف ایک احساس رہ گیا کہ زیبی بے حس ہے' گلو بھی بے حس ہے اور وہ خود بھی............ طبیعت اوب گئی۔ زیبی کا دکھ' دکھ نہ رہا' نہ نازاں سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ گلو کی فکر بھی مٹ گئی' نازاں کو برباد کرنے والے کے بارے میں سوچا تو اشتعال بھی محسوس نہ ہوا۔

"آدمی پتھر کا بن جاتا ہے ماے............ اسے بننا پڑتا ہے۔ نہ بنے تو اپنے حصے کی سانسیں کیسے پوری کرے گا؟ خود مرجانا تو بہادری بھی ہے اور حرام بھی' کیا خودکشی اس لئے حرام ہے ماے کہ اس میں آدمی کے اندر بے پناہ بہادری پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ خود کو اپنی موت پر قادر سمجھنے لگتا ہے؟"

امام دین نے اور کچھ بھی نہ سنا' صرف یہ کہ آدمی پتھر کا بن جاتا ہے۔ اسے بننا پڑتا ہے۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔ بہت زور سے' اپنی ہی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔ یوں ہنسنا بھانڈپن بھی لگا مگر وہ صرف لمحے بھر کو ٹھٹکا تھا' پھر ہنستا چلا گیا۔ زیبی اسے حیرت سے دیکھ

رہی تھی۔

"خودکشی ہی نہیں............ سب قسم کی بہادری حرام ہے۔ اس کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اگر گلو گھر سے نکل آئے یہ کہہ کر کہ وہ جسے ڈھونڈ رہا تھا' وہ مل گئی۔ اگر نازاں گلو کو بتادے کہ اس نے اس سے شادی کیوں کرلی' اگر وہ شخص اقرار کرلے کہ بچہ اس کا ہے' اگر میں کہہ دوں کہ میں اتنے برس صرف اسی لئے تجھے رکھے رہا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں' اگر تو بتادے کہ تو مجھے بے وقوف بناتی رہی تو............ تو اس سب کا انجام اچھا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لئے یہ سب کچھ حرام ہے۔ ہم کچھ بھی برداشت نہیں کرسکتے' مگر پھر بھی ہمیں برداشت کرنا ہوتا ہے' اسی کو صبر کہہ کر' صبر کے میٹھے پھل کا انتظار کرتے ہیں زیبی............ اس انتظار کے الجھاوے میں گم ہو کر ذہن سے یہ نکل جاتا ہے کہ عمر کے لمحے بیت رہے ہیں' صبر کا پھل نہیں ملے گا' جذبوں کو قرار آجائے گا' برداشت کی قوت بڑھ جائے گی۔ عمر کے لمحے بیت رہے ہیں' صبر کا پھل نہیں ملے گا' جذبوں کو قرار آجائے گا' برداشت کی قوت بڑھ جائے گی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہر جذبے میں بھی پختگی آتی ہوگی ناں! تجھے کسی سے محبت نہیں تھی زیبی............ وقت گزارنے کو تیرے پاس محبت کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے بھی تجھ سے محبت نہیں تھی............ مجھے گھر چاہئے تھا' گھر والی چاہیے تھی' حرام کو حلال بنانا تھا اور یہ بھی صرف اس لئے کہ میں یہاں پیدا ہوا' یہاں............ ان لوگوں میں جو صرف باتیں کرنا جانتے ہیں' جن میں نہ خود کچھ کرنے کی ہمت تھی' نہ وہ آنے والوں کو کچھ کرنے کا حوصلہ دینا چاہتے تھے۔ یہ قوم صرف باتیں بنانا جانتی ہے' ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کچھ کرتی ہے............ پیٹ سے مجبور ہو کر............ کوئی کسی کے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔"

وہ بولے جارہا تھا اور زیبی ساکت کھڑی اسے تک رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ امام دین پاگل ہو گیا ہے۔

"امام دین............!" وہ آگے بڑھی۔

"نہیں............ کچھ نہیں ہوا۔ سب ٹھیک ہے" وہ ہاتھ اٹھا کر دو قدم پیچھے ہٹا۔

"گلو کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ صرف ایک رات کی سیاہی نازاں کے گناہ کو نگل لے گی۔ تجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صبر آ جائے گا۔ مجھے صبر آ گیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ ویسے ہی رہیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد اپنے بہلاوے کو کچھ اور کرنے لگیں گے' کسی سے محبت یا کسی سے نفرت۔ ہمارے پاس کچھ کرنے کو ہوگا جو نہیں.......... سب ٹھیک ہو جائے گا زیبی۔ کچھ روز موسم بے رنگ لگے گا' دوپہریں لمبی اور راتیں کٹھن محسوس ہوں گی۔ کچھ دنوں تک نیند بھی نہیں آئے گی۔ مجھے تیرا انکار' تجھے گلو کا ملنا پھر بھی نہ ملنا' گلو کو تیری جدائی اور نازاں کو..........! نازاں کو اس کا ضمیر ملامت کرے گا مگر پھر.......... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسا ہی ہوتا ہے' ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔" وہ دھیرے دھیرے الٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب اس کی پشت دروازے سے جا لگی تھی۔

"امام دین..........!" زیبی نے اسے بہت پیار سے پکارا۔ اس کی آنکھیں امام دین کی وحشت زدہ آنکھوں میں کھوج رہی تھیں۔ "وہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں ناں' جنھیں کچھ بھی نہیں ملتا نہ محبت' نہ نفرت.......... پھر بھی ان کے دلوں میں سکون ہلکورے لیتا ہے۔ وہ کچھ نہ پاکر بھی کچھ پالینے والا غرور رکھتے ہیں۔ کچھ تو پاتے ہوں گے ناں! ہم بھی تلاش کریں گے پھر وہ سکون پالیں گے' ہم مایوس تو نہیں ہیں.......... ہماری دنیا ایک شخص کی محبت پر ختم نہیں ہو جاتی' اس دنیا میں صرف ایک ہی محبت تو نہیں.......... اور بھی تو ہزاروں چیزیں ہیں جو پیار کرنے کے قابل ہیں.......... اور بھی تو جذبے ہیں جن کی تکمیل آدمی کو مکمل کر دیتی ہے۔ یہ تو.......... یہ تو لمحوں کی کیفیت ہے' اور زندگی لمحوں کی نہیں' صدیوں کی ہوتی ہے ماے!"

وہ اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ امام دین ذہنی توازن کھو رہا ہے۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے تھے' گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں' آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور پتلیوں پر عجیب سی بے حسی طاری ہوتی جا رہی تھی۔

"ہاں زندگی تو اور چیز ہے.......... بالکل اور چیز۔"

وہ اچانک سر جھٹک کر بڑبڑایا' پھر یوں خلاؤں میں تکنے لگا جیسے زندگی مجسم ہو کر خلا میں تیر رہی ہو۔ وہ اس پر نگاہ ٹکانے کی کوشش کر رہا ہو۔ زیبی آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز میں اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اس کا ہاتھ پکڑ لیا مگر وہ بے

خبر رہا۔ یوں جیسے وہ اکیلا ہو یا اس کا بدن سن ہو چکا ہو۔ زیبی جس کا خیال ہی اسے گدگدا دیا کرتا تھا' اس کا لمس ایسا بے جان ہو چکا تھا جیسے وہ زیبی کا لمس نہ ہو' دروازے کی لکڑی کا لمس ہو۔

زیبی کا خالی پن اکائی بن کر اس کے حلق تک آ گیا۔ پہلی بار خیال آیا کہ کسی سے پیار کرنا ہی نہیں' کسی کا پیار کرنا بھی آدمی کو سنوارے رکھتا ہے۔ آج امام دین نے اس سے جس لاتعلقی کا اظہار کیا تھا اور جو کچھ وہ کھو آئی تھی' اس نے اسے بالکل تنہا کر دیا تھا۔ تنہائی تو پہلے بھی تھی مگر اپنے جذبے اور امام دین کی نگاہوں سے پھوٹتے رنگ ہی تو اس کا غرور تھے۔ وہ انہی ستونوں کے سہارے کھڑی تھی' آج لڑکھڑا گئی۔ گلو بہت پیار بھی کرتا' نازاں کو چھوڑ بھی آتا تو ضمیر میں تیر چبھا رہتا اور چین بے کلی بن کر زیادہ ستاتا۔ اس نے غیر ارادی طور پر امام دین کے ہاتھ کو ہلکے سے دبا کر شاید اپنے لمس کا احساس دلانا چاہا تھا مگر جب نہ اس کی آنکھوں میں جنبش ہوئی' نہ ہاتھوں میں لرزش تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ہاتھ چھوڑ کر کرسی پر جا بیٹھی۔

☆==========☆==========☆

جانے امام دین کب چلا گیا' اسے پتا بھی نہ چلا۔ اکیلے رہ جانے پر بھی وہی احساس تھا جو امام دین کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے اس کی موجودگی میں بھی تھا۔ امام دین کے الفاظ پورے گھر میں بازگشت بن کر چکرا رہے تھے۔ "سب کچھ حرام ہے۔ ساری بہادری حرام ہے۔" سچ تو کہتا ہے امام دین.......... وہ سن ہو کر رہ گئی۔ یہ بھی سچ کہتا ہے کہ کرنے کو کچھ نہ ہو تو آدمی نفرت.......... محبت یا غصہ کرنے لگتا ہے۔ نفس کو قابو میں رکھے تو خود پر قابو رہتا ہے اور نفس کیا ہوتا ہے؟ یہی جذبے.......... اچھے اور برے.......... اور سارے جذبے آدمی کے اپنے لئے ہوتے ہیں۔ کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ نفرت کیا' اختلاف برداشت نہیں کرتا۔ انتقام کیا' اپنے نفی کیے جانے' اہمیت نہ دیے جانے کا بدلہ لیتا ہے۔ سوچنا شروع کر دے تو کچھ بھی نہیں۔ مگر امام دین کو یہ سب کیسے پتا چلا؟ اس نے حیرت سے سوچا۔ اس کی سوچ کو گہرائی دینے والی تو آپا عصمت تھیں۔ پڑھی لکھی' بہت پڑھنے اور بہت لکھنے والی' بہت سوچ کر دھیرے دھیرے سمجھانے والی۔ جو محلے کی لڑکیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو سلائی کڑھائی کرتے ہوئے جانے کیسی کیسی باتیں سمجھا دیا کرتی تھیں۔ لڑکیاں منہ اٹھائے دیکھا کرتیں۔ کبھی حیرت سے اور کبھی چونک کر۔ جیسے کچھ کچھ سمجھ میں آگیا ہو۔ کچھ رہ گیا ہو۔ خود زیبی تو ان کی باتیں سن کر بہت سوچا کرتی تھی۔ بہت وقت تھا اس کے پاس' اسی لئے سمجھ جاتی تھی' نہ سمجھتی تو دوسرے دن وضاحت چاہتی تب عصمت آپا بہت خوش ہوتیں۔ وہ سوال کرتی تو بڑی محبت سے' بڑی آسان زبان میں اسے سمجھاتیں' باقی لڑکیاں ٹانکے کے سوا سب کچھ بھول جاتیں۔

مگر امام دین.........! وہ پھر چونک اٹھی۔ گیراج پر تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک گلی کا نائی کچھ پڑھا لکھا تھا مگر برسوں کے بعد امام دین شرط ہارا تو وہاں کتنی دیر بیٹھا ہوگا۔ کتنی باتیں سن لی ہوں گی؟ کون سا فلسفہ پڑھا دیا ہوگا؟ اور نہانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ جب سے امام دین نے گیراج پر پانی کی لائن ڈلوائی تھی' چار دیواری کھڑی کرکے غسل خانہ بھی بنوالیا تھا۔ اب نہانے کے لئے حمام جانے کی ضرورت نہ پڑتی ہوگی۔

"زندگی اور اس کے نشیب و فراز سب کچھ سکھا دیتے ہیں زیبی!" عصمت آپا نے اس روز اسے کاج بنانا سکھاتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ جو بوڑھے لوگ ایسی پتے کی باتیں کرگئے ہیں تو انھوں نے کہاں ڈگریاں لی تھیں؟"

"ہاں......... ماے کی زندگی میں تو اتنا کچھ ہو چکا۔ بسا بسایا اجڑا' پھر سمٹا' پھیلا' محبت بھی کرڈالی اور نفرت بھی۔ نہ انتقام لے پایا نہ محبت حاصل کرسکا۔ بتیس برس میں ساری زندگی گزار آیا۔ اب بھلا کیا رہ گیا ہوگا؟ شادی کرکے بچے پیدا کرلینا تو زندگی کی تکمیل نہیں۔"

وہ اندھیرے میں اسی طرح بیٹھی سوچ رہی تھی۔ گلی میں لگا کھمبا اونچا تھا' روشنی آنگن تک آکر مٹی مٹی سی ہو جاتی تھی مگر اندھیرا گہرا نہیں ہونے پاتا تھا۔ بہت خالی تھی' اکیلی نہتی' سنسان گھر میں اس کا وجود کونے میں پڑے ٹین کے بکس سے زیادہ کچھ بھی نہ تھا' یہ اللہ کی قدرت تھی کہ وہ سانس نہیں لے سکتا تھا اور بس۔

اندھیرا اور گہرا ہوگیا۔ پہلے سوچا کہ روشنی نہ کرے' پھر گلو اور ان کی سہاگ رات کا خیال آتے ہی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھر کے سارے بلب روشن کردیے جیسے

یہاں کی روشنی کہیں بھی کچھ غلط نہ ہونے دے گی۔

مگر امام دین تو اسی اندھیرے میں گیراج کے کمرے کی چارپائی پر پڑا تھا۔ بے سدھ سا' خالی ذہن سے چھت کو تک رہا تھا' چھت تو نظر نہیں آتی تھی بس احساس تھا کہ چھت ہے۔ وہ یہ سوچ کر ہی ہنس پڑا کہ احساس ہی تو ہے سب کچھ۔ چھت نہ ہو' سوچ کہ ہے تو ہوتی ہے۔ کھلے آسمان تلے بے آسرا ہونے کا احساس تو خود انسان نے پیدا کیا ہے ورنہ انسان کا رکھوالا تو اسی آسمان پہ ہوتا ہے' وہیں سے خبرگیری رکھتا ہے۔ چھت آسرا ہوتی تو وہ رکھوالی سے بے نیاز نہ ہوگیا ہوتا! نازاں نے تو سارے فیصلے کرلیے تھے۔ گلو سے محبت کرنے کے باوجود دستبردار ہوگئی تھی۔ نہ اقرار کی بے کلی کاٹی' نہ انکار کا دکھ سہا پھر بھی وہ اسے مل گیا۔

"سب کچھ خود بخود ہو جاتا ہے۔" وہ زور سے بولا۔

"جی استاد!" شاید اس کی آواز ملازم لڑکے تک پہنچ گئی تھی۔

"ہاں......... آں! کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ سب کچھ خود بخود ہو جاتا ہے۔ جو محنت کر رہا ہوا اسے بھی کچھ نصیب ہو تو ہو' ورنہ بٹوارا اس بنا پر نہیں ہوتا۔"

لڑکے نے پلٹتے پلٹتے رک کر سنا۔ لحہ بھر کو حیرت سے اندھیری کوٹھری میں جھانکا۔

"لائٹ جلادوں استاد؟" وہ قریب آگیا۔ شام ہی کو وہ امام دین کا حلیہ دیکھ کر ٹھٹکا تھا پھر یہ سوچ کر کام میں مگن ہوگیا کہ کل گلو کی شادی تھی۔ سارا انتظام اسی نے کیا ہوگا۔ تھکن آدمی کا حلیہ بگاڑ ہی دیتی ہے۔ مگر اب پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھے۔ اسے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ "لائٹ جلادوں؟" اس نے پھر ذرا اونچی آواز سے کہا۔

"نہیں......... ایک ہی بات ہے۔ اندھیرا' اجالا۔ جو کچھ اندھیرے میں دکھائی دے جاتا ہے' اجالے میں بھی نظر نہیں آتا بے وقوف۔"

امام دین ہنسا تھا مگر یوں جیسے روتے روتے ہنسا ہو۔ اندھیرے میں تھا تو جان نہیں پایا' مگر پہلا خیال یہی آیا کہ روتے میں ہنسا ہے۔ الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ امام دین اس سے اتنا بے تکلف نہیں تھا' بس کام ہی کی بات کرتا تھا۔ خود اس کی ہمت بھی نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ کہتا' کچھ پوچھتا۔ چھوٹے کے خیال سے سیدھا ہوٹل پہنچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا۔ ہوٹل پر رش تھا۔ کھانے کا وقت تھا۔ بہت لوگ تھے۔ چھوٹا پھرکی بنا گھوم رہا تھا۔ اس نے اسے دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا' کیا ہے۔ اس نے بھی اشارے سے جواب دے دیا۔ چھوٹا کچھ دیر میں آنے کا کہہ کر پکارا۔ "ایک پلیٹ بھاجی گوشت' چار نان............ سلاد کے ساتھ۔"

طارق واپس گیراج چلا گیا۔ کام پڑا تھا۔ دونوں ملازم کھانے کے لئے گئے تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ وہ اکیلا تھا۔ کھانا گھر سے لاتا تھا' بھوک بھی تھی مگر استاد کی حالت دیکھ کر پریشانی زیادہ تھی۔ ان کا انتظار کرتا رہا۔

☆==========☆==========☆

گلو بس اسٹاپ تک ہی پہنچا تھا کہ چچا کے کہے ہوئے سارے کام بھول گیا۔ ٹیکسی کو دائیں موڑتے موڑتے بائیں موڑ لیا۔ امام دین کا فق چہرہ سامنے کی اسکرین پر یوں ابھر آیا کہ گلو پریشان ہو گیا۔ جیسے کسی طلسم سے باہر آگیا ہو۔ زیبی کا ملنا اور ایسے وقت پر ملنا کیسا گہرا دکھ تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ دکھ پھیمو جیسی بے وقعت عورت کی باتوں میں کیسا ہلکا ہو گیا تھا۔ گلو کو خود پر حیرت ہوئی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے اندر ایسی گہرائی کے ساتھ اس قدر اتھلا پن بھی ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ گلو کے اندر اچانک جو تبدیلی ہوئی تھی وہ قطعی نئی تھی۔ اس نے اتنی عمر میں کبھی عورت کو نہ اتنے غور سے دیکھا تھا' نہ اس کے بارے میں اس انداز سے سوچا ہی تھا کہ سب کچھ صرف سنسنی میں بدل جائے مگر............ پھر بھی کل جو کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا وہ کم نہیں تھا' امام دین سے دوستی کے دعوے' زیبی کی محبت کا ان مٹ احساس' یہ سب کچھ اس کے دل میں نہیں دماغ میں تھا پھر بھی دل اسے بہکا گیا۔ ایسے گہرے نقش جذبات کی آندھی میں مٹ گئے تھے۔

اس نے اسپیڈ بڑھا دی۔ وہ جلد از جلد امام دین تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ گیراج سونا پڑا تھا۔ اس نے ٹیکسی ٹین کے چھپر تلے جا کر روک دی۔ امام دین کا ملازم طارق اسے دیکھ کر وہاں کھڑی گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔

"امام دین کہاں ہے؟" گلو نے چھوٹتے ہی پوچھ لیا۔

"استاد کی طبیعت خراب تھی۔ چھوٹا اور ملک حسین اسے اسپتال لے گئے تھے رات' ابھی تک وہ اسپتال میں ہے۔ ملک حسین تو آگیا' چھوٹا اسی کے پاس ہے۔" طارق نے جلدی جلدی بتایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کس اسپتال میں؟" گلو کا دل بیٹھ گیا۔

"عباسی میں.......... وہی قریب تھا۔ پہلے وہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے مگر اس کا بلڈ پریشر بہت لو تھا۔ اسپتال لے جانا پڑا۔"

وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا مگر گلو نے سنا نہیں۔ وہ سامنے کے ہوٹل کی طرف لپکا۔ ملک حسین کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ اسی سے پتا چلا کہ رات کے تیسرے پہر امام دین کی حالت سنبھلی تھی۔ وہ ہذیان بک رہا تھا۔ پہلے بلڈ پریشر لو تھا پھر سویرا ہوتے ہوتے بخار بھی چڑھ گیا۔ کبھی کبھی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتا' یہ حالت دیکھ کر چھوٹے نے واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔ ملک حسین سویرے لوٹ آیا تھا۔ اس نے امام دین کے گھر پر بھی اطلاع دی تھی۔ ملک حسین کا خیال تھا کہ زیبی اس کی رشتے دار ہے اور بہت جلد اس کی گھر والی بھی بن جائے گی اور زیبی یا امام دین نے کسی کے ایسے خیالات کی تردید ہی کب کی تھی؟

گلو اس سے وارڈ کا نمبر پتا کر کے سیدھا اسپتال پہنچا۔ امام دین اسے دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ "کیسا ہے تو؟ کیا ہو گیا تجھے؟" گلو نے بینچ اس کے بیڈ کے قریب کھینچ لی۔

"آدمی مشین ہوتا ہے گلو! کبھی کبھی کسی اناڑی کاریگر کا الٹا سیدھا ہاتھ پڑ جائے تو سارے پرزے الٹے چلنے لگتے ہیں۔ ویسے اب ٹھیک ہوں تو.......... تو نازاں کو چھوڑ کر یہاں کیوں آ گیا؟"

آخری جملہ کہتے ہوئے وہ گلو کی آنکھوں میں.......... چہرے پر کچھ تلاش کر رہا تھا مگر اس کی چہرے پر کچھ بھی نہ تھا۔ اس قدرے اطمینان ہوا۔ اس کی بے خبری یا معصومیت کسی کے لئے زندگی اور عزت کا پیغام بن گئی تھی۔ نازاں کے ساتھ مسئلہ نہ ہوتا تو وہ ضرور اس کا مذاق اڑاتا مگر.......... اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

"تو کیا اسے لے کر آتا؟" وہ بڑبڑایا۔ "وہاں تو سسری رسمیں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔" اس کے چہرے پر گلابی پن گہرا ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے چونک کر امام دین کو دیکھا۔ "زیبی کہاں ہے؟" حالانکہ وہ سن چکا تھا کہ ملک حسین اسے اطلاع کر آیا ہے' یعنی وہ گھر پر ہی تھی۔

"ہاں.......... گھر پر ہے۔ گلو! تقدیر ایسے ہی مذاق کیا کرتی ہے۔ مگر یاد رکھ' اس

میں کچھ نہ کچھ مصلحت ضرور ہوتی ہے انسان سمجھ نہیں پاتا۔ اگر مجھے پہلے پتا ہوتا تو یہ سب کچھ ایسے نہ ہوتا مگر اب.......... اب تجھے خود پر قابو پانا ہو گا گلو! اب زیبی سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے بالکل بھول جا۔ وہ جذباتی لڑکی نہیں ہے' بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے والی ہے۔ اس نے خود کو بالکل سنبھال لیا ہے۔ کہتی تھی' آدمی کے پاس کچھ کرنے کو نہ ہو تو.......... تو وہ خوابوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا ہے۔ ہوش میں آئے تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

امام دین نے بڑے ٹھہر ٹھہر کر جھوٹ بولا تھا۔ یہ سب زیبی نے نہیں اس نے کہا تھا مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ وہ گلو ہی کے لئے نہیں نازاں کے لئے بھی پریشان تھا۔ ویسے ایک بات اس نے بالکل سچ کہی تھی کہ زیبی جذباتی نہیں تھی.......... سمجھدار تھی' ہر فیصلہ کرتے ہوئے خود کو قابو میں رکھتی تھی' ایسا نہ ہوتا تو وہ لوٹ کر امام دین کے گھر نہ آتی۔

"جسے پندرہ بیس برس تک ہر لمحہ یاد رکھا ہو' اسے بھول جانا کیا اتنا آسان ہوتا ہے ماے؟" اس کے شکستہ انداز میں بے پناہ تھکن تھی۔

"بہت مشکل ہوتا ہے گلو مگر مشکلات سے گزرنا ہی تو مردانگی ہے۔ تو نے ایک عورت کو سہارا دیا ہے' یہ کوئی معمولی بات نہیں' اس عورت کا تیرے سوا نہیں' پھر تو اس کی ذمے داری سے دستبردار کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں کب ایسا کہتا ہوں مگر.........."

"تو کچھ بھی نہیں کر سکتا گلو اور نہ تجھے اب کچھ کرنا چاہیے۔ قدرت کے اس فیصلے کو صحیح مان کر تسلیم کر لینا چاہئے۔ چھوڑ ان باتوں کو.......... یہ بتا نازاں کیسی لگی؟"

"ٹھیک ہے' تو تو ایسے پوچھ رہا ہے جیسے میں نے اسے پہلی بار دیکھا ہے۔" وہ کچھ جھینپ رہا تھا۔

"دیکھنے کی بات نہیں کر رہا' دیکھنے اور پرکھنے میں فرق ہوتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں گہری کھوج تھی۔

"اچھا چھوڑ.......... اب کیا ہو گا؟"

"کیا مطلب؟ اب کیا ہونا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میرا مطلب ہے زیبی کا.........." گلو اسے غور سے دیکھ رہا تھا' اسے زیبی نہیں ملی ایک دکھ تھا اور گہرا بھی تھا مگر اس کے بارے میں امام دین کا کیا فیصلہ ہوگا یہ دکھ اسے زیادہ گہرا لگ رہا تھا۔

امام دین شاید سمجھ گیا تھا۔ اس نے دکھ سے مسکرا کر گلو کو دیکھا۔ "پتا نہیں اس کا کیا ارادہ ہے۔ ویسے میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ جب تک چاہے اسی گھر میں رہے' میں سوچ رہا ہوں کہ وہ گھر اسی کے نام کردوں تاکہ دربدر نہ ماری ماری پھرے۔ میرے لئے تو گیراج ہی بہت ہے۔ باقی اس کا ذاتی معاملہ ہے' وہ اپنے بارے میں جو فیصلہ کرے گی بہتر ہی کرے گی.......... ویسے.......... میری غلط فہمی تو دور ہو چکی ہے۔ تجھے اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں.......... وہ.........." جھینپ گیا۔ "میں پریشان ہوگیا تھا کہ نازاں کی طرح وہ بھی تو اکیلی ہے ناں!"

"تو صرف نازاں کی فکر کر.......... وہ اپنی فکر کرنے کو کافی ہے۔ نازاں کی طرح باؤلی نہیں ہے۔"

عین اسی لمحے چھوٹا گرم گرم دیگچی لئے وارڈ میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی چہکا۔

"وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے۔"

"ابے او گانوں کی حد آگے مت بڑھنا۔" امام دین نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ تیرا گھر ہے؟" گلو مسکرایا۔

"جس جگہ اپنے ہوتے ہیں ناں! وہی گھر ہوتا ہے اور اگر کسی چھت کے نیچے' دیواروں کے بیچ غیر رہتے ہوں' وہ گھر نہیں ہوتا' چوراہا ہوتا ہے۔"

گلو اور امام دین نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا جو اپنے کہے ہوئے جملے کی گہرائی سے ناواقف دیگچی سے گرم گرم چائے پیالیوں میں انڈیل رہا تھا اور دھیرے دھیرے تھرک رہا تھا۔ گلو کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں اور امام دین کی آنکھوں کے سامنے زیبی کا سراپا چکر کھانے لگا تھا۔ عجیب سا سناٹا چھا گیا تھا دونوں کے اندر۔ اگر ڈاکٹر نہ آجاتا تو یہ بڑھ کر قبروں ایسا ہو جاتا۔

"کیسے ہو بھئی؟" وہ ایک طائرانہ نگاہ گلو اور چھوٹے پر ڈال کر امام دین کی طرف

بڑھا۔

"اچھا ہوں۔ اب تو سب ٹھیک ہے ناں!" امام دین اچک کر سیدھا بیٹھ گیا۔

"ہاں.......... ٹھیک تو ہے مگر.........." وہ اس کا چارٹ دیکھنے لگا تھا۔ "سوچا مت کرو.........." اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب! اللہ نے دماغ سوچنے کے لئے دیا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں ہر کام سوچ سمجھ کر کیا کرو اور آپ کہتے ہو بغیر سوچے سمجھے کرو۔" امام دین کی بجائے چھوٹے نے ڈاکٹر کو حیرت سے دیکھ کر جواب دیا۔

"کام تو سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے مگر فضولیات نہیں سوچنا چاہئیں۔ دنیا کا ہر دکھ اپنے دل میں پالو گے تو زندہ کیسے رہو گے؟" ڈاکٹر نے مسکرا کر چھوٹے کو دیکھا۔

"جن کے دل میں درد نہیں ہوتا ڈاکٹر! وہ پتھر کے ہوتے ہیں۔" اس نے فلمسٹار محمد علی کے سے انداز میں کہا۔

اس بار ڈاکٹر بولا نہیں' ہنس پڑا..........

"میں گھر جاؤں؟" امام دین نے اسے کچھ لکھتے دیکھ کر پوچھا۔

"جی! یوں تو آپ نارمل ہیں مگر جو دوائیں میں لکھ رہا ہوں' وہ لیتے رہیے گا۔"

"مگر ہم چائے پینے کے بعد جائیں گے۔" چھوٹا پھر بول اٹھا۔ "آپ پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ! آپ لوگ ضرور پئیں۔" اس نے مسکرا کر کہا پھر ایک پرچے پر دوا لکھ کر پرچہ امام دین کی طرف بڑھا دیا جسے گلو نے تھام لیا۔

☆==========☆==========☆

وہ امام دین کو لئے گیراج پر پہنچا تو کئی لوگ آگئے۔ سب امام دین کی طرف سے پریشان تھا مگر گلو محسوس کر رہا تھا کہ امام دین بہت بہتر ہے' بلکہ وہ کچھ عجیب سا ہوگیا ہے' جو کچھ ان دو تین دنوں میں ہو چکا تھا اس کے حساب سے تو اسے بے حد غمزدہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ تو اسپتال جاتے ہوئے سوچ بھی رہا تھا کہ امام دین کا سنبھلنا اب آسان نہیں ہوگا۔ زیبی سے آس ٹوٹنے کا غم ہی ہلکا نہیں ہوا تھا کہ اس نے بے وقوفی میں اپنی محبت کی داستان بھی سنا ڈالی۔ جو بات اس نے برسوں چھپائی تھی وہ ایسے وقت پر بتا دینا نری بے وقوفی ہی تھی مگر گلو خود بھی قابو میں کب تھا؟

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر اس وقت جو امام دین اس کے سامنے تھا' وہ بالکل مختلف تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اداکاری کر رہا تھا' اتنی پہچان تو گلو کو بھی ہو گئی تھی کہ کب وہ اپنا آپ سب سے چھپایا کرتا ہے اور جب چھپاتا ہے تو کیسا لگتا ہے! اس کے چہرے پر واقعی کرب کا کوئی احساس نہیں تھا۔ آنکھوں میں اذیت کی کوئی رمق بھی نہیں تھی بلکہ ایک عجیب سا تمسخر تھا' عجیب سی بے حسی جو گلو کو بے چین کر رہی تھی۔ وہ بڑی دیر بیٹھا رہا۔ لوگ آتے رہے' خیریت پوچھ کر' باتیں کر کے جاتے رہے۔ امام دین سب سے یہی کہتا رہا کہ بلڈ پریشر لو ہو گیا تھا' کیوں یہ نہیں پتا' اور وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ یہ گلو کو یقین تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ بلڈ پریشر لو کیوں ہوا تھا پھر بھی جھوٹ بول رہا تھا۔

"ماے........ چل اٹھ یہاں سے........" وہ لوگوں کی آمد سے پریشان ہو گیا۔

"کہاں؟" امام دین نے اسے حیرت سے دیکھا۔

"یہاں سے کہیں بھی چل' یہاں تو بات کرنے کا ٹائم ہی نہیں مل رہا۔"

"اب کیا بات کرنی ہے تجھے؟ اور ہاں........ ولیمہ نہیں ہے کیا؟"

"ہاں........ ہے" گلو نے نگاہ چرا کر جواب دیا۔

"پھر........ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"دیکھنے آیا تھا تجھے۔" وہ جھنجلا گیا۔

"دیکھ لیا! اب جا۔ اتنے کام ہوں گے۔ اور وہ تیرا چاچا........ اسے تو زہر اگلنے کو موقع چاہئے۔ میں شام کو آؤں گا۔ نہا دھو کر........ جا موج کر........"

گلو نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "ماے........ تو یہاں بیمار پڑا ہے........ اور........ اور........ جو کچھ ہو چکا ہے اس میں........ اس میں' میں موج کیسے کر سکتا ہوں؟"

"کیوں........؟" اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "کیا ہو چکا ہے؟ ابے تیری شادی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد ولیمہ ہوتا ہے اور........ اور موج ہوتی ہے........ بس۔ بس........ اور کیا کرنا چاہتا ہے؟"

"مجھے تجھ سے بات کرنی ہے۔" وہ بپھر گیا۔

"مگر میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ کچھ دیر سوؤں گا' وہاں

اسپتال میں دواؤں کی بو نے اور چھوٹے کی تانوں نے سونے نہیں دیا۔ پھر نہا دھو کر ولیمے میں آؤں گا تب باتیں کر لینا۔"

"مگر ماے........!"

"جا یار! اپنا کام کر۔" امام دین جھنجلا گیا تھا۔ وہ کچھ سوچنا چاہتا تھا اور گلو سر پر ننگی تلوار کی لٹکا ہوا تھا۔ گلو کچھ دیر تک غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا پھر پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

☆==========☆==========☆

اسے جاتا دیکھ کر امام دین نے گہری سانس لی۔ طارق سے کہہ دیا کہ اب کوئی آئے تو اسے کہہ دے کہ امام دین سو رہا ہے۔ طارق سر ہلا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ امام دین بستر پر لیٹ گیا۔ وہ گلو کی بے چینی دیکھ کر مضطرب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گلو کیا کہنا چاہتا تھا۔ اس نے تو کبھی خود کو کسی پر کمزور ظاہر نہیں کیا تھا پھر بھلا اپنی یہ کمزوری اس پر کیسے ظاہر کرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جو کچھ درمیان میں غلط ہو چکا ہے اسے درست کر دے۔ زیبی یقیناً وہی لڑکی تھی جسے گلو بقول اس کے بچپن سے تلاش کر رہا تھا' مگر اب وہ نازاں کا شوہر تھا' اور نازاں بھی وہ جو ایک درندے کے ظلم کا شکار ہو چکی تھی۔ جو گلو کے ساتھ اتنی مخلص تھی کہ اسے دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہ دھوکا دینے پر امام دین نے ہی مجبور کیا تھا صرف اس لئے کہ اس میں نازاں یا آنے والے معصوم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کسی بات کی سزا انہیں نہیں ملنا چاہیے تھی۔

اب رہی زیبی تو اس نے ابھی تک اس کے سامنے صاف الفاظ میں اس بات کا اقرار کیا تھا نہ گلو کے سامنے کہ وہ جس شخص کے سائے کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی وہ گلو تھا۔ یہ صرف امام دین کا اندازہ تھا یا اس کے کہے ہوئے ذو معنی جملے اور وہ جملے بھی کوئی ایسے ڈھکے چھپے نہیں تھے کہ کسی کی سمجھ میں نہ آتے' بس اتنا ہوا تھا کہ اس نے گلو کا نام نہیں لیا تھا مگر یہ اقرار تو کر لیا تھا کہ وہ گلو ہی تھا' نام لئے بغیر اور امام دین نے زیبی کی آنکھوں میں بھی وہی حسرت اور وحشت دیکھی تھی جو گلو کی آنکھوں میں تھی مگر وہ اتنا جان گیا تھا کہ اس بات کا اظہار نازاں اور آنے والے بچے کی ہی نہیں خود گلو اور زیبی کی زندگی بھی تباہ کر دے گا۔ "نہیں........ ایسا نہیں ہونا چاہیے........ گلو کی آس ٹوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانی چاہئے۔ ورنہ......... ورنہ وہ واقعی اپنے ہی سائے میں تبدیل ہو کر رہ جائے گا' اسے کسی پل چین نصیب نہیں ہوگا۔ اگر اسے یہ پتا چل جائے کہ زیبی کو اس سے کوئی دلچسپ نہیں......... وہ اس کے لئے نہیں کسی اور کے لئے بیقرار ہے تو......... وہ بھی میر طرح صبر کر کے بیٹھ جائے گا۔

امام دین بڑبڑا رہا تھا۔ جوں جوں وہ اس بارے میں سوچتا گیا' اس کے دل کو قرا آتا گیا۔ اسے صرف زیبی سے بات کرنا تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ لے گی۔ وہ بے وقوف نہیں تھی اور نہ ہی بچی تھی۔

یہ یقین ہوتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ دھوپ نرم ہو چکی تھی۔ ہوا میں خنکی قطعی نہی تھی مگر اسے ٹھنڈک کا سا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے کمرے میں رکھے بکس میں سے گر شال نکال کر لپیٹ لی۔ گلو' طارق کو دواؤں کا تھیلا دے گیا تھا۔ اس کے باہر آتے ہی ا نے تھیلا امام دین کی طرف بڑھا دیا۔

"پانی لاؤں استاد......... دوا کھا لو۔"

"ہاں......... یار لا دے......... لگتا ہے بخار اترا نہیں ہے۔" وہ نڈھال ہو کر پا پڑی بینچ پر بیٹھ گیا۔ صرف چند قدم چل کر ہی وہ تھک گیا تھا۔

طارق دوڑ کر پانی لے آیا۔ اس نے پیناڈول کی دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل لیں

"میں گھر جا رہا ہوں۔ اظہار حسین کا ڈرائیور آئے گا۔ اس کی گاڑی تیار ہے ناں!؟"

"جی استاد۔ بس صفائی کرنا ہے۔" طارق نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

"دے دینا۔" اس نے مختصر سا جملہ کہا اور ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

☆==========☆==========☆

نازاں کو بخار تھا۔ امام دین کے لئے دوا لیتے ہوئے گلو نے اس کے لئے بھی لے لی تھی۔ طاقت کا سیرپ بھی لے لیا تھا۔ اسے اور بھی بہت سے کام نمٹانا تھے۔ کھا والے سے بات کرنا تھی۔ آرڈر تو رحمان چاچا دے چکا تھا' دیگیں اٹھانے کا کام اسی کو تھا۔ وہ لسبیلہ کی طرف چل دیا۔ راستے بھر وہ امام دین کے رویئے کے بارے میں سوچتا زیبی کا خیال رہ رہ کر اس کے دماغ میں گھس آتا۔ اس کی آنکھوں میں بھری وحش رخساروں پر بہتے آنسو' امام دین کی بتائی ہوئی باتیں ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہی تھیں

اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ جس آگ میں وہ جھلستا رہا تھا' اس کی آنچ زیبی تک بھی پہنچ رہی تھی۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ وہ اسے مل نہیں سکی تھی مگر نہیں۔ وہ مل تو گئی۔ گلو نے سوچا۔ نازاں سے شادی ضرور ہوئی تھی مگر اس کے دل و دماغ پر تو پہلے بھی اسی معصوم چہرے کا راج تھا۔ وہ چہرہ جو آج اپنی پوری شخصیت سمیت زیبی بن کر سامنے آ چکا تھا۔ اس نے نازاں کو اپنانے کا عہد کیا تھا سو پورا کر دیا مگر یہ عہد اس نے کب کیا تھا کہ وہ اپنی یادوں کے افق پر چمکتا چہرہ بھی کھرچ ڈالے گا۔ وہ اس سے پہلے بھی محبت کرتا تھا' اب بھی کرتا ہے اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔ اس نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی۔ "وہ نہ بھی ملتی تب بھی میں اسے بھلا کیسے پاتا؟"

اس نے گلی کا موڑ کاٹا۔ سامنے ہی باورچی تھا۔ اسے گھنٹا بھر وہاں لگ گیا۔ وہ لوٹا تو چاچا خاصا مضطرب تھا۔ یہ سن کر کہ وہ سارے کام نمٹا آیا ہے' اس کی باچھیں کھل گئیں۔

"میں نے کہا تھا ناں کہ گلو غیر ذمے دار نہیں ہے۔ بس ذرا لاابالی ہے' شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے چاچی کی طرف مڑ کر کہا جو پلیٹوں کا ڈھیر سامنے رکھے گن رہی تھی۔

گلو وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھر کے سامنے پہنچتے ہی اسے نازاں کا خیال پریشان کرنے لگا تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا مگر شرم آڑے آ رہی تھی۔

"جا تو بھی کچھ دیر کو لیٹ لے۔ میں نے سلطان سے کہہ دیا ہے۔ وہ سارا انتظام کر لے گا۔" چاچی نے اس کی مشکل حل کر دی۔ وہ جانتا تھا کہ رحمان چاچا کا بیٹا سلطان محلے کی ہر شادی اور دوسری تقریبوں میں آگے آگے رہتا ہے۔ وہ واقعی سب کچھ سنبھال لیتا پھر چاچا اور رحمان چاچا بھی تھے۔ کھانے کی دیگیں شام سات بجے پہنچ جاتیں' اس کا انتظام وہ خود کر آیا تھا۔ گلی میں شامیانہ لگ چکا تھا۔ کرسیاں اور میزیں ہی لگنا تھیں اور ان کا انتظام کرنا سلطان کے لئے مشکل نہ تھا۔ وہ چپکے سے......... دبے پاؤں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

☆==========☆==========☆

نازاں اسے دیکھتے ہی سمٹ گئی۔ آج اس کے چہرے پر گھونگھٹ نہیں تھا۔ دن کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روشنی میں اس کا چہرہ رات سے زیادہ ستا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی ویرانی تھی۔ گلو کو حیرت ہوئی۔ وہ تو جانتا تھا کہ نازاں اسے کتنا چاہتی ہے اور پہلے وہ اس سے کیسے باتیں کیا کرتی تھی۔ لمبے چوڑے پروگرام بنایا کرتی تھی۔ لڑتی اور جھگڑتی تھی مگر.......... یہ نازاں جو اس کے سامنے بیٹھی تھی' پرانی والی بالکل نہیں تھی۔ گلو کا دل گھبرانے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کی شادی ہوتے ہی سب کچھ بدل گیا ہے۔ امام دین بھی بدل گیا تھا۔ نازاں بھی اور.......... اور وہ خود بھی تو.......... نازاں کے اس رویے نے تو اسے بہت ہی حیران کیا تھا۔ کل تو اس کا خیال تھا کہ وہ دلہن بنی بیٹھی ہے۔ شرم و حیا بے تکلفی سے روک رہی ہے مگر آج..........

"طبیعت ٹھیک ہے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہاں.........." اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"میں دوا لے آیا ہوں۔ کھالینا۔" اس نے جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے کہا۔

نازاں نے اٹھ کر بستر جھاڑا۔ چادر صحیح کی۔ تکیہ رکھا پھر خود ایک طرف کو ہو کر' سمٹ کر بیٹھ گئی۔ گلو لیٹ گیا۔ نازاں اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"کک.......... کچھ نہیں گلو! وہ.......... تو نے یہ شادی چاچا کی وجہ سے کی ہے ناں!"

اس کا جی چاہا کہہ دے ہاں.......... "چاچا کی وجہ سے کی ہے۔" مگر وہ کچھ نہیں بولا۔

"مطلب کیا ہے؟" کافی دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"نہیں.......... ویسے ہی پوچھ رہی تھی۔" اس کا چہرہ اور مرجھا گیا۔

گلو نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا' اسے دکھ ہوا۔ اس نے سوچا اگر کل زیبی نہ ملی ہوتی تو.......... تو وہ نازاں کو اتنا اداس کبھی نہیں ہونے دیتا۔ اس نے کتنے ارمانوں سے اس گھر میں قدم رکھا ہوگا۔ گلو جانتا تھا کہ وہ اس کے منہ سے یہ سننا چاہتی تھی کہ اس نے اسے اس کی وجہ سے قبول کیا ہے یا یہ کہ اس کی محبت سے اس کے پتھر دل میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ اس میں تو شبہ نہیں تھا کہ کل رات سے اس کے دل میں نازاں

کے لئے بڑی جگہ بن گئی تھی۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ گلو کی زندگی میں عملاً وہ پہلی لڑکی تھی جس کی قربت نے اسے ملائم کر دیا تھا۔ مگر اب بھی وہ اپنے دل میں اس کے لئے کشادگی محسوس نہیں کر سکا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر کوشش کرتا رہا کہ دو تین جملے ایسے کہہ دے کہ نازاں خوش ہو جائے۔ ستم ظریفی تو اس کے ساتھ ہوئی تھی۔ نازاں کا اس میں بھلا کیا قصور تھا۔ اسے کیا پتا کہ گلو کے اس کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روک دینے میں کس کا ہاتھ ہے۔ وہ تو اس سے بھرپور محبت کی طالب تھی۔ اب تو یہ اس کا حق بھی تھا۔ مگر اپنے آپ کو بڑی دیر تک قائل کرنے کی کوشش کے بعد بھی وہ کھل کر اس سے کچھ نہ کہہ سکا بس اتنا ہوا کہ اس نے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ نازاں کی طرف بڑھا دیا اور نازاں جو سہمی سکڑی کنارے پر بیٹھی تھی بے اختیار ہو کر اس کے قریب آگئی۔

☆==========☆==========☆

امام دین نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دروازہ زیبی نے حسب معمول یہ اطمینان کرنے کے بعد ہی کھولا کہ دوسری طرف امام دین ہے۔ وہ بہت بیمار لگ رہی تھی۔ امام دین نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو ناں ماے؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"ہاں.......... بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ایک پریشانی ہے۔ میں اس وقت نہ آتا مگر.........."

"تم ٹھیک نہیں ہو۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "یہ گرم شال.......... اور چہرہ.......... دیکھا ہے تم نے؟"

"ہاں یہ.........." وہ شال کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ "کچھ سردی لگ رہی تھی۔ رات بخار تھا مگر دوا لی تو ٹھیک ہو گیا۔"

"اور پریشانی کیا ہے؟" اس نے پلٹ کر پوچھا۔ وہ کمرے کی طرف بڑھتے بڑھتے رکی تھی۔

"تم سے کچھ بات کرنا ہے۔"

"ہاں کہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ گڑ بڑا گیا۔ وہی پہلے والا انداز تھا اس کا جس کے بعد امام دین کی ہمت جواب دے جایا کرتی تھی۔

"ایسے بات نہیں ہو سکتی.......... بیٹھ کر.......... بیٹھ کر بات کرنا ہوگی۔" اس نے پھر بھی ہمت کی۔

"خیریت؟"

"نہیں.......... خیریت ہی تو نہیں ہے۔ وہ.......... گلو.........."

وہ چونک اٹھی۔ اس کی ویران' سپاٹ آنکھوں میں لو سی بھڑکی۔ "کیا.......... کیا ہوا؟"

امام دین چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر اس نے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "گلو آیا تھا زیبی.......... میں.......... میں نہیں جانتا کہ تم کیا سوچ رہی ہو! گلو سے تمہارا کیا تعلق ہے.......... مگر اتنا جانتا ہوں کہ گلو میرا یار ہے۔ میں نے اسے دکھ دینے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں اور اب.......... اس کی شادی ہوگئی ہے' نازاں سے.......... نازاں جو تمہاری ہی طرح بے آسرا تھی۔ بے سہارا تھی اور تمہاری ہی طرح گلو سے پیار بھی.........." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اب اس نے سامنے رکھی کرسی کی پشت کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب سا کروٹیں لے رہا تھا۔ پلکیں لرز رہی تھیں مگر وہ کچھ بولی نہیں۔ یونہی ساکت کھڑی رہی۔

"میرا مطلب ہے زیبی کہ گلو سخت اذیت میں ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کی یہ اذیت نازاں کی زندگی کو تباہ کردے تم.......... تم.......... تم کچھ کرو۔"

وہ ایک جھٹکے سے پلٹ گئی۔ اب اس کی پشت امام دین کی طرف تھی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا مگر اسے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اس کے چہرے کو تر کر دیا ہے۔ اسے تو اس کا بدن بھی لرزتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"زیبی!" اس نے پھر اسے مخاطب کیا۔ "اگر اسے یہ گمان بھی ہوگیا کہ تم بھی.........."

"کیا میں بھی؟" وہ زور سے چیخ کر پلٹی۔ اس کی پلکوں پر نمی تھی مگر آنکھوں میں

کچھ بھی نہ تھا۔ "کیا کہہ رہے ہو تم.......... میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آرہی۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ گلو نے اگر نازاں سے شادی کرلی ہے تو میں کیا کروں۔ اگر وہ اس شادی سے اذیت میں ہے تو بھی میں کیا کر سکتی ہوں' میرا کیا تعلق ہے گلو سے؟"

وہ اب بھی زور زور سے چیخ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور امام دین اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"بتاؤ کیا کروں میں؟ وہ کیوں اذیت میں ہے' مجھے کیا پتا کہ وہ کیوں اذیت میں ہے۔ میں تو اسے جانتی تک نہیں۔ اگر تم میرے وہاں سے چلے آنے پر ایسا کچھ سمجھ رہے ہو تو یہ تمہاری غلطی ہے' اسے میں کیوں درست کروں؟"

"کیا تم.......... تم اسے.......... اسی کے انتظار میں نہیں تھیں؟" امام دین نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے ایسا کچھ کہا تھا تم سے؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔ وہ اب زیادہ مضبوطی سے کرسی کی پشت کو تھام چکی تھی۔ پھر وہ نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"مگر میرا خیال ہے کہ.........."

"تمہارا خیال ہے.......... اور.......... تمہارے سارے خیالات فضول ہوتے ہیں۔" وہ قدرے بہتر ہوگئی۔

"لیکن زیبی..........! وہ.......... تمہیں تلاش کر رہا تھا۔ اس وقت سے جب سے چبوترے پر اس نے تمہیں.........."

"میں کوئی کہانی سننے کے موڈ میں نہیں ہوں ماے!" اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا۔

جھکے ہوئے چہرے پر کرب کی لہری اٹھتے امام دین نے بھی دیکھ لی۔ وہ سن ہو کر رہ گیا۔ ساری کہانی لمحہ بھر میں اس کی سمجھ میں آگئی۔ وہ کل جو کچھ کہہ چکی تھی' وہ امام دین کو آج بھی یاد تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ زیبی اسے بھی دھوکا دے رہی تھی اور ٹھیک ہی تو تھا۔ وہ بھی تو یہی کہنے آیا تھا۔ زیبی کتنی ذہین تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے ہی جان لیا کہ وہ اس کے پاس کیوں آیا ہے۔ امام دین نے آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے ٹکا لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر.......... اگر تمہارے دوست کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے ماے تو.......... تو تمہارا فرض ہے کہ اسے دور کرو۔ میں بھلا اس سے کیا کہہ سکتی ہوں؟"

وہ بولی تو اس کا لہجہ بہت نارمل تھا۔ امام دین نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ اپنی ساری اذیت' سارا کرب اندر ہی کہیں اتار چکی تھی۔ اس کے چہرے پر اب زلزلے کے سے آثار بھی نہیں تھے۔ اس کی پلکیں خشک تھیں اور آنکھوں میں بلا کا سکوت تھا۔

"ہاں.......... وہ تمہارے یوں چلے آنے سے غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہے۔" امام دین نے بوجھل لہجے میں جواب دیا۔ آواز کی لرزش کافی نمایاں تھی۔ "وہ سمجھ رہا ہے کہ تم بھی اس کی تلاش میں تھیں اور اب جو نازاں کو اس کی دلہن کے روپ میں دیکھا تو ملنے سے پہلے ہی جدائی کی اذیت برداشت نہیں کرپائیں اور.........."

"نہیں ماے! میں وہاں جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ میں کسی بھی تقریب میں نہیں جانا چاہتی۔ تم تو جانتے ہو کہ ہجوم سے میرا دل گھبراتا ہے۔ صرف اس لئے گئی تھی کہ وہ تمہارا دوست ہے۔ اس نے اصرار کرکے دعوت دی تھی اور بس.......... اگر وہ ایسا سمجھ رہا ہے تو میں.......... اس کی غلط فہمی دور کرسکتی ہوں۔" اس نے بڑے مضبوط لہجے میں جھوٹ بولا۔ امام دین بھی اس سے یہی جھوٹ بلوانے آیا تھا مگر اب اذیت کا شکار تھا۔

"میں یہی چاہتا ہوں زیبی! ہم اگر کسی کو خوشی نہیں دے سکتے تو اسے غم دینے کا بھی حق نہیں رکھتے۔ یہ بات اس کے دماغ سے نکل گئی تو وہ نازاں سے بے انصافی نہیں کرسکے گا اور اگر اسے یہی گمان رہا تو.......... تو تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ معصوم سی لڑکی جو خودکشی تک کرنے کو تیار تھی' کس بری طرح تباہ ہوجائے گی۔"

"ٹھیک ہے.......... میں.......... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی امام دین!" اس نے پرعزم لہجے میں کہا۔ امام دین کو لگا جیسے اس کے بدن کی تپش ایک دم کم ہوگئی ہو۔

☆==========☆==========☆

شام کے آٹھ بج چکے تھے۔ شامیانے میں مہمان بیٹھے تھے۔ سلطان بڑی پھرتی سے کام کرتا پھر رہا تھا۔ گلو نے آج سنورنے میں خاص اہتمام کیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا تھا۔ کئی بار اس آئینے پر زیبی کا چہرہ یوں نظر آکر غائب ہوا جیسے وہ یہیں کہیں چھپی ہوئی ہو۔ دبے پاؤں اس کی پشت پر آئی ہو پھر کہیں چھپ گئی

ہو۔ وہ خود کو اور اسے دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ اسے نازاں بھی نظر نہیں آرہی تھی جو کل سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ آج اس نے فیروزی سوٹ پہن رکھا تھا۔ رحمان چاچا کی بہو نے اسے سجایا اور سنوارا تھا۔ اس کا گورا سنہرا رنگ خوب نکھر آیا تھا۔ اس کے چہرے پر کل والا خوف یا پژمردگی بھی نہیں تھی گلو کے رویے نے اس میں اتنا اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ آج وہ سیدھی بیٹھی تھی۔

"اللہ! کیسا نکھار دیا ہے تو نے اسے۔"

گلو کو کسی نے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ پلٹا تو چھیمو سامنے کھڑی تھی۔ آج کا گلابی جوڑا پوری شام ہی گلابی کرگیا۔ اس نے کہنی ماری تھی' وہ لڑکھڑایا تھا مگر جب اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر سنبھالا تو گلو کو لگا جیسے سنبھلنے کی بجائے گہری کھائی میں گرتا ہی جارہا ہو۔

"یہ کمبخت کہاں سے ٹپک پڑی؟" سلطان کی بیوی نے سرگوشی کی تھی مگر گلو کے کانوں تک پہنچ گئی۔ "چلو بھئی! کمرا خالی کرو۔ دلہن کچھ دیر کو لیٹے گی۔" سلطان کی بیوی نے غالباً چھیمو کو کمرے سے نکالنے کے لئے ہانک لگائی تھی۔ کمرے میں بچے بھی بھرے ہوئے تھے۔ وہ یہ ہانک سن کر نازاں کو جھانکتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔ "چلو گلو! تم بھی جاؤ۔ باہر مہمان انتظار کررہے ہیں۔" وہ پھر بولی۔ گلو نے کن انکھیوں سے چھیمو کی طرف دیکھا۔ وہ اسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"ارے چلو!" سلطان کی بیوی بہت گھاگ تھی۔ فوراً لپکی اور گلو کا بازو پکڑ کر اسے دروازے سے باہر دھکیل دیا۔ گلو کسی سے ٹکرا گیا۔ گھبرا کر سنبھلا تو.......... اس کی کن پٹیوں میں چنگاریاں سی دہکنے لگیں۔

سامنے زیبی کھڑی تھی۔ ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ لئے۔

"مبارک ہو!" اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ "کل میری اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ میرے چلے جانے کا آپ لوگوں نے برا تو نہیں مانا؟"

"جی.......... جی وہ......" گلو گڑبڑا گیا تھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا' اس کی چہرے پر کل والی کوئی بات نہیں تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہونے کے باوجود آنکھوں میں اجنبیت تھی۔ گلو کو اس کا چہرہ بہت نامانوس سا لگا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ زیبی نہ ہو..........

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی اور ہو............ اسے وہ چہرہ یاد آگیا جس کے رخساروں پر آنسوؤں کی میلی میلی سی لکیریں تھیں اور آنکھوں میں التجا کے ساتھ ساتھ اپنائیت بھی' کل اسے دیکھ کر جو حالت گلو کی ہوئی تھی' وہ آج نہیں تھی۔ وہ رکی نہیں' اسے مسکرا کر دیکھنے کے بعد نازاں کی طرف بڑھ گئی۔

پتا نہیں اس نے ہنس کر نازاں سے کیا کہا تھا مگر گلو کو یوں لگا جیسے کہیں کچھ چھن سے ٹوٹ گیا ہو۔ اس نے پھر پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ نازاں کے پاس بیٹھی ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ایک بار بھی گلو کی طرف نہیں دیکھا۔

"وہ کوئی اور ہے............ نہیں............ نہیں' وہی ہے۔ وہی آنکھیں' وہی چہرہ............ اور وہی ہونٹوں کے قریب دانے کا ہلکا سا سیاہی مائل نشان............ اور پھر کل............ کل تو اس کے رخساروں پر بہنے والے آنسو بھی وہی تھے۔" وہ ہکا بکا کھڑا سوچ رہا تھا۔

"گلو!" اچانک اسے کسی نے چونکا دیا۔

وہ امام دین تھا۔ "کیسا ہے تو؟"

گلو نے خود پر قابو پالیا۔ "ٹھیک ہوں۔"

"میں تو جلدی آجاتا مگر زیبی پیچھے پڑ گئی کہ کل تو طبیعت کی وجہ سے آگئی تھی۔ مزہ ہی نہیں آیا۔ اب آج چلوں گی۔ بس............ تجھے پتا ہے عورتوں کی تیاری کا' اسی کی وجہ سے دیر ہوگئی۔" امام دین نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ایسا کہتے ہوئے اس نے گلو کی آنکھوں میں جھانکنے کی بھی کوشش نہیں کی۔

"چل باہر چلتے ہیں۔ کافی مہمان آئے ہوئے ہیں۔" امام دین اسے لئے باہر چلا آیا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا باہر آگیا۔

سلطان نے کرسیوں کے سامنے کے رخ پر ایک صوفہ سیٹ ڈال رکھا تھا۔ دلہا کو آتے دیکھ کر کچھ لوگوں نے اس کے گلے میں پھول ڈال دیئے۔ سلطان نے اسے صوفہ پر بٹھا دیا۔ امام دین اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا۔ ابھی انہیں بیٹھے دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک شامیانے کے دوسری طرف کسی گاڑی کے بریک چرچرائے۔ مہمان اچھل پڑے۔ کچھ لوگ باہر کی طرف لپکے۔ گاڑی نے بے خوفناک طریقے سے بریک لگائے تھے۔ دل

اچھل کر حلق میں آگئے تھے۔ گلو نے اٹھ کر جانا چاہا مگر امام دین نے اسے روک دیا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر خود اسی طرف بڑھ گیا جہاں دوسرے لوگ گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ شامیانے سے باہر نکلتا' گاڑی پھر جھٹکے سے اسٹارٹ ہوئی تھی۔ وہ لپکا............ عین اسی لمحے چاچا کی چیخ سنائی دی............

پورے پنڈال میں جیسے بھونچال آگیا۔ گلو اچھل کر باہر بھاگا۔ "چاچا............" اس نے چاچا کو پکارا مگر............

باہر کا منظر خوفناک حد تک سنگین تھا۔ دور جاتی گاڑی کی اڑتی دھول میں گلو کو لڑکھڑا کر گرتا ہوا چاچا صاف دکھائی دے گیا تھا۔ وہ اس کی جانب لپکا۔

"چاچا! کیا ہوا؟" وہ چیخ رہا تھا۔

"وہ............ وہ گلو! جھاراں............" چاچا نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا اور اس کا سر ایک جانب ڈھلک گیا۔

دھول بیٹھی تو گلو کا دل بھی بیٹھ گیا۔ ہاتھوں پہ چپچپاہٹ تو اسے فوراً ہی محسوس ہوئی تھی۔ چاچا کے سر کے پچھلے حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ "ماے!!"

گلو بے ساختہ چیخ اٹھا۔ اس نے چاچا کے بدن کو دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اٹھتے ہوئے اس کی نگاہ امام دین پر پڑی۔ وہ زمین پر پڑے کسی وجود پر جھکا ہوا تھا۔ شام کا سرمئی پن گہرانہ ہوتا تو وہ جان لیتا کہ بے سدھ پڑا جسم عورت کا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سب کیا ہوا ہے؟ اس کی کیا' کسی کی بھی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے؟ رحمان چاچا ہی نہیں گھر کے اندر باہر موجود سبھی لوگ شامیانے سے باہر آکر صورت حال جان لینے کو ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔

"ٹیکسی میں ڈال اسے۔" رحمان چاچا کی آواز نے گلو کو چونکا دیا ورنہ وہ تو پتھر کے بت کی طرح اسی طرف دیکھ رہا تھا جہاں امام دین زمین پر بیٹھا تھا۔ اتنا تو وہ جان گیا تھا کہ وہ جھاراں ہے۔ یقیناً وہ جھاراں تھی ورنہ چاچا کیوں کہتا۔

"ماے! اٹھا کر لا اسے۔" رحمان چاچا اپنی ٹیکسی کی طرف دوڑتے ہوئے پکارا۔ گلو اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے امام دین کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ پہچان چکا تھا کہ وہ عورت ہے' چاچا کو ٹیکسی میں ڈالنے ہی والا تھا کہ نازاں سر جھاڑ منہ پھاڑ وہاں پہنچ گئی............ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ ہی چاچی بھی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کون تھا.........؟"

"ہائے.......... یہ کیا ہوگیا؟"

ایسی ہی ہزاروں آوازیں تھیں جو گلو کو گھبرائے دے رہی تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا.........." وہ چیخ پڑا.........."جاؤ تم لوگ.........." وہ گھوم کر دوسری طرف پہنچ گیا' اسی دوران میں نازاں چھپاک سے ٹیکسی کے اندر جا گھسی' اس نے تو چاچا کو زخمی دیکھ کر بین بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کا سر گود میں لے کر بیٹھ گئی..........

"چل جلدی ماسے.........." رحمان چاچا جو ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولے کھڑا تھا' پکار کر بولا..........

"بے ہوش ہے.........." امام دین چلایا۔ اس نے اس عورت کو اپنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔ زیبی جو بری طرح بوکھلا گئی تھی لپک کر اس ٹیکسی میں جا بیٹھی۔

کچھ ہوش ہوتا تو گلو اور امام دین زیبی اور نازاں کو قطعی ساتھ نہ لاتے مگر ہونے والے واقعے اور ہنگامے نے سبھی کے حواس ہی چھین لیے تھے۔ گلو کو نازاں کی موجودگی کا احساس تب ہوا جب ایمرجنسی وارڈ میں چاچا اور اس عورت کو اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ گلو کو چاچا کی چلتی سانسیں دیکھ کر اور یہ دیکھ کر کہ وہ زیادہ زخمی نہیں ہے' کسی حد تک اطمینان ہو چکا تھا۔ اب اس کا سارا دھیان اس عورت کی طرف تھا جو بقول چاچا' جھاراں تھی۔ اسے دیکھنے اور اسے جان لینے کا تجسس تو اسے برسوں سے تھا۔ وہ چاچا کے اسٹریچر کو وارڈ بوائے کے حوالے کرتے ہوئے اس کی جانب لپکا تھا۔

اور جب اس کی نگاہ "جھاراں" پر پڑی تو جیسے دماغ میں آندھیاں سی اٹھنے لگیں۔ بچپن کے مٹے مٹے نقوش ماضی کی گرد جھاڑ کر ایک دم سامنے آگئے تھے۔ وہ چبوترے پر بیٹھا تھا اور ایک عورت اس سے جنت کا پتا پوچھ رہی تھی اور جب وہ پلٹ کر جنت کے گھر کی طرف چلی تو وہ اسے لنگڑاتے دیکھ رہا تھا اور پھر وہی عورت فتح کے ساتھ جب اس کے بنگلے سے باہر آکر گاڑی میں بیٹھی تو جانے کیوں اس کا ذہن اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے

لپٹ لپٹ کر الجھ رہا تھا۔

پھر جب اس نے اس کے ماں باپ کے بارے میں سوال کر لیا تھا تو دماغ میں ہونے والے دھماکوں نے اس کے حواس چھین لیے تھے۔ جانو اسے قابو کرنے کی کوشش میں لگ گیا تھا مگر اسے ہوش ہی نہ تھا.......... جب ہوش آیا تو وہ ایئرپورٹ کے چکنے فرش پر ہولے ہولے ڈگمگاتی ہوئی اندر جا رہی تھی۔

جانے کیوں اس وقت بھی گلو کو یوں لگا جیسے یہ وہی عورت ہے جس نے چبوترے پر ماسی جنت کے گھر کا پتا پوچھا تھا.......... جیسے یہ وہی ہے جس کی آنکھوں میں ممتا کا سمندر موجزن تھا' جیسے وہی اس کی ماں ہے.......... اور چاچا نے بھی تو یہی بتایا تھا کہ ماسی جنت ہی اسے اور اس کی ماں کو جانتی تھی پھر.......... پھر یہ جھاراں.......... ؟؟ اس کی ماں ہے.......... ؟ اگر یہ اس کی ماں ہے تو چاچا کس جھاراں کا منتظر ہے' کس کی تلاش میں اس نے اپنی زندگی گزار دی' اور اگر یہی جھاراں اس کی ماں ہے تو.......... چاچا نے اپنی زندگی اس کی تلاش میں کیوں گزار دی؟ مگر جھاراں کو تو چاچا سے چھیننے والا راجہ تھا.......... اور اس کی ماں کو؟ اس کی ماں کو کس نے اس سے چھین لیا تھا؟ وہ اسے جنم دے کر کھلے آسمان تلے چھوڑ کر کیسے چلی گئی؟ اور اگر گئی تھی تو کیا وہ اس کی ماں ہو سکتی ہے یا کوئی ماں اپنی اولاد کو یوں.......... چھوٹی سی عمر میں بے آسرا و بے سائبان چھوڑ کر جا سکتی ہے؟

"نہیں.......... یہ جھاراں ہے.......... میری ماں کیسے ہو سکتی ہے' اور پھر ابھی ابھی.......... کچھ دیر پہلے ہی تو چاچا نے بتایا تھا کہ وہ جھاراں ہے.........." گلو نے خود کو مطمئن کیا۔

"وہ میری نہیں.......... چاچا کی تلاش میں ہو گی.........." وہ اور مطمئن ہو گیا.......... دھند جیسے پھر چھا گئی۔ ماضی گرد میں اٹ گیا.......... وہ چونک اٹھا۔ اس کے گرد بہت سی آوازیں تھیں مگر سب اجنبی تھیں.......... اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ نہ امام دین' نہ زیبی' نہ نازاں' اور نہ جھاراں اور چاچا.......... لمحہ بھر کو اسے لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے یا جیسے ابھی ابھی کسی خواب سے چونک کر بیدار ہوا ہے۔ اسے بہت حیرت ہوئی' وہ اسپتال کے باہر ہی موجود تھا۔ ادھر ادھر لوگ آجا رہے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ سب بدحواس تھے۔ جیسے سب کا سب کچھ لٹ چکا ہو.......... وہ خوابیدہ سی حالت میں سامنے کی سیڑھیاں چڑھ کر استقبالیہ پر آگیا.......... وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ یہاں تک کیسے اور کیوں آگیا..........

اس کے کاندھے پر بھاری ہاتھ پڑا۔ وہ اچھل پڑا.......... سامنے امام دین کھڑا تھا۔

تو یہ خواب نہیں تھا؟ وہ چونک اٹھا.......... "ہیں.......... یں.......... ہاں..........

وہ چاچا کہاں ہے اور وہ.......... وہ عورت۔" وہ پوری طرح ہوش میں آگیا۔

"چل اندر.......... ایمرجنسی میں ہیں.......... ویسے سب ٹھیک ہے۔ چاچا کا تو سر پھٹ گیا تھا۔ چار پانچ ٹانکے آئے ہیں مگر.........." امام دین اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"مگر کیا؟" اس کا دل بری طرح دھڑک اٹھا تھا' جانے کیوں۔

"اس عورت کو.......... دماغ میں چوٹ آئی.......... بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر ایکسرے لے رہے ہیں.......... مگر یار گلو! یہ.......... ہے کون؟"

"یہ.......... یہ تو.........." گلو اچانک کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا پھر بولا۔ "چاچا کی جاننے والی ہے.......... اس کے گاؤں کی.......... شاید.......... شاید.......... شادی میں آرہی تھی کہ.........." پھر وہ بولتے بولتے ٹھٹک کر چپ ہوگیا۔ اس کے ذہن میں چبھن سی ہوئی تھی.......... عجیب سی بے چینی اس چبھن کے ساتھ ہی بڑھ کر اس کے پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔ "وہ.......... وہ گاڑی ماے! وہ گاڑی کس کی تھی..........؟"

سوال کرتے ہی جانے کیوں اسماعیل کا چہرہ اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا..........

"پتا نہیں یارا" امام دین نے بظاہر بے پروائی سے کہا تھا مگر گلو کو لگا جیسے وہ بھی الجھن میں ہو۔ "ایک تو روشنی کم تھی پھر جب تک میں وہاں پہنچا' وہ دور جاچکی تھی۔"

مگر گلو کو یقین نہیں آیا۔ امام دین اس سے کافی پہلے باہر چلا گیا تھا اور جب گلو نکلا تو اس وقت گاڑی موڑی گئی تھی۔ دھول تبھی تو اٹھی تھی اور جھاراں.......... یا جو بھی تھی' وہ قریب ہی گری ہوئی تھی.......... چاچا تو شاید بعد میں گرا تھا اور شامیانے کے قریب ہی تھا.......... اس طرح امام دین اس گاڑی سے قریب تھا۔ جس وقت دھول اڑی تھی اس وقت گلو نے گاڑی دیکھ لی تھی پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ ماے نے نہ دیکھی

ہو.......... مگر اس سے پہلے کہ گلو امام دین سے سوال کرتا' اس کی نگاہ کوری ڈور میں کھڑی نازاں اور زیبی پر پڑی۔ نازاں دیوار کی طرف منہ کیے رو رہی تھی اور زیبی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے غالباً اسے تسلی دے رہی تھی۔ نازاں نے فیروزی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے پیروں پر لگی مہندی گلو کو دور سے صاف نظر آرہی تھی۔ اس کی کلائیاں کانچ کی فیروزی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں تبھی اسے احساس ہوا کہ اس کے آنے کی بھلا کون سی تک تھی! وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

"تو کیوں آئی ہے؟" اس نے نتھنے پھلا کر تیز لہجے میں پوچھا۔

"م.......... میں.......... گلو! چاچا کو.......... پتا کر چاچا کیسا ہے" وہ سخت ہراساں تھا۔

"ٹھیک ہے وہ.........." اس نے اسی تیزی میں جواب دیا مگر دوسرے ہی لمحے بے چین ہوگیا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" وہ برابر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

یہ ایمرجنسی وارڈ تھا۔ سامنے ہی چاچا لیٹا تھا۔ وہ ہوش میں تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھ چکی تھی۔ ڈاکٹر اسے انجکشن لگا رہا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا.......... "چاچا! کیسا ہے تو؟ کیا ہوا تھا؟"

"پلیز!" پاس کھڑا ڈاکٹر پلٹ پڑا۔ "اس طرف مت جائیے گا.......... آپ لوگ مریضوں کو ہی نہیں ڈاکٹرز کو بھی ڈسٹرب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ مریض پر پوری توجہ نہیں دے پاتے اور پھر آپ ہی لوگ بلیم کرتے ہیں کہ جی ڈاکٹر نے کیس بگاڑ دیا۔" وہ برا سا منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔ کافی جلا ہوا لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے مگر آپ یہ تو بتادیں کہ وہ کیسی ہے؟" گلو رک گیا۔

"بے ہوش ہیں' آپ کا جانا ویسے بھی بیکار ہے.......... دماغ میں چوٹیں آئی ہیں.......... باقی تفصیل تو انہیں چیک کرنے والا ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے.........." اتنا کہہ کر وہ ایک آنے والے مریض کی طرف متوجہ ہوگیا۔ پھر پلٹ کر بولا۔ "انہیں لے کر آپ باہر جائیں.......... یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ دوائیں لکھ دی ہیں۔ یہ بھی لے آئیے.........." اس نے نسخہ گلو کی طرف بڑھا دیا۔

گلو نے چاچا کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور اس کا بازو اپنے کاندھے پر رکھ کر انہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے کمرے سے باہر آگیا.......... اسے دیکھتے ہی امام دین' نازاں' اور زیبی لپک کر قریب چلے آئے۔ گلو نے دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی بینچ پر چاچا کو لٹا دیا۔ نازاں اب بھی رو رہی تھی۔

"تو کیوں چلی آئی نازاں!"

چاچا نے اس کی موجودگی کو شاید اب محسوس کیا تھا حالانکہ وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ ٹیکسی میں بھی ہوش میں تھا مگر.......... نہیں.......... وہ بھلا ہوش میں کہاں تھا؟ اس کے ہوش تو تبھی کھو گئے تھے جب وہ کسی کام سے شامیانے سے باہر آیا تھا۔

"غلام حسین!"

ایک سرگوشی تھی جو اس کے حواسوں پر بجلی بن کر گری تھی۔ برسوں بیتنے کے باوجود وہ جھاراں کی آواز کو بھلا نہیں پایا تھا۔ وہ اچھل پڑا تھا۔ وہ شامیانے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ شام کا ملگجا اندھیرا ہونے کے باوجود وہ غلام حسین کو یوں دکھائی دی جیسے عین سر پر جلتے سورج کے نیچے کھڑی ہو۔ اس کا درمیانی فاصلہ پانچ چھ گز تو رہا ہوگا اور وہ غلام حسین جو قریب کی چیز دیکھتے ہوئے چندھیانے لگا تھا' اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پورے یقین کے باوجود وہ شل ہوگیا تھا۔ یوں جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ کھڑے کھڑے.......... جاگتے میں خواب دیکھ رہا ہو۔

اس کے پتھرا جانے والے قدم اٹھے تو اچانک ہی گاڑی کے انجن کا شور گونج اٹھا۔ گاڑی' ساتھ والی گلی سے نکلی تھی۔ ابھی وہ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک وہ سفید گاڑی عفریت کی طرح جھاراں کے سر پر پہنچ گئی۔ بریک چرچرائے اور دو مضبوط بازوؤں نے ایک دم دروازہ کھول کر جھاراں کو اندر گھسیٹنا چاہا.......... وہ لڑکھڑائی.......... گری' اٹھی اور اس کی سمت بھاگنا چاہتی تھی کہ انہی بازوؤں نے اس کے بال پکڑ لیے۔ غلام حسین تو کسی بت کی طرح ساکت رہ گیا تھا' اچانک اچھل کر بھاگا تھا.......... بے ساختہ چیخ اٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی پہنچا تھا کہ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ ابھی تک زمین پر گھسٹ رہی تھی اور پھر جانے کیا ہوا.......... وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گری اور گاڑی کے بریک خوفناک آواز میں چیخ اٹھے۔

گاڑی ریورس ہوئی اور پھر وہاں رکی نہیں.......... اس کی طرف لپکی.......... ا

نے بچنے کے لیے ایک طرف چھلانگ لگادی مگر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا.......... لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا' تبھی اس کے سر میں دھماکا ہوا۔ سب کچھ دھندلا گیا مگر جھاراں کا بے سدھ پڑا جسم واضح تھا شاید اس لیے کہ اس کا سارا دھیان اسی طرف تھا اور اس نے امام دین کو جھاراں کی طرف لپکتے دیکھا.......... گاڑی اسی تیز رفتاری سے آنکھوں سے اوجھل ہوگئی.......... اور گلو نے اسے سنبھال لیا.......... یہ احساس ہوتے ہی کہ وہی نہیں' جھاراں بھی بچ گئی.......... اسے وہ لوگ نہیں لے جاسکے' اس کا ذہن غنودگی میں چلا گیا مگر وہ بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ اسے چوٹ زیادہ نہیں ہے اور یہ کہ اب سب ٹھیک ہے.......... گلو' امام دین' رحمان سب موجود ہیں.......... مگر جھاراں..........؟

☆==========☆==========☆

"تو ٹھیک ہے ناں چاچا!" نازاں اس پر جھکی پوچھ رہی تھی۔

"ہیں.......... ہاں.......... آں ہاں.......... مگر تو کیوں آئی ہے؟"

"ٹھیک ہے چاچا.......... اب تو آگئی ناں! تو اور گلو دونوں جھلے ہیں۔" امام دین کو غصہ آگیا.......... "ایسی حالت میں کسے ہوش تھا کہ.........." وہ بڑبڑایا۔

"میں چاچا اور نازاں کو لے جاتی ہوں۔" زیبی نے گلو کو چونکا دیا۔ "تم دونوں بعد میں.........."

"میں نہیں جاؤں گا گلو!" چاچا نے ایک دم ملتجی انداز میں کہا۔ "تو نازاں کو لے کر جا.......... مہمان بیٹھے ہیں۔ سب پریشان ہوں گے.......... میں.......... میں جھاراں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا گلو! اتنی مشکل سے.......... اتنے برسوں میں تو وہ ملی ہے.......... اور.......... وہ.......... حرام زادے اسے لے جانا چاہتے تھے.......... وہ یہاں بھی تو آسکتے ہیں گلو!" خوف اچانک ہی اس پر حاوی ہوگیا تھا۔

"کون تھے وہ لوگ چاچا؟" گلو اس کے برابر بیٹھ گیا۔

"پتا نہیں گلو! گلو.......... مجھے یقین ہے.......... یہ وہی حرام زادہ ہوگا.......... جھاراں ہوش میں آجائے تو پتا چلے.......... تو پتا کر گلو.......... دیکھ ڈاکٹر سے کہہ' مجھے دکھا دے.......... وہ ہوش میں آجائے گی گلو! میں.........."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں اسے آواز دوں گا تو............ جا............ جا کر دیکھ............" چاچا پر اچانک وحشت سی طاری ہوگئی۔

"میں دیکھتا ہوں۔" امام دین جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا' پلٹ گیا............

پھر چاچا سے کچھ نہ بولا گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسی سمت تکتا رہا جس طرف امام دین گیا تھا۔ لمحہ لمحہ جیسے صدی بن گیا۔ خالی خالی سا گلو دیوار سے ٹیک لگائے' سوجی ہوئی آنکھوں والی زیبی کو دیکھے گیا جو شاید بہانہ پاکر رو دی تھی۔ ہر آنے والا لمحہ اس کے یقین کو پختہ کر رہا تھا کہ یہ وہی ہے' بس رخساروں پر بہتے آنسوؤں کی لکیریں مدھم ہو چکی تھیں۔ وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی پھر بھی گلو نے پہچان کے سارے رنگ اس کی آنکھوں میں پالیے تھے............ اس کا جی چاہا کہ اس کے کاندھے تھام کر اسے کہے کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھو............ میں وہی ہوں جو برسوں سے تمہاری تلاش میں تھا۔ وہی جس کی یاد نے تم سے چین اور سکون چھین لیا تھا مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"گلو! تم نازاں اور زیبی کو لے کر گھر جاؤ............" امام دین جانے کب لوٹ آیا تھا۔ وہ شاید چاچا کو جھاراں کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس کا چہرہ فق تھا' آنکھوں میں وحشت بھری تھی۔

گلو نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ چاچا پر ڈال کر امام دین کی طرف دیکھا۔ "کیوں! کیا ہوا؟"

"وہ............ ٹھیک نہیں ہے۔" امام دین نے سرگوشی کی۔ شاید وہ یہ بات چاچا سے چھپا رہا تھا۔

"ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" اس نے امام دین کا ہاتھ تھام کر چند قدم آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"کہتے ہیں بے ہوشی طویل بھی ہو سکتی ہے۔ دماغ کی اندرونی چوٹیں خطرناک ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی ہوش نہ آئے اور وہ............" امام دین نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

گلو سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے پلٹ کر چاچا کو دیکھا۔ کیسے لٹا لٹا سا بیٹھا تھا وہ............

"کتنا بدنصیب ہے چاچا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "ساری زندگی جس کی تلاش میں مارا مارا پھرا وہ خود چل کر اس تک آئی بھی تو............"

"گلو تو کوشش کر کے چاچا کو بھی لے جا۔ اسے تو ہوش نہیں آنا............ گھر پر مہمان ہیں۔ انہیں تو بھگتانا ہی ہے ناں! میں یہاں ہوں۔ اگر اسے ہوش آگیا تو فوراً پہنچوں گا۔ خیال رکھوں گا مگر یہ یہاں یوں وحشیوں کی طرح بیٹھا رہا تھا............ تو یہ کہیں خود ہی نہ............"

وہ جھٹکے سے پلٹ گیا۔ امام دین ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس کا یہاں رہنا خود اس کے لیے خطرہ تھا اگر جھاراں موت کی آغوش میں جا رہی تھی تو بھی اس کا لمحہ لمحہ آگے بڑھنا' اس کے اور موت کے درمیان کا فاصلہ کم کر سکتا تھا۔ وہ تو جیتا ہی اس کے لیے رہا تھا پھر اسے اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا کیسے دیکھتا! وہ تیز قدموں سے چاچا کے قریب پہنچ گیا۔

"چاچا!" اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔ چاچا نے دھیرے سے سر گھما کر خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"دیکھو چاچا! وہ بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں بے ہوشی طویل ہے۔ چل............ گھر چلیں............ امام دین یہاں ہے۔ گھر پر مہمان ہیں ناں! انتظار کر رہے ہوں گے۔ بس گھنٹا بھر کو چلتے ہیں پھر ان دونوں کو چھوڑ کر واپس آجائیں گے............" اس نے نازاں اور زیبی کی طرف اشارہ کیا۔

چاچا ویسے ہی خالی خالی سا' دونوں خالی اور کھلی ہتھیلیوں کو گود میں رکھے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا مگر آنکھوں میں بھرا کرب گلو کے اندر بل ڈال رہا تھا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت بے حسی کی باتیں کر رہا ہے۔

"چل چاچا............ یہاں بیٹھا رہ کر کیا کرے گا؟" اس نے اپنا ہاتھ اس کی بغل میں ڈال کر اسے اٹھانا چاہا اور یوں لگا تھا جیسے چاچا کو بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو............

"ہٹ جا............ ہٹ جا یہاں سے۔" وہ ایک دم چیخ پڑا............ "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ ارے میں تو جانے کتنے برسوں سے اسی راہ پر بیٹھا تھا' اس جھلی کی بے ہوشی ٹوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تو آئی ہے وہ ہوش میں............ اب تو ملی ہے وہ............ تجھے تو سب کچھ مل گیا ناں............! جا چلا جا............" یہ کہتے کہتے چاچا بلک اٹھا............

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو، نازاں، زیبی اور امام دین سکتے میں رہ گئے۔ وہ یوں بولا تھا جیسے کہیں سے اچانک طوفانی ریلا بہہ نکلے۔ جیسے اچانک کوئی آتش فشاں پھٹ پڑے۔ گلو جانتا تھا کہ برسوں سے پکنے والا لاوا تو کب سے نکلنے کو بے چین تھا اور اب بھی نہ نکلتا تو بھلا کب نکلتا؟ وہ شرمندہ ہوگیا۔ چاچا سے اس کی پہلی اور آخری خوشی چھیننے والا وہ خود تھا اور وہ صرف اسی لیے کہ گھر میں لوگ اس کے ولیمے کا کھانا کھانے کے منتظر ہیں۔

"ٹھیک ہے چاچا۔" وہ جلدی سے آگے بڑھا۔ اس نے دوسرے وارڈ سے جھانکتے ہوئے کچھ چہروں کو دیکھ لیا تھا۔ چاچا بہت زور سے چیخا تھا۔ اس نے اسے دونوں کاندھوں سے تھام لیا۔ "میں.......... میں جانتا ہوں چاچا۔ یہ وقت اسے یوں چھوڑ کر جانے والا نہیں.......... تم بیٹھو چاچا.......... میں.......... میں ان دونوں کو گھر چھوڑ کر آتا ہوں۔"

"سن گلو!" چاچا نے آستین سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "تیرے آنے کی ضرورت نہیں.......... دیکھ تو نازاں کی کیا حالت ہوگئی.........."

"کچھ نہیں ہوا اسے.........." وہ نازاں کی جانب دیکھے بغیر بولا۔ "اور میں تجھے اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں بس گھنٹا بھر میں آجاؤں گا۔"

☆==========☆==========☆

پھر امام دین بھی اسے سمجھاتا رہ گیا کہ وہ چاچا کی طرف سے بے فکر ہو جائے مگر گلو پر تو جیسے بھوت سوار ہوگیا تھا۔ اس نے ایک نہ سنی.......... ٹیکسی لے کے سیدھا گھر پہنچ گیا۔ نازاں جانے کیوں سہمی ہوئی تھی۔ زیبی کی گہری خاموشی گلو کے اندر بے پناہ شور مچا رہی تھی۔ وہ چاچا کے بارے میں سوچنا چاہتا تو جھاراں کا خوبصورت چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا اور پھر ہزاروں سوال کیڑوں کی طرح اس کے دماغ میں کلبلانے لگتے اور جب نازاں کا خیال آتا تو زیبی کی آنکھوں سے بہتے آنسو اس کے اور نازاں کے درمیان لوہے کی سلاخیں بن کر یوں کھٹاک سے حائل ہو جاتے، جیسے کسی نے اسے لوہے کے جنگلے میں قید کر دیا ہو۔

"خوشی اور غم میں اتنا فاصلہ ہوتا ہے گلو، جتنا زندگی اور موت کے درمیان ہوتا ہے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ ان دیکھی لکیر کب ادھر یا ادھر ہو جائے۔" زیبی دھیرے سے بولی۔

ٹیکسی میں چھائی خاموشی اچانک ٹوٹی تھی۔ اس کی آواز گلو کو اپنے ہی اندر کے کسی گہرے پاتال سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ پہلو بدل کے رہ گیا۔ پہلو بدلتے ہی جیسے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بیک مرر میں دو قندیلیں سی روشن ہوگئی تھیں، جھلملاہٹ دور تک پھیلی ہوئی تھی جیسے بہتے دریا میں دو دیے تیر رہے ہوں۔

"ہاں.......... خوشی اور غم میں کوئی فاصلہ نہیں۔" اس نے اک ذرا سا سر دائیں جانب کر کے نازاں کو دیکھا، وہ کھڑکی سے باہر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ گھبرائی گھبرائی سی۔ جیسے ٹیکسی میں اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس نے زیبی کا جملہ دہرایا تھا مگر یوں جیسے خود کو یقین دلا رہی ہو۔

اور گلو کا جی چاہا وہ ٹیکسی کو سامنے سے آتے ہوئے ٹرک سے ٹکرا دے۔ وہ تو ٹکرا بھی دیتا اگر زیبی نہ چیخ اٹھی ہوتی۔ اس نے تو صرف اس کی چیخ سے گھبرا کر اک ذرا اسٹیئرنگ کو لہرایا تھا اور ٹرک زن سے نکل گیا۔ اس نے دیکھا، خوف صرف زیبی کے چہرے پر تھا، نازاں ایسے ہی پُرسکون بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں در آنے والا سناٹا حبس بن کر اس کے اندر اتر گیا۔

ٹیکسی جونہی گلی میں داخل ہوئی، شامیانے کے باہر کھڑے لوگ اس کی جانب لپکے۔ رحمان چاچا کی بیوی بہت پریشان تھی۔ "کیا ہوا؟"

تب گلو نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ رحمان چاچا مہمانوں کے خیال سے اس کے پیچھے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔ اس وقت رحمان چاچا کا دم گلو کو بڑا غنیمت لگا تھا۔ اس نے فوراً ہی بے چین لوگوں کو بہلا کر پُرسکون کر دیا اور کھانا لگوا دیا۔ گھنٹا بھر بعد ہی شامیانہ خالی ہوگیا۔ رحمان چاچا، فضل دین اور کریم بھائی ہی رہ گئے۔ سلطان بیوی بچوں کو لے کر گھر چلا گیا، چاچی، بولائی بولائی پھر رہی تھی۔ پھپھو بھی اب تک وہیں چکرا رہی تھی۔ اس کا بچہ غالباً سو چکا تھا۔ کیونکہ اب اس کے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ زیبی نازاں کے کمرے میں، نازاں کے ساتھ تھی۔ گلو رحمان چاچا کے ساتھ بیٹھا تھا۔ رحمان چاچا کو سامان اٹھوانا تھا اور وہ گلو سے کہہ چکے تھے کہ ساتھ ہی اسپتال چلیں گے۔ جانے چاچی سے اس نے کیا کہا تھا کہ وہ چہرے پر وحشت بکھیرے خاموش تھی۔

☆==========☆==========☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب گلو اور رحمان چاچا اسپتال کے لیے روانہ ہوئے تب زیبی نے گھر جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ گلو اسے گھر چھوڑ دے۔ گلو ایسا بالکل نہیں چاہتا تھا مگر.......... اسے گھر تو جانا ہی تھا پھر بھی اس نے کہا۔ "اب رات کو!! آپ اکیلی ہوں گی.........."

"اکیلی ہی تھی۔" زیبی نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اور گلو نے یوں سر جھکا لیا جیسے اسے تنہا کرنے میں سو فی صد اس کا ہی ہاتھ ہو۔ پھر اچانک ہی وہ کھڑا ہو گیا۔

"میں.......... پھر میں پہلے آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔"

"پھر آپ کو دوبارہ آنا پڑے گا۔ رحمان چاچا کے ساتھ ہی نکلیں گے۔" وہ اس بار سرسری انداز میں کہہ کر پلٹ گئی۔ گلو نڈھال سا ہو کر دوبارہ بیٹھ گیا۔ رحمان چاچا کو فارغ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اسے خود بھی جانے کی جلدی تھی۔ اس نے سلطان کو بلا کر کئی کام اس کے ذمے لگا دیے اور چلنے کو تیار ہو گیا۔

☆==========☆==========☆

گلو نازاں کے کمرے میں داخل ہوا کہ زیبی کو بلا لے' زیبی منتظر تھی۔ وہ نازاں کو خدا حافظ کہہ کر گلو کے پیچھے چلی آئی۔ وہ اور رحمان چاچا اس کے ساتھ ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ ٹیکسی کب اسپتال کے گیٹ پر پہنچی' گلو کو احساس بھی نہ ہوا حالانکہ اسے زیبی کو پہلے گھر چھوڑنا تھا۔ ٹیکسی کے رکتے ہی رحمان چاچا اتر گئے۔

"پہلے مجھے.........." زیبی بول اٹھی۔

گلو کو اچانک احساس ہوا کہ لاشعوری طور پر وہ پہلے رحمان چاچا کو چھوڑنے چلا آیا۔ "میں.......... بھول گیا۔ ابھی چھوڑ دیتا ہوں۔" پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' گلو اتر گیا۔ اس نے رحمان چاچا سے کہہ دیا کہ وہ زیبی کو چھوڑ کر آتا ہے وہ پلٹنے ہی والا تھا کہ سامنے سے آتے امام دین کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اسے لگا جیسے اس کی کوئی امید ٹوٹ گئی ہو۔ محرومیاں مختلف روپ دھار کر اسے ڈرانے لگیں تھیں۔

"کیسا ہے وہ؟" رحمان چاچا نے اس کے قریب آتے ہی چاچا کے متعلق پوچھا۔

"چاچا! تو ٹھیک ہے مگر.......... وہ عورت.........."

"ہاں کیا ہوا؟" گلو اسے چپ ہوتے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"ابھی تک بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر مایوس ہیں۔ ویسے مجھے نہیں لگتا کہ وہ جیتی رہے گی۔" اسی لمحے اس کی نظر زیبی پر پڑی۔ لمحہ بھر کو اس کا رنگ سفید ہوا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گیا۔

گلو نے محسوس کر لیا کہ زیبی کو اس کے ساتھ دیکھ کر امام دین کا رنگ متغیر ہوا ہے۔ "انہوں نے گھر جانا تھا۔ میں نے کہا رحمان چاچا کو بھی چھوڑ دوں گا اور تجھے بھی.......... شاید گھر جانا ہو۔"

امام دین نے تمسخرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"گھر.......... ! کیسا گھر گلو! مجھے تو گیراج جانا ہے" آواز مدھم تھی کہ زیبی نہ سن سکے۔ رحمان چاچا گلو کا بازو پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ امام دین وہیں رک گیا اور گلو رحمان چاچا کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ جلدی آنے کا کہہ گیا تھا۔

"میں نے چاچا کا کھانا پہنچا دیا تھا گلو مگر اس نے کھایا نہیں۔" پیچھے سے امام دین نے پکار کر کہا۔ گلو ہاتھ ہلا کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

وہ جو زیبی سے کچھ پوچھنے کا حوصلہ اس نے پیدا کیا تھا وہ جیسے پھوٹتے پسینے میں بہہ گیا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا چاچا کے پاس پہنچ گیا۔ جھاراں ابھی تک آئی سی یو میں تھی۔ چاچا باہر بنچ پر اسی طرح لٹا لٹا بیٹھا تھا۔ گلو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا کیا کرے۔ گھر لے کر جائے تو کیسے اور یہاں تنہا چھوڑے تو کیسے؟ رحمان چاچا اس کے قریب جا بیٹھا۔ گلو ڈاکٹر کے کمرے میں چلا گیا۔ ڈاکٹر نے صاف طور پر بتا دیا کہ جھاراں کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اسے دماغ میں اندرونی چوٹیں آئیں تھیں۔ اس نے گلو سے کہا کہ ہو سکے تو وہ چاچا کو گھر لے جائے' یہاں اگر رہنا ہی ہے تو کسی اور کو چھوڑ دے۔ چاچا کی اپنی صحت اور پھر اس پر طاری وحشت ڈاکٹرز کے لئے مسئلہ بنی ہوئی تھی۔

"وہ ہر دو منٹ بعد آ کر ہمیں پریشان کرتے ہیں۔" پاس کھڑی نرس نے بھی منہ بنا کر کہا۔

گلو چپ چاپ باہر آ گیا۔ چاچا' رحمان چاچا سے لپٹا ہوا بری طرح رو رہا تھا۔ گلو کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ کیسے اسے سمجھائے۔ کیسے کہے کہ وہ جسے زندگی بھر تلاش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتا رہا۔ اسے یوں بے ہوشی کی حالت میں' موت سے قریب تر چھوڑ کر گھر چلا جائے۔ نہ ڈاکٹرز کی سمجھ میں اس کا دکھ آتا' نہ وہ اس کو یوں چھوڑ کر جانے کو تیار ہوتا۔ اس نے رحمان چاچا کو بلا کر ڈاکٹر کی بات بتائی۔

"مجھے تو نہیں لگتا کہ یہ بڈھا اسے یوں چھوڑ کر گھر جائے گا۔" رحمان چاچا نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"مگر اس کا یہاں رکنا فضول ہے چاچا۔ جب تک اسے ہوش نہیں آئے گا' سب بیکار ہے۔ ڈاکٹر مسلسل اس کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ تو چاچا کو کسی بھی طرح سمجھا کر گھر لے جا چاچا! میں یہاں رک جاتا ہوں۔"

"میں کوشش کرتا ہوں گلو پر سچی بات ہے' یہ یہاں کسی کونے میں جان دے دے گا پر چھوڑ کر نہیں جائے گا۔"

اسی لمحے زیبی اور امام دین بھی آ گئے۔ زیبی یہ سب سن کر بے چین ہو گئی۔ "میں رک جاتی ہوں۔ آپ بھی گھر چلے جائیں۔"

"نہیں............" امام دین وحشت بھرے انداز میں چیخ اٹھا۔ اسے نازاں کا انجام یاد آ گیا تھا۔ وہ درندہ بھی تو اسی اسپتال میں اسے لوٹ گیا تھا۔ وہ زیبی کو کبھی بھی یہاں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

"کیوں نہیں؟" زیبی نے تیوری پر بل ڈال کر پوچھا۔ "مجھے کچھ کام نہیں' اکیلی ہوتی ہوں۔ ان کے پاس رہ لوں گی۔ گلو کا یہاں رکنا بھی تو ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے ان کے کام آنا چاہئے۔ نہ چاچا رک سکتا ہے اور نہ گلو۔" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

امام دین اس کا لہجہ پہچانتا تھا۔ وہ جان گیا کہ اب زیبی کو کسی قیمت پر اس کے ارادے سے باز نہیں رکھا جا سکتا۔ مگر وہ سخت خوفزدہ تھا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ زیبی کو بتا دے کہ نازاں کے ساتھ کیا ہوا تھا یہیں اسی اسپتال میں مگر یہ ایسی بات بھی نہ تھی کہ وہ یوں منہ پھاڑ کر کہہ جاتا۔ نازاں کی عزت کے ساتھ ساتھ ان کی دھوکا دہی بھی کھل جاتی اور پھر زیبی جس ٹائپ کی تھی' امام دین کو علم تھا کہ وہ اسے اور نازاں کو قصوروار سمجھے گی۔ وہ اصل دکھ کو جانے بغیر گلو کا ساتھ دے گی اور یہ بات گلو کے علاوہ نازاں اور

خود اس کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

گلو تو خوش ہو گیا تھا۔ اس طرح وہ چاچا کو مطمئن بھی کر سکتا تھا کہ زیبی جھاراں کی خدمت کے لئے موجود ہے اور خود اس کو بھی زیبی سے بات کرنے کا موقع مل سکتا تھا پھر پتا نہیں رحمان چاچا نے چاچا سے کیا کہا کہ وہ بغیر واویلا مچائے گھر جانے کو تیار ہو گیا۔ زیبی نے کچھ ضروری چیزیں منگوانے کو کہہ دیا جسے پہنچانے کی ذمے داری گلو نے لے لی مگر امام دین اسے صاف نکال گیا۔ اس نے سختی سے منع کر دیا کہ گلو کی ابھی شادی ہوئی ہے۔ نازاں کا کوئی قصور نہیں کہ اسے دو دن کی خوشی بھی نصیب نہ ہو سکے۔ وہ گھر بیٹھے زیبی یہاں ہے اور خود امام دین بھی دن میں دو تین چکر لگا لے گا۔ ایسا کہتے ہوئے امام دین نے بڑی کمینگی سے دعا مانگی کہ جھاراں جتنی جلدی ہو سکے مر جائے۔

☆==========☆==========☆

زیبی کے بارے میں امام دین نے ڈاکٹر سے کہہ دیا کہ وہ رہے گی اور اس کا خیال رکھنا بھی ان کی ذمے داری ہو گا۔ یہ سن کر ڈاکٹر نے حیران نگاہوں سے امام دین کو دیکھا تھا مگر وہ اس خیال رکھنے کی وضاحت کے بغیر باہر نکل گیا تھا۔ چلتے چلتے اس نے زیبی سے بھی کہہ دیا تھا کہ ساری دنیا کی طرح یہاں بھی درندے پھرتے ہیں' اپنا بہت خیال رکھے۔ زیبی کو اس کی بات پر نہیں بلکہ اس کے چہرے پر پھیلی وحشت پر حیرانی ہوئی تھی۔ وہ بوکھلایا ہوا تھا۔

چاچا کو گھر لے جاتے ہوئے گلو کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھلے سمندر میں لکڑی کے دو علیحدہ ٹکڑوں پہ پاؤں جمائے کھڑا ہے۔ آتی جاتی لہریں اسے ڈگمگا رہی تھیں۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اور نازاں تو جیسے کسی دور دھند میں جا چھپی تھی۔ کسی لمحے' کسی پل اچانک اس کا وجود واضح ہو کر اس کے سامنے لہراتا اور پھر معدوم ہو جاتا............

"رحمان!! اب............ اب اسے کچھ نہیں ہونا چاہئے............ اب میں بہت تھک گیا ہوں............ وہ............ وہ خود آئی ہے رحمان............ اسے پتا لگ گیا ہو گا کہ آج گلو کی شادی ہے۔ یہ دل بھی کیسی عذاب چیز ہے۔ اسی نے بتایا ہو گا کہ آج............ آج گلو کی شادی ہے............ اور میری بھی تو صبح سے آنکھ پھڑک رہی تھی۔ دل بیٹھا جا رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جانے وہ کون حرام زادہ تھا۔ اسے کیا دشمنی تھی جھاراں سے؟" چاچا کہتے کہتے رو پڑا تھا۔

"ہوا کیا تھا۔ وہ گاڑی کس کی تھی؟ تو نے اسے کیسے دیکھا تھا؟" رحمان چاچا نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

"میں باورچی کے بیٹے کو بلانے اس طرف گیا تھا۔ برتن صاف کروانے تھے' اس لیے میں جونہی باہر نکلا' میں نے دیکھا' سفید کپڑوں میں کوئی عورت شامیانے سے لگی کھڑی تھی۔ وہ شامیانے کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ محلے کی کوئی عورت ہے مگر پھر مجھے یوں سنائی دیا جیسے وہ سسکیاں لے رہی ہو۔ تھوڑی دیر تو میں اسے پہچاننے کی کوشش کرتا رہا پھر دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھا مگر.......... پتا نہیں وہ کس کی گاڑی تھی' کہاں سے آئی تھی یا.......... یا شاید وہیں کسی کونے میں کھڑی تھی' اچانک اس کی لائٹس میری آنکھوں پر پڑی مگر وہ بھی اس روشنی میں نہا گئی۔ وہ بھی اچھل پڑی تھی۔ وہ پلٹی۔ اس نے لمحہ بھر کو گاڑی کی طرف دیکھا' پھر میری طرف مڑی' اب اس نے مجھے دیکھ لیا تھا' وہ مجھے پہچان گئی تھی رحمان.......... اس نے.......... اس نے مجھے پکارا تھا۔ میرا نام لے کر پکارا تھا مجھے۔ وہ میری طرف بھاگی مگر اتنی دیر میں گاڑی اس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ آگے کا دروازہ کھلا تھا۔ کسی نے اسے اندر گھسیٹنے کی کوشش بھی کی تھی مگر میں.......... میں ہوش میں آ چکا تھا۔ میں نے گلو کو پکارا' اس کی طرف لپکا۔ جانے کیسے اس نے خود کو چھڑا لیا تھا مگر گاڑی جوں ہی جھٹکے سے چلی وہ بونٹ پر ٹکرا کر نیچے گری اور.........."

چاچا کی آواز بھرا گئی.......... "رحمان! وہ.......... وہ حرام زادہ راجہ ہو گا.......... مجھے یقین ہے کہ.........."

اور گلو کے دماغ میں جیسے زوردار دھماکا ہوا.......... ٹیکسی لہرا گئی.......... ایکسی لیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھ گیا۔ لمحوں میں وہ گھر پہنچ گیا۔ اس کے دماغ میں بے پناہ شور سا ہو رہا تھا۔ جیسے سمندر کی طوفانی موجیں کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہوں۔ نکل جانے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہوں مگر بے بسی سے پلٹ آتی ہوں.......... وہ تیز قدموں سے اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ نازاں اسی کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا؟"

اس نے بے ساختہ پوچھا مگر گلو نے جواب نہیں دیا۔ وہ بستر پر نڈھال بیٹھ گیا.......... "کچھ نہیں.......... ہوش نہیں آیا۔"

اس کا جواب سنتے ہی وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اسے چاچا کی آواز سنائی دے گئی تھی۔ اس کے باہر جاتے ہی گلو نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ یہاں اب کوئی نہ آئے' کھڑکیوں اور دروازوں کی روزن سے اندر آنے والی آوازیں بھی سنائی نہ دیں۔ گہرا سناٹا چھا جائے۔ اندر بھی اور باہر بھی۔ اس کے سر میں اب بھی دھماکے ہو رہے تھے مگر وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی' یوں جیسے اس کے تحت الشعور میں کچھ ہو' جو نکلنے کو بے چین ہو۔

☆==========☆==========☆

نازاں کب چاچا کے پاس سے کمرے میں آئی' گھر میں کون کون تھا' چھیمو تھی یا خاچچی تھی۔ چاچی نے چاچا کو کیسے تسلی دی اور چاچا کو چین بھی آیا کہ نہیں' اسے کچھ بھی پتا نہیں تھا.......... وہ بالکل خالی الذہنی کی حالت میں بستر پر پڑا چھت کو تک رہا تھا۔ بستر ہلا تو اسے اتنا علم ہو سکا کہ نازاں لیٹ چکی ہے۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر چپ تھی۔ آنکھوں میں ہزاروں سوال مچل رہے تھے مگر گلو نے ان آنکھوں کو نظرانداز کر دیا.......... وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی جو اس کے اندر بھری وحشت کو بڑھاتی ہی چلی جا رہی تھی۔

"سو جاؤ گلو!" نازاں نے دھیرے سے کہا۔

"ہوں۔" گلو نے ہنکارا بھر کے فوراً ہی کروٹ لے لی.......... اس کی پشت پر نرم و نازک ہاتھ کا لمس محسوس ہوا تو اس نے کسمسا کر گویا اسے تنبیہ کی۔ نازاں نے ہاتھ ہٹا لیا.......... لائٹ بجھائی اور پتا نہیں سوئی کہ نہیں.......... گلو کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ گڈمڈ سوچوں کی لہریں سی دماغ میں اٹھتیں اور شعور تک آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتیں تو اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا' گویا پھانس سی چبھتی ہے' نکلتی ہی نہیں کہ بے چینی کو قرار آئے.......... پے در پے ہونے والے حادثوں نے اسے یوں بھی شل کر کے رکھ دیا تھا۔ جیسے کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

"گلو! او گلو!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک باہر سے چاچی کی آواز آئی.......... گلو جو پورے گھر میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا' اچھل پڑا.......... "میں دیکھتی ہوں۔" نازاں کی آواز سن کر گلو جانا کہ وہ جاگ رہی تھی۔

"جی چاچی!" نازاں نے پوچھا۔

"بٹوا تو نے کھانا نہیں کھایا.......... اور گلو نے بھی.......... رات کو بھوکے پیٹ نہیں سوتے' بڑھاپا جلدی آجاتا ہے۔"

"نہیں چاچی! مجھے ابھی بھوک نہیں ہے اور.......... گلو کو ہوتی تو وہ خود واویلا کر کے کھانا منگوا لیتا۔ مجھے اس کی عادت کا پتا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ چاچا نے کھالیا؟"

"وہ تو اب نہیں کھائے گا۔ جب تک وہ ہوش میں نہیں آئے گی۔" چاچی نے مایوس انداز میں سر ہلایا پھر چونک کر گلو کو دیکھا اور واپس پلٹ گئی۔

گلو کو پورا پورا احساس تھا کہ اس وقت چاچا کی کیا حالت ہو رہی ہوگی۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ چاچا جھاراں کو کس قدر چاہتا تھا' اسی کی خاطر اس نے ساری زندگی پھر کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ نازاں ایسی مجبور اور بے آسرا عورتیں تو اسے زندگی بھر ٹکرائی ہوں گی مگر اس نے ہمدردی کے نام بھی انہیں خود سے قریب نہیں کیا اور اب.......... اس عمر میں آکر اس کا یوں ملنا اور پھر بھی نہ ملنا.......... چاچا کو کتنا بے کل کر رہا تھا۔ اسے خوب اندازہ تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ "کاش! یہ نہ ملی ہوتی۔" بے ساختہ گلو کے دل میں خواہش نے جنم لیا۔

"پھر.......... پھر کیا ہوتا؟" اس نے خود ہی سوال کیا پھر جھنجلا گیا۔ زیبی کے ملنے اور پھر بھی نہ ملنے کا دکھ جھاراں کے ملنے اور یوں نہ ملنے میں مدغم ہو گیا تھا' وہی ابھرا رہتا.......... نازاں پھر بھی کونے کھدرے میں پڑی فضول سی چیز بنی رہتی۔ اس کے لمس نے اسے بے کل کرنے کی بجائے جھنجلا دیا تھا۔ نازاں کے لیے اس سے بڑا المیہ بھلا کیا ہوتا۔ اسے پھر اس سے ہمدردی محسوس ہوئی مگر ہمدردی کے لیے وقت بھی تو ہو.......... صبح سے رات تک جیسے ہنڈولے میں بیٹھا رہا تھا۔ گویا اب اترا ہو اور چکر تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ پوری دنیا گول گول گھومتی محسوس ہو رہی تھی۔

☆==========☆==========☆

دروازہ بند تھا۔ اندھیرا تھا۔ دور تک سناٹا تھا' شاید چاچا بھی رو رو کر تھک گیا تھا۔ رحمان چاچا اور چاچی جا تو نہیں سکتے اسے اس حال میں چھوڑ کر مگر چپکے ضرور پڑے ہوں گے.......... "اب کیا ہوگا" یہ سوال گلو کی طرح انہیں بھی ہولا رہا ہوگا؟ "اگر جھاراں مر گئی تو چاچا بھی مر جائے گا اور جیتی رہی تو چاچا کسی کام کا نہ رہے گا۔ وہ پھر اکیلا ہو جائے گا۔" گلو نے بڑی خود غرضی سے سوچا.......... نازاں کا اپنا پن پہلی بار پوری طرح وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے آیا۔ زیبی بدلی ہوئی تھی۔ اس کی تلاش میں بھی تھی تو بھلا اب کہنے سے کیا حاصل' اور وہ اب کیا کر سکتا تھا؟ اور پھر امام دین تو بھوت بن کر چمٹ گیا تھا۔ اس کی محبت کا علم نہ ہوتا اور نازاں کے لیے اس نے اتنے لیکچر نہ دیے ہوتے تو گلو میں بھلا کون سی خاص بات تھی۔ دو چار عشق یا دو چار شادیاں صرف روٹی' کپڑے کی فراوانی پر منحصر تھیں اور روٹی کپڑا اب اس کے لئے اتنا مشکل بھی نہ رہا تھا۔ وہ تو خود ہی اسماعیل کے پاس نہیں جا سکا تھا۔ اسے پتا ہی نہ تھا کہ گلو کی شادی ہے اگر پتا چل گیا ہوتا تو نوٹوں کی ایک گڈی تو وہ یونہی دے چکا ہوتا۔

"اسماعیل.........." گلو کو یوں لگا جیسے یہ سرگوشی اس کے باہر کہیں سے.......... شاید در و دیوار سے نکل کر چاروں طرف پھیلی ہو.......... وہ ایک دم بے چین ہو گیا۔

"اسماعیل راجہ.........." پھر تیز سرگوشی نے اسے پورا کا پورا لرزا دیا۔

"رحمان! وہ.......... وہ حرام زادہ راجہ ہی ہوگا۔" چاچا کی آواز کی بازگشت اس کے پاتال سے نکل کر جیسے پورے کمرے میں گونج گئی..........

"راجہ.......... ! اسماعیل راجہ..........!" وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی گونجنے لگیں پھر اچانک اسے یوں لگا جیسے وہ اسماعیل کے ڈرائنگ روم میں ہو اور باہر سے کوئی عورت چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو۔ "راجہ میں نے قسم کھائی ہے تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی مگر یہ بھی جان لے کہ تیرے سینے میں گولیاں اتار کر تیری موت کو آسان نہیں کروں گی۔ آگ بھردوں گی تیرے سینے میں۔ ایسی بھٹی سلگاؤں گی جیسے تو نے میرے سینے میں بھڑکائی تھی۔ تجھ سے تیرا سب کچھ چھین لوں گی' بالکل اسی طرح جس طرح تو نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میری شناخت' میرا گھر' میرے ماں باپ' میری محبت اور.......... میرا بچہ۔ جیسے تو نے میری کوکھ جلائی ہے راجہ' ایسے ہی میں بھی تیری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیوی کی کوکھ جلاؤں گی۔ تو نے میرے ننھے سے بچے کو چھینا ہے مگر میں.......... میں تیری جوان اولاد تجھ سے چھین لوں گی۔ میرا بچہ تو زندہ ہے راجہ.......... مگر.......... مگر تجھے تین جوان بیٹوں کے جنازے اٹھانا ہوں گے۔ سن رہا ہے تو؟"

گلو کا دم گھٹنے لگا.......... پسینا اس کے پورے بدن پر رینگ رہا تھا۔ اس نے ایک دم ہی قمیض اتار پھینکی۔ پنکھے کی اسپیڈ بڑھا دی۔ دروازہ کھول دیا مگر.......... گھٹن بڑھتی جارہی تھی۔ چیختی ہوئی عورت کی آواز اسے چاروں طرف گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا وہ جھاراں تھی؟" وہ بڑبڑایا۔ "کیا وہ اسماعیل وہی راجہ ہے.......... جو چاچا کی محبت کو گاؤں سے بھگا کر لے گیا تھا؟ اگر یہ جھاراں تھی تو.......... تو اس کا بچہ.......... کون سا بچہ تھا جو راجہ نے چھینا تھا؟ کس کا بچہ تھا؟ کیا چاچا کا؟" گھٹن اور بڑھ گئی..........

وہ گھبرا کر کھلے آنگن میں نکل آیا۔ چاچا ایک چارپائی پر سمٹا ہوا لیٹا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ جان نہیں پایا کہ وہ جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے۔ اس نے آنگن میں کھڑے ہو کر گہرے گہرے سانس لیے' وہ اپنے اندر کی گھٹن کو کم کرنا چاہتا تھا۔ مگر گھٹن اب بھی کم نہ ہوئی.......... اس کے اندر کا شور البتہ اچانک ختم ہو کر گہرے سناٹے میں ڈھل چکا تھا۔

"وہ شامیانے میں سے اندر جھانک رہی تھی۔" اچانک چاچا کی بات اسے یاد آگئی۔ چاچا' رحمان چاچا کو بتا رہا تھا۔

"وہ کسے جھانک رہی تھی؟" گلو نے اپنی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اپنے بالوں میں پھنسالیا.......... "کیا وہ چاچا کو تلاش کرتی ہوئی آئی تھی؟ پھر.......... پھر اس کا بچہ..........!!!"

"گلو!" گہرے سناٹے میں اس کی آواز کی گونج نے اسے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ نازاں تھی جو کسی سائے کی طرح اس کی پشت پر کھڑی تھی۔

"ہاں!"

"کیا بات ہے گلو! پریشان ہو!"

اس کے لہجے میں اتنی اپنائیت تھی کہ گلو کا دل بھر آیا۔ اپنے اندر اٹھتے طوفان کا مقابلہ کرتے کرتے وہ شل ہو چکا تھا۔ تنہا سب کچھ سہنا بڑا عذاب ہوتا ہے' یہ آج اسے پتا

چلا تھا۔ اس نے ایک دم ہی نازاں کا ہاتھ تھام لیا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر خود کو اکیلا کرلیا تھا۔ نازاں اس کے دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ زیبی تو وہ تھی جس نے اس کے خوابوں پر حکمرانی کی تھی مگر نازاں وہ تھی جس نے اس کا تھپڑ تک کھایا تھا۔ اس کی گالیاں سنی تھی جس نے اس کا تھپڑ تک کھایا تھا۔ اس کی گالیاں سنی تھیں' اس کی چیخ پکار اور ضد بحث برداشت کی تھی تو کبھی اسے روٹیاں پکا کر کھلائی تھیں۔ راتوں کو بیٹھ کر اس کے ساتھ مستقبل کے پروگرام بنائے تھے۔ اچھے گھر کی خواہش کا اظہار کیا تھا' اس سے روٹھی اور منانے پر من گئی تھی۔ زیبی کا دھندلا چہرہ اس کے لاشعور میں بسا تھا تو نازاں مجسم اس کے ساتھ تھی۔

"نازاں..........!!" اس نے غیرارادی طور پر اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ "میں بہت پریشان ہوں۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

نازاں اسے لیے کمرے میں چلی آئی اور تب گلو نے سب کچھ کہہ دیا۔ جھاراں کے بارے میں اسماعیل کے بارے میں' اپنے تمام خدشات کا اظہار کر گیا مگر زیبی سے متعلق الجھن پھر بھی نہ بتا سکا کہ وہ نازاں کی فطرت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نازاں کو پتا چلا تو وہ بڑا واویلا مچائے گی۔

"وہ گاڑی.......... وہ گاڑی نازاں میں نے دیکھی تھی' تبھی سے ایک چبھن تھی.......... کچھ تھا جو مجھے اندر ہی اندر بے چین کیے ہوئے تھا مگر میں اس وقت سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ گاڑی میں نے کہاں دیکھی ہے مگر اب.......... مجھے یقین ہے کہ.......... کہ یہ وہی اسماعیل راجہ ہے.........."

"یہ ضروری تو نہیں گلو!" نازاں نے دھیرے سے اس کے ہاتھ کو سہلایا' وہ اس کے ابال کو ختم کرنا چاہتی تھی.......... وہ جانتی تھی کہ گلو مشتعل ہو تو اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ایک دم ختم ہو جاتی ہیں۔ "تصدیق کیے بنا کوئی قدم نہ اٹھانا.......... ممکن ہے یہ غلط ہو' ایک جیسی ہزاروں گاڑیاں ہیں۔"

"مگر وہ عورت.......... وہ جو اسماعیل کے گھر میں.........."

"یہ اتفاق بھی ہو سکتا ہے گلو! غریبوں کے سارے دکھ اور سارے سکھ ایک جیسے ہوتے ہیں جیسے امیروں کے سارے ظلم.......... وہ کوئی اور عورت بھی ہو سکتی ہے' اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنو!! اگر وہ جھاراں تھی تو چاچا اس کے بچے کو جانتا ہوگا.......... اس سے پوچھ یا جھاراں کے ہوش میں آنے کا انتظار کر۔"

"نازاں کتنی عقل مند ہے" گلو نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھ کر سوچا۔

"واقعی.......... چاچا کو تو پتا ہوگا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ وہ کھڑا ہوگیا۔

"کہاں جارہا ہے؟" نازاں گھبرا گئی۔

"آں.......... ہاں.......... میں؟" وہ عجیب سے الجھے ہوئے انداز میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ "نازاں.......... میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

نازاں نے اس کی کشادہ پیشانی پر چمکتے ہوئے پسینے کے قطروں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے صاف کیا' دھیرے سے مسکرائی جیسے اسے تسلی دے رہی ہو۔ اس کی ڈھارس بندھا رہی ہو۔ اس کو گلو کے سب کچھ کہہ دینے پر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ یوں لگا تھا جیسے واقعی اب وہ گلو کی ہو' اس کے دکھ سکھ کی ساتھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا.........." اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر دھیرے سے دباؤ ڈالا۔ "بس اب تو یہ دعا کر کہ جھاراں بچ جائے۔ ورنہ چاچا تو.......... چاچا تو مر ہی جائے گا.........."

"ہم.......... کتنے بے بس ہیں نازاں.......... اس دنیا میں کچھ بھی ہمارے لیے نہیں' کوئی بھی ہمارا نہیں' نہ چاچا کا کوئی ہے نہ جھاراں کا' جو تھا چھین لیا گیا' نہ تیرا کوئی ہے نہ میرا کوئی اور جو میرا کوئی تھا' وہ بھی چھین لیا گیا۔"

"تیرا.......... تیرا کون چھن گیا گلو!"

تلوار کی سی کاٹ تھی جس نے گلو کا کلیجہ چھلنی کر دیا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ حالات نے اس کی ماں اور باپ کو تو چھینا ہی تھا مگر اس کی ہمدردی نے اس کا پیار بھی چھین لیا ہے۔ وہ چہرہ جو جانے کب سے اس کے ساتھ تھا' وہ مدھم جذبے جو اس کے اندر زندگی کی حرارت کو قائم رکھے ہوئے تھے' سبھی کچھ تو چھن گیا۔

وہ کچھ نہ بولا تو نازاں بھی یوں چپ ہوگئی جیسے اب کبھی بھی نہ بول پائے گی' وہ تو گلو کو اپنے دکھوں میں شریک بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چھیننے والے نے تو اس سے اس کی عزت چھینی تھی' اس کا مان چھینا تھا' اس کا غرور چھینا تھا۔ قوت گویائی تک چھین لی تھی کہ

نہ وہ بین کر سکتی تھی نہ اپنا دکھ کسی کو بتا سکتی تھی۔ اسے تو اب تمام زندگی اسی گہری چپ کے ساتھ جینا تھا۔

بے چینی گلو کے اندر ابھر کر ڈوب رہی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے کھڑا ہو جاتا' ٹہلتا' دروازے کو تکتا جیسے باہر نکلنے کے لیے روزن تلاش کر رہا ہو پھر کچھ سوچ کر نڈھال ہو جاتا' دیوار تھام لیتا یا مسہری کا سرہانہ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا پھر بیٹھ جاتا۔

"سویرا ہونے والا ہے گلو! کچھ دیر کو لیٹ جاؤ۔" نازاں نے بڑی ہمت کر کے خود کو قابو میں کیا اور بولی۔

اور وہ یوں لیٹ گیا جیسے اس کے لیٹتے ہی سویرا ہو جائے گا اور وہ اسپتال جا کر جھاراں کو منٹوں میں ہوش میں لے آئے گا پھر جھاراں سے پوچھے گا کہ وہ راجہ کون تھا جو اسے چاچا سے چھین کر لے آیا تھا' اور کیا اس کا کوئی بچہ بھی تھا؟ اگر تھا تو کہاں ہے اور جیسے وہ سب کچھ بتادے گی.......... سب کچھ صاف ہو جائے گا۔ کچھ الجھن نہ رہے گی اور خدا اچانک اس گھر پر خوشیوں کی برسات کر دے گا.......... ساری دنیا بدل جائے گی' بستی کی ساری کوری آنکھیں اپنے اندر سجے خوابوں کی سب سچی تعبیریں پالیں گی اور پھر.......... پھر.......... ؟

وہ جاگتا رہا۔ نیند جانے کہاں چلی گئی تھی۔ باہر گہرے سناٹے میں ہلکی ہلکی سسکیاں گونجتی سنائی دے رہی تھیں اور وہ بالکل بے حس پڑا سوچ رہا تھا' کیا چاچا بھی جاگ رہا ہے اگر نہیں تو پھر یہ سسکیاں کس کی ہیں؟ نازاں تو شاید سوچکی تھی یا بے حس و حرکت لیٹی تھی۔ اس کی تو سہاگ راتیں عذابوں میں لپٹی ہوئی آئی تھیں۔ گلو کے جذبے جیسے چھیمو کے ساتھ ہی رخصت ہوگئے تھے یا حادثوں نے ان پر برف جمادی تھی' بڑی ٹھنڈک تھی مگر نازاں کا لمس حرارت آمیز تھا.......... اس کے برابر لیٹی نازاں میں سے جیسے لپٹیں اٹھ رہی تھیں جو اس کے بدن سے اٹھتی برفیلی بھاپ سے ٹکرا کر اپنی ساری حرارت کھو دیتی تھیں۔ اس ٹھنڈی بھاپ اور اٹھتی لپٹوں کے درمیان کہیں چھیمو کی پائل کی طرح بجتی ہنسی تھی یا زیبی کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی نمی مگر یہ دونوں ہی گلو تک آتے آتے منجمد ہو جاتی تھیں۔

بس ایک بے بس' ایک بے چارگی اور عجیب سی بے کلی تھی جو اس کے سر سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے کر پیر تک سارے وجود میں سرسراتی پھر رہی تھی۔

☆==========☆==========☆

امام دین وہیں تھا۔ زیبی نے کہا کہ وہ چلا جائے مگر ایک الاؤ تھا جو اس میں دہک رہا تھا۔ وہ کسی پہرے دار کی طرح وہیں کاریڈور میں بیٹھا ہر آنے جانے والے کو یوں گھور رہا تھا جیسے وہ زیبی کو لوٹنے آیا ہو۔ زیبی اسے چپ پاکر اندر چلی گئی تھی۔ اس کے سامنے سفید بستر پر ایک بے جان عورت پڑی تھی جس کی سانسوں کا زیروبم اسے زندہ ثابت کر رہا تھا مگر اس کے سوا اس میں زندگی کے کچھ آثار نہیں تھے۔ اس کے سرہانے ٹی وی اسکرین کی طرح کئی مشینیں لگی تھیں.......... کئی تار ان مشینوں سے نکل کر اس بے جان وجود پر پڑی چادر کے اندر کہیں غائب ہوگئے تھے۔ دو نلکیاں اس کے نتھنوں کے اندر جارہی تھیں۔ بازو میں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ بے جان ہاتھ چادر سے باہر نکلا ہوا تھا۔ کچھ دور بنے شیشے کے کمرے میں دو ڈاکٹرز تھے جو ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کچھ اچک کر مریضوں کی طرف کم اور مشینوں کی طرف زیادہ دیکھتے تھے۔

آئی سی یو کے یہ وارڈ ایک لمبے سے ہال میں بنے ہوئے تھے۔ اس ہال میں کل آٹھ کیبن تھے جن میں چار خالی تھے اور ان چاروں خالی وارڈز کے جھرے ہوئے بستر اور تنی ہوئی سفید براق چادر دیکھ کر زیبی کو یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں سے جانے والے سیدھے موت کی وادی کی طرف گئے ہیں' جیسے موت اپنے عکس ان سفید چادروں پر چھوڑ گئی تھی۔ غیر مرئی سی ٹھنڈک تھی جو ان بستروں سے اٹھ کر چاروں طرف پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔

زیبی کو یقین تھا کہ وہ جس بستر کے پاس بیٹھی ہے' اس سے اٹھتی حرارت کی یہ مدھم لہریں کسی بھی وقت ایسی ہی یخ کر دینے والی ٹھنڈک میں تبدیل ہو جائیں گی۔ چھوٹے چھوٹے اسکرین پر جلتی سرخ اور ہری روشنیاں اچانک ساکت ہو جائیں گی اور.......... اور یہ گہرا سناٹا' بے پناہ شور میں تبدیل ہو جائے گا.......... اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ جھاراں چاچا کی عزیز ترین ہستی ہے اور شاید یہ گلو کی بھی.......... یہ خیال آتے ہی اس نے اس عورت کے سپاٹ چہرے پر نگاہیں جمادیں..........پینتالیس چھیالیس برس کی وہ ایک خوبصورت عورت تھی۔ ممکن ہے عمر دو چار سال اور بڑی ہو مگر لگتی نہیں

تھی۔ اس کی بند سیاہ پلکیں ساکت تھیں اس کے زرد چہرے پر بلا کی معصومیت اور سادگی تھی۔ اس کے ہونٹ.......... ارے ہاں.......... یہ ہونٹ.......... ناک اور.......... ٹھوڑی.......... ٹھوڑی کے بیچوں بیچ ہلکا سا گڑھا۔

"میں نے شاید اسے دیکھا ہے۔" وہ بے ساختہ بول اٹھی.......... اس نے اتنی دیر میں پہلی بار اسے گہری نگاہ سے دیکھا تھا۔ "کہاں..........؟" وہ دیر تک سوچتی رہی مگر یوں لگا جیسے ذہن بالکل صاف ہو.......... سوچا نہیں گیا بلکہ کوئی خیال ابھرا ہی نہیں.......... سپاٹ سا رہا ذہن۔

پھر جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ کتنی اکیلی ہے یہ عورت!! میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں' جس سے اس کا رشتہ ہے وہ.......... وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کیا چاچا اسے یہاں یوں چھوڑ کر چین سے سویا ہوگا؟

"بی بی آپ.........."

اچانک آواز سن کر وہ اچھل پڑی۔ سامنے ڈاکٹر کھڑا تھا۔ "جی.......... جی ڈاکٹر؟"

"آپ کچھ دیر کو ریسٹ کرلیں۔ بہت دیر سے بیٹھی ہیں۔ آپ چاہیں تو اس بستر پر لیٹ سکتی ہیں۔" اس نے برابر والے وارڈ کے خالی اور ٹھنڈے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

زیبی کی ریڑھ کی ہڈی میں لہریں سی اٹھنے لگیں۔ "نن.......... نہیں جی.......... میں ٹھیک ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

ڈاکٹر نے جواب دیئے بغیر خالی ہو جانے والی ڈرپ نکال کر دوسری ڈرپ لگا دی۔ زیبی کا جی چاہا کہ کہے' اسے زبردستی کیوں زندہ رکھ رہے ہو۔ یہ یوں تنہا' اکیلی اور بھلا کب تک جئے گی! مگر اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ اپنا اکیلا پن اور جینے کے ہزار بہانے یاد آگئے تھے۔ موت کا یہ خوف جو چند لمحے پہلے اس کے بدن میں سرد لہر کی طرح دوڑ گیا تھا پھر یاد آگیا۔

امام دین نے جھاراں کے بارے میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو اسے گلو مختصر عرصے میں بتا چکا تھا۔ وہ بس اتنا تھا کہ چاچا کی منگ تھی جسے گاؤں کا بدمعاش راجہ اغوا کرکے لے گیا تھا۔ زیبی کو جانے کیوں وہ عورت جانی پہچانی سی لگ رہی تھی' یوں جیسے وہ اسے جانتی ہو۔ اس سے مل چکی ہو۔ ذہن ماضی کی طرف سفر کر رہا تھا۔ وہ بستی کی ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلیوں میں پہنچ چکی تھی جہاں وہ اپنی مامی سے مار کھانے کے بعد ساری دوپہر جلتی پھرتی تھی۔ ان دنوں وہ جانے آس پاس سے گزرنے والے چہروں میں کیا تلاش کرتی تھی اور جب وہ ایک سلگتی دوپہر میں بھاپ اڑاتی سڑک کو عبور کرکے اس ٹھنڈے چبوترے پر جا بیٹھی تھی جہاں گھنا پیڑ اپنے سائے پھیلائے کھڑا تھا تب..........

"سنو!" اس نے لپٹی ہوئی چادر کو ماتھے سے اونچا کرکے اس آواز کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سامنے کھڑی تھی۔ "یہاں.......... اس چبوترے پر ایک لڑکا ہوتا ہے ناں!"

اور اسے یاد آ گیا۔ وہ اکھڑ سا' ناراض ناراض سا لڑکا جسے وہ بھی کئی بار دیکھ کر سوچ چکی تھی کہ اس سے دوستی کرلے۔ وہ بھی بھری دوپہر میں اکیلا چبوترے پر پریشان بیٹھا رہتا اور پیڑ پر بنے گھونسلے میں رہنے' ایک دوسرے سے لڑنے اور پیار کرنے والی چڑیوں کو تکا کرتا تھا۔ خود اسے بھی چڑیوں کا یہ خاندان کتنا اچھا لگتا تھا۔ وہ بھی دیکھتی تھی پھر جب اس نے اس سے دوستی کرنے کے لئے اس کے قریب جانے کی کوشش کی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے چبوترے پر جا لیٹی تھی تو اس نے کتنے غصے میں اسے اٹھا دیا تھا۔

"سنو بیٹا! میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔" اس عورت نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا۔

وہ محبت بھرا لہجہ' وہ پیار بھرا انداز اس کے حلق کو نمکین کر گیا تھا۔ "وہ.......... وہ یہاں تھا' پتا نہیں کہاں گیا۔" اس نے جواب دیا تھا پھر کتنی ہی دیر تک وہ اس لنگڑی عورت کو یہاں وہاں پریشان پھرتے دیکھتی رہی تھی اور جب وہ ہاتھ میں کاغذ کا تھیلا لئے چبوترے پہ آیا تھا اور اس تھیلے سے بن کباب نکال کر کھا رہا تھا' وہ یونہی دور بیٹھی سوچتی رہی تھی کہ وہ اسے بتائے' ایک بہت اچھی سی عورت اسے تلاش کر رہی ہے مگر اس کی آنکھوں میں اتنا غصہ ہوتا تھا کہ اس کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی مگر پھر بھی.......... جانے کیا بات تھی' وہ اسے اچھا لگتا تھا۔

اسے ڈانٹنے کے بعد اس کی آنکھوں میں ہمیشہ ندامت ہی محسوس ہوئی تھی مگر پھر وہ کبھی اس کے اتنے قریب نہیں گئی تھی۔ ہر دوپہر آ کر وہ اس دیوار کی آڑ میں بیٹھ جاتی' اسے چڑیوں کے گھونسلوں کی طرف تکتے دیکھتی اور پھر مامی کے ڈر سے گھر چلی جاتی تھی۔

اگلے روز پھر آنے کے لئے پھر اچانک ہی اس نے وہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا وہ.......... ہر گزرنے والے پل نے جہاں اس کے عذابوں میں اضافہ کیا تھا وہاں اس لڑکے کا چہرہ اس کے ذہن میں یوں جما رہا تھا کہ باوجود ہزار کوشش کے وہ اسے ذہن سے نہ نکال سکی اور شعور کی پہلی منزل پر ہی اسے احساس ہو گیا کہ بلا کی اجنبیت لئے ہوئے اپنا اپنا سا وہ شخص بڑا گہرا تاثر چھوڑ گیا تھا اور پھر.......... سارے فیصلے اس کے حق میں ہوتے رہے' اس کے نہ ملنے اور اسے نہ پانے کے یقین کے بعد بھی اس نے ہمیشہ خود کو اسی کا منتظر پایا تھا۔ وہ ملا اور.......... یوں کہ انتظار کے سارے کرب' گرداب بن کر اسی میں بھنور ڈالتے رہے۔ سارے یقین گمان میں بدل گئے۔ ایثار اور قربانی پھر منہ کھولے کھڑی تھی۔ امام دین کے ایثار نے اس کے اندر نرماہٹ کی انتہا نہ کر دی ہوتی تو اتنی خود غرضی تو وہ بھی دکھا سکتی تھی کہ ساری دنیا سے اسے چھین لیتی مگر.......... امام دین لوہے کی دیوار بنا کھڑا تھا۔ "مگر یہ عورت.........!" زیبی نے پھر چونک کر اس ساکت وجود کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اسے لگا جیسے اس کی پلکیں لرزی ہوں۔ وہ ٹھٹکی.......... ذرا سا آگے جھکی۔ اس نے اس کے سرد ہاتھ کو ہلکے سے چھوا' ہولے سے کانپتا ہاتھ اسے اپنا وہم لگا۔ پلکیں شاید پھر لرز رہی تھیں۔ وہم یقین میں بدلنے لگا۔ وہ دوڑ کر ڈاکٹرز روم میں پہنچ گئی۔

"وہ.......... وہ ہوش میں آ رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے چونک کر اسے دیکھا اور اسٹیتھو اسکوپ اٹھا کر اس کے ساتھ تیز قدموں سے اس کیبن میں آ گیا۔ وہ پھر ساکت تھی مگر اس بار سانس کی مدھم رفتار کچھ بڑھ گئی تھی۔ زیبی کی نگاہیں اس کے ساکت چہرے سے ہوتی ہوئی ڈاکٹر کے چہرے پر جا ٹھہریں۔ اس کے چہرے پر مایوسی نہیں' امید کی رمق تھی جو آہستہ آہستہ مسکراہٹ بن کر اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"یہ ہوش میں آ رہی ہیں۔ پلیز آپ یہیں رہیں' میں ڈاکٹر زیدی کو اطلاع کرتا ہوں۔" وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

زیبی یہ اطلاع جلد از جلد باہر چوکیداری کرتے ہوئے امام دین کو دینا چاہتی تھی مگر ڈاکٹر نے اسے وہیں رہنے کی تاکید کی تھی۔ پانچ منٹ' پانچ گھنٹوں کی طرح گزرے۔ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈاکٹر زیدی کو اطلاع کرکے واپس آچکا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی جھاراں کے زرد چہرے پر جمی تھیں۔ چہرے پر جوش کے آثار تھے۔ وہ بار بار گھڑی کی جانب بھی دیکھ رہی تھی۔ اسی دوران میں زیبی نے جھاراں کی پلکوں کی لرزش کو صاف محسوس کیا۔ سپاٹ چہرے پر کرب کا سایہ گہرا ہوگیا۔ ایک دوسرے میں پیوست ہونٹ دھیرے سے علیحدہ ہوگئے تھے اور پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

زیبی اس پر جھک گئی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

لمحہ بھر کو سپاٹ آنکھوں میں ایک لہر سی اٹھی۔ پلکیں لرزیں، پھر بند ہوگئیں۔ یک بیک اس نے چونک کر پھر آنکھیں کھول دیں۔ ڈاکٹر اس دوران مشینوں کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر دائیں بائیں دیکھا، شاید وہ اندازہ لگانا چاہ رہی تھی کہ وہ کہاں ہے۔

”آپ اسپتال میں ہیں۔“ زیبی نے اس کی مشکل آسان کردی۔

”تت.......... تم..........!“

”میں زیبی ہوں۔ گلو کی..........“ وہ گڑبڑا کر خاموش ہوگئی۔ ”گلو.......... اور چاچا میرے جاننے والے ہیں۔“

اس نے دھیرے سے کہا۔

”گلو..........!!“ ایک سسکی تھی، کراہ تھی جو اس کے ہونٹوں سے آزاد ہوئی۔

”کہاں ہے وہ؟“

”وہ.......... گھر چلا گیا..........“

گہری مایوسی نے اس کے زرد چہرے کو تاریک کردیا۔ کرب اس کی آنکھوں میں سمٹ کر پانی کے قطرے میں ڈھل گیا۔

”پلیز.......... آپ ڈسٹرب نہ کریں۔“ ڈاکٹر اب ان کی طرف متوجہ تھا۔

زیبی دھیرے سے سیدھی ہوگئی۔ ڈاکٹر اس کا چیک اپ کرنے لگا۔ جھاراں پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی پھر وہ ہر تھوڑی دیر بعد چونک اٹھتی تھی۔ آنکھیں پوری کھول کر چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کرتی تھی پھر بوجھل پلکیں گرتیں اور گردن ڈھلکنے لگتی۔

عین اسی لمحے سینیئر ڈاکٹر چلا آیا۔ ان لوگوں نے زیبی سے باہر جانے کو کہا۔ زیبی باہر آکر امام دین کو تلاش کرنے لگی۔ وہ کوریڈور میں نہیں تھا۔ وہ وہیں بنچ پر بیٹھ گئی۔ اسے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ بقول امام دین، جھاراں چاچا کی منگ تھی، اس سے بچھڑ گئی تھی۔ اس کی تلاش میں چاچا نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ اب اتنے عرصے بعد ملی بھی تو.......... تو اس نے چاچا کی بجائے گلو کو کیوں پوچھا.......... یہ سن کر کہ وہ گھر جاچکا ہے، اسے کیوں اس قدر دکھ ہوا۔ ”اس نے چاچا کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا؟“ یہ سوال اسے مسلسل پریشان کر رہا تھا۔

اسے پھر اس کا چبوترے کے آس پاس گھومنا اور اس لڑکے کے بارے میں پوچھنا یاد آگیا۔ ”کیا گلو..........!!!“

”کیا ہوا؟“ امام دین نے اس چونکا دیا۔

”کک.......... کچھ نہیں.......... ہاں.......... وہ ہوش میں آگئی۔“ زیبی گڑبڑا گئی۔

”کیا؟“ امام دین نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔

”ہاں.......... اس نے بات بھی کی تھی۔ گلو کے لئے پوچھا تھا۔ ماے.......... اس نے گلو کے لئے کیوں پوچھا۔ چاچا کو کیوں نہیں پوچھا؟“ اس سے برداشت نہ ہوا۔

الجھن امام دین کی آنکھوں میں بھی تیر گئی مگر اس سوال کے جواب کو تلاش کرنے سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ ہوش میں آگئی تھی۔ وہ، جس کے بچنے کی کسی کو بھی امید نہیں تھی۔ ”اچھا سنو! تم یہاں مت بیٹھو۔ اندر جاؤ میں جاکر چاچا کو خبر کرتا ہوں۔“

”ہاں، تم جاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔“

”نہیں.......... تم اندر جاؤ۔ باہر مت آنا جب تک ہم واپس نہ آجائیں۔“ اس کے انداز میں بھری وحشت زیبی کو عجیب سی لگی۔ وہ پھر رکا نہیں، تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

☆==========☆==========☆

صبح کی پہلی کرن جیسے چاچا کی کرب آمیز سسکی سے طلوع ہوئی تھی۔ گلو سویا کب تھا، نیند اور بیداری کے بیچ کہیں معلق تھا۔ چاچا کی سسکی نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ نازاں سوچکی تھی۔ وہ دھیرے سے باہر چلا آیا۔ آسمانوں کے کنارے دودھیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو چکے تھے۔ آنگن میں اندھیرا تھا پھر بھی گلو کو چاچا صاف نظر آگیا جو چارپائی پر دونوں ٹانگیں لٹکائے' سر کو ہاتھوں میں تھامے یوں بیٹھا تھا جیسے اس کا سب کچھ لٹ گیا ہو۔ گلو کا کلیجہ کٹ سا گیا۔ اس نے بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی اسے یوں ہارا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

"چاچا!!" وہ اس کے قریب زمین پر بیٹھ کر اس کے گھٹنے کو چھوتے ہوئے پکارا۔

"آں.......... ہاں.......... !!" چاچا نے چانک کر سر اٹھایا۔

گلو نے دکھائی نہ دینے کے باوجود جان لیا کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہے' اپنا ہاتھ اس کے چہرے پر پھیرا تو اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ "چاچا! رونے سے کیا ہوگا' دعا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔"

"وہی تو کر رہا ہوں گلو! اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ گلو! تجھے.......... تجھے نیند آگئی تھی؟ کیسے سو گیا تو؟ تیرے اندر کہیں طوفان نہیں اٹھے۔ تیرا دل کسی لمحے نہیں گھبرایا' تو نے اس کے لئے دعا نہیں کی؟"

"کی تھا چاچا.......... نیند بھی نہیں آئی' دل کی گھبراہٹ نے سونے ہی نہیں دیا۔"

چاچا جو اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لئے اسے وحشت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا' یوں خوش ہوگیا جیسے یہ سب گلو نے نہ کہا ہوتا تو بڑا گناہ ہو جاتا' جیسے اس کا گھبرانا' دعا کرنا اور نہ سونا اس کا فرض ہو۔

"تیرا دل کیا کہتا ہے گلو! وہ ٹھیک ہو جائے گی ناں؟"

اس نے سرسراتے انداز میں پوچھا۔ جیسے کوئی نجومی سے مستقبل کا حال پوچھتا ہے۔

گلو نے اپنی دل کو ٹٹولا۔ بڑا اطمینان سا پھیلا محسوس ہوا تھا اسے' یوں جیسے کچھ بھی غیر معمولی نہ ہوا ہو اور کچھ ایسا ہونے والا بھی نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو.......... کہیں کوئی گڑ بڑ نہ ہو۔

"بول گلو! تیرا دل کیا کہتا ہے؟ بول گلو!" چاچا بے چینی سے اس کے کاندھے ہلا رہا تھا جیسے اس کے منہ سے نکلنے والا ہر حرف سچا ہوگا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا چاچا.......... وہ.......... اگر تیری قسمت میں ہے تو ٹھیک

ہو جائے گی۔" گلو کا جی تو چاہا تھا کہ پورے یقین کے ساتھ کہہ دے کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی اس لئے کہ میرے دل میں کہیں کوئی بے چینی نہیں ہے۔ وہ بے چینی جس نے تمام رات مجھے سونے نہیں دیا مگر پھر بھی وہ چاچا کو یقین کے اس عروج پر لے جانا نہیں چاہتا تھا جہاں سے کوئی بھی المیہ اسے موت کی وادی میں دھکیل دے۔

"یا اللہ.......... ! یا اللہ! میری نہیں تو اس معصوم کی سن لے' اسے کس بات کی سزا دے رہا ہے میرے رب.......... ! اسے تو اس کا پیار دے دے۔"

چاچا ایک دم رو پڑا اور گلو حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا' کس کا پیار کسے دینے کی التجا کر رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ چاچا سے پوچھے مگر اس کی حالت ایک دم ہی بگڑ گئی تھی۔ آنسو دریا کی طرح بہہ نکلے تھے۔ گلو حیران تھا کہ خشک ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آنے والا کتنے سمندر سموئے بیٹھا تھا۔

"چاچا.......... میں نے کہا کہ وہ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی۔ اب بس کر.......... میں تیرے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ اب اگر تو رویا تو.........."

اور چاچا نے ایک دم ہی آنسو خشک کر لئے۔ "مجھے.......... مجھے یقین ہے گلو کہ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ اب اسے ٹھیک ہو ہی جانا چاہیے۔ اب بھی اگر وہ ٹھیک نہ ہوئی گلو تو.......... تو میں اس پوری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔" وہ اچانک بپھر گیا تھا۔ "ختم کر دوں گا سب کچھ.......... کیا فائدہ ایسی دنیا کا گلو جہاں رشتوں کی سچائیاں جھوٹ کے مکرو جال میں پھنسی ہوں۔ جہاں نہ باپ بیٹے کو اپنا کہہ سکے نہ ماں' جہاں نہ بیٹا ماں کو جان سکے نہ باپ کو' رشتے اتنے بے حیثیت نہیں ہوتے گلو' رشتے ہم نے نہیں بنائے ہیں گلو' یہ خدا نے بنائے ہیں۔ انہیں بنا رہنا چاہیئے' انسان انہیں مٹانے والا کون ہوتا ہے' وہ کون ہوتا ہے جو ماں کو بچے سے اور بچے سے باپ کو چھین لے۔"

گلو اب بھی حیران تھا۔ چاچا کی باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ صرف اتنا احساس تھا کہ اندر کا طوفان نکل رہا ہے۔ وہ اسے سنبھالے رہا۔ نازاں اس کی آواز سن کر باہر آ گئی تھی۔ وہ بھی چاچا کے کاندھے تھامے نم آنکھوں کو رگڑ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے چاچا! اٹھ چلتے ہیں۔ دیکھ' اب تو سویرا ہو گیا۔" گلو نے اسے کھڑا کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے چین نہیں آئے گا۔ جانے ساری رات کیا کیا سوچتا رہا تھا' دماغ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کیا کچھ بھرا تھا جس نے اسے باؤلا کر دیا تھا۔

جانے کا سنتے ہی وہ آستین سے آنسو صاف کر کے کھڑا ہو گیا۔ نازاں اتنی دیر میں چائے بنا لائی۔ رحمان چاچا اور چاچی جو رات گئے گھر چلے گئے تھے' سویرے ان کے چائے پینے کے دوران ہی آ گئے۔ چاچی کافی فکر مند تھی۔ وہ سب لوگ جانے کو تیار ہوئے تو نازاں نے بھی چادر اوڑھ لی۔

"تو کیا کرے گی؟" گلو بول اٹھا۔

"میں.......... میں بھی جاؤں گی۔"

"نہیں.......... بلاوجہ وہاں پریشان ہو گی۔" گلو نے صاف انکار کر دیا۔ نازاں روہانسی ہو گئی۔

"میں یہاں اکیلی رہوں گی کیا؟"

"کیوں.......... یہ جنگل ہے کیا؟" گلو جانے کیوں چڑ گیا۔

"اچھا بیٹا بحث نہ کر۔" چاچی نے گلو کو روک دیا۔

"نازاں!" وہ نازاں سے مخاطب ہوئی۔ "بیٹا تو گھر دیکھ' دعا کر کہ وہ ٹھیک ہو پھر اپنی حالت دیکھی ہے تو نے؟ اب تک آرام نہیں ملا۔ کچھ دیر سو لے۔ رات بھر جاگی ہے ناں! آنکھیں لال ہو رہی ہیں۔" چاچی اسے بہلا رہی تھی اور گلو چاچا کو سہارا دے کر باہر جا رہا تھا۔

جانے چاچی نے نازاں کو کیا کہہ کر روکا مگر گلو مطمئن ہو گیا۔ وہ جانتا تھا نازاں نے اب تک ایک پل بھی سکون سے نہیں گزارا۔ اب بھی اس جھاراں سے اس کا کیا رشتہ تھا' وہ تو چاچا سے رشتہ نبھانے کو وہاں جا رہی تھی۔ وہاں پریشان ہی ہوتی اور پھر وہاں زیبی بھی تو تھی۔ پتا نہیں کیوں گلو نہیں چاہتا تھا کہ نازاں وہاں ہو جہاں زیبی ہو۔ وہ لوگ اسپتال کے لئے روانہ ہوئے تو نازاں دروازے میں کھڑی تھی۔

"دروازہ بند کر لے۔" گلو پکارا اور نازاں نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا۔

☆==========☆==========☆

وہ بیٹی' سورج کی چند کچی کرنیں دیوار کے پار سے جھانک رہی تھیں۔ آنگن میں چھایا اندھیرا ملگجا سا ہو گیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر باورچی خانے کی بتی بجھا دی اور چاچا

کے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ جب سے وہ اسپتال سے آئی تھی ایک پل کو بھی سکون نہیں ملا تھا۔ وہ جو گلو کو پانے کی خوشی تھی' وہ اسے دھوکا دینے کے غم نے چھین لی تھی۔ اس کے اندر پلنے والا گناہ اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ امام دین نے اسے قسم نہ دی ہوتی تو وہ شاید اب تک زہر کھا کر مر چکی ہوتی مگر نہیں.......... شاید وہ ایسا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ گلو کو پانے کی آرزو نے ہی اسے ایک دم اتنا نرم کر دیا تھا ورنہ اپنے کئے ہوئے فیصلے پر عمل کرنا اس کے لئے اتنا مشکل بھی نہ تھا' کہ یا تو مر جائے یا شہر ہی چھوڑ دے۔

اور جب گلو کی اپنی ہو گئی تو لگا جیسے اس کے اور گلو کے درمیان کے فاصلے سمٹنے کی بجائے اور پھیل گئے ہوں۔ کچھ اس کا ضمیر اسے قریب نہیں ہونے دے رہا تھا اور کچھ گلو ہی کھنچا کھنچا سا تھا۔ نازاں خود چور نہ ہوتی تو شاید اس کھنچاؤ پر گلو کی جان کھا جاتی' چاچا سے شکایت کرتی' اس سے لڑتی' رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتی مگر.......... اسے تو یوں لگتا تھا جیسے اب وہ گلو کے سامنے کھل کر ہنس پائے گی نہ رو پائے گی۔

"یااللہ! اس حرام زادے کو ایسی سزا دینا کہ.........." اس درندے کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔ جتنے بھی آنسو رکے ہوئے تھے بہ نکلے۔ وہ جی بھر کر روئی' کوئی دیکھنے اور ٹوکنے والا جو نہ تھا اور جانے کب تک روتی رہتی اگر دروازے پر گاڑی کے رکنے کی آواز کے ساتھ ہارن کی اور پھر دستک کی آواز نہ سنائی دیتی۔

اس نے جلدی سے چادر کے کونے سے آنسو صاف کئے۔ چادر کو سر پر ایسے اوڑھا کہ آنے والا یہ نہ جان سکے کہ وہ رو رہی تھی۔ دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر اس نے جھانکا۔ باہر سفید وردی میں ملبوس ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے سفید رنگ کی کار تھی۔ کار میں پچھلی سیٹ پر دو آدمی بیٹھے تھے۔

"جی!!" اس نے سامنے کھڑے آدمی کو دیکھ کر خود کو دروازے کی آڑ میں کر لیا۔

"گلو ہے جی!" آنے والے نے پوچھا۔

"جی.......... وہ تو نہیں ہیں۔"

"اچھا جی! اگر آئے تو کہنا' اسماعیل صاحب آئے تھے۔" اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "اسے شادی کی مبارکباد دینے۔ اسے کہئے گا شام کو چکر لگا لے' ضروری کام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"جی اچھا۔" نازاں نے جواب دے کر دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکا۔ آنے والا غالباً ڈرائیور تھا۔ وہ پلٹ گیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمیوں سے کچھ کہا پھر گاڑی کو ریورس کیا۔ نازاں دروازہ بند کرنے ہی والی تھی کہ اس کی نگاہ اندر بیٹھے دونوں آدمیوں پر پڑی جو اب اسے صاف نظر آرہے تھے۔ لمحہ بھر کو اسے یوں لگا جیسے وہ خواب دیکھ رہی ہو مگر جونہی گاڑی قریب آکر مڑی' وہ اچھل پڑی اور پھراسے خود کو سنبھالے رکھنا مشکل ہوگیا۔ وہ دیوار کو تھامے بیٹھتی چلی گئی۔

عین اسی لمحے دروازہ پھر بجنے لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بھرے ہوئے دروازے کو تکنے لگی۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے۔ آنکھیں خوف سے ابلنے لگیں' اس سے اٹھا نہ گیا' بدن سے جیسے جان ہی نکل چکی تھی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اچانک دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلنے لگا اور آواز آئی۔ "نازاں!!"

وہ ایسی حواس باختہ تھی کہ آواز ہی نہ پہچانی۔ بند حلق میں اٹکے ہوئے آنسو ایک دم ہی بہنے لگے اور وہ بری طرح چیخنے لگی۔ باہر جو بھی تھا وہ دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ نازاں نے اپنا سر گھٹنوں میں دے دیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے موت دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوگئی ہو۔ اس کا ذہن ایک دم گہرے اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔

"نازاں........... نازاں..........."

اندھیرے میں ڈوبتے ابھرتے نازاں نے محسوس کیا جیسے کوئی اس کے رخساروں کو زور زور سے تھپک رہا ہے۔ اسے جھنجوڑ رہا ہے۔ اس نے خوف سے بھنچی ہوئی آنکھوں کو ایک دم یوں کھول دیا جیسے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حوصلے سے مرنا چاہتی ہو۔ امام دین کا دھندلا خاکہ آہستہ آہستہ واضح ہوتا چلا گیا۔ اس کی چیخوں کو بریک لگ گیا تھا مگر آنسو برابر بہہ رہے تھے۔ اسے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ اس کے سامنے موت نہیں امام دین ہے۔

"نازاں........... کیا ہوا........... ؟" وہ اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ وحشت سے اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔

"وہ........... ماے وہ........... تھا........... وہی تھا ماے..........." وہ ایک دم ہوش

میں آگئی۔ دروازے کی طرف ہاتھ اٹھائے وہ چیخ رہی تھی۔ "باہر جا ماے باہر..........."

"کون........... کون تھا؟ کہاں تھا........... ؟" وہ اس کے دونوں کاندھے تھام کر چیخا۔

"ہیں........... آں..........." وہ ایک چپ ہو کر دیوار سے ٹک گئی جیسے پورے حواسوں میں آگئی ہو۔ وہ جان گئی کہ گاڑی اب تک بڑی سڑک بھی عبور کر چکی ہوگی۔ وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی جبکہ امام دین سخت وحشت زدہ تھا۔

"کوئی آیا تھا کیا؟" ماے نے بھی خود کو سنبھالا۔ "گلو........... اور چاچا کہاں ہے؟"

"وہ........... ماے گاڑی میں وہ تھا........... میری تباہی کا ذمے دار........... وہی حرام زادہ ڈاکٹر........... جس نے........... جس نے مجھے..........." پھر وہ رو پڑی۔

"کیا........... مگر........... وہ یہاں کیسے پہنچا؟"

"وہ........... گاڑی کا ڈرائیور آیا تھا۔ گلو کو پوچھنے ماے........... کہتا تھا' گلو سے کہنا اسماعیل نے بلایا ہے اور ماے وہ اسی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ دو آدمی تھے۔ ایک وہ اور ایک........... بڑی بڑی کالی مونچھوں والا..........." نازاں اسے بتا رہی تھی اور یوں ہانپ رہی تھی جیسے میلوں پیدل چلتی رہی ہو۔

"اسماعیل...........!" سانپ کی سی پھنکار نکلی اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر زمین پر اکڑوں' اس کے قریب ہی بیٹھ گیا مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور کھڑا ہوگیا۔

"چل اٹھ........... چارپائی پر بیٹھ........... پوری بات بتا اور گلو وغیرہ کہاں ہیں؟"

نازاں نے پھراسے تفصیل سے بتایا۔ "گلو اور چاچا کچھ ہی دیر پہلے اسپتال کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔ ان کے جاتے ہی وہ سفید گاڑی آگئی اور........... ابھی ابھی..........."

"ٹھیک ہے نازاں........... بس' اب یہ بات تو منہ سے نہیں نکالے گی........... سمجھی تو........... جو ہوگیا اسے بھول جا۔ اب اگر بات سینے سے نکلی تو بڑی تباہی پھیلے گی۔ تو گلو سے واقف نہیں ہے شاید........... میں دیکھ لوں گا اسے........... پر........... اب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح بول رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے ماے........... میں........... میں اس سے اپنی تباہی کا بدلہ لے سکتی ہوں۔ اسے مار سکتی ہوں ماے........... ضمیر کا یہ بوجھ اٹھائے میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ گلو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بات کرتی ہوں تو لگتا ہے وہ میرے چہرے پر لکھی داستان پڑھ رہا ہے۔ ابھی میرا گلا دبا دے گا۔" وہ رو رہی تھی۔

"کوئی کسی کا گلا نہیں دبا سکتا۔" وہ بپھر گیا۔ "سب ضمیر پر بوجھ لئے زندہ ہیں نازاں.......... اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ نہ کوئی کسی کے چہرے پر لکھی داستان پڑھ سکتا ہے۔" وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ وہ نازاں کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ خود گلو ضمیر پر کیسا بوجھ لئے گھوم رہا ہے۔ اس کے دل میں، دماغ میں تو صرف زیبی ہے۔ اس کے اپنے چہرے پر جو داستان لکھی ہے وہ کب نازاں پڑھ سکی اور زیبی.......... پھر وہ خود.......... اس کے چہرے پر چھایا ہوا کرب ہی دیکھنے کی کسی کو فرصت نہیں ملی تو بھلا اس کی داستان کوئی کیسے پڑھ سکتا ہے۔

نازاں رو رہی تھی، امام دین نے اسے چپ نہیں کرایا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے اندر کا طوفان ابھی ختم نہیں ہوا۔ وہ تو سمجھا تھا کہ وہ رو چکی۔ اب اندر سکوت ہوگا، بے حسی ہوگی اور پھر یہی بے حسی اس کی عادت بن جائے گی، اس کے اندر دوسری نازاں کو جنم دے گی جو جھوٹ کی پوٹ ہوگی۔ دن گزریں گے، ایک یہی بچہ کیا، دو چار اور بھی ہو جائیں گے۔ گلو سب کو کندھوں پر لئے پھرے گا اور پھر نازاں بھول جائے گی کہ کون کس کا بچہ ہے۔

کس نے، کس کو دھوکا دیا ہے مگر طوفان تو ابھی باقی ہے۔ اسے چپ کرانا خطرناک تھا۔ یہ لمحہ غنیمت تھا۔ اس کا تو جی چاہ رہا تھا کہ ابھی اسماعیل کی کوٹھی پہنچ جائے اور وہ جو بھی تھا، اس کے سارے دانت اس کے حلق میں اتار دے، اس کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دے مگر نازاں کو اکیلا اس حال میں چھوڑ جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ گلو اسپتال میں تھا۔ جھاراں ہوش میں آچکی تھی۔ نہ چاچا اسے چھوڑ کر آتا نہ گلو چاچا کو۔ زیبی کا کچھ پتا نہیں تھا، دل میں آتا تو گھر چلی جاتی مگر یہاں نازاں ہلکان ہو رہی تھی۔ طوفان نکلنے کے بعد کا سکوت ہی امام دین کی باتیں اس کے دماغ میں بٹھانے میں مدد کرتا ورنہ ساری باتیں اس ریلے میں بہہ جاتیں۔ وہ ٹہلتا رہا۔ مٹھیاں بھینچتا رہا، پھنکارتا.......... اپنے ہی ہاتھ پر مکے برساتا، خود پر قابو پاتا رہا۔

زمین پر دیوار سے ٹیک لگائے وہ زیادہ بلک رہی تھی۔ جیسے سب کچھ ابھی ابھی

ہاری ہو مگر چار پائی پر سیدھے بیٹھے بیٹھے طوفان میں کمی اور تھکن میں اضافہ ہوتا رہا۔ جلد ہی امام دین کچھار میں ٹہلتا، غراتا شیر ببر لگا تو کچھ ہوش آیا، پھر اس خیال نے تو اسے بوکھلا ہی دیا کہ اگر ایسے میں گلو آگیا یا چاچا تو جانے کیا سمجھے! جلدی سے آنسو پونچھ کر سمٹ گئی۔

"جھاراں.......... جھاراں کیسی ہے، تم اسپتال میں تھے ناں!؟"

امام دین نے گہرا سانس لیا۔ گویا سب ٹھیک ہوگیا ہو۔ آدمی اپنے گرداب سے نکل آتا ہے تبھی دوسرے کا خیال آتا ہے۔ "ٹھیک ہے، ہوش آگیا ہے۔ وہی بتانے آیا تھا۔"

"اور وہ زیبی.......... وہ کہاں ہے؟" لہجہ مشکوک سا تھا۔

امام دین چونک اٹھا۔ "وہ.......... اسپتال میں.......... شاید اب گھر چلی گئی ہو.........." وہ نازاں کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔

"عجیب سی بات ہے۔" نازاں نے الجھے ہوئے انداز میں کہا پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

امام دین نے اس سے اس جملے کا مطلب نہیں پوچھا۔ بہت سی باتیں ہوتی ہیں جنہیں آدمی جان جاتا ہے مگر نہ ان پر سوچنا چاہتا ہے نہ بات کرنا۔

"ماسے.......... ! اگر ہم اس آدمی کو پکڑلیں۔" نازاں نے گہری سوچ سے سر اٹھا کر کہا۔

"تو پھر کیا ہوگا؟" وہ بپھر گیا۔ جیسے وہ کچھ بھول گیا جسے نازاں نے پھر یاد دلا دیا ہو۔

"کیا کسی کے گناہ پر، کسی کی زیادتی پر کچھ نہیں کیا جاسکتا؟" نازاں نے بے بسی سے دونوں ہاتھ ملے۔

"سب کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اسے بیچ میدان میں کھڑا کر کے، لوگوں کو جمع کر کے، چیخ چیخ کر کہا جاسکتا ہے کہ دیکھو.......... یہ ہے جس نے نازاں کی، یعنی گلو کی اس بیوی کا سب کچھ لوٹ لیا تھا، جو نئی دلہن ہے اور اب اس کے پیٹ میں اس آدمی کا گناہ پل رہا ہے۔ کل پیدا ہونے والا بچہ گلو کا نہیں، اس آدمی کا ہے۔ پھر لوگ اس پر تھوکیں گے، ممکن ہے لاتیں مار مار کر اسے جان سے مار دیں اور تو.......... تجھے وہ کاندھوں پر اٹھا کر نعرے لگائیں گے کہ دیکھو، یہ کتنی شریف عورت ہے جس نے اس زیادتی پر اتنی دیر میں واویلا کیا۔ سب سے سب کچھ چھپالیا۔ گلو کو بھی کچھ نہیں بتایا بلکہ چپ چاپ یہ گناہ چھپائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی بیوی بن گئی۔ اس نے چاچا کو بھی دھوکا دیا۔ ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی.......... پاگل ہوگئی ہے تو؟" آخری جملہ اس نے چیخ کر کہا۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ غصے سے آنکھیں سلگ اٹھیں۔

اور نازاں آنکھیں پھاڑے خوفزدہ انداز میں اسے دیکھے گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن کا لہو نچڑ گیا ہو۔ بدنامی اور رسوائی کا خوف اس کے چہرے پر مردنی پھیلاتا رہا۔

"پاگل ہوگئی ہے تو۔" اس بار امام دین کا انداز دھیما اور نڈھال کر دینے والا تھا۔

"وہ لوگ تجھے بھی ایسی پاکباز نہیں سمجھیں گے نازاں! خاص طور پر اس وقت جبکہ تیرے پیٹ میں تین ماہ کا بچہ ہے اور.......... اور گلو سے تیری شادی کو آج تیسرا دن ہے۔ بھول جا سب کچھ.......... اس آدمی سے میں نمٹ لوں گا۔ میرے پاس اب کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ میں اسے اور اسماعیل کو اس کے کرتوتوں کا مزہ ضرور چکھاؤں گا۔ پہلے تو مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کا جھاراں سے کیا تعلق ہے؟ اسے مارنے کی کوشش اس نے کیوں کی۔" وہ بے خیالی میں بولے گیا اور جب چونک کر خاموش ہوا اس وقت تک نازاں کی سمجھ میں ساری بات آچکی تھی۔

"کیا.......... کیا اس نے.......... ہاں.......... گلو اور چاچا کہتے تھے وہ سفید گاڑی تھی۔ مگر ماے.......... کیوں.......... ؟ یہ جھاراں.........."

"پتا نہیں۔" امام دین نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ وہ سب کچھ کہہ دینے پر افسردہ تھا۔ "تو چپ رہ' یہ بات گلو کے سامنے نہ کہنا' میں قابو میں نہیں تھا۔ مجھے یہ سب تیرے سامنے نہیں کہنا چاہیے تھا مگر.......... خدا کے واسطے تو اپنی اس زبان کو لگام دے کر رہ.......... کیا تیرے لئے یہ کافی نہیں کہ تو نے گلو کی خواہش کی اور وہ تجھے مل گیا۔"

نازاں نے سر جھکا دیا۔

"میں جا رہا ہوں۔" امام دین نے کہا۔

"میں.......... میں یہاں اکیلی.........."

"تو رحمان چاچا کے گھر چلی جا۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ گلو وغیرہ جلدی آئیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے' کیا تم اسپتال جا رہے ہو؟"

"ہاں مجھے اسپتال جانا ہے۔" وہ پلٹا' دروازے کے قریب پہنچ کر ایک دم ٹھٹک گیا۔ "کیا اس آدمی نے بھی تجھے یہاں دیکھ لیا تھا؟"

"نہیں.......... میں تو دروازے کی اوٹ میں تھی.........."

امام دین نے چند لمحے اسے دیکھا۔ "کچھ یاد ہے' حلیہ کیا تھا اس کا؟"

"وہ چوڑے سے چہرے والا تیس' بتیس برس کا آدمی ہے۔ اس کی آنکھیں موٹی اور ہونٹ سیاہی مائل ہیں۔ سر پر بال بہت کم تھے۔" نازاں نے حلیہ بتایا۔

امام دین کے بازو کے پٹھے پھڑکنے لگے۔ وہ اسے خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اسماعیل کا چھوٹا بھائی تھا۔ فیض محمد' لاہور کے سرکاری اسپتال میں کمپوڈر تھا مگر اسپتال سے باہر شان ہی نرالی تھی۔ سرکاری نوکری پتا نہیں کس برتے پر کر رہا تھا ورنہ بھائی نے کئی بار اپنے ساتھ رہنے اور کام کرنے کی پیشکش کی تھی۔ امام دین پہلے سمجھا تھا کہ شریف النفس ہے' حرام کی کمائی نہیں کھانا چاہتا مگر اب یقین ہوگیا کہ سرکاری اسپتال میں سارے گھپلوں کا ذمے دار یہی ہوگا۔ اسپتال سے تعلق ہی کی بنا پر یہ اس اسپتال میں بھی گیا ہوگا ہاں اس کی ہوس ناک نگاہوں نے نازاں کو تاڑ لیا ہوگا۔

امام دین کھولتا رہا مگر وہاں رہ کر کیا کرتا۔ وہ اس مسئلے پر سکون سے سوچنا اور پھر ل کرنا چاہتا تھا۔ جذباتی تو تھا مگر بڑی جلدی خود کو سنبھال لیا کرتا تھا۔ گلو کے گھر کی وکھٹ عبور کرتے ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ ٹیکسی کا رخ اسپتال کی بجائے گیراج کی طرف کر دیا۔ ئی روز سے گیراج کا کام نہیں دیکھا تھا۔ درمیان میں تھوڑی تھوڑی دیر کو گیا بھی تو رسری جائزہ ہی لے پایا۔ ملازم پرانے تھے' اعتبار کے تھے پھر بھی کچھ کام اسی کو نمٹانے تے پھر فیض محمد کے بارے میں فیصلہ کرنا بھی یوں چٹکی بجاتے کا کام نہیں تھا۔ وہ گلو کی رح واہی تباہی کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بچپن سے اب تک' ایک راہ متعین کرنے میں دہ وقت لیا تھا سو اسماعیل کے معاملے کو سامنے رکھ کر' نفع نقصان جانچ کر قدم اٹھانا عقل مندی تھی۔

☆==========☆==========☆

اسے دیکھتے ہی ملازم کھل اٹھے۔ گیراج پر ایک کھلبلی مچ گئی ورنہ کیسا ویران اور سان پڑا تھا۔ چھوٹا دور ہی سے اسے دیکھ کر ٹرے کاؤنٹر پر رکھ کر اسی طرف آگیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آگئے............ آ............ گئے، آگئے............ بلم پردیسی، صنم پردیسی............" اس نے بیچ سڑک پر ہی ایک ہاتھ کی مٹھی بنا کر داہنے کولھے پر رکھ لی تھی۔ دایاں پاؤں آگے بڑھا بڑھا کر ٹھمکے لگاتا ہوا دھیرے دھیرے گیراج کے سامنے کھڑی اس کی ٹیکسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دور دور تک دکانداروں کی ہنسی چھوٹ گئی، سبھی اپنے گاہکوں کو چھوڑ کر، جھانک جھانک کر چھوٹے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دکانوں کے آگے کھڑے گاہک بھی ہونق بنے اسے دیکھ رہے تھے۔

امام دین بے ساختہ ہنس پڑا۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ خوشیاں اس کے قریب ہی ہیں مگر وہ............ وہ انہیں کہیں دور ہی دور تلاش کر رہا ہے۔ یہ ہنسی کہیں اس کے اندر سے ابھری تھی۔ "ابے سدھرے گا نہیں تو؟" وہ وہیں سے ہانک لگاتا، سر نکالے لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتا گیراج میں آگیا۔

"اب اس عمر میں سدھر کر کیا کروں گا دوست؟" اس نے کسی فلمی ہیرو کے باپ کی طرح جواب دیا پھر سنجیدگی سے بولا۔ "گلو کہاں ہے، کیسا ہے؟"

"بڑی پریشانیوں میں ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ بیٹھا۔

"میں نے تو پہلے ہی منع کیا تھا کہ شادی مت کر۔" اس نے عورتوں کی طرح ایک ہتھیلی پر دوسرا ہاتھ مارا۔

امام دین ہنس پڑا۔ "ہاں یہ تو ہے۔ بات تو تو نے پتے کی کہی تھی مگر وہ ٹھہرا بے وقوف شادی کر لی اور اب بیوی کی جوتیاں سیدھی کر رہا ہے۔"

"استاد!!" چھوٹے نے عجیب سے گھمبیر لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ امام دین جو اس سے نگاہیں چرائے ہوئے تھا، چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹے نے آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو ناں!"

"آں............!" وہ گھبرا سا گیا۔ "کیا مطلب ہے؟" پھر سٹپٹا کر بولا۔ "اس میں جھوٹ کیا ہے؟"

"کچھ بھی............ یہ میں نہیں جانتا مگر............ تم پریشان ہو۔" چھوٹا خوفناک حد تک سنجیدہ تھا۔ اس سے ایسی سنجیدگی کی توقع تو اسے تھی ہی نہیں۔

"میری پریشانی سے گلو کا کوئی تعلق نہیں۔" یہ کہہ کر امام دین نے جھٹکے سے

گردن موڑ لی۔ "تو چائے اور کیک رس لے کر آ۔" پھر وہ اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔

چھوٹا دو منٹ اسے دیکھتا رہا پھر خاموش سا ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

امام دین نے کوٹھڑی میں داخل ہوتے ہی خود کو چارپائی پر گرا دیا۔ تھکن اچانک ہی اس کے جوڑوں سے ابلنے لگی تھی۔ دو دن سے وہ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ بے حسی کے فلسفے کو ترتیب دے کر اس پر ایمان لانے کے باوجود وہ اس پر عمل نہیں کر پا رہا تھا۔ سوچنا چاہتا تھا۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا اس نے بچپن ہی میں سیکھ لیا تھا ورنہ اپنی دنیا سیلاب میں بہا کر اتنی جلدی پاؤں تلے زمین نہ کھینچ لاتا۔ بدمعاشی کا بھوت تو زیبی سے محبت ہوتے ہی اتر گیا تھا۔ اس محبت کی ناکامی کے بعد بھی جو ہاتھ پاؤں اس نے مارے بے سود رہے۔ اب زندگی بے وجہ کا بوجھ لگ رہی تھی پیسا کمانے کے لئے جائز ناجائز کام بھی کر ڈالا تھا مگر جس سکون کی اسے ضرورت تھی وہ پیسا بھی نہ دے سکا۔ اسے لگ رہا تھا کہ تھکن لمبی نیند چاہتی ہے، ایسی نیند جس سے کبھی، آنکھ ہی نہ کھلے اور جو کھل جاتی تو وہ کیا کرتا؟ کرنے کو کچھ رہا ہی کب تھا۔

زیبی اپنی ذمے دار خود تھی۔ جھاراں کے ساتھ کیا ہونا تھا، نازاں کی زندگی کیسی گزرتی، گلو کیا کرتا؟ یہ سب مسئلے اس کے نہیں تھے مگر ایک چبھن سی جو دل میں تھی وہ ابدی نیند بھی نہ سونے دیتی، ہاں یہ چبھن اس کا ذاتی دکھ تھا۔ ایک ایسا دکھ جو لگتا تھا بعد میں سکون نہیں لینے دے گا۔ "وہ یہ کانٹا ضرور نکال دے گا" یہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا اور یہ کانٹا ایک نہیں، دو تھے۔ اسماعیل اور فیض محمد۔

فیض محمد کو مار کر وہ نازاں کی کوکھ کوری تو نہیں کر سکتا تھا مگر اپنی کوری آنکھوں کی چبھن تو دور کر ہی لیتا جہاں خوابوں کی بجائے بھیانک تعبیریں جنم لینے لگی تھیں۔ اسماعیل مرتا تو کئی معصوم نوجوان ذلت کی دلدل میں گرنے سے بچ جاتے۔ فتح سے اس کا کوئی بیر نہیں تھا۔ یہ بھی اسے یقین تھا کہ وہ اب گلو سے کچھ بھی نہیں چاہتا۔ انتقام فوراً نہ لیا جائے تو جذبے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اپنے چکروں میں تھا۔ گلو کو سنبھالنا نازاں کا کام تھا، بوڑھا چاچا اس بڑھاپے میں جھاراں کو پا کر کچھ برس اور جی لیتا پھر............ پھر سب ٹھیک ہو جاتا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیبی دنیا کے بھیڑیوں کو خوب پہچانتی تھی۔ اگر ناگزیر ہو جاتا تو انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہ کرتی' حوصلہ مند تھی' مضبوط کردار کی مالک تھی۔ گہری سوچ اور گہری باتیں اسے جینا سکھا چکی تھیں' جو کچھ رہ گیا تھا وہ حالات سکھا دیتے مگر راہ متعین کرنا اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ سوتا تو پُرسکون ہوتا۔ ضمیر نام کا بڈھا جو اس میں بھی کبھی کبھی اپنی موجودگی کا احساس دلایا کرتا تھا' اسے بھی چین آ جاتا۔ اب اس سے زیادہ وہ دنیا والوں کے لئے بھلا کیا کر سکتا تھا؟ لاکھوں کی جائیداد تو تھی نہیں کہ غریبوں کے نام کر جاتا۔ ایک چھوٹے سے لگاؤ تھا کہ اتنی سی عمر میں اتنا کچھ سہہ لیا تھا کہ اب اندر جھانک لیتا تھا۔ دوسرا گلو تھا۔ ٹیکسی کی قسطیں پوری کرنا اس کے لئے آسان نہ تھا اور اسماعیل نہ رہتا تو بس میں ہی نہیں تھا۔ ٹیکسی بیچ کر خان کو باقی رقم ادا کر دیتا تو اچھا تھا۔ ٹیکسی تو اس کے پاس بھی تھی' اس کی ہو جاتی۔ گیراج پر بیٹھنے لگا تو کام سیکھ جائے گا۔ چھوٹا بھی چلتر ہے۔ آدھا گیراج اسے مل گیا تو ساری ذہانت ہوٹل سے گیراج منتقل ہو جائے گی۔ "پھر.......... ؟ اب کیا رہا.......... ؟" وہ کسی حساب دان کی طرح سوچ رہا تھا۔

"کوئی رہ تو نہیں گیا؟"

"کوئی اپنا کہ حق تلفی کا بوجھ بنے؟"

کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔ زیبی کو مکان کافی تھا۔ گلو بھی تو تھا۔ اس کے ذمے راشن پہنچانے کا کام لگا دیتا تو ضرور پہنچاتا مگر یہ رابطہ خطرناک صورت بھی اختیار کر سکتا تھا زیبی کی عزت نفس بھی متاثر ہوتی۔ "اس کے ہاتھ سے کمانے کا انتظام ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ مشین لے دوں! سی سلا کر پیٹ بھر لے گی۔ نہ سمجھ میں آیا تو وہ جانے.......... مجھے تو اپنے بوجھ ڈھونے ہیں۔" وہ اکتا گیا۔ بہت وقت گزر گیا تھا۔ چھوٹا چائے لے کر نہیں آیا۔ بھوک پیٹ میں بل ڈال رہی تھی۔ اسے لگا جینا ایک جرم ہے جس کی سزا موت میں پنہاں ہے' زندہ رہنا عمل اور موت اسی عمل کا نتیجہ' سو بھگتنا تو تھا ہے۔ آدمی جرم کرتا ہے تو سزا تو ملتی ہی ہے۔ اسے ایک ہی کو کیا سبھی کو ملنا ہے۔ وہ پھر ہلکا پھلکا ہو گیا۔

"مگر چھوٹا کہاں رہ گیا۔ جب سزا بھگتنی ہی ہے' جرم کر ہی لیا تو.......... یہ اذیت بھی کیوں؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی کمرے کا دروازہ ہی کھولا تھا کہ چھوٹا اندر آ گیا۔ ٹرے رکھ کر سامنے بیٹھ گیا۔ عجیب مرا مرا سا تھا۔

"کیا بات ہے؟" امام دین نے کیک رس چائے میں بھگوتے ہوئے اسے گہری نظر سے دیکھا۔

"کچھ نہیں.........." اس کا جواب عجیب سا تھا' الجھا ہوا۔ جیسے بہت کچھ ہو جسے وہ چھپا کر بھی عیاں کرنا چاہتا ہو۔

"پھر یہ منہ پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"ماے.......... میں سوچتا ہوں تم لوگوں سے میرا بھلا کیا رشتہ ہے؟ میرے تو اپنے رشتے دار بھی رشتوں کا بھرم نہیں رکھ سکے اور تم لوگ تو چھوٹے چھوٹے جملوں جتنی یا مسکراہٹ ایسی خوشیاں ہی دے پاتے ہو۔ میں تم لوگوں سے اور کچھ چاہتا بھی نہیں پھر بھی یہاں تم سب کے درمیان رہنا اچھا لگتا ہے۔ اگر تم میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہوئی تو.......... تو میرا یہاں رہنا بیکار ہے۔ ملک حسین دبئی جا رہا ہے۔ ہوٹل اس کا سالا سنبھالے گا اور وہ سالا مجھے پسند نہیں۔ ہنسنا تو اسے آتا ہی نہیں۔

"اور ہمیں تو استاد! اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لوگوں کے ہونٹوں پر ہنسی لانا آسان نہیں مگر یہ کام میں اپنے لیے کرتا تھا۔ اس کے ہونٹ لوہے کے ہیں' سیاہ موٹے موٹے۔ اتنے بھینچے ہوئے جیسے ہلنا ہی نہیں جانتے اور اگر ہلتے ہیں تو جیسے آدمی کو چکی کے بیچ پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ ان کے بوجھ تلے ایک سانس بھی نہیں لے پاتا.........."

"ابے.......... ! ابے! تو یہ اتنی بڑی بڑی باتیں کہاں سے سیکھ گیا یار؟" امام دین جو چائے پینا بھول گیا تھا اور اب تک کیک رس کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھا تھا' مضطرب ہو گیا۔

"حالات سب سکھا دیتے ہیں استاد.......... !" چھوٹا ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس نے چوکور کپڑا کاندھے پر سے اتار کر جھٹکا پھر اسے کاندھے پر لٹکا لیا۔ "تم چائے ختم کرو۔" اور امام دین نے جلدی سے کپ کو ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔

"ارادہ کیا ہے تیرا؟" امام دین نے کپ اس کی ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں.......... ارادہ ایک دم ہی کر لیتا ہوں' خود بھی نہیں جانتا کہ کیا کرنا ہے؟ بس بھاگ گیا تو رہوں گا ورنہ.........." اس نے ٹرے اٹھالی۔

"بیٹھ.......... مجھے تجھ سے بات کرنی ہے۔" امام دین یوں مطمئن انداز میں سیدھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو کر بیٹھ گیا جیسے اللہ نے کام آسان کر دیا ہو۔

"کیا؟" وہ بیٹھا نہیں۔

"یہاں کام کرے گا؟"

"یہاں.......... ؟ یہاں کیا کروں گا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"کام سیکھ.......... یہ کوٹھڑی.......... اسے گھر سمجھ.......... یہیں رہ اور کامیابی کی پہلی سیڑھی سمجھ کر قدم رکھ۔"

پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتا ہوا چھوٹا اچانک فق ہو گیا۔ "وہ کیوں.......... یہ کیوں کہہ رہا ہے؟ کیا مطلب ہے اس بات کا؟"

"ابے!! ہر بات کا کوئی مطلب ہوتا ہے کیا؟ کام سیکھ اور یہاں کام کر.......... ہوٹل تو تو چھوڑ دے گا ناں! اور یہ سب میں تیری ہمدردی میں کہہ رہا ہوں۔"

چھوٹے نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔ "لیکن.......... کام میں تیرے سے سیکھوں گا۔"

"ہاں' ہاں.......... میں سکھا دوں گا۔ ایسا مشکل کام نہیں ہے اور ہاں.......... میں سوچ رہا ہوں کہ گلو بھی گیراج کا کام سیکھ لے.......... اسے سنبھالے۔"

"تو کیا حج پہ جا رہا ہے؟" وہ پھر تیز لہجے میں بولا۔

"حج پہ.......... ؟" امام دین نے ایک دم چونک کر اسے دیکھا۔ "ہاں.......... یہی سمجھ لے۔" اس نے چند لمحے بعد کہا اور دور خلاؤں میں تکنے لگا۔ "جانتا ہے لوگ حج پر کیوں جاتے ہیں؟"

"عبادت کرنے۔" چھوٹا یوں بولا جیسے کسی امتحانی ہال میں جواب دے رہا ہو۔

"ہاں' عبادت کرنے' نیکی کرنے.......... اور نیکی کے جذبے کو سچا بنانے کی دعا کرنے.......... یہ دعا تو میں نے یہیں کر لی ہے چھوٹے! وہ قبول بھی ہو گئی۔ اب بس نیکی کرنا ہے مجھے۔ ایسی نیکی جو لوگوں کو.........." پھر وہ ایک دم چونک کر چپ ہو گیا۔ "چل دوڑ یہاں سے۔ مجھے کچھ دیر سونا ہے۔ شام کو ایک ضروری کام سے جاؤں گا۔" شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ غلط کہنے جا رہا تھا۔ یہ بولنے اور بولتے رہنے والی عادت اسے خود بھی بری لگتی تھی۔

"یار ماے.......... ! کیا تو آج مسجد میں گیا تھا؟"

"کیا مطلب؟" ماے نے پوچھا تو ضرور مگر خود ہی شرمندہ ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ مسجد میں گئے تو اسے برسوں ہو چکے تھے۔ شاید تین برس پہلے جب زیبی نے اچانک رات کو اس سے کہا تھا کہ وہ عید کی نماز کے بعد گھر آ کر کھانا کھائے تب اس نے زندگی میں پہلی بار نماز پڑھی تھی اور اس کا اہتمام رات ہی سے کیا تھا۔ سویا تو وہ گیراج پر ہی تھا حالانکہ اس روز پورا گیراج ویران تھا۔ سب چھٹی پر گھر جا چکے تھے مگر پھر بھی اس ویران گیراج میں رونقیں تمام رات رقص کرتی رہی تھیں۔ اسے یوں لگا تھا جیسے بڑی چہل پہل ہو۔ کئی برسوں بعد اسے لگا تھا کہ عید آئی ہے۔ چاند رات کو بازار میں پھرتے ہوئے اس نے پہلی بار خریداری اس قدر اہتمام کے ساتھ کی تھی۔ جوتا' کپڑے' بنیان' ازار بند.......... رومال' عطر کی شیشی سبھی کچھ ایک ساتھ خریدا تھا۔

اس نے زیبی سے بھی کہا تھا کہ وہ خریداری کر لے مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ کہہ دیا تھا کہ وہ کپڑے بنا چکی ہے اور اسے اب کوئی خواہش نہیں.......... تب بھی اس نے دو رنگین پراندے' ایک جوڑی جھمکے اور گلاب کے عطر کی شیشی اس کے لیے خریدی تھی۔ وہ اسے اپنی محبت کا پہلا تحفہ دینا چاہتا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس نے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں بھی خرید لی تھیں۔ زیبی نے بتایا تھا کہ سبزی گوشت وہ لے آئی ہے۔ تین روز پہلے ہی تو اس نے اسے ایک ہزار روپے دیئے تھے اور جب وہ لدا پھندا گھر کے دروازے پر پہنچا تھا تو زیبی بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"یہ سب کیا اٹھا لائے.......... ! اتنا کچھ تو میں لے آئی تھی اور پھر.......... یہاں آنے والا کون ہے؟"

"محلے کے لوگ تو آئیں گے ناں!" اس نے سارے تھیلے چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی ہنسی اب بھی کانوں میں جلترنگ سے بجا رہی تھی.......... پھر ماے نے چاہا کہ اپنے لائے ہوئے تحائف خود اپنے ہاتھ سے نکال کر دے مگر ہمت نہ ہوئی.......... وہ پلٹ گئی تھی۔

"کھانا کھا لیا؟" اس نے اس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا تھا۔

"ہاں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کل نماز کے بعد کھانا گھر پر ہی کھانا............ میں شامی کباب بناؤں گی۔"

اور پھر پوری چاند رات اس نے اکیلے گیراج میں جاگتے اور خوش ہوتے گزار دی تھی۔ سارے دکان داروں سے پوچھ آیا تھا کہ وہ نماز پڑھنے کہاں جائیں گے۔ سب ہی سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے گا............ تبھی ملک حسین نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔ "تو مسلمان کب ہوا یار!"

امام دین نے اس کی بات کا برا مانا تھا۔ کئی روز تک اس سے بات نہیں کی تھی پھر پتا نہیں کب اس ناراضگی کو بھول گیا تھا اور جب عید کے روز سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ تیار ہوکر سنسان گلی میں پھرتا رہا تب اس نے گلی کو پہلی بار گہری نیند سے کروٹ لے کر جاگتے دیکھا تو اسے صبح ایک ایسی الھڑ ناری لگی جو گہری نیند کی بے خودی میں زیادہ پُرکشش دکھائی دیتی ہے۔ اس لمحے ہر روز اس وقت جاگنے کا خود سے وعدہ بھی کیا تھا مگر اس کا آپ اتنی جلدی حالات کی دھول میں اٹ گیا کہ دوسرے بہت سے وعدوں کی طرح وہ کبھی اپنے اس عہد کو بھی نہ نبھا سکا۔

اور اپنے اس عہد کو بھول جانے کا عہد تو اس نے عید کی نماز کے بعد زیبی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے اس وقت ہی کرلیا تھا جب اس نے عید کی مبارک باد تو بڑے خلوص اور گرم جوشی سے دی تھی مگر پھر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ٹیبل سجائی، پلیٹیں رکھیں، بڑے سلیقے سے کھانا نکال کر سجایا۔ پلیٹ کے چاروں طرف سجے ٹماٹروں کے بڑے بڑے قتلوں کے درمیان سلاد کے ہرے پتے، ان پر مولی کی قاشیں پھر ہری مرچ اور ہرے دھنیے کا کترا ہوا چھڑکاؤ جس نے امام دین کو ایک دم ہی کھلنڈرا سا بنا دیا تھا۔ وہ بے وجہ ہی ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا تھا، بھی برا لگنے لگا۔ اس نے سمجھا تھا کہ زیبی اکیلے خود سے لڑتے لڑتے، دیواروں سے باتیں کرتے کرتے، خلاؤں میں تکتے تکتے تھک گئی ہے۔ ایک اکیلی عورت کے لئے تنہائی کے اتنے بہت سے لمحے اکتا دینے کو کافی ہوں گے مگر وہ تو یوں سر جھکائے چند نوالے کھا کر پھر خلاؤں میں تکنے لگی تھی جیسے امام دین نام کا کوئی آدمی اس کے گھر میں ہی کیا، اس پوری کائنات میں موجود ہی نہ ہو۔ بے توجہی یا ذات کا انکار بہت بڑا اور ہتک آمیز انکار ہوتا ہے۔ گو امام دین اسے بے توجہی یا ذات کے انکار کا نام تو نہ دے پایا بس بیزاریت کا ایک طوفان اٹھا تھا اور وہ محلے والوں سے

عید ملنے کی ساری خواہشات بھول بھال کر سیدھا گیراج میں جا سویا۔ گھنٹوں کا رت جگا اور جذبوں کا انتشار، اضطراب میں اور پھر تھکن میں ڈھل چکا تھا۔ شام کے بعد اسے گلو نے آکر جگایا تھا۔

☆==========☆==========☆

"استاد............ ! استاد!" چھوٹا اس کی ناک کے سامنے ہاتھ لہرا رہا تھا۔

"ہاں............ تو............ ؟ ابھی گیا نہیں؟" وہ چونکا پھر جھینپ گیا۔

"میں تو بیٹھا رہا تو پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "میں نے پوچھا تھا تو کبھی مسجد گیا ہے کیا؟ لگتا ہے کسی کا تازہ تازہ واعظ سن لیا تبھی تو ج............"

"بس............ چل، اب پھوٹ لے۔ ہوائی جہاز ہو جا چل!" وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔

چھوٹا اب زیادہ حیران تھا، عجیب گھن چکر سا لگا یہ امام دین۔ نہ چہرے پہ کسی ایک جذبے کا ٹھہراؤ تھا، نہ لہجے میں کسی ایک جذبے کی یکسانیت، نرم گرم، دھیما اور پُرشور............ عجیب سا تضاد لیے۔ وہ بھی کھڑا ہوگیا۔ ٹرے اٹھائی۔ دروازے کی طرف بڑھا مگر باہر جانے سے پہلے پھر پلٹ پڑا۔ اس کے قدموں کی آہٹ معدوم ہوئی تھی، نہ میل سے اکڑ جانے والے کپڑوں کی سرسراہٹ مگر امام دین یوں چارپائی پر چت لیٹا تھا جیسے اس کے سوا دور دور تک کوئی نہ ہو۔ اس نے ٹرے کے برتن بھی کھڑکائے مگر اس کے محویت نہ ٹوٹی۔ آنکھیں کھلی ہوئی نہ ہوتیں، ان میں حرکت نہ ہوتی تو چھوٹا باہر جا کر پورے یقین سے اس کی موت کا اعلان کر دیتا مگر............

جانے کب تک وہ پڑا بڑی محویت اور بڑی ہوشیاری سے کہانی ترتیب دیتا رہا۔ جیسے ملک کا سب سے بڑا کہانی نگار ہو۔ ابتدا سے انجام تک سب سوچ لیا۔ کہانی کا سارے دورانیے کا صرف ہفتے بھر اندازہ رکھا۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ابھی تو دن کے دو ہی بجے تھے۔ دھوپ تیز تھی۔ اس نے سر اٹھا کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ دھوپ بہت تیز نہیں تھی مگر پھر بھی نکلنے کو جی نہ چاہا۔ ساری زندگی کی تھکن اسے آج ہی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اوندھا لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

☆==========☆==========☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گلو سیڑھیاں چڑھ کر، چاچا کو تھامے اسی کوریڈور کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک شخص اس کے سامنے آگیا۔ وہ ٹھٹکا۔ کچھ قدم دائیں طرف بڑھا کر آگے نکلنا چاہا کہ اس نے بازو تھام کر فوراً ہی چھوڑ دیا۔ گلو نے چونک کر اسے دیکھا............ لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا ہو............ سناٹے میں رہ گیا۔ وہ بالکل اجنبی شخص تھا۔ اس نے پھر چاچا کی طرف دیکھا جس کا سارا دھیان اس وارڈ کے دروازے پر تھا جہاں جھاراں داخل تھی۔ گلو اتنے سے وقت میں اس اجنبی کو کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ چکا تھا۔ آگے جا کر پلٹا۔ وہ وہیں دیوار کے قریب کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا، بھنویں اچکی ہوئی تھیں اور آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھتا پا کر اس نے واضح اشارہ کیا۔ گلو نے سر کے اشارے سے جواب دیا پھر چاچا کو لے کر آگے بڑھ گیا۔

آئی سی یو وارڈ کے دروازے ہی پر ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ جھاراں ہوش میں آچکی ہے۔ چاچا کی باچھیں کھل اٹھیں۔ رفتار میں تیزی آگئی............ وہ مارے جذبات کے گلو کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھا۔ گلو زیبی کو نہ پا کر چاروں طرف تلاش کر رہا تھا لیکن وہ اندر جھاراں کے قریب بیٹھی اسے خاموش نگاہوں سے تک رہی تھی۔ ان کے قریب آتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی............ نگاہ اٹھا کر گلو کو یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ عجیب سا تاثر تھا اس کی نگاہوں میں تاسف، ہمدردی، لگاؤ اور............ اور جانے کیا؟

جھاراں ان دونوں کو دیکھ چکی تھی۔ اس کے مضطرب چہرے پر ایک دم ہی گہرا............ بہت گہرا سکون ہلکورے لینے لگا۔ وہ دونوں آگے بڑھے۔ گلو نے سوچا بڑا فلمی قسم کا ملن ہے۔ کتنا قسمت والا ہے چاچا۔ ساری عمر کی تپسیا کام آگئی۔ وہ اسے لیے آگے بڑھا مگر اس ارادے سے کہ فلموں ہی کی طرح اسے جھاراں کے قریب چھوڑ کر اور کسی بہانے سے زیبی کو لے کر کمرے سے باہر چلا جائے گا۔ اس ملن کے لمحے کو دیکھنے کا فائدہ ہی کیا جس کی خواہش خود اس کے دل کی تہہ میں حسرت بن کر جا بیٹھی ہو مگر اس وقت وہ حیرت زدہ رہ گیا جب جھاراں کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں چاچا کے چہرے کی لرزتی جھریوں سے ہوتی ہوئی گلو پر آجمیں۔

"اوہ............! تم............ تم۔"

اور گلو اسے اجنبی سے انداز میں دیکھنے لگا پھر یوں لگا جیسے اس انداز سے دیکھنے پر وہ

دکھی ہوئی ہو۔ اس کے چہرے پر پژمردگی چھاگئی۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ یوں لگا جیسے ابھی وہ رو پڑے گی مگر چاچا اتنی دیر میں اس پر جھک چکا تھا۔

"جھاراں............ ! جھاراں............ تو............ خدا کا شکر ہے کہ تو بچ گئی۔ کہاں چلی گئی تھی تو............ ؟ اتنے برسوں سے تجھے تلاش کر رہا تھا پھر پتا چلا کہ تو تو قریب تھی............ میں ہی اندھا ہو گیا تھا۔"

اور وہ کبھی چاچا کو اور کبھی گلو کو دیکھے گئی۔ گلو الجھ رہا تھا۔ ٹھیک ہے کہ یہ وہی عورت تھی جسے وہ فتح کے گھر اس کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ یہی وہ عورت تھی جو فتح کے بنگلے سے ائیر پورٹ تک اس کے ساتھ گئی تھی مگر گلو اب فتح کے حوالے سے تو کوئی بھی واقفیت نہیں چاہتا تھا سو اسے پہچاننے سے انکار اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ہاں ذہن کبھی کبھی بجلی کی کوند کی طرح اسے چبوترے پر ضرور بیٹھا ہوا دکھا رہا تھا............ اور دور جاتی عورت جو ماسی جنت کا پتا پوچھ رہی تھی۔ اس نے اس کا نام بھی پوچھا تھا مگر پھر اس کے ذہن میں گہرا اندھیرا پھیل جاتا جیسے تاریک رات میں بجلی کوند جانے کے بعد پھیل جاتا ہے۔

"غلام حسین............ ! یہ .... میرا............" پتا نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھی کہ چاچا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"جھاراں!" لہجے میں تنبیہہ تھی پھر وہ گلو سے بولا۔ "گلو! دیکھ! ڈاکٹر سے تو پوچھ۔ اسے گھر لے جائیں؟" وہ اس کے جسم میں لگے مختلف تاروں سے منسلک مشینوں کو بھول گیا تھا مگر گلو کو یاد رہا۔ بس باہر جانے کا بہانہ ہی کافی تھا۔ وہ ابھی تک اس اجنبی شخص کے اشاروں میں الجھا ہوا تھا۔ سر ہلا کر زیبی کی طرف مڑا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔ باہر آیا تو برابر کی بنچ پر بیٹھی کسی سوچ میں غرق تھی۔ اسے کچھ کہنا نہیں پڑا............ بس جی چاہا کہ اسے سوچ سے چونکا دے مگر غیر ارادی طور پر گردن موڑ کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ مضطرب انداز میں ٹہل رہا تھا۔ سگریٹ کے دھویں کے مرغولے بنا رہا تھا۔

گلو تیز تیز چلتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔ "جی!!"

وہ چونک کر مڑا۔ اس نے دیوار کے ساتھ رکھے، مٹی سے بھرے ڈسٹ بن میں سگریٹ بجھا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"فیض محمد کہتے ہیں مجھے۔" اس نے بڑی شائستگی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

گلو نے کچھ پس و پیش کے بعد اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ نئے لوگوں سے ملتے ہوئے گھبراتا تھا۔ "لیکن میں آپ کو نہیں جانتا۔" اس نے جھجک کر کہا۔

"ہاں.......... مگر آپ کا غائبانہ تعارف میرے بڑے بھائی اسماعیل نے کرادیا تھا۔" اس نے یوں فخر سے اسماعیل کا نام لیا جیسے پاکستان کے وزیراعظم کا ذکر کر رہا ہو۔

گلو کے دماغ میں ایک چنگاری سی سلگی۔ رات کے اندھیرے میں دور جاتی گاڑی کی جھلک سی چمکی پھر معدوم ہوگئی۔ "ایک جیسی بہت سی گاڑیاں ہوتی ہیں۔" اندر کی سرگوشی باہر آئے بغیر اسے کچھ ہلکا پھلکا کر گئی۔ "جی!!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"وہ آپ کی تلاش میں ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" گلو کو لگ رہا تھا جیسے دماغ سن ہو چکا ہے۔

"اپنی کوٹھی پر آپ کے منتظر ہیں۔ ہم آپ کے گھر بھی گئے تھے مگر.......... آپ میرے ساتھ ہی چلیں۔"

"میں ایک پریشانی میں ہوں۔ ان سے کہئے گا کہ میں رات سے پہلے ان سے ضرور مل لوں گا۔ اس وقت تو جانا ممکن نہیں ہے۔"

"ویسے پوچھ سکتا ہوں کہ کیا پریشانی ہے؟" اس نے بڑے مہذب اور ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

"جی وہ.......... میرے چاچا کی.......... نہیں میری ماسی ہیں۔ ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ خود چاچا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ان سے کہئے گا کہ گلو بہت شرمندہ تھا مگر آج ہی میں ضرور مل لوں گا۔"

اس کے چہرے پر گہرا اطمینان سا پھیل گیا تھا۔ یوں جیسے وہ جس بات کی تصدیق چاہتا ہو' وہ تصدیق ہوگئی ہو۔ "اچھا.........." اس نے بہت کھینچ کر اچھا کہا۔ جیب ٹٹول کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ گلو کی جانب بڑھایا۔

"نہیں.......... شکریہ' میں نہیں پیتا بس کبھی کبھی.........."

"تو کبھی کبھی میں ہی سہی۔" وہ مسکرایا۔

"نہیں.......... چاچا کے سامنے نہیں پیتا۔" اسے جلدی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جس

قدر جلد اس شخص سے چھٹکارا پالے اتنا ہی اچھا ہے۔ یہ شخص اس کے لیے گہرے اضطراب کا باعث بن رہا تھا۔ اسے یہ بھی فکر تھی کہ اسماعیل نے اسے بلانے کے لیے ایک انجانے شخص کو کیوں بھیجا ہے؟ اور کیا یہ واقعی اسماعیل کا آدمی ہے یا.......... اس کے پاس کسی بات کا جواب نہیں تھا مگر پھر بھی اندر کا اضطراب کسی گڑبڑ کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ امام دین سے پوچھے گا۔ امام دین بھی اب تک نظر نہیں آیا تھا۔

"ممکن ہے کہ یہیں کہیں ہو۔" اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

"ٹھیک ہے جی!! پھر میں چلتا ہوں مگر.......... انہوں نے کہا تھا کہ گلو کو ساتھ ہی لے کر آنا۔ بلکہ انہیں پورا یقین تھا کہ آپ نام سنتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرے ساتھ چل پڑے گے۔ اب میں انہیں جاکر بتاؤں گا کہ ان کی خوش فہمی خطرناک حد تک بڑھی ہوئی ہے تو.........." اس کے انداز میں تنبیہہ.......... بلکہ دھمکی تھی..........

"نہیں.......... یہ ان کی خوش فہمی نہیں تھی۔ انہوں نے ٹھیک سوچا تھا۔ اگر یہ حادثہ نہ ہوا ہوتا' اور چاچا کی حالت اتنی خراب نہ ہوتی تو میں یقیناً آپ کے ساتھ چلتا۔ میرا خیال ہے کہ اسماعیل صاحب جانتے ہیں کہ میں چاچا کے بعد دنیا کے کسی شخص کو کوئی اہمیت دیتا ہوں۔" گلو کو بھی غصہ آگیا تھا مگر اس غصے نے اسے مشتعل کرنے کی بجائے بڑا مہذب بنا دیا تھا۔

"لیکن چاچا تو بالکل ٹھیک ہے۔" اس نے آنکھیں پھیلا کر حیرت کا اظہار کیا مگر انداز میں تمسخر تھا۔

"وہ ٹھیک نہیں ہے.......... میں ذاتی معاملات پر آپ سے بات نہیں کرنا چاہتا اس لیے مہربانی کرکے آپ اسماعیل صاحب تک میرا پیغام پہنچا دیں۔" اب اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔

فیض محمد گہری چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا' چوڑے جبڑوں اور اونچی پیشانی والا ایک ایسا شخص تھا جس کے باریک اور ایک دوسرے میں پیوست ہو جانے والے ہونٹ اس کے چہرے کی خباثت میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ دیکھتا تو لگتا جیسے اس کی نگاہیں خنجر کی نوک کی طرح چہرے پر گڑی جا رہی ہوں اس کے چہرے پر بلا کی سفاکی تھی.......... اس وقت بھی وہ بڑی تیز اور چبھنے والی نگاہوں سے گلو کو گھور رہا تھا۔ اس کی ان چھوٹی چھو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں اشتعال تھا مگر ہونٹوں پر بڑی کمینی قسم کی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ گلو کو مشتعل کرنے والی' اس کی یہ مسکراہٹ اور ٹھہرے ٹھہرے دھمکی آمیز لہجے میں بات کرنے کا انداز ہی تھا۔

"ٹھیک ہے.......... میں یہ پیغام انہیں دے دوں گا۔ مگر.........." اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور سگریٹ کا گہرا کش لگایا۔

"مگر کیا؟" گلو بپھرا ہوا تھا۔

"مگر یہ کہ.........." اس نے دھوئیں کا مرغولہ گلو کے چہرے پر چھوڑ کر کہا۔ "مگر یہ کہ اسماعیل صاحب نے جس طرح یہ پیغام مجھے دیا تھا' اس کا مطلب یہی تھا کہ میں آپ کو ہر حال میں اپنے ساتھ لے کر ہی وہاں پہنچوں.......... میں نہیں جانتا کہ مجھے تنہا دیکھ کر ان کی کیا کیفیت ہوگی!" اس نے کندھے اچکا کر سگریٹ پھر اسی ڈسٹ بن میں اچھال دیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

گلو کا جی چاہا کہ اس کا چوڑا اور گٹھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے جھٹکا دے کہ وہ بازو جڑ سے اتر جائے مگر اس نے دانت بھینچ کر خود پر قابو پالیا اور ہاتھ ملاتے ہی پلٹ گیا.......... گلو وارڈ کی طرف بڑھ رہا تھا' جہاں باہر بڑی بینچ پر زیبی بیٹھی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی پشت پر اب بھی فیض محمد کی نگاہیں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں میں اینٹھن بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ پلٹا نہیں.......... زیبی کے قریب جا پہنچا۔

"گلو! کون ہے یہ شخص؟" اس کے انداز میں تشویش تھی۔

"پتا نہیں.......... میں اسے نہیں جانتا۔" گلو اب پلٹا اور بینچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے سرسری سے انداز میں اس کی طرف دیکھا جہاں وہ اسے کھڑا چھوڑ آیا تھا' اور یہ دیکھ کر بری طرح سلگ اٹھا کہ وہ اب بھی پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے' پیروں کو ذرا سا پھیلائے کھڑا' اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"اس کا انداز.......... جارحانہ ہے۔" زیبی نے بھی اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔

"کیا.......... ؟" وہ چونکا۔

"مطلب یہ کہ اس کا انداز صحیح نہیں ہے.......... وہ تم سے کیا چاہتا ہے؟"

"بلاوجہ الجھنے کی کوشش کر رہا ہے.......... چھوڑو.........." اس نے اکتا کر دوسری طرف دیکھا۔

"تم ملے جھاراں سے؟"

"ہاں.......... میں اس عورت سے پہلے بھی مل چکا ہوں مگر.......... اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ چاچا اسی کی تلاش میں ہے.........."

"یہ ساری دنیا اسی کی تلاش میں کیوں رہتی ہے جو اسے نہیں ملتا۔" وہ یوں بولی' جیسے خواب میں بول رہی ہو..........

"ایسا کب ہوا ہے؟ سب کو' سبھی تو مل گئے۔" ایسا کہتے ہوئے گلو کو لگا تھا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔

وہ چونکی.......... اس کے چہرے پر سایہ سا لہرایا پھر وہ یوں اچانک کھڑی ہوگئی جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

عین اس لمحے گلو کی نگاہ اسی جانب اٹھ گئی جہاں اس نے فیض محمد کو چھوڑا تھا اور اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر ایک دم بھڑ بھڑا کر بھٹی سلگ اٹھی ہو.......... وہ اب بھی اسی پوزیشن میں کھڑا تھا۔

"زیبی.......... تم اندر جاؤ.......... میں دیکھتا ہوں اسے۔" وہ اٹھا۔

زیبی نے چونک کر فیض محمد کی طرف دیکھا.......... اور گھبرا کر گلو کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں گلو! تم ادھر نہیں جانا.......... تم بھی اندر چلو.......... پلیز.........."

زیبی کے ہاتھ کے لمس نے اس میں پھوار سی برسادی۔ تمام اشتعال ایک دم ختم ہوگیا۔ وہ رک گیا مگر اس نے خونخوار نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ اب وہ سر جھکائے سگریٹ سلگا رہا تھا مگر گھنی بھنوؤں کے نیچے اس کی دونوں آنکھیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ بے پناہ مشتعل کر دینے والا انداز تھا۔ گلو پھر مضطرب ہوگیا۔

"تم اسے مت دیکھو گلو!" زیبی نے اسے وارڈ کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا وہ تمہیں جان بوجھ کر اشتعال دلا رہا ہے۔ عقل استعمال کرو۔ یہ اسپتال ہے۔ جھاراں اندر ہے' چاچا بھی اس کے پاس ہے۔ تم محسوس نہیں کر رہے کہ اس کے ارادے خطرناک ہیں! پتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں وہ ایسا کرکے کیا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ تم تو ہوش پکڑو" وہ اسے دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی تھی۔

یہ ایک لمبا کوریڈور تھا جہاں بیک وقت دو وزیٹر کا آنا ممنوع تھا۔ دور بنے اسٹاف روم میں بیٹھی نرس انہیں دیکھ کران کی طرف آگئی۔

"پلیز آپ لوگ! باہر انتظار کریں۔ یہاں کھڑے رہنا منع ہے۔"

"ہم اندر جارہے ہیں۔" گلو نے تیز لہجے میں جواب دیا۔

"اندر مریض کے پاس ایک آدمی موجود ہے.......... وہ باہر آجائے تو آپ جاسکتے ہیں۔" اس نے مودب انداز میں کہا۔

"اس سے پہلے بھی تو ہم سب اندر تھے۔" گلو فیض محمد کا سارا غصہ اس پر اتارنا چاہتا تھا جبکہ زیبی بار بار اس کی کہنی چھوکر اسے منع کررہی تھی۔

"اگر ایسا تھا تو آپ غلطی کررہے تھے۔ اگر اس وقت کسی نے نہیں دیکھا اور ٹوکا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ وہ غلطی پھر دہراسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے نرس.......... ہم باہر چلے جاتے ہیں۔" زیبی جلدی سے درمیان میں آگئی پھر پلٹ کر گلو سے بولی۔ "چلو.......... باہر چلو مگر.......... خود پر قابو رکھنا.........."

گلو نرس کو گھورتا ہوا باہر کی طرف بڑھا جبکہ نرس بڑبڑاتی ہوئی اسٹاف روم کی طرف چلی گئی۔

وہ دونوں باہر آگئے تو گلو کا سارا دھیان فیض محمد کی طرف تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ باہر موجود نہیں تھا۔ ورنہ گلو اب شاید خود پر قابو نہیں رکھ پاتا۔ اس کی غیر موجودگی نے زیبی کو ایک دم پرسکون کردیا۔ گلو کا اضطراب بھی کم ہوگیا۔ وہ باہر بینچ پر آبیٹھا۔ زیبی اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"گلو! تمہاری ماں.......... تمہاری ماں کہاں ہے؟"

اور گلو کو لگا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ "کیوں.......... ؟" پھنکار سی آواز نکلی..........

"یونہی.......... " زیبی نے اسے غور سے دیکھا۔ "تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے کی مٹھاس نے گلو کو پرسکون کردیا۔

گلو نے سوچا کہ جھوٹ بول دے، کہہ دے کہ اس کی ماں زمانوں پہلے مرگئی مگر وہ جھوٹ نہیں بول سکا۔ وہ چند لمحے زیبی کو دیکھتا رہا.......... سوچتا رہا کہ اس سے سچ بول دیا تو وہ کیا سوچے گی، یہی کہ جانے کس گناہ کی پوٹ ہوگا وہ.......... مگر کوشش کے باوجود وہ جھوٹ نہیں کہہ سکا۔ "پتا نہیں.......... مجھے پیدا کرکے.......... اس چبوترے پر مجھے چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہوگی۔" نفرت اس کے چہرے سے ابلنے لگی تھی۔

زیبی بہت دیر تک بیٹھی اپنے دوپٹے کے پلو کو انگلی پر لپیٹ لپیٹ کر کھولتی رہی۔

"یہ تمہیں کس نے بتایا؟" کچھ دیر کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

"حالات نے.......... کوئی ماں اپنی اولاد کو چھوڑ کر، یوں.......... بے آسرا اور لاوارث چھوڑ کر کہیں جاتی ہے کیا؟ میں عورت کو نہیں جانتا.......... میں نے عورت کا کوئی روپ نہیں پرکھا مگر.......... دنیا دیکھی ہے، کسی عورت کو ایسا بے درد نہیں پایا۔ بلکہ میں نے ایسی مائیں بھی دیکھی ہیں جو اپنی اولاد کی خاطر اپنے شوہروں سے یا سسرال والوں سے جوتے کھاتی ہیں، گالیاں سنتی ہیں مگر ان کی محبت انہیں وہ گھر نہ چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے.......... میری ماں.......... میری ماں یا تو عورت نہیں تھی یا.......... پھر.........."

"گلو! کبھی کبھی انسان اصل حقائق سے ناواقف رہ جاتا ہے۔ کوئی حادثہ.......... کوئی سانحہ ایسا ہو جاتا ہے جو صرف ایک کے ساتھ ہوتا ہے اور دوسرے کو پتا بھی نہیں چلتا۔ دوسرا تمام زندگی کسی غلط فہمی کا شکار رہتا ہے۔ تمہاری ماں کے ساتھ بھی تو ایسا کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔"

"ہاں.......... ہوسکتا ہے.......... مگر وہ جہاں مجھے چھوڑ کر گئی تھی وہاں کے لوگوں نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ.......... کہیں گئی تھی پھر واپس نہیں آئی.......... اگر وہ مرگئی تھی تو بھی کسی نہ کسی کو تو اطلاع ملی ہوتی.......... کسی حادثے کا شکار ہوتی تب بھی اس کا محلہ تو وہی تھا۔ پولیس یا کوئی راہگیر، کوئی تو اطلاع کرتا۔ میں نے اپنی ساری زندگی اسی بستی میں گزار دی ہے۔ وہ آج تک مجھے ڈھونڈتی ہوئی نہیں آئی.........." ایسا وہ کہہ رہا تھا مگر جانے کیوں اس کے دماغ میں پھر وہی سین گھوم گیا جب ایک عورت اس سے بات کرکے مائی جنت کی طرف جارہی تھی اور.......... اور وہ عورت کوئی اور نہیں.......... جھاراں تھی...... "ہاں.......... جھاراں".......... وہ چونک اٹھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اگر تمہیں پتا چلے کہ تمہاری ماں زندہ ہے.......... کوئی سانحہ تھا جس نے اسے تم سے جدا کر دیا تو؟"

اس بار وہ زیادہ زور سے چونکا.......... "کیا.......... کیا مطلب ہے؟" گلو اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ایسے ہی پوچھ رہی ہوں۔" زیبی نے نگاہیں چرالیں.......... "یہ دنیا ہے گلو! یہاں سب کچھ ممکن ہے.........." اس کا لہجہ دھیما تھا۔ "میں نے جس شخص کو تمام عمر تلاش کیا' وہ میرے قریب ہونے کے باوجود مجھے دکھائی نہ دیا.......... جسے چاچا تلاشتا رہا وہ یہیں تھی.......... تم اس سے ملے بھی مگر.......... وہ.......... وہ کبھی بھی چاچا کو دکھائی نہ دی۔

"گلو! جو آدمی کھو جاتا ہے وہ کبھی نہ کبھی مل جاتا ہے مگر جو خود کھو جانا چاہے.......... قریب آکر بھی چھپتا رہے وہ.......... وہ بھلا کیسے مل سکتا ہے؟"

"بات کیا ہے زیبی! صاف صاف کہو.........." وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"میں صرف تم سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ تم اپنی ماں کے بارے میں کیا سوچتے ہو' تمہیں اس سے محبت محسوس ہوتی ہے یا.........."

"محبت کیسے محسوس ہوگی' میں نے اگر کبھی کسی ماں کو اپنے بچے سے محبت سے پیش آتے دیکھا بھی ہے تو اپنی ماں کے لیے دل میں نفرت ہی محسوس کی ہے۔ صرف اس لیے کہ.......... کہ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی.......... میں نے کبھی محبت پائی ہی نہیں تو محبت کرنا میرے لئے کیسے ممکن ہے؟"

"محبت تو میں نے بھی کبھی نہیں پائی.......... مگر.......... میں اس شخص سے اب بھی اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی پہلے کرتی تھی۔" زیبی بے خیالی میں کہہ بیٹھی۔

"کون ہے وہ؟" گلو ماں کو بھول کر اس میں ڈوب گیا۔

اس بار زیبی چونکی' سر اٹھا کر اسے لمحہ بھر کو دیکھا پھر سر جھکا دیا۔ "ہے ایک!!" وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

گلو کا جی چاہا کہ اسے کاندھوں سے تھام کر اپنے سامنے کھڑا کر لے اور کہے۔

"زیبی! میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے.......... تم کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ تم میری تلاش

میں تھیں۔" مگر نہ تو اس نے تھاما' نہ اپنے سامنے کھڑا کیا اور نہ ہی کچھ کہہ سکا۔

"چھوڑو.......... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ.........."

ابھی اس نے جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ ساتھ والا دروازہ کھلا.......... اسٹریچر پر جھاراں کو لیے دو وارڈ بوائے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں گلوکوز کی بوتل بھی تھی جس کی نالی سفید چادر کے اندر جھاراں کے بازو تک گئی ہوئی تھی۔ دوسرا ایک چھوٹی سی ٹرالی ساتھ لیے چل رہا تھا' اس ٹرالی پر رکھی چھوٹی سی مشین سے نکلنے والے تار بھی اسی سفید چادر میں گم تھے۔ چاچا اسٹریچر کے پیچھے پیچھے تھا۔ جھاراں پوری طرح ہوش میں تھی۔ اس کے مردہ چہرے پر دیکھنے والی آنکھوں میں جذبوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

دروازے سے باہر آتے ہی اس کی نگاہ گلو کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھی۔

"وارڈ مل گیا ہے.......... چل گلو!" چاچا اتنا کہہ کر یوں اسٹریچر.......... کے پیچھے دوڑ گیا جیسے اس کے اندر جوانی پھر سے پیدا ہوگئی ہو یا پیروں میں اس نے پہیے فٹ کرالیے ہوں۔ گلو اور زیبی بھی ان کے ساتھ ساتھ کوریڈور میں لپکے۔ جھاراں اب بھی سر موڑے گلو کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور گلو سوچ رہا تھا' وہ حیران ہوگی کہ فتح کا آدمی چاچا کے ساتھ کیوں ہے؟ یا ممکن ہے اسے فتح کو زخمی کرنے والی کہانی بھی پتا ہو..........

اسے پھر یہ بھی خیال آیا تھا کہ یہ وہی عورت ہے جو ماسی جنت کا پتا پوچھ رہی تھی مگر اتنی پرانی بات پر یقین کرلینا اس کے لیے مشکل تھا۔ اس وقت اس کی عمر بھی تو اتنی کم تھی۔ کیا پتا وہ کوئی اور لنگڑی عورت ہو' بقول چاچا' ہر لنگڑی عورت میری ماں تو نہیں ہوسکتی' مگر.......... اگر وہ یہی تھی تو ماسی جنت کا پتا کیوں پوچھ رہی تھی؟ اور اگر یہ نہیں تھی تو.......... مجھے کیوں بار بار یہی یاد آرہا ہے..........

وہ اسی سوچ میں غرق کافی پیچھے رہ گیا۔ اسٹریچر آگے نکل گیا تھا۔ چاچا تو اسے پکڑے ہوئے تھا یوں جیسے اگر اس نے اسٹریچر کو چھوڑ دیا تو وہ پھر کہیں دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائے گی۔ زیبی البتہ اس کے قریب آنے کی منتظر تھی۔ اسے منتظر پاکر گلو نے رفتار تیز کردی۔ اسٹریچر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ کے کوریڈور میں مڑ گیا تھا۔ زیبی اسی موڑ کے سنگم پر کھڑی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوگیا؟" اس نے قریب پہنچتے ہی پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کچھ نہیں..........." وہ اب بھی الجھا ہوا تھا۔

"کچھ محسوس کر رہے ہو کیا؟" اس نے گہرے سے انداز میں پوچھا۔

گلو کو لگا جیسے وہ اس کے دماغ میں جھانک رہی ہو........... "ہاں..........."

"کیا؟"

"ابھی بتانا بیکار ہے۔" گلو نے چلتے چلتے جواب دیا۔

"بعد میں بتاؤ گے؟" لہجہ پُرامید تھا۔

"ہاں.......... میں........... میں نے کبھی کسی کو کچھ بتایا نہیں مگر.......... میرا دل چاہا ہے کہ میں تمہیں سب کچھ بتادوں۔"

"اچھی بات ہے........... بتا دینے سے بڑا بوجھ کم ہوتا ہے۔"

"کیا تمہیں اس پر یقین ہے؟" گلو نے ٹھٹک کر پوچھا۔

"ہاں........."

"پھر تم بھی مجھے سب کچھ کیوں نہیں بتادیتیں؟"

وہ چونک کر رکی........... اسے دیکھا........... پھر دکھ سے مسکرا دی۔ "میں کسی کو سب کچھ بتا کر اپنا بوجھ ہلکا کر چکی ہوں۔ اب مجھ پر کوئی بوجھ نہیں۔" وہ پھر آگے بڑھ گئی اور گلو اسے بائیں جانب کے کمرا نمبر 222 میں داخل ہوتے دیکھتا رہا...........

☆==========☆==========☆

امام دین کو بہت سے کام تھے۔ وہ سر شام ہی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ ملازموں کو کچھ ہدایات دینے کے بعد اس نے ٹیکسی نکالی۔ آئل چیک کیا۔ پیٹرول دیکھا۔ ٹیکسی صاف کروائی۔ چھوٹے کو بلا کر چائے کے لئے کہا۔ کھڑے کھڑے چائے پی' کپ اسے واپس کرتے ہوئے پوچھا۔ "ملک حسین بمبئی کب جارہا ہے؟"

"شاید اگلے ہفتے۔" اس نے خلاف توقع سنجیدگی سے جواب دیا۔

"تو نے اسے بتا دیا ہے کہ تو ہوٹل چھوڑ دیا ہے اور اس کی وجہ اس کا سالا ہے؟"

"ہاں۔ میں کیا ڈرتا ہوں کسی سے۔ کیوں چھپاتا؟ میری مرضی' میں کام کروں یا نہ کروں۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ تو ایسا کر۔ اس سے حساب کتاب کر لے اور بتا دے کہ تو اب گیراج کا کام سیکھ کر یہاں کام کرے گا۔"

"مگر استاد..........!" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"چل' چل' ہوائی جہاز ہو جا۔ چل۔" اس نے اس کے کولہوں پر دھپ جما کر کہا اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ "رات کو بات کریں گے۔"

اس نے کہا اور زن سے ٹیکسی نکال کر لے گیا۔ چھوٹا حیران سا کھڑا رہ گیا۔ امام دین کے چہرے پر اس قدر افسردگی اور اضطراب اس وقت نہیں تھا' جتنا وہ دن میں دیکھ چکا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ امام دین کی اس پیشکش پر بے حد خوش تھا۔ وہ ان لوگوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر ملک حسین کے سالے کے ساتھ رہ کر کام کرنا بھی اسے منظور نہیں تھا مگر جس انداز میں امام دین نے فیصلے کئے تھے' ان پر چھوٹا کچھ کھٹک رہا تھا۔ یہ کھٹک کیسی ہے؟ کیوں تھی؟ وہ جان نہیں پایا۔ امام دین کہہ گیا تھا کہ وہ پھر رات کو بات کرے گا اور رات میں دیر ہی کتنی تھی۔

سوچتے سوچتے اس نے سر جھکایا' سامنے پڑے پتھر کو لات ماری' سر اٹھا کر ملک حسین کو دیکھا جو دنیا بھر سے بے خبر آخری بار حساب کتاب چیک کرنے میں یوں منہمک تھا جیسے اس کا سالا اسی ایمانداری سے آئندہ بھی حساب کتاب برابر رکھے گا۔ "سالا حرامی!" چھوٹے نے اندر کی نفرت کا برملا اظہار کر دیا۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ اظہار اس نے خود سے کیا تھا۔

☆==========☆==========☆

زیبی شام سے پہلے ہی گھر آگئی۔ اس نے تو اسپتال میں مزید رکنے کی پیشکش کی تھی مگر جب چاچا نے گلو سے صاف کہہ دیا کہ اب وہ گھر نہیں جائے گا تو زیبی' گلو سے اجازت لے کر چلی آئی۔ وہ یوں بھی جھاراں کو وقت دینا چاہتی تھی۔ رات ہوش آجانے کے بعد سے جھاراں تمام تر کمزوری اور ڈاکٹروں کی پابندی کے باوجود بولتی رہی تھی۔ یوں جیسے اس کے پاس وقت کم ہو۔ وہ سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی اور جب زیبی کو اس نے اپنی داستان سنائی تو اسے یوں لگا جیسے وہ زمین پر نہیں' کہیں خلاؤں میں معلق ہو۔ جو کچھ اس پر بیتا تھا' اس نے زیبی کو حیران کر دیا۔ وہ جو اپنی قسمت سے شاکی تھی' وہ جو اپنے دکھ پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشان تھی' جو خود اپنے ہی وجود پر ترس کھاتی تھی' ایک دم حوصلہ مند' صابر و شاکر بن گئی اور جب اس نے کہا۔

"زیبی!! میرے پیار میں بھی کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اتنی ہی طاقت تھی اس پیار میں کہ میں چاہتی تو دنیا کو ٹھکرا کر راجے جیسے بدمعاش کا مقابلہ کر کے بھی غلام حسین کے پاس لوٹ آتی مگر.......... مجھے اس سے سچا پیار تھا۔ میں نے جان لیا تھا کہ راجہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے سارے چیلے اس سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ میں لوٹی تو راجہ غلام حسین کو مروا دے گا۔ اس کی زندگی حرام تو ضرور کر دے گا تب.......... تب میں ایک دن اور ایک پوری رات سوچتی رہی۔ ایک طرف غلام حسین مجھ پر شک کر کے میرے لئے نفرت کو دل میں جگہ دے سکتا تھا اور دوسری طرف اس کی جان کو خطرہ تھا۔ زیبی جب کوئی کسی سے پیار کرتا ہے ناں تو اس کی خوشیوں کے لئے سوچتا ہے۔ میں جانتی تھی کہ راجے کے آدمیوں نے میرے بارے میں سارے گاؤں میں اڑا دیا تھا کہ میں راجہ کے ساتھ بھاگ گئی ہوں۔ میری ماں جانتی تھی کہ میں بھاگی نہیں ہوں۔ مجھے زبردستی اغوا کیا گیا ہے۔ اس نے چپ سادھ لی۔ راجے کے آدمیوں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر کسی نے زبان کھولی تو وہ مجھے بھی جان سے مار دے گا اور اسے بھی..........

"مجھے اپنی جان کی پروا نہیں تھی مگر.......... وہ تو ماں تھی ناں!! اس نے مرتے دم تک زبان نہیں کھولی اور جب راجے نے مجھے غلام حسین کے قابل نہیں چھوڑا' میں گاؤں میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہی تو.......... لوٹ کر کیا کرتی؟ یوں میری ماں بھی بچ گئی اور غلام حسین بھی۔ میں سمجھی تھی غلام حسین میرے تصور پر ہی تھوک چکا ہو گا۔ یہ بھی سنا کہ وہ بڑے دنوں تک گاؤں بھر میں پھنکاریں مارتا پھرا کہ اگر میں اسے کہیں مل گئی تو میرے ٹوٹے کر دے گا۔ پر وہ آگ رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہو گئی۔ راجہ مجھے لے کر کراچی چلا آیا۔ یہاں اس نے ہر وہ کام کیا' جس کی قانون اور مذہب اجازت نہیں دیتا۔ وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ یہاں وہاں پھرتا رہا۔ جو کچھ گاؤں سے لایا تھا' رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ گاؤں میں طرم خان تھا مگر یہاں تو گلی گلی اٹھارہ طرم خان ملے۔ ساری اکڑ نکل گئی کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ فاقے پڑے تو میرا حسن اور جوانی ڈھے گئی مگر میں اس کے لئے ایک ایسا سہارا تھی جو کسی بھی وقت اس کے کام آ سکتا تھا۔

میں نے اس سے منتیں کیں کہ وہ مجھ سے نکاح کر لے۔ گناہوں کا بوجھ مجھے مارے ڈالتا تھا۔ اس نے مہربانی کی سو میری یہ بات مان لی مگر بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ اس نے یہ بات کیوں مانی ہے۔ اب وہ پوری طرح مجھ پر قابض ہو چکا تھا۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ یہ گاؤں نہیں' بڑا شہر ہے۔ میں ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتی تھی۔ اپنے آپ کو اس سے آزاد کرا سکتی تھی۔ وہ خوفزدہ تھا کہ مجھے بھنک بھی پڑ گئی تو میں ایسا کر لوں گی مگر نکاح کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا سو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ میرے پاس ٹھکانہ بھی نہ تھا۔ ایک جگہ جھونپڑی ڈال لی۔ اچھے دنوں راجہ کو کوئی بڑا کام مل گیا۔ وہ اس روز بہت خوش تھا۔ اس نے آ کر بتایا کہ وہ ملک سے باہر جا رہا ہے اور جلد ہی واپس آ کر مجھے ایک بہت بڑے بنگلے میں رکھے گا۔ میں اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس سے پہلے بھی اس نے ہمیشہ اول فول ہی بکی تھی مگر وہ واقعی چلا گیا اور ایسا گیا کہ سال بھر تک اس کی شکل ہی نہ دکھائی دی۔

میرے پاس بہت وقت تھا۔ موقع بھی تھا کہ میں اپنے گھر لوٹ جاتی مگر.......... میں نے جب بھی ایسا سوچا' غلام حسین کی آگ برساتی آنکھیں تصور میں آ کر مجھے بھسم کرنے لگتیں۔ باپ برچھی اٹھائے میری طرف لپکتا محسوس ہوتا اور ماں.......... بس ماں کی آنکھوں میں جلتی قندیلیں تھیں جو مجھے بلایا کرتیں مگر میں انہیں بجھانا نہیں چاہتی تھی پھر گاؤں بھر کے لوگ میرے ساتھ کیا کریں گے' اس کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ تنہا اس جھونپڑی میں پڑی رہی۔ کچھ عرصہ بیماری رہی۔ پیٹ بھرنے کو جب سب کچھ جھونپڑی میں ختم ہو گیا تو ہمت کر کے باہر نکل آئی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار بستی والوں کی شکل دیکھی۔

بس ایک جنت تھی جو کبھی کبھی جھانک جاتی تھی۔ وہ اکثر راجے کی مار پیٹ کے بعد جھونپڑی میں گھس آتی تھی۔ اسے برا بھلا کہتی تھی مگر وہ اسے بھی گالیاں دے کر نکال دیا کرتا تھا۔ باقی کسی نے اس طرف آنے اور پوچھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ تو کسے مارتا ہے اور کیوں مارتا ہے۔ شاید شہر والوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا پھر جب میں باہر نکلی تو سیدھی جنت کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے میری حالت دیکھ کر مجھے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا۔ میں دنوں تپ میں پڑی رہی۔ اسی دوران پتا چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ مجھے تو اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بات سے بالکل خوشی نہ ہوئی اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ میں ایک اور راجہ کو جنم دوں گی پھر کسی غلام حسین کی جھاراں چھن جائے گی پھر کہیں محبت پر شب خون مارا جائے گا۔ جب مجھے جنت نے یہ اطلاع دی' مجھے غلام حسین بہت یاد آیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میرا بیٹا ہوگا تو میں اس کا نام گلزار رکھوں گا۔ وہ ہماری محبت کا مہکتا ہوا گلزار ہوگا۔ اسے یقین تھا کہ میں بیٹے ہی کی ماں بنوں گی۔ بیٹی کا اس نے کبھی بھول کر بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ ہماری شادی ہونے میں صرف چند دن باقی تھے جب غلام حسین کو گاؤں سے باہر جانا پڑا اور.......... راجہ جیسے بزدل نے اس کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مجھے اغوا کرلیا۔"

"کیا گاؤں میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو آپ کو بچاتا؟" زیبی نے اس کے نرم اور سرد ہاتھوں کو تھامتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کسی کو خبر ہوتی تب ناں!! وہ تو میرے آنگن کی دیوار پھاند کر آیا تھا اور کھڑکی کے راستے مجھے نکال کرلے گیا تھا۔ کون بچاتا مجھے اور پھر سویرے ہی اس کے آدمیوں نے واویلا مچا دیا کہ جھاراں بھاگ گئی۔"

"پھر.......... کیا ہوا؟" زیبی نے دوپٹے کے پلو سے اس کی عرق آلود پیشانی صاف کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ خود بھی بھول گئی کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ "پھر میں راجہ کا انتظار کرتی رہی مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا۔ پیٹ بھرنا تھا اس لئے جنت نے بستی سے کچھ دور بنگلوں میں کام دلا دیا۔ منہ اندھیرے وہاں جاتی اور رات کے ملگجے اندھیرے میں واپس آتی۔ دن گزرتے گئے۔ پیٹ پھولتا گیا' میرا کام کرنا دوبھر ہوگیا۔ جنت نے آخری دنوں میں مجھے بہت سہارا دیا۔ بیٹا ہوا تو میں نے اس کا نام گلزار رکھا۔ بڑا بدنصیب بچہ تھا جسے باپ کا سایہ ہی میسر نہ تھا مگر سچ زیبی! جو نو ماہ میں نے اپنی ہی کوکھ میں پلنے والے سے نفرت کرتے ہوئے گزارے تھے' اسے اس نے ایک پل میں محبت میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ صورت.......... وہ آنکھیں.......... وہ معصوم ساچہرہ' میرا سب کچھ بن گیا۔ میں بھول گئی کہ وہ راجہ کا تخم ہے۔ مجھے صرف یہ یاد رہ گیا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میرا گلزار۔ اب میں نے راجہ کا انتظار کرنا بھی چھوڑ دیا اور سوچا کہ اچھا ہی ہوا کہ وہ نہیں ہے۔ میرے بچے پر اس کا منحوس سایہ نہ ہی پڑے تو اچھا ہے مگر یہ میری بدقسمتی تھی کہ گلزار ابھی صرف ڈھائی برس کا ہوا تھا کہ ایک دن راجہ

لوٹ آیا۔

گلزار دن بھر جھونپڑی کے سامنے بنے سیمنٹ کے چبوترے پر کھیلا کرتا تھا اور اکثر وہ رات کو بھی وہیں چلا جاتا تھا۔ قریب کے سارے لوگ اسے پیار کرتے تھے۔ پہچانتے تھے۔ عموماً جب وہ میرے ساتھ جانے سے انکار کرتا تو میں اسے جنت کے پاس چھوڑ جاتی تھی۔ اس روز بھی وہ جنت کے گھر تھا۔ میں ابھی جھونپڑی میں گھسی ہی تھی کہ اچانک راجہ پہنچ گیا۔ اس کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ وہ ٹیکسی میں آیا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرے بیٹا ہوا تھا اور وہ اس وقت باہر ہے' اسے لے لوں تو اس نے مجھے زوردار لات ماری اور کہا۔ "کس کا گناہ پیدا کیا ہے تو نے؟"

"راجے! وہ.......... وہ تیرا بچہ ہے۔" میں نے کمر سہلاتے ہوئے کہا مگر اس نے مجھے پاگلوں کی طرح مارنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں کیسا باپ تھا وہ؟ اس نے میری بات پر یقین کیا' نہ مجھے چھوڑا۔ ساتھ لے چلنے پر بضد رہا۔ جب میں جان گئی کہ وہ مجھے میرے بچے سے جدا کرکے ہی دم لے گا تب میں نے شور مچانا چاہا۔ میں اپنے بچے کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لئے تو میں راجہ کو قتل کرنے کا بھی حوصلہ رکھتی تھی مگر زیبی.......... ! اس نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک بڑے سے کمرے میں قید پایا۔ تم یقین کرو گی کہ میں پورے ڈیڑھ برس تک اسی اکیلے کمرے میں قید رہی ہوں۔ جتنے آنسو تھے' خشک ہوگئے۔ گلزار کا خیال آتا تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یہ یقین کیوں نہیں کرتا کہ میں اس کے بچے کی ماں ہوں۔ اس نے تو اس بچے کے بارے میں جاننے یا کچھ پوچھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اتنا کٹھور پن دیکھ کر یوں ہوا جیسے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ صرف اور صرف میرا بچہ ہے۔

"بہت دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ راجہ اب بڑا آدمی بن گیا ہے۔ وہ ہیروئن کا اسمگلر ہے۔ کرائے کا قاتل بھی اور جانے کیا کیا کچھ ہے؟ ڈیڑھ برس کے بعد اسے یقین ہوگیا کہ میں بچے کو بھول چکی ہوں۔ وہ مجھ سے کام بھی کروانا چاہتا تھا جس پر میں تیار نہیں ہوتی تھی۔ آخر صرف یہ سوچ کر کہ شاید اس طرح یہ مجھے اپنے بچے سے ملنے دے یا' میں اس کو ڈھونڈ لوں' میں نے ہامی بھرلی۔ اپنے بچے کے بارے میں مجھے اتنا یقین تھا کہ جنت جب تک زندہ رہی' اس کی دیکھ بھال کرتی رہے گی۔ صرف یہ سوچ کر میں غم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاگل ہو جایا کرتی تھی کہ اتنی سی عمر میں وہ کیسا اکیلا پن محسوس کرتا ہوگا۔ میں اس سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ اسے پانے کو سب کچھ کرنے پر تیار ہوگئی۔ مجھے صرف اس قید سے رہائی چاہیے تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ میں کہاں ہوں؟ ڈیڑھ برس کے عرصے کے بعد راجہ نے مجھ پر اس شرط پر رحم کھایا کہ میں اس کا "مال" مطلوبہ جگہ پہنچایا کروں گی اور اس کے کاروباری ساتھیوں کو "خوش" کیا کروں گی۔

"شاید تم سوچو کہ میں بری عورت ہوں مگر زیبی بیٹا.........! اولاد بڑی بری چیز ہوتی ہے۔ میں بری عورت بن گئی۔ چھے ماہ لگے مجھے راجہ پر اپنا اعتبار قائم کرنے میں پھر میں ایک روز موقع پاکر اس کچی بستی کے اونچے نیچے راستوں پر گاڑی لے کر پہنچ گئی۔ وہاں وہ نالا تھا جہاں کبھی میری جھونپڑی تھی مگر جھونپڑی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چبوترہ بھی تھا مگر وہاں گلزار نہیں تھا۔ میں جنت کے گھر پہنچی تو پتا چلا کہ وہ ابھی پچھلے ہی ماہ فوت ہوگئی۔ میں گلزار کی تلاش میں تھی کہ مجھ پر ایک اور روح فرسا انکشاف ہوا۔ میرا بچہ، میرا گلزار غلام حسین کے پاس ہے۔ وہ بھی اسی بستی میں رہتا تھا مگر مجھے پتا بھی نہ چلا۔ حمیداں، جو جنت کی بیٹی تھی، اس نے بتایا کہ جنت نے غلام حسین کو بتا دیا کہ گلزار میرا بیٹا ہے۔ وہ غلام حسین کو اس طرح جانتی تھی کہ میں اسے اپنی داستان سنا چکی تھی پھر جانے کب غلام حسین اس سے ملا اور وہ جان گئی کہ وہ وہی غلام حسین ہے، جس سے مجھے چھین لیا گیا تھا۔ غلام حسین ابھی بھی میری تلاش میں تھا۔ وہ میرے بچے کو لے گیا۔

میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ گلزار، میری محبت کی پناہ میں ہے۔ محفوظ ہے۔ میں چاہتی تو اس سے ملتی مگر اب میں ایک ایسی دلدل میں اتر چکی تھی، جہاں سے نکلنا میرے بس میں نہ تھا۔ نہ تو میں اپنی اصلیت سے غلام حسین کو آگاہ کر سکتی تھی اور نہ گلو کو پیار کر سکتی تھی کہ میرا وجود اس کے لئے ایک گھناؤنے سائے سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا پھر کبھی پلٹ کر اس طرف نہیں گئی۔ اس دوران میں راجہ کا حریف، فتح مجھے مل گیا۔ اس نے مجھے اس دلدل سے نکالنے کا وعدہ کیا۔ راجہ کا مقابلہ کیا اور مجھے اس کے گھیرے سے نکال لے گیا۔ میں اس کی ممنون ہوں کہ واقعی اس نے مجھے دنیا بھر کی "گندگی" سے بچالیا۔ اس کی بہن کی بیٹی تھی جس کی پرورش کے لئے اس نے مجھے رکھ لیا۔ وہ بڑی پیاری بچی تھی......... پچھلے ماہ

اس نے خودکشی کرلی۔

پھر بیس برس گزر گئے۔ آج سے کچھ برس پہلے میں پھر غلام حسین کی گلی میں گئی۔ بڑی ہمت کی کہ اس کے گھر پہنچ جاؤں مگر......... قدموں نے ساتھ نہ دیا۔ میں نے فتح سے سب کچھ چھپایا تھا......... آخر ایک روز اسے بتا دیا۔ تب وہ سن کر حیران رہ گیا کہ گلو میرا بچہ ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور یہ کہ وہ تو اسے قتل کر دینے کی قسم بھی کھا چکا ہے۔ میں اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس کے بدلے میں نے معافیاں مانگیں اور اس کی جان بخشی کروا کر ہی دم لیا۔

اس نے مجھے اجازت دے دی کہ اگر میں گلو کے پاس جانا چاہوں تو چلی جاؤں مگر اس دوران میں مجھے فتح کے ڈرائیور جانو سے پتا چل گیا کہ وہ ماں باپ کے نام ہی سے بے پناہ نفرت کرتا ہے۔ وہ صرف اور صرف اپنے چاچا سے پیار کرتا ہے یعنی میرے غلام حسین سے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں غلام کے پاس چلی جاؤں مگر جانتی تھی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو پھر اپنے بچے سے محروم ہی رہوں گی بلکہ میرا بچہ ماں باپ کے بعد اپنے چاچا کو بھی کھو دے گا پھر اسے کیسے بتاتی کہ غلام حسین میرا کون ہے یا کیا رشتہ ہے اس سے میرا؟ اگر وہ اپنے باپ کا نام پوچھتا تو میں کیسے بتاتی کہ کراچی کا سب سے خراب آدمی اس کا باپ ہے اور ایسا باپ ہے جو اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں ہے۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے زیبی.........! میں اسے "بیٹا" کہہ کر پکارنے کو تڑپ رہی ہوں۔ مجھے پتا چلا کہ اس کی شادی ہے۔ تم سوچ نہیں سکتیں کہ میری کیا حالت ہوئی، میرا جی چاہا کہ میں راجہ کا خون پی جاؤں جس نے مجھ سے، میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی اور اس کی کوٹھی پہنچ گئی۔ فتح، اس کا سب سے طاقت ور حریف تھا۔ اس کی وجہ سے وہ میرا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ بالخصوص اس لئے کہ میں اسے بتا کر راجہ کے پاس گئی تھی۔ اس نے فون کر کے بھی کہہ دیا تھا کہ جہاں آرا تمہاری مہمان ہے۔ راجہ جانتا ہے کہ میں جب چاہوں، اسے سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتی ہوں۔ شاید میرا اس کی کوٹھی میں جاکر یوں شور مچانا، گالیاں دینا، اسے چوکنا کر گیا۔ وہ جان گیا کہ اب غم نے میرا دماغ بالکل خراب کر دیا ہے۔ میں کسی بھی وقت اس کے لئے خطرہ ثابت ہو سکتی ہوں۔ شاید اس نے اپنے آدمی میرے پیچھے لگا دیئے۔ میں گلو کی شادی پر اسے دلہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بنا دیکھنے کی خواہش لئے اندھیری گلی میں دبے پاؤں شامیانے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ.........."

زیبی کو لگا جیسے اس کے سامنے دنیا کی سب سے غم زدہ عورت لیٹی ہے۔ وہ بیٹی جو باغیرت تھی مگر ماں باپ کی بے غیرتی کا باعث بنی' وہ محبت کرنے والی وفاشعار عورت جس پر بے وفائی کا الزام آیا' وہ اچھی بیوی جس نے ایک خراب شوہر کو برداشت کیا مگر دھتکاری گئی اور وہ ماں جو اچھی ماں ہونے کے باوجود بھی بیٹے کے لئے باعث نفرت ٹھہری' اس وقت اس کی ویران آنکھیں پیار کی متلاشی تھیں۔ زیبی نے عہد کرلیا کہ وہ گلو کے دل میں اس کی ماں کی محبت' احترام اور عزت پیدا کرے گی اور اب وہ اسپتال سے آتے ہوئے گلو سے کہہ آئی تھی کہ وہ شام کو گھر آجائے۔ اسے کچھ ضروری کام ہے۔

گلو نے ہونقوں کی طرح اسے دیکھا تھا پھر اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا تھا اور تب زیبی کا دل رو پڑا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گلو کیا سوچ رہا ہوگا؟ اسے گمان بھی نہ ہوگا کہ زیبی اسے کیوں بلا رہی ہے۔ وہ تو سمجھا ہوگا کہ زیبی کمزور ہوگئی۔ برداشت ختم ہوگئی اس کی مگر اسے علم نہیں تھا کہ محبت کرنے والے دنیائیں بسانا جانتے ہیں' اجاڑنا نہیں۔ زیبی اس کی بسی بسائی دنیا بھلا کیوں اجاڑ دیتی پھر نازاں کا کیا قصور تھا؟ وہ معصوم سی لڑکی جسے علم ہی نہیں تھا کہ زیبی کہانیوں والی شہزادی کی طرح برسوں سے اپنے خوابوں کے محل کے جھروکے میں بیٹھی گلو کی منتظر تھی۔

اسے یقین تھا کہ گلو ضرور آئے گا اور یہ بھی یقین تھا کہ وہ اس کے پتھر دل میں پھول کھلا دے گا۔ محبت اسے نہ ملی تو کیا ہوا۔ اس کی کوشش سے کسی کو تو مل ہی جائے گی۔ اس نے تھکن سے آنکھیں موند لیں۔ ابھی اسے بہت سے کام کرنا تھا۔ ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا ابھی باقی تھا۔ بہت بڑا اور آخری فیصلہ۔

☆==========☆==========☆

امام دین بہت خوش تھا۔ آج اس نے سارے کام نمٹا دیئے تھے۔ اسے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی وہ سارے کام چٹکی بجاتے ہو جائیں گے۔ بس ایک حجت تھی' وہ بھی وکیل نے کہہ دیا تھا کہ صبح کورٹ سے اسٹامپ پیپر پر سب کچھ تیار کرکے لے آئے گا۔

امام دین خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آج وہ کراچی کی ان

ساری سڑکوں سے گزرے' ان تمام فٹ پاتھوں پر گھومے' جہاں اس نے اتنے برس گزارے۔ گرمی' سردی' بہار کے سارے موسم کبھی جانے بوجھے جذبوں سے اور کبھی انجانے میں گزار دیئے۔ ان فٹ پاتھوں پر لگے کھمبوں سے اسی طرح جا لپٹے جیسے وہ بچپن میں ان پر جھول جاتا تھا۔ وہ لسبیلہ کے اس پل کے فٹ پاتھ پر انہی پھول والوں کی دکانوں کے باہر بیٹھ کر آلو چھولے یا بن کباب کھائے جیسے اس نے برسوں کھایا تھا۔

کتنی معصوم فکریں تھیں جو اس کے ساتھ ساتھ جوان ہوکر پختہ ہوگئی تھیں۔ وہ بدمعاش بننے کی خواہش' وہ اپنے لاغر اور پچکے ہوئے سینے کو پھلانے کی کوششیں' آواز کو بھاری بناکر' بھنویں اچکا کر خاص انداز سے بات کرنے کا بھوت۔ یہ سب کچھ سوچ کر اسے آج ہنسی آرہی تھی۔ وہ اپنے بیتے دنوں کو یاد کرنا بلکہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ڈر رہا تھا۔ صرف ماضی تھا جو یاد آرہا تھا۔ سیلاب میں سب کچھ بہہ جانے کے بعد کا عرصہ.......... اس سے پہلے کا وہ کچھ یاد نہیں کرنا چاہتا تھا مگر سامنے ونڈ اسکرین پر سیلاب میں ڈوبتی ابھرتی ماں کی شبیہہ بار بار یوں چمک جاتی جیسے آسمان کے گھنے بادلوں میں بجلی کوندی ہو۔ وہ پھر سر جھٹک کر شرارتیں سوچنے لگتا۔ تب اچانک کہیں سے زیبی کا اداس چہرہ ابھر آتا۔ اس کا متضاد رویہ' اس کی مسکراہٹ اور سرد مہری' اس کا بلانا اور خاموش رہنا' اس کی اپنائیت اور پھر غیریت۔

اس نے پھر ذہن کو جھٹک دیا۔ ذرا سا ہوش آیا تو وہ لسبیلہ کے پل پر کھڑا تھا۔ پھول والوں کی دکانوں کے عین سامنے۔ وحید الدین اسے دیکھتے ہی پہچان گیا حالانکہ امام دین کوئی چھ' سات برس بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ دوڑا آیا۔ امام دین اس سے لپٹ گیا پھر ڈھیروں باتیں کر ڈالیں۔ سب کا نام لے لے کر پوچھا۔ اس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا جہاں پہلی بار گلو کو بٹھا کر اس نے برگر کھلایا تھا۔ اس کے اکیلے پن کی کہانی سنی تھی۔ اسے اپنا دوست بنالیا تھا۔

وحید الدین نے پھولوں کا گلدستہ ٹیکسی میں رکھ دیا۔ اسے ٹیکسی کے مالک کی حیثیت سے دیکھ کر وہ بہت خوش تھا۔ گیراج کا پتہ بھی پوچھ لیا تھا۔

پھر گھنٹا بھر گزار کر وہ دوبارہ آنے کا کوئی وعدہ کئے بغیر گیراج کی طرف چل دیا۔

اسے خیال آیا کہ وہ گلو سے مل لے۔ پر نازاں کا دھیان آتے ہی وہاں جانے کا ارادہ ترک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ نازاں اسے دیکھ کر ڈھے جائے گی۔ اس نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی ہمت ہار بیٹھتی ہے۔ شاید رازدار' آدمی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ بھولی بسری یاد دلا دیتا ہے۔ وہ یاد' دکھ بھری ہو تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ جیسے اچھے دنوں کے ساتھی سے برسوں بعد مل کر سنہرا ماضی یاد آجاتا ہے' اسی طرح دکھوں کے ساتھی سب کچھ یاد دلا دیا کرتے ہیں۔ اس نے سوچا۔ "چھوٹے کو بھیج کر گلو کو گیراج پر بلوائے گا۔"

"گھر بلوانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" اس نے خود کلامی کی.......... "ایک دن کا انتظار کرنا اتنا مشکل نہیں اور گلو کو تو انتظار بھی نہ ہوگا' انتظار تو اسے کرنا تھا۔ صبح کاغذات تیار ہونے ہے۔ وہ کچھ وقت ساتھی دکانداروں کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ زیبی سے باتیں کرنا چاہتا تھا...... اس کو ایک بار اور ہمت جمع رکھنے کی تاکید کرنا تو خیر منٹوں کا کام تھا.......... اور.......... اور بس.........."

پھر اچانک اس نے گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔ زیبی سے آج ہی بات کرلیتا تو کل کا کام ہلکا ہو جاتا۔ اب سرمئی رنگ میں ڈوبتی ہوئی سڑکوں پر کہیں کہیں کھمبوں پر لگے بلب جلنے لگے تھے۔ گاڑیوں کی بیک لائٹس آن ہوگئی تھیں۔ اس نے اندھیرا اترتے دیکھا تو احساس ہوا کہ اس نے بہت وقت سڑکوں پر گھومتے گزار دیا ہے۔ اس نے ٹیکسی موڑی۔ پندرہ منٹ بعد ہی وہ اپنی گلی میں داخل ہوا۔ رکا پھر جانے کیا سوچ کر پلٹ آیا۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ پوری قوت سے ٹیکسی کا رخ موڑ دیا اور دوسرے ہی منٹ وہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"کون؟"

"میں.......... میں ہوں' امام دین.........."

دروازہ کھلا.......... زیبی کے چہرے پر اضطراب اور آنکھوں میں حیرت تھی.......... امام دین نے ہمیشہ اس کے چہرے پر جذبوں کا تضاد ہی دیکھا تھا۔ یوں جیسے چہرہ کسی اور کا ہو اور آنکھیں کسی اور کی۔ "تم.......... مگر تم تو.........." پھر اچانک وہ دونوں ہاتھوں کو رگڑ کر اضطرابی انداز میں مڑ گئی۔

"ہاں میرا آنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔" آج امام دین نے خود میں بلا کا اعتماد محسوس کیا۔ آج اسے سامنے پاکر وہ نہیں' زیبی ہکلائی تھی۔ مضطرب ہوگئی تھی۔ "تم

شاید پریشان ہو یا.......... ہوگئی ہو۔" ماے نے یوں طنزیہ انداز میں کہا جیسے اس نے پہلی بار اس کی کوئی چوری پکڑی ہو' یا کچھ جتانا مقصود ہو..........

"ہاں۔" وہ بولی تو نظر آنے والا اضطراب کہیں بھی نہیں تھا۔ بڑا ٹھہرا ہوا' بڑا گہرا اور پُرسکون انداز تھا حالانکہ پریشانی اب بھی اس کی آنکھوں میں بپھرے ہوئے سمندر کی طرح موجزن تھی۔ "ہاں.......... میں تمھیں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ اس لئے کہ میں.......... میں تو گلو کی منتظر تھی۔"

امام دین کو لگا جیسے قریب ہی بم پھٹا ہوا۔ "کیوں؟" اس نے اس انداز میں کہا جیسے زیبی پر صرف اسی کا حق ہو۔

"کام تھا ضروری۔" اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔ "ویسے اب میں سوچ رہی ہوں کہ پہلے یا بعد میں۔ تمہیں یہ سب کچھ بتانا تو تھا۔ تم پہلے ہی آگئے ہو تو شاید یہی اچھا ہے.......... اس طرح تم مجھے مشورہ بھی دے سکتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے پر میں جو قدم اٹھا رہی ہوں وہ درست ہے مگر یہ سراسر غلط بھی ہو سکتا ہے کیونکہ گلو کو میں نہیں۔ تم زیادہ بہتر جانتے ہو.........."

زیبی کا پُراعتماد لہجہ امام دین کو پھر کسی لجلجی سی' بے وقعت' شے میں تبدیل کر گیا۔

"کیا کام.......... وہ.......... گلو سے بھلا..........؟"

"بیٹھ جاؤ.........." اس نے اسے یوں گہری نظروں سے دیکھا جیسے اس کی کیفیت ہی سے نہیں' اس کیفیت کے سبب سے بھی خوب آشنا ہو۔ اور پھر اس نے دھیرے دھیرے ساری داستان امام دین کو سنا دی۔

امام دین پتھر کے بت کی طرح بیٹھا سنتا رہا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ وہ زیبی کے سامنے بیٹھا ہے۔ اسے تو صرف اتنا یاد رہ گیا کہ اسماعیل اور فیض محمد دونوں ہی گلو کے مجرم ہیں.......... نازاں اور جھاراں کے مجرم.......... اور مجرم بھی ناقابل معافی.......... انہیں سزا ملنا ہی چاہئے تھی۔ ہر حال میں.......... اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں یہ سزا گلو یا چاچا' نازاں یا جھاراں دیں.......... وہ چاروں جو ایک دوسرے سے وابستہ تھے مگر ان کے درمیان لمبی جدائیاں حائل رہیں۔ آج گلو زندگی کے جس دور میں داخل ہوا تھا اس کے دروازے پر خوشیاں اس کی منتظر تھیں۔ "اسے یہ خوشیاں ملنی ہی چاہئیں۔" اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فیصلہ کرلیا۔ ایک کام زیبی نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ دوسرا کام نمٹانے کا فیصلہ امام دین کرچکا تھا اور یہ سب جان لینے کے بعد تو اسے اپنے کیے گئے فیصلے پر بے حد خوشی محسوس ہوئی۔

"میرا کیا ہے زیبی.......... میری ماں تو ملنے والی نہیں.......... وہ تو میرے سامنے مر گئی تھی۔ میں بالکل اکیلا ہوں اور زندگی اکیلے آدمی کو بہت ستاتی ہے۔ جذبے رشتوں کے محتاج ہوتے ہیں' رشتے نہ ہوں تو آدمی اندر سے خود کو کھوکھلا محسوس کرتا ہے اور اندر سے کھوکھلا ہو تو ذرا سے دکھ کا بھی شور بہت محسوس ہوتا ہے.......... میں بھی اس شور سے تنگ آیا ہوا تھا۔ سوچتا ہوں میں نے کس خوشی کے لئے اتنے عذاب اٹھائے تھے۔ اتنی بھی زندگی خود کو سنبھال سنبھال کر جیتا رہا مگر آج اپنے جینے کا مقصد نظر آنے لگا ہے۔ تم نے گلو کے دل سے نفرت کسی حال میں بھی نکالنی ہے۔ میں جھاراں کا دکھ جان سکتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ تم خود بھی اس دکھ سے واقف ہو۔"

"تم کیا کرنے کا ارادہ کر رہے ہو؟" زیبی جیسے سب کچھ جان گئی۔

"میں.......... میں.......... ابھی بتانا نہیں چاہتا مگر.........."

"امام دین.......... ! مجھے یہ سب ایسے موقع پر جان کر دکھ ہوا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکی مگر یقین کرو' میں منافقت کر نہیں سکتی۔ میں دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی وہ بھی تمہیں کہ تم میرے محسن ہو.......... ورنہ..........؟"

"نہیں.........." امام دین نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ خوشی ہے کہ میں آج ایسا فیصلہ کرنے کے قابل ہوں۔ تم.......... تم اگر میرے لیے کچھ کرلیتیں تو شاید میں ایک ایسے جال میں پھنس کر رہ جاتا جہاں آدمی صرف اپنے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ بہرحال تم سے صرف آخری بار کہہ رہا ہوں کہ میں جو کچھ کرنے جارہا ہوں وہ اپنے لیے نہیں.......... گلو جھاراں' نازاں اور چاچا کے لئے ہے.......... میں ان کی آنکھوں کا کوراپن اب نہیں دیکھنا چاہتا۔ جن آنکھوں میں خواب سج گئے ہیں انہیں تعبیر مل جائے تو.......... میرا دکھ ختم ہو جائے گا.......... تم مجھے غلط مت سمجھنا.......... اپنا خیال رکھنا تمہیں آتا ہے۔ اس لئے مطمئن ہوں۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ تم تمام زندگی یہیں گزارنا زیبی مگر زندگی کو کوئی سندر ڈھب ضرور دے لینا۔ عام سی زندگی کا

بھی مزہ بہت مختلف' بہت اچھا اور روح پرور ہوتا ہے۔"

"امام دین.......... اس بات کا پابند نہ کرو۔ میں یہاں رہ نہیں سکتی۔ میں گلو سے اتنی دور چلے جانا چاہتی ہوں جہاں اس کا تصور بھی مجھے نہ بہکا سکے۔ عورت ہوں ناں! عورت کی فطرت سے واقف ہوں۔ جہاں کمزور پڑی' گلو مجھے آہنی سہارا محسوس ہوگا۔ پھر اس کی طرف بڑھنے والا ایک قدم' اسے اس کی نازاں سے کئی کوس دور کردے گا' آج میرا ایمان مضبوط ہے' ارادہ مضبوط ہے تو میں اس کے لئے قربانی کو تیار ہوں' کل ایمان ڈگمگا گیا تو خود کو ہزار تاویلوں سے بہلا کر کسی کی دنیا بھی اجاڑ سکتی ہوں۔ ڈرتی ہوں اس وقت سے.........."

"کہاں جاؤں گی؟"

"گاؤں!"

"وہاں کون ہے؟"

"یہاں کون ہے؟" وہ ہنس پڑی۔ "آدمی خود ہی اپنا دوست اور دشمن ہوتا ہے۔ اپنے سوا اسے کسی کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اگر وہ زندگی کا گہرا مطالعہ کرچکا ہو تو۔"

"تم اتنا کچھ کیسے جانتی ہو؟"

"میں نے لمحہ لمحہ زندگی کی شاہراہ پر قدم جما کر رکھا ہے۔ ہوا میں تیرتے ہوئے گزرنے کی کبھی شعوری کوشش نہیں کی.......... اور اگر آدمی ہر گزرے لمحے کا عکس ذہن میں محفوظ کرلے تو وہ بنا لکھے پڑھے ہی فلسفی بن جاتا ہے۔ تب سب کچھ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھ رہا۔ بہرحال' یہ گھر تمہارا ہے اور یہ میری خواہش ہے کہ اگر بچ بچا کر رہ سکو تو یہیں رہ جانا۔" امام دین کھڑا ہوگیا۔

"ضرور کوشش کروں گی' صرف تمہاری خواہش پر.......... کاش میں تمہاری ایک خواہش پوری کرسکوں.......... شاید اس طرح ان احسانوں کا بدلہ چکا سکوں جو تم نے مجھ پر کیے ہیں۔"

"اس وقت ایسی باتیں کرکے، میرے دل کا بوجھ مت بڑھاؤ.......... میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ایک خراب اور بدمعاش آدمی تھا۔ تم ثابت قدم نہ ہوتیں تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری شرافت کب کی کھل چکی ہوتی۔ اسے قائم رکھنے میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا ہے۔ یہ تمہارا احسان ہے اور میں حساب برابر سمجھتا ہوں۔ اگر کبھی کوئی لرزش ہوئی ہو' میرے کسی رویے سے تمہیں دکھ پہنچا ہو تو معاف کر دینا۔"

"کتنی بڑی سعادت ہے ماسے کہ ہم.......... ہم دونوں کے پاس اتنا وقت ہے کہ ہم ایک دوسرے سے اپنے افعال کی معافی مانگ رہے ہیں۔ مجھے بھی معاف کر دینا۔ لوگوں کو تو یہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کبھی معاف کرنے والا سامنے نہیں ہوتا اور کبھی.......... معافی کا وقت نہیں ملتا.......... مجھے یقین ہے کہ تم سکون پاسکو گے.......... میرے سکون کے لئے جب تک دعا کرسکو' ضرور کرنا.........."

"خدا حافظ!"

"خدا حافظ و ناصر.......... خدا تمہیں' تمہارے مقصد میں کامیاب کرے۔"

☆==========☆==========☆

زیبی نے یوں دعا کی جیسے جانتی ہو کہ امام دین کیا کرنے جارہا ہے۔ ماسے کا جی چاہا کہ اسے کچھ اور بتا دے۔ نازاں کی تباہی کا حال تاکہ وہ جان سکے کہ فیض محمد نے سزا کیوں پائی' مگر اچانک اسے احساس ہوگیا کہ ایسا کرنا اس کے مقصد پر بھاری زد کے مترادف ہوگا۔ وہ پردہ پوشی اور راز کی امانت میں' خیانت کا مرتکب ہوگا۔ وہ اسے نظر بھر کر دیکھنے کے بعد پلٹ گیا۔

زیبی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "واقعی تم نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہے ماسے.......... تم محبت کرنے کے قابل تھے مگر.......... مجھے معاف کر دینا۔" وہ بڑبڑائی.......... اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ وہ حیران تھی' گلو کو آجانا چاہئے تھا مگر دور تک کسی کے قدموں سے لپٹ کر جیسے ساری آوازیں ہی اس کے گھر کو خالی کر گئی تھیں۔ وہ آنگن میں پڑی کرسی پر ڈھے گئی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

☆==========☆==========☆

گلو کو زیبی کے گھر جانے کی جلدی تھی۔ چاچا اسپتال چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔ نازاں اکیلی تھی اور اسماعیل نے اسے بلوایا تھا۔ امام دین سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی اگر ہو جاتی تو وہ فیض محمد کے آنے کا بتا کر اسے ہی بھیج دیتا۔ وہ چاچا کو اسپتال میں چھوڑ کر گھر پہنچ

گیا۔ نازاں بہت ہراساں تھی۔ اسے دیکھتے ہی رو پڑی۔ "تجھے کیا ہوا؟"

"میں.......... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اکیلے گھر میں.......... تم نے اتنی دیر کر دی۔ چاچا کہاں ہے؟"

اس نے بتایا کہ چاچا اب اس وقت تک نہیں آئے گا جب تک جھاراں اچھی نہیں ہو جاتی۔ "عادت ڈال اس طرح اکیلے رہنے کی۔" اس نے پانی گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ "رحمان چاچا کے گھر چلی جا.......... مجھے کام سے جانا ہے' دیر بھی ہوسکتی ہے' واپس آ کر لے لوں گا۔"

اور نازاں چپ چاپ دیکھتی رہ گئی۔ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ تیرے سوا مجھے ہر شخص سے خوف آنے لگا ہے۔

"کھانا کھالیا تو نے؟" گلو کو اچانک خیال آگیا۔

"نہیں!"

"نکال۔" وہ ہاتھ دھونے ٹنکی کے نیچے بیٹھ گیا۔ اچانک پلٹا۔ "کوئی آیا تھا کیا؟"

نازاں کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ وہی آیا تھا جس نے مجھے تباہ کیا تھا مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔ "وہ.......... ایک آدمی تھا۔ نہیں.......... دو آدمی تھے۔ گاڑی میں.......... کہتے تھے گلو کو بولنا اسماعیل نے بلایا ہے۔" وہ خشک حلق کو تر کرتے ہوئے بولی۔ "پھر.......... وہ امام دین بھی آیا تھا.......... بتانے کہ جھاراں کو ہوش آگیا ہے۔ تم دونوں جا چکے تھے۔" وہ امام دین کے آنے والی بات چھپا ہی نہ سکی کہ کیا پتا امام دین بتا دے اور گلو کو سوچے کہ نازاں نے کیوں نہ بتایا۔

"اچھا جلدی کر۔" وہ پھر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ نازاں نے کھانا گرم کر دیا۔ خود اس کی تو بھوک ہی اڑ چکی تھی مگر گلو کی وجہ سے ساتھ بیٹھ گئی۔ دو چار نوالے کھا کر اس نے پانی پی لیا۔ لگا جیسے گلو پوچھے گا۔ "کیوں نہیں کھاتی۔" مگر اسے تو اتنی جلدی تھی کہ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ نازاں کے حلق سے نوالے اتر ہی نہیں رہے۔ نازاں کے حلق میں نمک گھل گیا۔ آنکھوں کے کنارے نم ہوئے۔ اندر پلنے والے عذاب نے اس کی ساری خود اعتمادی چھین لی تھی.......... اپنی سوچی اور کہی ہوئی ہر بات غلط لگنے لگی تھی۔

"میں جارہا ہوں۔ چل رحمان چاچا کے گھر چھوڑ دوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ساتھ نکل گئی۔ گلو نے چاچا اور چاچی کو بتایا کہ جھاراں ہوش میں آگئی ہے‘ چاچا وہیں ہے اور اسے ضروری کام سے جانا ہے اس لیے نازاں کو وہ واپسی پر لے لے گا۔ اکیلے میں ڈرتی ہے۔

"اب نہیں ڈرے گی۔ اب دیکھنا گھر‘ گھر لگنے لگے گا۔ جھاراں آگئی تو گھر کو جنت بنادے گی۔" رحمان چاچا نے نازاں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

گلو چپ چاپ نکل گیا۔ اسے زیبی تک پہنچنے کی جلدی تھی مگر جانے کیسی رکاوٹیں تھیں۔ ایک جگہ موڑ .... کاٹتے ہوئے موٹر سائیکل والے کو سائیڈ مار گیا۔ وہ لڑھکتا ہوا دور جاگرا........... گلو بریک لگا کر چھلانگ مار کر اس کی طرف لپکا۔ موٹر سائیکل بیچ سڑک پر پڑی تھی۔ لوگ جمع ہوگئے۔ آنے والی گاڑیوں کے چرچراتے بریک ہنگامہ کھڑا کر گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ گرنے والا بچ گیا تھا۔ معمولی چوٹ تھی مگر عجیب بدتمیز آدمی تھی۔ گلو سے لپٹ گیا۔ ٹریفک سارجنٹ آگیا۔ چالان ہوا۔ مجمع میں کچھ لوگ گلو کے ہمدرد تھے۔ کچھ لوگ گرنے والے کی طرف داری کر رہے تھے۔ وہ بدمعاشی پر اتر آیا تھا۔ گلو پریشان ہوتا رہا۔ نقصان پورا کرنے کی کوشش کی تو وہ اور پھیل گیا۔ انہوں نے گلو کو اس آدمی کی طرف لپکتے اور معافی مانگتے دیکھا تھا۔ بڑی مشکل تھی۔ گلو کو صرف یہ فکر تھی کہ وقت گزر رہا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ زیبی نے کہہ دیا تھا کہ دیر میں نہ آئے۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ وہ اکیلی رہتی ہے۔ رات گئے جانا غلط ہے۔ بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جارہی تھی۔ گیارہ بج گئے تھے۔ گلو اندر سے ڈھے گیا۔ لگا کہ قسمت دشمنی پر اتر آئی ہے۔ خوب چیخا چلایا۔ کچھ معقول لوگوں نے معاملہ طے کرایا۔ موٹر سائیکل والا زیادتی کر رہا تھا اس کا اندازہ سبھی کو ہو گیا تھا۔ سارجنٹ بھی گلو کے ساتھ ہوگیا۔ ہنگامہ ختم ہوا تو سوا گیارہ بج چکے تھے۔ وہ لوٹ آیا۔

نازاں ویسی ہی سہمی سکڑی بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے لے کر گھر پہنچا۔ پھر وہ رات بھی ذہنی انتشار کی نذر ہوگئی۔ نازاں اس رات صرف لمس کی منتظر رہی‘ پھر تھک کر سوگئی۔ گلو جاگتا رہا۔ سوچتا رہا کہ زیبی کیا کہے گی۔ عجیب سے دوراہے پر آگیا تھا۔ نازاں پر ترس آتا تب بھی خود کو اسے تسلی دینے یا ہنس کر بات کرنے کے قابل نہیں

پاتا........... ایک دم سب کچھ غلط سلط ہوگیا تھا۔ یہ تو سوچ لیا تھا کہ سویرے چاچا کو ناشتا دے کر سیدھا امام دین کے پاس جائے گا تاکہ اسے اسماعیل کے پاس بھیج سکے پھر زیبی کے گھر جائے گا۔ وہاں سے واپسی پر امام دین سے پوچھ لے گا کہ اسماعیل نے کیوں بلایا تھا‘ ویسے اصولی طور پر تو اسے اس کے بلانے پر فوراً ہی چلے جانا چاہیے تھا آخر اس نے اپنی مرضی سے اس کے کام کی حامی بھرلی تھی۔

یہی باتیں سوچتے سوچتے رات بیت گئی۔ وہ دھیرے سے اٹھا۔ جانتا تھا کہ نازاں دیر سے سوئی ہے۔ اسے کچھ نہیں تو‘ آرام تو دے ہی سکتا تھا۔ اس نے خود ہی چائے کا پانی چڑھا دیا۔ نہا کر نکلا تو نازاں کو جاگتا پایا۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اسے افسوس ہوا۔ "تو کیوں اٹھی! سوئی رہتی۔ میں چائے پی کر چلا جاتا۔"

"چاچا کے لئے ناشتا لے کر نہیں جانا؟"

"بازار سے لے لیتا۔"

"وہ بازار کا نہیں کھاتا۔" نازاں نے توا چولھے پر رکھ دیا۔

☆==========☆==========☆

وہ ناشتا لے کر نکلا تو سورج اونچا ہو چکا تھا۔ چاچا اسے دیکھتے ہی کھل اٹھا۔ "اتنے سویرے آگیا بڑوا! دلہن کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" گلو نے جھاراں سے نگاہ چرائی۔ پتا نہیں کیسی نگاہیں تھیں اس کی کہ اگر دیکھ لیتا تو دل موم کی طرح پگھلنے لگتا تھا۔ وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا کہتا ہے ڈاکٹر؟" گلو بینچ کے کنارے بیٹھ گیا۔

"تین چار دن لگیں گے۔ مگر گلو! بیٹا‘ دوائی تو یہ گھر پر بھی کھا سکتی ہے۔ تو ڈاکٹر سے بات کر........... گھر کا سا آرام نہیں مل سکتا۔ پھر نازاں کی مجھے بہت فکر ہے۔ تو تو ٹکتا نہیں گھر میں۔ وہ بیچاری نئی دلہن سارا دن گھر میں اکیلی رہتی ہوگی۔ وہ دیواریں تو مجھے بھی کاٹنے کو دوڑتی تھیں۔ ہولہان کر دیا تھا۔ معصوم بچی تو مرہی جائے گی........... اب تو یہاں سے سیدھا گھر جائیو۔"

"کچھ نئیں ہوتا اسے........... دیواریں کسی کو نئیں کاٹتیں۔"

"تو اکیلا پن کاٹتا ہوگا۔" چاچا کی بجائے جھاراں بول اٹھی۔ اس کی آواز میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نقاہت تھی۔

"اکیلا پن سب کو کاٹتا ہے مگر کوئی نئی مرتا۔" گلو نے دیوار پر لگے انسانی ڈھانچے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "نہ یہ اکیلا پن کبھی دور ہوتا ہے۔" عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔

"لیکن............ اب گھر کا سونا پن ختم ہو جائے گا۔" چاچا نے اچانک بول کر سناٹا توڑ دیا۔

"گھر کا سونا پن نہیں چاچا............ تیرا سونا پن شاید ختم ہو جائے۔" پتا نہیں گلو کے لہجے میں کیا تھا۔ سناٹا پہلے سے گہرا ہو کر پھیلا تھا۔

"تو گلو! یہ جرم ہے کیا؟" چاچا نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں تو............ میں ایسا تو نہیں کہہ رہا۔ تیری خوشی تو شاید میرا اور نازاں کا سونا پن بھی ختم کر دے۔" گلو کو اچانک اپنی سفاکی کا احساس ہوا تھا۔

مسکراہٹ چاچا کے ہی نہیں جھاراں کے چہرے پر بھی پھیل گئی۔ پتا نہیں کیوں وہ بھی مسکرانا چاہتا تھا مگر کوئی اندر سے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ دیتا تھا۔

"میں جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟"

"کام ہے۔"

"دیر نہیں کرنا بیٹا۔ نازاں تیری ذمے داری ہے۔ اسے سکھ دینا ہی تیری زندگی کا مقصد ہونا چاہئے اور تو پہلے ڈاکٹر سے بات کر۔"

گلو نے ڈاکٹر سے بات کی۔ ڈاکٹر نے کچھ پس و پیش کے بعد رات کو جواب دینے کا کہہ دیا۔ اسے سینئر ڈاکٹر سے مشورہ کرنا تھا۔ ایکسرے لینا تھا پھر رپورٹ سامنے آنے کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کر سکتا تھا۔ چاچا یہ سن کر خوش ہو گیا۔ اسے کہہ دیا کہ رات کو نازاں کو ساتھ لے آئے۔ اسے یقین تھا کہ آج وہ لوگ گھر چلے جائیں گے۔

☆==========☆==========☆

گلو وہاں سے سیدھا امام دین کے گیراج پہنچا تھا۔ چھوٹے نے بتایا کہ وہ وکیل کے پاس گیا ہے۔ گلو کو حیرت ہوئی۔ "کیسا وکیل............ کسی چکر میں آ گیا ہے کیا؟"

"پتا نہیں گلو بھائی............ مجھے تو کچھ گڑ بڑ لگتی ہے۔ کل ساری رات پاگلوں کی طرح بولتا رہا ہے۔ میں کئی بار آیا' دروازہ بجایا مگر اس نے کھولا نہیں۔ چپ ہو جاتا تھا پھر بولنے لگتا تھا۔"

"کوئی آیا ہوا ہو گا۔" گلو نے اسے ٹالنے کو کہا حالانکہ وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"نہیں............ میرے سامنے اس نے کوٹھڑی میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا تھا۔"

"تجھے کیسے پتا چلا کہ وہ وکیل کے پاس گیا ہے۔"

"یہی تو مزے کی بات ہے' پوری بات تو سنو! میں تو پریشان تھا کہ کیا ہو گیا مگر وہ صبح اٹھا تو بڑا فٹ فاٹ تھا۔ خوب انکھیلیاں کیں۔ نہایا دھویا' باتیں کرتا رہا۔ ہوٹل پر آ کر ناشتا کیا۔ ملک حسین سے کہا کہ چھوٹا اب گیراج پر رہے گا۔ میری کوٹھڑی آج سے اس کی ہے۔ گلو میری جگہ گیراج دیکھے گا۔ میری ٹیکسی چلایا کرے گا۔ اپنی بیچ دے گا۔ جب ملک حسین نے پوچھا کہ تو کہاں جا رہا ہے تو بولا ابھی تو وکیل کے پاس جا رہا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ وہاں سے تو' تو واپس آ جائے گا مگر یہ باتیں کیوں کر رہا ہے کہ کوٹھری اس کی ہے اور تیری جگہ گلو گیراج سنبھالے گا' تو پتا ہے کیا کہا اس نے! بولا۔ یار تھک گیا ہوں' آرام کروں گا۔ ملک حسین بولا۔ آرام تو یہاں بھی کر سکتا ہے اس طرح سب کچھ بانٹ کر کیا تو مری کی پہاڑیوں میں جا رہا ہے یا ملک چھوڑ رہا ہے تو ہنس پڑا............

"مری سے بھی اچھی جگہ جانے کی کوشش کر رہا ہوں............ دعا کر جنت جیسی جگہ ملے۔ ٹھوکریں تو یہاں بہت کھالیں۔ اب سکون مل جائے۔" چھوٹے نے امام دین کی نقل اتاری۔ "بھائی گلو سچی بات ہے کہ میرا تو یہ باتیں سن کر دل گھبرانے لگا ہے' اب تک ساکت ہے' دیکھو............ ہاتھ رکھ کر دیکھ............ ۔"

چھوٹے نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ جسے وہ ساکت کہہ رہا تھا' وہ دل اس کے حلق میں دھڑک رہا تھا' جیسے ڈرم بج رہا ہو............ گھبراہٹ نے ایک دم ہی گلو کو گھیر لیا۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ "وکیل کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" چھوٹے نے سر ہلایا۔

"میں گھر جاتا ہوں' شاید گھر گیا ہو۔"

"نہیں گھر تو نہیں گیا' یہ تو مجھے یقین ہے۔" اس نے پھر زور سے سر ہلایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ اس طرف گیا تھا۔" اس نے دائیں طرف اشارہ کیا۔ "جب ادھر سے راستہ تھوڑا ہے تو اتنا گھوم کر کیوں جاتا۔ وہ کہیں اور گیا ہے۔" اس نے دوسری جانب اشارہ کیا۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ بات گلو کو بھی پتا تھی۔ دائیں ہاتھ کی چوڑی سڑک تقریباً سات فرلانگ پل کی طرف جاکر پھر مڑتی تھی اور وہاں رش بھی بہت ہوتا تھا جبکہ بائیں سڑک سے گھر زیادہ دور نہیں تھا' راستہ بھی صاف تھا۔ کم ٹریفک ہوتی تھی' اس لیے کہ گلیاں تھیں۔

"میں دیکھتا ہوں۔" گلو کے لئے اب ٹھہرنا دوبھر ہوگیا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے؟ زیبی کے پاس جانا تو تھا مگر ایسا بوجھ اور گھبراہٹ لیے وہ جانا نہیں چاہتا تھا۔ سڑکوں پر پھرتا رہا۔ پھر گیراج پر آکر بیٹھ گیا۔ چھوٹے کی باتیں اسے بہلائے رہیں۔ دل پھر بھی گھبراتا رہا۔ سورج نے آدھا چکر پورا کرلیا۔ تیز دھوپ برسائی تو وہ سائے میں چارپائی ڈال کر بیٹھ گئے۔ ملازم لڑکے کام میں لگے رہے۔ امام دین اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی نہیں آیا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا گلو کا دماغ پھوڑا بنتا جارہا تھا۔ سوچتا' گھر چلا جائے تو زیبی کا خیال پیروں میں زنجیر کی طرح لپٹ جاتا۔ جانا اور پھر واپس آجانا.......... پھر امام دین کی طرف سے اسے اطمینان بھی ضروری تھا۔ وہ بیٹھا رہا۔ پہاڑ سا دن سرکتا رہا۔ چھوٹے کے ساتھ کھانا کھالیا.......... چائے پی لی.......... ادھر ادھر گھوم پھر کر کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اگر چھوٹے نے کچھ عجیب عجیب سی باتیں نہ بتائی ہوتیں تو اسے اتنی فکر نہ ہوتی پھر اسماعیل کی تلوار اس کے سر پر لٹکی ہوئی تھی۔ فیض محمد کے بارے میں معلوم کرنا اور اس کے رویے اور اسماعیل کے پیغامات کی نوعیت پر امام دین سے بات کرنا بھی ضروری تھا۔ سو دن گزرتا رہا اور جب نرم ہوتی دھوپ میں امام دین کی ٹیکسی کا ونڈ اسکرین چمکا تو اس کی جان میں جان آئی۔

"ابے تو.......... اچھا کیا۔" وہ ٹیکسی سے اترتے ہوئے بولا۔ "میں تیرے گھر سے آرہا ہوں۔ پتا چلا کہ تو منہ اندھیرے کا نکلا ہوا ہے۔"

"تو کہاں تھا؟" گلو نے اسے غور سے دیکھا۔

"تو گھور کیوں رہا ہے؟" امام دین کافی خوش لگ رہا تھا۔

"کیا لاٹری نکلی ہے یا کوئی شرط جیت گیا ہے؟" گلو نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ چھوٹا اسے دیکھ کر چائے لینے دوڑ گیا تھا۔

"شرط..........؟" وہ چونکا۔ "اب یہاں.......... ایک شرط لگائے گا مجھ سے؟"

"کیسی شرط؟"

"تجھے خزانہ ملنے والا ہے۔" امام دین نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"پاگل ہوا ہے کیا؟ سر پر اگے بال برے لگ رہے ہیں؟"

"نہیں گلو.......... تو ہمیشہ بچتا رہا ہے۔ آج تجھے شرط لگانا ہی پڑے گی۔ اب کی بار تو گنجا ہوگا۔" وہ سنجیدگی سے اڑ گیا۔

"تجھے گنجا کرانا ہے تو کرادے۔ تیری خاطر بال تو کیا گردن بھی کٹادوں گا مگر ایسی فضول شرط لگانے کا مطلب کیا ہے!؟"

"یہ فضول شرط نہیں ہے۔ لگا شرط۔"

گلو نے حیرت سے امام دین کو دیکھا۔

"اور اب یہ کہ تیری دنیا ہی بدل جائے گی۔ خزانہ ملے گا وہ الگ۔"

"ماے تو.......... پتا نہیں کیوں لگا رہا ہے شرط' میں کہتا ہوں ناں کہ سر منڈھا دیتا ہوں ورنہ کیوں اپنے سر کے پیچھے پڑا ہے۔ بال بڑھے ہیں تو شکل اچھی لگنے لگی ہے' تجھے شاید یہ کسی نے نہیں بتایا۔" گلو اسے ٹالنے کے چکر میں تھا۔

"لگا شرط۔" اس نے ان سنی کرکے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ناچار گلو نے شرط لگالی اس لیے نہیں کہ اسے تجسس تھا کہ کون سا خزانہ اور کیسی دنیا بلکہ صرف اس لیے کہ وہ امام دین سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور وہ سنانے کو تیار نہ تھا۔ "اچھا ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے نہیں۔ ابے او چھوٹے۔" وہ پلٹ کر پکارا۔ چھوٹا دوڑتا ہوا آگیا۔

"ادھر آبے.......... دیکھ گلو نے مجھ سے شرط لگائی ہے۔ اب اس کا سر دیکھنا تو.......... کیا چمکدار اور انڈے کی طرح کا نکلے گا۔ ملک حسین کو بتا دیجیو۔" پھر وہ گلو کی طرف مڑا۔ "بے ایمانی نہیں چلے گی گلو اگر تو گنجا نہیں ہوا تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب گلو بہت پریشان ہو گیا تھا۔ اسے یقین آنے لگا کہ امام دین کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ "مامے.......... کیا ہو گیا ہے تجھے!"

"کچھ نہیں ہوا۔" اس نے جھڑک دیا۔ "ساری زندگی ہو گئی، کبھی شرط نہیں لگا سکا تجھ سے۔ ایک دفعہ سوچا تھا مگر نظر آ گیا تھا کہ شرط لگائی تو بری طرح ہاروں گا، تب سے موقع کی تلاش میں تھا۔"

اور جب چھوٹے نے شرط کی تفصیل سنی تو وہ بھی آنکھیں پھاڑ کر امام دین کو دیکھنے لگا۔ گلو کا جی چاہا کہ وہ امام دین کے رخساروں پر تھپڑ مار کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرے مگر اس سے پہلے ہی وہ بول اٹھا۔ "ہاں اب بول.......... کیا بات ہے۔ جھاراں کیسی ہے؟"

گلو نے گہرا سانس لیا۔ "ٹھیک ہے.........." پھر اس نے اسماعیل کے پیغام کا بتایا، جوں ہی اس نے فیض محمد کا ذکر کیا، امام دین کا چہرہ تپ کر سرخ ہو گیا۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔

"ٹھیک ہے۔ تجھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی آج سوچ رہا تھا کہ ادھر کا آخری چکر لگا ہی لوں۔"

"یار تم پتا کرنا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ میں چاچا اور جھاراں کی طرف سے پریشان ہوں ورنہ چلا جاتا اور وہاں اس سے کہہ دیتا کہ گلو دوسرے قسم کا آدمی ہے۔ اس کے پاس پیغام بھیجنے والا کم از کم انسان ہونا چاہیے۔ آئندہ اگر اس نے کبھی اس حرامی کو بھیجا تو اسے جوتے کے ڈبے میں پیک کر کے واپس کروں گا میں۔"

"زبردست آئیڈیا ہے۔" وہ زور سے ہنسا۔ عجیب سی ہذیانی ہنسی تھی۔ کھڑ کھڑا کر خوف سے رونگٹے کھڑے کر دینے والی۔ ویسے گلو! سچی بات یہ ہے کہ اب وہ آئندہ تیرے پاس نہیں آئے گا۔ چل چھوڑ تو، میں ذرا گھر جا رہا ہوں پھر نکلوں گا۔"

اور گلو کو لگا جیسے اس کے اور زیبی کے بیچ آہنی دیوار پھر سے موٹی ہو گئی ہو جسے اس نے رات بھر چاٹ چاٹ کر پتلا کر دیا تھا۔ وہ کب سے زیبی کے گھر جانے کا منتظر تھا۔ سوچا تھا کہ امام دین سے مل لے تو جائے گا مگر.......... امام دین رکا نہیں، وہ جلدی میں تھا۔ چلا گیا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ گلو نے دعا کی کہ امام دین جلد ہی وہاں سے چل

دے، ویسے اتنا تو اسے اندازہ تھا کہ زیبی کا رویہ ایسا ہوتا نہیں ہے کہ امام دین وہاں زیادہ دیر وقت گزارے۔ کوئی ضروری کام ہو گا ورنہ وہ تو دنوں اس طرف کا رخ نہیں کرتا تھا۔

اب پھر سڑک تھی اور وہ تھا۔ رستے کالے ناگ کی طرح سرسراتے رہے اور وہ گھومتا رہا جیسے تیز ہوا کی زد میں ہتھیلی پر دیا رکھے بھاگ رہا ہو۔ اس نے لو بڑھائے رکھی یہاں تک کہ تیز دھوپ گہری سرخی میں تبدیل ہو کر شفق بن گئی پھر دور تک آسمانوں کے ستارے سرمئی ہونے لگے اور گلو کو ہول آنے لگے۔ وہ تمام احتیاط اور خدشے بالائے طاق رکھ کر زیبی کے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ گلی میں مڑا تو جان میں جان آئی۔ امام دین کی ٹیکسی وہاں نہیں تھی۔ اس نے رفتار دھیمی کر کے فوراً خود کو سنبھالا پھر ٹیکسی دروازے پر روک کر اتر گیا۔

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ زیبی نے دھیمی سی مسکراہٹ سجا کر اس کا استقبال کیا مگر جانے کیوں اس مسکراہٹ میں ایسی حوصلہ افزائی نہیں تھی کہ وہ جواباً کسی بے ساختگی کا اظہار کر پاتا۔

"میں کل سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

گلو نے اسے بتایا کہ وہ کل کیوں نہیں آ سکا اور آج آنے میں دیر کیوں ہوئی۔

"ہاں امام دین آیا تھا۔" اس کا انداز عجیب سا تھا یا گلو کو ہی کچھ عجیب سا لگا۔ "گلو میں نے تمہیں بڑی امید کے ساتھ بلایا ہے۔ مجھے جانے کیوں یہ یقین ہے کہ تم میری ایک ایک بات پر یقین کرو گے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں جو کچھ بھی کہوں گی، وہ سچ کہوں گی۔"

گلو نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "مجھے یقین ہے۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"شکریہ گلو! میں نے زندگی میں حتی الامکان یہی کوشش کی ہے کہ مجھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ نہ میری بات میں کہیں جھوٹ کی آمیزش ہو، نہ میں مصلحت کا سہارا لے کر غلط بیانی کروں اور نہ میرے لہجے اور رویے سے کسی کو دھوکا ہو۔ میرا کبھی تم سے واسطہ نہیں رہا۔ میں تمہارے لیے اور تم میرے لیے قطعی اجنبی ہو اس لیے میں نہیں جانتی کہ تم میری بات پر کس حد تک یقین کر سکتے ہو۔ میرا تم سے کوئی لینا دینا بھی نہیں پھر بھی.......... میں.......... یہ" اس کی آواز اس کے اندر کی سچائی سموئے ہوئے تھی شاید اس لیے بھرا گئی۔ "میں نے صرف ایک مرتبہ جھوٹ بولا ہے اور.......... اور وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھوٹ بھی کسی کی خوشی کی خاطر بولنا پڑا ہے۔ یہ عہد بھی میں نے خود سے کیا ہے کہ میں اس جھوٹ کو آخری دم تک نبھاؤں گی۔'' اس بار اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

گلو کا جی چاہا کہ وہ کہہ دے۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ جھوٹ کیا ہے اور جسے تم اب بھی نبھانے کی کوشش کر رہی ہو'' مگر وہ کہہ نہیں سکا۔ اسے حیرت صرف اس بات پر تھی کہ اگر اس نے آج سچ بولنے کے لئے نہیں بلایا تو پھر.......... وہ کون سی بات ہے جو وہ اس سے کرنا چاہتی ہے۔

اور جب زیبی نے چائے پیتے ہوئے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا تو وہ بھی امام دین کی طرح ساکت رہ گیا۔ اسی کی طرح آنکھیں پھاڑے اسے تکتا رہ گیا۔ وہ بھی بھول گیا کہ وہ زیبی کے سامنے بیٹھا ہے۔ اسے بھی صرف اتنا یاد رہ گیا کہ اسماعیل ہی اسماعیل راجہ ہے' وہی راجہ جس نے جھاراں کو گاؤں سے اٹھایا' چاچا کی زندگی برباد کی' خود اس کی زندگی برباد کی۔ باپ ہونے کے باوجود اس نے کتوں کی طرح اسے سڑکوں پر تنہا چھوڑ دیا۔ اس نے اس سے ایک محبت کرنے والی ماں کو چھین لیا' وہی محبت کرنے والی ماں جس سے وہ ساری زندگی نفرت کرتا رہا۔ اس کی کنپٹیاں سلگتی رہیں۔ خون دماغ میں جیسے ٹھوکریں مارتا رہا۔ پسینا بدن سے پھوٹ پھوٹ کر اس کے کپڑوں میں جذب ہوتا رہا اور جب زیبی نے اسے جھنجوڑا تو وہ اچھل پڑا۔

''گلو! یہ بات میں نے تمہارے دل سے ماں کی نفرت نکالنے کے لیے بتائی ہے۔ وہ تمہارے لیے ہمیشہ تڑپتی رہی ہے۔ تمہیں اپنے سینے سے لگانے کی آرزو اس کی روح کا سب سے بڑا ناسور بن گئی ہے۔ کتنی اذیت کی بات ہے کہ آج تم اس کے سامنے ہو مگر وہ.......... اب بھی اس رشتے کی مہک سے محروم ہے۔ جاؤ گلو! نفرتوں کو دل سے نکال کر اسے سہارا دو اور اسماعیل.......... راجہ جیسے کتوں کو چھوڑ دو۔ قدرت ان سے خود انتقام لے گی۔ بڑا بھیانک انتقام۔ گلو.......... مجھ سے وعدہ کرو۔ میں تم سے محبت مانگنے کا حق رکھتی ہوں مگر میں اپنے لیے نہیں' جھاراں کے لیے مانگ رہی ہوں۔ میری ہی جیسی ایک اکیلی عورت کے لیے جو ہمیشہ ظلم کی چکی میں پستی رہی ہے۔'' زیبی بے ساختہ کہہ بیٹھی۔

گلو لمحہ بھر کو چونک اٹھا۔ ''تم سے جھوٹ نبھانا بھی نہیں آتا زیبی۔'' وہ بول اٹھا۔

زیبی کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے ہوئے شرمندہ بیٹھی تھی۔

''گلو! کبھی کبھی آدمی کمزور بھی پڑ جاتا ہے۔'' گلو کو لگا جیسے وہ اب رو دے گی۔ مگر وہ پھر سنبھل گئی۔

''گلو! حالات زندگی کا رخ خود متعین کر دیتے ہیں۔ جھاراں تمہاری منتظر ہوگی گلو!'' وہ جو اک رنگ اس کے چہرے پر پھیلا تھا' وہ ایک دم ہی غائب ہوگیا۔

''ہاں.......... میں.......... میں اس اسماعیل کو زندہ نہیں چھوڑوں گا زیبی..........'' وہ ایک دم آگ بگولا ہوگیا۔

''نہیں.......... تم کچھ نہیں کرو گے گلو! سوچو گلو! جو ماں تمہیں تمام زندگی ڈھونڈتی رہی' اس کے اور اپنے بیچ دیوار گرا دو گے۔ اس شخص کے خون سے ہاتھ رنگو گے اور پھر اس کی وجہ سے اپنی ماں سے بچھڑ جاؤ گے۔ تم کچھ نہیں کرو گے۔ تم صرف اپنی ماں کے پاس جاؤ گے۔ وعدہ کرو.......... وعدہ کرو گلو!''

گلو کچھ دیر اسے تکتا رہا پھر اس کی نگاہیں خلا میں تیرنے لگیں۔ اسے جھاراں کی آنکھوں میں ٹھاٹیں مارتا جذبوں کا سمندر نظر آنے لگا۔ چاچا کی آنکھوں کی چمک مگر سب کچھ چھپائے رکھنے کی کوشش میں اس کا نگاہیں چرالینا بھی یاد آیا۔

''جاؤ گلو۔ مجھ سے یہ وعدہ کرکے کہ تم صرف محبت کی طرف جارہے ہو۔ نفرت اور انتقام کی طرف نہیں۔''

اور اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ صرف اور صرف محبت ہی کر سکتا ہے اس لیے کہ یہ زیبی کہہ رہی تھی۔ وہ رہنمائی کر رہی تھی جسے اس نے صرف ہمسفر کے روپ میں چاہا تھا۔ اس نے وعدہ کرلیا اور یہ عہد بھی کہ ماں سے مل کر' یہ خوش خبری امام دین کو سنا کر' چاچا کو سینے سے لگا کر اور نازاں کو اپنی خوشی میں شریک کرکے وہ پھر لوٹ کر آئے گا اور پھر زیبی سے کہے گا کہ وہ ایک بار کہہ دے کہ وہ ''وہی'' ہے۔

اسے یقین تھا کہ زیبی انکار نہیں کرے گی۔ وہ اس کا مان رکھ سکتا تھا تو وہ بھی اس کا مان رکھے گی۔ گلو گھر سے باہر نکلا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں۔ اچانک اسے امام دین کی شرط یاد آگئی۔ واقعی وہ شرط جیت گیا تھا۔ خزانہ گلو کو مل گیا تھا۔ ایک ایسا خزانہ جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بدحال ہو چکا تھا۔ ماں کی محبت کا خزانہ۔ اس کے سینے میں محبت کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اڑ کر اسپتال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہنچ جائے۔

جی تو اس کا یہ بھی چاہا تھا کہ وہ سیدھا اسماعیل کے گھر پہنچے۔ اور اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دے۔ اتنی لاتیں مارے کہ اس کے دل میں اب تک بھری رہنے والی نفرت اس کا حلیہ بگاڑ دے۔ وہ تو اسی وقت جان گیا تھا کہ یہ وہی اسماعیل ہے۔ جب زیبی نے بتایا کہ جھاراں کو ٹکر مارنے والی گاڑی اسی راجہ کی تھی جو اب راجہ اسماعیل کے نام سے جانا جاتا ہے اور وہ فتح کا حریف بھی تھا مگر اس نے زیبی سے وعدہ کیا تھا۔ وہ اس سے کیا گیا پہلا وعدہ توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سیدھا امام دین کے گیراج پر پہنچا تاکہ اسے بتا سکے کہ وہ شرط جیت گیا ہے۔ اور جب چاہے گلو اپنا سر منڈھانے کو تیار ہے مگر امام دین ابھی تک نہیں آیا تھا۔ وہاں سے اسپتال پہنچا۔ اوپر گیا تو پتا چلا کہ ڈاکٹر نے جھاراں کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ چاچا سے صبر نہ ہوسکا اور وہ اسے لے کر چلا گیا۔

☆==========☆==========☆

آج گلو گھر کی طرف جاتے ہوئے بہت مسرور تھا پھر بھی دل میں ایک کھٹک سی تھی۔ باپ کے بارے میں جو کچھ اسے معلوم ہوا تھا اس نے اس خوشی کے موقع پر بھی اسے اندر سے غم زدہ کردیا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ وہ ایک ایسے خبیث شخص کی اولاد ہے جس نے اپنی بیوی کی ہی نہیں، اپنی اولاد کی پروا بھی نہیں کی۔ وہ جانتا تک نہ ہوگا کہ جسے وہ اپنا آلہ کار بنا رہا ہے، وہی اس کا بیٹا ہے۔ قدرت بھی کیسے عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ آج اسے یقین ہوگیا تھا کہ جو عورت اس روز اس کی کوٹھی میں آکر چیخ و پکار کررہی تھی وہ جھاراں تھی۔ اگر وہ کہیں اسے بھی وہاں دیکھ لیتی تو نہ جانے کیا ہوتا!

وہ انہی سوچوں میں غرق گھر کی طرف جارہا تھا۔ چاچی اسے گلی میں ہی مل گئی۔ لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرایا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے ہنستے ہوئے گلو سے کہا۔ "گلو! بیٹا تیری تو لاٹری نکل آئی۔"

"جی!!" گلو حیران ہوا کہ وہ سب کچھ کیسے جان گئی۔

"ہاں.......... پتا ہے تو باپ بننے والا ہے۔"

"کیا؟" خوشگوار حیرت کے جھٹکے نے اسے اچھال دیا۔

"ہاں بیٹا.......... اب تو بچہ نہیں رہا، بچے کا باپ بننے والا ہے۔ نازاں کا خیال

رکھ۔ آج حالت بہت خراب ہوگئی تو میں پچھلی گلی میں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ جاکے اپنے چاچا کو تو دیکھ، ناچا ناچا پھر رہا ہے۔" چاچی کی باچھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

"ہاں.......... اسے تو اللہ نے چھپڑ پھاڑ کر خزانہ دے دیا چاچی.......... اور مجھے بھی۔" وہ اتنا کہہ کر اندر بھاگا۔ اندر واقعی چاچا ناچ رہا تھا۔ جھاراں کا زرد چہرہ اس وقت گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ وہ نازاں کے ہاتھ تھامے چارپائی پر بیٹھی تھی۔ گلو کو دیکھ کر تو چاچا اس سے لپٹ ہی گیا۔ بہت زور سے گھوما۔ گلو نے بھی اسے اپنی مضبوط بانہوں میں بھینچ لیا۔ پھر کان کے قریب سرگوشی کی۔ "میرا باپ راجہ نہیں.......... تو ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا چاچا۔" اور اسے لگا جیسے چاچا کو سانپ سونگھ گیا یا وہ کندھے سے جڑ کر کھڑا رہ گیا۔

"چاچا.......... خوشیاں تجھے ہی نہیں.......... مجھے بھی تو ملی ہیں۔ میں تجھے مبارک باد دے رہا ہوں، تو مجھے دے، اس لیے کہ میں باپ بننے والا ہوں اور.......... اور اس لیے کہ آج جھاراں بھی ماں بن گئی۔ اسے بھی تو اس کا بیٹا مل گیا ناں!"

اسے گویا بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ گلو سے الگ ہوکر منہ کھولے اسے دیکھتا رہا پھر بے قابو ہوکر اس سے لپٹ گیا۔ ہنسا اور ہنستے ہنستے رو پڑا۔

"گلو!! گلو.......... بیٹا مجھ سے تو یہ خوشی سنبھالی نہیں جارہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تجھے کیسے بتاؤں.......... تیرے دل میں بھرا زہر کیسے نکالوں۔ وہ بہت ترسی ہے۔ میں نے تو سوچ لیا تھا اور اس نے بھی کہ اگر تیری نفرت نکلنے کا آسرا ہوا تو ہم تجھے بتائیں گے ہی نہیں۔ کم از کم اس طرح وہ تجھ سے قریب تو رہے گی۔ مگر تو.......... تجھے یہ سب کس نے بتایا گلو!" وہ اسے کاندھے سے پکڑ کر پوچھ رہا تھا اور گلو کی نگاہیں دور بیٹھی نازاں اور جھاراں پر جمی ہوئی تھیں۔ جھاراں کی ساری توجہ انہی کی طرف تھی مگر گلو کو یقین تھا کہ اس کی باتیں وہ نہیں سن سکی ہوگی۔

"بتا گلو! کس نے بتایا؟"

"زیبی نے۔" اس نے دھیرے سے کہا اور چاچا دونوں ہاتھ اٹھا کر زیبی کو دعائیں دینے لگا۔ پھر اسے لیے جھاراں کے قریب آگیا۔ گلو کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، جھاراں کی پیار برساتی آنکھیں لمحہ بھر کو خالی ہوئیں پھر ان میں حیرت اور خوف بھر گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"گلو!!"

"گلو نہیں اماں......... گلزار......... تمہارا گلزار۔" گلو ایک دم اس کے قدموں میں بیٹھ گیا اور پھر تو یوں لگا جیسے جھاراں پر شادی مرگ طاری ہو گیا ہو۔ وہ گلو کے گلے میں جھولی اور ساکت رہ گئی۔ صرف اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو تھے جو پاس کھڑے غلام حسین کے دل پر گر رہے تھے۔ نازاں اپنا دکھ بھول کر حیرت اور خوشی سے رو رہی تھی۔

خوشیوں نے جیسے اس گھر کی چوکھٹ پر بسیرا کر لیا تھا۔ رحمان چاچا اور چاچی جانے کب آ گئے تھے اور بت کی طرح کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر گلو پہلی بار اس قدر پھوٹ پھوٹ کر رویا کہ اس کے دل میں بھرا سارا زہر بہہ گیا۔ جھاراں کے سب دکھ، چاچا کی ساری جدائیاں، سب آنسوؤں میں دھندلا کر مٹ گئے تھے۔

اس وقت کسی کو کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ وہ سب جیسے خود کو ایک دوسرے میں سما کر ایک دوسرے کو پالینے کا یقین دلا رہے تھے۔ رات کے لمحے ہواؤں کے دوش پر تیرنے بلکہ اڑتے ہوئے گزر رہے تھے۔ رات ڈھلتی جارہی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا مگر ان کا آنگن جگمگا رہا تھا۔ اوس پڑ رہی تھی مگر وہ سب تو نرم جذبوں کی پھوار میں بھیگے بیٹھے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ سن رہے تھے۔

"آپ لیٹ جائیے اماں! اتنا نہ بیٹھیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ آرام آپ کو جلدی ٹھیک کر دے گا۔" نازاں بولی تو گلو کو اس کا خیال آیا۔ اس نے پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور اسے اپنی جانب دیکھتا پاکر آنکھ ماردی۔ اس نے شرما کر گردن جھکالی پھر چونکی اور سر اٹھا کر بولی۔

"گلو! امام دین آیا تھا۔ یہ لفافہ دے گیا ہے۔" اس نے چارپائی پر تکیے کے نیچے رکھا خاکی لفافہ گلو کی جانب بڑھا دیا۔

"کیا ہے یہ؟ مجھ سے تو ذکر نہیں کیا۔" وہ حیران ہوا۔

"کہتا تھا گیراج گلو کے نام کر دیا ہے۔ کل سے وہی سنبھالے گا۔"

"کیا؟" وہ اچھل پڑا۔ "مگر مجھے تو.........۔" ابھی اس نے جملہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ اچانک سنسان اور اندھیرے میں ڈوبی گلی میں شور کی آواز گونج اٹھی۔ کسی بڑی گاڑی

کے انجن کا شور تھا۔ پھر گاڑی اس کے دروازے پر آ کر رکی۔ لوگوں کے اترنے بولنے اور پھر کھٹکھٹانے کی آوازیں آنے تک وہ سب حیران اور گم صم بیٹھے رہے۔

"کون ہو گا......... اس وقت؟" چاچا گھبرا گیا۔

گلو دروازے کی طرف بڑھا۔ چاچا بھی اس کے پیچھے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔ چھوٹا، ملک حسین، نائی اور امام دین کے گیراج کے تمام لوگ تھے۔ ایمبولینس ساتھ تھی۔ سب رو رہے تھے۔ "کیا......... کیا بات ہے؟" ایمبولینس کے پیچھے ہی پولیس کی گاڑی تھی۔ پولیس کا افسر اتر کر گلو کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"گلو! امام دین......... امام دین ہمیں چھوڑ گیا......... ہمیں۔" چھوٹا بولا نہیں تھا، چیخا تھا اور پھر ذرا سی دیر میں ساری گلی جاگ اٹھی۔

"کیا کہہ رہا ہے تو۔" گلو کی آواز پھٹ گئی۔ وہ ایمبولینس کی طرف لپکا۔ اندر امام دین کی لاش رکھی تھی۔ کنپٹی پر خون جما ہوا تھا۔

"اس نے اسماعیل اور فیض محمد کو مار کر خود کشی کر لی۔" یہ بات پولیس افسر نے کہی۔ گلو کو یوں لگا جیسے ساری دنیا گول گول گھومنے لگی ہو۔

"ہم بروقت پہنچ گئے تھے۔ یہ ابھی مرا نہیں تھا۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ یہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرے مگر......... اس کے ہاتھ میں پستول تھا جو اس نے ہم پر تان لیا تھا۔ اس نے ہمیں بتا دیا کہ اسماعیل راجہ ہی وہ آدمی ہے جسے ہم بہت دنوں سے تلاش کر رہے تھے۔ ہمیں فیض محمد کی تلاش بھی تھی لیکن......... بہرحال ہم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ہم اسے سلطانی گواہ بنالیں گے اس لیے کہ اس نے ایک مجرم کے سلسلے میں ہماری مدد کی ہے مگر......... اس نے کہا کہ ہم اس کی لاش گیراج پر نہیں دیں بلکہ وہاں سے کسی کو لے کر آپ کے گھر کا پتا کر کے یہاں پہنچائیں۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح بول رہا تھا۔ گلو کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔

گلو سوچ رہا تھا کہ ضرور اسے زیبی نے بتا دیا ہو گا......... تبھی تو اس نے شرط لگائی تھی۔ وہ سب کچھ جان گیا تھا۔ اس نے میرا انتقام بھی لے لیا تھا اور......... "وہ شرط جیت گیا......... وہ شرط جیت گیا چھوٹے......... دیکھا......... دیکھا.........۔" گلو اچانک پلٹ کر بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملک حسین' چھوٹا اور دوسرے سب لوگ اب دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

"وہ جیت گیا چھوٹے۔ پہلی بار مجھ سے شرط لگائی تھی اس نے اور.......... اور جیت گیا.......... جیت گیا وہ۔" ایک شور تھا آہوں کا' چیخوں کا۔ سب اسے سنبھال رہے تھے اور وہ بے قابو ہو رہا تھا مگر ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو رو کر بیٹھا تھا۔

ایمبولینس سے میت اتار کر گلو کے آنگن میں رکھ دی گئی۔ پولیس ضروری کارروائی اور لاش کی وصولی رسید پر گلو سے دستخط لے کر چلی گئی۔ پورا محلہ گلو کے گھر آمڈ آیا۔ نازاں بلک رہی تھی۔ جھاراں رو رہی تھی' چاچا رو رہا تھا' چھوٹا سینہ پیٹ رہا تھا مگر گلو' امام دین کے سرہانے ساکت بیٹھا اسے تک رہا تھا۔

اچانک شور سناٹے میں ڈھل گیا۔ گلو امام دین کو آوازیں دے رہا تھا۔

"مامے.......... مامے اٹھ۔ تو شرط جیت گیا مامے.......... چل میں گنجا ہونے کو تیار ہوں۔ مجھے خزانے مل گئے مامے.......... دیکھ مجھے گنجا دیکھنے کا تجھے بہت شوق تھا ناں.......... چل اٹھ.......... پگلے.......... میں تو یوں بھی تیار تھا' شرط ہارنے کو.......... بالکل تیار تھا' یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی مامے.......... اٹھ ناں.......... اٹھ۔" اس کی فلک شگاف چیخیں سن کر ہر شخص چیخ چیخ کر رو پڑا۔

"مامے تو نے ایک خوشخبری تو سنی ہی نہیں.......... اب تو چاچا بننے والا ہے.......... چاچا.......... مجھے مبارک باد دے.......... مامے مجھے میری ماں مل گئی' اٹھ مجھے مبارک باد دے.......... میں ساری زندگی جن خوشیوں کے لئے تڑپا وہ خوشیاں مل گئیں مامے.......... اٹھ مجھے مبارک باد دے۔ اٹھ مامے.......... اٹھ مامے۔" وہ اسے جھنجوڑ رہا تھا اور سب رونے والوں میں نازاں کی آواز اونچی.......... اور اونچی ہوتی جارہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر گلو سے کہے کہ امام دین جانتا تھا کہ وہ چاچا نہیں بنا۔ وہ جانتا تھا کہ تو باپ نہیں بننے والا.......... اور وہ جانتا تھا کہ اس گناہ کا سبب کون ہے پھر وہ تجھے کیوں مبارک باد دے۔ وہ جانتا تھا کہ بچے کا باپ کون ہے جبھی تو اس نے فیض محمد کو مار ڈالا گلو۔ وہ کیسے مبارک باد دے.......... تجھے کس تباہی کی مبارک باد دے۔ بڑا امانت دار تھا وہ تو.......... میرا راز ساتھ ہی لے گیا۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر امام دین نے ہی تو کہا تھا کہ چپ رہنا۔ آخری بار کہہ کر گیا تھا پھر کیسے آواز نکلتی؟ گلو تو آپے سے باہر ہو

رہا تھا۔ اسے سنبھالنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ رحمان چاچا جھاراں اور نازاں کو اپنے گھر لے گیا۔

وہ گھر جہاں رات خوشیوں کی برسات اتری تھی۔ سویرے اپنے سینے پر امام دین کا جنازہ اٹھائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ چھوٹے نے ابھی ابھی آکر گلو کو بتایا تھا کہ امام دین کے دروازے پر تالا پڑا ہے اور چابی سامنے والوں نے دی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ زیبی چلی گئی۔ ایک خط چھوڑ گئی تھی۔ چھوٹے نے پڑھا۔ لکھا تھا۔

"گلو! جو قربانی امام دین نے دی ہے اور جو میں دے رہی ہوں اس کا مان رکھنا۔ یہ خوشیاں جو تمہارے حصے کی تھیں تمہیں مل گئیں۔ ہمارے حصے میں کچھ نہیں تھا سو آس بیکار تھی۔ ہاں.......... میں وہی ہوں اور وہ شخص.......... جس کی میں زندگی بھر منتظر رہی وہ تم ہو۔ نازاں میری اور امام دین کی امانت ہے تمہارے پاس۔ اس کا خیال رکھنا۔"

اگلی صبح سورج کی ابھرنے والی پہلی کرن نے بڑھ کر کفن میں لپٹے امام دین کے چہرے کو چوما اور گلو نے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیئے۔ اسے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔

"وہ.......... وہ تیری امانت ہے مامے.......... اسے میں سینے میں چھپا کر رکھوں گا۔" ایک سسکی اُبھری اور بہت سی آہوں اور سسکیوں میں دب گئی۔

ختم شد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محی الدین نواب

- ادھورا ادھوری ۱۵۰/=
- شعلوں کی سیج ۱۳۵/=
- آبلہ بدن ۱۳۵/=
- پتھر /=
- شارٹ کٹ ۱۲۵/=
- دل پارہ پارہ ۱۲۵/=

محمود احمد مودی

- لہو کا سراغ ۸۰/=
- سمندر ۱۵۰/=
- کنارہ ۱۵۰/=

طاہر جاوید مغل

- پرستش ۱۵۰/=
- آلاؤ انگارے آنچ (انسپکٹر نواز خان) ۳۰/=
- آندھی (دو جلدیں) ۳۰۰/=

سیما غزل

- کال بیل (دو جلدیں) ۳۰۰/=
- کمند (دو جلدیں) ۲۴۰/=
- کوری آنکھیں (دو جلدیں) ۳۰۰/=

ڈاکٹر مشتاق احمد قریشی

- پاتال /

ابن آدم

- لاوارث ۵۰/=
- سیاہ عقاب ۱۰۰/=
- عنوشہ ۱۰۰/=
- شعلہ حریت /=
- چرغ /=

ابن حسن عثمان آبادی

- چیل کوٹھی ۱۰۰/=

شکیل صدیقی

- بے پناہ /=

احسان الحق نازش

- موسم بدلتے رہتے ہیں (شاعری) ۱۲۰/=

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور فون: ۷۲۴۷۴۱۴